جہانِ دانش

—Husain—

احسان دانش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جہانِ دانش

احسان دانش

مکتبہ

المسلم پبلشرز

اردو بازار کراچی

کتاب ——————— جہانِ دانش

صفحات ——————— ۶۴۸

کتابت ——————— خلیل الرحمٰن

تعداد ——————— ۳۰۰

سنِ طباعت ——————— 1995

المسلم پبلشرز
اردو بازار۔ کراچی

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

فہرس

چہ می پرسی سر و سامانِ من اے یار چوں کاکل
سیہ بختم، پریشاں روزگارم، خانہ بر دوشم

دیباچۂ حیات

یہ کتاب "جہانِ دانش" جو آپ کے سامنے ہے۔ میں نے اسے کئی بار لکھنے کا ارادہ کیا لیکن اپنے حالات کی طرف دیکھ کر اس خیال سے خاموش ہوگیا کہ کہیں پڑھنے والے اسے رحم کی درخواست نہ سمجھ لیں۔

میں اوّل سے بفضلہ تعالیٰ اپنی دشوار ترین منزلِ حیات سے ثابت قدم اور بے داغ گزر رہا ہوں اور خیال کرچکا ہوں کہ ایک مصیبت سے دوسری مصیبت تک کا درمیانی فاصلہ سکونِ حیات کہلاتا ہے، اس لئے ذرا اطمینان سا ہوگیا ہے۔

لیکن اب کچھ دنوں سے خود کو دُنیا کا مقروض سا خیال کر رہا ہوں، اُس دُنیا کا جس نے مجھے کسی طرح بھی سہی یہ شعور دیا ہے کہ میں اپنے محسنوں، دوستوں اور ساتھیوں کا شکر گزار ہو سکوں۔

مگر ڈر رہا ہوں کہ ماضی کے خدوخال اُبھارتے اُبھارتے کہیں حال بدنما نہ ہو جائے مجھے کبھی کسی سے کوئی شکایت نہیں رہی، دُشمنوں کو بھی میں نے محبت اور تشکّر کا مستحق گردانا ہے کیونکہ اُنھوں نے بھی مجھے غفلت سے جگایا اور آنکھیں دی ہیں۔

میری عمر کی باؤلی[5] گہری ضرور ہے لیکن اندھیری نہیں، جب میں اس میں جھانکتا ہوں تو چاروں طرف طاقوں میں چراغ جل اُٹھتے ہیں اور سیڑھیاں اس قدر روشن ہو جاتی ہیں کہ درزیں تک نظر آنے لگتی ہیں۔ مجھے میرے ماضی نے اس قدر گُھندلا ہے کہ کہیں تو ہتھنیاں کھا کھا کر میرا بدن نیلا پڑ گیا اور کہیں چوٹ جگہیں اپنی سطح سے اُبھری کی اُبھری رہ گئی ہیں۔ مگر نظر میں تہ رسی آگئی۔

---

5 باولی:۔ زینہ دار کنواں

مَیں نے جب بھی اپنے ماضی کا دریچہ کھولا ہے میرے سامنے حادثات کے سینکڑوں آئینے جھپپانے لگے، یہی نہیں بلکہ میرے زخمی اور مدفون لمحے مسافت کی دھول سے گرد نیں اُٹھا اُٹھا کر مجھ سے مخاطب ہو گئے، اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ مجھے اپنی عمر کے محافظ خانے سے واقعات کی فائلیں اور حادثات کے محلِ وقوع کے نقشے تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آئے گی۔ کیونکہ میرے سامنے خلوص اور صداقت کی راہیں ہیں، تصنّع کی شعبدہ گاہیں نہیں۔

ہر چند کہ آپ بیتی لکھنا آسان کام نہیں اس کے لئے تندرست تصوّر، جیالا حافظہ اور تازہ دم قُوّتِ تخلیق درکار ہوتی ہے جو ہر شخص کا حِصّہ نہیں، آپ بیتی لکھنے والا انسان ناول نویس یا افسانہ نگار کی طرح ادب تخلیق نہیں کرتا بلکہ آن کے جادۂ فکر سے ہٹ کر گزری ہوئی صداقتوں کو عصرِ حاضر کے بالا بر[ے] میں اس طرح رفو کرتا ہے کہ سیون دکھائی نہیں دیتی۔

وہ ڈرامہ کی طرح بھی کردار تخلیق نہیں کرتا، بلکہ گذشتہ ماہ و سال کے قافلے سے شناسا کرداروں کو مرکز کی طرف موڑ کر لاتا ہے اور اپنی سادہ کاری سے موقع و محل کے مطابق نواگری سے ایک آہنگ کو جنم دیتا ہے، اس آہنگ میں جہاں تفصیل کے وسیع پشتانے ہوتے ہیں وہیں اکثر مقامات پر اجمال کے جلوے بھی پردہ نہیں کرتے۔

سوانح نگار کو اصل کردار اپنی صورتوں میں اس طرح پیش کرنا ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا بھی خود کو سوانح کا ایک کردار محسوس کرنے لگے، اور نازک سے نازک مقام پر سوانح نگار کے ساتھ چلنے کے علاوہ حالات و واقعات کی جانچ پرکھ کے ساتھ اسلوب بیان کے جنکشنوں پر حاضر مال کو آنکنے کا شعور بھی رکھتا ہو۔

بعض واقعات کو میں نے ماضی کے تہ خانے سے جھاڑ پونچھ کر نکالا اور وہ جھلکار بھی دینے لگے، مگر طوالت و ضخامت کے خیال سے شامل کتاب نہیں کیا،

ے بالا بر۔ شیروانی یا انگرکھے کا وہ دامن جو نیچے ہوتا ہے اور اس میں بند یا ہُک لگایا جاتا ہے

اگر ضرورت ہوئی تو دوسرے ایڈیشن یا دوسری جلد میں شامل کر دوں گا، اُن کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ بعض جگہ حالات کا توارد بھی ہوا ہے لیکن میں نے پروا نہیں کی۔

کئی حالات و واقعات ایسے ہیں کہ میری سخت جانی نے اُنھیں معمولی خیال کر کے نظر انداز کر دیا، لیکن وہ خود بخود غیر محسوس طور پر تصوّر اور حافظے سے اُتر کے کارگاہ تخلیق میں آ گئے! مجھے اپنے قارئین کی اُکتاہٹ کے خیال نے چونکا تو دیا لیکن میں نے اُنھیں قلم زد نہیں کیا،

مجھے احساس ہے کہ میں واقعات کی ترتیب میں بہکا ہوں، لیکن کہاں تک نہ بہکتا، میں نے جہاں اور جس نشیب سے سفر شروع کیا ہے وُہ ایسا تھا کہ علم و ادب کے قافلے اُس سے بہت آگے جا چکے تھے اور وہاں یہ تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کبھی ایسا وقت بھی آئے گا کہ مجھے اپنی آپ بیتی لکھنے کا ناگوار فرض ادا کرنا پڑے گا، یہی سبب ہے کہ آپ کو اس سوانح میں سنین نہیں ملیں گے، ویسے بھی مجھے ہندسہ، نام اور رستہ اچھی طرح یاد نہیں رہتا اور نہ کبھی یاد رکھنے کی کوشش کی ہے، علاوہ ازیں میری کتاب کوئی تاریخ کی کتاب نہیں یہ تو میرے غیر منظم اور مختصر واقعات کی یادداشتیں ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ میرے دھندلے دھندلے نقوشِ حیات ہیں اور اس خیال سے پیش کر رہا ہوں کہ شاید یہ کسی رُخ سے انسانیت کے لئے مفید ہوں اور بس!

میں اس کتاب میں دیدہ و دانستہ سیاست کے ایچ پیچ اور مذہب کے رموز و غوامض کی طرف بلند بانگ ہو کے نہیں آیا اور نہ خود کو اس کا اہل خیال کرتا ہوں میں تو صرف محبت کا بندہ ہوں اور خلوص کو انسانیت کا زیور گردانتا ہوں۔

مجھے جو کچھ دُنیا سے ملا ہے میں نے اُسے منافع سمیت واپس کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں کامیابی اور ناکامی کے متعلق میرے قارئین اور ناظرین فیصلہ کریں گے!!

بحمد اللہ نہ تو میں کہیں ملازم ہوں نہ مجھے کوئی سرکاری وظیفہ ملتا ہے، نہ کوئی خطاب ہے نہ سند اور نہ کوئی ایسی جائداد جو میرے کنبے کی کفالت کر سکے، لیکن وہ ذاتِ پاک جو ہر شے کو اس کی مختلف حالتوں میں ضرورتوں کے مطابق نشو و نما دے کر اُسے اپنی حدِّ کمال تک پہنچاتی ہے، اُسی نے مجھے بھی ماسوا اللہ کی پستی سے بچایا ہے، اور اسی کے فضل و کرم پر دار و مدار ہے! جہاں تک ظاہری اسباب کا تعلق ہے ایک خدا سلامت سی بات ہے کہ میرا قلم میری کفالت کر رہا ہے، ہر چند کہ میں ابھی تک افلاس کے اونچے نیچے ٹیلوں میں بھٹک رہا ہوں لیکن مایوسی کا سایہ تک مجھ پر نہیں پڑتا، شاید اس لئے کہ میں نے مشکل سے مشکل وقت میں بھی اپنی صداقت کو داغدار نہیں کیا اور میری پوری زندگی قرض کی ندامت سے پاک ہے، ہاں حافظے میں فاقوں کے بے شمار نشان دھندلی دھندلی صورت میں موجود ہیں جو مجھ پر شکر گزاری کا تقاضا کرتے رہتے ہیں، زمانہ ہو گیا کہ میں زمین پر سوتا ہوں اور ایک وقت کھانے کا عادی ہوں جو میرے افلاس کی مقدس یادگار ہے اور میں اس سے بے وفائی کو روا نہیں رکھتا۔

مجھے اپنے بچوں کی اصالت سے بھی مایوسی نہیں کیونکہ میں نے انھیں حلال روزی سے پالا ہے، لیکن خدا کے سوا کسی پر بھروسا کرنا اپنے دست و بازو کی توہین خیال کرتا ہوں۔ جس نے میری عزت کی، عمر بھر حفاظت کی ہے وہی میری ناتوانی کا بھرم بھی رکھے گا!!

میری زندگی کے کرداروں میں جو وفات پا چکے ہیں اُن کے لئے دعائے مغفرت اور جو زندہ ہیں اُن کے لئے تندرستی اور سلامتیٔ ایمان کی دعا میرا معمول ہے۔ ہاں بعض واقعات ؏ خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے،

میں نے بعض بعض مقامات پر کرداروں کے نام بدل دیئے ہیں کیونکہ میرے پیشِ نظر کسی کی دلآزاری نہیں بلکہ معاشرے کی حالت کا اظہار رہا ہے۔

جن حضرات[1] نے آراء و مقالات کی صورت میں میری حوصلہ افزائی کی ہے میں اُن کا شکر گزار ہوں ہر چند کہ تمام مطبوعہ تحریریں میری نظر سے نہیں گزریں اور مجھے اپنی کم خوانی کا اعتراف ہے لیکن میری رُوح اُن کی ممنون ہے۔

مجھ پر اُن عزیزوں[1] اور دوستوں کا شکریہ بھی واجب ہے جنھوں نے اس کتاب کو پڑھنے یا نقل کرنے میں میرا ہاتھ بٹایا ہے یا نوک پلک درست کرنے میں مشورہ دیا ہے۔ خُدا اُنھیں تندرست رکھے اور آبرو دے!

اِحسان دانش

---

[1] ڈاکٹر سد ھیشور ورما ڈاکٹر لوبیات سنسکرت جموں، ڈاکٹر سید محمد عبداللہ ڈی لٹ ڈاکٹر بشارت علی قریشی ایم اے پی ایچ ڈی۔ سید حامد ایم اے علیگ، پروفیسر ادریس احمد خاں۔ قدرت اللہ شہاب سیکرٹری تعلیمات پاکستان، ڈاکٹر عبادت بریلوی پرنسپل اورینٹل کالج، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، پروفیسر مشرف انصاری سید وقار عظیم صاحب ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر وحید قریشی ڈی لٹ، مدن لال من چندا، ڈاکٹر مبشر حسن صاحب وزیر خزانہ، آغا شورش کاشمیری، پروفیسر مولانا سعید احمد اکبر آبادی، شاہ معین الدین ندوی، عزیز احمد صاحب، جناب مجنوں گورکھپوری پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، سید سجاد علی مہر، جناب جوش ملیح آبادی، جناب فراق گورکھپوری، بشیر احمد صدیقی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی، مولانا تاجور نجیب آبادی مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا نیاز فتحپوری، پروفیسر احتشام حسین ہاملی، پروفیسر اعجاز حسین جناب عبدالمغنی خاں سنبھلی، پروفیسر غلام حسین اظہر، مولانا عبدالمالک آروی، پروفیسر خلیق انجم، جناب نادم سیتاپوری، جناب نوبہار حسین خاں لکھنوی، ضیاء السلام ضیا (علیگ کاندھلوی)، جناب رفیق خاور، جناب ضیاء الاسلام پی سی ایس۔ جناب سجاد باقر رضوی علامہ ارشد، راحت مولائی (علیگ) مراد آبادی، جناب انتظار حسین، جناب ہوش ترمذی، جناب اشفاق احمد، جناب عاصی کرنالی استاد اردو، جناب خلیق قریشی، جناب غلام حسن کسریٰ، جناب ظفر ادیب، محمد احمد وکیل کراچی، جناب سیف زلفی جناب طاہر سردھنوی، جناب شریف فاروق، مولانا ظہیر الحسن کاندھلوی، جناب سلیم تماہانی، جناب شبیر احمد خاموش، جناب مختار حبیب، مولانا برہانی حسنی گنگوہی، حزیں صدیقی، جناب وحشت بھاری، جناب عاشق عمران عباسی، جناب اثر جلیلی، مسیح الحسن بقا نقوی، ابو سلیمان شاہجہانپوری اختر صدیقی وغیرہ[2] سے جناب پیام شاہجہانپوری، ڈاکٹر قمر میرٹھی، جناب عبدالغفار ایم اے اخلاق احمد اخلاق، سید اقبال حسین زیدی، جناب حسرت بہاری، جناب مختار عباس، جناب شکیل شاہد، جناب نذیر نقش وحید خیال مظفر حسین ادیب اور جعفر نسب اسی صف میں ہیں آخر میں جناب منظور الحق صدیقی اور محمد رشید کاندھلوی بھی ایسے لوگ ہیں جنھوں نے بعض پہلوؤں پر رائے دی اور نوک پلک درست کی ہے خُدا اُنھیں تندرست رکھے! آمین۔

---

[2] میرے حالات اور شاعری کے متعلق پروفیسر ادریس احمد خاں نے سجاد حارث کے نام سے ایک کتاب "عوامی شاعر اور اس کا فن" لکھی ہے جو اہلِ ادب کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ میری شاعری پر وہ سب سے پہلی کتاب ہے۔

کام رُکنے کا نہیں اَے دلِ ناداں کوئی
خود بخود غیب سے ہو جائے گا ساماں کوئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وطن

"کاندھلہ"، ضلع مظفر نگر یو۔پی میں شاہدرہ، سہارنپور ریلوے پر ایک بارونق قصبہ ہے جس کے مشرق میں نہر جمن شرقی اور اس کے کنارے کنارے باغوں اور کوٹھیوں کا پرفضا منظر ہے۔ اگرچہ قصبے کے چاروں طرف گنجان باغوں کے بڑے بڑے قطعات چل کر محلوں تک آگئے ہیں لیکن یہ نہر کے گل بار کناروں کا منظر ہر وقت رہٹ چلنے کے باعث گردو نواح کے دوسرے مناظر سے نسبتاً شاداب اور روح افزا رہتا ہے۔ مگر شام ہوتے جب آسمان کی نیلی آنکھوں میں سرسوں پھولنے لگتی ہے اُس وقت یہ قطعہ اور بھی تیکھا ہو جاتا ہے۔

میرے محلّے "مولانان" سے تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر جنوب میں شاہی وقتوں کا ایک پختہ تالاب ہے جس کے مشرقی کنارے پر پرانی اور مختصر سی مسجد، مغرب میں نہانے کا زینے دار گھاٹ، شمال میں ایک عالیشان مندر اور پجاریوں کے رہنے کے لئے دو منزلہ عمارت ہے جنوب میں مویشیوں کے پانی پینے کے لئے کچا اور ڈھلوان گھاٹ، اور اس گئو گھاٹ کی پشت پر دور تک ٹیلے کے پیچھے سرسبز میدان چلا گیا ہے۔ تالاب کے شمالی زینے کی طرف جدھر دیوار کے قدموں پر پاکھن کا سایہ اور پیپل کی چھاؤں فقیروں کی پھٹی پرانی گدڑی کی طرح پھیلی رہتی ہے۔ دسیوں بیسیوں مینڈک اور کچھوے پانی کی طرف پیٹھ کئے سیڑھیوں کی کائی پر ٹھوڑیاں ٹیکے اس طرح منہ چلاتے رہتے ہیں جیسے ان کے گلے میں کوئی لیسدار مواد

اٹک رہا ہے، ذرا دُور میدانی کھیتوں کی کور سے ہی بیدوالا باغ شروع ہو جاتا ہے تالاب
پر جب شام کو پاکھن کی گھنی شاخوں میں چڑیاں چہچہاتیں تو مجھے پھریریاں آنے لگتیں۔ نہ جانے
چڑیوں میں اور مجھ میں کونسی قدر مشترک تھی۔ مندر میں سنکھ بجتا اور گھنٹیاں ٹنٹناتیں تو شہر سے
سینکڑوں ہندو دیویاں پھول پان لئے مندر میں آجاتیں اور فضا میں "اوم جے جگدیش
ہرے" کی آرتی کا نغمہ لہلہانے لگتا۔ جب مورتیوں پر پھول چڑھائے جاتے تو مجھے ایک
بے نام سی حیرت ہوتی کیونکہ مورتیوں کے جبر و اختیار میرے سامنے تھے۔ ہمارے دروازے
کے سامنے والے گھر میں بھگتن سنگ ساز رہتا تھا اور اس کے یہاں روز اس قسم کے ٹوٹے
پھوٹے اصنام آتے رہتے تھے۔ مگر آج کی طرح مجھے شعور و احساس کی دولت نصیب
نہ تھی اس لئے یہ مشاہدہ ذہن سے پانی کی بوند کی طرح ڈھلک جاتا یا خشک ہو جاتا۔ جب
میں تالاب کی طرف کھلی ہوئی کھڑکی میں بیٹھ کر پانی میں تیرتی ہوئی مچھلیوں کو بگلوں اور تقلقوں
کی خوراک بنتے دیکھتا تو خیال ہوتا کہ سفید پوش بگلوں اور رنگین لباس تقلقوں کی زندگی ان بے قصور
مچھلیوں کے شکار پر کیوں ہے؟ مگر یہ خیال دیرپا نہ ہوتا۔ مجھے اس تالاب، مندر، مسجد اور
گرد و نواح کے تنہا مناظر سے نہ جانے کیوں محبت سی تھی۔ میری تنہائی کی صبح ہو یا شام،
ٹنار دوپہر[۱] ہو یا چاندنی اسی معصوم مقام پر آکے دم لیتی، حالانکہ بعض بعض اوقات جب برسات
ہوتی تو راستے میں کوڑے کرکٹ کے ڈھیر اسقدر متعفن ہو جاتے کہ تھوڑی دیر کے لئے تو
حواس ہی ٹھکانے نہ رہتے لیکن جب راستوں کی کھاد کھیتوں میں پہنچ جاتی اُس وقت بستی
سے تالاب تک راستہ نہایت صاف اور خوش رُو ہو جاتا۔ کاندھلہ کی آبادی سے ریلوے
اسٹیشن صرف ایک میل کے فاصلے پر ہے رات کو ریل گاڑی کی آواز اس طرح آتی ہے جیسے
زمین دردِ زہ میں مبتلا ہے۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ جب گرمیوں میں بارش ہوتی تو مندر کی عمارت سے بوندوں
میں آبادی کا منظر ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نہایت حسین سینری پر شیشے کی چق ہوا سے

---

[۱] ٹنار دوپہر: بھری دوپہر، شکر دوپہر۔

ہل رہی ہو جب بارش ہوکر تھمتی اور پونڈوں کے دھوئیں سے برگد کے درخت دُھل کر نکلتے تو جوہڑ کے کنارے والے پڑاوے[1] کی پیشانی پر بھی خون دوڑنے لگتا اور ٹھیکریوں کے نکیلے ٹکڑے ہزاروں شانتیں بنا دیتے دُوسرے کنارے پر اِس سیم فام تختے کے حاشیے پر دُھان کے ہرے کھیت مسکرانے لگتے۔ پگڈنڈیاں اِن ذی رُوح اور تازہ دَم کھیتوں میں ایسی معلوم ہوتیں جیسے مخمل کے سبز شلوکوں سے فطرت کی لوچ دار باہیں نکل کر دامنوں تک پہنچ رہی ہوں، جب تالاب پر مندر کے احاطے میں جھُولے پڑتے اور قصبے کی ہندو لڑکیاں پینگیں لیتیں۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا جیسے ہواؤں کے پاؤں میں جھانجھنیں پہنا دی گئی ہوں کہیں پپیہیاں پِک رہی ہیں کہیں چاٹ والوں کی آوازیں گونج رہی ہیں۔ بچّوں کے بھولے بھالے چہرے دل کو سرور اور آنکھوں کو نُور دینے لگتے تھے جب موسمی گیتوں کی تانیں اور برساتی کجریاں[2] اپنا جادو ڈالتیں، تو نَس نَس میں ٹھنڈی ٹھنڈی گدگدیاں تیرتی معلوم ہونے لگتیں، تاریک رات میں جب ہوائی جہاز گزرتا تو اندھیرے کی فضائی جھیل میں شرابیوں کی مُنہ زور رحلیں دانا دلتی معلوم ہوتیں۔

آبادی اور تالاب کا یہ محبوب منظر باغ سے اِس قدر قریب تھا کہ جب آموں کا موسم جنم لیتا تو بُور کی خوشبو اور کوئلوں کی کُوک آبادی میں مندروں کے کلس اور مکانوں کی اٹاریاں چُومتی پھرنے لگتیں اور رات کی خاموشی میں رکھوالوں کی آواز قصبے کی گلیوں تک مار کرتی۔ برسات میں جب رات کو آسمان کا حاشیہ تک گھٹاؤں کے لبادے سے سیاہ اور بھیانک ہو جاتا اور مینڈکوں کا شور کالی ہواؤں کے بچھروں پر سوار گلی گلی میں بہنے لگتا، نہ جانے کیوں اُس وقت میرے دل میں ایک اجنبی سا غم سانسیں لینے لگتا اور جگنوؤں کی لچکتی ہوئی کرنیں میرے خون میں تیرنے لگتیں۔ سیّد والے باغ کے دوش بدوش

---

[1] بھٹّے کی پرانی صورت جسے پجاوا بھی کہتے ہیں۔ میرے بعد ترقّی پسند اور اقتصادی نسل کے لوگوں نے اِسے میدان بنا کر اسی میں کیکروں اور پاپلروں کے درخت لگا دئے تھے اب قیامِ پاکستان کے بعد نہ جانے کیا ہوا ہوگا [2] کجریاں، برساتی گیت۔

قصبہ کے ایک رئیس لالہ بُدھ سنگھ نے بھی ایک باغ لگایا تھا جو اس قصبے میں اپنی نظیر خود تھا۔
لالہ بُدھ سنگھ ایک شریف پڑھے لکھے اور مغربی تعلیم کے باوصف مشرقی تہذیب کے انسان تھے۔ وُہ غالباً تاجرانہ ذہنیت سے دُور رہ کر شوق اور روحانی تقاضے کے تحت اپنے باغ کی زینت اور دیکھ بھال میں مصروف رہتے۔ صرف میرے والد ہی نے نہیں خود مَیں نے بھی اُس باغ کی بنیادوں میں کام کیا ہے۔ پیسے کے معاملے میں کوئی مزدور کبھی لالہ بُدھ سنگھ سے دل برداشتہ نہیں ہُوا۔ اُن کے اخلاقی نقوش ابھی میرے دل میں درخشاں ہیں اور رہیں گے۔ لالہ بدھ سنگھ تو سرگباش ہو چکے مگر ان کی جگہ ان کا لڑکا آنند سروپ ان کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے اسے دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ شرافت و اخلاق وراثت میں بھی ممکن ہے۔

کاندھلے میں متعدد شاعر بھی تھے اور جیّد جیّد مولوی بھی۔ انگریزی کے فارغ التحصیل بھی اور اصول و عقیدہ سے انگریزی کو گناہ خیال کرنے والے صاحبِ نظر بھی، نیز پُرانے فیشن کے وُہ علما بھی جن کی علمیّت کے باعث بڑی بڑی درسگاہیں اور دُنیا بھر کے دارالعلوم "کاندھلہ" کا نام عزّت سے لیتے ہیں جیسے روشن ضمیر شاعر[1] نے مثنوی مولانائے رُومؒ کا ساتواں دفتر لکھا ہے۔ وہ بھی اِسی قصبے کی خاک سے اُٹھا تھا اور تبلیغی جماعت کے بانی مولوی محمدؒ الیاس صاحب رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے صاحبزادے مولوی محمد یوسفؒ بھی اسی مٹّی کے خمیر سے تھے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

اس گئے گزُرے زمانے میں بھی علم و فضل کے اعتبار سے یہاں کے مشاہیر[2] نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔ ان کے بعد کے لوگوں[3] میں بھی ترقّی کے جذبات اُجاگر ہیں اور اس حد

---

[1] مفتی الٰہی بخش صاحب نشاطؔ مرحوم خاتم مثنوی مولانائے رُومؒ۔

[2] مفتی الٰہی بخش صاحب نشاطؔ، حاجی کمال الدین صاحب، مولوی محمود بخش صاحب، مولوی امام الدین صاحب، مولوی حکیم محمد اشرف صاحب اشرفؔ، حاجی محمد صابر صاحب۔ مولوی مظفر حسین صاحب، مولوی ابوالحسن صاحب، مولوی نورالحسن صاحب، مولوی حاجی محمد ضیاء الحسن صاحب، حکیم مولوی ظہورالحسن صاحب، محمد ابراہیم صاحب، مولوی عزیز الحسن صاحب عزیزؔ، مولوی افتخار الحسن صاحب، حاجی مولوی

(باقی حاشیہ صفحہ ۲۱ پر)

تک کہ اگر یہ اپنی قابلیتوں اور قوتوں کا استعمال جانیں تو قصبہ پھر اُنہیں بلندیوں پر پہنچ سکتا ہے جہاں اس کے رفتگانی نقوش تاریخی دریچوں سے آواز دے رہے ہیں لیکن یہاں تو فرداً فرداً ہر شخص اپنے ذاتی مقاصد میں اس طرح رُندھا ہوا ہے کہ اجتماعیت کی اہمیت کا تصوّر تک معدوم ہو چکا ہے یہی وجہ ہے کہ آئے دن لڑائی جھگڑے اور خانہ جنگیاں برپا ہیں۔ اکثر ذہنیتیں ایسی گمراہ ہوتی ہیں کہ اُن کی نظر میں ہر بلندی ذلیل اور ہر پستی محترم ہے۔ جو دو چار آدمی مخلصانہ طور پر ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں اُنہیں دروغ باف، ریاکار اور خود کام کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ غرضیکہ یہاں نہ نیکی نیکی ہے نہ بدی بدی۔ ایک خانہ بدوشوں کا قافلہ ہے کہ کبھی ڈھولک اور ہارمونیم کی بھنگم آوازیں ہیں، اور کبھی کتّوں کی نسلوں کی جانچ پڑتال پر تنازعے رہتے ہیں۔

اب مجھے یہ سُن کر مسرت ہوئی کہ قصبہ رُو بہ اصلاح ہے اور ایسا کہ دو کالج چل رہے

محمدؐ ابوبکر صاحب، مولوی محمد سلیمان صاحب، حکیم حاجی محمد مشرّف صاحب، حاجی محمد اسمٰعیل صاحب، مولوی محمدؐ صاحب، متولّی محمد اسمٰعیل صاحب، منشی دوست علی صاحب، مولوی محمدؐ صدیق صاحب۔ قاضی شیخ محمدؐ صاحب رسؔوا، قاضی محمد زکی صاحب زکیؔ، مولوی محمد اسمٰعیل صاحب، مولوی محمد الیاس صاحب (بانی تبلیغی جماعت) مولوی محمد یُوسف صاحب، متولّی ریاض الاسلام صاحب، متولّی ضیاءالاسلام صاحب ضیاؔ، حافظ سید محمد مصطفےٰ صاحب، مولوی محمد محسن صاحب، شیخ محمدؐ صدیق صاحب قریشی، مولوی شمس الحسن صاحب، مولوی ظہیر الحسن صاحب، مولوی منظر الحق صاحب، مولوی رؤف الحسن صاحب، مولوی محمد موسیٰ صاحب، حکیم قمر الحسن صاحب، محمد رشید ذوقیؔ، حافظ اللہ بندہ بندہؔ، حافظ محمد عثمان صاحب، چودھری اصغر جنگ صاحب۔ ؁ مولانا محمد یحیٰی صاحب۔ مولوی محمد زکریا صاحب، مولوی محمد ادریس صاحب، مولوی محمد میاں صاحب، حکیم محمد عمر صاحب، مولوی محمد علی صاحب، مولوی محمد مالک صاحب، مولوی اظہار الحسن صاحب، مولوی محمد نعمان صاحب، حکیم شفیق الرحمٰن صاحب شفاؔ۔ مولوی افتخار الحسن صاحب، محمد رفیق قریشی صاحب، چوہدری شفقت جنگ صاحب، محمد سعید قریشی صاحب، حکیم محمود جنگ صاحب۔ شیخ محمد رشید صاحب۔ اجتبا الحسن صاحب، مولوی محمد داؤد صاحب ایڈووکیٹ، مولوی محمد زبیر صاحب، مولوی احتشام الحسن صاحب،

نوٹ:- مولوی احتشام الحسن صاحب نے تذکرۂ مشائخ کاندھلہ میں کئی ناقابلِ فراموش شخصیتوں کو نظر انداز کر دیا ہے جو میری اس فہرست میں موجود ہیں۔

ہیں مگر علمی لحاظ سے تو پہلے بھی یہاں کم درجہ کے لوگ نہیں تھے سوال تو علم کے استعمال اور تمدّن و معاشرت میں ترقی کے علاوہ آزادی اور غلامی کا ہے جس کی طرف بہت کم لوگ توجہ دیتے ہیں۔ غریب بیچارے تو سرمایہ داری کی ہر گرفت کو آسمانی سمجھ کر خاموش رہتے ہیں۔ کیونکہ پیشوایانِ مذہب اور سیاسی رہنماؤں نے انھیں ابھی تک زندگی کے صحیح اصولوں کے متعلّق کچھ بتایا ہی نہیں۔ رہے اوچھے حاکم اور سنگدل سرمایہ دار، یہ دونوں تو ہمیشہ رحم اور انصاف کی خصوصیات سے علیحدہ رہے ہیں۔ وہ تو ایسے مُردے ہیں جو خود اپنے تابوت اُٹھائے پھرتے ہیں اور رونے ہنسنے کی سکت رکھتے ہیں۔ انہیں غیرت، وفا، اور ہمدردی جیسے ناموں سے متعارف ہونے یا سیاست کا منشا و مفہوم سمجھنے کی کیا پڑی ہے؟

کاندھلہ اور اس کے اِرد گِرد کی زمین بھی مردم خیز ہے نواحی قصبات[۱] کی ناہموار آبادیوں سے سینکڑوں علم وفضل کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ مگر افلاس کی ریتی اور مصائب کے ملبوں میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ جب کہیں کہیں اُنہیں ذرا آسائش ملتی ہے تو وہ اپنے ماحول کی چٹانوں سے سفر کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ وہیں پھیل کر اتھاہ جھیلوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں ان میں بعض تو اس قدر گہرے ہو جاتے ہیں کہ ان کے شفّاف سینے آسمان کے روشن ستاروں، سرسبز کناروں اور گرد و پیش کے اجنبی مناظر کا عکس بھی نہیں لے سکتے۔

بہت ہی کم ایسے لوگ ہیں جن کی سیرتوں کے آبشار سفر کے فرائض سے گزر کر دریاؤں سے ہم کنار ہوتے ہیں اس کے باوجود اس زمین سے جگہ جگہ تند اور شفّاف جھرنوں کا نکاس ضرور ہے اور بلندیوں پر روحانی شفق پھوٹتی ہے ان کے مرکزی سمندر انھیں پکارتے بھی رہتے ہیں اور بعض وقت ان کی طرف چل بھی پڑتے ہیں۔

---

[۱] قصبہ جھنجھانہ، کیرانہ، مظفر نگر، تھانہ بھون، پھلت، بوڑھانہ، نانوتہ وغیرہ

کاندھلے کے علماء و فضلاء کی تصانیف اور کارنامے اس کے شاہد ہیں کہ کاندھلے میں خود فروش عالم اور قوم فروش لیڈر پیدا نہیں ہوتے۔ کاندھلے کے علماء کے خون سے غدر[1] میں سینکڑوں پھانسیوں کے تختے رنگے گئے ہیں اور اب تک کاندھلے کے لوگوں میں خلوص اور جاں نثاری اسی طرح شاداب و شگفتہ ہے۔ علماء سے قطع نظر کاندھلے کے بڑے آدمیوں میں جہاں، مولوی ظہیر الحسن، شیخ محمد صدیق، امجد بیگ اور مرزا اسمٰعیل بیگ کا نام لیا جاتا تھا وہیں چودھری عبدل جنگ کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا۔ چودھری صاحب لمبے تڑنگے، وجیہ اور باغ و بہار قسم کے انسان تھے، ابراہیم علیخان ستار نواز جو اپنے فن میں اُستادِ کامل تھا اُن کے یہاں مہینوں مہمان رہتا۔ قصبے کے خوش الحان نوجوان اس کے گرد گھیرے رہتے اور وہ ہر شخص کے ساتھ اس کی مشق و مزاولت کو دیکھ کر استادوں والے مشورے دیتا۔

چودھری عبدل جنگ کی بیٹھک کے سامنے سڑک کے پار پاکھن کے نیچے مرغوں اور تیتروں کی پالیاں لگتیں اور استادانِ فن اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے۔ مرغ اور تیتر استادوں کے اشاروں پہ لڑتے اور وہ وہ بڑھاوے سننے میں آتے کہ رہے نام اللہ کا۔

چودھری صاحب کو جہاں مرغوں اور تیتروں کا شوق تھا وہیں انہوں نے بیٹھک کی چھت پر کبوتر بھی پالے ہوئے تھے، اُن کے کبوتروں پر شہر بھر کے کبوتر بازوں کو رشک تھا۔ کئی کبوتر تو جوں صبح سے اڑتے شام کی خبر لاتے اور روشنی کر کر کے اُتارے جاتے۔ جو بہت گھرنے جاتے ان میں سے بعض ڈوب جاتے اور بعض بہہ کر کسی دوسرے گاؤں میں جا گھرتے اور چودھری صاحب ان کی تلاش کے لئے آدمی بھیجتے اور یہ تھانگی[2] دس دس بیس بیس میل سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ہر قیمت پر کبوتر حاصل کرتے۔

شہر میں کوئی بھی جلسہ، جلوس اور قصبے کی بہبود کا ہنگامہ چودھری صاحب کے

---

[1] ۱۸۵۷ء میں پہلی سعیِ آزادی تھی جسے انگریز اور اس کے زر خرید غلاموں نے غدر کا نام دے دیا۔
[2] تھانگی۔ کھوجی۔ سراغ رساں

بغیر ممکن نہ سمجھا جاتا ، وہ جہاں کارپوریشن کے لئے عیر شہر منتخب ہوتے وہیں اُلجھے ہوئے قضیئے اور تاجروں کے لین دین میں بھی ثالث قرار پاتے تھے ۔

آبائی ماحول

میرے والدِ ماجد قاضی دانش علی کا وطن قصبہ "باغپت" (ضلع میرٹھ) تھا۔ یہ دریائے جمنا پر لبِ ساحل آباد ہے۔ اگرچہ قضا ہمارا جدی طرۂ امتیاز تھا لیکن میرے والد کا تعلیم میں خام رہ جانا بتاتا ہے کہ خاندانی طور پر تو پشتوں سے یہ انحطاط شروع ہو چکا تھا۔ جس کا شباب مجھے نصیب ہوا۔

سنا جاتا ہے کہ میرے والد کے پاس اچھی خاصی جائداد تھی لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں گئی اور کیونکہ گئی ؟ میں نے والد صاحب سے کئی بار دریافت کیا۔ انہوں نے صرف یہ کہا کہ تھوڑی سی جائیداد کی کھرچن تھی جو بے بروائی سے آتی جاتی رہی ۔ میرے ایک بزرگ نظام الحق صاحب جو ریاست سرونج میں ناظم تھے کبھی کبھی منی آرڈر بھیجتے اور لکھتے کہ یہ روپیہ زمین کے حساب میں ہے ۔ نہ جانے وہ زمین انھیں والد صاحب نے کن شرائط پر دی تھی ۔ غالباً والد صاحب نے انھیں اپنی زمین کا مختار نامہ لکھ دیا ہوگا اور کچھ رقم ماہانہ کے حساب سے ٹھہرالی ہوگی ۔ وہی رقم منی آرڈر کی صورت میں وصول ہوتی ہوگی اور کاغذات بھی انہی کے پاس ہوں گے ۔ میرے پاس اس کا کوئی کاغذی ثبوت نہیں ۔ ہاں والد صاحب کبھی کبھی کچھ خسرہ یا کھتونی قسم کی چیز دکھایا کرتے تھے لیکن مجھے اس وقت اس کا اور اس کی اہمیّت کا علم نہیں تھا ۔

مَیں قصبہ کاندھلہ (ضلع مظفر نگر) میں پیدا ہوا اور وہیں اپنے نانا ابو علی شاہ کے یہاں پرورش پائی جو ایک غریب سپاہی تھے ۔ اُن کے انتقال پر میرے والد باغپت سے سکونت ترک کر کے کاندھلے آگئے ممکن ہے اُس وقت بھی کچھ بچا کھچا سرمایہ ان کے پاس ہو لیکن جب مَیں نے ہوش سنبھالا وہ نہر جمن شرقی میں کھدائی کرانے والے ٹھیکیداروں کے یہاں مزدوروں کے جماعت دار تھے اور جب جماعت داری نہ ملتی تو خود ٹوکری پھاوڑے

سے روزی کماتے اور گھر کا گزارا کرتے۔

قرائن اور ماحول سے پتہ چلتا ہے کہ میرے نانا جان بھی بمشکل اپنے خاندان کا گزارا کرتے ہوں گے کیونکہ جس مکان میں میں نے ہوش سنبھالا، تھا تو شاہانہ طرز و طریق کا، لیکن اس قدر کہنہ اور بوسیدہ کہ جس بالائی حصے میں ہم رہتے تھے آئے دن چھت پر سانپ رینگتے دکھائی دیا کرتے۔ گھر میں کوئی لکڑی لوہے یا جست کا بکس نہ تھا۔ نئے اور دُھلے ہوئے کپڑے ایک مٹکے میں بھرے رہتے اور عید تہوار کو میری والدہ وہی مَلے دَلے کپڑے سلوٹیں کھول کھول کر مجھے پہنایا کرتیں۔ ہر برسات میں مکان کا ایک نہ ایک حصّہ یا تو گر جاتا یا گرنے کے قابل ہو جاتا۔ مگر چونکہ مکان نہیں حویلی تھی اس لئے رہنے میں کوئی دِقّت نہ ہوتی پھر نانا صاحب نے ازراہِ ہمدردی کبھی کچھ عزیزوں کو آباد کر لیا تھا۔ جو اب رفتہ رفتہ ماحول کو نرم پا کر ساری حویلی پر قابض ہو گئے تھے۔ اور اس سے ہماری زندگی اجیرن ہوتی جا رہی تھی۔ انتہا یہ ہوئی کہ ہمارے پاس ایک بوسیدہ سا کمرہ رہ گیا۔ جس کے آگے ایک مختصر سی چھت کا کمزور اور لچکیلا صحن اور صحن کے آخری حصّے کے آثار پر تھوڑی سی جگہ تھی جس کے چاروں طرف میرے والد نے خود قدِ آدم چار دیواری اُٹھائی تھی نہ باورچی خانہ نہ غسلخانہ نہ کوئی محفوظ کمرہ نہ محفوظ زندگی جب کبھی زور کی ہوا یا آندھی چلتی تو ہمارے گھر کا چراغ ہونٹ چاٹ چاٹ کر رہ جاتا۔ جھونکے اور جھکّڑ اس گھروندے کو روشن نہ دیکھ سکتے اور ہماری تمام رات بے خوابی و تاریکی میں بیت جاتی۔

اصل میں اعزا و اقربا میرے نانا کی سادہ خاطری اور شرافت سے فائدہ اُٹھاتے رہتے تھے۔ لیکن فطرت تا بہ کے یہ ظلم خاموشی سے دیکھتی۔ ایک ایک کر کے رفتہ رفتہ نیچے کی منزل کے لوگ مکان خالی کر گئے۔ کسی نے اپنا نیا مکان بنا لیا، کوئی ترکِ وطن کر کے باہر چلا گیا اور کچھ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حویلی میں صرف دو تین گھر آباد رہ گئے اور وہ بھی معاشی بدحالی میں دم توڑ رہے تھے۔ اس حویلی کے چاروں طرف ہندو آباد تھے۔ میرے والد

نوناروں کی چھاؤں میں ہی مسجد کو چلے جاتے لیکن میری والدہ مجھے کبھی سویرے نہ جگاتیں۔ کیونکہ ہمارے مکان کی اونچائی سے نیچے کے کوٹھوں کی تمام سوئی ہوئی مخلوق بے پردہ نظر آتی تھی اور اس وقت کا ہندو معاشرہ رات کے پردے کو روا نہیں رکھتا تھا۔ گرمیوں میں جب کبھی سویرے سویرے ہواؤں پہ بادلوں کا باردانہ بنجاروں کے ڈیروں کی طرح لد کر آسمان سے بوندیاں برساتا گزرتا یا جھنجھلاتی ہوئی تیز ہوا بادلوں کی میلی روئی کو بجلی کی سنہری دُھنکی سے پیننے لگتی تو کوٹھوں کی چارپائیوں پر چاروں طرف ہندو عورتوں کے ننگے جسم دُور سے یوں معلوم ہوتے جیسے صندلی بادلوں اور تاریک دھندلکوں کے لکّے کلبلا رہے ہوں بعض اوقات تو کئی کاہل اجسام تیز بوندوں میں بھی نیندوں کے نشے سے نہ نکلتے اور سوتے رہتے۔

چونکہ مزدوری مستقل اور مسلسل چیز نہیں ہوتی اس لئے جب ٹھیکیدار کا کام ختم ہو جاتا اور والد صاحب کو جماعت داری کی بجائے خود مزدوری کرنے کی نوبت آجاتی تو گزارا مشکل ہو جاتا اس معاشی خلاء کو پُر کرنے کے لئے میری والدہ محلّے سے سینے کے لئے کپڑے اور پیسنے کے لئے اناج منگا لیا کرتیں۔ ادھر دن بھر کپڑے سینا اُدھر صبح کے چار بجے سے چکّی کی جانگداز مشقّت ان کا معمول سا ہو گیا تھا۔ میری چارپائی کے سرہانے ہی والدہ کی چکّی تھی۔ اس لئے برسوں میرا بے خبر لڑکپن ٹمٹماتے دیئے کی نیم جان روشنی میں سو کر چکّی کی گھوریں بیدار ہوتا رہا۔ ساون میں برسات کے بے رحم بادل پھونس کے شگافوں سے ہماری کوشش کے باوجود ہمارے بچھونے بھگو دیا کرتے بعض اوقات تو میری والدہ کو تمام تمام رات پانی اُلیچتے گزر جاتی۔ کہیں چھت ٹپکتی تو کہیں بار بار کو چھاٹ ٹٹّی کا پھونس ہٹا کر چھڑ کاؤ کر جاتی، اگر بدقسمتی سے کبھی لمبی جھڑی لگ جاتی تو ٹپکنے کے علاوہ مکان بیٹھ جانے کا خیال اور بھی خون سُکھاتا رہتا۔ اس عالم میں تیز ہوا کے ظالم جھونکے دروازے کے قریب گھڑونچی پہ ترچھے رکھّے ہوئے گھڑوں میں بھیانک آوازیں

پیدا کر دیتے جیسے زلزلے کی گونج۔

اسی ماحول میں میری کمسنی نے والدہ سے سوتک گنتی یاد کی جب سالن نہ پکتا تو والدہ مجھے پانی میں بھگو کر روٹی کھلاتیں اور ساتھ ہی خود بھی کھاتیں۔ اگر قسمت سے ذرا ظہور سی لال شکر ہوتی تو پہلے ہی سے مجھے للچایا جاتا، کہ آج تو ہم سب شربت سے روٹی کھائینگے اور کھانے کے وقت تک اتنا اشتیاق بڑھا دیا جاتا کہ وہ روکھی سوکھی روٹی مزہ دے جاتی۔ جب شکر میسّر نہ آتی تو اسی طرح نمک کے سادہ پانی کا استعمال بھی روا تھا۔ اگرچہ مجھے کھانا کھلاتے وقت وہ بڑی ہنسی خوشی کی باتیں کرتیں مگر ان کے کڑھنے کا اندازہ اُس وقت ہوتا جب کھانے کے بعد کہیں سے سلائی یا پسائی کے پیسے آجاتے اُس وقت وہ بڑی طرح تلملاتیں اور کہتیں کہ "بہن اگر ذرا سی دیر پہلے آجائیں تو کیا ہو جاتا؟ میرے بچّے نے تو نمک کے پانی سے روٹی کھائی ہے۔"

ایک حادثہ ہمیں کاندھلے سے نہایت دھوم دھڑکے سے جانے والی ایک برات میں جانا تھا جس میں والد۔ والدہ اور میری بہن کی شرکت بھی لازم تھی۔ چنانچہ نرم دوپہر کے قریب ایک دقیانوسی فیشن کی بیل گاڑی دہلیز کے سامنے آکے رُک گئی اور گاڑی والے نے تقاضا شروع کر دیا کہ تیار ہو جاؤ کچا راستہ ہے، والد کے شدید تقاضے پر میری والدہ اور ہمشیرہ نے اپنے میلے اور شکن آلود برقعے اوڑھے اور میرا ہاتھ پکڑے آکر گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ گاڑی قصبہ سے باہر گئی تو میں نے دیکھا کہ اور بھی گاڑیاں ہیں اور ہماری گاڑی سب سے پیچھے ہے۔ راستہ اطمینان سے طے ہو رہا تھا۔ کہیں کہیں اکا دکا آدمی بھی نظر آجاتا تھا۔ دوپہر کی تپتی ہوئی فضائیں لمبے لمبے سانس لے رہی تھیں۔ کچّے راستے کی باریک اور پیاسی مٹی میں بیلوں کی ایک ایک ٹانگیں ڈوبی ہوئی تھیں اور گاڑیبان، ٹٹکاریاں دیتا اور آر سے بیلوں کے پٹھے لہولہان کرتا برابر ہانکتا چلا جا رہا تھا۔ اڑتی ہوئی مٹی کی زرد چھاؤں میں سے کبھی تو گاڑی بانوں

کی یہ آواز آتی " چلو شاباش " اونچا گاؤںᐤ آگیا ۔ اور کبھی کبھی بیلوں کی پیٹھ پر ہاتھ لگنے کی آواز سے جنگل کی خاموشی میں درز سی کھل جاتی ورنہ کھُسر کھُسر ریت میں پہیوں کی آواز کے سوا جنگل پر سکوتِ مرگ طاری تھا ۔ خدا خدا کر کے دھوپ ذرا سی اُتری ۔ سر پھرے سورج کی تپتی ہوئی سنگینیں ٹھنڈی پڑنے لگیں ۔ لوؤں کی نیم مُردہ تپش معتدل جھونکوں میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی ۔ ہماری گاڑی کے جھونگے بیل گاڑی کو سرعت اور اطمینان سے کھینچے چلے جا رہے تھے ۔ مَیں نے والدہ سے کہا کہ مَیں تو اسباب کے چھکڑے پر بیٹھوں گا جو ہماری گاڑی کے پیچھے آ رہا ہے ۔ والدہ نے تو منع کیا کہ دونوں وقت مل رہے ہیں مَیں تجھے اکیلا نہیں چھوڑوں گی لیکن والد نے یہ کہہ کر " کیا ہرج ہے ؟ ہوشیار رہے گرے گا نہیں ۔" چھکڑا رکوا کے مجھے اُوپر بٹھا دیا ۔ تھوڑی دیر میں سڑک کے دو رویہ درختوں کے سائے بڑھ بڑھ کر ملنے لگے ، مغرب کی طرف شفق کے پردوں پر نارنجی لہریں اُبل پڑیں ۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان کا مغربی صحن ماتمیوں کے سینوں کی طرح سرخ ہو گیا ۔

اور تعزیے کی طرح سورج کی سنہری محراب اُفق کی کور سے جا لگی ، سامنے کے جنگل کا ہر اونچا درخت کالے علم کی طرح لہرا رہا تھا ۔ مَیں اس منظر سے بڑا متاثر تھا ۔ غبار سے اَٹے ہوئے چرواہے چھکڑے کے ساتھ ساتھ گنگناتے اور سیٹیاں بجاتے گاؤں کی طرف جا رہے تھے تھوڑی دُور چل کر سڑک ایک پُل کی بلندی سے اُتری اور دونوں طرف درختوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ۔ چھکڑا اچھی خاصی رفتار سے چل رہا تھا اور مجھے راستے کے ہچکولوں سے ایک غنودگی سی آ چلی تھی ۔ شیشم کی شاخیں میرے سر کو چھُو چھُو کر گزر رہی تھیں ۔ اتنے میں ایک کیکر کی شاخ اسباب کے ذرا اوپر تیرتی ہوئی آئی اور میری دائیں آنکھ میں خراش دیتی ہوئی نکل گئی ۔ مَیں نے چیخ ماری اور دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر منہ کے بل اسباب پہ گر گیا ۔ چھکڑا رک گیا ۔ میرے والد جلدی سے آئے اور آنکھ سے خون بہتا دیکھ کر گھبرا کے بولے " اوہو !

ᐤ راستے کے ایک گاؤں کا نام ہے

آنکھ گئی"۔ اس آواز کے ساتھ ہی میں نے گاڑی کے پردے سے والدہ کی چیخ سُنی اور کچھ دیر کے لئے مطلق سناٹا چھا گیا۔ اس کے بعد میری ہمشیرہ کے رونے کی دردناک آواز جنگل کے اندھیرے میں بھٹکنے لگی۔ خدا خدا کر کے والدہ کو ہوش آیا اور والد نے یقین دلایا کہ آنکھ کی پتلی صحیح سالم ہے صرف خراش آئی ہے والدہ نے گھر واپسی کے لئے گاڑی مُڑوالی جب ہم گھر پہنچے تو عشا کا سا وقت ہو رہا تھا۔ والد تو سامان اُتروانے لگے، اور والدہ مجھے اور ہمشیرہ کو ساتھ لئے حویلی میں آگئیں۔ آناً فاناً میں یہ خبر سارے محلے میں پھیل گئی اور گھر میں ہمسایہ عورتوں کا ہجوم ہو گیا۔ کئی تو اپنے اپنے کوٹھوں پر سے میرے متعلق دریافت کر رہی تھیں۔ بڑی دیر کے بعد اسی محلے کی ایک ہندو بیوہ منوہری آئی جس کے بال پک چکے تھے اور میری والدہ کی بہنیلی تھی۔ وہ ایک گوشت پوست کی عورت ضرور تھی لیکن اس کی ہمدردی اور خلوص سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ وہ زمین پر صرف انسانی ہمدردی کے لئے بھیجی گئی ہے۔ پہلے تو اس نے دیر سے آنے کی معذرت کی کہ "کل سے کپور چند* کو بخار ہے۔ اُس کے پاس بیٹھی تھی ورنہ لڑکے کی آنکھ کے متعلق تو میں نے دیر ہوئی سُن لیا تھا۔ ہاں بہن! ایک دوا بتاؤں؟"

"جلدی بتاؤ بہن! میرا تو دم نکلا پڑا ہے"۔ میری والدہ نے کہا۔

"اس کی آنکھ میں خون ڈالو۔ خون!" منوہری نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ میری والدہ یہ سُن کر چپکے چپکے اُس سے کچھ گفتگو کرنے لگیں جسے میں نہ سن سکا۔ اور پھر اس کے ہمراہ نیچے اُتر کر دہلیز تک گئیں۔

منوہری کی شکل مجھے اب تک یاد ہے۔ وہ ایک نیک دل بیوہ تھی بالکل اس طرح جیسے ویران کنوؤں میں لٹکی ہوئی دوب اور پودے ہواؤں کی نمی اور فضا کی برودت سے پیاس بجھا کر شاداب رہتے ہیں اور آبپاشی کے محتاج نہیں ہوتے۔

مجھے اس رات اگرچہ ٹیسوں کے باعث دیر سے نیند آئی لیکن آخر سو گیا۔ صبح کو

---

* منوہری کا اکلوتا لڑکا

ابھی سو ہی رہا تھا کہ کسی نے میری آنکھ کھول کر زبردستی کوئی سیّال چیز ڈال دی۔ دیکھا تو والدہ نے اپنی انگلی کے دو پور ڈورے سے جکڑ کر لہو اکٹھا کر کے شگاف دیا ہوا تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا "امی یہ انگلی تم نے کیوں کاٹ لی ہے؟" اس پیکرِ محبت نے ہنس کر کہا "بیٹا اس میں تکلیف ہی کیا ہوتی ہے؟ آخر دو چار بوندیں ہی تو ہیں۔" اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی طویل زینہ چڑھ کر آئی ہیں۔ ان کے دل میں ایک غم ہونک رہا تھا۔ انہوں نے شفقتوں سے لدا ہوا ہاتھ میری پیشانی پر رکھدیا اور بولتے بولتے اس طرح خاموش ہو گئیں جیسے کسی بھورے[۱] میں اُتری جا رہی ہوں۔ آنسوؤں سے ان کا گلا رُندھ گیا تھا۔ اس علاج کا عمل ایک ہفتہ جاری رہا جب میری آنکھ جھپک جاتی اور لہو آنکھ میں نہ پڑتا تو پہلے کی طرح پھر ڈورا باندھ کر لہو اکٹھا کیا جاتا اور دوسرا شگاف لگتا۔ میں نے دیکھا کہ میرے منع کرنے کے باوجود والدہ کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کئی کئی جگہ سے تراشی ہوئی تھیں۔ آہستہ آہستہ میری آنکھ بالکل درست ہو گئی اور میں پہلے کی طرح باہر آنے جانے لگا۔ تھوڑے دنوں تو دھوپ میری آنکھوں میں چبھی پھر رفتہ رفتہ کھٹک دور ہو گئی۔

رحیمن ایک دفعہ والد صاحب نے ایک باغیچی بٹائی پر لے رکھی تھی جس میں امرودوں کے سوا کسی اور قسم کے درخت نہ تھے۔ ساتھ ہی بھگوتی والے باغ کی فصل شادی کنجڑے نے خریدی ہوئی تھی۔ قریب ہونے کے باعث وہ ہمارے اور ہم اُن کے باغ میں آنے جانے لگے تھے۔ رحیمن جو غالباً شادی کنجڑے کی بہن تھی مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتی۔ شاید اس لئے کہ اس وقت اس کے کوئی بچہ نہیں تھا۔ میں اُسے مہربان پا کر پہروں اس کے پاس کھیلتا رہتا۔ ایک دفعہ میرے پاؤں میں موچ آ گئی۔ جب اس نے میرے پاؤں پر ورم دیکھا تو اس کے چہرے پر ایسا تغیر آیا جیسے بیلے کے پھولوں کو زرد بادل کا سایہ اداس کرتا ہوا گزر جائے۔ میرے والد کی موجودگی کے باوصف رحیمن مجھے

---

[۱] بھورا۔ تہ خانہ

باغ سے گھر تک اپنی پیٹھ پر لاتی اُس وقت مَیں رحیمن میں اپنی ماں جیسی بات پا رہا تھا جب فصل اُتر چکی تو ہماری بھی بٹائی ہو گئی اور شادی نے بھی ڈیرا ڈنڈا اُٹھا لیا۔ مگر رحیمن میری والدہ کے پاس برابر آتی جاتی رہی۔ اُس کا خُسر جو باغ لیتا وہ مجھے ایک بار اپنے ساتھ لیجا کر دکھا دیتی اور پھر میں خود وہیں پہنچ جایا کرتا۔ جو پھل باغ میں ہوتا بے روک ٹوک کھایا کرتا۔ کبھی کبھی رحیمن میری والدہ کے لئے بھی کچھ نہ کچھ لے آتی۔ مجھے خوبصورت جانوروں کو دیکھنے اور پالنے کا بہت شوق تھا جب میں رحیمن کے پاس باغ میں جاتا تو پہروں بلبلوں۔ ڈومینوں۔ لعلوں۔ چتیوں۔ توتوں۔ ہدہدوں اور پدونوں کو دیکھتا رہتا۔ ان کی رنگ رنگ کی بولیاں مجھے بھاتی رہتیں۔ اس وقت غالباً مجھ میں رنگ و نغمہ کی آرزو بولنا نہیں سیکھی تھی۔ میری توتلی زبان اور ہنکلے ارادے عمر کی انگلی پکڑ پکڑ کے چلنا سیکھ رہے تھے۔ بعض دفعہ میں باغ سے نکل کر ریل کی پٹڑی کی طرف آ جاتا اور کبھی تو تاروں کے پول کبھی پٹڑی پہ کان لگا کر لوہے کی رگوں میں جھنکاروں کی گونج کا بہاؤ سُنتا رہتا اور اس سے خوش ہوتا۔ مگر یہ سمجھ میں نہ آتا کہ یہ کیا طلسم ہے؟ ہَوا کی ضرب سے جھنجھناتے ہوئے تاروں کا شور پول میں کیسے اُتر جاتا ہے؟ جبکہ پٹڑی اور پول، دونوں آہنی ہیں لیکن کچھ سمجھ کام نہ کرتی اور نہ جانے کن کن نسلوں کے چکر سے خیالات آتے اور گزر جاتے۔

جب مَیں باغ کے پرندوں کو ہلکارتا تو میرے گلے کی رگیں دُکھنے لگتیں اور جب میں رحیمن سے کہتا تو وہ کہتی "ارے لڑکے تجھے کس نے ہلکارنے کو کہا ہے؟ اگر ایسا ہی شوق ہے تو سامنے بیٹھا پڑا رہتا ہے یا پھر بیٹھا کھٹکھٹے کی رسّی کھینچتا رہا کر۔"

رحیمن ایک نہایت حسین اور شریف عورت تھی اس کا کتابی چہرا اور غلافی آنکھیں میں ابھی تک نہیں بھولا۔ مَیں نے کبھی اُسے گوٹے ٹھپے کے کپڑے پہنے نہیں دیکھا۔ موٹے کھدر کی نیلی کرتی میں کئی کئی پیوند لگے رہا کرتے اور آنکھوں میں ہمیشہ ایسی چیز رقص کیا

کرتی جیسے کوئی مقدس اور غنودہ نشہ! وہ اپنے گھر کے صحن میں ایسی لگتی جیسے بھیگے ہوئے بنجر سے قوسِ قزح اُگ رہی ہو۔ اپنی چوڑی پیشانی کی چمک اور شادابی سے وُہ کسی محل کی ایسی ملکہ معلوم ہوتی تھی جو خدا کی تلاش میں تارک الدنیا ہوگئی ہو۔ اس کی آنکھیں ایسی روشن اور خوبصورت تھیں کہ جب وہ سیاہی لگاتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کاجل سے نامعلوم سی کونپلیں نکلی ہیں جو پلکیں بن رہی ہیں۔ میں نے اُسے کبھی کسی سے بے تکلف نہیں دیکھا۔ وہ چلتے ہوئے آنکھیں اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھنا نہیں جانتی تھی۔ مخیّر اور رحمدل ایسی کہ جب تک وہ باغ میں رہتی کوئی سوالی ہاتھوں کا کاسہ خالی لے کر نہ جاتا۔ کبھی کبھی اس کا شوہر بڑے نرم لہجے میں اس کی فراخ دلی پہ ناک بھوں چڑھاتا تو وہ کہہ دیا کرتی۔ "ابا فقیروں کو دینے سے کمی نہیں آیا کرتی۔ جب ہم پنڑول، پٹواری، امین اور میاں کے کارندوں کے گھر ٹوکرے کے ٹوکرے بھیجتے ہیں اُس وقت یہ خیال کیوں نہیں آتا؟ وہ لوگ تو ہمیں ایک نوالا بھی نہیں دیتے۔ بلکہ کھاتے ہوئے ہمیں پاس بھی کھڑا نہیں ہونے دیتے اور ہمارے مال کو اپنا حق خیال کرتے ہیں! ہم کنجڑے جو ہوئے!! فقیر بیچارے دُعائیں تو دیتے ہیں!" یہ کہتے کہتے وہ اپنی غلافی آنکھیں جھکا لیتی جیسے برسات میں بوندوں کے بوجھ سے عموماً نرگس کی پتیاں محرابیں بن جاتی ہیں۔ رحیمن سراپا تقدّس اور تاثر تھی کیونکہ روحانی اور جسمانی طور پہ وہ ہر تعفّن سے پاک تھی۔ انتہا یہ ہے کہ اگر کھانا کھاتے میں کوئی فقیر آگیا تو جتنی روٹی سامنے ہوتی سب دے دیتی اور خود شام تک بھوکی پھرتی رہتی۔

ایک دفعہ میرے والد نے سیدوالے باغ کے آموں کی فصل میں کچھ حصّہ لیا۔ اب مجھے رحیمن کا قرب نصیب نہیں تھا۔ اگرچہ باغ میں اَور کئی حصّہ دار تھے اور ہر وقت ایک محلّہ سا آباد رہتا تھا لیکن میری بالکل طبیعت نہ لگتی، کیونکہ میں جس خلوص اور محبت کا پیاسا تھا وہاں اس کا کوسوں کوئی پتا نہیں تھا۔ ایک دن مجھے باغ میں سونا پڑا تو نیند نہ آئی۔ ایک تو برسات کا بدبودار اندھیرا پھر حبس۔ گھبرا کے میں پاس ہی ایک کنوئیں پر جا بیٹھا اور

سوچنے لگا کہ اگر اب کی بار مجھے یہاں سونا پڑا تو کسی اور لڑکے کو ضرور ساتھ لاؤں گا تاکہ ہنستے بولتے تو رہیں اور دل تو نہ گھبرائے ۔ میرا اُن لوگوں میں بالکل جی نہ لگتا جو آموں کے چھلکوں اور گٹھلیوں کی بو میں چپڑی پچپائے حقے کے کش لگا لگا کر لالٹین کی سوگوار روشنی میں دھوئیں کو پھیلتے دیکھتے اور دق کے مریضوں کی طرح خوش ہوتے ۔ باغ کی دلدار تاریکیوں کے علاوہ بھی باغ کی کھائی سے باہر چاروں طرف اندھیرے کے انبار لگے پڑے تھے ۔ اتنے ہی میں دور جنگل کے کنارے درختوں کی ٹہنیوں سے چاند نے اُجالی لی جیسے بسنت کی دیوی کی چتا سُلگ پڑے ۔ دیکھتے ہی دیکھتے ستاروں کی جگمگ دھیمی پڑ گئی اور باغ کا مشرقی اُفق ایسا لگنے لگا جیسے رات کی سنہری زلفوں کا الاؤ بھڑک اُٹھا ہو ۔ میری پلکوں پر نیند برسنے لگی تو میں گھنیرے درختوں کے سائے کی سیاہ جاجم کے خشک پتوں کو کھوندتا ہوا چارپائی پر جا لیٹا اور نگاہوں کو ایک موٹے تنے کی گہری کھوکھل پر جمائے جمائے سو گیا ۔ صبح کو آنکھ کھلی تو آسمان کے کھیتوں میں املتاس پھولا ہوا تھا اور صبح کے مولود سے سورج شفق کی سرخی میں تانبے کے کٹورے کی طرح تیرتا ہوا اُبھر رہا تھا ۔ میں خوش خوش اپنے گھر چلا آیا ۔

تعلیم

میری تعلیم کے متعلق میرے والدین کے ارادے تو بلند تھے لیکن افلاس میں ہر ارادے کی بنیاد بے اعتبار ہوتی ہے ۔ چنانچہ قدم قدم پر ناسازگار ماحول آڑے آتا رہا ۔ پہلے پہل میرے والد نے مجھے قرآن خوانی کے لئے سید حافظ محمد مصطفےٰ صاحب کے سپرد کیا اور میں بہت جلد روزے نماز کے قابل ہو گیا ۔ پھر وہاں سے اُٹھا کر اس خیال سے تحصیلی اسکول میں داخل کر دیا کہ جب قرآن کی اہمیت کو سمجھے گا تو خود بخود بڑھ

لے گا۔ حافظ سیّد محمّد مصطفےٰ صاحب یکتائے روزگار حافظ ہونے کے علاوہ عربی فارسی میں بھی بلند استعداد کے مالک تھے۔ چلتے پھرتے روزانہ ایک قرآن ختم کرنا ان کا معمول تھا اور خوش الحانی میں تو خدا نے انہیں خاص انعام سے نوازا تھا۔ میں نے انھیں مجذوبوں کی طرح قرآن پڑھتے اور ساتھ ساتھ روتے بار ہا دیکھا ہے۔ جب کبھی وہ تراویح میں امامت کرتے اور اُن پر رقّت طاری ہو جاتی تو بھرّائی ہوئی آواز اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے ایسا تاثر ہوتا کہ اُن کے ساتھ مقتدی بھی تڑپ تڑپ اُٹھتے اُس وقت اُن کی آواز ایسی معلوم ہوتی جیسے بہار کی چاندنی میں تیز فوّارے کے نیچے ستارہ رکھ کر فطرت نے بہاگ چھیڑ دیا ہو۔

میں ان کے مکتب سے علیحدہ ہو کر بھی ان کے وہاں آتا جاتا رہا۔ ان کی تربیت سے شروع ہی میں مجھ پر زندگی کے بہت سے نشیب و فراز روشن ہونے لگے تھے کیونکہ وہ ہمیشہ تبلیغی گفتگو کے عادی تھے۔ کم علموں میں سادہ الفاظ کی تبلیغ صرف ایک دو آدمیوں تک محدود نہ رہتی بلکہ گرد و پیش کو بھی متاثر کرتی اور تجربات دیتی تھی۔

حافظ صاحب کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ صرف ایک لڑکی "ام ہانی" تھی جس کا شادی سے پہلے ہی انتقال ہو گیا تھا۔ حافظ صاحب اچھے خاصے زمیندار تھے لیکن بالکل درویش صفت! آخر میں وہ مجھ سے ذرا بے تکلّف بھی ہو گئے تھے لیکن وقتاً فوقتاً استادوں کی طرح ڈانٹ ڈپٹ بھی جاری تھی۔ ان کے زیرِ تربیت کئی یتیم بھی تھے جن کے تمام تر مصارف حافظ صاحب ہی اُٹھاتے تھے اور اپنے بچّوں کی طرح اُن کی ناز برداری سے انھیں کبھی اُکتاتے یا ناک بھوں چڑھاتے نہیں دیکھا۔ کئی لوگوں نے انھیں اس یتیم پروری سے روکا بھی لیکن وہ صرف یہ جواب دیتے کہ یہ آپ نہیں آ گئے ہیں میں انہیں خود لایا تھا اور یہ سوچ سمجھ کر لایا تھا کہ ان کی تمام تر خدمت میرے ذمّے ہوگی۔ اب تو یہ دَم کے ساتھ ہیں۔

مَیں حافظ صاحب کے فیضانِ صحبت سے محروم ہو کر تحصیلی اسکول میں جاتا رہا اور اسباق کی ترقی میرے لئے باعثِ مسرّت بنتی رہی۔ رام چندر اور لَلّو یہ دونوں لڑکے میرے ایسے ہم جماعت اور ساتھی تھے جن سے مَیں زیادہ مانوس تھا۔ رام چندر سے تو ہمسائیگی کے باعث اور لَلّو سے اس لئے کہ جب تک میں اُسے گھر سے آواز نہ دے لیتا وہ اسکول نہ جاتا۔ مِردھوں کے محلّے میں لَلّو کا بھائی رمضانی گھر سے ذرا فاصلے پر ایک جھونپڑی میں اکیلا بیٹھا رہتا تھا، وُہ سارنگی کا بڑا استاد تھا۔ جب وہ سارنگی کے تاروں پر گز کھینچتا اور پنچم کے تاروں پر انگلیوں کو لرزش دیتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے اسکی انگلیاں تاروں میں بندھی ہوئی ہیں اور رمضانی کے خیالات و جذبات کے ایما پر چل رہی ہیں۔ میرے دل میں گدگدیاں سی تیر لے لگتیں اور بعض وقت تو ایسا معلوم ہوتا جیسے سارنگی کی آواز برفیلی ہو کر میری شریانوں میں بہہ رہی ہے۔ لَلّو کی بھاوج بھی نہایت سلیقہ مند اور خوش گِل عورت تھی۔ وہ اچھّے اور معیاری مسلمانوں کی طرح پردے کی سختی سے پابند تھی اور مجھ سے بچّوں کی طرح محبّت کرتی تھی۔ ان کے یہاں جب کوئی اچھی اور مزیدار چیز پکتی تو وہ ضرور میرے لئے رکھتی بلکہ لَلّو کو بھیج کر مجھے گھر سے بلوا لیا کرتی۔ کبھی کبھی اس کا مہربان اور حسین چہرہ اب تک میرے سامنے آجاتا ہے۔ اس کی پاکیزہ محبّت اب تک میرے رگ و ریشہ میں زندہ و بیتاب چلی آتی ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ مجھ پر شفقت کرتی تھی بلکہ وہ اپنے حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ سیرت میں بھی ایسے جوہر لئے ہوئے تھی جو شہزادیوں کو بھی نصیب نہیں ہوتے۔ اس میں گھر کے کام کاج کا سلیقہ اس بلا کا تھا کہ مَیں نے اب تک بڑے بڑے اونچے گھرانوں میں نہیں پایا۔ روکھی سوکھی روٹی کھاتے ہوئے کبھی اس کی پلکوں کا تبسّم چہرے کی شادابی سے بغاوت نہ کرتا اور گھر کے رنگے ہوئے معمولی لباس میں وہ ملکہ کی طرح گھر کی زینت دکھائی دیتی۔ لَلّو کا بھائی رمضانی ایک طلوا نقف کا سنگتی تھا۔ مَیں اور لَلّو اسکول جاتے ہوئے اس کے مکان کے سامنے سے

گزرتے تو کبھی کبھی للّو مجھے لے کر اس مکان میں گھس پڑتا اور اپنے بھائی سے پیسے مانگ کر لاتا۔ اس طوائف کی لڑکی شمعی اُن دنوں رمضانی سے سَرگم سیکھ رہی تھی۔ وہ مجھ سے قد میں تو ذرا بڑی تھی لیکن خوش رنگ شربتی آنکھیں، ستواں ناک۔ پیاز کے نگھار کی طرح ابرو اور چھریرا بدن۔ جب وہ بولتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ ایک غیر مرئی لذّت کانوں سے دل پر چھن رہی ہے۔ میں اور للّو جب بھی اس مکان کے سامنے سے گزرتے تو اکثر شمعی آواز دے لیتی۔ ان کے یہاں میری اور للّو کی بدحسنی کا مذاق اڑایا جاتا جس میں کوئی طنز یا کراہت کا پہلو بالکل نہ ہوتا بلکہ ایک ہلکی سی تفریح۔ شمعی بھی کوئی آوازہ نہ کستی اور نہ ان کی ہاں میں ہاں ملاتی بلکہ بعض اوقات ہماری حمایت میں گھر والوں سے بگڑ جاتی کہ آخر یہ بھی تو اُسی خدا کے بنائے ہوتے ہیں۔ آپ میں رنگ کے سوا کونسی بات ہے۔ اس کی یہ ہمدردی غیر محسوس طور پر مجھے اس کے نزدیک کرتی رہی۔ نہ جانے وہ کیا جذبہ تھا اور اس کے نقش و نگار میرے حافظے سے کیوں محو نہیں ہوتے تھے۔

ایک دن یکایک سکول جاتے ہوئے دیکھا کہ کچھ اسباب چھکڑے پر لد رہا ہے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ شمعی کی والدہ بال بچوں سمیت کاندھلے سے کہیں باہر جا رہی ہے۔ للّو اور میں دیر تک بستہ لئے کھڑے دیکھتے رہے۔ سب لوگ اسباب کی جکڑ بند میں مصروف تھے۔ شمعی کی نظر باہر کی طرف اٹھی تو لپک کر باہر چبوترے پر آگئی اور کہنے لگی ”ہم آج بمبئی جا رہے ہیں۔“ اتنے میں اندر سے کسی نے آواز دی اور وہ خدا حافظ کہکر دونوں ہتھیلیاں ملائے اندر چلی گئی۔ اس وقت تو ہم دونوں کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا مگر اسکول تک اسی کی باتیں کرتے چلے گئے اور نہ جانے کیا کیا کہا ہوگا۔

شمعی کے چلے جانے کے بعد میری عادی نگاہیں روزانہ اس کے بند کواڑوں پر دستک دے کر لوٹتی رہیں۔ کچھ دنوں کے بعد للّو بھی غالباً اپنے بھائی کے ساتھ ”دربھنگہ“ چلا گیا اور کاروانِ حیات اُفتاں و خیزاں گزرتا رہا۔ کاندھلے سے چلے جانے کے برسوں بعد للّو

سے صرف ایک بار ملاقات ہوئی۔ اس کے خلوص و محبت کو میری آنکھیں اب تک ڈھونڈتی ہیں اور عمر کے اس گردائے ہوئے آئینے میں لڑکپن کی شرارتیاں اب تک مسکرا پڑتی ہیں۔
ایک زمانے کے بعد ۱۹۳۴ء میں جب میں کلکتہ کے ایک ہفت روزہ اخبار "خادم" میں کام کرتا تھا۔ تو میرے دفتر میں "دربھنگہ" کا رہنے والا بھی ایک شخص کام کر رہا تھا۔ میں نے کئی بار اس سے بھی دریافت کیا اور دربھنگہ سے معلوم بھی کرایا۔ مگر للّو کا کوئی پتا نہ چلا۔ اور میری توقع کی کونپلیں کھرنک[1] ہو کر ٹہنیاں چھوڑ گئیں۔

جہاں ہمارا اسکول واقع تھا اس سے تھوڑی دور کے فاصلے پر "ماجرا" نام کا ایک بھنگیوں کا محلہ تھا جس کا جنوبی پہلو ڈاکخانے کے سامنے کی بڑی سڑک کی طرف تھا اور شمالی حصہ باغوں کا جزو معلوم ہوتا تھا۔ اس کا ایک کچا ڈگرا[2] اسکول کی دیوار کے پیچھے پیچھے بھگوتی والے باغ کو چھوتا ہوا ایک جوہڑ کے کنارے ختم ہوتا تھا۔ اسکول کے تمام لڑکے پیشاب وغیرہ کے لئے اسی طرف جایا کرتے۔ جوہڑ اور باغ کی حدِ فاصل ناگ پھنی کی ایک زبردست باڑ تھی اور اس نے اچھی خاصی زمین گھیری ہوئی تھی۔۔ مدرسے کی اس ویران سمت میں آوارہ کتوں اور سوروں کے ڈارے کے ڈارے پھرتے دکھائی دیتے اور باڑ کے کیکروں کی چھدری قطاریں اپنے گرم سائے "ناگ پھنوں" تک محدود رکھتیں۔ شوخ طبع اور شریر بچوں کے ساتھ میں بھی کبھی کبھی ساتھ والے باغ سے امرودوں کی چوری میں شریک ہو جاتا اور "امیر خان"[3] (میرا ایک ہم جماعت) جو بڑا ہی تیز طرار قسم کا لڑکا تھا مجھے اس قسم کی حرکات سے روکا کرتا اور چوروں کی سزاؤں کے قصے سنا کر ڈراتا۔ مگر للّو اور دوسرے لڑکے اپنی شیطنت پر اترتے تو مجھے زبردستی گھسیٹ کر لے جاتے اور میں آنکھ بچا کر طوعاً و کرہاً ان کے ساتھ ہو لیتا اور ہم جھبور[4] بھر بھر کے امرود لاتے، جب کسی کو دور سے بھی کوئی آدمی دکھائی دے جاتا تو گدبدی[5] لگا دیتے اور سکول میں آکر سانس لیتے۔

---

[1] کھرنک، سوکھا، خشک [2] ڈگرا، کچا رستا [3] امیر خان آجکل پاکستان میں ایک ٹیکسٹائل مل میں باڈر مین ہے۔
[4] جھبور، گود، دامن [5] گدبدی، دوڑ۔

ایک دن ہم کئی لڑکے امرود توڑ رہے تھے کہ دُور سے رکھوالے نے للکار کر تاہا[1]۔ ہم سب سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے مگر رکھوالے نے مدرسے تک پیچھا نہ چھوڑا۔ ہم جس کمرے میں گئے وہ ساتھ ہی گھُسا چلا گیا۔ اسکول میں جا کر لڑکے سامنے ہو گئے۔ آٹھ دس لڑکوں نے رکھوالے کو نیچے گرا لیا اور پوانڑے سے خوب پٹائی کی یہ اُکھاڑ پچھاڑ اور غل غپاڑہ ہو ہی رہا تھا کہ منشی پیارے لال آ گئے ان کے آتے ہی لڑکے کان دبا کر اپنی اپنی جگہ جا بیٹھے۔ منشی صاحب نے سب سے پہلے رکھوالے سے سوال کیا۔

"تم کون ہو؟ اور اسکول کے اندر بغیر اجازت کیوں آئے؟

"تمہارے لڑکے امرود توڑ کر پھونڈ[2] مار لائے" رکھوالے نے بوکھلائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تو پھر تُم نے ہم سے کہا ہوتا۔ لڑکوں کو کیوں لپٹ گئے؟ ٹھہرو! میں تمہیں ابھی تھانے بھجواتا ہوں"۔ منشی صاحب نے ڈپٹ کے لہجے میں کہا۔ تھانے کا نام سنتے ہی رکھوالا تو اڑنچھو ہو گیا اور منشی جی نے ہم چھ سات لڑکوں کے کان پکڑوا دئے اور بڑی دیر تک مُرغا بنائے رکھا۔ پھر بڑبڑاتے ہوئے اُٹھے اور سب کے دو دو قمچیاں رسید کیں اور کہا کہ "خبردار! اب اگر اس قسم کی کوئی شکایت آئی تو یاد رکھنا کہ سکول سے تمہاری لاشیں جائیں گی"۔ اس کے بعد سے میں کبھی امرودوں کی چوری کو نہیں گیا۔ جب بھی لڑکوں نے مجبور کیا مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ منشی پیارے لال مرکھنے بجار کی طرح اپنی سُرخ کانی آنکھ سے مجھے گھور رہے ہیں۔

---

[1] تاہنا: پچھا کرنا۔ [2] پھونڈ مارنا: کپڑے میں بندھا ہُوا بوجھ کمر پہ ڈال لینا۔

لڑکپن کا ایک رجحان

مجھے لڑکپن ہی سے موسیقی پسند تھی چنانچہ جب کسی برات میں کوئی طائفہ آتا یا سانگ ہوتا تو میں آدھی آدھی رات تک گھر سے غائب رہتا اور پھر ہفتوں سارے سارے دن انھیں سُنی سُنائی دھنوں کو گنگناتا پھرتا اور آہستہ آہستہ وہی سُر پیدا کر لیتا۔ چوبٹے* کے پاس مونگا نائی ڈھولک بجانے کی مشق کرتا تو میں پہروں اس کی "کڑ کڑ دھا۔ کڑ کڑ دھا" سنا کرتا۔ مونگا کو ڈھولک میں مہارت کی دُھن دیوانہ بناتے ہوئے تھی اور کچھ نہ ہوتا تو وہ بیٹھا بیٹھا چارپائی کے پائے بجاتا اور چارپائی نہ ہوتی تو دیواروں اور کواڑوں پر بھی اس کا تین تال رواں رہتا بعض اوقات تو وہ جب لوہے کے ڈول کی تلی بجا بجا کر خود بخود گردن ہلاتا تو مجھے ہنسی آجاتی۔ اس وقت وہ ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کے سر کو گا پیرا آگیا ہے۔ وہ پسینے میں شرابور ہو جاتا مگر زیر و بم کا چکر اُسے سانس نہ لینے دیتا۔ ایک دن میں نے اُسے ڈھولک بجاتے دیکھا تو اُس وقت کھُلا کہ وہ تو بڑا صاحبِ فن ہے جب اس نے چلت بجائی اور کڑ کڑ دھا، کڑ کڑ دھا کے پلٹے لئے تو ڈھولک کی آواز ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے کبوتروں کی ٹکڑیاں منظم ہو کر تال سے غٹک رہی ہوں۔ کیفیت کا یہ عالم تھا کہ جیسے کوئی دل کے چاروں طرف نرم پروں سے سہلا رہا ہو یا سینبھل کی بنی ہوئی رُوئی کے گالے سینے سے گزر رہے ہوں۔ اس کی ریس میں گھر آکر میں خود بھی طاشلے یا رکابی پر تالیں نکالنے کی کوشش کیا کرتا اور بعض اوقات تو ایسا مزہ آتا کہ ہلکا ہلکا نشہ سا ہو جاتا اور خود بخود گردن ہلنے لگتی۔ اُس وقت مجھے مونگا کا یقین آتا کہ وہ بجا طور پر گردن ہلاتا ہے۔

* چوبٹا میرے محلے کے قریب ایک چوراہے کا نام ہے جہاں کچھ دکانیں بھی ہیں۔

قصبے میں جب کوئی تھیٹر آتا اور گانے والے رنگ برنگ کے لباس سے آراستہ اسٹیج پر اُترتے تو وہ مجھے راگنیوں کے دیوتا معلوم ہوتے اور ان سے قریب ہونے کو جی چاہتا۔ بولوں کی تان یا انترے کے بعد سانگیوں اور نچنیوں کا رقص میں پھرکی کی طرح گھومنا مجھے مبہوت کردیتا اور تو اور جب کہیں سے کوئی "آلہا اُودل" کا ماہر آجاتا تو اس میں بھی زیر وبم کا جادو مجھ پر اپنا کام کرجاتا۔ اسٹیج کے فنکاروں کے اشاروں پر میرے ہاتھ پاؤں بھی خود بخود حرکت میں آجاتے کئی بار تو ایسا ہوا کہ ڈاکخانے کی پشت پر اپنے اسکول کے گراؤنڈ میں "آلہا اُودل"[۵] سنتے سنتے صبح ہوگئی۔

ایک دن چوہدری عبدل جنگ کے یہاں بخشا قوال آیا، وہ دُبلا پتلا گہرے گندمی رنگ کا آدمی تھا۔ دانت باریک اور گنجان۔ بدن چھریرا وہ آدھی رات تک تو یُونہی گلے بازی کرکے آواز گرماتا رہا۔ اور مجھے یقین ہوچلا کہ یُونہی معمولی سا گانے والا ہے لیکن جب رات ڈھلنے لگی تو اُس نے ستاروں پر الاپوں کے جھولے ڈال دیئے اور آسمانی کیفیات کو انسانی دُنیا تک لے آیا۔ شام کلیان کے لہلہاتے ہوئے سُر بھیرویں کی حدوں کو چھُونے لگے اُس نے ہارمونیم کے پردوں پر جھک جھک کر انتروں میں رنگ بھرنا شروع کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر راگ پر چیچ وتی کے زینے سے جاتا ہے جب وہ انترہ سے پہلے تان لیتا تو پُروائی میں لہراتا ہوا کالا ناگ معلوم ہوتا۔ اُس وقت وہ جس کی طرف دیکھتا اس کی نظر بھی ایک دلدوز اور جان لیوا ہُوک معلوم ہوتی۔ جوں جوں رات گزر رہی تھی اس کی آواز میں روشنی اور الاپ میں تاثیر جاگتی جارہی تھی۔ چار بجے صبح تک اس کے فن کا شباب اُن منزلوں میں تھا کہ لوگوں کی آنکھوں میں نیند کی سرخیاں اس کے نغمے کا اثر معلوم ہورہی تھیں۔ اس کے فن کا جادو پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگوں تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ ناسمجھ اور گاؤدی قسم کے لوگ بھی گریبان چاک کر ڈالتے تھے! ورصوفیا ر پر تو اُس کا

---

۵ آلہا اودل:۔ ایک منظوم جنگی کہانی۔

انسول اس قدر رواں تھا کہ جہاں ڈھولک پر تھاپ پڑی وہیں صوفیاء نے محسوس کیا کہ دل پر دو ہتڑ لگا۔ اس کی آواز کا شباب صوفیوں کے دلوں کا شباب تھا۔ جب میں گانا سنتا، اُس وقت شاید میرے جسم میں بیدار سماعت اور گونگے وجدان کے علاوہ ہر شے دُور فاصلے پر کھڑی ہو جاتی اور مجھے ایک غیر مرئی فضا گھیر لیتی۔ مجھ پر بختا قوال ایسا اثر چھوڑ گیا کہ مجھے خوش آواز کا چسکا سا پڑ گیا۔ قصبے کے گرد و نواح میں جہاں بھی قوالی ہوتی مَیں اس میں ضرور پہنچتا، اور ایک مقدس کیفیت میں غلطاں و پیچاں گھر آتا۔ ہر تان مجھ میں کچھ جھنکاریں داخل کر کے گم ہوتی جو لطیف بھی ہوتیں اور بامعنی بھی۔

کیرانہ[1] کی چھڑیوں کے میلے میں کہیں سے ایک قوال آیا کرتا تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ پیر جی محمد ابراہیم[2] صاحب کا چہیتا قوال ہے وہ ظالم کئی کئی منٹ تک ایک سانس سے مُرکیاں لگاتا۔ مگر ایک تو وہ پہلے ہی نقش و نگار کے اعتبار سے بھدا تھا اور گٹکری لیتے وقت جب اس کے گلے کی رگیں پھول جاتیں تو وہ اور بھی بھیانک معلوم ہونے لگتا جیسے کوئی چیتے کا بچہ گردن میں بندھی ہوئی رسّی کھینچ کر توڑ ڈالنا چاہتا ہو۔ لیکن پیر جی صاحب کے مُرید تھے کہ تقلیدی کیفیت کے وُہ پینترے دکھاتے کہ رہے نام سائیں کا۔ کوئی کھڑا ناچتا اور کوئی لوٹن کبوتر کی طرح نظر آتا۔ مجھ پر اُس کیفیت اور رقص کا کوئی اثر نہ ہوتا بلکہ پہروں سوچا کرتا کہ بھلے چنگے ڈھیل لوگوں کو کیا ہو جاتا ہے؟ کہ بزرگی اور سنجیدگی سے یک لخت دست بردار ہو کر اُچھل کود پر اُتر آتے ہیں۔ جب میں اپنے ہم عمروں میں اس خیال کا اظہار کرتا تو وہ سب توبہ توبہ کرنے لگتے اور کہتے "کم بخت تُو تو دوزخی ہے دوزخی، ارے صوفیوں پر ہنستا اور حال و قال کو بُرا کہتا ہے یہ تو کافر بھی نہیں کرتے۔ دیکھتا نہیں کہ وہاں ہندو مسلمان سب کیسے ادب و احترام سے بیٹھتے ہیں"۔ مَیں سُن کے خاموش ہو جاتا اور کچھ ڈرسا بھی لگنے

---

[1] میرے وطن قصبہ کاندھلہ سے پانچ کوس پر ایک قصبہ ہے جہاں کی گائیکی مشہور ہے۔
[2] کیرانہ کے مشہور شیخ طریقت۔

لگتا۔ لیکن دل تھا کہ اس قسم کی چھان بین سے باز نہ آتا۔ آگے چل کر اسی کریدنے رفتہ رفتہ مجھے بزرگانِ دین کی زندگیوں کے مطالعے کی طرف رجوع کر دیا۔ اور میں صوفیاء و علماء کے سوانح حیات کی طرف راغب ہو گیا۔ لیکن یہ مسئلہ جس قدر بڑھتا گیا میرے لئے اُسی قدر پیچیدہ ہوتا چلا گیا۔ اب میں مطالعہ تو کرتا لیکن اپنی اس تشنگی اور بے اطمینانی کا کسی سے ذکر نہ کرتا۔ شاید میں عقلی طور پر سکون چاہتا تھا جس کی مجھ میں ابھی صلاحیت ناپید تھی۔ مشاہدہ کے بغیر خالی پھیکے عقیدوں کو تسلیم کر کے کسی بات کو مشعلِ زندگی قرار دے لینا میرے بس کی بات نہ تھی اور نہ اُوٹ پٹانگ باتوں سے میری تسکین ہوتی تھی۔ دل میں خود بخود اس طرح کے خیالات چکر لگاتے رہتے کہ آخر یہ مُریدین خود کیوں کوئی سیدھا راستہ تلاش نہیں کرتے؟ اس گانے بجانے میں اگر خُدا کا راستہ ہوتا تو تمام قوال اور سارے گویّے صاحبِ باطن ہوتے۔ یہ کوئی صحیح راستہ معلوم نہیں ہوتا۔ اگر یہی بات درست ہے کہ راگ راگنی کا تاثر خدا سے بھی ملا دیتا ہے تو مندروں کی آرتی سے بھی تو ایک کیفیت طاری ہوتی ہے۔ وہاں کے حاضرین کو حال کیوں نہیں آتا۔ کبھی خیال آتا کہ کہیں یہ کوئی شیطانی حرکت تو نہیں جس پر لوگوں نے پاکیزگی کا جھول چڑھا رکھا ہو یا ایسا ہو کہ ان میں بعض لوگ واقعی مقدس ہوتے ہوں اور اکثر جعلی بہروپیے! غرض کہ اسی قسم کی ردّ و قدح پہروں میری تنہائیوں میں ہنگامہ آرا رہتی لیکن کسی خاص نتیجے پر نہ پہنچتا۔ سینکڑوں شکوک اپنی اپنی کھوریوں[1] سے گردنیں اُٹھا اُٹھا کر میرے خیالات کے پیچھے پیچھے ہو لیتے۔

ایک ہم سبق

امیر شاہ یوں تو اچھا خاصا لڑکا تھا۔ نقش و نگار کے اعتبار سے وہ کئی لڑکوں سے بہتر تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور چمکیلی تھیں۔ گندمی رنگ مضبوط ہاڑ گوڑ، مگر بالوں میں وہ تیل کے بجائے مکھن لگاتا تھا۔ شاید اسی وجہ سے اس کے پاس بیٹھ کر ایسی بُو آتی جیسے کسی ڈوک[2] میں پلا سڑ جائے۔ امیر شاہ کو دیکھ کر مجھے اپنے پرانے ہم جماعت امیر خاں اور للّو کی یاد آتی اور ساتھ ہی شمسی کی صورت سامنے پھر جاتی جیسے لونڈو ں

---

[1] کھوری: جانوروں کے بیٹھنے کی جگہ [2] ڈوک: پانی کا گڑھا۔

سے شرابور پیپل کے پتوں پہ صبح کی دھوپ ، امیر شاہ قوم کا تو فقیر تھا مگر وہ خاندان کھاتا پیتا ہونے کے علاوہ اپنے جوگیوں کے محلے میں زمیندار قسم کا تھا۔ اسکول میں بھی وہ اپنی دودھیل بھینسوں اور جوان بچھڑوں کی خوبصورتی اور رنگ و رفتار کی تعریف کرتا رہتا۔ مجھے اس کی اس عادت سے ایسی نفرت تھی کہ سانس اُلجھنے لگتی وہ بے حد چرب زبان تھا اور بولنے میں مجھ پر حاوی رہتا۔ مگر جب میں دیکھتا کہ میری لکنت مجھے مفتوح کئے دے رہی ہے تو میں فوراً ہاتھا پائی پر اُتر آتا۔ اگرچہ ڈیل ڈول میں وُہ مجھ سے کہیں سجل تھا لیکن میں نے ہمیشہ اس کی پٹائی کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی وہ خود بخود مجھ سے قریب ہو کر بیٹھ جاتا اور چھیڑ چھاڑ شروع کر دیتا جیسے ہم دونوں میں کوئی ناقابلِ شکست رشتہ ہے جس دن وہ غیر حاضر ہوتا تو میں بھی دن بھر غمگین تنہائی میں ڈوبا رہتا۔ جیسے ایک ٹکڑی کا کبوتر اُڑتے اُڑتے دیوار سے ٹکرا کر کسی تنگ گلی میں گر پڑے۔ اب بھی مَیں جب اس کا تصور کرتا ہوں تو اُس کا آنکھیں مٹکاتا ہوا چہرہ حاضری سے گریز نہیں کرتا اور اس زندگی کی تیز رفتاری آج ماضی و حال کے درمیان غیر مرئی موجوں کی طرح دکھائی دیتی ہے خدا کرے وہ بخیر ہو۔

انگریزی بال

اپنے ہم جماعتوں کی وضع قطع دیکھ کر یوں تو میں ہر روز ہی ایک نہ ایک حسرت دل میں لاتا تھا۔ لیکن وہ کم عمری ہی میں مفلسی کے انبار سے دب کے مر جاتی تھی۔ ایک دفعہ شوق چرّایا کہ انگریزی بال رکھے جائیں۔ اس میں تو کوئی ایسا لمبا چوڑا خرچ نہیں۔ چنانچہ گھر پہنچتے ہی والدہ کی گردن میں لٹک گیا اور کہا کہ مجھے انگریزی بال رکھنے کی اجازت دیدیں انہوں نے کہا :-

" نہیں بیٹا ! یہ تو گناہ ہے "۔ لیکن جب مجھے بضد پایا تو بولیں -

" اچھا بال تو رکھوا لے مگر اپنے ابا کے سامنے ٹوپی نہ اُتارنا "۔ مَیں نے اقرار کر لیا

اور سیدھا کلّو کے مکان پر جا دھمکا - کلّو ہمارے محلے کا ایک نائی (نائی) تھا اور نہ جانے کب سے پشت در پشت محلے کی حجامتیں کرتا چلا آرہا تھا - ہر فصل میں وہ کھیتوں پر جا کے کسانوں سے فصلانہ لے آتا اور وہی گزی کا ڑھا پہن کر گزر اوقات کرتا، قصبے کے جنوب کی طرف جوہڑ کے قریب ایک کچے جھونپڑے میں کلّو اپنے نیم کی ٹھنڈی چھاؤں میں اوزار لئے بیٹھا رہتا اور جب محلے میں کسی کو حجامت بنوانا ہوتی تو کلّو کے مکان پر جا دھمکتا۔

جب مجھے یہ انگریزی بال رکھوانے کا دورہ پڑا تو غالباً جون کا مہینہ تھا اور کلّو بیچارہ گھٹنوں سے اونچا تہبند باندھے اپنے چھپر میں سو رہا تھا نہ جانے کن قرنوں کی موٹے شیشوں کی عینک چارپائی کے پائے میں لٹک رہی تھی جس میں کمانیوں کی جگہ میل سے رنگے ہوئے ڈورے تھے اور جو حصّہ ناک پر رہتا ہے وہاں ایک دھجی لپٹی ہوئی تھی جو دُور سے موم جامہ معلوم ہوتی تھی۔

"خلیفہ جی! آج تو انگریزی بال کاٹ دو۔" مَیں نے بوکھلائے ہوئے انداز میں کہا۔ کلّو ہڑ بڑا کر پسینہ پونچھتا ہوا اُٹھا اور گھڑوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"میاں! پانی تو ہے ہی نہیں۔ اگر انگریزی بال ابھی رکھوانا ہیں تو سامنے جوہڑ میں سر بھگو لاؤ۔ وہ بال بناؤں کہ رہے نام اللہ کا۔" اُٹھو! اُٹھو! یہ تو ہے ہی جوہڑ۔" کلّو نے کہا ——— گرمی کی دوپہر تھی اور جوہڑ کے چاروں طرف پپڑی جمی ہوئی تھی میں انگریزی بالوں کے شوق میں اگرچہ گھٹنوں تک گارے میں لت پت ہو گیا مگر سر بھگو کے گدّی، کنپٹی اور ماتھے سے کائی کے ریشے جھاڑتا ہوا کلّو کے پاس آ پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی کلّو کلمہ پڑھتا ہوا اُٹھا اور اندر سے ایک ٹوکری سی اُٹھا لایا جس پر ایک میلی دھوتی کا ٹکڑا ڈھکا ہوا تھا جیسے سپیروں کی پٹاری۔

مَیں نے کلّو سے پُوچھا۔

"خلیفہ یہ کیا ہے؟" کلّو اپنی ژولیدہ داڑھی میں خلال کرتے ہوئے بولا۔

"میاں! فرنگی کے راج کی عجیب عجیب باتیں ہیں۔ اب ہم نے بھی انگریزی ڈھب سے کام شروع کر دیا ہے۔ اس میں انگریزی سامان ہے۔"

مَیں نے پوچھا "سامان کیا؟ اَوزار؟"

"اجی میاں اَوزار تو خیر، یہ ہی پوڈر ہے پوڈر" مَیں خوش ہو رہا تھا کہ آج دل کی مُراد پوری ہو گی اور اچھّی طرح انگریزی حجامت بنے گی۔ کلّو دوزانو ہو بیٹھا اور آستین چڑھا کر اُستادانہ ہتھکنڈوں سے میرے سر کو اس شدّت سے رگڑا کہ مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ ہر رگڑے پر سر کی جلد گوشت چھوڑ رہی ہے۔ جب بالوں کی جڑیں کمزور ہو گئیں اور کھوپڑی سے آنچ نکلنے لگی تو کلّو نے ہاتھ بڑھا کر اَوزاروں کی پٹاری کا کپڑا اُٹھایا۔ اس میں قینچی نہیں ایک قینچ دھرا تھا یا ذرا اُس سے اُنیس جس سے عموماً بھیڑیں مونڈی جاتی ہیں یا زین ساز نمدے وغیرہ کاٹتے ہیں۔ ایک بانس کی ڈنڈی کا بغدے نما اُسترا جسے وہ کسی مستری علی بخش کا شاہکار بتاتا تھا۔ اُس کے قریب ہی کسی بچّے کے جوتے کا ایک پُرانا تلا جس پر اُسترا تیز کیا جاتا تھا۔ اس کے پاس ایک ٹوٹی ہوئی کٹورچی اُس میں دھوتنہ کے کپڑے میں بندھا ہُوا پتھّر کے کوئلے کی راکھ اور کھریا کا ایک پوٹلا رکھا تھا جسے اُس نے پاؤڈر کا نام دے رکھا تھا اور کہتا تھا کہ یہ بالکل نئی چیز ہے ابھی تھوڑے دن ہوئے ایک ججمان کے کام سے دلّی گیا تھا وہاں دیکھ کر آیا ہوں۔ سر کی جلد کو بے جان کر کے کلّو نے گدّی پر ہاتھ رکھ کے میری گردن جھکا لی اور ساتھ ہی اُس مصفّیٰ خون اُسترے کو روانگی کا حکم دے دیا۔ مَیں انگریزی بالوں کے چاؤ میں دانتوں میں زبان دبائے جی کڑا کئے بیٹھا تھا اور اُسترا تھا کہ دو دو انگل کے بعد یادگار کے طور پر سُرخی سے دستخط کرتا جا رہا تھا کلّو نے ساری ٹانٹ کو اُجلی کر کے ماتھے پر ایک جُوتے کی کھُری کے برابر بال چھوڑ دیئے اور اس خونی اُسترے کو ہاتھ سے رکھ کر کہنے لگا "لو میاں! ایسی حجامت بنا دی ہے کہ یاد کرو گے۔" ساتھ ہی وہ راکھ اور کھریا کا پوٹلا میری منقّش چاند پر پھیرنا شروع

کر دیا۔ زخموں میں راکھ کا لگنا تھا کہ اُسترے کا ہر نقش آتش زیر پا ہو گیا اور میرے تمام جسم کی رگوں میں چنگاریاں سی بہنے لگیں۔ مگر کلّو کی مہربانی۔ نئے فیشن کی حجامت اور میرے شوق نے لبوں پر مہر لگا دی تھی۔ جب میں اس سُندر روپ میں گھر پہنچا تو ٹوپی اتار کر والدہ کو فخریہ انداز میں سلام کیا، دیکھتے ہی والدہ نے پہلے تو ایک قہقہہ لگایا، پھر جب نزدیک سے انھوں نے سر کو دیکھا تو دِل مسوس کے رہ گئیں اور آگ بگولا ہو کر بولیں "ارے بیوقوف! ان بالوں کو جلد ہی کسی نائی سے مُنڈوا کے آ۔ ایک تو پہلے ہی ماشاء اللہ نُور برستا تھا اِن انگریزی بالوں نے تو اور بھی چار چاند لگا دیئے۔ دیکھ تو اس کلّو کو خُدا سمجھے اُس نے سر کا تو قیمہ کر دیا ہے"۔

مَیں نے آئینہ اُٹھا کر دیکھا تو اپنے درشنوں سے مجھے بھی ہنسی آگئی مَیں فوراً ایک نائی کے پاس گیا کہ بھائی میرے بال درست کر دو۔ اس نے جُونہی میرا سر دیکھا تو کہنے لگا۔

"میاں! سر تو کوئی بنائے اور بال میں ٹھیک کروں؟" مَیں نے کہا "یہ تو خلیفہ کلّو کی بنائی ہوئی حجامت ہے۔"

وہ بولا۔ "اس میں شک نہیں کلّو اُستاد ہے مگر حجامتیں بھی تو الگ الگ ہوتی ہیں۔ یہ تو بتاؤ جب تم حجامت بنوا کر آئے تو کلّو نے کچھ پرہیز بھی بتایا تھا کہ نہیں؟ اس قسم کی حجامتوں میں تو اکثر پرہیزی کھانا بتایا جاتا ہے۔" یہ کہکر اس نے رہی سہی چندیا بھی صاف کر دی۔ اُس کے بعد مجھے مدّتوں انگریزی بال رکھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔

سرّاجی ہمارے محلّے کے متصل ہی سرّاجوں کا محلّہ ہے جو ہر قسم کی زینوں۔ لگاموں اور کاٹھیوں کے علاوہ کسوتیں اور تھیلے وغیرہ بنانے میں مشہور ہیں وہاں کا بنا ہوا مال دُور دُور جاتا ہے۔ مَیں آتا جاتا حاجی سرّاج کی دکان پر کھڑا ہو جایا کرتا اور پہروں اُنہیں کام کرتے دیکھتا رہتا۔ ایک دن حاجی نے مجھے بٹھا لیا اور کہا

"تو روز کیا دیکھا کرتا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ تمھیں کام کرتے دیکھتا ہوں" مَیں نے جواب دیا۔

"کام دیکھنا ہے تو بیٹھ کر دیکھا کر" حاجی نے ذرا نرم لہجے میں کہا۔
اُس دن سے وہ دکان میرا ٹھکانا بن گئی اور جب اُس نے دیکھا کہ یہ مستقل آنے لگا ہے تو کبھی مجھ سے حقّہ بھروا لیا کرتا اور کبھی چھنّے گھوٹنے کے لئے دے دیتا۔ مَیں نہایت دلچسپی سے پالش کرتا۔ اور اُس سے مجھے ایک مسرّت سی ہوتی۔ رفتہ رفتہ مَیں نے سلائی سیکھ لی جب کام زیادہ ہوتا اور وہ سب رات دن کام کرتے تو حاجی مجھے بھی بُلا لیا کرتا اور آتے ہوئے دو چار پیسے بھی دے دیتا۔ چند روز کے بعد میرا ہاتھ سلائی پر ایسا رواں ہو گیا کہ لوگ مجھے سلائی کرتے ہوئے حیرت سے دیکھنے لگے۔ اس محلّے کا کوئی کاریگر کسی غیر قوم کے آدمی کو اپنا فن نہیں سکھاتا تھا۔ اس لئے مجھے کام کرتے دیکھ کر محلّے کے ذمّہ دار لوگوں نے پنچایت کی جس میں حاجی کو تاکید کی کہ یا تو اس لڑکے کا آنا جانا بند کرو ورنہ برادری سے خارج کر دیئے جاؤ گے اور شاید حاجی پر کچھ جُرمانہ بھی کیا۔ حاجی نے مجھ سے براہِ راست تو کچھ نہیں کہا مگر مجھے ایک لڑکے نے یہ ماجرا سُنایا اور ساتھ ہی مَیں نے دیکھا کہ حاجی کچھ غیریت سی برت رہا ہے۔ نہ اچھی طرح بولتا ہے نہ کام دیتا ہے۔ اس کے بعد اُس راستے سے جانے کو میرا جی نہیں ٹھکا اور مَیں نے دوسری گلی اختیار کر لی۔

کھیتی

ایک دفعہ میرے والد نے ایک بنیے کی زمین میں بٹائی پر گیہوں بوئے۔ وہ کاشتکاری کے بڑے حامی تھے۔ شاید اس خیال سے کہ زمین کسان کے ساتھ بد دیانتی نہیں کرتی۔ ایک ایک دانے کا حساب چُکا دیتی ہے اور حقیقت بھی ہے کہ مٹّی نے ازل سے کسان کی محنت کا معاوضہ دینے میں خساست نہیں برتی۔ مگر زمینداروں کی سفّاکی کا کیا علاج؟ میرے والد جب کھیت کی گھاس نکالنے جاتے اور مجھے بھی فراغت ہوتی تو میری والدہ مجھے

ے چرمی بیگ کے بازو والے ٹکڑے

بھی وہیں بھیج دیتیں کہ جا کے اپنے ابّا کے ساتھ گھاس اکھاڑو۔ میں کھیت پر جاتا اور ان کے ساتھ گھاس اکھاڑتا رہتا وہ جب مجھے تھکا ہوا پاتے تو زبردستی گھر بھیج دیتے شام تک جو گھاس نکلتی اٹھا لاتے اور یہ گھاس گھر پر ہی اونے پونے بک جاتی ہیں جب گھر لوٹتا تو راستے کے سبز کھیتوں پر سرسوں کے زرد حاشیئے اور ان پر بادلوں کے ٹہلتے ہوئے سائے مجھے بھلے معلوم ہوتے اور میں کہیں کہیں تو کھڑا ہو جاتا۔

وقت کے ساتھ ساتھ موسم بھی بجلی جیسی تیز رفتاری سے گزرتا گیا جس کا احساس بہت کم ہوتا ہے رفتہ رفتہ وہ وقت آگیا کہ دودھ بھری بالیوں میں خشکی آنے لگی اور ہرے بوٹوں میں دانے گدرانے لگے لہلہاتے ہرے کھیتوں لے سنہری دلائیاں اوڑھ لیں نیم پختہ اناج کی خوشبوئیں کھیتوں پر منڈلانے لگیں اور موسم کی حدت پودوں کی نمی کو پی گئی۔ لالہ میرے والد کی شرافت کو بھی کمزوری ہی خیال کرتا تھا اور کمزور کو زندگی کا حق بمشکل تمام ملتا ہے۔ چنانچہ کھیتی کٹی تو بنیا ہمارے حصے کے تمام گیہوں ہضم کر کے بیٹھ گیا۔ صرف اس جرم میں کہ میرے والد گھاس پھینکنے کی بجائے فروخت کر لیتے تھے والدہ نے جب سنا تو تشکرانہ ادا کر کے رہ گئیں اور والد دل برداشتہ ہو کر اس پریشانی میں پھر مزدوری پر جانے لگے۔ اس واقعہ سے میری والدہ کو بھی رنج پہنچا اور اپنے باپ کی بے بسی سے مجھے ایک دکھ بھری حیرانی ہوئی اور ناداری میری آنکھوں میں مجسّم ہو گئی۔ مجھے خود بخود ایسے خیالات نے گھیر لیا کہ "کیا دنیا میں ہم اسی طبقے سے تعلّق رکھتے ہیں جو امیروں کے ظلم و ستم برداشت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے؟ کیا غریبوں اور ناداروں کی دعاؤں میں اثر نہیں ہوتا؟" یہ میرے بچپن کے ضمیر میں ایسا کانٹا چبھا تھا جو اب تک برابر کھٹک رہا ہے۔

نہ جانے کیوں اب میں کچھ دبّو سا ہو گیا تھا۔ ... سے گھر آکر اسکول کا کام کرتا اور کہیں جانا ہوتا تو والد کو ساتھ لئے بغیر نہ جاتا۔ رات کو وہ مجھے کہانیاں سنایا

کرتے، انہیں حاتم طائی - الف لیلہ - فسانۂ عجائب اور نہ جانے کون کونسی کتابیں ازبر تھیں۔ یہی نہیں فارسی کی بیسیوں غزلیں۔ معانی اور مطالب سمیت ان کے حافظے میں محفوظ تھیں۔ ان کے دوستوں میں کوئی چھچھورا - کھاؤ پیر - اُول جلول اور گھامڑ قسم کا انسان نہ تھا، بلکہ خاندانی اور نستعلیق قسم کے لوگوں سے اُن کے مراسم تھے۔ باغپت کے لوگوں میں لالہ فیروزی لال[1] اور خلیل الرحمٰن گھڑی ساز سے ان کی خط وکتابت تھی اور کاندھلے میں ان کا تعلق محمد رفیق نمبردار، لالہ شیو چرن داس، اور وہاں کی مختصر سی سوسائٹی تک محدود تھا۔ وہ درویش دوست انسان تھے، اور اسی وجہ سے سینکڑوں بوٹیوں کی شناخت اور خواص پر بھی انہیں بڑا عبور تھا۔ وہ جڑی بوٹیوں سے علاج معالجہ بھی کرتے تھے اور اس کا کوئی معاوضہ نہیں تھا۔ ان کے کچھ دوستوں کا اُن پر اس قدر اعتقاد تھا کہ خاندان میں جب بھی کوئی بیمار پڑتا تو وہ انہیں ہی بُلا کر علاج کراتے۔ چنانچہ کاندھلہ کیرانہ - باغپت - انبالہ اور گوہانہ وغیرہ جب کسی کے علاج کے لئے جاتے تو پندرہ پندرہ دن میں گھر آتے اور واپسی پر وہ لوگ سینکڑوں کی رقمیں پیش کرتے لیکن وہ بقدر مزدوری لیتے اس سے زیادہ کو جائز نہیں سمجھتے تھے جس مریض کو دوا دیتے اس کے لئے رات کو تہجد کے وقت دعائیں بھی مانگتے۔ اُن کا کہنا تھا کہ جو طبیب متقی نہیں اور مریضوں کے لئے رات کو دُعا نہیں کرتا وہ کامیاب طبیب نہیں ہوتا اس کے ہاتھ میں شفا نہیں ہوتی اُنھوں نے مجھے بھی سینکڑوں جڑی بوٹیوں کے نام اور ان کے خواص سے آگاہ کر دیا تھا جو آج تک میرے حافظے میں ہیں۔ بعض بعض دفعہ وہ کشتہ سازی بھی کرتے لیکن ان کا

---

[1] لالہ فیروزی لال قصبہ باغپت کے رہنے والے اور میرے والد کے پرانے دوستوں میں تھے۔ ان کی شادی بھی میرے والد ہی نے کی تھی وہ میرے والد کا احترام اپنے والد کی طرح کرتے تھے اور میرے والد انھیں بالکل اسی طرح ڈانٹتے ڈپٹتے تھے جیسے بعض اوقات مجھے۔ خلیل الرحمٰن بھی باغپت کے رہنے والے تھے اور اپنے فن میں مہارت رکھتے تھے۔ میں والد صاحب کے ساتھ ان دونوں دوستوں سے ملا ہوں خلیل الرحمٰن صاحب تو قصبہ باغپت ہی میں انتقال کر گئے تھے اور فیروزی لال قیام پاکستان سے پہلے ہی انبالہ چھاؤنی میں آ گئے تھے اور بزازے کی معمولی سی دکان کرتے تھے۔

رجحان کسی کیمیاگری یا مہوسی کی طرف نہیں تھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ سونا مفرد دھات ہے، مرکب نہیں اسلئے اس کا بننا ناممکن ہے اور اگر کوئی بناتا ہے تو وہ دھوکا دیتا ہے۔ لوگ جوڑا بھی بناتے ہیں، جو بنتا نہیں بلکہ اصل سونے میں دوسری دھات ملاکر وزن بڑھا لیا جاتا ہے اور وہ ہم لوگوں کے دائرۂ جوازسے باہر ہے البتہ وہ سینکڑوں قسم کے کشتہ جات پر حاوی تھے اور جب بھی کوئی دھات کُشتہ کرتے تو مجھے سامنے بٹھا لیتے اور گرد و پیش کے دیگر مسائل پر گفتگو کرتے رہتے تاکہ میرے حافظے میں جگہ پا جائے۔

اسکول سے فرار

پنڈت سیتا رام کا اکلوتا لڑکا رام چندر میرا ہمسایہ ہونے کے علاوہ ہم جماعت اور گلی محلّے کا ساتھی بھی تھا۔ وہ مجھے روز گھر سے بھاگ نکلنے کی پٹّی پڑھایا کرتا۔ مگر میرے ذہن میں اس کے الفاظ نہ بیٹھتے! ایک دن ہم دونوں اسکول جاتے جاتے نٹ کا تماشا دیکھنے لگے۔ میں نے تماشے کے دوران کئی بار اُسے جھنجھوڑا کہ مدرسے چلو دیر ہو رہی ہے مگر اس نے میرا پلّا پکڑ لیا کہ ٹھہرو چلتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب تماشے سے اسکول پہنچے تو دیر ہو چکی تھی۔ ماسٹر نے دونوں کو دھونا شروع کیا اور اس بُری طرح مرمّت کی کہ پڑھنے سے میرا بھی دل اُچاٹ ہو گیا۔ دوسرے دن صبح ہی رام چندر نے پھر بھرّا دیا کہ اسکول میں ہرگز نہ پڑھو۔ چلو کہیں اور پڑھیں گے یا پھر کسی کے ہاں ملازم ہو جائیں گے۔ چونکہ اب میرے دل میں اسکول جانے اور نہ جانے کے خیالات گڈمڈ ہو گئے تھے اس لئے میں نے فوراً اس کی تائید کر دی اس وقت میں ایک معمولی سا کھیس اوڑھے ہوئے تھا۔ رام چندر اپنے گھر جا کر ایک دھوتی اُٹھا لایا اور ہم دونوں کاندھلہ سے چل دیئے۔ قصبہ شاملی تک کے سات کوس طے کرنے کے بعد جب ہم قصبہ بنت* کے سامنے پہنچے تو بھوک کے مارے میرے تو قدم گر گئے۔ میں نے رام چندر سے کہا۔

---

* بنت، شاملی سے غالباً تین میل پر ایک شرفا کی بستی ہے۔

"بھائی واپس چلو۔ کہیں جا کر کیا کریں گے پہنچتے پہنچتے ہی بھوکوں مر جائیں گے"۔ رام چندر نے مرے سے لہجے میں کہا۔

"بھوک تو مجھے بھی بہت لگی ہے۔ اچھا تو یہیں ٹھہر۔ میں بازار میں اپنی فالتو دھوتی بیچ کر آتا ہوں"۔

میں سڑک کے کنارے پیاؤ پر بیٹھ گیا اور رام چندر آناً فاناً میں اپنی دھوتی سات آنے میں فروخت کر کے کچھ تو بھنے چنے اور کچھ شکر قندیاں لے آیا۔ وہیں سڑک کے کنارے کنوئیں پر بیٹھ کر ہم دونوں نے پٹھانے[1] اور شکر قندیاں کھا کر پانی پیا اور چل دئیے۔ ایک خالی ٹم ٹم والے نے ترس کھا کر ہم سے پوچھا۔

"لڑکو! کہاں جاؤ گے؟"

"مظفر نگر"۔ رام چندر نے جواب دیا۔

"اسی طرح جاؤ گے؟" اُس نے دوبارہ سوال کیا۔

"اور کس طرح جائیں بھائی!" میں نے رحم طلب لہجے میں جواب دیا۔

"تھوڑے بہت پیسے ہوں تو آؤ ٹم ٹم پر بٹھا لوں"۔ ٹم ٹم والے نے کہا۔

"پیسے ہوتے تو بھائی ہم پیدل کیوں چلتے؟" میں نے مجبورانہ لہجے میں کہا۔

تھوڑی دُور خاموشی سے چلتے چلتے ٹم ٹم والے نے آواز دی کہ "آؤ بٹراڑہ[2] کی چوکی تک تو تمہیں پہنچا ہی دوں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے"۔

ہم دونوں مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے اور بھاگ کر ٹم ٹم میں بیٹھ گئے۔ اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دُنیا میں اس سے بہتر آرام رساں اور کوئی وقت نہیں آئے گا ———— شام ہو چکی تھی ٹم ٹم والے نے ہمیں چوکی پر جا اُتارا[3] جہاں اِدھر مظفر نگر اور اُدھر شاملی آنے جانے والوں کا اچھا خاصا ہجوم تھا۔ اندھیرے کی

---

[1] پٹھانے: بھنے ہوئے چنے [2] بٹراڑہ: مظفر نگر کے قریب ایک قریہ ہے [3] مجھے آج اُس ٹم ٹم والے کا نام بھی یاد نہیں لیکن میری روح اس کی ممنون ہے۔

دلدل میں ڈوبے ہوئے ہم دونوں ایک طرف بیٹھ گئے۔ اس وقت رہ رہ کر ہماری نظر آسمان کے تالاب میں ستاروں کی سیپیوں پر اُٹھ رہی تھی اور آنے والے وقت سے ڈر رہے تھے، ذرا دیر کے بعد میں نے کہا۔

"بھائی اب بھی ہو سکے تو گھر چلو۔"

سردی سے رام چندر کے دانت بج رہے تھے۔ اس نے ذرا رازدارانہ آواز میں کہا۔ "اب کس طرح جائیں؟"

مَیں نے کہا "کہ یہ کھیس جو ہم اوڑھے ہوئے ہوں اگر کوئی ٹم ٹم والا لے لے اور ہمیں شاملی تک پہنچا دے تو پوچھ لو۔" سردی کی شدّت کے باعث اندھیرا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے جنگل میں سیاہ برف کا طوفان اُمڈ کر جم رہا ہے۔

"مَیں پوچھ کے آتا ہوں۔" رام چندر نے کانپتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز سے سردی کی شدّت ظاہر ہو رہی تھی جس میں ایک مظلومانہ تاثر تھا۔ رام چندر شاملی کے ایک ٹم ٹم والے سے طے کر آیا کہ اگر تم ہمیں شاملی پہنچا دو تو ہم وہ کھیس دے دیں گے جو وہ لڑکا اوڑھے کھڑا ہے۔ وہ خوش ہو گیا اور چلایا۔ "جلدی چلو جلدی، بس دو سواریوں کی جگہ ہے۔ دوکی!"

ٹم ٹم کی سواریاں پوری ہو چکی تھیں۔ رات کا وقت تھا رام چندر کو تو اس نے سواریوں کے ساتھ اپنے پاس جگہ دے دی اور مجھے گدّی کے پیچھے ہودے میں ٹھونس دیا جہاں گھاس بھری رہتی ہے۔ ٹم ٹم شاملی کی طرف روانہ ہو گئی۔ مَیں اپنے کھیس میں منہ لپیٹے سکڑا پڑا رہا۔ کیونکہ ساری گرد میرے منہ کی طرف آ رہی تھی۔ جب سواریوں کے پاؤں میرے سر کو لگتے تو میں ذرا پیچھے کھسک جاتا۔ اور جب ٹانگیں پائیدان سے باہر نکلنے لگتیں۔ تو پھر وہیں سواریوں کے قدموں میں گردن ڈال دیتا۔ کچھ دیر کے بعد ایک سواری نے جوتے نکال کر میری کنپٹی پر رکھ دیئے اور مَیں نے انھیں سرکا کر چپکے سے تکیہ

بنالیا۔ رامچندر بھیگے ہوئے قینچ کبوتر کی طرح سکڑا ہوا سواریوں میں بیٹھا تھا۔ شاملی کے اڈے پر جب ٹم ٹم رکی تو پہلے میں اور پھر رام چندر دونوں لڑکھڑاتے ہوئے اترے میں نے کہا۔

"کیا آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے؟"

اس نے بیمار سی آواز میں کہا "نہیں تو، پاؤں سو گئے ہیں۔"

شاملی میں بارش ہو کر تھمی تھی اور تیز ہوا درختوں کی لٹیں کھینچ کھینچ کر زمین پر بچھ جانے کے لئے مجبور کر رہی تھی۔ ابھی رات آدھی باقی تھی! میں نے کپکپاتے ہوئے اپنا کھیس اتار کر ٹم ٹم والے پر پھینک دیا۔ اب ہم دونوں بغلوں میں ہاتھ دبائے اس فکر میں تھے کہ کہاں جا کر پناہ لیں۔ یکایک رام چندر نے کہا، "چلو سامنے شوالے میں چلیں"۔

"میں تو مسلمان ہوں مجھے شوالے میں کون گھسنے دے گا؟" میں نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم اپنا نام بالک رام بتا دینا" رام چندر فوراً بولا۔

میں خاموشی سے لرزتا ہوا اس کے ساتھ شوالے تک گیا۔ جب شوالے کے احاطہ میں قدم رکھا تو مجھے کپکپی چڑھ گئی اور رام چندر کا سہارا لئے ہوئے سادھو کی دھونی پر جا بیٹھا۔ جہاں ایک بڑا لکڑ پڑا دھندھک رہا تھا اور پجاری دروازے بھیڑے لحافوں میں دفن نیند کے مزے لے رہے تھے۔ سادھو نے میرا نام پوچھا۔

میں نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بالک رام"

اس کے بعد وہ رام چندر ہی سے کچھ کہتا سنتا رہا اور میں نے جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ آگ کے سامنے مجھے فوراً نیند آگئی لیکن تھوڑی دیر میں پشت کی طرف کی سردی نے جگا دیا۔ میں نے دیکھا کہ رام چندر ایک پھٹا پرانا کمبل اوڑھے سو رہا ہے۔ میں نے جہنم اور جنت کے درمیان کروٹیں بدل بدل کر رات گزار دی اور صبح ہوتے ہی دونوں

اُٹھکہ نہار مُنہ کاندھلے کی طرف چل دیئے ۔ رات کی بھوک سے صبح کا یہ سفر دشوار تر ہو رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ٹانگوں کا ست ختم ہوتا جا رہا ہے اور رُوح پر جسم کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہو رہا ہے ۔

خدا خدا کر کے کاندھلہ آیا اور ہم سہمتے سہمتے اپنے اپنے گھر گئے ۔ نہ معلوم رام چندر کے ساتھ کیا گزری ہوگی ۔ میری والدہ نے جب مجھے دروازہ میں دیکھا تو لپک کر سینے سے لگا لیا اور کہا ۔

" بیٹیا تو کہاں ہے ؟ تیرے والد تو کل سے ہی ڈھونڈتے پھر رہے ہیں ۔ رام چندر بھی ساتھ تھا نا ؟ "

مَیں نے کہا ۔ " ہاں وہی مجھے لے گیا تھا ۔ "

" ہاں اُسی کمبخت نے تجھے گھر سے بھاگ نکلنے کی پٹّی پڑھائی ہوگی اور کھیس کہاں ہے ؟ " والدہ نے ماتنا بھرے لہجے میں پوچھا ۔

مَیں نے خاموشی سے گردن جُھکا لی اور پھر انھیں حد سے زیادہ مہربان پاکر تمام سرگزشت کہہ سُنائی ۔ مَیں دیکھ رہا تھا کہ والدہ ایک ایک فقرہ پر بیتاب ہوتی جا رہی ہیں کبھی دیوانوں کی طرح ٹکٹکی بندھ جاتی ہے اور کبھی آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں ۔ شام کو مَیں ابھی باہر سے آیا بھی نہیں تھا کہ والد سے اُنھوں نے سب کچھ کہہ سُنایا اور جب مَیں آیا تو وہ معمولی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد خاموش ہو گئے ۔ ان کا آخری فقرہ یہ تھا کہ " اگر آئندہ اِسی طرح بھاگا تو گھر واپس آنے کی ضرورت نہیں ۔ "

مَیں نے والد کی اس درگزر کو اپنے لئے رحمت سمجھا اور دل ہی دل میں شرمندگی سی ہوئی ، اس میں اپنے بچاؤ کے ساتھ والد کی شفقت کا پہلو بھی اُجاگر ہو کر مجھے اپنی غلطی کے احساس کی طرف لا رہا تھا اور مَیں شرمندہ تھا ۔

دو درویش (۲)

رحمان ——— امانی شاہ

رحمان سنا ہے کہ کاندھلہ ہی کے رہنے والے تھے وہ تمام دن تو نہ جانے کہاں رہتے تھے ہاں جب ریل گاڑی کے آنے کا وقت ہوتا تو وہ ہمیشہ اسٹیشن پر ہی نظر آتے، اگر میاں ہوں یا سردیاں وہ ہمیشہ کھیمن بھڑ بھونجے کی دکان میں سویا کرتے جہاں وہ دانے بھونتا تھا اور جس میں کوئی کواڑ وغیرہ نہیں تھا۔

رحمان صاحب کو اکثر خاموش دیکھا گیا، کبھی کبھی جب اُنہیں محلّے کے بچے تنگ کرتے تو وُہ بچوں کو دھمکاتے اور لٹھ دکھاتے لیکن انھوں نے کبھی کسی بچے کو مارا نہیں اور نہ کبھی کسی سے سوال کیا۔ جب اُنھیں کھانے پینے کی ضرورت ہوتی تو کہیں نہ کہیں خاموش کھڑے ہو جاتے اور آس پاس کے لوگ کھانا لے کر دوڑ پڑتے لیکن وُہ کبھی ضرورت سے زیادہ نہ لیتے اور نہ دُوسرے وقت کے لئے رکھتے، گورا رنگ پتلے پتلے سُرخ ہونٹ، سنہری اُلجھی ہوئی ڈاڑھی، غلافی آنکھیں، درمیانہ قد خاموش تنہا بیٹھ کر ہنسنے رونے کے عادی، نہ اُنھیں دُعا کرتے دیکھا نہ دوا لیتے، اُن کی صورت ابھی تک میرے سامنے ہے، قصبہ کے لوگ اُنھیں ُولی اللہ' خیال کرتے تھے اور وہ مجذوبیت کی طرف مائل تھے، دنیا و ما فیہا سے مطلق بے خبر و بے نیاز۔ سدا اُنھیں اسی ادا میں دیکھا۔

امانی شاہ:۔ یہ امانی شاہ تارک الدنیا قسم کے درویش تھے۔ پکا رنگ، خمیدہ کمر۔ نیلا تہبند اور نیلا انگوچھا کرتا، وہ تمام دن نہر جمن شرقی پر کہیں نہ کہیں آبادی سے دُور بیٹھے رہتے اور سینکڑوں بندر اُن کے اردگرد جمع رہتے، کبھی شاہ صاحب

بندروں کا سر سہلاتے نظر آتے اور کبھی بندر اُن کے کندھوں پر سوار دیکھے جاتے، اُن کے ہاتھ میں ایک معمولی سی لکڑی سہارے کے لئے رہتی تھی لیکن بندر اُن کی لکڑی سے نہیں ڈرتے تھے بلکہ بعض اوقات بندر کتنی کتنی دُور اُن کی لکڑی پکڑ کر چلتے جیسے کوئی رہنمائی کر رہا ہو

وہ علی الصبح شہر میں آتے اور کسی نہ کسی دروازے پر بڑی آہستہ سے دستک دیتے اُنھیں کہیں کسی بازار میں نہیں دیکھا گیا۔ وہ نہایت لکھے پڑھے مگر آدم بیزار قسم کے انسان تھے، نہ جانے کیوں وہ میرے والد صاحب سے کچھ مانوس سے تھے کبھی کبھی بڑی بڑی دیر بیٹھتے اور بڑی نستعلیق اور فلسفیانہ گفتگو کرتے، مجھ سے انھیں ایک خاص لگاؤ تھا۔ وہ کبھی کبھی بندروں کی طرح میرا سر بھی سہلاتے اور میرے سینے پر کچھ پڑھ کے دم کرتے رہتے

ایک دن میں نے اُن سے کہا، شاہ صاحب آپ نہر کے کنارے تمام رات کھلی فضا میں رہتے ہیں کیا آپ کو سردی نہیں لگتی؟ شاہ صاحب نے کہا ہاں بیٹیا سردی تو کبھی کبھی اپنا رنگ دکھاتی ہے مگر میں بستی کے کسی نہ کسی چراغ پر نظر جما لیتا ہوں اور سردی پھر قریب بھی نہیں آتی۔

مَیں نے کہا اس کی کیا وجہ؟

اُنھوں نے فرمایا تُم ابھی اس بات کو نہیں جان سکتے۔ ہم درویشوں کے لئے جگہ جگہ الاؤ لگے ہوتے ہیں، جب بڑے ہو جاؤ گے تو شاید تمہیں معلوم ہو سکے۔

یُونہی ایک دن امانی شاہ سے مَیں نے سوال کیا، شاہ صاحب آپ بیمار بھی ہوتے ہیں کبھی؟

فرمایا، ہاں کبھی کبھی بیمار ہو جاتا ہوں، مگر مَیں ایک دفعہ بچپن میں بیمار ہوا تھا اس میں میری والدہ نے مجھے دوا پلائی تھی اور مَیں تندرست ہو گیا تھا، اب جب کبھی بیمار ہوتا ہوں، اُسی دوا کا تصوّر کر لیتا ہوں اُس سے میرا مُنہ بھی کڑوا ہو جاتا ہے اور آرام بھی محسوس ہونے لگتا ہے، اس کے علاوہ بعض جنگل کی جڑی بُوٹیاں جنہیں مَیں جانتا پہچانتا ہوں

کھاتا پیتا رہتا ہوں اور بحمداللہ میری صحت برقرار رہتی ہے، اس کے علاوہ ہم فقیروں کی سادہ خوراک بھی صحت کی ضامن ہوتی ہے کیونکہ ہم جسم اور رُوح کی اشتہا ایک ہی غذا سے پُوری کرتے ہیں، دستر خوان پر گوشت خور جانوروں کی طرح شکم سیر ہونے والے ڈھیل لوگوں کی توندیں بڑھ جاتی ہیں، اور ہڈیوں کی کشش کم ہونے سے گوشت اِدھر اُدھر لٹکنے لگتا ہے، دیکھتے نہیں امیر لوگوں کے پھُول پھُول سے بچّے صرف غذا کی بے احتیاطی سے گوشت کے بے تُکے تودے ہو کر رہ جاتے ہیں، غذا میں احتیاط برتنا اور حرام و حلال میں تمیز کرنا بھی ایک قسم کے اتقا اور پاکیزگی میں شمار ہے۔ عموماً اہل اللہ اور صاحب احتیاج لوگوں میں یہ بات پائی گئی ہے اور انہیں یہ کتنے بھی سُنا ہے کہ سادہ خوراک سے پیٹ بھرنے والا انسان اپنی تلاش اور ذات کی شناخت میں جلد کامیاب ہو جاتا ہے۔ بعض بعض مرتاض قسم کے درویش تو اس کھانے پینے کی بے جواز زندگی سے بھی پیچھا چھڑا لیتے ہیں۔ ہر دوار میں کئی درویش ایسے ملے کہ اُن کی یکسوئی میں سانس کی آمد و شد اور دل کی دھڑکن بھی مخل ہوتی ہے۔ ہر چند کہ یہ خُدا رسی نہیں لیکن لذّت اس میں بھی کم نہیں ہے۔

مقوّی اور روغنی غذائیں خواہش نفسانی کے ساتھ بے غیرتی اور بدتمیزی کے غدود دل کو بڑھاتی ہیں یہی سبب ہے کہ دولت مند بقدر سرمایہ شہوانی خواہشات کے غلام نظر آتے ہیں۔

ایک دن میں نے شاہ صاحب سے پوچھا کہ جنگل کی تنہائی میں آپ کا جی نہیں گھبراتا؟

وہ بڑے اِطمینان سے بولے۔ بیٹا اس زمین کے کُرّے پر مجھے جو چاروں طرف نظر آتا ہے اُس کے مشاہدے سے اتنی فرصت کہاں کہ کسی اور طرف سوچ سکوں۔ ابھی تو انسان کی معلُومات کے لئے چاروں طرف راز ہائے سربستہ کے انبار لگے ہُوئے ہیں، ابھی ہزاروں نسلوں تک انسان گرد و پیش کی تحقیق و تدقیق سے فرصت نہیں پا سکے گا، جب تک یہ تمام موجودات علم انسانی کے آثار قدیمہ میں نہ آ جائیں اس وقت تک نسلِ انسانی کے دِل و دماغ سکون نہیں پا سکیں گے، مگر یہ باتیں ابھی تمہارے سوچنے سمجھنے کی

نہیں ہیں یہ تو قدرت کے پروگرام ہیں اور قرآن کریم نے یہ سب معاملے صاف کر دیئے ہیں۔

دفینہ

میرے اسکول کے ساتھی رامچندر کا باپ پنڈت سیتارام جوتش کا بڑا ماہر تھا اور اسی جوتش کی آمدنی پر اس کے خاندان کا دارومدار تھا۔ ایک دن میرے والد نے اس سے پوچھا "پنڈت جی! بتاؤ کہ کبھی ہمارے دن بھی پھریں گے یا یونہی جان کھپاتے گزر جائے گی؟"

سیتارام نے اُن کا نام پوچھا اور پھر کاغذ پر کچھ خانے کھینچے جیسے تعویذوں کے لئے کھینچے جاتے ہیں۔ پھر کچھ کنڈلیاں سی بنائیں اور بڑی دیر تک جمع تفریق اور ضرب و تقسیم کے سوالوں کی طرح کچھ کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر انہماک تھا اور گھنی بھنویں بار بار جونکوں کی طرح حرکت کر رہی تھیں۔ اس لئے بڑی دیر تک وہ سوال سے حل کر کے کہا۔ "اچھا۔ بات بتائیں اور ایسی بتائیں کہ سب دِلدّر دُور ہو جائیں! بتاؤ ہمیں کیا دو گے؟"

میرے والد:۔ "وہ تو آپ ہمیں دیں گے، ہم کیا دیں گے ظاہر ہے کہ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں جو ملے گا وہ آپ ہی دلوائیں گے۔"

سیتارام:۔ "یوں نہیں، صاف صاف بات کریں۔"

میرے والد:۔ "تم بھی تو کچھ بتاؤ کہاں سے آئے گا کتنا آئے گا اور کیسے آئے گا؟"

سیتارام:۔ "اگر خزانہ بتا دوں تو کہو کیا دو گے؟"

میرے والد:۔ "دیتے دینے کیا دونوں آدھا آدھا کر لیں گے۔"

سیتارام:۔ "نہیں آدھا نہیں، چوتھائی مجھے دے دینا۔"

میرے والد:۔ "اگر نہ ملا تو؟"

سیتارام :۔ " جو اس میں صرف ہو گا میں دوں گا ! بطورِ جرمانہ !! "

میرے والد :۔ " بتاؤ نا پھرا کہاں ہے ؟ "

سیتارام :۔ " تمہارے مکان کے پیچھے کوٹھڑی میں دفن ہے "

میرے والد :۔ " بات پکّی ہو گئی ؟ کل صبح اس کی کھدائی کریں گے ! تم بھی آ جانا "

سیتارام :۔ " میرے بغیر کیسے کام ہو گا ؟ مَیں تو ضرور آؤں گا "

چنانچہ صبح ہوتے ہی میرے والد نے کھدائی شروع کر دی اور سیتارام آ کر بیٹھ گیا میرے ایک رشتہ کے ماموں بھی آ دھمکے جو ٹھیکیداری کرتے تھے۔ کوٹھڑی کھودتے دیکھا تو میرے والد سے پوچھنے لگے۔

" کیا بات ہے، یہ کھدائی کیسی ہو رہی ہے ؟ "

میرے والد نے سیدھے سبھاؤ سیتارام کی نشاندہی کے متعلق سب کچھ کہہ دیا اور کہا " پنڈت جی سے چوتھائی پر بات ہو گئی ہے "

وُہ ٹھیکیدار تو تھے ہی آگ بگولا ہو گئے اُور کہنے لگے۔

" بزرگوں کی چیز کے مالک تم اور سیتارام ہی ہو اور کوئی نہیں۔ ہم لوگ تو مر گئے ہیں نا ! "

سیتارام نے کہا۔ " مجھے آپ جو چاہے دیدیں لیکن یہ نکل تو آنے دیں "

ماموں صاحب تو چُپ ہو گئے مگر سیتارام کی تیوری چڑھ گئی وہ بادلِ ناخواستہ بیٹھا تاؤ کھاتا رہا مگر نہ جانے وہ بیٹھا کیوں رہا ؟ چلا کیوں نہیں گیا ؟ آخر جب کوٹھڑی تگڑی تگڑی کھُد گئی اور دیواروں کی بنیادیں ختم ہو گئیں لیکن کچھ نہ نکلا تو میرے والد مایوس ہو گئے اور ماموں نے سیتارام کو ڈانٹنا ڈپٹنا شروع کر دیا۔

سیتارام خاموش تھا اور آخر اس نے نہ جانے کیا سوچ کر ہلکے سے انداز میں کہا " اچھا۔ ایک ایک فٹ اور کھود لو "

چنانچہ میرے والد پھر کھودنے لگے کوئی ایک فٹ گہرائی کے بعد کوٹھڑی کے بیچوں بیچ پھاوڑا کسی پتھریلی سخت چیز پر لگا ۔ میرے والد نے سمجھا کوئی اینٹ وغیرہ ہے لیکن سیتارام نے کہا "اتنے نیچے اینٹ کا کیا کام ہے یہیں کھودو"
سطح تک کھود کر مٹی ہٹائی تو چارپائی کے برابر پتھر کی سل نکلی جو ایک چاہ بچہ نما چھوٹے حوض پر ڈھکی ہوئی تھی۔ سیتارام نے کہا۔

"سل اٹھاؤ اور دیکھو"

جونہی سل ہٹائی گئی تو معلوم ہوا کہ وہاں تو کوئلے ہی کوئلے ہیں۔ کوئلوں پر نظر پڑتے ہی سیتارام چلایا۔

"لو تمہاری نیت کی خرابی سے کوئلے ہو گئے۔ میرا اس میں کیا قصور ہے ؟ میرا حساب غلط ہوتا تو یہ پتھر کی سل کیوں نکلتی ؟"

یہ کہہ کر سیتارام تو اٹھ کر چلا گیا اور گھر جا کر اپنے لڑکے رامچندر کو بھیج دیا۔ میرے والد اور ماموں نے مایوس ہو کر سل تو نکال لی اور کھدی ہوئی مٹی بھر کر زمین ہموار کر دی میرے والد کو تو اپنی قسمت پر افسوس ہوا لیکن سیتارام اپنے فن اور نشاندہی پر نازاں تھا اور دونوں اپنی اپنی جگہ حق بجانب تھے۔

باغ باڑی :۔ رام لیلا میں بھرت ملاپ کے دن لٹنے والی پھلواڑیاں بنانے والے چھیپی[1] میرے راستے ہی میں ایک جگہ کام کیا کرتے تھے۔ میں نے روز تھوڑی تھوڑی دیر ٹھٹکنا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی بازار سے کاغذ لا کر اسی طرح پھلواڑی بنا لیا کرتا۔

ہمارے محلے کے نمبردار کا بڑا لڑکا اس فن کا ماہر تھا مگر اس قدر خسیس کہ کسی کے

---

[1] ایک قوم ہے۔ یہ لوگ شادیوں کے لئے سہرے، موڑ اور رام لیلا وغیرہ کے لئے پھلواڑیاں بناتے ہیں اور شادیوں میں لٹنے کے لئے باغ باڑی بھی۔

سامنے ایک پتّی میں چُنٹ تک نہ ڈالتا اور گلدستے تیار کرکے اچھی خاصی قیمتیں وصول کرتا۔ اس کی دکان لبِ راہ تھی۔ بھرت ملاپ کے بعد اُس کی محتاط خاموشی مجھے غور و فکر کا درس دیتی رہی اور میں نے پھلواڑی کے ساتھ پتنگ بنانا بھی سیکھ لیے۔ روز دو ایک پیسے کا کاغذ لانا اور پتنگ بنا کر بچوں کے ہاتھ بیچ دیتا۔ اس پتنگ سازی کے ساتھ ہی محلے کے آوارہ گرد بچّوں کو دیکھ کر میں پتنگ اُڑانے لگا۔ میرے والد نے پہلے تو مجھے روکا اور جب مجھ پر نصائح کا اثر نہ دیکھا تو خود میرے شوق میں شامل ہوگئے۔ پہروں کانچ کے ٹکڑے۔ گُج۔ میدہ لکڑی۔ مروڑ پھلی اور نہ جانے کیا کیا اَٹر کباڑ کوٹتے چھانتے رہتے اور دوپہر کی کڑکتی دھوپ میں مجھے مانجھا سونت کر دیا کرتے۔

ایک دن مَیں ان کی عدم موجودگی میں پتنگ اڑا رہا تھا کہ کوٹھے کی ایک پرانی اور شکستہ منڈیر پہ پاؤں بہک گیا اور میں دو منزل کی اونچائی سے نیچے ایک گھوُر پر آ رہا۔ پاؤں کے ٹخنے پچ گئے اور ایسی شدید ضرب آئی کہ بمشکل تمام ایک آدمی کی پیٹھ پر مجھے گھر پہنچایا گیا۔ جب والد آئے اور انھیں میری چوٹ کے متعلق علم ہوا، تو سُن کر ایک دفعہ تو اُن کا رنگ فق ہوگیا۔ مگر پھر فوراً ہی کہنے لگے کہ کوئی پروا کی بات نہیں۔ پتنگ بازی میں تو چوٹ لگا ہی کرتی ہے۔ دوسرے دن شام کو اُنھوں نے خود پتنگ چڑھائی اور کہنے لگے۔

"لو! چارپائی پر بیٹھے بیٹھے پیچ لڑاؤ۔"

مگر مَیں پتنگ بازی سے ایسا متنفّر ہو چکا تھا کہ پتنگ کا نام بھی ناگوار تھا۔ میں نے کہا کہ "یہ ڈور جلا دیں اور پتنگ پھاڑ دیں۔"

چنانچہ ڈور تو والدہ نے کپڑے سینے کے لئے رکھ لی اور پتنگ والد صاحب نے جلا ڈالا۔

اُن دنوں ہمیں منشی اُگر سین پڑھایا کرتے تھے وہ ادیبوں اور شاعروں کی سوسائٹی کے آدمی تھے ان کا طرز و طریق دوسرے اُستادوں سے قطعی جدا تھا۔ ان کے رویّے میں دوستانہ سلوک اور اُستادانہ برہمی ایسی گتھی ہوئی تھیں کہ کسی بچے میں نہ گستاخی کی جرأت تھی نہ جھجک کا امکان۔ وہ جہاں ہنس مکھ تھے وہیں مدبّر بھی۔ جب وہ گھُڑکتے تو جماعت کو سانپ سونگھ جاتا اور جب دل لگی پر اُتر آتے تو پہروں ہنستے ہنساتے رہتے۔ اُن کی اِس ہنسی اور دِل لگی میں معلومات کا ایسا ذخیرہ ملتا کہ بچے دلچسپی کے باعث تمام اُستادوں میں انہی کو چاہتے تھے۔ اُن کی قابلیت، طبیعت اور کارکردگی سے سب واقف تھے اس لئے اسکول سے علیحدگی کے بعد قصبہ کے ایک رئیس نے انہیں بطور کارندہ جگہ دیدی تھی اور وہ وہاں بھی اُسی طرح ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ معلوم اب کس عالم میں ہیں۔

رنگ سازی:- ان ہی دنوں لالہ مولھڑمل نے اپنی حویلیاں اور رتھ رنگوانے کے لئے میرٹھ سے محمد رمضان کمنگر کو بلوایا تھا۔ ہم محلہ ہونے کی وجہ سے ان کے گاڑی بان سمندخان کے لڑکے نبطر سے بھی میرا میل ملاپ تھا۔ وہ میرا ہم عمر اور بڑا ہی شوخ مزاج لڑکا تھا۔ جب میں رمضان کو بیلوں پر پھول بناتے دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ چنانچہ سمندخان کی معرفت رمضان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مجھے یہ کام سکھا دے۔

دوسرے دن جب میں بہل خانہ میں گیا تو رمضان نے مجھے کھُرچائی پر لگا دیا اور کئی دن کھُرچائی کراتا رہا۔ پھر جن جن چیزوں کی کھُرچائی ہو چکی تھی اُن پر یہ کہہ کر کہ رنگ میں گڑھی یا جھٹکی نہ رہے نہ لگوائی اس کے بعد پھر ریگ مال دے دیا کہ تمام چیزوں کو صاف کر دے۔ جب صفائی اس کے حسبِ منشا ہو چکی تو سفیدے کی زمین پر اُس نے پھول پتّے شروع کئے۔ خدا کے فضل و کرم اور اساتذہ کے فیضِ نظر سے

مجھ میں پھول پتی بنانے کی سُوجھ بُوجھ پہلے سے تھی۔ اس لئے مَیں نے ایک چھوٹی سی تختی پر سفیدہ لگا کر ایک گلدستہ سا بنایا۔ رمضان نے جب مُجھ میں ذرا شُدبُد دیکھی تو اس نے پہلی کے سپاٹے شکستہ پاروں کے خط لگا کر میرے سپرد کر دیئے جب مَیں اُنھیں بنا چکا تو اُس نے اُستادانہ رویّہ کے تحت کہیں کہیں نوک پلک درست کر دی اور مَیں دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے مجھے خاموشی سے "جُرا" دے دیا۔ اور مَیں نے اُس کی ہدایت کے مطابق وُہ بھی بنا ڈالا اور اسی طرح میں ادھر چل نکلا۔

موٹھر مل کا کام ختم ہو جانے پر لالہ بھگوتی پرشاد اور سیٹھ مل کی گاڑیاں کھول لیں اور میرا یہ معمول ہو گیا کہ اسکول سے آکر جو فراغت کا وقت ملتا رمضان کے ساتھ کام کر کے گزارتا۔ یہ کام ختم کر کے رمضان میرٹھ چلا گیا اور کہہ گیا کہ "اب کی بار آؤنگا تو اس لڑکے کو باقاعدہ شاگرد کروں گا۔ اگر یہ کمبخت میرے ساتھ چلے تو اچھا خاصا کاریگر ہو جائے۔"

مَیں مہینوں انتظار میں رہا مگر رمضان نہ آیا۔ اب پھر میرا مشغلہ وہی اسکول کی آمد و رفت تک رہ گیا۔ روز کا راستہ ہونے کے باعث بازار کی بِھیڑ بھڑکا اور بازاری چیزوں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ طبیعت اور اُلجھتی۔ کیونکہ ہم ہی سب لڑکوں میں ایک ایسا تھا جس کے پاجامے اور کُرتے میں پیوند لگے رہتے تھے۔ خود بخود مَیں نے وُہ راستہ چھوڑ کر تیبٹری[1] میں سے آنا جانا شروع کر دیا۔ یہ وہی راستہ ہے جہاں سے مَیں للّو کے ساتھ جایا کرتا تھا اور للّو بعض دفعہ مجھے گھر تک چھوڑنے آتا۔ اور راستہ میں شمّی کی باتیں کرتا کہ میرے بھائی رمضانی صاحب اُس کی بڑی تعریف کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ابھی سے اُسے گلے پر قابو ہے اور آواز میں سُریلی جھنکار۔ کسی وقت وہ بلا کی فنکار ہو جائے گی۔

---

[1] تیبٹری ایک محلّہ ہے۔ چونکہ وہاں تھانک کے سامنے سے تین بڑی گلیاں چلتی ہیں شاید اس لئے اُسے تیبٹری کہتے ہیں۔

قاضی محمد زکی صاحب

اسکول میں سالانہ مرمت کے ساتھ لیپ پوت ہوا کرتی تو اسکول کے اساتذہ بھی تصویریں بنایا کرتے اور بچوں کی بنائی ہوئی اچھی تصویریں بھی کمرے میں آویزاں کیا کرتے۔ اس سلسلے میں اسکول کے کئی لڑکے قاضی محمد زکی صاحب زکی سے بھی تصویریں بنوا کر لاتے اور اپنے نام سے زیبِ دیوار کر کے اپنا نام بلند دیکھتے اور خوش ہوتے۔

قاضی محمد ذکی صاحب زکی گرد و نواح میں معروف بزرگ تھے۔ عربی۔ فارسی سنسکرت اور اردو میں اعلیٰ قابلیت رکھنے کے علاوہ بلند درجے کے شاعر اور چابکدست مصوّر بھی تھے۔ خصوصاً لائف اسکیچ میں اُنھیں بڑی مہارت تھی ویسے وہ گلکاری اور ڈریزائننگ میں بھی بڑے بہار قلم فنکار تھے جب وہ کسی کو سامنے بٹھا کر تصویر بناتے تو اصل سے ٹکر کھانے لگتی۔ اور جب وہ خطِ گلزار میں کچھ لکھ دیتے تو اُن کے خطوط منہ سے بولنے لگتے۔

ایک دِن میرا ایک ہم جماعت جو ایک غریب مالی کا لڑکا تھا مجھے اپنے ساتھ قاضی صاحب کے یہاں لے گیا۔ قاضی صاحب اُس پر مہربان تھے کیونکہ وہ ہندی میں بلا کا خوش نویس تھا لیکن اردو میں میری تختی بھی دوسرے اسکولوں تک مقابلے کیلئے جاتی تھی، اور کاندھلے کے اسکولوں کے اساتذہ میرے نام سے واقف تھے۔ میرے ہاتھ کے ترشے ہوئے گارے کے حروف، مٹی کے سکتے، اور دیگر اشیاء اسکول کی مخصوص الماریوں میں محفوظ کر کے معائنہ کرنے والے افسروں کو دکھائی جاتیں۔ بابو رام نے کہا۔

"قاضی جی! اس لڑکے احسان کا خط بھی آپ نے دیکھا ہے یا نہیں؟"
"بھئی لڑکوں سے اس کا نام تو سُنا ہے تختی نہیں دیکھی۔ بیٹا ذرا کچھ لکھو تو سہی!"

قاضی صاحب نے نہایت کریمانہ لہجے میں کہا۔ میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور دو چار لفظ جن کی خاص طور پر مجھے مہارت تھی لکھ کر پیش کر دیئے۔ قاضی صاحب بہت خوش ہوئے اور کہا کہ چھٹی کے بعد یہاں آجایا کرو اور ساتھ ہی پنسل کاغذ اٹھا کر ایک گملا سا بنا دیا۔ میں خوشی خوشی اسکول آگیا اور اس دن سے قاضی صاحب کے یہاں آنا جانا ہو گیا۔ ان کے فیضانِ کرم سے مجھے ہوش آنا گیا اور میں ایسا محسوس کرنے لگا جیسے کسی بوجھ کے نیچے سے نکل رہا ہوں۔ وہ بذاتِ خود تو ایسے تھے کہ سراپا مایوسی اور غم کی تصویر بن کر رہ گئے تھے مگر دوسروں کو غمگین نہیں دیکھ سکتے تھے جب کوئی ان کے سامنے اپنی مجبوریاں بیان کرتا تو اس کے سامنے سے ہٹ کے گھر میں چھپ چھپ کر رو دیا کرتے اور پھر اس کی امداد کے لئے جو ہو سکتا سلوک کرتے میرے بہت سے فاقوں کی شکست کا سہرا انھیں کی نوازشوں کے سر ہے۔ ان کا دل غم سے اس قدر مالا مال تھا کہ جب وہ کسی کا غم دیکھتے یا سُنتے تو ان کی ٹھنڈی سانسوں میں ذندانے پڑنے لگتے اور آنکھوں سے آنسو نہ سنبھلتے۔

جب کوئی نیا آدمی ان کے یہاں آتا تو فوراً مولا بخش حلوائی کی دکان سے مٹھائی آجاتی اور سب مل کر کھاتے۔ یوں بھی جب یار لوگوں کا مٹھائی کھانے کو جی چاہتا تو کسی اجنبی کو ساتھ لے کر قاضی صاحب کے یہاں آدھمکتے اور قاضی صاحب تعارف کے بعد فوراً مٹھائی کا آرڈر بھجوا دیتے اور اس تعارف کے بہانے ہمراہیوں کا چٹورپن پورا ہو جاتا۔ قاضی صاحب کی یہ وضعداری اور تواضع گرد و نواح میں مشہور تھی۔

وہ قاضیٔ شہر بھی تھے اور رئیس بھی، لیکن قضا کا کام انھوں نے ایک اور بزرگ[1]

---

[1] قاضی محمد یوسف صاحب۔

کے سپرد کیا ہوا تھا۔ ان کے نہ تو کوئی اولاد تھی اور نہ کوئی ایسا قریبی رشتہ دار جس سے
اُن کا گہرا لگاؤ ہوتا۔ جو دُور پرے کے رشتہ دار تھے وہ ان کی کم توجہی سے نالاں تھے
نتیجہ یہ کہ قاضی صاحب عزیزوں کی خود غرضی اور اپنی سادہ خاطری کے باعث گوشہ نشینی
پر مجبور ہوگئے تھے۔ اب گھر میں قدر شناسوں اور مزارعین کی آمد و رفت کے علاوہ مجلس
شعر و سخن اور غربا کی امداد اُن کا مشغلہ سا بن چکا تھا۔ اُن میں جاگیر دارانہ فرعونیت
نہیں تھی۔ وہ دوستوں ہی کی نہیں، پاس آنے جانے والوں کی ضرورتوں کا بھی خیال
رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے یہاں آنے جانے والے غریب لوگوں کو دُکانیں اور مکانات بھی
دیئے اور نقدی سے بھی مدد کرتے رہتے تھے۔ بیواؤں اور یتیموں سے ہمدردی کے
علاوہ کئی غریبوں کے بچوّں کی تعلیم کے مصارف بھی قاضی صاحب ہی اُٹھاتے تھے۔

قاضی صاحب کی سوسائٹی اور ماحول میں رچ بچ جانے سے مصوّری اور شاعری
کے معمولی عیوب و محاسن کی شُد بُد کے علاوہ میری نظر دنیوی نشیب و فراز اور سماجی
اُونچ نیچ سے بھی اُلجھنے لگی تھی کیونکہ وہاں قصبے کے معززین کے علاوہ ایک ایک دلی کھنگر[ـه]
اور شہر خبرا ایسا پہنچتا تھا کہ خدا کی پناہ۔ کوئی قصبے کی خبروں کا چلتا پھرتا ماسٹر
کوئی دیہات کے واقعات کا ہنستا بولتا ٹیلی پرنٹر۔ کوئی جنسی معلومات کا انسائیکلو پیڈیا۔
اور کوئی بے سوچے سمجھے اَنٹ شنٹ داغنے والا دھنتر۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ قاضی صاحب
حتی الوسع سب کی دلجوئی کرتے اور ضرورتوں کا خیال رکھتے تھے۔

قاضی صاحب سے مجھے عقیدت اور اُنھیں مجھ سے ہمدردی تھی۔ میری شاعری
کی بُنیاد اُنھیں کے فیضانِ کرم کی رہینِ منت ہے۔ وہ اپنے کلام کی اشاعت کے سخت
مخالف تھے کیونکہ اُن کی مایوسی مکمل ہو چکی تھی۔ ان کے پاس ان کے کلام کی کئی بیاضیں
تھیں جن سے وہ وقتاً فوقتاً اپنا کلام سنایا کرتے تھے۔ نہ معلوم وہ دولت کس کے ورثے
میں آئی۔ کاش میری معاشی جانکنی مجھے ترکِ وطن پہ مجبور نہ کرتی اور میں اُن کی کچھ خدمت

[ـه] دلی کھنگر، تجربہ کار اور ہر طرح کی معلومات رکھنے والا۔

کر سکتا۔ میری رُوح ان کی بے لوث کرم فرمائیوں کی معترف ہے اور رہے گی۔

نتیجہ یہ ہُوا کہ میں اسکول میں خود کو سب لڑکوں سے الگ سا محسوس کرنے لگا، اور لڑکوں کی صُحبت سے ایک قسم کی ناپسندیدگی سی ہو گئی۔ سب سے پہلے اسکول پہنچ جاتا اور سارے دن خاموشی سے کام کر کے گھر چلا آتا، اور پھر جلدی جلدی اسکول کا کام کر کے قاضی صاحب کے وہاں جا دھمکتا۔

دُنیا میں کون کسی کا ہوتا ہے۔ چنانچہ قاضی صاحب بھی کس مپرسی اور گوشہ نشینی کے عالم میں اپریل ۱۹۳۹ء میں وفات پا گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ان کے انتقال کے بعد جب میں کاندھلے گیا تو ان کا مکان سرکاری عمال کے قبضے میں تھا۔ جو زمینیں اور مکانات باقی رہ گئے تھے ان کی حقوق رسانی کے لئے دُور پرے کے لواحقین درخواستیں لئے پھرتے تھے نہ جانے کس کے ہاتھ کیا آیا؟

اُستاد کے علاوہ میں تو آج اُنھیں ایک صاحب باطن بزرگ بھی خیال کرتا ہوں کیونکہ اپنی اسکول کی تعلیم دیکھتا ہوں تو ان کی تقسیم علم اور توجہ کو تفویض تو کہہ سکتا ہوں، تعلیم کہنے میں مجھے تامل ہے۔ اُنھوں نے اُس وقت مجھے جو کچھ دیا یا بتایا اسی کی شاخیں میری زندگی اور لٹریچر میں برگ و بار لا رہی ہیں۔ آج بھی مَیں ان کی شفقتوں کو یاد کر کے دل میں گداز محسوس کرتا ہوں۔ اُنھوں نے میرے بچپن کو آنکھوں دی تھیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ افلاس کے اس اندھیرے میں اگر علی الصبح کھانے کا بندوبست نہ ہو سکتا تو میرے والد دوپہر تک کہیں سے اُدھار سُدھار لے کر اسکول میں کھانا پہنچاتے اور میں مدرسے کے برابر والی مسجد میں گھر سے آئی ہوئی روٹی بھوک میں اندھے باولوں کی طرح کھاتا۔ کئی بار میں نے یہ بھی دیکھا کہ میرے لئے اسکول میں گیہوں کے آٹے کی روٹیاں گنی ہیں اور ماں باپ نے جب اپنے لئے آٹا کم دیکھا تو "بنھوا" ابال کر پیس لیا اور آٹے میں ملا کر نمک مرچ کی آمیزش سے روٹیاں پکائیں تاکہ حلق سے اُتر سکیں۔ کبھی کبھی

مدرسے سے واپسی پہ اُس روٹی کا بچا کھچا ٹکڑا مجھے بھی مل جایا کرتا۔ اور میں مزے لے لے کر کھاتا۔ مجھے وُہ بڑا مزیدار لگتا۔ کیونکہ اُس وقت تک میری زبان دُنیا کی رنگ برنگ نعمتوں اور طرح طرح کے چٹخاروں سے آشنا نہ تھی۔

ایک خامی :- جب میں جین مندر کی طرف سے گھر آتا تو مجھے دُور تک آسا رام نامی لڑکے کے ساتھ باتیں کرنے کا موقع ملتا۔ یہ ایک غریب برہمن کا نورِ نظر تھا۔ بلا کا ذہین اور رنگین ہونے کے علاوہ خوش پوش اور خوش گُل واقع ہوا تھا۔ وہ کوشش کر کے اسکول میں میرے برابر بیٹھا کرتا اور دوستانے میں مجھے سوال دکھایا کرتا۔ ہوتے ہوتے مجھے بھی اس چوری کی ایسی عادت پڑی کہ اگر کسی دن کوئی لڑکا بیچ میں بیٹھ جاتا تو میں لڑ کر اُسے اُٹھا دیتا۔ ابھی تک مجھ میں وہی خامی چلی آتی ہے کہ حساب سے جی چُراتا ہوں۔ حالانکہ صرف ریاضی پر میری دس کتابیں "الحساب" کے نام سے ہیں۔

رام لیلا :- صبح و شام کے اُتار چڑھاؤ میں میرا معصوم لڑکپن ہانپ ہانپ کر سفر کرتا رہا۔ اتنے میں رام لیلا کے دِن آ گئے۔ میرے ایک ہم جماعت مٹھن لال اور دُوسرے بیربل کو سیتا جی کے پارٹ کے لئے منتخب کیا گیا۔ مگر بیربل کے لئے اُس کے چچا ابھے رام نے اجازت نہ دی اس کے اس اِنکار سے قصبے کے لوگ جز بز ہوئے مگر اس نے کہہ دیا کہ میں اپنے لڑکے کو زنانہ پارٹ کیوں دلواؤں؟ رام چندر جی کا پارٹ کیوں نہیں دیتے؟ لوگ خاموش ہو گئے کیونکہ بیربل کا چہرہ تو صرف سیتا جی کی نسائی خوبیوں کا دیدبان ہو سکتا تھا اور رامچندر جی کے پارٹ کے لئے ان کے پاس نہایت موزوں لڑکا تھا، خیر مٹھن لال کو سیتا جی بنا دیا گیا، وُہ تھا تو ایک دیہاتی برہمن کا نورِ نظر مگر زنانہ لباس نے اُسے چار چاند لگا دیئے۔ شہر بھر میں اس کے جسم کی موزونیت اور خدوخال کی نسائی جاذبیتوں کے ڈنکے پٹ گئے اور دلکش ڈرامائی اندازِ تکلم کی دھوم مچ گئی۔ دیہات سے تماشائیوں کے ٹھٹھ مٹھن لال کی نسائیت کو دیکھنے آنے لگے اور

انگشت بدنداں رہ جاتے، رام لیلا کے بعد عورتوں کی عقیدت اور مردوں کی جاں نثاریوں نے مٹھن لال کو سہارا دے کر کچھ دنوں کے لئے مصارف سے بے نیاز کر دیا تھا، وُہ اسکول میں کاندھلے سے چھ میل موضع کرٹھل سے روز کاندھلے آیا کرتا تھا۔ پھر غالباً وُہ کسی عقیدت کیش دکاندار کے یہاں ملازم ہو گیا۔ نہ جانے رام لیلا کے بعد سیتا جی کے مُقدّس تخیّل سے ہٹ کر ایک برہمن زادہ ہونے کی حیثیت سے لوگوں نے کب تک اُسے قابلِ امداد اور لائقِ توجہ سمجھا ہوگا۔

اس زمانے کے کچھ ہم جماعت عطر سنگھ۔ چندو لال، بابو رام، بُدھ سنگھ بارو مل وغیرہ اپنی خصوصی قابلیتوں کے باعث مجھے اب تک یاد ہیں۔ ان میں چتر سین کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ اگر چہ وُہ بہت بھلکڑ نہیں تھا۔ مؤخر الذکر تینوں اوسط درجے کے دکانداروں کے بچے تھے اور یہ چتر سین کاندھلے کے ایک رئیس کا نورِ نظر تھا، ممکن ہے اُس نے تعلیمی طور پہ ترقی کی ہو۔ سُنتے ہیں کہ اب وُہ میونسپلٹی کا ممبر ہے، اور باقی تینوں اوسط درجہ کے انسانوں کے بچے ہونے کے جُرم میں اب تک اوسط کی حدود کو عبور نہیں کر سکے۔ چتر سین میرے راستے ہی میں رہتا تھا۔ مَیں کئی بار اس کے گھر گیا اور وُہ ہمارے گھر آتا جاتا تھا۔ وہ طبعاً خاموش اور شرمیلا لڑکا تھا۔ شاید وہ ہمارے محلّے کے شوخ اور کھلنڈرے قسم کے بچّوں سے میرا گہرا لگاؤ دیکھ کر دامن کش ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ بے تعلقی تک نوبت آ گئی۔ ویسے بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ رئیسوں کے بچّے غریبوں کے بچّوں سے گہرا تعلق نہیں رکھتے اور نہ رکھنے کی اجازت دی جاتی ہے یہ تعلق جہاں امیروں کیلئے عیب ہے وہاں غریبوں کے لئے تکلیف رساں بھی ہے۔

جب میں اگلی جماعت میں آیا تو مجھ پر یہ روشن ہو گیا کہ میری تعلیم۔ ناز برداری اور محبّت میرے والدین کے لئے باعثِ پریشانی ہے، اس لئے بچّوں والی ضد اور اچھا کھانے پہننے کا خیال دل سے جاتا رہا۔ اکثر والدین کو پریشان دیکھ کر کچھ گھُٹن

سی محسوس ہُوا کرتی ہیں ہر وقت یہ سوچتا رہتا کہ کس طرح اپنی آمدنی میں کچھ اضافہ کیا جائے جو کھانے پینے میں سہولت پیدا ہو۔ اسی کشمکش کے نتیجے میں مجھے مسلم اسکول کے ایک لڑکے سیّد احسن اختر[1] کو دو روپے ماہانہ پر اُن کے گھر جاکر پڑھانے کی جگہ میسّر آگئی اور کئی مہینے یہ سلسلہ جاری رہا۔ نزدیک رہنے سے تعلقات بڑھ گئے اور ہم آپس میں ایسے بے تکلّف دوست ہوگئے کہ مجھ سے اپنے والدین کی مُفلسی نہ چھپائی جا سکی، اور اس کی خاندانی پیچیدگیاں مجھ پر بے نقاب ہوگئیں۔

ایک اَور اُستاد مجھے اس زمانہ کے اپنے شفیق اُستاد منشی عبدالرحیم جلال آبادی ابھی تک یاد ہیں، اور میرا رُوحانی تقاضا شاید عمر بھر نہ بھولنے دے

اُنھوں نے تیسری جماعت میں وہ وہ باتیں ذہن نشین کرا دی تھیں جو اب تک میری علمی کم مائگی کو چھپائے ہُوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُنھوں نے مجھے ڈانٹنے اور سزا دینے میں کبھی رعایت نہیں برتی اور میرے داہنے ہاتھ پر ان کی بید کی ضرب یادگار کے طور پر زندگی بھر میرا ساتھ دے گی۔ اِس کے باوجود مجھے ان کی اُستادی اور شفقت کا دل سے اعتراف ہے اُنھوں نے مجھے فنِ سپہ گری کی مشق بھی کرائی تھی جو اب تک سکون کا باعث ہے۔

وہ جہاں مجھے سختی سے سزا دیتے تھے وہیں میری کاپی اسکول بھر میں دوسرے اُستادوں کو دکھاتے بھی پھرا کرتے تھے کہ "ایک یہ لڑکا بھی میری جماعت میں ہے اگر مُفلسی نے معاشی طمانچوں سے نہ توڑ دیں اور تربیت نگہداری سے ہوئی تو اس میں بلندیاں ہی بلندیاں ہیں۔ مگر اس قسم کے لڑکے اس ملک میں عموماً ضائع ہو جایا کرتے ہیں۔"

تعلیمی کامیابی:۔ جب میں تیسری جماعت کے امتحان میں کامیاب ہُوا اور اپنی کامیابی

---

[1] سیّد احسن اختر پٹواری سیّد خورشید علی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ شادی کے بعد دو بچے چھوڑ کر راہیِ عدم ہوگیا تھا۔ اس کا باپ جوان بیٹے کے ماتم اور یتیم پروری کو زندہ تھا۔ اب وہ دونوں کراچی میں مقیم ہیں۔ دوران میں سے ایک طبیب ہے۔

کی خبر گھر جا کر سُنائی تو میرے والدین کے بشروں پر بشاشت کھیل گئی جیسے ڈھلوان پر بارش سے ٹھیکریاں ٹھنڈی اور سیراب ہو کر نکھر آتی ہیں لیکن ایک لمحہ کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے چہروں پر ایسی اُداسی اُتری کہ جُھریاں سوتی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر میں عصر کا وقت ہو گیا، اور والدہ نماز میں مصروف ہو گئیں، نماز سے فارغ ہو کر اُنھوں نے دعا کو ہاتھ اُٹھائے۔ اور گڑگڑا گڑگڑا کر مُنہ ہی منہ میں کچھ کہنے لگیں دیکھتے ہی دیکھتے ان کے خدوخال پر غم کا پانی پھر گیا اور آنسو جاری ہو گئے انھیں روتے دیکھ کر مَیں بے اختیار بھاگ کر اُن سے لپٹ گیا مُجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اُنھوں نے میری طرف سے منہ پھیر کر آنچل سے آنسو پونچھ لئے۔ میں نے رونے کا سبب پوچھا تو اُنھوں نے کچھ نہ کہا اور مجھے گلے سے لگا لیا۔ پھر میرے والد سے کہنے لگیں

"بھلا اب احسان کیسے پڑھے گا؟ چوتھی جماعت کی کتابیں کہاں سے آئیں گی؟"

"کیا کیا جائے؟ مجبوری ہے تم دیکھ رہی ہو کہ اب مزدوری بھی کئی کئی دن میں نصیب ہوتی ہے"۔ والد نے مایوسانہ لہجے میں جواب دیا۔

اوّل تو مفلسی پہلے ہی گھر کا تمام سامان کھا چکی تھی رہے سہے چند تانبے کے برتن تھے جنہیں میری والدہ اکٹھا کر لائیں اور والد کے سامنے دہلی[1] پہ ڈھیر لگا دیا پھر بڑے جی دار اور روشن لہجے میں بولیں۔

"آخر یہ برتن کس کام آئیں گے؟ ہم تو مٹی کے برتنوں میں بھی پکا کھا سکتے ہیں مگر احسان کو یہ عمر کہاں نصیب ہوگی؟ اگر یہ پڑھ لکھ نہ سکا تو جوان ہونے پر اس کے سامنے ہماری مجبوریاں نہیں ہونگی یہ اپنی جہالت کو ماں باپ کی غفلت اور بے پروائی سمجھے گا اور دُنیا اس کی ہم نوا ہوگی"۔

مجھے اچھی طرح یاد نہیں کہ برتن کتنے میں فروخت ہوئے تھے لیکن اتنا یاد ہے کہ جب مَیں نے درجہ چہارم کی کتابیں خریدی تھیں اس وقت ہمارے گھر میں کوئی تانبے یا پیتل کا برتن نہیں رہا تھا۔

---

[1] دہلی۔ دہلیز، چوکھٹ۔

منشی عبدالرحیم جاباں آبادی کے بعد مجھے جو استاد ملے ۔ میری بدقسمتی سے وُہ شاعر بھی تھے ۔ بڑے خوش پوش ۔ نفاست پسند اور تنک مزاج ۔ وُہ مجھ سے نہ جانے کیوں ناراض رہنے لگے تھے ۔ ذرا ذرا سی بات پر مجھے اسکول سے نکال دینے کی دھمکی دی جاتی اور معمولی معمولی خامیوں پر میری ٹھکائی ہوتی ۔ یہ بے التفاتی یا التفات میرے حق میں تو مفید رہا کیونکہ میں پڑھائی سے اُتر کر اِدھر اُدھر نہیں بھٹکا لیکن اُستاد کی شفقت اور حوصلہ افزائی سے محروم ہو گیا تھا کھیل میں مجھے گول کیپر بنایا جاتا اور جب گول ہو جاتا تو مجھی پر کچکچا کچکچا کر برستے حالانکہ میرے ساتھی اور بھی تھے اور مَیں سنٹر میں اچھّا کھیلتا تھا ۔

منشی محمد عُمر صاحب مجھے بڑی دیر میں سمجھے اور جب سمجھے تو افسوس کیا بلکہ یہاں تک کہا " میرے ساتھ رہو تو تمہاری تعلیم کا انتظام مَیں خود کروں گا " لیکن میرا دل بجھ گیا تھا اور یہ خیال یقین کی حد تک پہنچ چکا تھا کہ غریبوں کے بچّوں کی کہیں گنجائش نہیں ۔ اُستاد کی نظر میں آجانا صِرف قابلیت کا کام نہیں بلکہ خوش وضع خوش اوقات اور شرمیلا پن بھی ہونا ضروری ہے اسکول کے سیکنڈ ماسٹر منشی فتح محمد صاحب[1] نہایت شریف انسان تھے میں جب بازیں ہوتا تو وہ میری دلجوئی کرتے اور مجھے محنت کے ساتھ وقت گزارنے کی تلقین کے علاوہ ہمّت دلاتے رہتے ۔ انھیں شعر و ادب سے دلچسپی تھی یُوں تو ہیڈ ماسٹر صاحب بھی آخر شاعر تھے اور اپنے حلقے میں سراہے جاتے تھے لیکن ان کا شاعرانہ کارنامہ ابھی تک غالباً شرمندۂ اشاعت نہیں ہو سکا ۔ مَیں جب تک اس جماعت میں رہا ۔ خوش نہ رہ سکا ۔ مگر

---

[1] جب مجھے لاہور میں مدّت ہو گئی اور میرا کلام ملک کے مؤقر جرائد میں چھپنے لگا تو فتح محمد صاحب اَثم اپنی غزلوں پر مجھ سے اصلاح لینے لگے ۔ اور اس میں خوشی محسوس کرتے تھے کہ ایک شاگرد کو اصلاح کے لئے رجوع کر رہا ہوں ۔ ان کے انتقال سے کچھ پہلے تک یہ سلسلہ جاری رہا ۔ ان کے بعد نہ معلوم اُس ذخیرۂ کلام کا کیا ہوا ۔

اتنا ضرور ہُوا کہ چند[1] لڑکوں سے ایسے تعلقات وابستہ ہو گئے جن کے باعث قدم قدم پر سہارا سا ملتا رہتا۔ ہر چند کہ معاشی پوزیشن میں یہ سب مجھ سے بلند تھے لیکن اُن کے خلوص سے مجھے کبھی مایوسی نہیں ہُوئی اور خدا خدا کر کے میں چوتھی جماعت کے امتحان میں کامیاب ہو گیا۔

اگر مَیں اِن دوستوں کے والدین سے کہتا تو ممکن تھا کہ میری تعلیم کا سلسلہ نہ ٹوٹتا لیکن ان سے برابر کی دوستی کے باعث طبیعت نے گوارا نہ کیا بلکہ اور دامن بچانے لگا، یہ جہاں ملتے اسی خلوص اور مُروّت سے تو پیش آتے لیکن یہ میرے تعلیمی اور معاشی خسارے کا علاج نہیں تھا۔ مَیں ان کے سامنے اِن کی مسکراہٹ کی نقل تو ضرور کرتا لیکن دماغی خلجان سے کہاں چھٹکارا تھا؟ مَیں تو لڑکپن کی نیند اور عمر کی غنودگی سے چونک کر آبائی مصیبتوں کے جان لیوا حصار میں گھرا ہُوا چل رہا تھا۔

مرزا شفاعت بیگ

یُوں تو محلہ بھر میں مجھے سبھی[2] جانتے پہچانتے تھے اور مجھ پر سب کی نگاہِ التفات تھی لیکن اِن میں مرزا شفاعت بیگ صاحب عجیب و غریب کردار کے انسان تھے۔

اگر آدھی رات کو بھی کسی غریب نے آکر دُہائی دی ہے تو اس وقت بھی مرزا صاحب نے لیت و لعل نہیں کی بلکہ دامے، درمے قدمے سخنے معاونت پر تیار ہے اسی انسانی خدمت کے باعث دو چار نوجوان بھی مرزا شفاعت بیگ کے زیرِ سرپرستی ہر وقت گوش بر آواز رہتے اور مرزا صاحب کی جنبشِ ابرو کے اشارے پر انھیں جان دینے سے بھی گریز نہ تھا ان کے مصارف مرزا صاحب اس لیے برداشت کرتے تھے کہ کوئی زورِ بازو کے پندار میں پس ماندہ طبقے کو نہ دبا سکے۔

---

[1] چوہدری اصغر جنگ، چودھری شفقت جنگ، چودھری اشرف جنگ، لیسین جنگ، خلیل جنگ وکیل جنگ، محمد رفیق قریشی، محمد سعید قریشی۔ محمد رشید قریشی (میرے محلے میں) عاشق علی، لیاقت علی اعجاز علی، مرزا سُبحان بیگ وغیرہ سب میرے ساتھی تھے [2] مرزا اسماعیل بیگ، مرزا رضا بیگ، مرزا قیوم بیگ، مرزا محمد علی بیگ، مرزا امجد بیگ اور مرزا شمشاد بیگ وغیرہ۔

چنانچہ قصبے کا ہر منہ زور اور سر پھرا انسان مرزا شفاعت بیگ کے نام سے گھبراتا تھا کیونکہ مرزا صاحب پہلوانی کے داؤ پیچ اور بانک بنوٹ سے بھی بے بہرہ نہیں تھے اردگرد کے نوجوانوں کو وہ فنِ سپہ گری سیکھنے پر روز دیا کرتے اور قریبی لوگوں کو سکھاتے بھی۔

اگرچہ وہ بہت بڑے زمیندار نہیں تھے اس کے باوجود ان کی معمولی سی آمدنی میں کئی یتیم، کئی بیوائیں اور کئی طالب علم حصّہ دار تھے اور ان کی کفالت سے کبھی ان کے ماتھے پر شکن نہیں اُبھری۔

مَیں نے یہ دیکھا ہے کہ اگر کوئی مصیبت زدہ یا صاحبِ ضرورت آگیا اور اُسے روپے پیسے کی ضرورت ہوئی اور مرزا صاحب کے پاس رقم نہ ہوئی تو کسی سے قرض لے کر یا گھر کی کوئی چیز فروخت کر کے اس کی ضرورت پوری کرتے اور مایوس نہ جانے دیتے۔

اگر کسی صاحبِ حیثیت نے کسی غریب کا حق مارا یا زبردستی کی تو مرزا صاحب لٹھ لے کر پہنچ گئے اور ہر صورت میں مظلوم کی مدد کی۔ مَیں نے زندگی میں بہت کم زمینداروں میں یہ مردانہ صفات اور درویشانہ خصائل دیکھے ہیں۔ مجھے ان کی پشت پناہی نے کبھی لچکنے نہیں دیا اور میری خودداری کی بنیاد اور نازک مزاجی کی بنیاد میں بڑی حد تک ان کا سلوک اور مشورہ شامل رہا ہے

وُہ شہر میں صرف قاضی محمد زکی صاحب کا احترام کرتے تھے اور اُن کے ایسے ماننے والوں میں سے تھے کہ قاضی صاحب پر پیر اور مرزا صاحب پر مُرید کا گمان ہوتا تھا۔

عملی زندگی

بقا کی فکر کرو خود ہی زندگی کے لئے
زمانہ کچھ نہیں کرتا کبھی کسی کے لئے

کیفؔ مرادآبادی

نقطۂ آغاز

مَیں چوتھی جماعت میں کامیابی کے بعد اپنے ایک عزیز منشی محمود علی صاحب کے پاس جو کاندھلے میں محرّر ضلعداری تھے "پٹواری" سیکھنے لگا۔ کیونکہ اُنھوں نے یقین دلایا تھا کہ امیدداری کے دَوران میں بھی کچھ نہ کچھ ملتا رہے گا۔ مَیں تمام دن ڈاک کے رجسٹروں میں آنے جانے والی چٹھیوں کی نقلیں کیا کرتا اور شام کو گھر آجاتا۔ رفتہ رفتہ مجھے پنسال لکھنا، شجرے ملانا اور آبپاشی وآب ضائع کا اندراج آگیا۔ مگر وہاں کوئی جگہ نہ نکل سکی اور گھر کی ضروریات کے تقاضوں نے دفتر چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

منشی محمود علی صاحب کے والد منشی محمد علی صاحب شجرہ نویس تھے چونکہ ان کے گھر میں میرا آنا جانا تھا اس لئے رفتہ رفتہ مجھے شجرہ نویسی سے دلچسپی ہو گئی۔ اور چپکے چپکے اپنے گھر میں ایک باریک کپڑے کی ٹٹّی[1] بنا کر ردی شجروں کے عکس لینا شروع کر دیئے۔ جب میرا ہاتھ جم گیا تو منشی صاحب سے مَیں نے اپنی آرزو کا اظہار کیا۔ اُنھوں نے کسی عذر کے بغیر میری درخواست قبول کر لی اور دو چار دن میرا کام اور رجحان دیکھ کر مجھ سے اصل شجروں کے خطوط ملوانے لگے۔

چند روز میں مجھے اس کام میں بھی اچھی خاصی مہارت ہو گئی۔ لیکن کہیں بھی صرف مہارت کام نہیں کرتی۔ بلکہ ہر کام کے چاروں طرف کا ماحول بعض شرائط کا مقتضی ہوتا ہے کام ملنے کے لئے جن باتوں کی ضرورت تھی میں اُن سے بالکل بے بہرہ تھا۔ منشی صاحب کے پُرانے گاہک مستقل طور پر چاروں طرف کا کام سمیٹ لاتے اور احترام سے منشی صاحب سے تکمیل کراتے۔ منشی محمد علی صاحب نے مجھے صرف کام سکھانے کا ذمّہ لیا تھا، اور اس میں اُنھوں نے بالکل بُخل نہیں کیا۔ اب آگے صلاحیت اور تقدیر پہ بات تھی چنانچہ یہ کام بھی میرے لینے کا نہ نکلا۔

---

[1] ٹٹّی۔ شجروں کا عکس لینے کے لئے کپڑے کا چوکھٹا۔

اِنک مَین ہُا۔

اسی اثنا میں منشی محمود علی صاحب کے عزیزوں میں سے ایک صاحب دہلی سے آئے اور میری والدہ سے اجازت لے کر آٹھ روپے ماہانہ پر مجھے "انک مین" بنانے کے لئے دلّی ساتھ لے گئے۔ وہ دِلّی پرنٹنگ ورکس میں مشین مین تھے۔ میں ان کے ہمراہ چلا تو گیا لیکن مجھے دلّی کی گہما گہمی بالکل پسند نہ آئی۔ کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے کھُلی فضا سے گرفتار ہو کے رنگ برنگ کے قیدیوں میں آ پھنسا ہوں۔ مجھے ہر شام اُداس اور ہر چاندنی لُو کی بوچھاڑ میں نہاتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

شروع شروع میں مجھ سے خدمت زیادہ اور کام کم لیا گیا۔ البتہ شام کے وقت فورمین صاحب آتے تو مجھے کاغذ اُٹھانے کے لئے مشین پر کھڑا کر دیا جاتا۔ میں نے کئی بار کہا کہ مجھ سے کام لیا کریں۔ لیکن مشین مین صاحب نے ایک نہ سُنی اور ہنس کر ٹالتے رہے۔ یہ وہی صاحب تھے جو مجھے گھر سے نہ جانے کیا کیا سبز باغ دکھا کر لائے تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو لوہے کی پٹّیوں سے مارتے تھے اور بے قصور گالیاں تو اُن کا شعار تھا لیکن مجھ پر ابھی نظرِ عنایت تھی۔ شاید وہ میرے عادات و خصلات کا اندازہ لگا رہے تھے مگر نہ جانے کیوں میں اس نوکری کے مستقبل سے خائف سا رہتا تھا۔

بعض اوقات مشین پر سے کاغذ اُٹھاتے اُٹھاتے خیالات کے تار خود بخود ماضی کے رشتوں پر جا گرتے تو تالاب پر گزری ہوئی بھُوبل برساتی دوپہریں مجھے اپنے صندلیں عکس سے نوازنے لگتیں، ناہموار گلیوں کے تپتے ہوئے فرش اور بسا ندی نالیاں میرے لئے تماشا بن جاتیں۔ جس سے رَوارَوی کو سکون سا ہو جاتا۔ لیکن کام کے وقت یہ تصوّرات بڑے خطرناک تھے۔ مشین مین صاحب کبھی کبھی مجھے کہنی سے ٹھوکا دیتے کہ "کہاں ہو؟ نیند آ رہی ہے؟ ہاتھ مشین میں آ گیا تو چورا ہو جائے گا۔" میں چونک پڑتا اور دھیان سے کاغذ اُٹھانے لگتا۔ میں نے وہاں غالباً ڈیڑھ ماہ کام کیا لیکن کچھ تو ان کے رویّے سے اور کچھ اپنی افتادِ طبع کے باعث میرے پاؤں اکھڑ گئے۔ میں نے چاہا بھی کہ خود پر جبر

کر کے کام سیکھ لوں لیکن دل کی طرف سے تائید نہ ہوئی۔ گھر سے آئے ہوئے خط کو میں سینکڑوں بار پڑھتا اور ہر دفعہ کرُھن میں اضافہ ہوتا رہتا بعض اوقات تو رات رات بھر زندگی اور اس کے مستقبل کی اُدھیڑ بن میں لگا رہتا اور قصداً بھی سونا چاہتا تو حال کی مجبوریاں مجھے ماضی کی طرف رجوع کر دیتیں۔ اور میں تصوّر سے آناً فاناً میں اپنے گھر پہنچ کر کھلی آنکھوں اپنے قصبے کا نظارہ کرتا رہتا۔ دل و دماغ کسی صورت سے بھی چھاپہ خانے کی زندگی پر نہ مانتے اور میں خود کو خیالات و یقین کے کچّے دھاگے پر معلّق پاتا۔
ایک مشین مین کام کرتے وقت اُس دور کی مشہور غزلیں جھوم جھوم کر الاپتا تو میں اس کی خوش آوازی سے متاثر ہوتا۔ کام کی سختی یا زیادتی مجھ پر کوئی اثر نہ کرتی۔ کیونکہ میں شروع ہی سے مصیبت زدہ تھا لیکن اس کا کیا علاج کہ برائے نام بھی فرصت ہوتی تو خیالات و تصورات کا سلسلہ مجھے دِلّی سے لے نکلتا۔ قصبے کے لہکتے باغ، گنگناتی نہریں، کوکتی کوئلیں اور ڈھلتی دوپہر میں فاختاؤں کی درد بھری آوازیں دھڑکن کو تیز کر دیتیں اور میں فلم کی طرح تمام مناظر کو زندہ اور متحرک دیکھا کرتا۔ ایک دن علی الصبح مجھے ایک خط ملا جس میں لکھا تھا کہ "تمہارے والد کی طبیعت اچھی نہیں۔ تنخواہ میں سے کچھ پیشگی لے سکو تو بھیجدو۔" میں نے خط پڑھتے ہی یہ محسوس کیا جیسے میری روح سے ایک ناسور تیزی کے ساتھ اُبلنے لگا، اور میری رگ رگ میں ناطاقتی دوڑ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن میں پوری تنخواہ لے کر ناکامی میں اُلجھا ہوا کاندھلے کے اسٹیشن پر آ اُترا۔ والدہ نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ "اچھا ہوا تو آگیا جو تقدیر کا ہوگا یہیں مل جائیگا، ساری دُنیا کا رزق تو دلّی میں نہیں لکھا گیا۔"

دلّی سے آئی ہوئی رقم کتنے دنوں کی تھی چنانچہ پھر وہی افلاس کا عفریت پچھلے پاؤں سے سامنے دھول اُڑانے لگا اور مجھے کام کی فکر نے بیتاب کر دیا۔

مہاجن کی نوکری :- جب بیکاری کو کئی روز ہوگئے اور کوشش کے باوجود کوئی

کام نہ ملا تو میں نے بادلِ ناخواستہ قصبہ کے ایک مہاجن کے یہاں پانچ روپے ماہانہ پر تقاضوں کی نوکری کرلی۔ ایک مہینہ تو مجھے اُن پانچ روپے کی تعداد نے پریشان رکھا۔ لیکن جب میں اس ماحول کو سمجھ گیا اور ماحول نے میری جگہ نکال لی تو ایک جان کار کی طرح رہنے لگا۔ مہاجن تھا تو امیر کبیر انسان مگر ایسا خسیس اور جل ککڑا کہ الامان والحفیظ، بہی کھاتوں کی میزانیں دیکھ کر اس پہ ایک کیف طاری ہو جاتا اور باچھیں کھِلنے لگتیں۔ ایک ایک پیسے پہ لڑنے مرنے کو تیار رہتا اور ہاتھ سے پیسہ نہ چھوڑتا۔ اُس کی فطرت مزدوروں کے لہو اور کسانوں کے ڈھانچوں سے ترقی کے زینے بناتی رہتی۔ وُہ اپنے بنک بیلنسوں اور آرزوؤں کے منصوبوں کا جائزہ لیتا رہتا اور اس مشغلے سے اس کے چہرے پر ایک سُرخ زہر تمتماہٹ دیتا رہتا۔

اس مہاجن کی بیوی کسی اچھّے خاندان سے تعلّق رکھتی تھی۔ وُہ نہایت نیک دِل اور شریف ہونے کے علاوہ بڑی مخیّر قسم کی عورت تھی۔ اس نے مجھے لالہ کے سرمایہ پرستارانہ اصُولوں کے خلاف اور اپنے روحانی تقاضے کے تحت کچھ ایسی سہولتیں دے دی تھیں کہ میرے لئے وُہ پانچ روپے برائے نام رہ گئے تھے۔ غالباً اس کا دِل دولت کی آلودگی سے پاک تھا۔ وہ لالہ کے تنگ دلانہ رویّے اور صاحبِ ضرُورت لوگوں کی تکلیف سے باخبر تھی۔ وہ اس کے غیر منصفانہ حرکات سے نالاں بھی تھی اور پریشان بھی۔ ابھی اس کی شرافت تازہ دم تھی، اِس لئے شوہر کی بخیلی اُس کا کچُھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔ قدُرت نے اسے ایسی رحمدلی عطا کی تھی کہ زنانہ دروازے کی طرف فقیروں اور صاحب ضرُورت لوگوں کا تانتا بندھا رہتا اور وُہ سب سے مقدُور بھر سلُوک کرتی، لیکن بعض دفعہ اُس کی معنی خیز نگاہ اور مفہوم انگیز لہجے میں بڑے بڑے دفتر جھلک جاتے۔

اُس گھر میں وہ رسم ورواج سے مجبور ہو کر بسر تو کر رہی تھی لیکن میاں بیوی کی

طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ مذہبی پیشواؤں، رشیوں اور منیوں کے وضع کردہ قانون اُس کے خیالوں اور ارادوں میں گردش کرتے رہتے لیکن اظہار کے لئے الفاظ اپنے معانی میں وسعت کی جرأت سے عاری تھے۔ وہ جانتی تھی کہ ہندو معاشرے میں شوہر کی بدگمانی عورت کے معاملے میں کس قدر سنگین اور بے رحم ہوتی ہے۔ وہ ایک امیر اور شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کی شادی شوہر کی امارت اور جاگیرداری دیکھ کر نہیں ہوئی تھی بلکہ صرف اس لئے کہ لڑکی وہ عزیز شے ہے کہ اسے گھر سے باہر پھینکنا ہی پڑتا ہے۔ اس کے والدین نے اُسے اس قدر جہیز دیا تھا کہ اگر بیس برس بھی شوہر کے یہاں کا کپڑا نہ پہنتی تو وہ مہارانی کی طرح ہی رہتی۔ وہ غالباً اُس وقت تک اپنے میکے ہی کے کپڑے پہنتی تھی کیونکہ وہ قیمتی ہونے کے علاوہ قدیم قطع و بُرید کے تھے اور وہ اُنھیں کو بہتر خیال کرتی تھی، وہ چاندی سونے کی نئی طرز کے زیورات سے غالباً متنفر تھی۔ کیونکہ میں نے اُسے ہمیشہ سادگی ہی میں دیکھا۔ البتہ اگر کہیں باہر جاتی تو وہی اپنے پرانے چھن، پچھیلیاں۔ کڑے، تگڑی۔ دولڑی اور بچھوے وغیرہ پہنتی اور واپس آکر فوراً اُتار ڈالتی جیسے زخموں سے ناگوار پھا ہے، شاید اس کی رُوح کے کسی پھوڑے میں تپکن تھی۔ اس کی صفات سے ذات کو پہچاننے والا انسان میسر نہ تھا کیونکہ چاندنی کی ٹھنڈک اور پھولوں کی خوشبو لوہے کے باٹوں اور کانچ کے پیمانوں سے تو نہیں اَنک سکتی۔

کُھنوں کی طرح جہاں لالہ جی اور اُن کے مُنیم وغیرہ بیٹھتے تھے اُس دروازے کی طرف کوئی فقیر نہیں جاتا تھا۔ وہ سمجھ چکے تھے کہ خسیس کی دولت میں فقیر کا حصّہ نہیں ہوتا وہاں سے تو ڈاکٹروں اور حکّام کی طرف ہی پیسہ جاتا ہے۔ جب میں اس خاتون کی آنکھوں میں نوازش کے آثار پاتا اور وہ سب سے نظر بچا کر مُجھے کوئی چیز دیتی تو ایسا لگتا جیسے میری پلکوں سے برفانی ہوا گزر رہی ہے اور ہاتھ پاؤں جواب دے رہے ہیں

کچھ روز بعد اعتبار میں اضافہ اور کام میں کمی محسوس کر کے مہاجن مجھے اپنے خانگی سرمایہ سے قریب سمجھنے لگا، اور قدم قدم پر دیکھ بھال شروع کر دی وہ مجھے ایک پل بھی ٹھالی[1] نہ دیکھ سکتا۔ صبح آتے ہی اتنا کام بتا دیتا کہ بمشکل شام تک انجام پاتا اور جب میں باہر سے واپس آتا تو بیٹھک سے وہ اپنی چارپائی صحن میں نکلوا لیتا تاکہ کوئی بے اصولی دیکھ پائے۔ لیکن اس کی بیوی اس کے دل کی سیاہی کو پا گئی۔ ایک دن تیسرے پہر جب سائے چھتوں پر اترتے آتے ہیں اس نے مجھے کوٹھے پر بلایا اور پچاس روپے دیتے ہوئے کہا کہ ——

"احسان! اب تم نوکری چھوڑ دو۔ لالہ جی بدگمان ہو گئے ہیں۔ اتنے کہیں دوسری جگہ کام ملے ان روپوں سے کام چلاؤ۔ اگر یہ ختم ہو جائیں اور نوکری نہ ملے تو منگانائی کے ہاتھ خبر کر دینا۔ میں کچھ نہ کچھ اور بھیج دوں گی۔ تم غریب آدمی ہو ایسا نہ ہو تمہیں لالہ جی کسی اڑ گڑی[2] میں پھنسا دیں۔"

یہ کہہ کر وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتی ہوئی چل دی، اور میں ساکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا میرے حواس باختہ اور زبان شل تھی مگر فوراً ہی میرے جسم سے ایک لہر سی گزری اور میں حاضر حواسی محسوس کر کے اس کی طرف لپکا، مگر وہ زینے سے اتر چکی تھی جب اس نے زینے میں میری آہٹ سنی تو رسوئی کے دروازے میں کھڑی ہو گئی اور مجھے بوکھلایا ہوا دیکھ کر بولی۔

"کیا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ یہ پچاس روپے تم نے مجھے کیوں دیئے ہیں؟" میں نے ہکلاتی ہوئی زبان سے کہا۔

"تمہاری نوکری میری وجہ سے جا رہی ہے۔ بلکہ میں چھڑا رہی ہوں" اس نے کڑک کر کہا۔

---

[1] ٹھالی: بیکار، بے روزگار [2] اڑگڑی: ناگہانی مصیبت۔

"مجھے شرمندہ نہ کریں ۔ میں تمہارے یہاں رہتا تو ممکن ہے اسے برداشت کر لیتا مگر اب یہ کس دل سے لوں؟" میں نے رُک رُک کر کہا جیسے گلا خشک ہو گیا ہو۔

اب میری زبان میں وہی چیز آگئی جو ایک شدید الاحساس مفلس میں اپنے سچے محسن سے کسی احسان کے تحت بات چیت کرنے میں آجاتی ہے ۔ میں اپنے الفاظ میں اپنے گوشت پوست کو تحلیل کر دینا چاہتا تھا ۔ مگر اُس نے اپنے دونوں بند ہونٹوں پر آلف کی طرح کھڑی انگلی رکھ کر مجھے ہاتھ سے نیچے چلے جانے کو کہا اور میں تعمیل میں خاموش ہو گیا ۔

مصیبتوں کے ہجوم میں مجھے اُس عورت کی نوازش رحمتِ خدا سے کم نہ تھی اور میں اس میں ایسی مقدس جاذبیت محسوس کرتا جیسے کسی مہاجر کا گمشدہ بچہ کسی گلی کے نکڑ پر اپنی اپنی ماں یا بہن کی ہمشکل عورت کو دیکھ کر قدرے بہل جائے ۔ میری نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور دل سراپا شکستہ ہوا جا رہا تھا ۔ وہ میرا یہ عالم دیکھ کر پھر زینے میں آئی اور مجھے بلا کر کہنے لگی ۔

"احسان! اچھی بات یہی ہے کہ اب تم نوکری پر لات مارو ۔ دنیا ظاہر کو دیکھتی ہے بس اب جاؤ ۔" یہ کہہ کر وہ رسوئی گھر میں چلی گئی ۔ چونکہ معاشی طور پر مجھے اب تک آرام نہیں ملا تھا اور میرا جسم ابھی کشمکش کے گھاٹ اور عمل کے اسٹیشن سے دور ارادوں اور جرأتوں کے ہچکولوں میں تھا اس لئے کڑھتا ہوا خاموش نکل آیا ۔ گھر آکر والدہ کو یہ سب حال کہہ سنایا ۔ وہ دیر تک سوچتی رہیں پھر انھوں نے مجھے مہاجن کے یہاں نہ جانے دیا ، اور میرے والد کو بھیج کر حساب صاف کرا لیا ۔ مہاجن نے بھی بے حیل و حجت نوکری چھوڑنے کی وجہ دریافت کئے بغیر کوڑی کوڑی چکا دی ۔ اس کے بعد میں جب تک بیکار رہا سینکڑوں بار اس مکان کے آگے سے گزرا ، ہزاروں بار کوٹھے پر چڑھ کر نظر دوڑائی مگر وہ نظر نہ آئی ۔ عرصہ کے بعد ایک دن چند عورتوں کے ہمراہ وہ ایک گلی میں جاتی ہوئی ملی مگر نظر ملتے ہی اس کے چہرے پر ایسا تغیر آیا جیسے اُس کی وضعداری دہائی دے رہی ہو

ے بند ہونٹوں پر کھڑی انگلی کے معنی ہیں خبردار ! آگے نہ بولیں خاموش رہیں وغیرہ ۔

مَیں لڑکھڑاتے ہُوئے قدموں سے لپک کر ایک دُوسری گلی میں مڑ گیا۔ اس کے بعد آج تک میری نگاہیں اُس کرم فرما سے محروم ہیں۔ لاکھوں رنگینیوں کے سیلاب اور غموں کے طوفان کے باوجود وہ اب تک میرے دل و دماغ میں اسی طرح شاداب ہے اور ہر مصیبت کے عالم میں ایک دو بار ضرور اس کا خیال حال کے آئینے میں ماضی کے حاضرات کا عمل کر لیتا ہے جیسے رات کو حوض میں بادل سے نکلے ہُوئے ستارے کا عکس جھلک کر غائب ہو جائے یا چھ؎ آگ کی روشنی قرب و جوار کے درختوں پہ لہر کھا کر بیٹھ جائے۔

بیوپاری کی ملازمت

اِدھر تو مَیں خالی تھا، اُدھر ایک ٹُٹ پونجیا اَن پڑھ بیوپاری میری دریافت میں کامیاب ہو گیا جو کاندھلے سے ڈُو کوس موضع ایلم میں دیہاتیوں کو فصل کے اُدھار پہ مصالحے اور میوہ دیا کرتا تھا۔ پانچ روپے اور کھانے پہ معاملہ طے ہو گیا اور اس کے ساتھ گاؤں گاؤں پھر کر خریداروں کے نام اور رقم بتانا میرا کام قرار پایا۔ میرے دوست نور احمد نے جو خود بھی بیوپاری تھا، مجھے بہت منع کیا اور کہا کہ یہ لوگ نہ انسان کی قیمت کو جانتے ہیں اور نہ محنت و مشقت کا ان کی نظر میں کوئی مقام ہے لیکن اپنے والدین کی عمریں میرے سامنے تھیں، مَیں نے ایک نہ سُنی۔ اگرچہ یہ مقام کاندھلے سے دُور نہ تھا لیکن مَیں اپنے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر ملازمت پر جا رہا تھا۔ عصر اور مغرب کے درمیان میری والدہ نے مجھے سینے سے لگا کر نم آلود آنکھوں سے رخصت کیا۔ تالاب کے قریب پہنچ کر جو مَیں نے مڑ کر دیکھا تو والدہ مجھے کوٹھے پر سے دیکھ رہی تھیں۔ میرا گلا آنسوؤں سے بھر گیا، مگر خاموش چلتا گیا۔ میرے والد سید والے باغ تک مجھے دُنیا کی اونچ نیچ سمجھاتے ہُوئے ساتھ رہے پھر ایک کھیت پہ اپنے کسی دوست کے رٹھان؎ پہ رہ گئے۔ جب ایلم آیا تو دن بھر کا تپتا ہُوا سورج بُجھتے ہُوئے الاؤ کی طرح نظر آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں شفق کے

؎ رٹھان: جنگل میں کسانوں کے رہنے کی جگہ، کہیں کچا گھروندا ہوتا ہے اور کہیں پھونس کا بونگا

سُرخ ہونٹ نیلے پڑ گئے اور اندھیرے نے افق کی سنہری ورزش چھال دی۔ ناتو بیوپاری مجھے اپنی دکان پہ لے گیا۔ لالٹین کی دھیمی روشنی تپ دق کے مریض کے چہرے کی طرح دیوار کو پیلی کئے ڈالتی تھی۔

یہ اُدھار کی وصولیابی کے دن تھے اور اُسے منشی کی تو ایسی ضرورت نہیں تھی بلکہ ایک ایسا باربردار قلی یا پلّےدار درکار تھا جو حرف شناس بھی ہو اور کم از کم مَن سوا مَن اناج کا پھینچا[1] مارے تمام دن دیہات کے کچّے راستوں اور ناہموار ڈگروں میں ناک پھانکتا ہُوا شام کو اس کی دُکان میں لا پٹکے۔ چنانچہ پہلے ہی دن وہ مجھے بہی دے کر اپنے ساتھ لے کر چلا۔ کوئی دو کوس کے فاصلے پہ ایک گاؤں میں پہنچکر اس نے ایک عورت سے اپنی اُدھار دی ہوئی مرچوں کے عوض بیس سیر اناج وصول کیا۔ کچھ تو بھاؤ بڑھانے اور کچھ ڈنڈی مارنے سے اناج تیئیس چوبیس سیر کے قریب بن گیا۔ اُس نے پورا وزن چادر میں باندھ کر میری کمر پہ لاد دیا اور وہاں سے دو چار تقاضے کرکے اگلے گاؤں کی راہ لی۔ وہاں بھی جھوٹ اور بے ایمانی کے ہتھکنڈوں سے دیہات کی بھولی بھالی عورتوں کی کوٹھیاں اوچھی کرتا گیا۔ ہر دروازے پر اس کی بدنیتی کا بوجھ جو میری کمر پہ لدا ہُوا تھا، بڑھتا رہا اُن دنوں میری کمر چٹکیاں لینے والے گھام[2] سے چھپی پڑی تھی اناج کے اجنبی بوجھ کے ساتھ بھری دوپہر کی چبھتی دُھوپ اور کٹ کھنی کرنوں نے گرمی دانوں کو اور بھی سلگا رکھا تھا۔ آخر جب اُس نے میرے پھینچے میں گنجائش نہ دیکھی تو خود بھی ایک چادر میں من بھر اناج لے کر مجھے ہانکتا اور ہمّت بڑھاتا شام کر ایم آ گیا۔

اس کی نظر میں نہ مُروت تھی نہ عدل۔ اسے مطلق خیال نہیں تھا کہ ایمان فروشی اور دھوکے بازی سے پیدا کی ہوئی دولت قبر میں ساتھ نہیں جاتی اور مُروت کفن کی اجازت بھی مشکل سے دیتی ہے۔ میں اُس کے اس رویہ سے اپنی رُوح گھبراتی ہوئی محسوس کرتا۔ اور پھینچا اتار کر تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں کسی پڑاوے کے دھوئیں میں ہانپ رہا

---

[1] پھینچا:- سامان کی گٹھری۔ [2] گھام:- دھوپ اگری دانے، پت، انھوریاں

ہوں۔ کڑکتی دھوپ میں دیہات کے تپتے ہوئے ناہموار راستے بعض اوقات تو میرے قدم پکڑ لیتے اور ایسا محسوس ہوتا کہ ہر درخت کا سایہ مجھے آواز دے رہا ہے اور راستے کے کنوئیں کی طرف میں بے ارادہ کھنچا جا رہا ہوں۔ مگر کیا کرتا آخر نوکری تھی۔ مجھے اُس وقت یقین آتا تھا کہ واقعی جنّت تو ماں باپ کے قدموں ہی میں ہے۔

کبھی تو جب بوجھ زیادہ ہوتا اور تھکن شام کے آخری لمحات میں تکمیل کی حدوں سے نکلنے لگتی تو میری رُوح گھبرا کر مسامات کی راہوں سے نکل جانے کے لئے بے تاب ہو جاتی مگر شاید ماں باپ کی محبت میری مَوت کا رستہ گھیر لیتی تھی۔

مجھے اس طرح ناقابلِ برداشت سپاٹ صبحوں کو شام اور راتوں کو دن کرتے تین ماہ گزر گئے۔ نانو بیوپاری کا اُدھار قریب قریب وصول ہو گیا اور اس نے دیگر خدمات کے ساتھ ساتھ باورچی کا کام بھی میرے سپُرد کر دیا۔ تمام اُدھار وصول ہو جانے کی وجہ سے اس کا رویّہ سخت سے سخت ہوتا چلا گیا۔ اب وُہ پھیپا خود نہیں اُٹھاتا تھا بلکہ ایک گدھے کا بوجھ مجھ پر ہی لاد کر دکان تک آتا اور میری پیٹھ ٹھونکتا۔ جب وُہ میرے قریب آتا تو اُس کے کپڑوں سے جی متلا دینے والی بساند مجھے گھیر لیتی اور مَیں سانس بند کر کے باہر نکل آتا۔ جب وہ صُبح سو کر اٹھتا تو اس کے چہرے پر میلے رنگ کے چٹاخ ایسے معلُوم ہوتے جیسے رات کو راستہ چلنے والے اس کے مُنہ پر بار بار تھوک گئے ہوں۔ ہر بات پر نکتہ چینی اس کی عادت بنتی جا رہی تھی تاکہ مَیں اس کے جواب دے دینے سے پہلے ہی نوکری سے دستبردار ہو جاؤں۔

ہم دونوں صُبح اُٹھتے ہی گاؤں کو نکل جاتے اور دوپہر ہوتی تو نانو تو کہیں کسی گاہک کے پاس بیٹھ جاتا اور مجھے کسی کے چولہے پر روٹی پکانے کے لئے کہہ دیتا۔ مَیں یُوں تو ہر ہفتہ کا ندھلے اپنے ماں باپ سے ملنے آتا تھا مگر کبھی ان مشکلات کا ذکر نہ کرتا کہ مبادا والد صاحب ڈانٹنے لگیں کہ کم ہمّت ہے اور ہماری بوڑھی ہڈیوں کو

ریت ریت کر کھانا چاہتا ہے۔

ایک دن موضع اسارال میں نانو نے مجھے ایک جولاہے کے چولھے پر روٹی پکانے کا حکم دیا، سامنے والے چھپر میں ایک نوجوان لڑکی دودھ بلو رہی تھی۔ میں اس کے دونوں شانوں کے گھماؤ میں ایسا گم ہوا کہ نظر ٹھہر کر رہ گئی اور میری آستین نے آگ پکڑ لی، اُس نے بھاگ کے رجھنی میں رکھا ہوا پانی میرے ہاتھ پر انڈیل دیا لیکن اس کے باوجود آستین کے ساتھ ہاتھ جل گیا اور چھالا پڑ گیا۔ جمعہ کو جب میں گھر آیا تو والدہ نے چھالے کا سبب پوچھا۔ میں نے والدہ سے من وعن تین ماہ کی سرگزشت کہہ سنائی۔ سنتے سنتے اُن کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ ایسی نوکری پر خدا کی مار، کل سے وہاں نہ جانا میں کسی کو بھیج کر وہاں سے حساب کرا لوں گی۔ چنانچہ دوسرے روز میں اٹیم نہ گیا، اور میرا دوست نور احمد بیوپاری نانو سے میری تنخواہ لے آیا۔

مزدوری

نانو سے علیحدگی کے بعد میرے والد اور میں کاندھلے میں نہر جمن شرقی کی کھدائی کرنے والے مزدوروں میں جا ملے۔ اُن دنوں ایک مزدور سے چار آنے میں ایک گاٹا[1] کھدوایا جاتا تھا اور اس طرح ہم دونوں کو چار سو من ریت کھودنے اور ڈھونے کے معاوضے میں ٹھیکیدار صرف آٹھ آنے دیتا تھا۔

ٹھیکیدار کی عدم موجودگی میں جب اوورسیر (OVERSEER) یا صاحب علاقہ آتا اور مزدوروں سے کچھ پوچھنا چاہتا تو سب کی طرف سے میں ہی ترجمانی کیا کرتا، کیونکہ چوتھی جماعت تک تعلیم ہونے کے باعث میں ہی مزدوروں میں ایسا تھا جسے کھدے ہوئے گڑھوں میں ٹشام[2] کی اونچائی سے حساب کرنا آتا تھا۔

---

[1] بیس فٹ لمبا، دس فٹ چوڑا اور ایک فٹ گہرا قطعہ زمین کھودنے اور ڈھونے کو مزدوروں کی اصطلاح میں گاٹا کھودنا کہتے ہیں اور کہیں کہیں اسے کھدان یا کھتان بھی کہا جاتا ہے

[2] کھدے ہوئے گڑھوں کے بیچ میں مٹی کا ذرہ تودہ جو کھودتے وقت درمیان میں چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ صحیح گہرائی معلوم ہو سکے موٹا نام کہلاتا ہے اسے برتی بھی کہتے ہیں۔

میرے دُکھیا شب و روز اسی محنت و مشقت میں گزرتے رہے۔ کبھی کبھی مزدوری کے دوران شام کے وقت اپنے بوڑھے اور ناتواں باپ کو تھکن سے سُست رفتار دیکھتا تو دِل میں ایک نشتر سا کھیل جاتا مگر مجبوری ہیں خاموشی کے سوا کیا چارۂ کار تھا۔ کیونکہ جب تقدیر کی گردش بے کسی اور بے بسی کی دوش لے کر زندگی کا محاصرہ کرتی ہے، تو ہوش و حواس آنکھیں کھولنے کی جرأت نہیں کرتے۔

بعض بعض اوقات جب کوئی اجنبی ہمدرد مزدور مجھے مزدوری کرتے دیکھ کر میرے والد سے پُوچھتا کہ لڑکے کو کیوں نہ پڑھایا؟ تو وُہ جواب میں بڑے ہی مضمحل لہجے میں کہہ دیا کرتے کہ درجہ چہارم پاس کر لیا ہے۔ خط پتر کے قابل تو ہو ہی گیا ہے، اب اللہ مالک ہے نہ جانے اس کی قسمت میں کیا ہے۔ ہم غریب لوگوں کے بچے کیسے تعلیم پا سکتے ہیں اور پھر حلال روزی میں ہم اِس سے بڑھ کر کرتے بھی کیا۔

جب مَیں دوپہر کو تھک کر کسی درخت کے ٹھنڈے سائے میں سر کے نیچے کسی اُونچی زمین، ٹوکری یا ڈھیلے کا تکیہ لگا کر بیٹھ جاتا تو ہَوا کے نرم جھونکے بالکل میری ماں کی طرح میرا سر سہلاتے اور مَیں ایک رُوحانی توانائی محسوس کیا کرتا۔

کئی دفعہ تو ایسا موقع بھی آیا ہے کہ چِٹھا بانٹتے وقت ٹھیکیدار کی بے پروائی اور بدلگامی سے بھُن بھُن گیا ہُوں مگر کیا کرتا؟ گرد و پیش پر نظر کرتا تو بے کسی کی زنجیروں کے سوا کوئی سہارا نظر نہ آتا لیکن یہ ضرور خیال ہوتا کہ مشرکوں، فاجروں اور بے رحم لوگوں کی دُعائیں فرشتے آسمانوں پر کیوں لے جاتے ہیں۔ گندگی میں کیوں نہیں پھینک دیتے۔ کیا ان ظالموں کے اعمال فرشتوں کی نظر سے پوشیدہ ہیں؟

چونکہ علمی کم مائگی کے باوصف مجھ میں احساس جنم لے چکا تھا اس لئے ذرا سی دل شکنی سے مجھ پر ایک عالم گزر جاتا اور اُدھیڑ بن میں ساری ساری رات نیند نہ آیا کرتی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ مزدوروں کے طبقے میں جو دیوانوں کی طرح پیدا ہو کر وحشیوں کی طرح بسر کرتے ہیں خود کو بلند سمجھتا تھا۔ صرف اس لئے کہ چوتھی جماعت پاس کر چکا تھا اور کبھی کبھی وُہ لوگ

اپنی سادہ دلی سے مجھے منشی جی کہہ دیا کرتے تھے۔ مگر میرا احساس میرے لئے مصیبت بن گیا تھا۔ جب کسی سے کوئی ایسی بات سُنتا جس سے میری یا میرے والد کی توہین کا پہلو نکلتا تو میرے خون میں چنگاریاں دوڑنے لگتیں اور ایسا معلوم ہوتا جیسے میرے کانوں کے راستے سے کسی نے میرے سینے میں نیلے رنگ کا گرم گرم زہر انڈیل دیا ہے۔

شام کو مزدوری سے آکر تھوڑی بہت دیر کو میں قاضی محمد زکی صاحب کے یہاں ضرور جاتا جہاں میرے احساس کی دھاریں اور بھی تیز ہو جایا کرتیں۔ وُہ مجھے خاموش دیکھ کر خود ہی حوصلہ افزا گفتگو شروع کر دیتے اور خصوصاً اس پہلو پر زور دیتے کہ مفلسوں کو جسمانی تکلیف ضرور ہوتی ہے مگر ناداری رُوح کی مسرت میں حائل نہیں ہو سکتی بشرطیکہ اُسے زندگی سمجھ کر گوارا کر لیا جائے اور ہر ناکامی کو فتح کر لینے کی مہم جاری رکھی جائے۔ اس کے مقابلہ پہ سرمایہ داری کے رُوحانی تشنّج اور جسمانی تکبّر میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے اور اس کا علاج کوئی مادّی طاقت نہیں کر سکتی ہر وقت انسان ایک بدبُو دار لہو میں اونٹتا رہتا ہے۔

شروع شروع میں جب مَیں مجبُور ہو کر والد صاحب کے ساتھ مزدُوری پہ جانے لگا تو سارا سارا دن مٹی اور ریت ڈھونے سے میرا بدن چُور چُور ہو جاتا، جیسے جسم کے ہر جوڑ کی درمیانی چکناہٹ خشک ہو گئی ہو، لیکن مجبوری کا کیا علاج ؟ کبھی کبھی شام کو کھانا کھاتے ہی مجھے ایسی گہری نیند آتی کہ صُبح تک خواب بھی گریز کرتے اور جب صُبح کی اذان پر میری ماں مجھے جگاتی تو مَیں یُوں اُٹھتا جیسے ابھی ابھی نئی زندگی سے دوچار ہو رہا ہُوں۔ اُن دنوں اکثر مجھے یہ خیال آتا کہ کیا ساری دُنیا اِسی معاشرے کی چکی میں پِس رہی ہے اور پستی رہے گی ؟ کیا غریب لوگ ہمیشہ سے اسی طرح اپنے گرم خُون کی حدّت سے معدہ کے لئے ایندھن مہیّا کرتے رہتے ہیں اور کرتے رہیں گے ؟ کیا ہم یہی ٹھیکریں اُٹھانے آئے ہیں ؟ کیا ناداروں کے شباب اور

جسم کی قوتیں اسی طرح کم کرایہ پر چلتی اور ختم ہوتی رہیں گی؟

عرصہ کے بعد جب میرا جسم اس مشقت کو سہہ گیا اور ہاتھوں میں پھاوڑے کی ٹھیکیں پک گئیں تو وہ ہلاک کر دینے والی مشقت میرے لئے کوئی جان لیوا چیز تو نہ رہی لیکن یہ خیال ضرور آتا رہا کہ ٹھیکیداروں کو گچھے کے گچھے ملتے ہیں اور ہم مزدوروں کو صرف چار آنے روز دیئے جاتے ہیں جن سے نہ اچھی طرح کھانے بھر کو ملتا ہے اور نہ زندگی کے دوسرے کام چل سکتے ہیں۔

سارا دن خون بلونے کا یہ معاوضہ دیکھ کر نہ ماننے کی بے انصافی اور بے ایمانی پر دل کڑھتا رہتا اور میں اس کے سیاق و سباق پر سوچا کرتا۔ آخر آخر میں تو غصہ آنے لگا اور انتقام و تشدد کی طرف طبیعت راغب ہونے لگی مگر اسی کے ساتھ ساتھ جیل کے تصور سے روح کانپ کانپ اٹھتی۔

اسی جذبۂ انتقام کی ایک صورت یہ تھی کہ جب ٹھیکیدار کام پر نہ آتا یا دیر سے آتا یا آنکھ سے اوجھل ہوتا تو مزدور لاشعوری طور پر بے دلی اور کام چوری پر اتر آتے اور کئی لوگ نماز کے بہانے سے وقت گزارتے۔ کھدائی میں رانڈ کاٹتے۔ گارا پٹواتے وقت بے ایمانی، چالاکی اور ہتھکنڈوں سے کام لیتے۔ اس کا جواز اُن کی نظر میں اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ٹھیکیدار ہمارا حق ہمیں نہیں دیتا، مگر کسی کو کوئی ایسا مفید، پاکیزہ اور مؤثر چارۂ کار نہ سوجھتا جو تمام مزدوروں کے لئے مفید ہوتا یا غلط لوگوں کی اصلاح ہوتی۔

میرا عزیز پڑوسی

ہماری حویلی کی نچلی منزل میں میرے دُور کے ایک عزیز منظور حسین اور دوسرے مُلّا صادق رہتے تھے۔ مُلّا صادق صاحب میرے نزدیکی رشتہ سے ماموں اور محلے کے اوسط درجے کے لوگوں میں تھے لیکن میرے

لہ رانڈ کاٹنا معنی بے توجہی سے کام کرنا۔ بیگار کی طرح کام کرنا۔

نانا ابو علی شاہ نے ان سب کو مراعاتی طور پر یہاں رکھ لیا تھا اور اب یہ وقتاً فوقتاً مجھ پر غرّانے لگے تھے۔

منظور اور اُس کے چھوٹے چھوٹے بچے کڑکتے جاڑوں میں ٹاٹ کے ٹکڑے اوڑھ کر پیال کے بستر پر سکڑ سکڑا کر نکلتے سورج کی دھوپ دیکھتے۔ جب رات آتی تو ہر شام تھوڑی بہت دیر کو ایک چُندھا سا دیا صحن کی دیوار کو منوّر کر دیتا۔ اُس کے بعد اندھیرے سے لدی رات کی تاریکی چھا جاتی اور منظور کے ٹوٹے پھوٹے کواڑوں میں اندر سے جھانوا[1] اگ جاتا۔

وہ ایسا مضبوط آدمی بھی نہیں تھا کہ کوئی سخت کام کر سکتا۔ چنانچہ وہ ہمیشہ کھیتوں میں کام کیا کرتا، جس میں کام کم اور ظاہرداری زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن زمیندار بھی تو مزدور کو اُسی قدر معاوضہ دیتا ہے جس سے وہ بمشکل تمام جی سکے اور لباس پیوندوں سے فراغت نہ پائے۔ منظور کی خستہ حالی نے اُسے ایسے کپڑے پہننے پر مجبور کر دیا تھا جیسے جنگل کی بے رحم آندھیاں جگہ جگہ سے اس کی تھگلیاں نوچ کے لے گئی ہوں اور بگولوں نے اس کا شلوکا مروڑ کے مسکا دیا ہو۔ دُکھوں کے سوا منظور کے بچّوں کے پاس اوڑھنے کا کوئی کپڑا تک نہ تھا۔ کیونکہ وہ بے رحم معاشرے میں ایک کمزور مگر باہمت اور مفلس مگر ایماندار باپ کے گھر پیدا ہوئے تھے اس تنگی ترشی میں بھی اُن کا باپ کسی جرم کا مرتکب نہ ہوا۔ لیکن ایمانداری المحنت اور کم خوری نے اُسے زیادہ دنوں جینے نہ دیا۔ ایک دن شام کو مزدوری سے آیا تو ہانپتے ہوئے کھانسی اُٹھی اور اسی میں صبح تک بے دوا و دارو ناداری کی دھول میں دم توڑ دیا۔ اور اس کے بچّوں کی نمانی صورتیں چیخیں مارتی رہ گئیں۔

منظور کی بیوی کے پاس میلے کچیلے، پیوند لگے کپڑوں اور سر پہ پھٹے پرانے لوگڑے[2] کے سوا کیا تھا مگر مردہ کسی کا بھی ہو پڑا نہیں رہتا۔ منظور کی تجہیز و تکفین عزت

---

[1] جھانوا: بے ڈول پتھر، پھٹے ہیں بہت سی اینٹیں جب آپس میں چپک کر پکتے پکتے سیاہ ہو جاتی ہیں
[2] لوگڑا: معمولی چھوٹا پرانا کپڑا۔

اور خاموشی سے ہو گئی۔ اگرچہ ایک ہندو عورت کے ہاتھ کڑوں سے خالی ہو گئے۔

منظور کے یتیم اپنی کھوئی ہوئی شفقت کی تلاش میں سارے سارے دن چپ چاپ لوگوں کے چہروں کو پیاسی نگاہوں سے تکتے پھرتے اور چپکے چلے آتے۔ میری والدہ انہیں پیار کرتیں اور جو میسر ہوتا چمکار چمکار کر کھلاتیں پلاتیں۔ کئی بار انھوں نے ہمارے پرانے کپڑوں میں سے اُن کے لئے کپڑے بھی بنائے کیونکہ اس سے زیادہ کی بساط یہاں بھی نہیں تھی۔

عدّت کے بعد منظور کی بیوی نے دوسرا نکاح کر لیا اور بچوں سمیت بوڑھانہ[1] چلی گئی۔ نہ جانے پھر اُن پر کیا گذری ہو گی۔

مُلا صادق نہر جمن شرقی اور اس کے راجبہوں پر معمولی قسم کی ٹھیکیداری کرتے تھے میرے نانا کے انتقال کے بعد ان کی حالت ذرا سنبھل گئی تھی اور وہ مکان چھوڑ کر دوسرے محلّے میں چلے گئے تھے۔ وہ عموماً چماروں کو مزدوری پر لے جاتے تھے اور مجبوراً اگر کسی عزیز یا رشتہ دار کو کام پر لے بھی جاتے تو اس قدر سختی سے کام لیتے کہ دوبارہ جانے کی ہمّت نہ ہوتی۔ میں اور میرے والد صاحب کئی بار اُن کے یہاں مزدوری پر گئے اور وہ ایسی بے رُخی سے پیش آئے کہ میری رُوح پہروں اس اوچھی امارت کی بداخلاقی اور اپنے افلاس کی ندامت میں گھلتی رہی۔

ایک مثالی مزدور

میرے ساتھی مزدوروں میں ایک صاحب حاجی بارو بھی تھے۔ جب میں ٹھیکیداروں کی بُرائی کرتا تو وہ میرے ہمنوا نہ ہوتے۔ بلکہ منہ پھیر کر بیٹھ جاتے۔ اُن کا کہنا تھا کہ "چار آنے ہماری دن بھر کی مزدوری طے ہے اس میں ہمیں تمام دن کام کرنا چاہیئے۔ ورنہ چار آنے بھی حلال روزی نہیں رہتے۔ ہم مزدوروں کو کسی کی امارت پر نکتہ چینی سے کیا غرض ؟ کیوں اپنی گور

---

[1] ضلع مظفر نگر کی ایک تحصیل جو کاندھلہ سے غالباً نو کوس ہے۔

انگارہ دل بھر لیں؟" حاجی بارو کی یہ بات مجھے اچھی معلوم نہ ہوتی اور رہ رہ کر یہ خیال آتا کہ ہمارا خون پسینہ آخر اتنا سستا کیوں خریدا جاتا ہے؟ میں حاجی بارو کی اس بات کا تو قائل تھا کہ روزی حلال ہونی چاہیئے لیکن سرمایہ دارانہ سفّاکی، بے انصافی اور بے رحمی کی طرف سے کبھی دل صاف نہیں ہوتا تھا۔ حاجی بارو ایک وجیہہ انسان تھے۔ ان کے خدّوخال بتاتے تھے کہ وہ کبھی نہایت خوبصورت انسان ہوں گے اُن کے ایک لڑکا تھا اور ایک لڑکی اور نکھ سکھ کے اعتبار سے وہ بھی حاجی بارو سے کچھ کم نہ تھے لیکن ہر آدمی کی عادات جُدا اور اطوار علیحدہ ہوتے ہیں۔ حاجی کا لڑکا باپ سے بالکل مختلف فطرت لے کر آیا تھا۔ وہ قریب قریب میرا ہم خیال تھا۔ مگر سُست اور کاہل قسم کا انسان، اس لئے اس کی طرف میری توجہ کم رہی

حاجی بارو جیسا محنتی انسان میں نے مزدوروں کی دُنیا میں نہیں دیکھا۔ مزدور کھانا کھانے اور نماز پڑھنے میں دیر کر کے اپنی حلال روزی کو مُشتبہ بنا لیتے تھے لیکن حاجی بابا کو میں نے کبھی اس کام چوری میں مبتلا نہیں پایا۔ وہ بڑی محنت شاقّہ سے کام کرتے اور اُس کا یہ نتیجہ تھا کہ مزدوروں سے لے کر ٹھیکیدار تک اُنھیں دیانتدار اور جفاکش خیال کرتے تھے۔ ہر مزدور اُن کی جُٹ میں رہنا پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ ان کے سوا کوئی بھی مزدور ٹھیکیدار کی طرف سے خوش خیال، دیانت دار اور مطمئن نہیں تھا۔ میں اس میں تو انھیں حق بجانب خیال کرتا تھا لیکن حاجی بارو کی تعریف و توصیف کے باوجود اُنھیں مزدوری سب کے برابر ملتی۔ کبھی کوئی ان کی دیانت داری سے خوش ہو کر ایک پیسہ بھی زیادہ نہ دیتا۔ مزدوروں کا لہو فروخت کرنے والے سرمایہ دار تو اکثر سکّوں کی جگہ زبان کی بناوٹی شیرینی سے کام لیتے ہیں اور جہاں جاییے یہی قانون ملے گا۔ چنانچہ حاجی بارو کے ساتھ بھی یہی بات تھی۔

جس دن میرے والد ساتھ نہ ہوتے اُس دن میں حاجی بارو کی جو رسی میں

رہتا۔ ان کے اعلیٰ کردار نے مجھے ان کا عقیدت مند اور ہمدرد ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ کسی مزدور سے لڑنا تو درکنار تلخ کلامی بھی نہ کرتے۔ خاموشی سے کام میں جُٹے رہتے ان کے چہرے پر معصومیت اور شرافت کا ایک آئینہ تھا جسے ہر آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی، اور نہ ہر دل ہی محسوس کر سکتا تھا۔ جن آنکھوں نے اُنھیں دیکھ لیا گرویدہ ہو گئیں مگر اُن پر کوئی سرمایہ دار رحم نہ کرتا۔ وہ تھے کہ عقبیٰ کے تصوّر اور ٹھیکیداروں کی تحسین پر خون پانی ایک کئے رکھتے تھے۔ ان کے افلاس نے اُنھیں جرم و گناہ کی روٹی کھانے اور کم ہمتّی نے گدلا پانی پینے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ وہ محنتی بھی تھے اور شاکر بھی۔

مجھے ہمیشہ یہ ٹوہ رہتی کہ ان مزدوروں میں کوئی میرا ہم خیال بھی ہے یا نہیں جہاں ذرا کسی کو ناداری اور امارت کی شکایت کرتے پاتا مجھے فوراً اس سے ایک قسم کی ہمدردی پیدا ہو جاتی اور اس سے نزدیک ہونے کو جی چاہنے لگتا۔

میں اس زمانے میں کئی لوگوں سے مِلا اور ان کو اپنا ہم خیال بنایا لیکن وہ بے علمی کی وجہ سے اس قدر شدید ہو گئے کہ جرائم پیشگی اختیار کر لی بعض چور بن گئے بعض ہیرا پھیری پر اتر آئے۔ مجھے یوں حیرت ہوتی تھی کہ آخر صاحبِ حیثیت طبقہ موقع پا کر حرام خور۔ زانی۔ شرابی اور بے رحم کیوں ہو جاتا ہے؟ پس ماندہ طبقے کے لوگ علم حاصل کرتے ہیں تو جرم و گناہ میں کیوں آلودہ نہیں ہو جاتے؟ اُس وقت میں زندگی کے گردوپیش کے ماحول کو دیکھ کر پگڈنڈیاں ڈھونڈنے لگا تھا۔ اور میرے لاشعور میں فہم و ادراک کے اکھوئے پھوٹ رہے تھے۔ کبھی کبھی تو مجھے اپنی روح میں ایک بیتاب تشنگی دریچے کھولتی محسوس ہونے لگتی۔ مگر ماحول کی تمام تکالیف کے باوصف میری نظر مذہبی اصول و قوانین کے اُس کارخانہ سے نہ ہٹتی۔ جہاں زنجیریں ڈھلتی ہیں اور طوق بنائے جاتے ہیں، حیرتناک بات یہ ہے کہ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کے

؎ اکھوا۔ یعنی کونپل کی ابتدائی شکل جو گھنڈی کی طرح ہوتی ہے۔ یہی چیز گنّے میں ہوتی ہے اور آنکھ کہلاتی ہے۔

لئے مجرم ہونا ضروری نہیں۔ دبنگ، جیالے، صاف گو اور حق پسند لوگ اخلاقی مجرموں سے زیادہ سزائیں پاتے ہیں۔

ایک مزدور ساتھی

مزدوروں میں ایک مزدور یعقوب بیگ بھی تھا جو محلہ خیل میں رہتا تھا اور کبھی کبھی میرے ساتھ مزدوری کیا کرتا۔ وہ یوں تو ایک بہت اچھا صاحبِ فن باورچی تھا۔ مگر جب اُسے ڈھب کی ملازمت نہ ملتی تو ہلکی پھلکی مزدوری کر لیا کرتا۔ ایک دفعہ میں اور مرزا یعقوب کھیت میں سے گھاس اُکھاڑنے گئے۔ تھوڑی دیر تک تو یعقوب خاموشی سے دُوب اُکھاڑتا رہا۔ جب ہاتھوں میں دُوب کھینچنے سے نشان پڑنے لگے تو کہنے لگا۔

"بھائی احسان! کیا حال ہے؟"

مَیں:۔ "میرا حال تو جو ہے سو ہے تُم بتاؤ کیا ارادہ ہے؟"

یعقوب:۔ "بھائی شام ہوتی نظر نہیں آتی۔"

مَیں:۔ "ہم تُم ہوں یا نہ ہوں شام تو ہوگی اور روز ہوتی ہے"

یعقوب:۔ "ہاں شام ہوگی مگر مجھے دیکھنا نصیب نہ ہوگی۔ دیکھو تو ہاتھوں کا کیا حال ہو گیا؟ لہولہان ہو گئے۔"

مَیں:۔ "جب مضبوط نہیں پکڑو گے تو یہی حال ہوگا، گرفت سخت رکھو تاکہ ریشے پھسلنے نہ پائیں۔"

یعقوب:۔ "اچھا دیکھتا ہوں۔"

تھوڑی سی دیر میں وہ دُوب ختم ہو گئی اور کہیں کہیں بتھوا اور پیازی کے ننھے ننھے پودے آ گئے تو یعقوب بولا۔

"خُدا کا شکر ہے کہ دُوب ختم ہو گئی۔"

"اب کیا خیال ہے شام کے متعلق؟" مَیں نے پوچھا۔

یعقوب: "اب کیا خیال ہوتا، اب تو دِن اسی کھیت میں گزرے گا اور یہیں شام ہوگی"۔

جب کبھی یعقوب کے ساتھ مزدوری کا موقع ملتا تو مجھے بڑی خوشی ہوتی کیونکہ محنت کے جس مرحلے کو وہ عذابِ جان خیال کرتا تھا اس پر مَیں حاوی ہو چکا تھا۔ تمام دِن مرزا یعقوب میری تفریح کا باعث بنا رہتا اور آخر میں تو مرزا یعقوب کو بھی مزا آنے لگا تھا۔ مزدوری کے علاوہ بھی وہ مجھے ملتا رہتا اور مجھے ہنسانے کے لئے اپنی ڈرپوک فطرت کے واقعات بیان کرتا رہتا جن سے مجھے ہنسی آتی، اور عبرت بھی ہوتی۔ اُس کے واقعات سُن کر مَیں ایسا محسوس کرتا جیسے آہستہ آہستہ میری ہمت اور جرأت کی دیواریں بلند ہو رہی ہیں اور مجھ میں ایک مردانگی کا جذبہ آنکھیں کھول رہا ہے۔

یعقوب بھوت پریت سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ رات کو جب گھر جاتا تو اُنہی گلیوں سے گذرتا جہاں کی لالٹینوں کی بیمار روشنی گلیوں کے درو دیوار اور کھنڈرات کو سوگوار اور سایوں کو اور بھی ہیبت ناک بنا دیتی ہے۔ اُس وقت جھینگروں کی آوازیں زیادہ دلدوز ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات اپنے پاؤں کی آہٹ سے بھی دل ڈرنے لگتا اور کپڑوں کی سرسراہٹ بھی غیر جسم کا لمس معلوم ہونے لگتا ہے۔

مزدوری کے دوران جب مَیں اور یعقوب آرام کرتے تو اپنے آرام کے دنوں کے قصے بھی سُنایا کرتا اور کبھی کبھی مجھ سے بھی کہا کرتا کہ کوئی قصہ سُناؤ جس سے طبیعت خوش ہو لیکن میری زندگی میں خوشی کہاں تھی۔ جب میں سوچتا کہ میرا کوئی خوشی کا زمانہ بھی گذرا ہے تو میرے سامنے میرے مٹیالے ماضی سے لَلّو اور شمّی کی صرف دو صورتیں ابھر کر محو ہو جاتیں اور زبان سے ایک لفظ نہ نکل سکتا۔

مَیں یعقوب کے ساتھ نہ جانے کتنی بار مزدوری پر گیا ہوں اُس نے مجھے کبھی مغموم نہیں ہونے دیا۔ ایک دن مَیں اور یعقوب دھان لگانے گئے نیلے اور سُرخ لہنگے

اور نیچے کیئے ہوئے جھکی ہوئی عورتیں ایسی معلوم ہوئیں جیسے کالے ہرن اپنے اپنے آکھروں[۵] پر اکٹھے ہو رہے ہوں۔ یعقوب نے کہا "جناب من! اِن تمام عورتوں میں مرد تو ہمیں دو ہیں اب کیا ارادہ ہے؟"

مَیں نے کہا "بس آنکھ بچا کے بھاگ لو۔"

چنانچہ ایک ایک کر کے ہم دونوں بھاگ آئے اور خدا کا شکر ادا کیا۔

یعقوب اچھا نیک اور خوش طبع قسم کا ساتھی تھا نہ جانے اب کہاں ہوگا۔

بکری پالی ایک دفعہ ایک پڑوسی کی ایک بکری مر گئی اور اس کے دو بچوں میں سے ایک پٹھیا میری والدہ نے ایک روپے میں خرید لی۔ کچھ دنوں تو وہ گھر میں پلتی رہی۔ جب ذرا بڑی ہوئی تو مَیں جہاں مزدوری پر جاتا اُسے ساتھ لے جاتا اور وہاں جھاڑیوں کی کونپلوں کے علاوہ کوکر اور شہتوت کے تازہ پتّے کھلایا کرتا۔ چند روز میں آزادی اور خوش خوری کے باعث وُہ پوری بکری ہو گئی اور دو بچے دیئے اِس طرح اب تین بکریاں ہو گئیں۔

جب مزدوری میسّر نہ آتی تو مَیں اُنہیں لے کر جنگل کو نکل جاتا۔ انہیں چرانے میں مجھے ایک قسم کی مسرّت ہوتی۔ اور جی چاہتا کہ اگر دس بیس بکریاں ہو جائیں۔ تو مزدوری ترک کر کے یہی کام کرنے لگوں۔ یوں بھی پیٹ بھر روٹی تو مل ہی سکتی ہے۔ اب طبیعت اِسی تصوّر پر اَڑ گئی اور عزائم یہی ضد کرنے لگے۔ مجھے جب بھی فرصت ملتی بکریاں لے کر جنگل کو نکل جاتا۔

اصغر جنگ میرے دوست چودھری اصغر جنگ کو کتب بینی کا شوق تھا۔ وُہ تاریخی اور جاسوسی ناولوں کے علاوہ تنقیدِ مذاہب یا یوں سمجھیئے کہ تنقیصِ مذاہب کا

---

۵ آکھر، ہرن، چکارا، اور نیلا وغیرہ پیشاب اور مینگنیوں کے لئے ایک محفوظ جگہ تلاش کر لیتے ہیں اور پھر وہاں کے سوا کہیں پیشاب نہیں کرتے۔

رسیا تھا۔ اصل میں اس کا اسلامی کتب کا مطالعہ تو محدود تھا اور ہندوؤں کے مناظرل کی کتب کا اس کے پاس اچھا خاصا ذخیرہ تھا جو متعصّب لوگوں کے یک رُخے رجحان کا نتیجہ ہوتا ہے۔

وُہ مجھے ماحول سے بیزار دیکھ کر روز ایک نہ ایک کتاب دے دیتا اور کبھی کبھی پہروں میرے ساتھ بیٹھ کر ڈاکوؤں کے گروہ بنانے کے منصوبے گانٹھا کرتا جو غالباً جاسوسی لٹریچر کے مطالعے کا نتیجہ تھا۔ کتابوں سے ہی اپنی مصیبت زدہ دوپہروں کو ٹھنڈا کرکے اس کی کتاب واپس کر دیتا۔ وُہ مجھ سے اس کا خلاصہ بھی پُوچھا کرتا۔ اور میری سمجھ میں جو اُلٹا سیدھا آتا بیان کر دیتا۔ اُس پر وہ تنقید نہیں تنقیص کی نظر ڈالتا اور اس کے خیال میں جو کچھ آتا بے تکلّف بکتا رہتا۔ اس کے بعد فوراً ایک نئی کتاب مجھے پکڑا دیتا۔ اس نے میرا شوقِ مطالعہ اس قدر بڑھا دیا کہ مَیں جب بکریاں چرانے جاتا تو ایک نہ ایک کتاب میری بغل میں ہوتی۔ بکریاں نہر کی پٹڑی پر جھاڑیوں میں چرتی رہتیں اور میں درخت کے سائے میں کتاب کے مطالعے میں محو رہتا۔ جاسوسی۔ تنقیدی یا تعصّبی مطالعہ کے زور پر اصغر جنگ نے وقتاً فوقتاً میری غفلت اور جہالت کو اس طرح جھنجھوڑا کہ مجھ میں امیروں سے دشمنی اور انتقام کا جذبہ کروٹیں لینے لگا۔ مَیں دُنیا بھر کے مزدوروں کسانوں اور تمام پس ماندہ طبقوں کو اور بھی مظلوم سمجھنے لگا۔ اور اصغر کی اس سازش میں مجھے نیکی نظر آنے لگی۔ اصغر اچھّے کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے باوجود مالداروں کے خلاف تھا اور اپنے باپ کو بھی اسی زمرے میں شمار کرتا تھا۔ وُہ چوروں، ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ لوگوں کو ایک مرکز پر لانے کا متمنّی تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ چور عموماً غاصبوں کا دن میں جمع کیا ہُوا مغصوبہ راتوں کی تاریکی میں چُراتے ہیں اور یہ چوری مُباح ہے جب صرف اصغر اور مَیں دونوں ہوتے تو گانے کی کوشش بھی کیا کرتے۔ وُہ راگ کو اچھی طرح سمجھتا تھا اور صرف مجھتا ہی نہیں تھا۔ کبھی کبھی تو وہ ڈوم ڈھاڑیوں سے وہ گھنٹوں راگ راگنی

پر گفتگو کرتا اور میں حیران و پریشان اُس کا مُنہ تکا کرتا۔ اس کی کوشش کے باوجود میری پراگندہ روزی اور پریشان خالی میرے لئے آڑے آتی رہی اور موسیقی کی تحصیل میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اتنا ضرور ہوا کہ ہر غزل اور نظم تحت اللفظ سے زیادہ گنگنا کر پڑھنے میں لطف آنے لگا۔ کیونکہ طبیعت فطری طور پر نغمہ پسند واقع ہوئی تھی۔ بکریاں چرانے میں دُودھ کا فائدہ ضرور تھا لیکن ایسی آمدنی نہیں تھی کہ مزدوری چھوڑ کر اُسی پر اکتفا کر لیا جاتا۔ چنانچہ مفلسی کا عفریت ایک ایک کر کے تینوں بکریاں بھی ہضم کر گیا اور میں اُسی مزدوری پر آ گیا۔

سردار سوہن سنگھ نہر جمن شرقی کے ایک اوورسیئر سردار سوہن سنگھ اُن دنوں کاندھلے ہی میں تھے۔ میرے والد اُن کے یہاں کام پر جایا کرتے تھے والد کی وجہ سے وُہ مجھ پر مہربانی فرمانے لگے۔ جہاں کام نکلتا مُجھے مزدوری پر لے جاتے اور بڑی شفقت سے پیش آتے۔ ان دنوں محنت مزدوری کے علاوہ رات کو ایک پنواڑی کی دکان پر چند لوگ جمع ہو جاتے اور میں قصوں کہانیوں کی کتابیں اُنھیں سُنایا کرتا۔ قصہ ممتاز۔ حاتم طائی۔ فسانۂ عجائب۔ فسانۂ آزاد وغیرہ کے علاوہ میر حسنؔ کی مثنوی اور نل دمن وغیرہ میں نے اُنھی دنوں پڑھیں۔

ایک خواب ایک رات مَیں نے خواب دیکھا کہ میں ایک کچی سڑک سے ریل کی پٹڑی عبور کرنا چاہتا ہوں مگر خود بخود ایک لوہے کا پھاٹک بند ہوا اور میرا راستہ مسدود ہو گیا۔ دوسرے دن ہی سردار سوہن سنگھ کا تبادلہ ہو گیا وُہ چھچھونگر چلے گئے مَیں بے یار و مددگار رہ گیا۔ اُن کی روانگی سے تیسرے روز مجھے بخار نے آ دبایا اور ساتھ ہی چیچک نکل آئی۔ اب یہ ایسا وقت درپیش تھا کہ مَیں بیمار، والد ضعیف اور ناتواں، زندگی خدا کے سوا ہر سہارے سے مایوس ہو گئی، اَب کھانے پینے کا دارومدار پھر بوڑھی والدہ کے سینے پرونے پر آ گیا۔ مگر مَیں دیکھتا تھا کہ اب ان میں بھی تو محنت

مشقت کا تو تا نہیں لیکن کیا کرتا ؟

ہماری حویلی کے دُوسری طرف سیانیوں[1] کا ایک بڑا گھیر تھا اور اس میں اُن کے کئی خاندان آباد تھے اور ایک زمانے سے وہ کاشتکار پیشہ ہی چلے آ رہے تھے اِس تمام گھیر کے کپڑے سینے سے میری والدہ کو جو معاوضہ ملتا اسی سے دَوا دارُو اور کھانے پینے کا سامان آتا۔

بڑی تکلیف کے بعد پُھنسیاں ذرا خشک ہُوئیں اور مجھے کچھ ہوش آیا لیکن پُھنسیوں کی کثرت سے تمام جسم ابھی ایک زخم کی طرح تھا جس پر پپڑی آگئی ہو۔ مَیں کُرتا پہنتا تو جگہ جگہ زخموں پر چپک جاتا اور میری والدہ بڑی مشکل سے آہستہ آہستہ جُدا کرتیں۔ لیکن روز بروز زخموں سے اندمال اُبھر رہا تھا اور کُھرنڈ سخت ہو رہے تھے۔

مَیں نے دیکھا کہ گھر میں نہ کھانے پینے کو کچھ ہے اور نہ دوا دارُو کو کوئی پیسا، تو مُجھ سے نہ رہا گیا اور چادر اوڑھ کر مزدوری کی تلاش میں نکل کھڑا ہُوا۔ تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ والد صاحب کے ایک کرم فرما شیخ ناظر حسن ملے۔ مَیں نے سلام علیک کیا۔ جواب کے بعد اُنھوں نے پُوچھا کہ کیا کر رہے ہو اور کہاں جا رہے ہو؟

مَیں : ”مزدوری کی تلاش میں نکلا ہُوں“۔

ناظر حسن: ”اِس حالت میں مزدوری کیسے کرو گے؟“

مَیں : ”یہ جو آپ زخم دیکھ رہے ہیں یہ تو زخموں کے نشان ہیں، زخم نہیں۔ مَیں تندرست ہو چکا ہُوں، اب کوئی تکلیف نہیں۔ وہمی لوگ یُونہی چھوت چھات کے خوف سے بد کتے ہیں“۔

ناظر حسن: ”اچھا تو۔ ہمارے قبرستان کے برابر گہر[2] کے اُوپر ہی جہاں ہماری

---

[1] سیانی : ایک ہندو کاشتکار قوم۔ [2] کچا راستہ

امرودوں کی باغیچی ہے۔ قریب قریب ایک ڈیڑھ بیگھے میں ناگ پھنی[1] کھڑی ہے اُسے کاٹ کر برابر باڑھ کے نیچے کھائی کے پانی میں پھینک دو اور کیاری صاف کر دو۔ اس میں امرودوں کے "پیچے" لگانے ہیں۔ مگر پہلے طے کر لو کہ کیا لوگے؟"

میں: "ذرا میں دیکھ لوں تو اندازہ کر کے بتاؤں!"

ناظر حسن: "ابھی دیکھ لو، چلو!"

میں وہاں گیا تو دیکھا کہ زمین کے ایک بڑے قطعے میں قدِ آدم ناگ پھنی اڑی کھڑی ہے۔ پہلے تو مجھے دیکھتے ہی جھرجھری سی آگئی۔ کیونکہ اس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اس کا کانٹا گلتا نہیں لیکن فوراً ہی گھر میں ناہوت[2] کے خیال نے بدن میں بجلی سی دوڑا دی اور میرے ہاتھ پاؤں میں ایک غیبی طاقت جاگ اٹھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "اچھا فیصلہ کریں۔"

ناظر حسن: "تو ایک ہی بات کہتا ہوں۔ ڈھائی روپے دوں گا ناگ پھنی خواہ ایک دن میں صاف کر دو خواہ دس دن میں، میری تو کیاری بن جائے۔"

اُن کے الفاظ کا سپاٹ لہجہ بھاپ کے مرغولوں کی طرح میرے گرد چکر کاٹ رہا تھا جیسے کینر اور گیندے کے پھولوں کی باس خاموشی کو ذرلی اور نفرتِ شاتہ کو غلیظ کر دیتی ہے۔ مگر وقت کا تقاضا۔

میں: "بہت اچھا کیاری بن جائے گی۔ فی الحال آپ مجھے ایک روپیہ دے دیں۔ میں کل سے کام شروع کر دوں گا۔"

ناظر حسن: "لو آٹھ آنے تو یہ لو۔ کل کام پر آجاؤ تو آٹھ آنے اُس وقت دے دوں گا۔"

میں نے آٹھ آنے لئے اور راستے سے دال اور آٹا وغیرہ لے کر گھر پہنچا اور اپنے

---

[1] ناگ پھنی: پنجاب میں اسے چھتر تھوہر کہتے ہیں۔ اس کی شکل سانپ کے پھن کی طرح ہوتی ہے اور اس پر کانٹے بھلے بُونے ہوتے ہیں [2] ناہوت: ناداری۔ افلاس۔

اِس ٹھیکہ کے متعلق ذکر کیا۔ والدہ نے ایک ٹوٹے ہوئے تار جیسی لرزتی ہوئی سانس لی اور کہنے لگیں:۔

"بیٹا! تیرا تمام جسم تو زخموں سے پٹا پڑا ہے تو کس طرح کام کرے گا؟ محنت اور مشقت کے لئے بھی تو توانا اور تندرست انسان ہونا چاہیئے۔ تیرے چہرے اور چال سے تو ویسے بھی ناتوانی ظاہر ہوتی ہے"

مَیں نے بے پروائی کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اُونہہ۔ یہ کام تو اماں بہت ہی ہلکا ہے، بیلچے سے ناگ پھنی کاٹنا ہے اور ٹوکرے میں بھر بھر کے تھوڑی سی دُور پانی میں پھینک دینا ہے اور بس، کام ہوگیا اس میں کونسا پھاوڑے کا کام ہے، جو محنت زیادہ کرنی پڑے گی؟"

دُوسرے دن علی الصبح مَیں بیلچہ اور ٹوکرا لے کر ناگ پھنی کاٹنے چلا گیا۔ دوپہر تک تو کاٹ کاٹ کر وہیں ڈالتا رہا، اور تیسرے پہر سے شام تک ٹوکرے میں بھر بھر کے پانی میں پھینکتا گیا۔ اس طرح چار روز تک میں اُس زہریلے کانٹوں کے جنگل سے لڑتا رہا اور کیاری بنا دی۔ لیکن جب مَیں ہری ہتھیلیوں پر تسلو کا پھننا اور دوپہر کی دھوپ اُس پر اپنی قہر آلود نگاہیں گاڑ دیتی تو مجھے اپنی کمر کے زخم سُلگتے ہوئے محسوس ہونے لگتے ٹوکرے سے چھن چھن کر باریک کانٹے میرے سر میں بھر جایا کرتے اور کچھ گردن پر پھانسوں کی صُورت میں رہ جاتے۔ جنھیں میری والدہ سامنے بٹھا کر پہروں چنتیں اور کڑھتی رہتیں۔ جیسے ایک مدقوق بچّی کے سر میں جوئیں ڈھونڈتے ہوئے ماں کو کڑھن ہوتی ہے۔

ناظر حسن سے ڈھائی روپے آئے اور ٹھکانے لگ گئے۔ لیکن وہی ایک عیب جو مزدوری میں ہے یعنی کسی جگہ مستقل مزدوری کی سبیل نہ نکلی۔

قاضی محمد زکی صاحب نے کئی بار دریافت کیا کہ تمہارے حالات کیا ہیں اگر کچھ

ضرورت ہے تو لے جاؤ"۔ مگر ایسے وقت پر ہمیشہ میری زبان سِلی رہی۔ اس کے باوجود انھوں نے کئی بار اپنے ملازم کے ہاتھ مختلف قسم کا سامان بھجوا دیا۔ ان کے سلوک میں رحم کا عنصر بھی شامل تھا اور محبت کے جذبات بھی۔ ایسے اُستاد اب کہاں میسّر ہیں۔

شہر کی مزدوری

مَیں نے نہر کے ٹھیکیداروں کی بدمزاجی اَور تنگ ظرفی سے تنگ آکر شہر میں مزدوری کرنا شروع کر دی۔ معماروں کے ساتھ کام تو ایسا مشکل اَور ہمّت شکن نہیں تھا کیونکہ وُہ خود بھی زیادہ محنتی نہیں ہوتے لیکن جب مجھے کوئی اپنا سکول کا ساتھی نظر پڑ جاتا تو مَیں گڑ جاتا، اور ہمیشہ عوام کی نظروں سے خود کو چھپا کے رکھتا۔ راستے میں اگر کوئی آتا جاتا ہم جماعت نظر آ جاتا تو راستہ کاٹ کر نکل جاتا یا کہیں ایک طرف ہو جاتا۔

بنیادیں کھودتے ہوئے دو ایک بار میرا پھاوڑا دفینوں پر بھی پڑا مگر میرے لینے کا نہیں تھا۔ مالک مکان نے کام بند کرا کے رات کو سُنگوا لیا۔ ایک بار ایک مکان کی نیو کھودتے ہوئے سونے کی سلاخیں اور اشرفیاں نکلیں۔ مہاجن ذرا فاصلے سے بیٹھا تھا۔ میرے ساتھی نے کچھ اشرفیاں اپنی گُڑگُڑی[1] میں بھر کر اُسے ذرا دُور رکھ دیا اور پھر آکر نیو کھودنے لگا اَور خُود ہی لالہ جی کو پکارا۔ لالہ جی آئے اور کام بند کرا دیا، پھر سُنا گیا ہے کہ وہ دولت رات کو پلّے داروں نے ڈھوئی۔ اَور حُقّے والا ساتھی تمام کا تمام لے کر بیٹھ گیا۔ مَیں مزدوری کے چار آنے سے زیادہ حاصل نہ کر سکا۔ زندگی تھی کہ گھسٹ گھسٹ کے چلتی رہی۔

برکھا کا موسم آگیا اور مکانات کی چنائی کے کام بند ہو گئے۔ اب ایک تو بیکاری تھی دوسرے برسات۔ تین چار دن تک کام نہ لگا۔ میری اُمیدوں

---

[1] چھوٹا حُقّہ

کے چراغ پھر بجھنے لگے اور مایوسی میں در و بام پر ایک باریک شربتی بادلوں کا جال سا پھیلا نظر آنے لگا۔ میں شام کو تین بجے کے قریب ہلکی ہلکی بوندوں میں ایک ٹاٹ کا ٹکڑا اوڑھ کر کام کی تلاش میں نکلا تھوڑی دور ہی چلا تھا کہ بادل چھٹ گئے اور مطلع صاف ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک گلی میں چونے کے بوّں سے لدا ہوا ایک چھکڑا کھڑا ہے۔ میں اس کی طرف تجسس سے دیکھتا ہوا گزر رہا تھا کہ ایک بنیئے نے آواز دی۔

"مزدوری کرے گا؟"

میں۔ "ہاں کروں گا۔"

لالہ۔ "یہ گاڑی بھیتر ڈال دے، بتا کیا لے گا؟"

میں۔ "ایک روپیہ دے دینا۔"

لالہ۔ "لوٹ پڑ رہی ہے؟ لینے دینے کی بات بول نا!"

میں۔ "لالہ! اب تم کہدو!"

لالہ۔ "بارہ آنے ملیں گے۔ گھنٹے بھر کا تو کام ہے بھی نہیں۔"

میں نے "اچھا" کہہ کر اپنا ٹاٹ کا ٹکڑا کمر پر ڈال لیا اور وہ چونے کے کھدّ کتنے ہوتے تھے جو پھٹی پرانی بوریوں میں تھے اس کے بہل خانے میں ڈالنا شروع کر دیئے بوریوں پر جہاں جہاں بوندیں لگی تھیں وہیں وہیں سے جھار کھل گئے تھے اور چونا نکلنے لگا تھا۔ اسی طرح دسیوں بوریوں میں تسند ھڑ سند ھڑ کے سوراخ نظر آنے لگے تھے۔

لالہ جی نے تقاضا کیا کہ "جلدی ڈھو! جلدی! نہیں تو یہیں ڈو دن کا کام ہو جائے گا اور اس میں میرا کوئی دوش نہیں ہو گا۔"

لالہ کے اس فقرے کا مجھ پر بھی اثر ہوا اور میں سانس روک روک کر جلدی

جلدی چونا ڈھونے لگا۔ گئی جگہ سے گرم چونے نے میری گردن اور کمر جلا کے رکھدی خدا خدا کر کے رات کے گیارہ بجے تک گاڑی ختم ہوئی اور میں نے زمین پر گرا ہوا چونا ہاتھوں سے سمیٹا، چونے کی حدت نے انگلیوں پر بھی اثر کیا اور ہاتھ الوائے ہو گئے۔ بارہ آنے لے کر میں جھلسا جھلسایا گھر پہنچا اور اس جان لیوا مزدوری کی رُو داد گھر والوں کو نہ سنائی صرف اتنا کہا۔ تھوڑا سا چونا ڈھویا تھا بارہ آنے بل گئے۔ میری والدہ نے میرے سارے بدن پر تیل مَلا۔ میں اس قدر تھک چکا تھا کہ کھانا کھانے کے بغیر ہی سو گیا۔ اُس نیند کی لذت مجھے زندگی بھر نہ بھولے گی۔

اس کے بعد میں نے محکمہ نہر میں قُلی سے لے کر محرّر تک کی جگہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ چِٹھّی رسانوں میں نام دیا، عرائض نویسی کرنا چاہی۔ مگر ہر دروازے سے قسمت نے دھتکار دیا۔ جس قدر ناکامیاں ہوتی گئیں اُسی قدر مجھے غم انگیز اور انقلابی کتابیں پڑھنے کا شوق بڑھتا گیا۔ میں اِن دِنوں مراثی میر انیس پڑھ پڑھ کر نہ جانے کتنی بار خود رویا اور کتنی بار دُوسروں کو رُلا رُلا کر دِل ہلکا کیا۔ اسی طرح زہرِ عشق نے بھی کچھ کم اثر نہیں کیا مگر روز کی مُشقت کا سلسلہ ہر لطیف جذبہ کو روند ڈالتا اور میں بھچک کر رہ جاتا۔ یُونہی زندگی پاؤں مل مل کر مستقبل کے مصائب کی طرف چلتی رہی۔

ایک بااصُول آقا

قصبے میں ایک رئیس ایسا بھی تھا جو یُوں تو سرمایہ داری کے تمام اصُول و قواعد سے آگاہ ہی نہیں اُن پر کاربند بھی تھا لیکن ایک بات اس میں جانے کہاں سے جنم لے گئی تھی کہ جب وہ کوئی کام غلط یا اپنی مرضی کے خلاف پاتا تو نوکروں چاکروں پر ہی نہیں بیوی بچوں پر بھی جُرمانہ کر دیتا تھا۔ حالانکہ بیوی کا چونڈا اَیک چکا تھا اور اولاد جوان تھی۔ اُس کی

ھ الوائے: چھُونے سے دُکھنے والے۔

اس عادت کا نتیجہ یہ تھا کہ کوئی ملازم نہیں ٹھہرتا تھا۔ اپنے بھولپن میں افلاس کے مارے لوگ نوکری کی ہامی تو بھر لیتے مگر جب وہ اپنی عادت کے مطابق جرمانہ کرتا تو اچھے اچھے جیالے لوگ اُڑنچھو ہو جاتے پھر بھی جتنے دنوں کوئی کام کرتا لالہ اُن تمام دنوں کا حساب صاف کر دیتا تھا۔ سات آٹھ روپے کی تنخواہ میں آٹھ دن کے جرمانے بھرنا پس ماندہ طبقے کے بس کی بات کہاں ہو سکتی تھی؟ چنانچہ اس کے یہاں ایک دو نوکروں کی ہر وقت ضرورت رہتی تھی۔

مَیں بیکار ہُوا تو ایک دو روز کے بعد میری طبیعت گھبرانے لگی اور ایک مزدور نے جو لالہ کا زخم خوردہ تھا مجھے اُس کا پتا بتا دیا۔ مَیں ایک واقف کو ساتھ لے کر لالہ کے پاس گیا، کیونکہ مزدوری دریافت کرتے ہُوئے بھی مجھے شرم سی محسوس ہوتی تھی۔

لالہ نے ایک نظر میں نیچے سے اُوپر تک دیکھ کر میرا جائزہ لیا جیسے بے احتیاط دولتمند کو دیکھ کر ڈاکو کے چہرے پر پسندیدگی کی بھیانک سُرخی اور آنکھوں میں خونخواری آجاتی ہے، کہنے لگا "یہ تو ویسے ہی دھان پان ہے، کام کیا کرے گا؟ میرے یہاں تو مالی کے نیچے کام کرنے والے آدمی کی ضرورت ہے۔ اس میں تو مونگھے کھودنا پانی دینا، تھالے بنانا۔ قلمیں باندھنا، گھاس صاف کرنا، پودے لگانا، سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اِس کے مُنہ پر تو ویسے ہی ہوائیاں اُڑ رہی ہیں۔"

اُس وقت میرے خیالات کا یہ عالم تھا جیسے بگولے میں پُرانی دھجّی لہرا رہی ہو میرے ساتھی نے جواب دیا کہ "لالہ جی! یہ تو بڑا جی دار لڑکا ہے۔ اس کے کام میں شکایت کا موقع نہیں ملے گا! یہ تو گا ہے کھودتا ہے گا ہے! اس سے کام لے کر دیکھیں اور پھر بتائیں۔"

لالہ:- "مَیں اصُولی آدمی ہُوں اور ایسا ہی آدمی چاہتا ہوں۔ زبانی چاپلوسی نہیں۔"

مَیں اس کی گفتگو سے کھڑا بھنّاتا رہا، لیکن جب اُس نے اصُول کا نام لیا

تو مجھ سے نہیں رہا گیا۔

مَیں :۔ "لالہ جی۔ ساری زندگی بااصُول ہے؟ یا صرف نوکروں تک اصُول ہیں؟"

لالہ :۔ "ساری زندگی سے تیرا کیا واسطہ؟ تُو تو باغ کا نوکر ہوگا۔ وہاں کوئی غلطی ہوئی تو مَیں جرمانہ ٹھونک دوں گا۔ سُن لیا"

مَیں :۔ "بااصُول ہونا تو بڑی اچھّی بات ہے مگر دُوسروں کے اصُول کو بھی تو نہیں بھُولنا چاہیئے۔ اُنہیں بھی تو اصُول قائم رکھنے کا حق ہے؟"

لالہ :۔ "کیوں نہیں! میری غلطی ہو تو مَیں بھی قصوروار ہوں، مَیں کوئی لاٹ صاحب تو نہیں۔"

مَیں نے کہا "ٹھیک ہے مجھے منظُور ہے۔"

لالہ :۔ "جا تو یہاں کیوں کھڑا ہے؟ کچھ پیسے چاہئیں تو لے جا۔ رات کو وہیں سونا پڑے گا۔ مَیں سویرے ہی سویرے باغ میں پہنچ جاتا ہُوں۔"

مَیں فوراً ہی باغ کو روانہ ہوگیا اور جا کر مالی سے کہا۔ "مجھے لالہ نے آپ کی خدمت کے لئے بھیجا ہے۔" مالی شریف انسان تھا اس نے کہا

"بھائی میری طرف سے کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ مگر جب لالہ باغ میں آوے اُس وقت ذرا چوکس رہنا۔ وُہ جرمانے کر کر کے کلگا دیتا ہے۔"

مَیں نے فوراً بیلچہ اُٹھالیا اور شام تک پنیری کے لئے گڑھے کھودتا رہا۔ زمین گیلی تھی۔ شام تک ہاتھ باہنوں تک گارے میں سن گئے۔ اور جو کپڑے پہنے ہوئے تھا وُہ بھی اکارت ہوگئے اور علاج بھی کیا تھا، آخر نوکری تھی! شام کو گھر گیا اور کھانا کھا کر واپس باغ میں آگیا۔ باغ میں چوکیداری کے لئے دُوسرا آدمی تھا۔ علاوہ ازیں جن لوگوں نے شہتوتوں کی فصل خرید رکھّی تھی وُہ بھی جھونپڑی میں رہتے تھے۔ لیکن پھر بھی مالی نے پھولوں اور ذخیرے کی نگہداشت پر میری ڈیوٹی لگا دی،

اُور رات میں ایک دو بار باغ میں گشت کرنا میرے فرائض میں شامل ہوگیا تاکہ کوئی ذخیرے سے پودے نہ لے جائے، اُور پھولوں کے گملے چوری نہ ہوں۔

جب میں دُھوپ میں کام کرتا اُور ہوا بند ہوتی تو شلوکے کے نیچے بدن چھپانے لگتا اور جُوں جُوں سُورج چڑھتا جس کی شدّت سے کمر اور سینہ پر پسینہ برفاب سے زیادہ سکون بخش لگنے لگتا۔ جب میں کھانا کھانے کے لئے کام چھوڑتا تو دُھوپ سے نرم و نازک پودے بھی تھکے ماندے ساتھیوں کی طرح نظر آتے اور سبزے پر ایک حسرت سی پھیلی رہتی۔ رات کو جب مَیں ذخیرے کی طرف پھیرا لگانے اُٹھتا تو باغ کے سوتے ہوئے نوکر میلے، متعفّن اور بھیگے ہُوئے کپڑوں کی ڈھیریاں سی معلوم ہوتے۔

جب رات آسمان سے اپنا بساطِ خانہ سمیٹتی اُور فضاؤں میں سنولاہٹ آجاتی تو میری قُوّتِ حیات مجھ سے خود بخود بستر چھین لیتی۔ میں اُٹھ کر پھولوں کے گملوں کی طرف چلا جاتا۔ کہ کوئی گملا کم تو نہیں ہوگیا، پھر وہیں رہٹ کے قریب وضو کرکے نماز سے فارغ ہوتا اور ٹہلتے ٹہلتے ذخیرے کو دیکھتا، واپس آکر پھر کنویں پر بیٹھ جاتا۔ جب آنکھیں جھپکاتے جھٹپٹے میں اندھیرے کی دیواروں کے گرنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آتیں جیسے دُور بستی میں شور جاگ رہا ہو اُس وقت میری نظر خود بخود فضا کی طرف اُٹھ جاتی اور مجھے ایک قسم کا سکون سا محسُوس ہوتا۔ جب درختوں پر نکلتے ہُوئے سُورج کی کرنوں سے درختوں کی چوٹیوں پر سنہری قناتیں بندھ جاتیں اُور ٹھنڈی ہَوا سے ہلتے پتّوں پر اُترتی کرنوں سے ہلکی ہلکی تالیاں سی بجنے لگتیں تو مَیں اپنے کوٹھڑے کی طرف آجاتا جہاں میرا بیلچہ اُور پھاوڑا وغیرہ رکھا رہتا تھا۔ باغ میں تازہ ہَوا اُور محنت سے میری صحّت بہت اچھّی ہوگئی تھی۔ اُس وقت قُدرت میرے بازوؤں میں آہستہ آہستہ سیسہ پلا رہی تھی اور مجھے اپنی رانوں کی مچھلیاں سال کے گُودے کی بنی ہُوئی محسُوس ہوتی تھیں۔

ایک دن لالہ حسبِ معمول منہ اندھیرے سیر کو آیا تو باغ کا دروازہ کُھلا پایا جسے

مَیں رات کو بند کرنا بھُول گیا تھا۔ لالہ تو دروازہ چوپٹ دیکھ کر آگ بگولا ہوگیا، اور وہیں سے ہنکارنا شروع کر دیا۔

"نوکروں کا کیا ہے؟ اگر کوئی گھوڑا گدھا باغ میں گھس آتا تو میاں صاحب کا کیا جاتا نقصان تو میرا ہوتا۔"

مَیں ابھی بیلچہ اور کھُرپی سنبھال ہی رہا تھا کہ لالہ میری جان کو آ اٹکا۔ مگر میرا قصور تھا میں سنی اَن سُنی کرتا رہا۔ جب اُس نے خوب دل کی بھڑاس نکال لی اور بھانت بھانت کی بولیاں مجھے سُنا چکا تو بڑے جھٹکے کے لہجے میں بولا۔

"اچھا تو پھر دو روپے جرمانہ! ۔ سُن لیا نا؟ تُم لوگ یُونہی ٹھیک رہتے ہو۔"

مَیں "جی ہاں سُن لیا!" دو روپے جرمانہ سُن کر میرا سینہ دَند کھنے لگا۔ اور فکر ہوئی کہ آٹھ روپے میں سے چھ باقی رہ گئے یہ تو بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔ مگر کیا کرتا دل مسوس کے رہ گیا۔

چھ سات روز کے بعد مَیں پودینے کی کیاری سے گھاس صاف کر رہا تھا کہ لالہ نے پیچھے سے آکر پُوچھا "کیا حال ہے۔ کیا کام ہو رہا ہے؟" مَیں نے دیکھا کہ لالہ جوتے سمیت کیاری میں آگیا اور میرے سر پہ کھڑا ہے۔ مَیں نے دست بستہ عرض کی۔

"جناب یہ کھانے پینے کی چیز ہے؛ آپ دیکھ رہے ہیں کہ مَیں ننگے پاؤں گھاس نکال رہا ہوں اور آپ جوتا پہنے چلے آئے لہٰذا چار روپے جُرمانہ!! بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟"

لالہ دو منٹ تو میرا منہ تکتا رہا پھر مُسکرا کے بولا۔

"ابھی گھر جا کے نوکر کے ہاتھ بھیجتا ہُوں۔ آج تو مزا آگیا۔"

لالہ نے گھر پہنچتے ہی ملازم کے ہاتھ مجھے چار روپے بھیج دیئے۔ مَیں بڑا خوش ہوا اور خیال کیا۔ یہ تو بڑے کام کا انسان ہے۔ چنانچہ لالہ مجھ پہ اور مَیں لالہ پہ جُرمانہ کرتا،

اور کوئی مہینہ ایسا نہ ہوتا کہ میں تنخواہ سے ڈیوڑھی رقم وصُول نہ کرتا۔

کچھ دِنوں کے بعد لالہ نے ایک نئی قید کا اضافہ کیا "تمہارا کوئی دوست باغ میں نہ آنے پائے۔ تمہاری چوبیس گھنٹے کی نوکری ہے۔ صرف کھانے کے وقت گھر جا سکتے ہو"۔ اِس نوکری میں مجھے جُرمانہ تو راس آگیا تھا اور لالہ مجھے سمجھ گیا تھا لیکن لالہ کا خیال تھا کہ جب میں کھانا کھانے جاتا ہوں تو دیر میں آتا ہوں اور میرے دوست زیادہ ہیں۔ اور کسی حد تک یہ بات تھی بھی درست۔ مگر لالہ کی یہ شرط میری طبیعت کے خلاف تھی کیونکہ اس میں میرا جسم نہیں رُوح قید ہو رہی تھی۔ چنانچہ مَیں نے جواب دے دیا اور آکر پھر وہی پُرانی فکر۔

فصل کی کٹائی

گرمیوں میں جب گیہوں کے کھیت پک جاتے ہیں اُس وقت گرمی کی دیوی کا شباب بھی تنت پر ہوتا ہے۔ کھیت کاٹنے کے لئے سُورج نکلنے سے پہلے دیہات اور قصبات کے لاوڑے[1] دس دس بیس بیس کی ٹولیاں بنا بنا کر آبادی سے جنگلوں کی طرف نکل پڑتے ہیں۔ اس وقت دُور سے یہ نظارہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مینڈوں پر ہرنوں کی قطاروں نے آدمیوں کی صورت اختیار کر لی ہو۔

مَیں بھی اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ لائی[2] کرنے جایا کرتا تھا۔ مَیں نے قصبے سے چار چار پانچ پانچ کوس تک جا کر کھیت کاٹے ہیں اور میرے دست و بازو نے مجھے کبھی مایوسی کے رستے پر نہیں ڈالا۔ میرا محنتی مگر کمایا ہوا جسم مجھ سے کبھی بے وفا نہیں رہا۔ مَیں نے اپنے سب ساتھیوں سے زیادہ لمبی اور اچھی درانتی بنوا رکھی تھی اور اُس درانتی میں وہی میرے بازو کا کام دیتی تھی۔ کیونکہ اس کے سبب سے مَیں دوسروں

---

[1] کھیت کاٹنے والے مزدور جنہیں شام کو معاوضہ میں غلّے کا لان ملتا ہے۔ لاوے کہلاتے ہیں
[2] کھیت کاٹنے کا معاوضہ جو لاوے کو لان کی صورت میں ملتا ہے۔ لائی ہے۔

میں بیٹھا نہیں رہتا تھا۔ جب ہم علی الصبح گھروں سے نکلتے تو جنگلوں کی پُر کیف ہوا میرے گالوں اور پیشانی کو تھپتھپاتی مگر تھوڑی دیر میں جب چلتے چلتے دِن چڑھ جاتا تو مجھے پسینے کی نمی کا احساس ہونے لگتا۔

جب سب لاوے کھیت کاٹنے بیٹھتے اور پانت بھرتے تو میرے والد صاحب میرے برابر بیٹھتے کیونکہ وہ ضعیف تھے اور لاوے اپنی پانت کی حد سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں کاٹتے ان میں کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔ بلکہ ایک طرح کی آپا دھاپی پڑی رہتی ہے۔ جو کھیت کاٹ کر گلی بناتا آگے بڑھ گیا وہ بڑھ گیا اور جو رہ گیا بس رہ گیا۔ اس وقت گویا وقت اور قوتِ انسانی میں دوڑ ہوتی ہے۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد سب برابر نظر آنے لگتے ہیں۔

بعض بعض جیالے اپنی پانت کاٹ کر آرام کرنے لگتے ہیں اور جو بہت کمزور ہوتے ہیں وہ کاٹتے رہتے ہیں، کوئی کسی کا ہاتھ نہیں بٹاتا۔ البتہ شام کو جو پیچھے رہ جاتے ہیں سب اُن کمزوروں کی مدد کرتے اور مل جل کر بچا کھچا کھیت برک ڈالتے ہیں۔ کبھی کبھی اگر کسی کا کام کم ہمتی سے سب کے برابر نہیں ہوتا تو وہ رات تک کاٹتا رہتا ہے۔ البتہ ہر لاوا سب کے مساوی کام کر کے مساوی لائی کا حقدار رہتا ہے۔ مجھے کھیت کاٹتے ہوئے کبھی ایسا موقع نہیں آیا۔ میں ہمیشہ اپنی درانتی کا تعاقب کرتا اور نتیجہ یہ ہوتا کہ کبھی کسی سے پیچھے نہ رہتا۔ لیکن آرام بھی نصیب نہیں تھا، کیونکہ مجھے کھیت کاٹتے ہوئے بوڑھے باپ کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہوتا تھا۔ اگرچہ وہ بھی بڑی محنت اور جانکاہی سے کام کرتے تھے۔ لیکن مجھے اُن کی اس عمر کی مزدوری سے قلق ہوتا تھا۔ کیونکہ ایک تو بوڑھاپا، دُوسرے اُن کے گھٹنوں میں درد مستقل ہو گیا تھا وہ جھک کر کھیت کاٹتے تھے بیٹھ کر

ف پانت: قطار۔ لائن۔ اگر ہم بیٹھ کر مشرق کی طرف منہ کر لیں اور شمالاً جنوباً بازو پھیلائیں تو جہاں تک ہاتھوں کی حد ہوگی وہ پانت ہوگی۔

نہیں، اس لئے تھوڑی دیر کے بعد کمر سیدھی کرتے تھے تو میری جان پہ بن جاتی تھی۔ اس محنت اور خدمت سے کسانوں میں میری طرف سے شریفانہ خیالات تو پیدا ہوتے اور ٹھانوں پر میرے تذکرے رہتے لیکن اُن کی ہمدردی یہیں تک تھی، اس سے آگے نہیں، اور وہ بیچارے کرتے بھی کیا؟ جب ہم لوگوں کو لائی ذرا اچھی مل جاتی اور گیلی نالیوں۔ کے جُونوں میں بھروٹیاں باندھ باندھ کر سب اپنا اپنا بوجھ اُٹھا کے نیچے اُونچے دگڑوں سے گذرتے تو خشک بالیوں اور نالیوں کی آواز ایسی معلوم ہوتی جیسے ہوائیں گھنگرو باندھ کر ٹھمکتی ہوئی ساتھ چل رہی ہیں اور چاندنی جھائیں مائیں کھیلتی شانہ بشانہ آرہی ہے۔

میری زندگی مزدوری ہی میں گذری لیکن لائی سے زیادہ مَیں نے کسی کام کو سخت نہیں پایا۔ حالانکہ سادن بھادوں میں جب ایکھ[1] سانُوٹے ہوجاتے ہیں تو پتی دھاردار بن جاتی ہے۔ مَیں نے ایکھ کھودے ہیں۔ جنس میں ننگے بدن پر جب پتی لگ جاتی تو نشتر کا کام کرتی اور کھودتے کھودتے جب میں ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے کھڑا ہوتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے میں تخلیق کے مرحلے میں ہوں اور لچک کے لئے عناصر کا گرم گرم مسالہ مٹر تڑ رہا ہے۔ لیکن لائی پھر لائی ہے۔

اسی طرح جب میں اور میرے والد حاجی ریاض الاسلام[2] کے باغ میں بوکے[3] ڈالتے جاتے اور سارا دن پانی کھینچتے کھینچتے کمر تختہ ہوجاتی تو بیٹھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا جیسے بدن کے جوڑ زنگ آلود ہوگئے ہیں مگر لائی اس سے بھی جان لیوا مشقت ہے، دوپہر کو جب تمام لاوے اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے تو چھدرے درختوں کے سائے دسترخوانوں پہ جراریوں کے ہاتھوں کی طرح لپکتے رہتے۔ کورے گھڑے کا سوندھی سوندھی

---

[2] کاندھلہ کے ایک رئیس جو وفات پا چکے۔

[3] بوکا۔ چمڑے کا ایک بڑا ڈول جس میں دونوں طرف رسّی بندھی ہوتی ہے اور دو مزدور آمنے سامنے کھڑے ہو کر کنوئیں کے نشیب سے پانی لے کر اُوپر کھیت میں یا نالی میں پھینکتے ہیں۔

خوشبو والا پانی اور پسینے پر سائے کی آزاد ہوا دُنیا و مافیہا سے بے خبر کر دیتی، مجھے تو فوراً نیند آجاتی تھی۔ جب تک لوگ حقّہ پیتے اور اِدھر اُدھر کی گفتگو میں وقت گزارتے مَیں ذراسی دیر سو لیتا اور جب وہ کام کے لئے اُٹھتے تو مَیں تازہ دم اپنی درانتی لے کر ان کے ساتھ کٹائی پر بیٹھ جاتا، مجھے سونے جاگنے میں اُنھیں دنوں کی عادت اب تک سنبھالے ہُوئے ہے۔

ایک کمزور ساتھی

تصدق حسین کاندھلے میں ایک پان فروش تھا غالباً آمدنی کم ہونے کے باعث پوٹ[۱] پُورا نہیں ہوتا ہوگا۔ اس لئے وہ لاڑول کے موسم میں لاوؤں کے ساتھ ہو لیتا تھا تاکہ شام کو دوسروں کے ساتھ برابر کی لائی مل جائے یہ شاید اس کا تیسرا سال تھا کہ وہ ہم لوگوں کے ساتھ ہو لیا۔ اتفاق سے اس کی پانت میرے دائیں ہاتھ تھی اور آسمان جھیل کی طرح صاف، جیسے جیسے سورج بلند ہوتا گیا درانتیاں رفتار پکڑتی گئیں۔ تقریباً گیارہ کا عمل ہوگا۔ کہ کھیت میں جھوانسا[۲] آگیا۔ اس وقت کٹائی مَد پر تھی اور درانتیاں تھیں کہ ایک ایک دو دو فٹ آگے تک کے کھیت کو اُڑاتی جا رہی تھیں۔ جھوانسا کے کانٹوں نے درانتیوں کی رفتار نرم کر دی، اس سے کٹائی کرنے والوں میں ذراسی احتیاط آگئی تھی۔ اتفاق سے تصدّق کے سامنے جھوانسا زیادہ آگیا اور کھیت کم۔ اُوپر سے سُورج کی سنگینیں گدّیوں کو چھیدے ڈالتی تھیں۔ اور کمروں پر شلوکے ٹین کی چادروں کی طرح تپ رہے تھے۔ تصدق بیچارا اس مصیبت میں گھبرا گیا اور اُس نے اپنی درانتی زمین کی درز میں دے کر توڑ ڈالی اور ہاتھ جھاڑ کر معذرت کرنے لگا۔ لیکن ہم سب سمجھ گئے اور مشورہ کر کے اُسے سب کا کھانا لانے کے لئے بھیج دیا اور اس کا کام تھوڑا تھوڑا سب نے تقسیم کر لیا۔ مگر تصدق اس رزق رسانی کے کام میں اس قدر مستعد نکلا کہ بہت ہی جلد سب کے گھروں سے چھالا[۳] بھر کے کھانا لے

---

[۱] پوٹ: تعداد۔ ضرورت [۲] ایک کانٹے دار بوٹی جس میں پتّے کم اور کانٹے زیادہ ہوتے ہیں۔
[۳] چھالا: چھبّا۔ چھبّا۔ بڑا ٹوکرا۔ چھابڑا۔ چھابا۔

آیا اور جس جس کے گھر سے لایا تھا اُسی کو دیا۔ اب تو وُہ جب بھی ہمارے ساتھ ہوتا ہم اسے یہی کام دیتے اور وُہ بطریقِ احسن انجام دیتا۔ سُنا ہے تصدق حسین دہلی گیا تھا۔ اور ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں کام آگیا۔ اللہ اُسے جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین

ایک میٹرک پاس مزدور

اتفاق سے مُجھے ایک ایسا ساتھی نصیب ہُوا جس کا نام مسعود تھا اور دسویں جماعت پاس کر چکا تھا۔ خاندانی لحاظ سے مہذّب اور عادات کے اعتبار سے وُہ تربیّت یافتہ معلوم ہوتا تھا معاشی طور پر اُس خاندان کے انحطاط کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کیونکہ مسعود خاکی زین کا شکاری کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ بدقسمتی نے اُسے میرے ساتھ کل ہجڑ کر دیا اور اسے اب تک یہ معلوم نہیں تھا کہ مزدوری میں مزدُور پر کیا گزرتی ہے وُہ شریف تھا اور باہمت اسی لئے اس نے مزدوری کی ٹھان لی تھی۔ لیکن کوئی مزدور اُسے اپنی جوڑی میں رکھنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ناز و نعم کے پلے ہوئے بچّے اسکول کی فضا سے نکل کر مزدُوری نہیں کر سکتے۔ مزدوری کرنا تو اپنے خون کے شعلوں سے کھیلنا ہے۔ مجھ سے ملنے سے پہلے وُہ کسی مزدور کے ساتھ گیا ہوگا، اِس لئے وہ نہر پر گا ہے کھودنے یا زیت ڈھونے سے گھبراتا تھا۔ کیونکہ وہ تو بڑا ہی پِتّہ ماری کا کام ہے وہ کسی ہلکی سی مزدُوری کا تلاشی تھا مگر اس کے ڈھب کا کام اسے میسّر نہیں آتا تھا۔

مَیں اور مسعُود مزدوری کی تلاش میں نکلے، کیونکہ دونوں کے حالات ناگفتہ بہ تھے۔ مزدُوروں کے کام پر جانے کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ نرم دوپہری ہو رہی تھی اس وقت کہاں کام لگ سکتا تھا۔ لیکن تفریحاً ہم دونوں تلاشِ معاش میں نکل کھڑے ہوئے اور تیسرے پہر تک قصبے کی گلیوں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ کہیں کسی نے مزدوری کے لئے نہیں پوچھا۔ اب ہم مایُوس ہو کر لوٹ رہے تھے کہ ایک ادھیڑ عمر کے تو ندل بنیئے نے اشارے سے بُلایا اور کہا " مجُوری کرو گے ؟ "

مَیں نے کہا " ہاں کر لیں گے، کیا کام ہے ؟"

لالہ ۔" میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ ۔"

ہم دونوں اس کے پیچھے ہو لئے وُہ ہمیں ایک طویلے میں لے گیا جس کے صحن میں ایک سرخی کا ڈھیر لگا ہُوا تھا ۔ ڈھیر کی طرف اشارہ کر کے اُس نے کہا " یہ سُرخی اٹھا کر سامنے چھپّر میں ڈالنی ہے ۔ بتاؤ کیا لو گے ؟"

مَیں ۔" دو روپے ہوں گے ۔"

لالہ ۔" مجاک نہ کرو، مجوُری کرنی ہے تو ٹھیک بولو ۔"

مَیں " ۔ تُم بھی تو کچھ بتاؤ کیا دو گے ؟"

لالہ ۔" کھرا ایک رُپیّا ملے گا "

مَیں نے مسعُود کی طرف دیکھا اور مسعُود نے چپکے سے کہا " ٹھیک ہے ۔"

اس کا اشارہ پا کر مَیں نے لالہ سے کہا ۔ " اچھّا! کام ہو جائے گا ۔"

لالہ ۔" ہو کیا جائے گا، شرو کر دونا، جب معاملہ طے ہو گیا تو اب باکی کیا رہ گیا ہے ؟"

مَیں ۔" ہمیں ایک طشتلا یا پراٹ لا دو آخر ہم کس چیز میں بھر بھر کے اُٹھائیں ؟"

لالہ ۔" میں تو بس رُپیّا دوں گا ۔ اپنے گھر سے جا کے کچھ لے آؤ، مجھے کلکان نہ کرو ۔"

مَیں نے مسعود سے کہا " لعنت بھیجو ۔ اس مزدوری پر چلو خُدا اور کہیں دیگا ۔"

مسعود نے کہا " یہ بھی تو خدا نے ہی دی ہے اب لینا نہ لینا ہمارا کام ہے ۔" اتنے میں لالہ کو تو کسی بچّے نے آواز دے لی اور وُہ یہ کہہ کر چل دیا " جب کام ختم کر لو تو آ جانا رُپیّا دے دوں گا ۔"

ہم دونوں کھڑے سوچتے رہے مگر کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی آخر مَیں نے مسعود سے کہا " تُمہارا یہ زین کا کوٹ نیا ہے یا پُرانا ؟"

اس نے جواب دیا ۔" نہ نیا ہے نہ پُرانا، میری طرح مصیبت زدہ ہے "

مَیں :- "کیا اس میں سُرخی نہیں ڈھوئی جاسکتی ؟"

مسعُود :- "ڈھوئی تو جاسکتی ہے مگر یہ لال ہوجائے گا۔"

مَیں :- "کیا بُرا ہے ؟ لال ہو یا کالا - کوٹ تو ہر صُورت میں رہے گا۔"

مسعُود نے بادلِ ناخواستہ کوٹ اُتار کر میرے اوپر پھینک دیا - مَیں نے کہا -

"مَیں کیا کروں ؛ زمین پر بچھاؤ اور سُرخی بھرو - مَیں اُٹھا اُٹھا کے اندر ڈالتا ہوں۔"

مسعود نے کوٹ بچھا کر سرخی بھرنا شروع کر دی اور مَیں اُٹھا اُٹھا کر اندر ڈالنے لگا - دوسرے دن دوپہر تک ہم نے سُرخی اندر ڈال دی - لالہ آ آ کر ہمیں دیکھتا رہا - اور آخر میں صرف یہ کہا -

"میاں صاحب ! تُم مجبُور معلُوم نہیں ہوتے ؛ پرماتما جو چاہے وہی کرتا ہے۔"

یہ کہتے ہُوئے اس نے ہمیں ایک روپیہ اور ایک آنہ دے دیا اور کہا " اس ایک آنے کا گُڑ کھانا۔"

ہم مزدوری لے کر چل دیئے - اور آگے چل کر آٹھ آٹھ آنے تقسیم کر لئے - تیسرے چوتھے روز مُجھے ریلوے لائن کے برابر برابر مٹّی ڈالنے کا کام مل گیا اور چونکہ مٹّی قریب سے لائی جاتی تھی اس لئے نرم کام دیکھ کر مَیں مسعود کو ساتھ لے گیا - مَیں مٹّی کھود رہا تھا اور مسعود ڈھو رہا تھا کہ اتنے میں ایک ٹرالی آ کر رُکی اور ایک افسر اُترا ، نہ جانے وہ اوورسیئر تھا یا ایس - ڈی - او ، بہر نوع میری نظر میں وہ افسر تھا - ساری مدد جلدی جلدی کام میں مصروف ہو گئی اور وہ ٹہل ٹہل کر کام دیکھنے لگا - مَیں نے مسعُود سے کہا -

" جب یہ تمہارے پاس آئے تو اس سے انگریزی میں گفتگو کرنا اور چہرے پر شگفتگی رکھنا۔"

مسعُود نے کہا " کیوں ؟"

مَیں نے کہا "ذرا دیکھو تو سہی مزا۔"

مسعود خاموشی سے مٹی ڈھوتا رہا اور جب ٹرالی والا افسر اس سے قریب ہوا تو اس نے انگریزی میں سلام کیا۔ مسعود کا لہجہ اور تلفظ انگریزوں کی طرح تھا افسر نے حیرت سے اُسے دیکھا اور پھر انگریزی میں سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ مسعود برابر جواب دیتا چلا گیا آخر میں اس نے پُوچھا۔ "تمہاری تعلیم؟"

مسعود نے جواب دیا کہ "دسویں پاس کر چکا ہُوں۔"

ٹرالی والے افسر نے کہا "ٹوکری پھینک دو اور ٹرالی میں میرے ساتھ چلو۔"

مسعود پیر ملنے لگا۔ مَیں نے کہا "جلدی بھاگ، ایسا نہ ہو کہ قسمت کا دروازہ بند ہو جائے۔"

مسعود ٹرالی والے افسر کے ساتھ چلا گیا اور اُس نے اُسے نوکر کرا دیا۔ اس کے بعد مسعود سے صرف ایک بار بھٹنڈہ کے اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ وہ دیکھتے ہی ہنس کر لپٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور گاڑی میں اگلے اسٹیشن تک میرے ساتھ آیا اس کے بعد اس سے ملاقات نہیں ہو سکی۔

والد کی علالت

اسی اثنا میں والد صاحب بیمار ہو گئے اور بخار کی حالت میں جوڑوں کا درد بھی شدید ہو گیا۔ سینکڑوں علاج معالجے کیئے مگر پھر وہ صحیح معنی میں مزدوری کے قابل نہ ہو سکے۔ اب میرے بوڑھے ماں باپ کے جُھرّیائے ہوئے چہرے ہر وقت میری نظروں میں پھرا کرتے۔ مَیں اکثر بے چین رہا کرتا۔ مگر خُدا کی ذات کے سِوا کوئی آسرا نظر نہ آتا۔

منافع خوروں کی ملازمت

مُلک کے شہروں سے لے کر دیہات تک میں منافع خور پٹھان اور پارچہ فروش سِکھ جگہ جگہ ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ چنانچہ کاندھلے میں بھی لدّھا سنگھ اور کئی اس کے

ساتھی غریبوں، مزدوروں اور کسانوں میں کپڑا فروخت کر کے اس کی قیمت فصل پر یا بالاقساط وصول کیا کرتے تھے۔ اسی طرح منافع خوروں نے جامع مسجد کی پُشت پر بازار ہی میں ایک بالائی منزل کرایہ پر لے رکھی تھی جس کی کھڑکیاں بازار کی طرف کُھلتی تھیں اور سامنے کی چھت کا سارا صحن ایسا تھا جہاں کھڑے ہو کر آسانی سے سارا بازار نظر آتا تھا۔ مگر زینہ بازار سے ہٹ کر گلی میں تھا۔ چنانچہ جب کسی پر وقت پڑتا اور قسمت کے چکّر میں آجاتا تو وہ اُس زینے سے اِن منافع خوروں کے پاس پہنچ جاتا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوتی، یہ لوگ چار آنہ فی روپیہ ماہانہ پر قرض دیتے تھے اور پہلے مہینے کے سُود کی رقم پہلے ہی اصل سے منہا کر لیتے تھے اور مہینے کے بعد پھر سُود کا تقاضا کرنے لگتے گویا ہر ماہ کا سود پیشگی لیتے تھے۔ ان میں سے ایک اچھّا ادھیڑ عُمر کا پٹھان کھڑکی میں بیٹھا بازار سے گذرنے والوں کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔ جہاں کوئی مَری گری یا چُھپی چھپائی اسامی نظر آتی وہ فوراً بجلی کی طرح بازار میں آتا اور پکڑ کر اُوپر لے جاتا پھر کٹی پٹھان مل کر اُس کی مرمّت کر کے وصُولی کی صوُرت پیدا کر لیتے۔

کاندھلے میں متعصّب قسم کے لوگ آباد نہیں تھے۔ وہاں بربنائے تعصّب ہندو مسلمان میں بھی کوئی ایسی آویزش نہیں تھی۔ چنانچہ منافع خور، ولائیتوں سے اگر کوئی جھگڑا اٹھتا ہوتا تو جہاں تک ہو سکتا اپنوں کو دباتے اور پٹھانوں کی طرفداری کرتے کیونکہ یہ اُنھیں غریب الوطن اور قابلِ امداد خیال کرتے تھے اور اسی تصوّر کی بنا پر جو سلوک مہمانوں اور مسافروں سے رَوا ہے۔ اُس میں کمی نہ کرتے، اگرچہ بعض اوقات قصبے کے صاحبِ معاملہ اِس بات پر بگڑ بھی جاتے لیکن اکثریت کا رویّہ یہی تھا۔

مَیں بیکار تو تھا ہی گھر سے اُٹھ کے مرزا احمد علی بیگ کے پاس جامع مسجد کے مدرسے میں جا بیٹھتا۔ مرزا احمد علی بیگ اس مدرسہ میں معلّم تھے اور فالتو وقت

میں کالی روشنائی سے قدیم قلمی کُتب کی نقلیں اُن کا ایک قسم کا روزگار تھا۔ میں سوچا کرتا کہ کاش مجُھے بھی یہ فن آجائے۔ مرزا صاحب سے عرض بھی کی لیکن اُنہیں اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ مجھے خوش نویس بنا دیتے۔ لہٰذا میں خود ہی لکھتے وقت ان کی نشست قلم کی گرفت، دوائر کی یکسانیت، مرکزوں کی کشش اور حرُوف کے پیوندوں کو بڑی تشنگی سے دیکھا کرتا مگر کبھی مرزا صاحب نے ایک نظر بھی ایسی نہ ڈالی جس سے ان کا التفات ظاہر ہوتا۔

وہیں مسجد میں ایک منافع خور نمازی بھی آتا تھا اور پنج وقتہ آنے والوں میں تھا۔ کبھی کبھی وہ مجھ سے گول مول سے سوال بھی کیا کرتا لیکن میں اس کی کوئی بات توجہ سے نہ سُنتا اور ہُوں ہاں کرکے گزر جاتا کہ مبادا لوگ مجُھے بھی اس کا مقروض خیال کرنے لگیں۔ ایک دن اُس نے میرا راستہ گھیر کر مجھ سے سوال کیا۔

”تو چہ کیا کرتا ہے؟“

مَیں نے کہا ”آج کل بیکار ہُوں کچھ نہیں کرتا۔“

خان :۔ ”تُم نوکری کرے گا؟“

مَیں :۔ ”کیسی نوکری، کس کی نوکری؟“

خان :۔ ”وال ضلع میرٹ (میرٹھ) میں اَمارا (ہمارا) بھائی لوہارہ سرائے میں رہتا ہے اُسے آدمی کا ضرورت ہے۔“

مَیں :۔ ”کیا کام ہے اور کیا ماہانہ دیں گے؟“

خان :۔ ”کام کیا؟ بہی کاتا (کھاتہ) کرے گا اور بیس روپیہ ملے گا۔“

مَیں :۔ ”ہاں کرلُوں گا۔“

خان :۔ ”تو پھر تُم اَمارا (ہمارا) چی ٹی (چِٹھی) لے جاؤ اور چلا جاؤ۔“

مَیں :۔ ”خط لکھ دینا۔ مَیں کل چلا جاؤں گا۔“

دوسرے دن خان نے مجھے خط دے دیا اور میں خط لے کر لوہارہ سرائے پہنچ گیا وہاں دو خان موجود تھے جو روپیہ کا لین دین کرتے تھے۔ ایک علی شیر خان، دوسرا مبین خان۔ وہ یوں تو چچا بھتیجے کہلاتے تھے لیکن بات کچھ گول مول سی تھی۔ مبین خان سیّد تھا اور علی شیر خان پٹھان۔ مبین خان کی عمر اس وقت انیس بیس سال کی تھی اور علی شیر خان پچاس پچپن کے پیٹے میں تھا۔ بعض اوقات تو وہ دونوں شیر و شکر معلوم ہوتے اور بعض دفعہ ایک دوسرے پر غرّاتے اور لپاڈگی تک نوبت آجاتی۔ پھر کئی کئی دن بول چال بند۔

میں حیران تھا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ اور اصل میں ان کے تعلّقات کی نوعیّت کیا ہے؟ علی شیر خان نے مجھ سے بہی کھاتے کا کام لیتے لیتے تقاضوں کا کام بھی لینا شروع کر دیا۔ لیکن چونکہ ان کا روپیہ سب گنواروں، گت تانگروں، غریبوں اور ٹوٹے ہوئے کاشتکاروں میں تھا اور میں بھی اُسی سطح کا آدمی تھا اس لئے میں اُن پر سختی نہ کر سکتا۔ معمولی تقاضا کر کے چلا آتا۔

میرے اس رویّے سے علی شیر خان خوش نہ تھا اور مجھے جب خالی ہاتھ آتا دیکھتا تو نہ جانے کیا کیا بڑبڑایا کرتا۔ حالانکہ میں وہاں تھوڑے دنوں کے بعد ہی ان کی روزمرّہ کی پشتو سے آشنا ہو گیا تھا۔ لیکن جب علی شیر خاں بڑبڑاتا تو میری سمجھ میں خاک نہ آتا۔ مگر لہجے اور تیوروں سے ایسا لگتا جیسے وُہ مجھے گالیاں دے رہا ہے۔ آخر ایک دن اس نے مبین خان سے کہا۔

"دیکھو تُم منشی کو ساتھ لے جایا کرو اور اسے وصُولی کرنا سکھاؤ۔" مبین نے اثبات میں گردن ہلائی اور چُپ ہو گیا۔

دُوسرے دن مبین مجھے ساتھ لے کر ایک گاؤں کو چلا جب راستے میں گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک مظلوم، شریف زادہ ہے جسے علی شیر خان تجارتی لین دین کا چسکہ

دے کر وطن سے لے آیا۔ اور جس قدر روپیہ پھیلا ہوا ہے وہ سب مُبین کا ہے۔ دو چار بار کی گفتگو میں مُبین بالکل کُھل گیا اور آپس میں کچھ دوستانہ سے مراسم ہو گئے۔

مجھے ورزش کا شوق تھا، لیکن کچھ تو میری مصروفیت اور کچھ حجاب سا مانع ہو گیا تھا۔ رفتہ رفتہ میں نے مُبین خان کو بھی ورزش پر لگا لیا اب ہم دونوں علی الصبح اُٹھ کر جنگل میں چلے جاتے اور راجبہے پر ورزش کرتے، پھر نہا دھو کر واپس آتے مُبین خان نے علی شیر خان سے کہہ دیا تھا کہ میں اور منشی صبح سیر کو جاتے ہیں، اس لئے علی شیر خان بھی نہ بگڑتا۔ کبھی کبھی ورزش کے بعد ہم دونوں زور بھی کیا کرتے۔ مُبین خان طاقت کے اعتبار سے مجھ سے بہت سجل[1] تھا لیکن داؤ پیچ کے بل پر میں اُسے بچھاڑ لیتا۔ اور اس دھر پٹک میں اچھا خاصا دم بھر جاتا۔

ایک دن لوہارہ[2] سرائے میں دنگل ہوا۔ قرب و جوار کے پہلوان اکٹھے تھے دنگل دیکھنے کے لئے میں اور مبین خان بھی گئے اُس وقت جوڑیں لکھی جا رہی تھیں۔ مُبین خان آگے بڑھا اور ایک مقامی نوجوان لڑیتے پٹھے سے میری کشتی لکھوا دی۔ میں نے ہزار منع کیا لیکن وہ نہ مانا۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ میرا انکار میری کشتی کو اور بھی مستحکم کرتا جا رہا ہے تو میں نے زیادہ اصرار نہ کیا کیونکہ میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ مبین خان میں آقاؤں والا پندار اور تحکم آ رہا ہے۔ اُس وقت فوراً میری نظروں میں اپنا مقام آ گیا کہ میں تو ملازم ہوں، اور جو مالک کہے گا کرنا ہوگا؛ چنانچہ میں خاموش ہو گیا، دل تو چاہتا تھا کہ اُسی وقت اس نوکری پر لات مار دوں اور گھر جا بیٹھوں لیکن یہ بھی خیال آیا کہ جوڑ لکھی گئی ہے۔ اس وقت اگر میں بھاگتا ہوں تو اس میں میری اور مُبین دونوں کی توہین ہوتی ہے اس لئے جو ہو سو ہو! یہ مرحلہ بھی گزر ہی جائے تو بہتر ہے۔

دنگل میں چاروں طرف سے اردگرد کے دیہاتی آئے ہوئے تھے اور اس ہجوم کے

---

[1] سجل، بڑھا ہوا۔ زیادہ۔ وزنی، [2] لوہارہ سرائے ضلع میرٹھ میں ایک قصبہ کا نام ہے۔

درمیان میدان میں ایک شخص اکھاڑا گود رہا تھا۔

میرا حریف ٹھاٹھ سے اکھاڑے میں اُترا اور جسم پر تیل مل کر ڈنڈ بیٹھک لگانے لگا۔ کبھی وہ ڈھیکلی کے ڈنڑ لگاتا کبھی نالی کے، کبھی قینچی مارتا، اور کبھی دست و بازو پر مالش کرنے لگتا۔ ایک دفعہ وہ اُٹھ کر میرے پاس آیا اور دانت پیس کر مجھے اس طرح دیکھا جیسے اکھاڑے میں اُترتے ہی کچا چبا ڈالے گا اور بات بھی کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی تھی۔

جب میں اکھاڑے میں جانے لگا اور سب کو گھوم کر سلام کیا تو عوام نے میری اور میرے حریف کی تیاری میں فرق اور مدِّ مقابل کا غرور دیکھ کر مجھے دُعائیں دیں اور میرا دل بڑھایا۔ دنگل کا شور و شر اور دیہاتیوں کے ہجوم میں میری موجودگی جنگل یا پہاڑوں کی اُس تنہائی کی طرح تھی جس میں عنایتِ خُداوندی کے سوا کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میں نے رسماً "یا علیؑ" کا نعرہ لگایا اور اپنے حریف کی طرف تیزی سے اِس طرح لپکا جیسے تُرمتی* کسی کالے ہرن پر حملہ آور ہو۔ میرے حریف نے میری توقّع کے خلاف دونوں ہاتھوں سے اکھاڑے کی مٹّی اُٹھا کر میری آنکھوں میں جھونک دی اور میرے سامنے بالکل اندھیرا آگیا۔ اسی عالم میں اس نے پیٹی میں ہاتھ ڈال کر مجھے زمین سے اُٹھا لیا اور اس تیزی سے چاروں طرف گھمایا کہ مَیں معلّق فضاؤں میں چرخے کی طرح گھومنے لگا اور حواس باختہ ہوگیا۔

آخر اُس نے مجھے زمین پر دے مارا۔ خدا جانے کون سا داؤں کہاں لگا کہ جب مُیَں نے مجھے اُٹھایا اور میں نے زبردستی آنکھیں کھولیں تو میرا حریف نیچے چت پڑا ہُوا تھا اور مَیں اس کے سینے پر سوار تھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں یہ ایک خواب سا گزر گیا۔ میری نظر اُس وقت ایسی چکرا رہی تھی کہ مجھے مشرق و مغرب کا پتا نہ رہا۔ چنانچہ میں سیدھے سبھاؤ دشمن کے کیمپ کی طرف جانے لگا۔ مُیَں نے مجھے کندھے پر اُٹھا لیا اور دھوم دھڑکّے میں بازار سے میرا جلوس نکالا جو ہماری

---

* ترمتی :- باز سے ذرا چھوٹا گوشت خور پرندہ۔

قیام گاہ کا راستہ تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مبین خاں سے مجھے کچھ انسیت سی ہو گئی تھی لیکن ذہنگل میں اس کا ایک دم آقا بنت پر آجانا میرے لئے سوہانِ رُوح بن رہا تھا۔ اور رفتہ رفتہ اِسی احساس کی شدّت نے مجھے اپنی نظروں میں ذلیل کر دیا۔ ایک دن علی شیر نے مُبین سے کہا کہ "کچھ مہمان آنے والے ہیں، منشی سے کہو آٹا گوندھ لے اور روٹی پکائے۔"

مبین نے کہا۔ "اِسے ابھی اچھّی طرح روٹی پکانا نہیں آتی۔"

علی شیر تھا کہ مبین پر برس پڑا، اُس کے بنکارنے کی آواز دوسرے کمرے میں مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اب یہاں رہنا بیکار ہے۔ علی شیر کسی نہ کسی طرح مجھے ذلّت سے نکالے گا۔ چنانچہ اُسی وقت میں نے ان سے دو روز کی رخصت چاہی علی شیر نے اجازت دے دی اور مبین خان گاؤں سے باہر تک مجھے چھوڑنے آیا۔ اُس نے کہا "دیکھو احسان! اگر تم نہ آئے تو میں یہ کاروبار ختم کر کے تُمہارے پاس آجاؤں گا اور پھر وہیں مِل جُل کر کوئی کام کر لیں گے۔ یہ یاد رکھنا۔

مَیں نے کاندھلہ پہنچ کر استعفیٰ روانہ کر دیا۔ مبین خان نے میرا حساب بھجوا دیا۔ کچھ روز کے بعد معلوم ہُوا کہ مبین خان کاروبار ختم کر کے وطن چلا گیا اور پھر ملاقات نہ ہو سکی۔ مبین مجھے ایسے یاد آتا ہے جیسے ایک مندمل زخم کے اُبھرے ہوئے نشان پر کبھی کبھی اچانک ہاتھ پھر جائے۔

مَیں بعض بعض اوقات مختلف منافع خوروں سے مُبین کے متعلّق معلوم کرتا رہتا تھا، لیکن یہی پتا چلتا کہ وُہ وطن سے واپس نہیں آیا۔ اُس کی خاموشی مجھے آج تک مشکوک کئے ہوئے ہے۔ خُدا کرے وہ بخیریت ہو۔ آمین

وطن میں چپراسی

منافع خوروں کی ملازمت چھوڑنے کے بعد میں کچھ عرصہ بالکل بیکار رہا۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ نوٹیفائڈ ایریا میں ایک چپراسی کی اسامی خالی ہے۔ دو ماہ سے اس جگہ کوئی نہیں آیا۔ میرے ایک دوست نے مجھ سے بھی درخواست دِلوا دی اور میرے والد بھی میرے متعلّق بات چیت کر آئے تھے۔ سیکریٹری[*] صاحب نے مجھے بلوایا اور سر سے پاؤں تک بیک نظر میرا جائزہ لیا اور فرمایا "دوپہر کو مکان پر آؤ۔"

چلچلاتی دھوپ میں جب مکانوں کی دیواروں سے گلیوں کے حاشیوں پر بھی سایہ نہیں رہتا میں سیکرٹری صاحب کے مکان پر پہنچا۔ دروازے پر چق پڑی تھی۔ اور ایک نوٹیفائڈ ایریا کمیٹی کا ملازم سقّا پنکھا کھینچ رہا تھا۔ سیکرٹری صاحب اندر اپنے چند مقامی دوستوں سمیت خوش گپیوں میں مصروف تھے مجھے دیکھتے ہی انہوں نے پنکھا کھینچنے والے سقّے کو آواز دی اور کہا

"پنکھے کی رسّی اسے دیدو اور تم جاکر کھانا کھا آؤ۔"

اُس نے پنکھے کی رسّی مجھے پکڑا دی۔ میں پنکھا کھینچنے لگا۔ مجھے اس سے دل ہی دل میں گھٹن سی ہونے لگی کہ ہم غریب لوگ آخر کس گناہ کے مرتکب ہیں کہ مصیبت میں عمریں برباد ہو جاتی ہیں۔ عالمِ ارواح میں ان لوگوں کی روحوں نے کون سی نیکیاں کی ہیں جن کے صلے میں انہیں آرام و آسائش نصیب ہے۔ نشیب و فراز کی یہ ناقابلِ برداشت تقسیم میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کبھی سوچتا تھا کہ جن لوگوں کو آسودگی میسّر ہے۔ آخر ان میں رحم اور ہمدردی کا کونسا موسم ہوتا ہے اور عاقبت کوئی چیز نہیں تو ناداروں اور غریبوں کو عذابوں سے کیوں ڈرایا جاتا ہے؟ کبھی یہ یقین ہوتا تھا کہ یہ بھی انسان ہیں اور ہم بھی مگر یہ ہمیں صرف علم کے بل پر پچھاڑ رہے ہیں۔ پھر خیال آتا کہ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں یہ بھی تو ایک علم ہی ہے۔ آخر خیالات کی تان یہاں ٹوٹتی کہ دُنیا کی شقاوتوں کے

---

[*] سید اکبر علی صاحب آجکل بہاولپور میں مقیم ہیں اور مجھے بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

راستے روکنا اور ناانصافیوں پر پُل باندھنا آسان بات نہیں، یہ تو کوئی بڑی طاقت ہی کر سکتی ہے جس کا وجود ابھی ناپید ہے۔ جب کبھی تقسیم علم کا دَور آئے گا تب کہیں قضا بدلے گی مگر ساتھ ساتھ جواب بھی خود ہی سُوجھتا کہ تعلیم کو مُشکل اور علم کو مہنگا کرنا بھی تو بڑے آدمیوں ہی کا کام ہے۔ غرضیکہ میرے ہاتھ پنکھا کھینچتے رہے اور مَیں انہیں خیالات میں اُلجھا وقت کی رَو میں بہتا رہا۔ جب تین بجے اور وُہ سقّا کھانا کھا کر واپس آیا تو اُس نے میرے ہاتھ سے رسّی لے لی اور سیکرٹری صاحب نے آواز دی۔

مَیں ”آہم“ پی گیا مگر بےقرار نگاہوں کو پلکوں کی سلاخوں سے نکلنے کی ہمّت نہ تھی اور دِل رو رہا تھا۔ مجھے پہلی بار اس دن غلامی اور آزادی کا فرق معلوم ہُوا کہ مزدوری میں کتنی آزادی اور ملازمت میں کیسی نامعقول غلامی ہے۔ کیونکہ جو لوگ سیکرٹری صاحب کے ہمنشین بنے بیٹھے تھے وہ خاندانی طور پر مجھ سے بلند نہ تھے۔

سیکرٹری صاحب:۔ ”ملازمت تو تمہیں مل جائے گی مگر علی الصبح آ کر ناشتہ تیار کرنا اور پھر دوپہر اور شام کا کھانا بھی پکانا ہوگا۔ تعطیل کوئی نہیں ہوگی اور جب ہم شکار کو جایا کریں گے تو نکّر پہن کر ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔ تُم چپراسی بھی ہو گے اور ہمارے اردلی بھی، تُمہارے والد سے ہم نے یہ سب کہہ دیا ہے۔“

مَیں:۔ ”مگر جناب مَیں نکّر کہاں سے لاؤں گا۔“

سیکرٹری صاحب:۔ ”نکّر نہ سہی اپنا کُرتا باندھ لیا کرنا یا اور کوئی کپڑا ساتھ لے لیا کرنا۔“

مَیں:۔ ”اگر کُرتا نکّر کی جگہ باندھ لیا تو پہنُوں گا کیا؟“

سیکرٹری صاحب:۔ ”کُرتا تمام دن تھوڑا ہی بندھا رہے گا یہ تو صرف اُس وقت کے لئے ہوگا۔ جب تم شکار پانی سے نکال کر لاؤ گے یا کہیں جب راجبہہ یا نہر آئے گی اور ہمیں کندھے پر بٹھا کر دوسری طرف لے جاؤ گے ورنہ سارا دن تو تم کُرتا ہی پہنے

رہو گے نا ؟"

یہ فقرہ سیکرٹری صاحب نے ایک ہی سانس میں کہدیا جیسے ایک ٹھیکیدار زیادہ کام کو چند لفظوں میں بتا کر مزدور کو تیار کرتا ہے ۔ "قہرِ درویش برجانِ درویش" میں نے اقرار کر لیا اور کہا سب کچھ کروں گا صاحب! اس وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دماغی وسعتوں پر مکڑیوں نے جالے تن دیئے ہیں اور میں چوہے کی گرہ دیکھ رہا ہوں۔

سیکرٹری صاحب نے کہا اچھا جاؤ کل صبح یہیں آجانا اور یہاں روٹی پکانے کے بعد اپنے گھر ہوتے ہوئے دفتر پہنچ جانا ۔ میں سلام کرکے واپس ہوا تو میرے سینے میں میری غیرت کے جنگل جل رہے تھے اور ارادوں کے چراغ ہونٹ چاٹتے معلوم ہو رہے تھے ۔ اب میرے دماغ میں ایک طرف گرمی میں روٹی پکانا پھر پابندی سے دفتر کی حاضری میں بے عذر کارگزاری ، اس کے علاوہ شنکار کی رُوح فرسا اور جانگداز تعمیل تھی دوسری طرف صرف آٹھ روپے اور گھر بھر کا گزارا ۔ رات کو مجھے بہت دیر تک نیند نہ آئی ۔ جب میرا خیال آلام و مصائب کی طرف جاتا تو نگاہوں میں حوصلہ شکن اندھیرا چھانے لگتا لیکن جب افلاس کے اثرات کی مختلف تصویریں میرے سامنے جاگتیں تو یہی آٹھ روپے کی رقم ایک حیات افروز اُجالے میں بدل جاتی اور آسمان کا رچوبی کا شامیانہ نظر آنے لگتا ۔ القصہ میں صبح اٹھتے ہی سیکرٹری صاحب کے مکان پر جا پہنچا ، جیسے زرِ خرید غلام اپنے آقا کے سامنے پیش ہونے پر مجبور ہو ۔ مجھے یہ نوٹیفائیڈ ایریا کمیٹی کی چپراس تو مل گئی مگر محسوس یہ ہوا کہ تمام دن راجبھوں کی ریت کھودنا اور شہر میں اینٹیں گارا ڈھونا اس سے کہیں معزز پیشہ ہے ۔ لیکن مجبوریوں نے اسے بھی گوارا کرا دیا جیسے سفر میں ایک بھوکے اور غیرت مند مسافر کے لئے سوکھی روٹی کے ٹکڑوں میں بھی چبانے چباتے مٹھاس آجاتی ہے اور یہ قدرت کا نظام ہے ۔

نہ بازاری سنیچر کے روز جب محرّر نہ بازاری کے ساتھ میری ڈیوٹی چمڑے کی بیٹھ میں لگتی تو شام کو محرّر مجھے دو اڑھائی روپے دیا کرتا۔ ایک دو ہفتے تو میں مطلق نہ سمجھا کہ یہ رقم کہاں سے آتی ہے اور کیوں مجھے ملتی ہے اور نہ ہی محرّر نے اپنا طول وعرض بتایا اگر پوچھا بھی تو آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گیا، لیکن رفتہ رفتہ دفتر میں واقفیت بڑھی اور راز کھلا کہ سینکڑوں چمڑے بلا رسید بکتے ہیں اور زرِ محصول محرّر کا حق المحنت ہو جاتا ہے جس سے مجھے بھی بقدرِ زکواۃ حصّہ ملتا ہے۔

ایک واقعہ کاندھلے میں نہ تو تحصیل تھی نہ کوئی ایسا خزانہ جس میں مختلف ٹیکسوں کو وہیں جمع کر دیا جاتا اس لئے نوٹیفائیڈ ایریا کمیٹی کے تمام ٹیکسوں کا روپیہ تحصیل کیرانہ میں جمع ہوتا تھا جو کاندھلہ سے پانچ کوس پر تھی۔

اس نوٹیفائیڈ ایریا کمیٹی میں دو۲ چپراسی تھے، ایک میں اور دوسرا پنڈت لبھے رام جو اس دفتر میں بہت پرانا یعنی گرگِ باراں دیدہ ہو گیا تھا۔ زمانے کا زم و گرم دیکھنے اور سکون و اضطراب کی برساتیں کھاتے کھاتے اسے ایک زمانہ گزر گیا تھا، چنانچہ جب بھی تحصیل میں روپیہ جاتا وہ اپنی ضیعفی کا اڑواڑہ[۵] لے کر دامن بچا جاتا اور اپنی جگہ میری ڈیوٹی لگوا دیتا۔ میں اس لئے خاموش رہتا کہ دفتر سے باہر کی زندگی آزاد ہوتی ہے اس میں کلرکوں کی نوک جھونک اور افسروں کی گیدڑ بھبکیوں سے آدمی محفوظ رہتا ہے۔

ایک دِن مجھے حکم ہوا کہ تحصیل میں روپیہ جمع کرا کے آؤ! میں نے "بہت اچھا" کہا اور خاموش ہو گیا۔ کیرانہ میں میرے عزیز بھی تھے اور جیوٹ قسم کے دوست بھی۔ مجھے ہمیشہ بہادر، سُورما اور اکھڑ مزاج لوگوں سے مل کر خوشی ہوتی تھی کیونکہ ایسے لوگ طبعاً تو کھردرے ہوتے ہیں لیکن وفاداری کے اعتبار سے قابلِ پرستش دیکھے گئے ہیں۔

مُنشی رنگی لال کے حکم سے میں نے روپے اپنے سامنے گنوا کر تھیلے میں مقفّل کرالئے

---

۵ اڑواڑہ۔ دو ساکی لکڑی جو نوکتی ہوئی کنی یا پھلوں سے بوجھل شاخ کے نیچے لگا دی جائے۔ سہارا۔ ٹیک

اور تھیلا گلے میں ڈال کر تحصیل کی راہ لی۔ اُس وقت بہ کیرانہ سے کاندھلے تک پانچ کوس کی سڑک خام تھی۔ سڑک پر دو رویہ درخت مسافروں کو سفر سے اُکتانے نہیں دیتے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دُور پر ریوڑ اور لہنڈےؔ کی اڑائی ہوئی مٹّی اور بہلیوں سے اُڑتی ہوئی گرد کے بادل باریک جالی کی طرح فضاؤں میں تنے رہتے اور غبار سے اَٹے ہوئے پتّوں کے۔ درختوں کا سایہ ایسا گھنیرا رہتا کہ آگے چلنے کو جی نہ چاہتا۔

راستے میں اُونچے گاؤں کے سامنے ہی باغ میں میرا ہم جماعت بابو رام مالی بڑی محبّت کا انسان تھا۔ مَیں تحصیل میں آتے جاتے اس کے پاس باغ میں آرام ضرور کرتا۔ مجھے اس کی نظر میں وہی اسکول والی محبّت موجزن دکھائی دیتی تھی اور اس کے لہجے میں اب تک وہی لوچ باقی چلا آ رہا تھا حالانکہ دفتر والوں کا حکم تھا کہ جب روپیہ پاس ہو تو راستے میں آرام نہ کیا جائے۔

لیکن مجھے بابو رام کا خلوص اور فنِّ بنوٹ کی برائے نام مہارت بے فکر رکھتی تھی راستے میں جہاں جی چاہتا وہیں آرام کرنے بیٹھ جاتا۔ بابو رام آج بھی معصومیّت سے ہنستا ہُوا میرے سامنے آجاتا ہے۔ اگرچہ وُہ بھی میری طرح زندگی کے مختلف موڑ مُڑ چکا ہوگا، اور بیدرد زمانے نے میرے چہرے کی طرح اس کے چہرے پر بھی اپنے نقشِ قدم ثبت کر دیئے ہوں گے۔ اس کے سینے میں بھی میری طرح درد کی خراشیں ہری رہتی ہوں گی اور مستقبل تاریک نظر آتا ہوگا، کیونکہ ہر دَور مزدور اور مفلس کو دھوکے میں رکھتا ہے۔

مَیں اُٹھتا بیٹھتا راستے کی گرد پھانکتا۔ غبار میں اَٹی ہُوئی وردی پہنے تحصیل تک پہنچ گیا۔ اور خزانچی نے روپے گن کر وصولیابی کی رسید دے دی۔

مَیں اپنے اس فرض سے سبکدوش ہو کر اپنے دوست شجاعت خان کے یہاں چلا گیا۔ وہ اپنی بیٹھک کے باہر چارپائی بچھائے حقّہ پی رہا تھا۔ مُجھے دیکھتے ہی

ے لہنڈا : گلّہ

سینے سے لپٹ گیا۔ اور گھر میں جائے کے لئے کہہ دیا۔ اتنے چائے آئی میں اپنی وردی کی گرد جھاڑتا رہا اور پھر غسل کرکے گھر کے کپڑے پہن لئے۔

کیرانہ کے لوگ جو نسلاً شریف اور عملاً لڑاکا ہوتے ہیں، نہایت خوش مزاج اور وفادار بھی پائے گئے ہیں۔ ہم چائے پیتے رہے اور گپ لگتی رہی۔ شام ہونے کو آئی تو میں نے شجاعت سے اجازت چاہی۔ اس نے کہا۔

"میاں! میں نے گھر کھانے کے لئے کہہ دیا ہے۔ اب تو آپ کھانا کھا کر جا سکیں گے۔"

میں نے کہا "رات ہو جائے گی۔ پھر کہاں جانے کا وقت رہے گا۔ دو گھنٹے خاموشی سے سفر کرنا میرے بس کی بات نہیں۔"

اس پر شجاعت نے کہا۔ "میں ساتھ چلوں گا! اب تو ٹھیک ہے نا۔"

میں مطمئن ہو گیا کہ شجاعت میرے ساتھ جائے گا اب کیا فکر ہے؛ چنانچہ ہم رات کا کھانا کھا کر گیارہ بجے کے قریب "کیرانہ" سے "کاندھلہ" کو چل دیئے۔ چاند ہم دونوں کے سروں پر ساتھ ساتھ چل رہا تھا اور جنگل کی خاموشی چاندنی میں گھل مل کر پھیل رہی تھی۔

ہم دونوں آپس میں باتیں کرتے اور ایک دوسرے کو اپنے انتخاب کے اشعار سُناتے جا رہے تھے۔ اونچے گاؤں کے سامنے میں نے بابو رام مالی کو آواز دی وہ شاید دن بھر کی مشقت سے تھک ٹوٹ کر بے خبر سو رہا تھا۔ اُس طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے دوبارہ آواز دی تو باغ کا چوکیدار نمودار ہوا اور اُس نے بتایا کہ وہ سارا دن سفیدے کے بیچے لگاتا رہا اس لئے تھک ہار کر سو رہا ہے۔ ہم آگے بڑھ گئے اور چوکیدار سے کہہ دیا کہ صبح اسے بتا دینا کہ رات احسان آیا تھا، دیر ہو گئی تھی اس لئے تمہیں جگانا مناسب خیال نہیں کیا۔

ے سفیدے کے بیچے لگانا یعنی پود لگانا۔

اُونچے گاؤں اور جدّانہ[1] کے درمیان شیخ سلیم چشتیؒ کے مزار کے سامنے ایک برساتی نالے کی پلیا کی بلندی دو ڈھلوان بناتی ہے، سڑک کے دونوں طرف جمویوں کے درخت خاموش تھے۔ جیسے جنازگاہ کے صحن میں متقیوں نے نماز کی نیّت باندھ رکھی ہو۔ درختوں سے ذرا فاصلے پر دُور تک بیوہ زمین کے صحن میں آخری حاشیے پر تھوڑے سے کٹے کھیتوں کے تابوت سے باقی تھے۔ اس سُونی اور بے حس رات میں جب ہم پلیا پر پہنچے تو ٹھنڈی ہَوا رمقی۔ مَیں پلیا پر ستانے لگا۔ شجاعت نے کہا "چلو یہ ستانے کا وقت نہیں ہے۔ گھر چل کر آرام کریں گے۔" مَیں نے کہا "ٹھہرو۔ ذرا اس نعمت سے تو محظوظ ہونے دو جو ہمارے ارد گرد پھیلی پڑی ہے۔" شجاعت خاموش ہو کر میرے قریب بیٹھ گیا اور ہم دونوں چاندنی اور خاموشی کے آمیزے میں کھو گئے۔ ابھی ہم دونوں میں سے کسی کی خاموشی میں درز نہیں کُھلی تھی کہ سڑک سے ذرا پرے ایک اُونچے درخت کی چوٹی سے کوئی بھاری چیز پتوں اور شاخوں میں کھڑ بھڑ کھڑ بڑ کرتی دھم سے زمین پر آ رہی۔ جیسے کوئی اناج کی بھری بوری پھینک دے۔

مَیں نے شجاعت سے کہا "یہ کیا ہے؟"

شجاعت:۔ "کچھ بھی ہو بس یہاں سے چل دو۔"

مَیں:۔ "دیکھو تو سہی آخر یہ ہے کیا؟"

شجاعت:۔ "کیا ہو گا دیکھ کر۔ اُٹھو چلو۔"

مَیں:۔ "چلیں گے تو سہی مگر یہ معاملہ تو کُھلے کہ یہ ہے کیا؟"

شجاعت:۔ "یہی بات ہے تو آؤ اُٹھو۔"

ہم دونوں لٹھ تانے اُس کی طرف بڑھے جب قریب پہنچے تو تقریباً دس فٹ کے فاصلے سے معلوم ہُوا کہ کوئی چیز ہے جو کمہار کے چاک جیسی تیزی سے ایک محور پر

[1] جدّانہ راستے کے گاؤں کا نام جو اُن دنوں مولوی ظہیر الحسن مرحوم کی ملکیت تھا۔ سنا ہے کہ ظہیر الحسن کو تقسیمِ ملک کے ہنگامے میں ان کے ایک ہندو دوست نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ یہ قتل علمی نقطۂ نظر سے قصبہ کا سب سے بڑا نقصان ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔

گھوم رہی ہے اور رفتار کے باعث اس کی ساخت اور خد وخال معلوم نہیں ہوتے ہم وہیں رُک گئے اور برابر نظریں گاڑے دیکھتے رہے۔ وُہ ہمارے دیکھتے دیکھتے کم ہونے لگی اور رفتہ رفتہ غائب ہوگئی جیسے ایک بگولا چکرا کر گم ہو جائے۔

ہم دونوں دھڑکتے ہوئے دلوں سے واپس ہوئے۔ اب ہمارا یہ عالم تھا کہ اگر پتّا بھی کھڑکتا تو شبہ ہوتا تھا کہ وہی بلا تعاقب کر رہی ہے۔

خدا خدا کر کے گھر پکڑا پھر نیند کہاں؟ ہم دونوں نے زندگی کے مختلف واقعات بیان کرتے کرتے صبح کر دی۔ اس سے پہلے بھی مجھے اس طرح کا ایک حادثہ پیش آیا تھا جسے میں نے کوئی اہمیّت نہیں دی تھی۔

اگیا بیتال[ا] میں اور میرا ایک دوست کیرآنہ سے گنگیرو[ب] کے راستے کاندھلہ آنا چاہتے تھے۔ شام ہوگئی تو راستہ بھول گئے۔ اب اندھیری رات تھی اور چاروں طرف کھیت ہی کھیت جن پر اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اور گرد وپیش کا ماحول مرتشی کے ضمیر کی طرح تاریک اور بدمعاشوں کے منصوبے کی طرح مشکوک و مخدوش ہو چکا تھا۔ لیکن ہم اُن اندھے راستوں پر اٹکل پچّو چلے جا رہے تھے۔ گھبراہٹ بالکل نہیں تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ کسی وقت بھی سہی گھر ضرور پہنچ جائیں گے۔ ایک طرف کو جو نظر اُٹھی تو معلوم ہوا کہ قریب قریب آدھے فرلانگ پر آگ جل رہی ہے۔ خیال گزرا کہ یہ ضرور کسانوں کا ڈیرا یا رکھوالوں کا ٹھکانا ہوگا۔ پھر خیال ہوا کہ اگر یہ خانہ بدوشوں کا قافلہ ہوا تو وہ لوگ کپڑے تک چھین لیں گے اور گھر ننگے جانا پڑے گا۔ لیکن پھر سوچا کہ کھیتوں میں خانہ بدوشوں کا کیا کام؟ وُہ تو سڑک کے آس پاس یا کسی میدان میں ڈیرے ڈالتے ہیں۔ ہم اُس آگ کی سیدھ باندھ کر چلنے لگے۔ جب چلتے چلتے پَون گھنٹے کے قریب ہوگیا تو آگ بجھ گئی اور ہم پھر تاریکی میں کھو گئے۔ دو لمحے کے بعد پھر وُہ آگ

[ا] اگیا بیتال:۔ آسیب۔ بھوت۔ پریت وغیرہ [ب] گنگیرو کاندھلہ سے دو میل پر ایک بڑا گاؤں ہے۔

اُبھری اور بائیں طرف ایک ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر دکھائی دی۔ ہم سمجھے کہ ہم غلط آ گئے ہیں۔ لہٰذا پھر اُس طرف کو چل دیئے۔ کوئی تیس چالیس منٹ پھر چلے مگر آگ کا فاصلہ کم نہ ہوا۔ ہم نے تنگ آ کر وہ راستہ چھوڑ دیا اور غالباً خود بخود صحیح راستے کی طرف رُخ ہو گیا۔ پھر دیکھا تو وہ آگ نظر نہ آئی۔ ہم چلتے رہے، اتنے میں کوئی دس فٹ کے فاصلے پر بھک سے ایک قدِ آدم شعلہ بلند ہوا جیسے کوئی کھال اُترا ہوا آتشی بھینسا ڈکرا کر پچھلے دونوں پاؤں پر الف ہو جائے۔ آن کی آن میں وہ غائب تو ہو گیا اور ایک چنگاری تک باقی نہ تھی مگر ہم خوف زدہ ہو گئے اور بدن میں سنسناہٹ کے ساتھ دھڑکن تیز ہو گئی، اس کے باوجود ہم چلتے رہے پھر ذرا سی دیر میں ایک لُوکا کوئی پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر اُٹھا ہمارا قدم تو نہ رُکا مگر معلوم یہ ہوا کہ یہ شعلہ ہمارے

ساتھ چل رہا ہے اور ہمیں گھیر کر کہیں بھٹکانا چاہتا ہے۔ چنانچہ ہم نے اس کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا۔ اب ہم پر اور بھی دہشت سی طاری ہونے لگی۔ اُس وقت جسم میں خون کی جگہ خوف گردش کر رہا تھا۔ انتہا یہ ہوئی کہ اس شعلے کی روشنی ہمارے سامنے دس بارہ فٹ پر پڑ رہی تھی اور ہم اپنے اندازے کے مطابق کہیں گھر اور کہیں راجبہ کے آثار نظر میں رکھ کر پکے جا رہے تھے۔ خدا خدا کر کے رات کے تین بجے کے قریب صحیح سڑک ملی اور ہم نے خود کو بہار خاں[1] کے حظیرے کے قریب پایا۔ یہ مقبرہ محلہ خیل کے قبرستان میں واقع ہے اور چونکہ یہ شاہی وقتوں کی قدیم عمارت ہے اس لئے اس کے دونوں طرف ٹوٹے پھوٹے مناروں میں عموماً چیلوں کے گھونسلے دکھائی دیا کرتے ہیں۔

---

[1] بہار خان کاندھلہ کی ایک مشہور شخصیت تھی جس کو شاہی وقتوں میں کسی بہادری کے صلے میں بیشمار جاگیر دی گئی تھی۔ اُس کے مقبرہ کو بہار خاں کا حظیرہ کہا جاتا ہے۔ اس کی اولاد پاکستان میں دُوسرے مہاجرین کی طرح مفلوک اور پریشان ہے۔ میں دو ایک کو تو جانتا بھی ہوں۔ ان میں ایک تو آتم پانی پتی ہے۔ اس کے پاس تو اس دور کے سرکاری کاغذات بھی ہیں۔

ہم حظیرے کے سامنے پہنچے تو سڑک سے ذرا فاصلے پر شمالی منار سے ایک اُلو کی آواز اندھیرے میں اس طرح آ رہی تھی جیسے اندھیرے کے دیوتاؤں کو کالی کھانسی کا دورہ پڑ رہا ہو یا کوئی سفلی علم کا ماہر کسی آسیب سے کوئی راز اُگلوا رہا ہو۔

اُس کی سیاہ الاپیں اندھیرے کو اور بھی مہیب بنا رہی تھیں جس سے عموماً رُوح سہم جاتی اور دل کے سکون سے استحکام چھن جایا کرتا ہے لیکن ہم تو اس سے زیادہ خوفناک حادثے کو جھیل کر آ رہے تھے اس لئے اس قبرستان کے اس تاریک نوا نوحہ گر کی آواز سے ہماری رُوحیں گرانبار نہیں ہوئیں اور دل کی دھڑکن اپنے مقام پر رہی۔

اَب وہ شعلہ ٹھنڈا ہو چکا تھا اور دُور دُور تک اس کا نام و نشان نہ تھا۔ مجھ پر اس پہلے واقع کا اِس قدر اثر نہیں تھا جتنا اِس نئے حادثے کا احساس۔ کئی روز تک میں اسی کے متعلق سوچتا رہا۔ آج بھی میں نے جہاں تک سائنس کا مطالعہ کیا، فنا کے بعد عناصر کی تشکیل اور خیر و شر کا شعور میرے لئے اسی طرح معمّے کی صورت رکھتا ہے۔ شاید سائنس اور نفسیات نے اس گوشے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ یہ تو ممکن ہے کہ میرا احساس اور وہم دونوں مل کر کوئی صورت پیدا کر لیں لیکن ایک ہی چیز پر دو آدمیوں کے احساس اور یقین کیسے متفق ہو سکتے ہیں اور نگاہیں کیسے دھوکا کھا سکتی ہیں؟

ناشتے کے بعد شجاعت خان کیرانہ اپنے گھر واپس ہو گئے اور میں حسب معمول دفتر میں پہنچ گیا۔ لیکن کئی روز یہ عالم رہا کہ جب بھی کام سے فراغت ملتی ذہن کے پردے پر اس حادثے کے نقوش سرسرانے لگتے۔ کبھی وقت نے فرصت دی تو زندگی اور کائنات کے اِس رُخ پر بھی تحقیق کروں گا۔ انشاء اللہ۔

ایک شکاری ساتھی

جنگو ایک غریب اور دیہاتی قسم کا پینتیس چالیس سال کا آدمی تھا۔ نہ جانے اُسے شکار کا ملکہ کیسے ہو گیا تھا۔ میں جب اس سے ملا تو وہ اُمراء کا پیشہ ور شکاری تھا۔ ضلع مظفر نگر کے کئی رئیس اُس

کے فن سے آگاہ تھے ، اور اُسے شکار کے لئے تنخواہ دیتے تھے چنانچہ ایک عرصہ سے اُس کا روزگار شکار ہی تھا۔ اس کے یہاں فکر دیروز اور غم فردا شکار سے متعلقات تک محدود تھے۔

جب مَیں سیکرٹری صاحب کے ساتھ اُن کی کارتوسوں کی پیٹی اور بندوق لے کر چلتا تو بعض بعض اوقات جنگو بھی آ جاتا۔ اس وقت وُہ غالباً سیکرٹری صاحب کے والد سیّد مکرم علی صاحب کے پاس ملازم تھا۔ اس لئے یہاں بھی وُہ اسی خادمانہ حیثیت سے رہتا اور فخر محسوس کرتا تھا۔

جنگو کو شکار میں ایسی مہارت تھی کہ وہ جنگل میں مست ہرن کی خوشبو کو پہچان لیتا اور دو دو تین تین میل دُور دریا سے باہر نکلے ہُوئے مگرمچھوں کی بُو اُسے آگاہ کر دیتی وُہ ہَوا کے رُخ پر کھڑا ہو کر یہ بتا دیتا تھا کہ جانور کتنے فاصلے پہ دریا سے باہر نکلا پڑا ہے، جب سیکرٹری صاحب اپنے گھر بنت[۵] چلے جاتے تو جنگو مجھے ہمراہ لے کر جنگل کو نکل جاتا اور تمام رستے اپنے شکار کے قصّے سناتا جاتا۔ کچھ دنوں تو جنگو کا ساتھ اس طرح رہا کہ دریائے جمنا پر مگرمچھ مارتے اور پیٹ چاک کر کے اس میں زیورات تلاش کرتے، کسی کسی میں تو اچھے خاصے قیمتی زیورات نکل آتے اور ہمیں بے حد خُوشی ہوتی، کیونکہ اُن کی فروخت کی رقم پر ہی آسودگی کا دارومدار تھا۔ اور جب کسی کے پیٹ میں سے کچھ نہ نکلتا تو دونوں کے چہرے اُتر جاتے کہ محنت فضول گئی جیسے کوئی جوئے میں قرض کی رقم ہار جائے۔

جب سیکرٹری صاحب اور جنگو دونوں ہوتے اور مَیں بندوق برداری کی خدمت انجام دیتا تو میرے لئے بڑی مشکل ہو جاتی۔ دونوں کی دو کارتوسوں کی پیٹیاں اور دو رائفلیں مجھ پر لدی رہتیں اور میں خود کو ایسا محسوس کرتا جیسے کوئی کورٹ مارشل کا مجرم!

---

۵ بنت ۔ ضلع مظفر نگر کا ایک قصبہ۔

جب کہیں راستے میں نہر یا راجبہ آجاتا تو ایک کے بجائے دو آدمیوں کے لئے مجھے دریائی گھوڑا بننا پڑتا۔ اور میں باری باری ایک ایک کو کندھے پر بٹھا کر پار اُتارتا۔ ایک دفعہ وہ ایک مولوی صاحب کو بھی ہمراہ لے گئے۔ اور جب نہر آئی تو مجھے حکم ہوا کہ کُرتا اُتار کر باندھ لو! میں نے کپڑے اُتار دیئے اور کرتے کا لنگوٹا بنا کر نہر میں اُتر گیا۔ سب سے پہلے مولوی صاحب نے میرے کندھے پر پھلاری ماری۔ وُہ ظالم اس قدر وزنی تھا کہ میری پسلی پر پسلی چڑھنے لگی۔ میں کنارے سے ایک قدم ہی سرکا تھا کہ کائی پر سے پاؤں پھسل گیا۔ میرے پھسلتے ہی مولانا نہر میں، اور اس پر طرّہ یہ کہ پانی نے فوراً پیر اکھاڑ دیئے۔ اب مولانا لگے ڈبکیاں کھانے۔ میں نے بڑی مشکل سے سنبھالا، مگر اتنی ہی دیر میں وہ پانی پی چکے تھے۔ جوں توں کر کے اُنہیں میں دُوسرے کنارے پر لے گیا۔ وُہ جاتے ہی لیٹ گئے۔ اُنہیں کنارے پر پھیلا کے مَیں نے سیکرٹری صاحب اور جنگو کو دوسرے کنارے پر ڈھویا اور اُنھوں نے مولانا کے حواس درست کئے۔ ہوش میں آکر وہ مجھ سے خواہ مخواہ بدظن ہو گئے اور بڑی مشکل سے کئی دن میں سیدھے ہوئے۔

بزمِ شفیق

یُوں تو میں شرُوع ہی سے شاعرانہ فطرت رکھتا تھا اور مجھے بہت سے اچھے اشعار یاد تھے۔ لیکن قاضی محمد زکی صاحب کے فیضانِ صحبت سے شعر و شاعری کی مجلسوں سے دلچسپی اور قصبے کے اربابِ ذوق سے ایک قسم کی عقیدت سی ہو گئی تھی۔ قاضی صاحب کے مکان کے علاوہ چند من چلے نوجوان حکیم شفیق الرحمٰن شفاؔ[۵] کے مکان پر جمع ہو جایا کرتے تھے۔ جہاں شعر و شاعری ہی گفتگو کا جزوِ لازم تھی۔ چنانچہ میں قاضی صاحب کی سوسائٹی کے علاوہ شفیق پارٹی کا بھی ایک معتبر رکن بن گیا اور کچھ روز بعد میرے

---

۵ حکیم شفیق الرحمٰن شفاؔ کاندھلہ کے مشہور طبیب جو آجکل سنجورہ (سندھ) میں مقیم ہیں اور بڑے فاضل طبیب ہیں۔

ایما پر چودھری اصغر جنگ بھی آ شامل ہوئے۔

اِس سوسائٹی کا ہر فرد یہاں آکر زندگی کی مشکلات اور ضروریات کو بے کم و کاست بیان کر دیا کرتا اور سب مل کر اُس پہ غور کرتے پھر جہاں تک ہو سکتا ایک دوسرے کی امداد کرتے۔ بعض اوقات حکیم شفیق الرحمٰن دوستوں کے اس طرح کام آتے، جیسے کوئی ہمدرد زخمی اپنے زخم کی پٹی کھول کر دوسرے کے زخم پر باندھ دے اور اس کے زخم کا کھرنڈ لہو دینے لگے گویا یہاں کے ہر رُکن کے شباب کا آسیب اور بلندی کا جِنّ، خلوص۔ بصیرت اور ہمدردی نے اُتار رکھا تھا جب میں نے وہاں یہ عالم دیکھا تو میں نے بھی اپنی زندگی کو افلاس کے علاوہ ہر رُخ سے بے نقاب کر دیا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے مجھے اس سوسائٹی کی خصوصیات اور قواعد و ضوابط سے آگاہی ہوتی گئی۔ حکیم صاحب کے مکان پر آٹھویں دن ایک مخصوص بزم مشاعرہ کا دستور بھی تھا جس میں کبھی چوری کے مُرغ پکائے جاتے اور کبھی پلاؤ دَم ہوتا۔ رات بھر یہ شریف جرائم پیشہ جشن برپا رکھتے اور مُرغوں کے علاوہ (جن کی فراہمی کو ہر ممبر اپنا فرضِ منصبی گردانتا تھا) تمام مصارف کے کفیل حکیم صاحب ہوتے۔ اِس کے علاوہ تمام ممبروں اور اُن کے متعلّقین کا معالجہ حکیم صاحب ہی کے ذمّہ تھا۔ جس کا معاوضہ شکریہ کے سوا کچھ نہ ہوتا غالباً آج تک وہ پاکستان میں آکر بھی اُسی معاوضے پہ کام کرتے ہوں گے کیونکہ فطرتِ انسانی کا یہ خاصّہ زندگی بھر ساتھ دیتا ہے اور رُوح اِس تعیّش کے بغیر آرام نہیں پاتی۔

دو ساتھی میرے اُن دنوں کے دو ساتھی قمر الحسن اور محمد محسن بھی قابلِ ذکر ہیں قمر الحسن جو اُن دنوں طالب علم تھا مجھ سے بڑی محبت رکھتا تھا۔ یہ مفتی الٰہی بخش جامع مثنوی مولانائے روم کے خاندان کا چشم و چراغ تھا۔ اس نے اپنے گھر سے مجھے بہت سی کتابیں لا کر دکھائیں جنھیں پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت ہم دونوں میں نہیں تھی اور قمر الحسن اپنے اخلاق کی روشنی میں مجھے کچھ زیادہ سمجھ گیا تھا۔

قمرالحسن نے کاندھلے ہی میں طب پڑھ لی تھی اور وہ یہ چاہتا تھا کہ میں بھی طب پڑھوں اس نے کئی بار مجھ سے کہا کہ حکیم شفیق الرحمٰن تو آپ کے دوست ہیں۔ اُن سے آپ طب کیوں نہیں پڑھ لیتے ، آپ کے لئے کونسی بڑی بات ہے؟ اسے یہ خبر نہیں تھی کہ میری زندگی کس قدر درد آلود ہے اور اس کا سبب یہ تھا کہ میں ہمیشہ مصیبت کو دوسروں سے بیان کرنے میں ناکام رہا اور خود کو بے نقاب کرنے کی جرأت نہیں ہو سکی۔

پھر قمر کاندھلے سے باہر چلا گیا۔ مدت کے بعد جب ملک کے اطراف و جوانب میں میری نظمیں میرا تعارف کرانے لگیں اور مشاعروں میں داد و تحسین کا شور مچا تو میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں دکن سے واپسی پر دہلی آیا جہاں اچانک قمر سے ملاقات ہو گئی۔ اُس وقت وہ نہایت اچھا اور تجربہ کار طبیب تھا اور اس نے اُردو بازار میں مطب قائم کر رکھا تھا۔ طویل مدت کے بعد ہم دونوں ملے تو بڑی دیر تک ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے اور پھر بے اختیار لپٹ گئے۔ دونوں کی پلکیں نم آلود ہو گئیں وہ مجھے اپنے مطب میں لے گیا۔

میں اُٹھنے لگا تو یادگار کے طور پر اُس نے مجھے کچھ نسخے لکھوائے جو اُس کے خاندانی مجربات سے چلے آ رہے تھے۔ وہ آج تک میری بیاض میں موجود ہیں۔ قمرالحسن نے عالمِ جوانی میں انتقال کیا اور مابعد الطبیعات کی ابدی مصروفیتوں میں محو ہو گیا۔ اعزا سے دُور اور میرے حال سے بے خبر۔

قمر کی نسبت سے اب تک میرے تعلقات اُس خاندان سے ویسے ہی مخلصانہ چلے آ رہے ہیں۔ قمرالحسن کے بھائی اظہارالحسن کے بشرہ میں بھی مجھے قمر جھانکتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس سے مل کر مجھے ایک سکون سا ہوتا ہے جیسے صبح کی ہوا کسی صاحبِ احساس کی پیشانی کو چھوتی ہوئی گزر جائے۔

اُن دنوں کا میرا دوسرا ساتھی محمد حسن ایک غریب نیچہ بند کا لڑکا تھا۔ نہایت طبّاع اور ذہین مگر نہایت مفلس اور نادار باپ کا لختِ جگر۔ یہی وجہ تھی کہ اوائل عمری میں جو پڑھنے

لکھنے کا وقت ہوتا ہے اس کا باپ اسے اپنے پاس بٹھا کر بیچہ بندی سکھا رہا تھا۔

محمد حسن کا بوڑھا باپ جب محمد حسن کے پاس بیٹھتا تو اس کے مہتابی چہرے پر سُرخ ڈاڑھی کے بال جڑوں کی سفیدی سے اُس کی عمر کا سُراغ دیتے ورنہ دیکھنے والوں کا تصوّر اس کی عمر کی طرف نہ جاتا۔ وُہ پرانی تہذیب کا آدمی تھا اور قدیم روایات کے چراغ اس کی زندگی کے ہمنا تھے۔ وُہ اپنے بیٹے محمد حسن کو بھی وہی پُرانی تہذیب تفویض کر رہا تھا۔ محمد حسن مجھے علم کے لئے بہت بیتاب ملا۔ فطرت نے اُسے قیامت کا حافظہ دیا تھا۔ ایک بار سبق پڑھ کر وہ کتاب کھول کر نہ دیکھتا اور جب اس سے پُوچھا جاتا، تو کتاب کے بغیر لفظ بہ لفظ دُہرا دیتا۔ مجھے اس کی ذہانت پر رشک تھا۔ مَیں دل ہی دل میں کہا کرتا کہ کاش ایسا حافظہ مجھے مل جائے۔

وُہ مجھ سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ "اگر کہیں دس پانچ روپے ماہانہ کا سہارا ہو جائے تو میں آنکھیں بند کر کے کاندھلہ سے نکل جاؤں اور کہیں طالب علمی کی زندگی بسر کروں۔" پھر دل مسوس کر کہتا "مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" مَیں اُسے ڈھارس دیا کرتا کہ "فکر نہ کرو، میں بھی یہاں رہنے والا آدمی نہیں ہوں۔ تم سے پہلے جاؤں گا اور پھر تمہارے لئے جگہ پیدا کروں گا۔ یہ ماحول تو آدم خور ہے آدم خور۔"

محمد حسن ایک حسّاس لڑکا تھا۔ ایک دن ایک کانسٹیبل نے اُس سے پنکھا بندھوایا۔ اور جب اُجرت مانگی تو سپاہی سے گالیاں کھائیں۔ کیونکہ وہ کانسٹیبل داروغہ محمد حسین کی پیشی میں تھا۔ داروغہ محمد حسین مسلمان قسم کا نیک داروغہ تھا اور میں نے اِس قسم کے بہُت کم تھانیدار دیکھے ہیں لیکن عملے کا کیا علاج وہ تو بستی کو اپنی رعایا خیال کرتے ہیں۔

محمد حسن شام کو میرے پاس آکر بڑی دیر تک رویا اور یہی کہتا رہا کہ "احسان! اس بستی کو چھوڑو، یہاں سے نکل چلو۔ ممکن ہے دُنیا میں کہیں اچھے لوگ بھی بستے ہوں ہم یہاں کیسے زندگی گزاریں گے؟" مَیں نے دلاسا دیا کہ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں،

خُدا کے یہاں انصاف ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ ایسے جابر اور ظالم لوگوں کا انجام اچھا نہیں ہُوا کرتا۔ تُم دیکھتے نہیں کہ اس قسم کے مُلازم اور امیر لوگ زیادہ بیمار ہوتے ہیں اور غریب تمام جسمانی اور روحانی تکالیف کے باوجود تندرست نظر آتے ہیں" محمد حسن اصل زندگی کی تڑپ میں مختلف سَرابوں کی طرف دوڑتا پھرا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ لیکن وہ غیرت مند لڑکا تھا اس ماحول میں زیادہ روز تک زندہ نہ رہ سکا اور اس نے اسی افلاس کے نیلے کہرے میں دم توڑ دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ اگر محمد حسن زندہ رہتا تو وہ کسی نہ کسی طرح اپنی تعلیم کی کمی پوری کر لیتا۔ اُسے ایک لگن تھی جو جنُون کی طرف بڑھ رہی تھی اور مَوت کی نزدیکی تھی کہ اُسے بیتاب کیئے ڈالتی تھی۔

اس باغِ عالم میں بعض بدنصیب پھُول تو ایسے کھلتے ہیں جنہیں مجاور اور گورکن ذرا اُٹھا لیتے ہیں پھر وہ تربتوں پہ ملتے ہیں یا قبرستان کے چوراہوں پر۔ اور بعض بعض کلیوں ہی کو لوؤں کی لپٹیں چاٹ جاتی ہیں۔ محمد حسن اُنھیں غنچوں میں ایک غنچۂ نارسیدہ تھا جو کاندھلہ کی قدرناشناس مٹّی میں مٹی ہو گیا، اور مَیں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

پلاؤ

ایک دن سیکرٹری صاحب کاندھلہ سے دس گیارہ میل کے فاصلے پہ اپنے گھر قصبہ بنت جانے لگے اور اپنی بڑی بطخوں کا جوڑا مجھے سونپ گئے کہ ذرا خیال رکھنا کوئی پکڑ کر نہ لیجائے۔ مَیں نے سُنا اور "بہت اچھا" کہہ کر خاموش ہو گیا۔ جیسا کہ عموماً آقاؤں کے حکم پر ملازم کہہ دیا کرتے ہیں۔

اِدھر وُہ رخصت ہوئے اُدھر کسی ممبر نے شفیق پارٹی میں جا کر یہ تجویز پیش کر دی کہ کل بطخ پلاؤ پکنا چاہیئے، اور احسان یہ کام بڑی آسانی سے کر سکتا ہے، سیکرٹری کی بطخیں اُس کی تحویل میں ہیں۔ چنانچہ رات کو مجھے اس قوم کی طرف سے یہ ریزولیشن اس طرح سنایا گیا کہ اس دفعہ کے مشاعرے کے ساتھ بطخ کا پلاؤ رہے گا اور اس کارِ خیر میں ہم

جنابِ احسان کے شکرگزار ہوں گے"۔ یہ تجویز سُن کر میں سناٹے میں آگیا کہ اپنی تحویل کی چیز کو کس طرح اَلوپ[1] کر دوں؟ لیکن اصغر جنگ نے غلامی کا طعنہ دے کر میرے سہم کو بُزدلی قرار دے دیا اور قہقہے کے بعد مُجھے ایک باغیانہ لیکچر پلایا جس سے میرا تمام خوف وہراس تائید میں تبدیل ہو گیا۔ دوسرے دن مشاعرے کے بعد بطخ کا پلاؤ زیبِ دسترخوان ہوُا۔ صبح ہوتے ہی اس کے پَر پُرزے اکٹھے کر کے مُجھے دیدیئے گئے کہ یہ تُمہارے کام آئیں گے، یہ کہہ دینا کہ رات کو بطخیں جو ہٹر پر رہ گئی تھیں کوئی گیدڑ پکڑ کر کھا گیا۔ مَیں نے کہا "یُوں کیوں نہ کہوں کہ "شکاری کتّوں کے کام آگئی"۔ سب نے ایک فاتحانہ قہقہہ لگایا اور خاموش ہو گئے۔

جب سیکرٹری صاحب آئے اور بطخ کے بارے میں دریافت کیا تو مَیں نے کہہ دیا کہ "مجھ سے غفلت ہوئی کہ شام کو بطخیں بند نہ کیں اور ایک کو گیدڑ کھا گیا۔ تالاب کے کنارے یہ پَر وغیرہ پڑے ہوئے ملے"۔ وُہ بُری طرح برافروختہ ہُوئے اور مَیں نے اُنھیں حق بجانب خیال کرتے ہوئے ادھر سے کان بند کر لئے، اور سوچنے لگا کہ حکیم شفیق سے اس کا انتقام کِس طرح لیا جائے۔ چنانچہ ایک دن شام کو مَیں نے بھی پارٹی میں ایک تجویز پیش کی کہ حکیم شفیق الرحمٰن صاحب شفا کل شام تک مولوی ضیاء الاسلام[2] صاحب کا بکرا لائیں گے جو سارے دِن بازار میں غریب دُکانداروں کا اناج اور بے چارے کنجڑوں کی سبزیاں کھاتا پھرتا ہے اور مجسٹریٹ صاحب کا مال خیال کر کے کوئی نہیں بول سکتا۔ زندہ دل ممبرد ل

---

[1] اَلوپ کرنا۔ چھپانا۔

[2] مولوی ضیاء الاسلام بی۔ اے رعلیگ) رئیس کاندھلہ آنریری مجسٹریٹ اور حکیم شفیق الرحمٰن کے خسر تھے۔ وُہ شاعر بھی تھے اور ان کا مجموعۂ کلام "ضیا" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ میرے کتب خانہ میں بھی ایک نسخہ موجود ہے۔ ضیاء الاسلام صاحب کا انتقال ہو چکا ہے وُہ بڑے صاحبِ ذوق اور مہمان نواز قسم کے انسان تھے۔ جب کوئی شاعر یا ادیب باہر سے آتا تو اُن کی تواضعات کو وہ اپنا فرض خیال کرتے تھے۔ ان کے بعد ان کا صاحب زادہ فیضی ان کی صحیح جانشینی کر رہا ہے۔ خدا اُس کی عمر دراز کرے۔ آمین

نے دادِ تحسین کے ساتھ میری تجویز قبول کی اور زور دار الفاظ میں تائید ہوئی۔ شفیق صاحب نے نہایت خندہ پیشانی سے اِس خدمت کو منظور کیا۔ اور اُسی وقت اُٹھ کھڑے ہوئے یوں تو عشا کی اذان کے بعد سے ہی قصبات کی گلیوں میں قبرستان کا سا عالم طاری ہو جاتا ہے مگر اس وقت پورنماشی کا چاند اپنے شباب پر تھا اور چاندنی گلیوں میں دو طرفہ چھجوں کے سایوں کے درمیان بہہ رہی تھی۔ حکیم صاحب چوہ گلی کو عبور کر کے ضیاء الاسلام صاحب کی دہلیز میں سے اس پالے پوسے بکرے کو کندھوں پر لاد لائے اور پارٹی کے حوالے کر دیا اور کہا "اب تم جانو اور تمہارا کام۔ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو گیا ہوں"

وہ بکرا اس قدر فربہ تھا کہ ایک رات میں ہم دس کے بس کا نہ کھانا تھا نہ چھپانا چنانچہ تجویز ہوئی کہ بیت المال میں جمع رکھا جائے اور جب کل پرسوں تلاش کی ہڑبونگ اور پوچھ گچھ ختم ہو جائے تو بالاقساط جشن منایا جائے۔ سب نے تائید کی اور بکرا ایک تاریک کوٹھری میں بند کر دیا گیا۔

دوسرے دن تمام ممبر بکرے کے گم ہونے کی منادی سے بہرہ یاب ہوئے اور کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ شام کو معمولی تذکرے کے بعد اس جرم اور خیال کو قہقہوں میں اُڑا دیا گیا۔ کیونکہ سب اس قسم کے عادی مجرم ہو چکے تھے۔

تیسرے روز مجسٹریٹ صاحب کو کسی ذریعہ سے معلوم ہوا کہ شفیق پارٹی میں مستقل طور پر بڑے لوگوں کے مرغے اور بکرے ہضم کئے جاتے ہیں اور خصوصاً مولویوں کے نچلے ہیں سے تو کسی کے لئے بھی بخشش کا خانہ موجود نہیں۔

وہ یہ سن کر ہکا بکا رہ گئے کہ اوّل تو قصبے میں ایسی چنڈال چوکڑی کا قیام اور مجسٹریٹ کی معلومات سے باہر؟ اور اُس پر طرّہ یہ کہ میرا داماد اُس پارٹی کا سربراہ۔ اُنھوں نے اُسی وقت ملازم کے ذریعے حکیم شفیق الرحمٰن صاحب کو بُلوا بھیجا۔ حکیم صاحب

پہنچے اور نہایت سنجیدگی سے آرام کرسی پر بیٹھ گئے۔ ضیاء الاسلام صاحب پہلے تو بہت جھلائے اور جب دیکھا کہ شفیق کے ماتھے پر شکن ہے نہ چہرے پر تغیّر۔ تو پھر نہایت نرمی سے ڈُنیا کے نشیب و فراز سمجھا کہ پارٹی کا راز لینا چاہا۔ وہ کہاں راستہ دینے والے تھے۔ اُن کے نیچے کھجور پر بتا کر علیحدہ ہوئے اور آتے ہوئے کہہ آئے "آپ کا ہم لوگوں کی طرف سے جو خیال ہے وہ آپ کے منصب کے منافی ہے اور ہم سب لوگ اس پر احتجاج کریں گے۔ یہ ہماری توہین ہے۔"

پارٹی میں آکر سب کے مشورے سے ایک گمنام خط بھجوایا گیا۔ کہ اگر آپ دس روپے مسجد میں مؤذّن کو دے دیں تو بکرا گھر پہنچ جائے گا۔

مجسٹریٹ صاحب نے اِس خیال سے کہ مسجد کا مؤذّن ہے سب کچھ بتا دے گا یہ جُرمانہ قبول کر لیا۔ اور دس روپے مؤذّن کو بُلوا کر اس شرط پر دیئے کہ جو مانگنے آئے اُسے دے دو۔ مگر اُس کا نام اور صورت یاد رکھّو اور فوراً ہمیں بتاؤ۔ مجسٹریٹ صاحب کو کیا خبر تھی کہ مؤذّن بھی ہمارا ایک ممبر ہے اور حلال کرنے کا کام اُسی کے سپرد ہے۔ چنانچہ اُس نے دس روپے پارٹی کو پہنچا دیئے اور مجسٹریٹ صاحب سے جا کر کہہ دیا کہ ایک صاحب رات کو چادر میں منہ لپیٹ کر آئے تھے اور اپنا نام ریاض الاسلام بتاتے تھے، ریاض الاسلام صاحب ضیاء الاسلام کے بھائی تھے جنہیں اِن باتوں سے دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا، ضیاء الاسلام صاحب چُپ ہو کے رہ گئے۔

قوم نے بکرا تو چھوڑ دیا اور روپیہ وصول کر کے جشن منایا۔ حصّہ جناب ضیاء الاسلام صاحب کے یہاں بھی بھجوا دیا۔ رات دن یُونہی ارتقائی رفتار سے گزرتے رہے اور میں قاضی محمد زکی صاحب کی سوسائٹی سے زیادہ شفیق پارٹی میں دلچسپی محسوس کرنے لگا۔ کیونکہ وہاں احترام اور عقیدت کا جذبہ کارفرما تھا، اور یہاں برابری کا۔ حکیم شفیق الرحمٰن نہ جانے کیوں مجھے اپنا کلام دکھانے لگے اور اس طرح میں پارٹی کی نظر میں

اُن کے نیچے کھجور پر بتانا: کچھ کا کچھ بیان کرنا، زمین کی پوچھنا آسمان کی بتانا۔

اور بھی محترم و معتبر ہو گیا۔ حالانکہ شفیق عربی۔ فارسی کے منتہی تھے اور میں معمولی شُد بُد رکھتا تھا۔ کچھ دنوں بعد سیکریٹری کو اتفاق سے سستا آدمی مل گیا اور مجھے باورچی کے کام سے نجات مل گئی اور میرا کام صرف دفتر کی چپراس تک رہ گیا۔

پھر نہ جانے کیوں ایک دن مجھے یک بیک ویکسینیٹر کے ساتھ لگا دیا گیا۔ محرّر دفتر نے ویکسینیٹر کے بہت کان بھرے لیکن عظیم الدین صاحب شریف انسان تھے میں تمام دن اُن کا رجسٹر اور ویکسینیشن کا سامان اُٹھائے اُن کے ساتھ رہتا۔ لوگوں سے وُہ مجھے چھ آنے، آٹھ آنے اور کبھی کبھی روپیہ روپیہ بھی دلوا دیتے تھے اور میں محلّوں میں پھر کر اُنہیں ٹیکوں کی کامیابی اور ناکامی کی اطلاع دیا کرتا۔ آہستہ آہستہ عظیم الدین صاحب نے اپنے آرام کے لئے مجھے ٹیکہ لگانا سکھا دیا۔ اس میں کوئی ایچ پیچ کی بات تو تھی ہی نہیں۔ میں ٹیکے لگانے لگا بالکل اُسی طرح جیسے ہسپتالوں میں ڈاکٹروں کی عدم موجودگی یا شب خوابی کی مصروفیت کے وقت وارڈ کا ادنیٰ ملازم بھی انجکشن لگا دیتا ہے عظیم الدین صاحب میرے لگائے ہوئے ٹیکوں کو سراہتے تو میں خود کو ایک ڈاکٹر قسم کا انسان محسوس کرتا اور رَوا رَوی کو میری نظر بلند ہو جاتی۔ میں ٹیکہ لگانے میں تو ماہر ہو گیا تھا لیکن یہ میرے فہم سے باہر کی بات تھی کہ آخر یہ بچھڑوں کی چیچک کا مواد چیچک کی روک تھام کے لئے کیسے مفید ہو سکتا ہے؛ میں نے کئی بار عظیم الدین صاحب سے پوچھا بھی مگر تشفی نہ ہوئی۔ اُنھوں نے کچھ اوٹ پٹانگ بتایا تو ضرور۔ مگر یا تو وہ سمجھا نہیں سکے یا پھر میرے پلے نہ پڑا۔

ایک عُمر کے بعد جب میں نے طِب اور ہومیوپیتھی کا مطالعہ کیا تب راز کُھلا کہ یہ علاج بالمثل قوّتِ مدافعت کو اُبھارنے اور چونکانے کے لئے ہوتا ہے ابھی میں اس فن کے رستے ہی میں تھا کہ محرّر دفتر نے مجھے ٹیکس کی وصولی کے لئے پھر دفتر میں طلب کر لیا، اور حکم حاکم مرگِ مفاجات، میں وہاں کام کرنے لگا۔

دفتر کی چوکیداری

چونکہ میری تفریحات دفتر کے احاطے سے آزاد تھیں اس لئے کام کے وقت کے علاوہ میں کسی دفتری آدمی سے ایسا مانوس نہ ہو سکا جو دوستی کے حدود میں آجائے۔ میری اس بے تعلقی سے جل کر اراکینِ عملہ نے میری ڈیوٹی میں اضافے شروع کر دیئے۔ دفتر میں غریبوں کو سستے داموں بیچنے کے لئے اناج آیا تو چپراس کے ساتھ رات کو اس کی چوکیداری بھی میرے سر منڈھ دی گئی، جو میرے والدین کے لئے بے اطمینانی اور میرے لئے تکلیف کا باعث تھی۔ اِس پاسبانی میں چونکہ دفتر کے احاطے میں چاروں طرف رات بھر لالٹینیں جلتی تھیں اور ماحول روشن رہتا تھا۔ اس لئے اب اصغر جنگ کا کتب خانہ تھا، اور میں۔ اصغر مجھے میرے تقاضے کے بغیر اچھی اچھی کتابیں لا کر دے جاتا اور ان کے حسن و قبح پر ایک مختصر سا لکچر بھی دے ڈالتا۔ وہ شاید میرے مطالعہ کو اس لئے بڑھا دینا چاہتا تھا کہ مجھے ہم خیال بنا لے اور منکرین میں ایک فرد کا اضافہ ہو جائے۔ مگر اس کا خلوص مجھے کبھی اس کی نیت پر شک کا موقع نہیں دے سکا، اور آج بھی اُس پر شک کرتے ہوئے خود کو مجرم خیال کرتا ہوں۔

میں جی ہلکا کرنے کے لئے جب اُس سے اپنی مصیبتوں، زمانے کی سفاکیوں اور افسروں کی سختیوں کا ذکر کرتا، تو وہ ناک بھوں چڑھا کر کہتا "یہاں تم ہی نہیں، یہ ماحول کا ماحول اور ملک کا ملک بزدل اور غلام فطرت ہو چکا ہے۔ ورنہ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ غریبوں کو غلام ابنِ غلام بناتے چلے جائیں خود رئیس ابن رئیس ہونے پر فخر کریں اور دوسروں کا حق کھا کر معزز کہلائیں۔ یہاں کے پس ماندہ طبقے کی آنکھوں میں بھی تو جہالت کا جالا آگیا ہے۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اگر یہ خدا کا قانون ہے تو اس قانون کا خدا کیا پرستش کیلئے بھی موزوں ہو سکتا ہے، اگر یہ انسان کی مشیت ہے تو کیا انسان گردن زدنی نہیں؟

بھائی! مَیں تو اُن چوروں چکاروں کو اچھّا خیال کرتا ہوں جو امیروں کا مال چراتے ہیں اور غریبوں میں بیٹھ کر ٹھکانے لگاتے ہیں۔ اُن کے دروازے سے کوئی فقیر خالی تو نہیں جاتا۔ وہ کسی بیوہ کو تو نہیں ستاتے۔ وہ کسی دوشیزہ کی عصمت کے درپے تو نہیں ہوتے ہماری اور آپ کی قسمت میں ابھی نہ جانے کب تک یہ ذلت لکھّی ہے۔"

تیل کی چوری

ایک بار شفیق پارٹی کے چند ارکین دفتر میں آدھمکے اور میونسپلٹی کے احاطے میں چاروں طرف بتیاں روشن دیکھ کر کہنے لگے۔ "بھائی ہم یہ پوچھتے ہیں کہ جب رات کو دفتر کا ذمہ دار تمہارے سوا کوئی نہیں تو احاطے میں چاروں طرف ان بتیوں کے کیا معنی؟ مطالعہ کے لئے تمہاری چارپائی کے قریب ایک لالٹین بہت ہے باقی لالٹینوں کا روزمرہ تیل اُلٹ لیا کرو اور جب کنستر ہو جائے تو بیچ دیا کرو۔ تم تو بالکل بُدھو ہو۔ ارے یہ تو معمولی سا اقتصادی مسئلہ ہے، یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا؟"

اُن کی یہ بات میری سمجھ میں بھی آ گئی اور اُسی وقت سے عمل شروع کر دیا۔ جہاں بتیاں روشن ہوئیں تھوڑی سی دیر کے بعد احاطے کی دیوار پر چڑھ کر پا کُرسی رکھ کر سب کُپیوں میں سے تیل اُلٹ لیا۔ اور جب کنستر ہو گیا تو اونے پونے بیچ دیا۔ کبھی کبھی میں رات کے اندھیرے میں آواز لگاتا تو چاروں طرف بھری ہوئی کالی خاموشی کے سینے پر دھکا سا لگتا معلوم ہوتا، اور تاریکی میں ڈبکیں سی پڑتی محسوس ہوتیں۔

اُن دنوں میں تو رات کو دوستوں کے مکان پر جا ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ شفیق کے مکان سے اُٹھ کر دوستوں کا ہجوم دفتر میں آ جاتا، اور خوب دل لگی رہتی۔ اس جشنِ شبینہ کی بھنک محرّر ٹیکس سے ہوتی ہوئی انسپکٹر تک پہنچ جایا کرتی۔ انسپکٹر ماتحتوں میں شکم سیر یہودی کی طرح آتا۔ اور جب تک دفتر میں بیٹھتا کابوس کے مریض کی طرح بڑبڑاتا رہتا۔ اس کے الفاظ دفتر کی اُدنچائی میں اس طرح گونجتے کہ الفاظ کے خدوخال خراب ہو جاتے، اور بعض دفعہ اصل مفہوم بھی پلّے نہ پڑتا۔ مجھے تو یہ محسوس ہوتا کہ میرے

ڈبکیں:- گڑھے۔ چپ۔

اعتماد اور عزائم کو چابک سے کھدیڑا جا رہا ہے، اور لوگوں کا نہ جانے کیا حال ہوتا ہوگا جب وُہ چلا جاتا تو کلرک ہونٹ بچکاتے[1] اور باقی اپنی اپنی اداۓ خاص میں ایک طرح کی خوشی مناتے۔ بعض تو ہلکی ہلکی گالیاں بھی دیتے، کیونکہ وہ اکثر اوقات ماتحتوں سے اس طرح پیش آتا جیسے اس کا ضمیر اس کے اخلاق اور تقدّس کو پی گیا ہے اور اس کی شریانوں میں گدلے تیل کے سوا کچھ نہیں رہا۔ اس کے سامنے دفتر کے لوگ مشین کی طرح کام کرتے اور وُہ زخمی بھیڑیے کی طرح غرّا غرّا کر نگرانی کرتا رہتا۔

یہ ٹیکس انسپکٹر تھا تو خود ساز لیکن ناقص تعلیم اور خود غرضانہ ماحول کے تحت اس کا تجربہ دنیاداری کی پستیوں ہی بود و باش اختیار کر گیا تھا۔ لیکن بیتاب فطرت تھا اس لئے قصبہ کی کثیف سیاسی فضا میں یک جان ہونے پر بھی اپنی حکمت عملی سے پیر پیر کر اُس گدلے دریا میں کنارے پکڑتا رہتا۔ اس سے اُس کا ضمیر بنجر ہو گیا تھا۔ اُس کی تِل چاولی[2] گھنی داڑھی کے نیچے دھاری دار سلیٹی شیروانی ایسی معلوم ہوتی جیسے کسی مدراسی نے اپنے کالے اور خشک سینے پر بڑھے ہوئے ناخنوں سے خوب کھجلایا ہو۔ جب وُہ مجھے عادتاً ڈانٹتا اور اچھّے کاموں کو بھی بُرا ثابت کر کے اپنی برتری کو اجاگر کرتا تو اس کے الفاظ میری رُوح کو کھرچتے ہُوئے دست و پا میں تیرنے لگتے اور سارے جسم میں ایک زہریلی خارش سی دوڑ جاتی۔ صرف مَیں ہی نہیں دفتر کے مُنشیوں سے لے کر بھنگیوں تک کوئی اس کی چڑچڑی طبیعت سے خُوش نہ تھا۔ وہ ذرا سی بات پر چاہے جس پر برس پڑتا، اور ایسا لگتا جیسے دفتر کے در و دیوار سے بھاڑ کا دُھواں ٹکرا رہا ہو۔ اس نے قصبہ کی سیاست اور ترقّی کی بساط پر موقع بموقع خانے خالی اور چالیں کمزور دیکھ کر اپنی آسائشِ حیات کے لئے اچھی خاصی جائیداد پیدا کر لی تھی۔ اس کے ایک لڑکی[3] کے سوا کوئی نرینہ اولاد بھی

---

[1] ہونٹ بچکانا۔ اظہار نفرت میں نیچے کے ہونٹ کو اوپر کے ہونٹ سے بڑھا کر ہلکی جنبش دینا۔

[2] تِل چاولی۔ جیسے تِل اور چاول مِل گئے ہوں۔

[3] اُس لڑکی کی شادی میرے ایک دوست ارشاد علی نامی سے ہو گئی تھی جو ایک پرائمری سکول میں مدرّس تھے۔ بڑے وجیہ توانا و تندرست انسان۔ مگر ایک ٹرین کے حادثہ میں اُن کی ایک ٹانگ بیکار ہو گئی تھی۔ جب میں

تو نہیں تھی لیکن اس کے باوصف وہ اپنی دولت کو اپنی انفرادی حدود سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ شاید اس کی اولاد کی محبت اور آرزو اب دولت کے لئے محدود ہوچکی تھی۔

وہ ایک تعفّن کے تالاب میں مگرمچھ کی طرح تھا جس سے سب گھبراتے تھے۔ وہ ہمیشہ کسبِ دولت کی اس چکاچوندھ میں رہتا، جو بصیرت کو تاریک کر کے اسرارِ کائنات کی طرف نہیں آنے دیتی۔ یوں تو وہ نماز روزے کا پابند بھی تھا لیکن ایسے غلط رَو لوگوں کی نیّت عبادت کو بھی خراب کر دیتی ہے۔ کیونکہ اُس کی بنیاد وجدان پر نہیں ہوتی اور سینے میں لہوولعب کے اٹیرن ٹرکنے کا نام تک نہیں لیتے۔

کاندھلے کا ادبی ماحول

جغرافیائی اعتبار سے کاندھلہ ترقی کرنے والے شہروں سے دُور تھا۔ دہلی وہاں سے چالیس کوس تھی۔ اسی طرح سہارنپور کا فاصلہ بھی اتنا ہی تھا اور میرٹھ کی بھی قریب قریب اتنی ہی مسافت تھی۔ اس کے باوجود اپنے علمی ذوق کی بنا پر وہ آس پاس کے تمام قصبوں سے بلند اور شہروں میں بھی ممتاز تھا۔ جہاں تک دینی، اسلامی اور علمی ماحول کا سوال ہے وہاں تک تو وہ سربلندی میں لاجواب تھا، کیونکہ جگہ جگہ عربی فارسی کے مکتب تقسیم علم کے فرائض انجام دے رہے تھے لیکن شعر و ادب کے معاملے میں وہاں کا معاشرہ اور عوام کا ذوق تیز رَو اور قدآور نہیں تھا جس کا سبب وہاں کا محتاط ماحول اور باشرع لوگوں کی کثرت خیال کی جاسکتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ لوگ ثقہ ہونے کے باوصف مطالعہ کے رسیا تھے اس لئے کور ذوق بھی نہ تھے۔ گھریلو مجلسیں دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ یہاں کے تو علماء و فضلاء

(بقیہ صفحہ ۱۴۶) کاندھلا گیا اور انھیں بیساکھیوں پہ چلتے دیکھا تو بیحد صدمہ ہوا۔ ان کی جوانی میں اسطرح معذوری میرے لئے عبرت بھی تھی اور غم بھی۔

بھی ذوق کی نفاست اور طبیعت کی لطافت میں کم نہیں چنانچہ ان کی مرہونِ قلم بہت سی کتابیں سرمایۂ علم میں شمار کی جاتی ہیں۔

ہندوؤں میں پنڈت مکندلال خوشدل کے تلامذہ اچھی خاصی تعداد میں تھے اور آئے دن کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا رہتا تھا۔ مسلمانوں میں صرف قاضی محمد زکی صاحب کی ذات تھی جو خود تو گوشہ نشین تھے لیکن اپنے چند شاگردوں کو سامانِ حرب سے لیس کر کے اُس محاذ پر بھیج دیتے تھے۔ کبھی کبھی قصبہ کیرانہ کے خواجہ محمد عادل صاحب یا ان کا کوئی شاگرد آجاتا تو ذرا اور بھی لطف آجاتا۔ کبھی کبھار خواجہ صاحب سے ملاقات ہو جاتی تو ہفتوں سرور رہتا۔ وہ لکھے پڑھے اور پختہ مشق شاعر تھے۔

کاندھلے کی شعری فضا پر داغ اور ذوق کا رنگ غالب تھا۔ شاید اس وجہ سے کہ قاضی محمد زکی صاحب کے بڑے بھائی قاضی شیخ محمد صاحب رسوا اُستاد ذوق کے سلسلے سے تھے۔ ارد گرد کے شہروں میں تو شعری ذوق ممکن ہے ترقی کر رہا ہو لیکن یہاں ہنوز اُسی قدیم ڈگر پر ہی شعر کہا جاتا تھا۔ اور اشعار میں وہی ذکر و اذکار اور معاملہ بندی کا زور تھا جو جنسی تعلقات کی بنا پر ظہور میں آتی ہے۔ وہاں یہ عام خیال تھا کہ شاعری میں عاشقی۔ معشوقی۔ رقابت۔ جوبن۔ بوسہ۔ چٹکی۔ حسرت۔ ارمان۔ قتل۔ خنجر۔ چھری۔ کٹاری۔ بسمل۔ قاتل۔ زخمی۔ بیمار۔ چارہ گر۔ شاہ۔ خداوند۔ اور مرنے کے بعد کی گفتگو ضرور ہونی چاہیئے۔ اور تصوّف کے مسائل شعر میں دلکش ہو جاتے ہیں۔

یہ تمام چیزیں علم اور تجربات کے نقوش تھے اور میرا علم تو چوتھی جماعت سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ البتہ معمولی قسم کا مطالعہ سینے میں ہنگامہ بپا کئے رکھتا تھا۔ کتنی کتابیں حمد باری اور دستور الصبیان وغیرہ الفاظ کے اعتبار سے ابھی تک میرے ساتھ روشنیاں لے کر چل رہی ہیں۔ اور مفید نامہ کا مطالعہ ہنوز میری دستگیری کر رہا ہے۔

قاضی صاحب کا فیضانِ نظر اور شفیق پارٹی کی بے تکلفی اس پہ زندگی کے مہلک

حالات میری شاعری کا سرمایہ تھے۔ میں ان دنوں جو تُک بندیاں کرتا وزن اور بحر کے لحاظ سے تو شعر کی صف میں آتیں لیکن حسنِ شعر اور مفہوم کے اعتبار سے ناقص ہوتیں۔ شعراء کے چند دَواوین کا مطالعہ بھی تھوڑی بہت معاونت کرتا لیکن میری عمر تجرباتی طور پر تہی دامن اور علمی رُخ سے خالی ہاتھ تھی۔ اس کم مائگی کے باوجود مجھ میں قوتِ اعتماد کا یہ عالم تھا کہ خود کو شاعر خیال کرتا اور ذرا ذرا سی بات شعر کی صورت اختیار کر جاتی۔ اس تُک بندی کو میں ایسے لوگوں میں سُنایا کرتا جو سوسائٹی سے دُور اور علم سے بے بہرہ ہوتے۔ جیسے باغوں کی فصل کے خریدار، پان فروش یا اکھاڑوں کے پہلوان اور ورزش کے شوقین جن کے اجسام تو ہوتے ہیں لیکن دماغ اُن پر حاکم نہیں ہوتا۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ دادِ تحسین کے علاوہ تنقیص و تنقید کا بُوتا ان میں کہاں تھا۔ اسی داد و تحسین کو میری خود اعتمادی اوزان و بحور کے ریتیلے رستوں میں دوڑاتی رہی۔ افسوس کہ آج میرے پاس ہی اس دور کے اشعار نہیں۔ اور اس کا کوئی ایسا غم بھی نہیں کیونکہ میں تو خود معترف ہوں کہ میرے اُس دَور کی شاعری میں کوئی حسن نہ تھا اور نہ اُس وقت یہ معلوم تھا کہ کبھی مجھے اپنے سوانح لکھنے کا ناخوشگوار فرض بھی ادا کرنا پڑے گا۔ اور میں اُس وقت اپنی بے بضاعتی کے اعتراف کے سوا کوئی ثبوت مہیّا نہ کر سکوں گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کاندھلے کے وہ مشاعرے اور تشفیق پارٹی کی ہفت روزہ مجلسوں کی روئیداد میں قلم بند نہ کر سکا۔ یہ کسے خبر تھی، کہ قدرت مجھے اِن راستوں سے کہیں دُور لے جا رہی ہے۔ ورنہ آج وہ یادداشتیں نقوشِ ماضی کے طور پر کام آتیں۔ ممکن ہے حکیم شفا کے پاس اس دَور کا کچھ ہو۔

قاضی صاحب کی تقلید میرے بُوتے کی بات نہیں تھی اور دوسرے شعراء میری نظر میں مُجھی جیسے تھے۔ چنانچہ مجھے پاؤں پہ پاؤں دھرتے ہوئے شعری سفر کا ماحول نہیں مل سکا، میں تو اُس راہ پہ چلتا رہا جہاں میرے قدم مجھے لے جاتے رہے نہ کہ جہاں میں قدموں کو لے جاتا رہا۔

میں اس عالم میں بھی کبھی کبھی کسی کا اچھا شعر سنتا تو آدھی آدھی رات تک میرے ذہن کے منڈیروں پر خیالات کا رتجگا سا رہتا اور بڑی بڑی خوبصورت صناعیاں میرے تصور اور خیالات میں نہ صرف مسکرائیں بلکہ حیا آلود اشارے بھی کریں اگر میں اُس وقت کچھ لکھنے بیٹھ جاتا تو مایوس نہ اُٹھتا، اور طبیعت بشاش ہو جاتی۔

شادی

نوکری کے اس دور میں کاندھلے کے ایک شریف مگر غریب کسان گھرانے میں میری منگنی ہو گئی۔ میں ابھی شادی کے حق میں نہیں تھا مگر والدہ نے کہا کہ میرے بوڑھے اور کمزور ہاتھ پاؤں سے اب گھر کا کام نہیں ہوتا۔ اب میرے پاس کوئی جواب نہ تھا چنانچہ شادی ہو گئی اور اس قلیل آمدنی میں ہم تین کے بجائے چار نفوس ہو گئے۔ لیکن اب والدہ کے ساتھ میری بیوی بھی سینے پرونے کا کام برابر کرتی تھی۔ یونہی تنگی تُرشی سے گزارا ہوتا گیا۔ دفتر میں میری بزم آرائیوں اور جشن آفرینیوں کی مستقل شکایت طول پکڑتی گئی۔ آخر ایک دن انسپکٹر صاحب نے چوکیداری سے نجات دے دی اور پھر دفتر میں صرف ٹیکس کی وصولی پر ڈیوٹی لگا دی۔ اب میں خوش تھا کیونکہ افسروں کی نظر سے دور آزادی سے گلیوں میں پھرتا اور جو اسامی ملتی ٹیکس داخل کرنے کا تقاضا کر دیتا اور جو دفتر کی زحمت سے بچنے کے لئے مجھے ہی رقم دے دیتا۔ میں اُسے شام کو رسید پہنچا دیتا مجھے چپراسیوں کی وردی سے سخت نفرت تھی وہ دانستہ طور پر ایسی بنائی جاتی تھی جس سے غلامی اور خواجگی میں دور ہی سے امتیاز ہو جائے۔ کیونکہ یہ لوگ اس سے آشنا نہیں تھے کہ عزت ہمیشہ چھوٹے چھوٹے آدمیوں ہی سے ہوتی ہے لیکن چونکہ دنیا کی گندگی ان کے محاسن کو جذب کر چکی تھی اور یہ ایک ایسے درخت کی طرح ہو گئے تھے جس میں صرف کانٹے ہی کانٹے رہ گئے ہوں اور پتے سونت لئے گئے ہوں۔ بعض بعض

اوقات دفتر کے افسران اپنے ماتحتوں میں بیٹھ کر ایسی دوغلی ہنسی ہنستے کہ میری رُوح مسرّت کے بجائے نفرت میں غوطہ سا کھانے لگتی اور میں ان کے چہروں پہ ایک سانولی روشنی کو دم توڑتے محسوس کرنے لگتا۔ مگر مجبور تھا کہ وہ افسر تھے اور میں معمولی ماتحت بعض بعض اوقات تو ان کے ذلیل فقرے ایسے شاق گزرتے جیسے مجھے کوئی مکّوں سے دھکّے دے رہا ہو۔ مجھے اس ڈیوٹی میں تھوڑی سی آزادی کے باعث ایک ذرا سی آسودگی بھی تھی۔ کہ جب دوستوں میں مل بیٹھنے کا موقع ہوتا تو ایک ایک دوست کو اس کے محلّے کے ٹیکس دہندگان کی فہرست دے کر تقاضے کرا دیتا اور بس۔

جب دوسرے چپراسیوں اور محرّروں کو میری اس ستم ظریفی کا پتا چلا تو اُنھوں نے چُپکے چُپکے انسپکٹر کے کان بھرنا شروع کر دیئے وہ یہ کام بظاہر تو محکمہ کی وفاداری اور افسر کی تحسین طلبی کے تحت کرتے تھے لیکن اصل بات یہ تھی کہ کھُل کے مخالفت کرنے کا اُن میں دَم نہیں تھا وُہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ ہم ایک چھوٹے مُجرم کے جرم سے بڑے مُجرم کو آگاہ کر رہے ہیں۔

جب میں گھر جانے کے لئے دفتر سے نکلتا تو عموماً اصغر جنگ سے ملتا ہُوا جاتا۔ اور اپنے تمام دِن کے حالات اور واقعات کے اثرات میں ڈوبا ہُوا اُس کی گفتگو سے ایسا محسُوس کرتا، جیسے مجھ میں کوئی روشن طاقت پھریری لے رہی ہے۔ اس کے علاوہ اسکول کی ہم جماعتی کے دَور سے اس محلہ کے چند[1] اور لوگوں سے بھی میری خاصی بے تکلّفی تھی اور آج تک اُن سے ویسے ہی مخلصانہ تعلّقات چلے آ رہے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ علمی طور پر

---

[1] یٰسین جنگ۔ خلیل جنگ۔ وکیل جنگ۔ اشرف جنگ۔ شفقت جنگ اور رفیق جنگ وغیرہ۔ شفقت جنگ اس محلے میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں اور علمی طور پر بھی قلاش نہیں۔ لیکن قصبہ کی آدم خور آب و ہَوا اُنہیں اپنے سانچے میں نہ ڈھال لے۔ سُنا گیا ہے کہ پچھلے سال شفقت جنگ اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے۔ وُہ نہایت ذہین اور دلنواز قسم کے انسان ہیں خدا اُنہیں عمرِ طویل اور راست روی عطا فرمائے۔ آمین

کوئی خاص اور بلند مقام حاصل نہیں کر سکے بلکہ اپنے آبائی پیشہ زمینداری اور کاشتکاری میں گھِر کر رہ گئے لیکن میری نظر میں اُن کے خلوص کا ایک بلند مقام ہے اور ہر وقت ایک سہارا سا محسوس کرتا ہوں اور ان کے لئے دُعاگو ہوں۔

مشاہدے کا چراغ

میرے جاننے والوں میں ایک شخص نے اپنے خاندان کی ایک لڑکی سے محبت کی، اور دونوں نے اپنے والدین سے کسی طرح اپنی آرزو کا اظہار کر کے شادی رچالی۔ دو سال تو بڑے سکون اور اطمینان سے ہنسی خوشی گزر گئے۔ تیسرے سال کے شروع ہی میں ایک بازاری عورت اپنے فن میں کامیاب ہو گئی اور میاں اُس کے گھر آنے جانے لگے نتیجے میں نکاح کا سوال آیا تو اعزّا و اقربا کی مخالفت کے باوجود نکاح عمل میں آگیا اور خیالات کے افق تک بھی یہ آثار نظر نہ آئے کہ زندگی بے برگ تھر کانٹے دار درختوں سے گھِر رہی ہے۔

چند دنوں کے بعد چھوٹی بیگم نے کہا کہ میں بڑی بیگم کے ساتھ نہیں رہ سکتی میرے لئے کسی دوسرے مکان کا انتظام کریں۔ میاں اچھے خاصے زمیندار تھے اور روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ چنانچہ پُرانے مکان کے سامنے ایک نیا مکان تعمیر ہو گیا۔ اور اس نئے مکان میں دوسری بیگم آدھمکیں، دونوں مکانوں کی دوسری منزل کے پچھواڑے کی کھڑکیاں آمنے سامنے اور صدر دروازے مخالف سمتوں میں تھے۔

میاں کی توجہ نئی نویلی دلہن کی طرف زیادہ تھی اور بڑی بیگم کی طرف کم۔ چنانچہ دونوں طرف ایک جذباتی غبار دلوں میں گھُٹتا رہا۔ حیرات مسلن فضا کو مکدّر رکھتا۔ اور علیحدگی کے باوجود زندگیوں کے درمیان ایک دُھند برستی رہتی، بڑی بیگم کے قامت کو اس کے داخلی کرب نے کمان کر دیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے چہرے کی رعنائی کو اس کے غموں نے

بھنبھوڑ ڈالا اور تندرستی کو گھن لگ گیا ہے۔

ایک دن شام ہی سے آسمان بادلوں سے پٹ گیا۔ اور رات کے دس گیارہ بجے ننھی ننھی بوندوں کے ساتھ برف میں بھیگی تیز دھار دار ہوا سنسنانے لگی۔ گلیوں میں بوندوں کی نمی سے اینٹیں دُھل گئی تھیں اور میونسپل کمیٹی کے بھیگے ہوئے فرش پہ رہ رہ کر بجلی کا عکس لوٹ رہا تھا۔ جس سے دیواروں پر ایک جھلک سی ناچ ناچ جاتی اور بام و در چونک چونک پڑتے ورنہ پوری آبادی اندھیرے کے طوفان میں ڈوبی ہوئی تھی۔

نئی بیگم کے کمرے کی روشنی کھڑکی سے نکل کر سامنے کی دیوار پر ایک روشن مستطیل بنائے ہوئے تھی، اور بڑی بیگم اپنے دریچے میں روشنی پر نظر جمائے ٹھنڈی سانسوں میں تحلیل ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ ایسی موسیقی کی طرح تھی جس سے اس کی سرگم سے لے کر تمام آلاپ اور سُرتال کے تانے بانے سے آشنا مُطرب چھِن گیا ہو۔ اس کے دماغ میں بیزاری کی بے شمار نسلیں جنم لے رہی تھیں اور بدگمانیوں کے اَن گنت ہنگامے برپا تھے۔ جب رات کا ایک بجا تو وہ مکان سے اُتری اور چھوٹی بیگم کے دروازے پر دستک دی۔ میاں نے دستک کے جواب میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

"زمین پر آئیں تو بتاؤں" بڑی بیگم نے ہوا سے اپنا دوپٹہ چھینتے ہوئے کہا۔

میاں صاحب آئے اور گرم لہجے میں پوچھا، "تم اس وقت کیوں آئی ہو؟ کیا بات ہے؟"

"رات کا ایک بج چکا ہے۔ دُنیا آرام کر رہی ہے چراغ بُجھا کر سو جاؤ! ہوس کی کاشت کر کے ندامت کے کھلیان اُٹھانے کی کوشش نہ کرو۔" بیگم نے پگھلی پگھلی آواز میں کہا۔

میاں نے "اچھا" کہہ کر دروازہ بند کر لیا اور اُوپر جا کر چراغ گُل کر لیا۔ بڑی بیگم تھی کہ پھر دریچے میں جا بیٹھی اور اس تاریک رات میں باولے موسم اور جھنجھنانے جھکڑوں پہ نظر جمائے نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔

قریباً پون گھنٹے کے بعد غالباً چھوٹی بیگم کے اصرار پر کمرے کا بلب پھر روشن ہو گیا۔

بڑی بیگم تھوڑی دیر تک تو اس زہریلی روشنی کو دیکھتی رہی کہ مبادا کسی ضرورت کے تحت روشنی ہوئی ہو لیکن جب اُس نے دیکھا کہ چراغ جل ہی رہا ہے تو پھر اُسی بارش اور طوفان میں گھر سے نکل آئی اور پھر دستک دی۔

میاں اُترے ذرا تلخ لہجے میں بولے "تُو سو کیوں نہیں جاتی، بھلا یہ وقت باہر پھرنے کا ہے؟"

"دیکھو میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ رات آرام کے لئے ہوتی ہے، آرام کرو اور چراغ گُل کر کے سو جاؤ، مجھے تم نے ضیق میں کیوں مبتلا کر رکھا ہے۔ اب تو قیدیوں کو بھی گھروں سے زیادہ آرام میسّر ہو گا اور سب سو رہے ہوں گے، آخر میں نے کیا قصور کیا ہے جو تُم نے مجھے سُلگا رکھا ہے"۔ بیگم نے غم انگیز اور پناہ طلب لہجے میں کہا۔

میاں صاحب نے کہا "اچھا جاؤ آرام کرو یہ باتیں اچھی نہیں ہیں چراغ کی ضرورت تھی جلا لیا تھا اب بجھ جائے گا۔"

بڑی بیگم بھیگتی ہوئی اپنے مکان میں چلی گئی۔ اور میاں نے اوپر جا کر چراغ ٹھنڈا کر دیا۔ بڑی بیگم تھی کہ پھر اُسی دریچے میں آ بیٹھی جو نئے مکان کے دریچے کے بالکل سامنے تھا۔ گھنٹہ بھر نہیں گذرا تھا کہ چراغ پھر روشن ہو گیا، آدھ پون گھنٹے انتظار کے بعد بڑی بیگم پھر اُتری اور دروازے پر آ دستک دی۔ اب کی بار میاں نے دروازہ نہیں کھولا بلکہ دریچے سے ہی تلخ لہجے میں کہا "تُو تو پاگل ہو گئی ہے جا آرام کر رات کو تنگ کرنا اچھی بات نہیں، صبح کو مجھے تیرا انتظام کرنا پڑے گا، تو پاگل خانے ہی میں ٹھیک رہے گی۔"

بڑی بیگم تو غم سے لبریز تھی اور حقوقِ زوجیت کا خون انتقام کے لئے رستے تڑا رہا تھا اُس نے نہایت درد انگیز لہجے میں چیخنا شروع کر دیا "کیا آج میں اس کی حقدار بھی نہیں کہ آرام سے سو سکوں؟ کیا میرے لئے یہ چراغ جلتا ہی رہے گا، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ یہ چراغ تُمہارے گھر میں نہیں میرے سینے میں جلتا ہے اور اس کی روشنی میری رگ رگ کو بندھے ڈالتی ہے۔"

میاں نے تلخی سے جواب دیا۔ "تُو بد گمان عورت ہے جا اب چراغ نہیں بجھتا۔"

بڑی بیگم جھلا گئی اور کہا۔ "میں تمہاری موت کا غم اُٹھا لوں گی مگر یہ چراغ نہیں دیکھا جائے گا اب تُم چراغ بجھانے ہو یا محلّے کے شریفوں کو جگاؤں؟ تُم سمجھتے ہو کہ تُم ہی مجھے ستا سکتے ہو؟ تمہیں یہ خبر نہیں کہ میں اب تک تمہارے خاندان کی آبرو کی دیوار بنی ہوئی ہوں۔ غور نہیں کرتے کہ اگر تمہارے والا رویّہ میں بھی اختیار کر لوں تو دُنیا کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہو گے۔"

میاں نے جا کر چراغ بجھا لیا۔

میرے سامنے عورت کی محبت اور حقوقِ زوجیّت کا ایسا نقشہ کھنچا کہ ہفتوں ذہنی خلجان سے نہ نکل سکا۔ عام زندگی میں بھی جہاں کوئی ذہنی تاثر اپنا رنگ دینے لگتا فوراً میرے احساس کی راتوں میں ڈراؤنے سویرے اُترنے لگتے۔ اور میرے نازک خوابوں میں دھندلکا برس پڑتا۔ میں والدین کی خدمت کے بعد اپنی اہلیہ کے حقوق کو دُنیا بھر کے فرائض پر ترجیح دینے لگا اور وُہ غریب بھی میرے اس رویّے سے مطمئن تھی جس طرح دیہات کی لڑکیاں چھَل فریب سے پاک ہوتی ہیں اور شوہر کے علاوہ ان کا کوئی اثاثۂ حیات نہیں ہوتا۔

بعض اوقات یہ بھی ہُوا کہ میں نے اپنی بیگم کو ڈانٹ ڈپٹ بھی پلائی اور گالی گلوچ کا گندہ زہر بھی اس کے کانوں میں انڈیلا مگر جواب میں ڈھلتے آنسوؤں اور ناہموار سانسوں کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ اس نعمتِ خُداوندی نے مجھے کبھی تنہا کر دینے کا تصوّر بھی نہیں کیا کیوں کہ نکاح کے احترام اور ماں باپ کے اس فقرے "بیٹی ڈولے میں جا رہی ہو اب شوہر کے گھر سے جنازے میں نکلنا" نے اُس کے سراپا کو رُوح سمیت میرے حالات کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ اور یہ ایسا ٹانکا تھا جو اب تک نہ ٹوٹتا ہے نہ پگھلنے کا نام لیتا ہے۔

کیرانے کے دو شخص

میں آئے دن کسی نہ کسی کام سے کیرانہ جاتا رہتا تھا، اس لئے وہاں میرے کئی دوست بن گئے تھے جن میں پیرجی محمد اشفاق اور قاضی سراج احمد خصوصیّت سے قابلِ ذکر ہیں اس جگہ ان کی خصوصیات تفصیل سے بیان

۱۔ نعیم الدین نعیم، ماسٹر مسعود صاحب۔

کر دِل تو صفحات میں ناقابلِ برداشت اضافہ ہو جائے گا مختصر یہ ہے کہ محمد اشفاق وہاں کے مشہور پیر محمد ابراہیم کا بھتیجا اور پیر جی محمد اسحاق کا نورِ نظر ہے یہ گھرانا اب تک قصبے میں ایک معزز گھرانا شمار ہوتا ہے۔ یوں تو اشفاق آزاد خیال اور یار باش قسم کا انسان تھا لیکن خاندانی طور پر اُسے بھی ورثہ میں متصوفانہ خیالات ملے تھے جو صرف زبان و بیان کی حد تک رہے۔ عملی طور پر پیری مریدی سے اس کا دُور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ جب بھی اُس سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی اُسے اِس پیشہ ورانہ مشرب سے بیزار ہی پایا، آخر آخر تو وہ اپنے تایا پیر محمد ابراہیم صاحب کے مشرب کو بھی تنقیدی نظر سے دیکھنے لگا تھا۔

جب بھی میں کیرانہ جاتا اشفاق سے ضرور ملتا، کیونکہ وہ مجھے مختصر سی ملاقات میں قصبے کی اہم اہم خبروں سے آگاہ کر کے مجھ سے مشورہ طلب کرتا اور پوچھتا، تمہارا کیا خیال ہے فلاں فلاں باتوں کے متعلق؛ میں اپنی استعداد کے مطابق اُس پر گفتگو کرتا اور وہ اپنے خیال کی روشنی میں تبدیلہ کرتا تاکہ سامعین اس کی لسانی قابلیت سے متاثر ہوں اور اس کی شخصیت نمایاں رہے۔ اکثر وہ اپنی اور اپنے دوستوں کی بہادری اور مار دھاڑ کے قصے بڑی خوبی اور تفصیل سے بیان کرتا جنہیں سُن کر میں خود اپنے اندر ایک توانائی اور جرأت سی محسوس کرنے لگتا حالانکہ تندرستی کے اعتبار سے وہ مجھ سے بھی گیا گزرا تھا

اشفاق کی وساطت سے قاضی سراج[1] سے تعارف ہوا وہ نہایت شریف اور شرمیلا لڑکا تھا۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے سوسائٹی نے اُسے بھی جری اور جیالا بنا دیا۔ اشفاق تو صرف گفتار کا غازی تھا۔ مگر سراج عملی طور پر مجھے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے اس میں مردانہ پن کی روح حلول کر گئی ہے۔ اس کے یہاں بیان کم اور عمل زیادہ تھا مگر اُسے اس آزادہ روی سے

[1] قاضی سراج تقسیم کے ہنگامے میں ملتان چلا آیا تھا حالانکہ وہ کیرانہ میں اچھا خاصا زمیندار تھا۔ لیکن یہاں اُسے کچھ نہیں ملا۔ کیونکہ وہ سرکشی افسروں کے کام کا آدمی نہ تھا اب بھی وہ ملتان میں کشمکش کی زندگی بسر کر رہا ہے اور دورِ شرافت کا منتظر ہے۔ وہ شاکی نہیں بلکہ خدا پر اس کی نظر ہے جو اچھے ظرف و ضمیر کے لوگوں کا شعار ہے۔

یہ نقصان پہنچا کہ اس کی تعلیم ناقص رہ گئی۔ جس سے وہ آدھا بتیر آدھا بٹیر ہو کر رہ گیا، بہ ایں حالات قصبے میں سراج کی قدر و منزلت زیادہ تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ غریبوں کی زیادہ حمایت کرتا تھا۔ اس کا چچا ایک نیک نام پٹواری تھا۔ پٹواری کے ساتھ نیکنامی عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اُس کی عمر جوانی سے دامن چھڑا کے ضعیفی کی طرف مُڑ رہی تھی جس میں عموماً لوگ رُو بہ تقدّس ہو جایا کرتے ہیں۔ ممکن ہے اپنی چلتی میں اس نے بھی ڈھیلے پھینکے ہوں اور جوانی میں دیوانگی سے دوچار رہا ہو مگر اس وقت وہ قابلِ تعریف اخلاقی دَور سے گزر رہا تھا۔ تمام قصبہ اس کا مدّاح اور دیانت و اخلاق کے لئے رطب اللسان تھا۔ پٹواری رفیق احمد سے مجھے کچھ ایسی دلچسپی بھی نہیں تھی کیونکہ وہ یار باش قسم کا انسان نہیں تھا، اور میں کیرانے میں مستقل طور سے مقیم نہیں تھا اس لئے اس سے کوئی کام بھی نہیں پڑا تھا۔ جب کبھی کاندھلے سے جانا ہوتا تو سراج سے گھنٹے دو گھنٹے گپ لڑ لی اور واپس ہو گیا، مگر پٹواری رفیق احمد سراج کو میری اور اشفاق کی صحبت سے بچانا چاہتا تھا اور وہ اس میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھا کیونکہ نئی عمر کے لئے آزاد رُو لوگوں کی صحبت عموماً مفید ثابت نہیں ہوتی۔ ہاں سُوجھ بُوجھ کا نوجوان مستفیض ہو سکتا ہے جو اُن نفسیات میں مشکل سے میسر آتا ہے۔ اشفاق اور سراج دونوں کو اچھے اشعار یاد تھے لیکن صرف وہ جو قوال چھڑیوں کے میلے یا پیرجی ابراہیم صاحب کی نشستوں میں سُننے میں آتے تھے

شجاعت خان، بابر خان

شجاعت خان کا تمام خاندان آج تک چشم سازی کرتا ہے اور ابھی تک اس کُنبے کو وَیدوں کا کُنبہ کہا جاتا ہے، بلکہ وہ محلّہ ہی "ویدوں کا محلّہ" کہلاتا ہے۔ اُن میں کچھ مخصوص نسخے ہیں جو بزرگوں سے سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں اور اس پُورے محلّے میں اُنہی کی آمدنی کفالت کرتی ہے شجاعت خان کے دو بھائی اور بھی تھے۔ جن میں ایک کو شاہ جی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ معمولی معاشرت کا آدمی تھا۔ دوسرے کا نام بابر تھا جو اپنے اس چشم سازی کے آبائی پیشہ کو اپنی توہین

خیال کرتا تھا۔ لیکن ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا تھا۔ میں نے شجاعت سے کئی بار دریافت کیا کہ بابر کا روزگار کیا ہے وہ کیا کام کرتا ہے؟ لیکن اُس نے کوئی شافی جواب نہ دیا بلکہ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گیا۔

ایک دن میں کیرانہ گیا تو اتفاقاً شجاعت رستے ہی میں مل گیا۔ میں نے خیریت دریافت کی اُس نے کہا۔ "بابر سخت بیمار ہے"، میں نے کہا "کیا بیمار ہے"؟ اُس نے جواب دیا کہ "وہ کہیں سے گر گیا ہے اور کئی جگہ شدید ضربیں آئی ہیں"۔ میرا دل اُس کے بیان سے مطمئن نہ ہوا میں نے شجاعت سے شکایت کے لہجے میں کہا کہ "یہ اچھی دوستی ہے کہ تم نے بابر کے متعلق کبھی مجھ سے کھل کر بات نہیں کی۔ جب بھی پوچھا گیا تم نے ڈھیل کی اڑائی اور اب بھی ویسی ہی لگی لپٹی بات کر رہے ہو"۔

شجاعت :۔ "اگر میں بابر کے متعلق صحیح بات بتا دُوں تو شاید آپ مجھ سے کنارہ کرنے لگیں گے"۔

میں :۔ "اُس کی کسی بات سے میں تم سے کیوں ملنا چھوڑ دوں گا؟ ہر آدمی کا فعل اس کے ساتھ ہے"۔

شجاعت :۔ "اس لئے کہ وہ چوری کرتا ہے چوری"۔

میں :۔ "ہاں پھر کیا ہوا وہ اُس کا کام۔ ہے کسی مکان سے گر گیا ہوگا"۔

شجاعت :۔ "وہ مکان والا چوری نہیں کرتا"۔

میں :۔ "پھر کیسی چوری کرتا ہے؟ جیب تراش ہے؟"

شجاعت :۔ "میں ابھی اُس سے ملاتا ہوں معلوم ہو جائے گا"۔

میں :۔ "ضرور ملاؤ اور ابھی ملاؤ"۔

شجاعت :۔ "ہاں ہاں ضرور ملاؤں گا۔ تحصیل میں اپنا کام کر کے گھر آ جائیں"۔

میں تحصیل میں ہو کر شجاعت کے گھر پہنچ گیا۔ اُس نے پہلے تو چائے وغیرہ سے میری تواضع کی پھر پردہ کرا کے مجھے اندر لے گیا۔ میں نے جو دیکھا تو بابر کا جسم جگہ جگہ سے

نیلا پڑا ہُوا تھا جس پر تیل اور ہلدی کی سینکائی ہو رہی تھی۔

صورت سے بابر نہایت ہی مظلوم معلوم ہوتا تھا چلتے ہوئے اُس کی آنکھیں دو دو چار چار فٹ کے فاصلے تک بغور دیکھتیں جیسے کسی گمشدہ شے کو ڈھونڈھ رہی ہیں۔ مَیں نے کبھی کسی سے اُسے نظر اُٹھا کر بات کرتے نہیں دیکھا۔ نہایت کم گو اور کم آمیز انسان! محلّے میں وہ اکثر بچّوں کو پیسے تقسیم کیا کرتا چھوٹے چھوٹے بچّے اُس سے بڑے بے تکلّف تھے کبھی کبھی کئی کئی بچّے مِل کر اُسے گرا لیتے اور زبردستی اُس سے پیسے چھین لیتے بلکہ بعض بعض بچّے تو اُس کی جیب نوچ کے لیجاتے اور وہ ہنستا رہتا۔ جب بچّے اُسے زمین پر گرا لیتے تو اُس کے ہاتھ پاؤں موم سے بنے ہُوئے معلوم ہوتے تھے وُہ بچّوں کو بڑے پیار سے گالیاں دیتا مگر کبھی ہاتھ نہ اُٹھاتا۔

مَیں نے جاتے ہی بابر کو سلام کیا اور وہ منع کرنے کے باوجود اُٹھ بیٹھا پھر کہنے لگا مَیں نے کئی بار شجاعت سے کہا کہ احسان صاحب سے میری ملاقات کرا دے لیکن یہ آنے بہانے کرتا رہا، آج بھی نہ جانے کس طرح آپ کو یہاں تک لے آیا ہے۔ خیر مَیں اِسے بھی اپنی خوش بختی سمجھتا ہُوں۔

مَیں نے ہلکے سے لہجے میں شکریہ ادا کیا، اور اُسے لیٹ جانے کے لئے کہا مگر وُہ بیٹھا ہی رہا کہنے لگا ”مجھے اتنی تکلیف نہیں جتنی آپ سمجھ رہے ہیں“۔

مَیں :۔ ”بابر صاحب یہ کیا ہوا چوٹیں کیسے آئیں؟“

بابر :۔ ”آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا میں چور ہوں مگر غریبوں کی بددعائیں نہیں لیتا۔ نوابوں اور انگریزوں کا مال چراتا ہوں۔ مَیں ایک سیکنڈ کلاس کے ڈبّے سے ایک معمولی سا سوٹ کیس اُٹھا کر اترا تو خیال نہ رہا کہ گاڑی کس مقام پہ ہے اور گاڑی دریا کے پُل تک پہنچ چکی تھی وہ تو خُدا کا شکر ہے میرا ڈبّا ابھی پُل سے باہر تھا اگر کہیں پُل میں داخل ہو گیا ہوتا تو شاید مَیں زندہ نہ رہتا۔ قدرت کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہو کے رہتا ہے۔ مُقدّر

کی چوٹ تھی لگ گئی"۔

مَیں :"آپ چلتی گاڑی سے کیسے اُتر پڑتے ہیں؟"

بابر :"مَیں ذرا تندرست ہو جاؤں تو دِکھا دُوں گا"

مَیں :"مجھے یقین تو سو فیصد ہے لیکن ترکیب کیا ہے جس سے چوٹ نہیں لگتی؟"

بابر نے کہا "ہاں ترکیب ہے اور بالکل چوٹ نہیں لگتی" میرے اصرار پر بابر نے ترکیب بتائی۔ بات تو وُہ درست نکلی مگر بڑی جراُت، ہمت اور جی داری کا کام ہے۔ ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔

بابر کا کام تو اچھا نہیں تھا لیکن میں بابر کے فن اور اُس کی مردانگی کا معترف ہو گیا۔ میرے دل میں اُس کی قدر و منزلت ہو گئی اور مَیں جب تک وہاں رہا اُس کا احترام کرتا رہا صرف اس لئے کہ وُہ مَوت سے کھیلتا تھا اور اپنے فن میں باکمال تھا۔

شجاعت کو شعر و شاعری کا ذوق بھی تھا اور وہ ماحول کے اعتبار سے اچھا خاصا شعر کہتا تھا لیکن بہت کم، مہینے دو مہینے میں پانچ سات شعر کی ایک غزل کہتا تھا وہ بھی بالاقساط نہ معلوم میرے آنے کے بعد اُس کی شاعری کیا ہوئی اور اس کا کلام کہاں یا کس منزل میں ہے۔ عرصہ ہو گیا اُس کا کوئی خط نہیں آیا خُدا کرے زندہ اور تندرست ہو۔

شمعی سے ملاقات

یُوں تو میری پیاسی نگاہوں کو برسوں سے شمعی کا دروازہ چومنے کا ایک عادت بن چکا تھا اس سے لڑکپن کے نقوش اُبھرتے رہتے تھے اور بَلو اپنے کُنبے سمیت یاد آ جاتا تھا لیکن آج خلافِ معمول دروازہ کُھلا ہوا ملا۔ تمام صحن میں اسباب اٹا پڑا تھا اور کچھ اجنبی لوگ سامان کی دھر پکڑ میں مصروف تھے میں نے ذرا ٹھٹک کر نظر دوڑائی اس سے زیادہ مصلحتِ وقت نے اجازت نہ دی۔ اور میں شمعی کے ارتقا کا طوفانی تصوّر لئے ہُوئے دفتر پہنچ گیا، لیکن کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے دفتر میں بھری ہوئی گرد میرے پھیپھڑوں پر جمی جا رہی ہے۔ مَیں نے گذشتہ دن کی رپورٹ دی اور ٹیکس کے تقاضوں کی فہرست لے کر دفتر سے نکل آیا۔

یُوں تو مَیں مختلف اوقات میں کئی بار شمعی کے مکان کے سامنے سے تشنہ نگاہی سے گزرا لیکن آنکھیں محروم رہیں۔ اس سے ملاقات کا شوق مجھے بے تاب کر رہا تھا اور مَیں ایسا محسوس کرنے لگا تھا جیسے میرے جسم کی حریری جلد کے اندر بانسے[1] کے سفید پھُول بھرے ہُوئے ہیں اور بدن کی تمام تر قوتیں مجتمع ہو کر آنکھوں میں آگئی ہیں۔

دن ڈھل رہا تھا اور بدھو تنبولی پانوں پر چھینٹا لگانے کے بعد نظر بچا کر آئینے میں اپنے خدوخال کی جاذبیت کا جائزہ لے رہا تھا۔ مَیں سگریٹ پیتا پھر اُسی راہ سے منزل سے گزرا۔ میرے نیم جان قدم سنبھل سنبھل کر اُٹھ رہے تھے اور کچھ یہ خیال ہو چلا تھا کہ شاید شمعی نہیں آئی

[1] بانسا: ایک پودا ہے جس پر سفید پھول آتا ہے اور اس کے ڈنٹھل میں ایک خاص مٹھاس ہوتی ہے اور جب بانسا پھلتا ہے تو شہد کی مکھیاں اُس سے مٹھاس لیتی ہیں۔

صرف اُس کی نانی اور بچے آئے ہیں اور ان میں سے کوئی مجھے پہچانتا نہیں، اس کے باوجود نگاہوں کا شدید اصرار تھا جیسے کوئی پیاسا کبوتر دُور کی بُلندی سے نل سے ٹپکتی موٹی بوند پر نظر جمادے ما اتنے میں ایک بچے نے آکر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور باریک سی آواز میں کہا،

"آپ کو بُلایا ہے!"

"کس نے"؟ میں نے رُکتے ہُوئے لہجے میں پُوچھا۔

"آپ آئیں تو سہی"، ملازم نے شمعی کے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دِل نے کہا، ہو نہ ہو شمعی نے پہچان لیا ہے، مَیں ہونے کو تو اُس کے ساتھ ہو لیا لیکن یہ عالم تھا جیسے میرے پاؤں کے نیچے سے ریت کِھسک رہی ہے یا میں اسفنج کے فرش پر چل رہا ہوں۔ تلوے سنسنا رہے تھے اور وہ سنسناہٹ پنڈلیوں کی طرف چل رہی تھی۔ خدا خدا کر کے راستہ طے ہوا۔ شمعی مُجھے دیکھ کر اس طرح اُٹھی جیسے لپٹ جانا چاہتی ہو مگر مَیں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا اور وہ ہاتھ میں ہاتھ لئے رہ گئی۔

وقت کا تقاضا ہر موسم میں مناسب خوراک، شادابی اور جھپتی خوشبو کو ارزاں کر دیتا ہے۔ چنانچہ اب شمعی نقش و نگار کے اضافے سے قدِ آدم ماہتاب کی طرح تھی۔ ایک دو منٹ کے بعد ہاتھ کی گرفت ڈھیلی کرتے ہُوئے اُس نے سامنے والی آرام کرسی کی طرف اشارہ کیا جو اس کی مسہری سے بہت قریب بچھی ہوئی تھی۔ میں آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ مسہری کے پائینتیا نے پاندان کھول کر پان بنانے لگی، اُس نے پان بناتے بناتے گفتگو کا سلسلہ یُوں شروع کیا۔

"مَیں نے جنگلے سے کئی بار آپ کو دیکھا اور بُلانا بھی چاہا مگر نانی نے منع کر دیا کہ اتنے دن ہو گئے ہیں نہ معلوم کس طبیعت کے آدمی ہو گئے ہوں۔ ہمارے گھر آنا پسند کریں یا نہ کریں، اب وہ صحن میں تھیں تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے آپ مجھے نیند میں پکار رہے ہیں۔ مَیں اُٹھی اور گلی کی طرف گئی، آپ تنبولی کی دکان پر کھڑے کسی سے بات کر رہے تھے۔ مَیں نے ملازم

کو بھیج کر آپ کو زحمت دی ہے۔ ہم آپس میں اجنبی نہیں، لڑکپن کے شناسا ہیں اگر یہ بات خلافِ طبع ہو تو معافی چاہتی ہوں۔"

مَیں:۔ خود میری نگاہیں بھی صبح سے بے تاب تھیں نہ معلوم کیوں رہ رہ کر تمہارا خیال آ رہا تھا اور دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ جب سے تم نے چبوترے پر کھڑے ہو کر خدا حافظ کہا تھا اس دن سے آج تک تمہارا تصوّر اور خیال ناموسِ مذہب کی طرح میرے رگ و ریشہ میں اُترا ہُوا ہے۔"

"کیوں نہیں، بچپن کے ساتھی کہاں ملتے ہیں"۔ اُس نے ہنستے ہوئے کہا۔

مُجھے کوئی بات بن نہ پڑی اور ایک کونے کی طرف نظر جمائے خاموش رہا۔ اُس نے پان بناتے بناتے دو تین بار میری طرف دیکھا اور میں نے محسوس کیا کہ اس کی نرم پلکوں کی جھپکیاں میری رُوح میں پیوست ہوئی جا رہی ہیں۔ اس وقت میرا دل رہ رہ کر لرزتے ہوئے چراغ کی طرح ہلکورے⁵ لے رہا تھا۔

اُس نے پان دینے کے لئے طشتری بڑھائی مَیں نے اُس کی نگاہوں کے غیر مرئی خطوط اپنی انگلیوں تک محسُوس کئے اور ہزار ہوشیاری کے باوصف گُم شدگی کے عالم میں پان لیا۔ مُجھے کچھ ایسا محسُوس ہو رہا تھا جیسے میری آنکھوں اور شمعی کے چہرے کے درمیانی فاصلے میں کوئی کیفیت لہلہا رہی ہے جس کا دونوں سے تعلّق ہے۔

"اتنے عرصے کیا کرتے رہے"؟ شمعی نے سوال کیا۔

مَیں:۔ "چوتھی جماعت تک تعلیم کے بعد اپنے حالات کے تحت تعلیم نہ پا سکا اور یہ تشنگی اب تک سینے میں سُلگ رہی ہے۔ چوتھی جماعت تک کی تعلیم ایسی نہ تھی کہ کوئی وقیع جگہ فوراً مل جاتی، چنانچہ اپنے والد کے ساتھ کام پر جانے لگا۔ اب آ کر یہ نوبت آ پڑی ہے کہ جس مل کا نوکر ہوں وہ زندگی کو جہنم بنائے ہُوئے ہے۔ آدمی ہوں اور اپنے سے بدتر آدمیوں کے اشاروں پر بھاگ دوڑ کر زندگی گزار رہا ہوں، اُن لوگوں کے اشاروں پر جو سمندروں

⁵ ہلکورے:۔ ہچکولے، رہ رہ کر لہریں لینا۔

کی طرح بولتے ہیں اور عملی زندگی میں بدروؤں کی طرح چلتے ہیں۔"
"ایسا کیوں ہوتا ہے احسان صاحب؟ کبھی اس پر سوچا ہے" شمعی نے متجسسانہ لہجے میں سوال کیا۔
"دُوسروں کے متعلق مجھے معلوم نہیں اپنے متعلق تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عالمِ ارواح میں میری رُوح سے بھی حضرت آدم کی طرح کوئی لغزش سرزد ہوگئی ہوگی جس کی سزا میں اس زندگی کے مظالم سہہ رہا ہوں اور نہ جانے مرتے وقت تک یہ کفّارہ ادا ہوتا بھی ہے یا نہیں۔" میں نے جواباً کہا۔
شمعی نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا: "دنیا بڑی ظالم ہے۔ افسوس کہ کوئی ان بیدردوں کو روکنے ٹوکنے والا نہیں اور یہ ستمگری تمام مُلک میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ ایسا جرم ہے کہ اس کی اصلاح میرے اور آپ کے یا ہم جیسے دو چار دس بیس لوگوں کا کام نہیں یہ تو ایک وبا ہے جو معاشرے میں بُری طرح گھل رہی ہے اس کے لئے تو نفسیاتی فضا شناس ڈاکٹروں، ہوا کو پرکھنے والے صاحبانِ فکر و عمل اور مخلص لیڈروں کی ضرورت ہے۔ جسے ایک زمانہ درکار ہے، ممکن ہے کہ کئی نسلوں کے بعد لوگ ایسی فضا دیکھیں اور غریبوں کو سکون میسّر آئے ابھی تو اکیلے اکیلے ہی دست و بازو کے زور پر اس زندگی کے خُونیں دریا کو بازوؤں سے کاٹ کے عبور کرنا پڑے گا۔ اور یہاں قصبات میں اوچھے سرمایہ دار اور مغرور حاکم واقعی ملازموں سے جانوروں کی طرح کام لیتے ہیں کیونکہ ان سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔"
مَیں: "جی ہاں ان قصبات میں شرافت، محنت اور خلوص کی کون قیمت لگاتا ہے؟ وہ تو غریبوں کی جاں نثاری کو اپنا حق خیال کرتے ہیں، کیونکہ ان کے ضمیر سنّیلا میں مُبتلا ہیں اور عقائد نظر بندی میں بسر کرتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ اُسے شرافت کا نام بھی دیتے ہیں۔ حالانکہ ان کی یہ شرافت شر اور آفت کا مجموعہ ہے۔"

شمعی ذرا مُسکرائی اور بڑے ہی شیریں مگر دردناک لہجے میں بولی "جناب یہ امیر یا حاکم جنھیں آپ صاحبِ اقتدار کہتے ہیں تمام دُنیا میں یکساں ہیں۔ دولت اور اقتدار کے ساتھ اخلاق اور انصاف کا کوئی میل نہیں ہوتا میرا تو احمد آباد اور بمبئی کا تجربہ ہے، جہاں تاجروں اور حاکموں ہی سے واسطہ پڑتا تھا۔"

"تو پھر جو لوگ اُنہیں لُوٹتے اور قتل کرتے ہیں وُہ اچھّا ہی کرتے ہیں نا؟" میں نے ذرا سنجیدہ ہو کر پوچھا۔

شمعی بولی آپ تو انتہا پسند معلوم ہوتے ہیں جناب جب ایک قاتل قتل کے مقدمّہ سے بری ہو جاتا ہے تو اس کا حوصلہ اور بھی بلند ہو جاتا ہے اور پھر اُس کے لئے قتل کوئی اہم بات نہیں رہتی، آئندہ کے قتل میں دشمن کا ہونا ضروری نہیں ایسے لوگ عموماً دوستوں کو بھی قتل کر دیتے ہیں پھر اِس دَور میں تو دولت پھانسی کا بھی توڑ ہے لیکن میں آپ میں وُہ بربریّت کے آثار نہیں پاتی" شمعی نے نہایت جمے ہُوئے لہجے میں کہا۔

مَیں نے "واقعی مَیں تو بڑا بُزدل انسان ہوں جہاں تک میرے اختیار کی بات ہے۔ میں اس طبقے کو اچھّا خیال نہیں کرتا، اور ان کی طرف سے میرا دل کیسے صاف ہو سکتا ہے میرے والد زندگی بھر ان کا شکار رہے اور اب میں ان کے جبڑوں میں پھنچا ہُوا ہُوں۔"

شمعی "کبھی کبھی اس طبقے کی اصلاح عدالتوں کے احاطوں اور ڈاکٹروں کی تشخیص و تجویز سے ہوتی ہے مگر پوری طرح ان کی اصلاح و علاج سے وہ بھی معذور ہیں انہیں تو کوئی انقلاب ہی راہ راست پر لا سکتا ہے یا پھر کوئی ایسا حاکم جو با اختیار تو ہو مگر کمینہ نہ ہو۔"

مَیں ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ شمعی نے زبان کُھلنے سے پہلے ہاتھ میں ہاتھ لے لیا اور لُکنت کے باعث میری زبان بَل کھا کے رہ گئی، جذبات کے لئے الفاظ ختم ہو گئے اور ایسا محسُوس ہُوا کہ نطق کی قوّت تالو سے ٹکرا کر رگ و ریشہ میں تیر گئی۔ پھر جو مَیں نے دیکھا تو شمعی کا چہرا شگفتہ سا ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے ریت کے تودے پر پَو پھٹ رہی ہو۔

اس نے ہاتھ کی گرفت سخت کرتے ہوئے کہا "میں آپ کی ہم خیال ہوں اور اس قصبہ میں آپ کو مجھ جیسا ہم خیال نہیں ملے گا۔ آپ نے یہاں قصبے میں رہ کر دیکھا ہی کیا ہے تیسرے درجے کے سرمایہ داروں کے اوچھے حربے ہی ادٹتے رہے ہونا، سرمایہ داروں کی فطرت سے تو میں خوب واقف ہوں ان کے ہتھکنڈے تو میں آپ کو سنایا کروں گی۔ بدقسمتی سے میں طوائف ہوں اور اس طبقے کا تعلق عموماً سرمایہ داروں ہی سے رہتا ہے، اور اس ناپائیدار نزدیکی میں دونوں ایک دوسرے کو سبز باغ دکھاتے رہتے ہیں حالانکہ دونوں اپنے اپنے مورچے پر ہوتے ہیں کوئی مخلص نہیں ہوتا، نہ ہو سکتا ہے! احسان صاحب میں اس بارے میں آپ کو ایسی ایسی باتیں بتاؤں گی کہ آپ حیران رہ جائیں گے۔ آپ کو لکھنے پڑھنے سے بھی شوق ہے کچھ؟"

میں۔ "مجھے تو شوق ہی صرف کتابیں پڑھنے کا ہے اور میرے اس عیب پہ لوگ جز بز بھی رہتے ہیں"۔

شمعی۔ "آپ کو کس قسم کی یا کس مضمون کی کتابیں پسند ہیں؟"

میں۔ "اب تک تو شعر و شاعری میں اساتذہ کے دواوین دیکھے ہیں اور تاریخ کی معمولی معمولی کتابیں، چند قصے اور داستانیں جو قابلِ ذکر نہیں"۔

شمعی۔ "اچھا تو آپکو شعر و شاعری سے بھی لگاؤ ہے؟"

میں۔ "سچ پوچھو تو مجھے لگاؤ ہی شعر و شاعری سے ہے اور ٹوٹے پھوٹے شعر بھی کہتا ہوں اور اسکول کے زمانے سے کہہ رہا ہوں"۔

شمعی۔ "سبحان اللہ پھر تو خوب گزرے گی، میں بھی کبھی کبھی شعر کہہ لیتی ہوں۔ آپ روز تشریف لایا کریں۔ میں آپ کو بہت اچھی اچھی کتابیں دکھاؤں گی، لو آج ہی بکس کھلواتی ہوں"۔

میں۔ "وعدہ تو نہیں کرتا، کوشش کروں گا، بعض بعض اوقات افسران کے احکام کی تعمیل میں مجھے سرکاری روپیہ لے کر تحصیل میں جانا پڑتا ہے اور تحصیل یہاں سے پانچ کوس کے فاصلے پر قصبہ کیرانہ میں ہے اور اس آرجار میں تمام دن صرف ہو جاتا ہے۔

شمعی "وہ تو کام کی مصروفیت ہوئی ایسے میں تو مجبوری ہے۔ ویسے تو آپ گریز نہیں کریں گے نا؟"

مَیں "گریز اب میرے بس کی بات کہاں رہ گئی۔"

اُس وقت مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کے نقش و نگار کی چھوٹ[1] سے میری رُوح پسیجی جا رہی ہے اُس وقت نہ جانے کہاں سے ایک اجنبی سی خوشبو آ رہی تھی اور میرا دل تاثرات کے ٹھنڈے لوکوں میں خاکستر ہونے پر تُل رہا تھا۔ شمعی نے مُسکرا کر گردن جُھکا لی اور مَیں ایک حسین تذبذب میں غلطاں و پیچاں ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے اجازت طلب کی اور شمعی دروازے تک میرے ساتھ آئی۔ جب مَیں دوبارگی[2] سے نکلنے لگا تو اُس نے پھر کہا "آپ اب آتے رہیں گے نا؟" میں رسماً "ضرور ضرور" کہتا ہُوا بڑھ گیا۔ اس کے سوا مجھے اس وقت اور کوئی جواب بن نہ پڑا۔

مَیں گھر جا کر بڑی دیر تک یہ سوچتا رہا کہ شمعی میں اب تک طوائفیت کیوں نہیں آئی۔ اب تک اس کی رُوح میں یہ شرافت کی جھلکار کیسے باقی ہے۔ شب و روز اخلاقی تخریب کے کچوکوں میں رہنے کے باوجود یہ شرافت سے دست بردار کیوں نہیں ہوگئی؟ اِس نے عصمت کے قمار خانے اور شرافت کے نیلام گھر میں اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کیوں نہیں کر دیا؟ پھر خیال آیا کہ شاید یہ قصبہ کی پرورش اور کاندھلے کی گھُٹی کا اثر ہو، یا یہ کسی شریف کی لڑکی ہو، مگر ہر تصور اور ہر خیال خود اپنے توڑ پر آتا گیا اور کوئی فیصلہ سامنے نہ آیا۔

مَیں نے اس ملاقات کا ذکر اپنے دوستوں سے نہ کیا اور وہاں آمد و رفت شروع ہوگئی۔ وہ صبح و شام اپنے دریچے میں چق ڈالے کتاب پڑھتی رہتی جیسے باریک اور حریری جالی میں کوئی شاہکار تصویر! اُس نے مجھے کبھی سلام کا موقع نہیں دیا۔ مَیں جب بھی اس کے مکان پر جاتا وہ سلام کی میم تک آتے آتے کھڑی ہو جاتی جیسے کسی شاداب شاخ کو

---

[1] چھوٹ:۔ روشن عکس یا شعاعیں جو دُور سے کسی ایک مقام پر مرکوز ہوں [2] دوباری یعنی ڈیوڑھی یا دہلیز

صبح کی ہوا کا تیز جھونکا ٹھوکا دے کر جگا دے۔ میں جب بھی اُس سے ملتا اُس کا ایک نہ ایک جوہر ایسا اُجاگر ہوتا کہ عقل ہونٹ چاٹتی رہ جاتی۔

اُس کی انگلیاں چنبیلی کی شاخ کی طرح لچکیلی تھیں لیکن جب کبھی وہ ارادہ کر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیتی تو اُس کے جسم کے تمام فولادی عناصر اُس کی انگلیوں میں کھنچ آتے رفتہ رفتہ اُس نے مجھے پنجہ لڑانے کی عادت ڈال دی۔ میں جب تک پنجہ نہ لڑاتا میری انگلیاں بیدار نہ ہوتیں۔ جب وہ میرا ہاتھ مسوس دیتی تو کتنی کتنی دیر میری انگلیوں کو اپنے مُنہ کی بھاپ دے دے کر تھکن سے نکالتی۔ کبھی کبھی تو میں بڑی شدّت سے یہ محسوس کرتا کہ اس کی رُوح کسی مقدّس اور حقیقی غم کے لئے بیتاب ہے وہ پاکیزگی کی رنگین کہر سے نہ گھبراتی، نہ متنفّر ہوتی، جو اس کی تندرستیٔ رُوح کی علامت تھی، اُسے بے شمار منتخب اشعار ازبر تھے۔ جب وہ گفتگو میں اُنہیں موقع موقع سے استعمال کرتی تو میں جھوم جھوم جاتا۔ وہ میرے تقاضے کے بغیر مجھے گانا سُناتی اور میں دیوار پر اُس کے ہاتھوں کی پرچھائیوں میں سنہری لہریں محسوس کرتا۔ بعض اوقات تو وہ اس طرح معلوم ہوتی جیسے سردیوں میں چتا کی آگ سے نکلے ہوئے رنگوں نے برُودت سے جسم کر انسانی صُورت اختیار کر لی ہو، اور اس ہماری دُنیا کی مخلوق سے الگ تھلگ کوئی دُوسری مخلوق ہو۔

اوّل تو میں اپنے حالات سے ہی سرمایہ پرستوں اور مغرور حاکموں کی مخالفت پر تُلا ہُوا تھا اُس پر شمسی کی روز مرّہ کی گفتگو نے میرے اندازِ فکر پر اور بھی سان لگا دی۔ اب میرے مُطالعہ میں صرف وہ کتابیں رہنے لگیں جو مظلُوموں کی داستانوں اور ظالموں کے قصوّں سے پُر ہوتیں۔ شمسی کے ذخیرۂ کتب میں اساتذہ کے دواوین اور ناولوں کا ذخیرہ زیادہ تھا جو ذہنی تشنگی کا علاج تھا۔

ایک دن میں نے شمسی سے کہا "خُدا انجام بخیر کرے ہم تم بہت قریب اور بڑے بے تکلف ہو گئے ہیں" یہ سُن کر وہ سنجیدہ سی ہو گئی اور کہنے لگی کہ احسان صاحب کیا بے تکلفی

خلوص سے کوئی علیحدہ چیز ہے؛ مَیں ایک طوائف تو ضرور ہوں لیکن کیا میرے دل کو خُدا نے خلوص سے محرُوم رکھّا ہے؛ کیا مَیں شریف جذبات سے خالی ہوں! ہاں بےتکلّف ضرور ہوں لیکن کیا آپ نے مُجھے کبھی گُستاخ پایا ہے؛ آپ خود کو بھی تو دیکھیں کہ کس قدر بے لوث ہیں"۔ مَیں نے اُسے سنجیدہ سی پا کر اپنی طرف اشارہ کیا اور وہ سر جھکائے پھولوں سے لدی چنبیلی کی طرح میرے بازوؤں کے نیم دائرے میں آگئی۔ اس وقت اُس کی باچھوں سے ایسی خوشبُو پھُوٹ رہی تھی جیسے ابھی کافی پی کر آئی ہے۔ وُہ غم کی دولت سے اس قدر لبریز تھی کہ مَیں نے اس کے ہاتھ کی پُشت اپنے گال سے ملا دی تو اُس کی ہچکی بندھ گئی اور سانسوں میں ایسے اٹکاوے پڑنے لگے جو کرب و غم کی علامت کے سوا کوئی دُوسرا مفہوم نہیں رکھتے۔ اور اُن کی قدر و قیمت صاحبِ دل ہی جانتے ہیں۔

اُس کی محبّت بےتکلف تو ضرور تھی لیکن گُستاخی کی حدوں سے واقعی کوسوں دُور۔

وُہ کہا کرتی تھی "احسان صاحب ہم تُم اِس ماحول کے انسان نہیں، چلو یہاں سے دلیس نکالا لے لیں۔ مَیں تو خیر ایک بُری عورت ہوں لیکن مَیں نے علم قیافہ کا مطالعہ کیا ہے اور اُس کی رُو سے مَیں آپ میں کُچھ جوہر کُلبلاتے دیکھ رہی ہوں اور وُہ یہاں کی فضا میں صیقل نہیں ہو سکتے۔ سیاحت انسان کو بہُت کچھ دیتی ہے۔

اس کا تعلق وضعداری سے کوسوں دُور تھا۔ میرے ہوتے ہوئے اُس نے کبھی کسی کو کمرے میں آنے کی اجازت نہیں دی۔ ملازم برآمدے کے ایک کونے میں بیٹھا رہتا تھا۔ جب شمعی کی نانی کو کوئی کام ہوتا یا کوئی بات دریافت کرنا ہوتی تو نوکر چپکے سے آکر پیغام دیتا بعض اوقات جب شمعی اپنی نانی سے بات کر کے میری طرف آتی تو اس کی نانی منہ ہی منہ میں نہ جانے کیا کیا بڑبڑاتی، عمر کے اعتبار سے وہ کُبڑی ہو چکی تھی اور سر کے بال کنگھی سے اپنی سیاہی کھو چکے تھے مگر اس کی کانی آنکھ زہریلے شعلے کی طرح روشن ہی رہتی، اُس کی چھاتیاں قصاب کی دکان کی میلی صافیوں کی طرح ہو چکی تھیں اُس کے دل میں

انسانی عظمت کے دریچے یا تو تھے ہی نہیں یا تیغہ کر دیئے گئے تھے، وہ تمام دُنیا کو خود غرض اور ہوس پرست خیال کرتی تھی۔ نئے اُمرا کی خوشنودی کے لئے قدیم شرفا کو نظر انداز کر دینا اس کا زندگی بھر کا شیوہ تھا۔

شمعی میرے حالات میں میرے لئے اسی طرح تھی جیسے قیدیوں کو خوش رکھنے کے واسطے جیلر اُن کے لئے ڈرامے وغیرہ کا تفریحی پروگرام بھی روا رکھتے ہیں تاکہ سارے دن کی جانگداز مشقت اُنہیں جینے سے بیزار نہ کر دے۔ قید خانے کے عملے کو اچھّی طرح معلوم ہے کہ نغمہ اور حسن سے بڑھ کر رُوح کی بالیدگی کے لئے کوئی شے نہیں اور اس تحریک و تجویز کے پیچھے کوئی بڑا دماغ نظر آتا ہے۔

ہم دونوں تنہا تنہا چائے پینا قریب قریب بھول چکے تھے جب دونوں مل کر چائے پیتے تو بہار کے خوابوں کا سا عالم طاری رہتا جیسے گرد و پیش آہستہ آہستہ فضا میں گھُل رہے ہیں اور ماحول پر خوشبوؤں نے گھیرا ڈالا ہوا ہے۔

ٹیکس کے تقاضوں میں شفیق پارٹی کے اراکین اور میں مل جُل کر کام کیا کرتے جس سے دفتر کے کام میں تو ہرج نہ ہوتا مگر کسی ٹیکس دہندہ کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ محکمے کا اصل ملازم کون ہے۔

رفتہ رفتہ شمعی کی نانی کو مجھ سے کچھ دِلی بُغض سا ہو گیا۔ اُس کے جھُریوں سے پٹے ہوئے چہرے پر سکّوں کی ہوس اور خدوخال میں فریب کے گوشے بولتے تھے۔ ایک دن میں نے ایک جھڑپ سُنی۔ اُس کی نانی بڑے ہی تلخ لہجے میں اس سے کہہ رہی تھی کہ "آخر وہ کلوا چپراسی تیرے پاس کیوں آتا ہے؟ اور تو اُسے لے لے کر علیحدہ کیوں بیٹھتی ہے؟ آخر تیرا کیا ارادہ ہے بتا تو سہی؟ سونے کے ڈھیروں پر لات مار آئی اور اب یہاں قصبے میں تین پیسے کے چپراسی سے پھنس رہی ہے۔"

شمعی "نانی آخر اس سے آپ کو کیا غرض؟ روٹی کھائیں کپڑا پہنیں، مجھے آپ نے اپنی کمائی کی کون سی جاگیر بخش رکھی ہے یہ سب کچھ میرے ہی فن کا کرایہ تو ہے جس پہ

سب پل رہے ہیں، آخر تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟"
شمعی کی نانی۔ "فن کا کرایہ! ادھر بے لڑکی تیرے منہ میں تو اُس کلوے کی زبان بھی آگئی، اپنی بات چیت بھی بھول گئی!"

مجھے دیکھ کر دونوں خاموش ہوگئیں اور شمعی کے خدوخال مرجھا سے گئے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئی، اس وقت اس کی سانسوں کا یہ عالم تھا جیسے اس کا سینہ تپکتے ہوئے چھالوں سے بھرا ہوا ہو اور انھیں گرد آلود ہوا لگ رہی ہو۔

"یہ کیسا شور مچا رکھا ہے۔" میں نے آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔"
شمعی۔ "احسان صاحب، نانی جان چاہتی ہیں کہ مجھ سے یہاں بھی ٹکے کموائیں۔ بھلا یہاں کون ایسا رئیس ہے جو میرے فن کو پرکھے گا اور تحسین کی صورت میں روپیہ دے گا؟

خدا جانتا ہے کہ مجھے تو اس پیشے ہی سے نفرت سی ہے۔ میں نے تھیٹر کمپنیوں اور راجواڑوں میں گا گا کر اتنا سرمایہ کرلیا ہے کہ اپنی مختصر سی عمر معمولی آسائش سے گزار سکوں۔ بھلا مجھے زندگی بھر ذلت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔" یہ کہتے کہتے وہ یکدم خاموش سی ہوگئی اور دیر تک میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبائے کانپتی رہی۔ اُس وقت وہ اپنے تمام ترکرب سے نہائے ہوئے جذبات کو میری روح پر انڈیل دینا چاہتی تھی، اس نے اپنے دونوں ہاتھ منہ پر ڈھک لئے غالباً وہ خود کو اپنے سے چھپا کر میرے مطالعہ و اختیار کے سپرد کر دینا چاہتی تھی، ایک لمبی سانس لے کر وہ مسہری پر گر گئی جیسے رنگ اور خوشبو کا مرقد!

پھر اچانک معافی طلب لہجے میں کہنے لگی، "احسان صاحب خدا کے لئے آپ کچھ اور نہ سمجھ لیں، رفتہ رفتہ یہ سب راستے صاف ہو جائیں گے، ایسا بھی ہوا ہی کرتا ہے۔"

یہ فقرہ اُس نے نہایت بیکسانہ انداز میں کہا اور ایک لمحہ خاموش رہ کر نہایت پُرجوش آواز میں بولی، "دیکھئے۔ اگر آپ مجھ سے ملنے میں عار نہیں سمجھتے تو میں خوش قسمت ہوں، اور

یقین دلاتی ہُوں کہ اب میں طوائف نہیں اب میں خود کو کرایہ پر نہیں چلا سکتی۔ لیکن ابھی آپ ایک ایسی مظلوم عورت سے مل رہے ہیں جس کے چاروں طرف ناگ پھنی ہی ناگ پھنی ہے۔"
اُس وقت اس کی نانی کی طرف سے میرے خون میں زہر اُونٹ رہا تھا مگر میں نے خود کو سنبھالا اور کمر کے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر اس کا شانہ پکڑ لیا اور اُس نے میرے بازو پہ گردن ڈال دی جیسے ایک زرد شیرازی کبوتری ہاتھ میں مر جائے۔

شمسی کی جاں نثاری اور اپنے افلاس کا گٹھ جوڑ دیکھ کر میرے بھی آنسو بھر آئے کیونکہ بعض اوقات حالات کے سائے غموں کی دُھوپ کو اور بھی شدید کر دیتے ہیں، اور سینے میں اونگھتا ہُوا درد دہکنے لگتا ہے جب اُس نے میری برستی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو آنسوؤں کے نمک میں دست بوسی کی شیرینی کا جاون لگا دیا جس سے اوباشوں کو وحشت اور کھرے لوگوں کو سُرور ہو جاتا ہے۔ وُہ بعض اوقات اپنی گفتگو میں زندگی کے ایسے ایسے نیم روشن اور دھندلے پہلوؤں پر بھی جھلکی ڈال جاتی جس سے اُس کے تجربے اور مشاہدے کا پتا چلتا اور میں انگشت بدنداں رہ جاتا۔

ایک دن ہم دونوں ایک دُوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دالان میں ٹہل رہے تھے وہ اُسی طرح مجھے باورچی خانے کی طرف لے جانے لگی، میں اس کی نانی کی عادت کو دیکھتے ہُوئے ذرا جھجکا، مگر اُس نے کڑک کر کہا "آپ کہاں ہیں؟ کیا فکر کر رہے ہیں؟ آپ کسی کی پروا نہ کریں! نہ تو میں نابالغ ہوں اور نہ محتاج! یہ گھر اور اس میں جو کچھ ہے سب میرا ہے اور بفرضِ محال مجھے یہاں سے کچھ بھی نہ ملے تو بھی میں آج نہیں، اسی وقت جا کر دو ڈھائی ہزار پر کسی بھی کمپنی میں ملازم ہو سکتی ہوں۔ میرا خدا میرے ساتھ ہے جس نے مجھے فن عطا کیا اور آواز بخشی ہے۔"

میں نے اُسے تسکین دی اور یقین دلایا کہ "میں اس بات سے متاثر نہیں جو تم سمجھ رہی ہو، میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ میری تقدیر کے دونوں پلّے کس قدر غیر متوازن ہیں۔ تم کہیں

اِسے بھُول تو نہیں رہی ہو کہ مَیں چپڑاسی ہوں اور قلیل تنخواہ میں ایک کُنبے کا کفیل ہُوں!"

شمعی نے جواباً کہا "مَیں جانتی ہوں جو آپ ہیں اور یقین دلاتی ہوں کہ آپ چپڑاسی ہرگز نہیں، اور اس ذلّت کے لئے دُنیا میں نہیں آئے آپ کے ہاتھ کی لکیریں مجھ پہ آئینہ ہیں۔ مَیں نے چپڑاسی بھی دیکھے ہیں اور افسر بھی، مزدُور بھی دیکھے ہیں اور ٹھیکیدار بھی مَیں اپنی قیافہ شناسی اور نا تمام سی دست شناسی کے یقین پہ زندگی داؤں پر لگالے کو تیار ہوں۔"

شمعی روز مجھے اپنی زندگی کے واقعات سُناتی جس سے معلوم ہوتا کہ وُہ مجھ سے بھی زیادہ مظلوم ہے اور کسی بد رنگ دُھند سے نکل کر میری پناہ میں آنا چاہتی ہے۔ وہ فطرتاً شریف اور اصیل عورت تھی۔ بعض وقت تو وہ اپنی خود فروشی کے مسخ اور تخریب رسیدہ ٹکڑوں کو اس کرب اور نفرت سے بیان کرتی کہ رات کی رانی معلوم ہوتی، ہم جب بھی ایک دوسرے سے جُدا ہوتے ایسا محسُوس ہوتا جیسے وُہ مجھے کوئی ایسی امانت، دینا چاہتی ہے جس کی حفاظت کے لئے کرب کا لوبان سُلگانا ضروری ہوگا۔ وُہ پرانی بانبیوں میں گھرا ہُوا ایک شفّاف چشمہ تھی۔ بعض اوقات مصائب کی دُھوپ کے اثر سے اُس پر میری اخلاقی روزہ داری بھی منڈلانے لگتی، لیکن میرے خاندانی روایات، زندگی کے مشاہدات اور گھریلو گرفت میرے سامنے محشر بپا کر دیتی، اور عقبیٰ کا یقین اس قسم کے ارتکاب کی ایک پَل کو بھی اجازت نہ دیتا۔ مگر شمعی ایسی چیز نہیں تھی کہ اُسے یکسر بھُلا دیا جاتا یا نظر انداز کر دیا جاتا۔ اس کے حالات کی ایک ضخیم کتاب میرے دماغ میں موجُود ہے وہ ایک ایسا ادبی، ثقافتی اور سماجی ذخیرہ ہے جس میں آہوں عبرتوں اور پائمالیوں کے سوا کچھ نہیں۔ اگر کبھی موقعہ ملا اور زندگی کے مہلک سلوک نے فرصت دی تو انشاء اللہ سپردِ قلم کروں گا اور وُہ ایک خدمت ہوگی انسانیت کی۔

رقص کا تاثر

شمعی سے نزدیک ہو کر مجھ پر یہ انکشاف بھی ہُوا کہ رقص و نغمہ سے صرف دل ہی گداز نہیں ہو جاتا، اُس سے ہاتھ پاؤں میں بھی لوچ آ جاتا ہے، طبلہ کی تال پہ ہاتھ پاؤں میں خود بخود حرکت جاگنے لگتی ہے جس میں انسانی ارادے کا دخل نہیں

بانبی:۔ سانپوں کی رہنے جگہ جہاں عموماً مٹّی کے چھوٹے چھوٹے شیوالے سے بنے ہوتے ہیں۔

ہوتا، اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہاتھ پاؤں کے حرکات و سکنات بھی ایک زبان ہے جیسے ہاتھ پاؤں ہی سمجھتے ہیں۔ ساز کا لہرا رقص میں ایک ایسا بہاؤ پیدا کر دیتا ہے کہ اگر اس میں موسیقی کا جادو بھی شامل نہ ہو تو بھی ہاتھ پاؤں اپنا پیغام مخاطب کے دل و دماغ تک پہنچا دیتے ہیں اور اس طرح بھی رقّاص کا مقصد پورا اور فن کا اظہار مکمّل ہو جاتا ہے۔
شمعی نے بتایا کہ رقص ایک تحریر بھی ہے جو ہاتھ پاؤں کے اشاروں سے کبھی فضا میں اور کبھی فرش پر کنایوں سے لکھی جاتی ہے اور گردن کی تمام حرکات ماترائیں سمجھی جاتی ہیں، اس طرح ایک رقّاص اپنے مخاطب سے جو جی چاہے کہہ سکتا اور پیغام دے سکتا ہے۔
شمعی جب رقص کرتے کرتے تھک کر میرے پہلو میں گر پڑتی تو میرے بدن میں زعفران سا بھیگ جاتا اور میں ایسا محسوس کرتا کہ میرے سامنے رنگا رنگ پھولوں کے ڈھلوان ہیں جن کے پس منظر میں اونچی نیچی پہاڑیوں کا سلسلہ بادلوں تک چلا گیا، لیکن بحمد اللہ اس عالم ہوش رُبا میں کبھی میرا ہاتھ بے ٹھکانے نہیں پڑا اور مشاہدے میں گم رہا۔
وہ ناچتے ناچتے پسینے میں شرابور ہو جاتی تو اس کی بلوریں چھتوں کے عکس پسینے کی بوندوں میں ستاروں کی طرح ناچنے لگتے۔ وہ ذرا دم لے کر پھر ناچنے لگتی اس عالم میں وہ ہلکی ہلکی نَے میں ایسا گاتی جو الفاظ سے بلند صرف آواز کے زیر و بم ہی سے تخلیق ہوتا تھا۔ اس مترنم رقص میں اس کے ہونٹ جنبش سے بیگانہ رہتے ایک آواز تھی جو اس کے سینے سے اُٹھ کر گلے کی شہنائی سے ہوتی ہوئی نتھنوں میں آکر نغمہ بنتی تھی۔ اس وقت وہ نہ جانے کہاں پہنچ جاتی کہ اُس پر آسیب زدگی کا شک ہونے لگتا، آنکھوں کے پپوٹے بھاری رخساروں پر تپتی ہوئی سُرخی اور ماتھے پر پسینے کی نمی! شاید ایک فنکار کا کمال اسی طریق اظہار سے مکمّل ہوتا ہے۔ بہر نوع اُس وقت وہ اِس دنیا کی نہیں کسی دوسری دنیا کی شے نظر آتی تھی۔ اُس کے بند ہونٹوں سے بے لفظ نغمہ اور اس کے ساتھ مرمریں بانہوں کے لوچ سے قوسیں کھینچنا اور دائرے لگانا اہلِ دل اور مذاقِ سلیم رکھنے والے

کے لیئے بڑا ہی جان لیوا فن تھا۔ اُس وقت اس کا دل ایسا دھڑکتا جیسے کوئی پیاسا کبوتر پانی کو دیکھ کر چونچ کھولے لخر لخر کر رہا ہو اور اس قسم کا رقص و نغمہ رات کے اُس حصّے میں ہوتا جب دُنیا نیند میں ڈوب جاتی ہے، رقص کے بعد چائے آجاتی، اور چائے پیتے پیتے نیند پپوٹوں سے اُتر کر اس کی پلکیں بوجھل کر دیتی اور یہ عالم اُس کے چہرے میں اور ہی افسونی قوّت بھر دیتا، یہ شمعی تک ہی محدود نہیں جب حسین آنکھوں میں نیند رچتی ہے تو حُسن کا جادو اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔

کانجی ہاؤس

دفتر والوں کی نظر سے میری ملازمانہ بے راہروی زیادہ دیر نہ چھُپ سکی چنانچہ جب میرے متعلق دفتر میں یہ پتا چلا کہ ٹیکس دہندگان میں دُوسرے لوگ تقاضے کرتے ہیں اور یہ چپراسی رنگ و بُو کی دُنیا میں گُم رہتا ہے تو اُنھوں نے مجھے ٹیکس کے شعبے سے ہٹا کر کانجی ہاؤس پر تعینات کر دیا۔ اب نہ بازاری کی آمدنی بھی گئی اور ہمارے گھر کے چار آدمیوں کے لئے یہ صرف آٹھ روپے ماہانہ رہ گئے۔ اس پہ طرّہ یہ کہ دِن رات کی ڈیوٹی۔ مجھے گزارے کی فکر ہوئی۔ بزرگوں اور دوستوں سے انتہائی مراسم ہونے کے باوجود میرے افلاس کی غیرت مندی محفوظ تھی مَیں نے شفیق پارٹی میں جاکر اپنے نئے تقرّر کی خبر سُنائی۔

اِس فرحت افزا خبر سے سب کی باچھیں کِھل گئیں کہ اَب تو ہر ہفتہ ایک بکری آیا کرے گی، مَیں گھبرا گیا اور ہڑبڑا کر کہا "میاں میں تو وہاں چپراسی کی حیثیت سے محرّر کے تحت ہُوں۔"

"رات کو تو محرّر نہیں ہوتا تم رسّی پکڑا دیا کرنا ہم خود لے آیا کریں گے"۔ بیک زبان کئی ممبروں نے کہا۔

"وہاں تو ہر راس رجسٹر میں درج ہوتی ہے مَیں وہاں سے کوئی بکری وکری نہیں دے

سکوں گا۔ کیا آپ سب نے مجھے جیل بھیجنے کی ٹھان لی ہے"؟ میں نے ترشروئی سے کہا۔

"رجسٹر میں درج شدہ کون مانگتا ہے؟ ارے ہم تو اُن کے متعلق کہہ رہے ہیں جو محرّر کے گھر چلے جانے کے بعد داخل ہوں گی اور جن کا اندراج نہیں ہوگا"! ایک ممبر نے تمسخرانہ انداز سے کہا اور پھر مشترکہ قہقہے کے ساتھ حقّہ آگیا۔

تیسرے روز مجھے معلوم ہوا کہ بالائی آمدنی تو کانجی ہاؤس پر بھی ہے۔ یہاں بھی باقاعدہ حصّہ ملتا ہے اور جانوروں کی خوراک سے آدمیوں کے پیٹ پلتے ہیں لیکن میری گھبراہٹ دُور نہ ہوئی۔

تین روز تو شمی نے انتظار کیا چوتھے روز اپنے ملازم کو رقعہ دے کر گھر بھیجا۔ گھر سے دفتر کا پتا لگا اور دفتر والوں نے ملازم کو کانجی ہاؤس پر بھیج دیا۔ رُقعے میں لکھا تھا "خدا کرے آپ بخیریت ہوں کئی دن سے کیوں نہیں آئے۔ فوراً پہنچیے"۔ منتظر

میں نے اسی پرچے کی پُشت پر جواب لکھ دیا کہ "معتوب ہوگیا ہوں۔ کانجی ہاؤس پر رات دن کی ڈیوٹی لگ گئی ہے۔ دن کو دفتر اور رات کو مویشیوں کی چوکیداری کرتا ہوں کام کم مگر ذمہ داری زیادہ ہے۔ انشاءاللہ آؤں گا مطمئن رہیں"۔

رات کے گیارہ بجے ہوں گے چاند اُفق کی مشرقی مُنڈیر سے آدھا اُبھر چکا تھا، روشنی کانجی ہاؤس کی دیواروں کو عبور کرکے سامنے کے پیپل پر پڑ رہی تھی جیسے شعاعیں پتّوں سے پھسل کر زمین پر ٹپک رہی ہوں۔ شمالی جانب بھگوتی والے باغ سے ملا ہوا جوہڑ چاندنی سے آدھا سفید ہو چکا تھا اور مشرق کی طرف مدرسے کے برابر والی مسجد ٹھنڈی سانسیں لے رہی تھی۔

دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ کانجی ہاؤس میں مویشی داخل کرنے والے لوگ رات کو بھی تنگ کرتے رہتے تھے۔ اس لئے میں نے کرخت لہجے میں کہا، کون؟

مگر جواب ندارد۔ پھر دستک۔

کون ہے ؟ میں نے پھر کڑک کر پوچھا۔
چینخنی تو کھولئیے! ایک آشنا آواز۔
میں فوراً پہچان گیا شمعی کی آواز میں نسائی جھنکار کے ساتھ ایک جرأت مندانہ حوصلہ بھی تھا جس نے اُس کے سراپا کو میری نظر میں اور بھی محبوب بنا رکھا تھا۔ میں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ شمعی زرد ریشم پر سلمہ ستارہ کے کام کی دُلائی اوڑھے پیپل کے تنے سے لگی جگمگا رہی تھی۔ میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے دفتر کی طرف اشارہ کیا۔ قدم اُٹھانے سے پہلے اُس نے میرے دائیں ہاتھ کی پُشت پر اپنے دونوں ہونٹ ثبت کر دیئے اور مجھے محسُوس ہُوا کہ شمعی نے نائیلون کی سرنج سے زعفران کا انجکشن لگا دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں چہروں میں کوئی فاصلہ نہ رہا آخر اُس نے کھرکھرائی آواز سے کہا۔ کیسی طبیعت ہے آپ کی؟ اب جو میں نے اُس کا چہرہ دیکھا تو میری پریشانی اُس کے چہرے پر اُتر رہی تھی۔
وہ ڈیسک سے کمر لگا کے بیٹھ گئی اور سامنے والے طاق سے لیمپ کی بسنتی روشنی اُس کی پیشانی پر لہریں کھاتی رہی، جیسے کسی چشمے پر شام کے زرد سُورج کی روشنی۔
ابھی اُسے آئے ہوئے پون گھنٹہ کے قریب ہی ہُوا تھا کہ ملازم آیا اور کہا چلو نانی بُلا رہی ہیں!
جاؤ میں لے کر آؤں گا! میں نے شمعی کے جواب دینے سے پہلے ہی کہدیا اور پھر اُسی طرح لطیف حرف و حکایات کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ سامنے تھانے کے گھڑیال نے ایک بجایا! ابھی اُس کا ٹھنا کا شاید اپنی گم شدگی کی حد کو بھی نہیں پہنچا ہوگا کہ شمعی نے کہا۔ اوہو ایک بج گیا ہے۔
ہاں بس چلئے۔ میں نے اُس کے خیال کی تائید میں کہا۔
میں دروازے کو بند کرنے لگا اور شمعی آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلنے لگی۔ میں نے

دُلائی: بہت ہلکی قسم کی رضائی (تلائی)

کہا۔ آہستہ بلو اندھا قانون اور اُس کے بے ایمان محافظ ہر وقت شکار کی تلاش میں رہتے ہیں ان میں حرام و حلال کا امتیاز نہیں ہوتا۔ ان کے یہاں بدمعاشوں سے زیادہ شرفا کا خون منہ لگا ہوتا ہے اور کمینے افسرانِ ارتکابِ جرم سے نظر ہٹا کر غائتِ جرم پر بہت کم نظر ڈالتے ہیں۔

اَب آسمان پر کہیں کہیں بھورے ابر پارے آچکے تھے اور کچے راستے کی ٹھنڈی مٹی ایسی معلوم ہوتی تھی کہ چاندنی، پارے کا سفوف بن کر برس رہی ہے۔

میں شمعی کو اُس کے مکان پر پہنچا کے پورے سوا نجے کانجی ہاؤس واپس آگیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ محبت میں رُوح کی تشنگی جسمانی اطمینان سے زیادہ پُرکیف اور دِل کی آگ پھولوں سے زیادہ سکون پرور ہوتی ہے۔ راستے کے درمیان پھیلی ہوئی بالیاں مُردہ اژدہوں کی طرح نظر آ رہی تھیں اور نیند کی گھمیر میں کھوئے ہوئے عوام خرّاٹے لے رہے تھے۔ دروازہ کھولتے ہی سامنے سے تھانے کے سنتری نے آواز دی،

”میاں احسان ہمیں بھی گھر چھوڑ آیا کرو نا!

”جب تم اس مقام پہ آؤ گے تو تم سے بھی یہی ہمدردی ہو گی“۔ میں نے کھسیانا ہو کر کہا۔

صُبح کے دس بجے تک یہ خبر سپاہی سے لے کر تھانہ دار تک ہو آئی اور گیارہ بجے کے قریب ہمارے دفتر میں بھی کانا پھوسی ہونے لگی۔ ہر شخص متعجب تھا کہ کہاں احسان، اور کہاں شمعی؟ کوئی بات بھی ہو! کیسے باور کیا جاتے؟

کسی کو یقین نہیں آتا تھا، مگر شور و غوغا تھا کہ بڑھ رہا تھا۔ جو سُنتا انگشت بدنداں رہ جاتا۔ میں گزرتا تو لوگوں کی آنکھیں چلنے لگتیں اور مسکراہٹوں کا لین دین شروع ہو جاتا۔

میں علی الصبح شمعی کے مکان کی طرف گیا تو اُس کی نانی کی کرخت آواز اذیت رساں ناز بیانے کی طرح گونج رہی تھی کیونکہ اس کی گندی اور مجرمانہ زندگی اُس کے

محاسن کو کھا چکی تھی۔ اس کا اخلاق گندہ اور خلوص بکھد ہو چکا تھا۔ میں نے درز میں سے جھانکا تو شمعی ننگے پاؤں صحن میں اس طرح پھر رہی تھی جیسے پر شکستہ تتلی پیاور میں رینگ رہی ہو وہ کہہ رہی تھی کہ ہمیشہ کے لئے میں خود کو اِس الاؤ میں نہیں ڈالوں گی۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔

میں نے دستک دی۔ دروازہ کھل گیا اور گھر کا گھر خاموش ہو گیا۔ شمعی کا چہرہ اُس وقت ایسا ہو رہا تھا جیسے سیلاب اپنی گذرگاہوں میں جگہ جگہ جھاگ اور پیلی مٹی چھوڑ جاتا ہے۔

مُجھے وہ اپنے کمرے میں لے گئی اور میری گردن میں باہیں حمائل کر دیں، میں نے محسوس کیا کہ میرے ہاتھ بازوؤں تک گلاب کی پتیوں میں ڈوب گئے۔ اُس کے چہرے پر شگفتگی کی جگہ ویرانی نے لے رکھی تھی اور خشک ہونٹ گلاب کی پتیوں کی طرح خاموش تھے۔ میں نے پُوچھا کیا بات ہے؟ شمعی نے کہا وہی پُرانی داستاں کلکل، مگر پرواہ کریں یہ سلسلہ ابھی اور چلے گا۔

میں دفتر کے خیال سے اُس کے ہاتھ کو آنکھوں سے لگا کر باہر نکل آیا۔ دفتر میں جاتے ہی محرّر نے مجھ سے دریافت کیا "کیوں میاں احسان تمہاری تو بڑی شہرت ہے" میں نے کہا میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں لیکن یہ عرض ہے کہ نوکری میں میں نے وقت بیچا ہے خود نہیں بک گیا ہوں۔ یہاں میری دن رات کی ڈیوٹی ہے اس لئے میری زندگی کی ہر ضرورت یہیں پوری ہوگی اور میرا ہر دوست یہیں آئے گا۔ میں ہی کیا ذرا انصاف سے سوچیں کہ اگر آپ بھی چوبیس گھنٹے دفتر میں رہیں تو یہی بات کیا آپ نہیں کریں گے؟

وہ یوں تو مجھے کچھ نہیں کہہ سکے مگر دفتر میں بات بات پر میری مخالفت شروع ہو گئی۔ انہیں کیا خبر کہ محبت میں انسان دُنیا کے لعن طعن معاشی خسارہ اور

نہ بکھد: ناکارہ۔ فرسودہ۔ گیا گذرا۔ ئہ درختوں سے سُوکھ کر گرے ہوئے پتے۔ برگ ہائے خزاں رسیدہ۔

مذہبی حرف گیری کی پروا نہیں کیا کرتا وہ تو پہلے ہی سوچ لیتا ہے کہ مُرّت کے سائے ہیں مشکلوں سے دست و گریباں ہونا اور جھنجھلائے ہوئے عناصر سے ہم چشمی کا دوسرا نام زندگی ہے۔

اوّل تو کانجی ہاؤس پر ایسی آمدنی نہیں تھی کہ مَیں مطمئن رہ سکتا۔ اس کے علاوہ کہیں سے میری والدہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ احسان کو تنخواہ کے علاوہ تھوڑی بہت بالائی آمدنی بھی ہے۔ اُنھوں نے مجھے مغرب کی نماز کے بعد گھر بُلوا بھیجا۔

مَیں گھر پہنچا تو سلام کے جواب کے بعد تھوڑی دیر تک تو والدہ خاموش رہیں پھر ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کہا "احسان تم جانتے ہو کہ ہم ایک وقت کھا کر بھی گزارا کر لیتے ہیں اور فاقوں میں بھی شکر کرنے سے غافل نہیں ہوتے، بیٹا تم ہمیں بوڑھاپے میں حرام روزی کھلا کر ہماری عاقبت کیوں خراب کرتے ہو؟ ہم نے تو تمہارا بچپن اپنے پاک خون سے سینچا ہے اور تمہاری پرورش اَکلِ حلال سے کی ہے، اس سلوک کا بدلہ یہ تو نہیں کہ تم ہماری عاقبت ہی خراب کر دو۔

ان کا یہ عالم دیکھ کر میری آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور مَیں نے اُن کے سامنے معافی کے بعد قسم کھائی کہ مَیں آئندہ کبھی اس قسم کے پیسے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، والدہ نے میری پیشانی پر بوسہ دیا اور میرے سامنے چنگیری لا کر رکھ دی، اس میں جو روٹیاں تھیں وہ ماش کی دال کے چھلکوں کو پیس کر آٹا اور نمک مرچ ملا کر پکائی ہوئی تھیں مَیں نے کھانا شروع کر دیا۔

دیکھو کیسی مزے دار روٹیاں ہیں ہم زبان کے ذائقے کے لئے ایمان کیوں خراب کریں بیٹا؟ میری والدہ نے نہایت مشفقانہ لہجے میں کہا۔

والدہ کی باتوں سے مجھے ندامت ہو رہی تھی، اب مقررہ تنخواہ کے علاوہ ہر وُہ پیسا میرے لئے حرام تھا جس میں کسی صورت سے بھی کوئی غلط پہلو نکل سکے، یا میری نظر میں

دائرۂ جواز سے باہر ہو۔ کئی بار جب پیسے کی تنگی ہوئی تو خام خیالی نے مشورہ دیا کہ کچھ لے لیا جائے مگر ہر بار والدہ کے چہرے کی گُتھی ہوئی جھرّیاں میری آنکھوں میں پھر گئیں اور میں کانپ گیا اور بعض اوقات تو اس تصوّر سے بھی خود بخود میری آنکھیں بھر آئیں۔

ہفتے عشرے کے بعد مجھے کانجی ہاؤس سے پھر دفتر میں طلب کر لیا گیا اور وُہی پہلی چپراس کی جگہ مل گئی میں حیران تھا کہ آخر یہ مجھے کون سی جگہ رکھیں گے۔

استعفیٰ

قصبے میں میرے تعلقات اور زود آمیزی کے باعث دفتر کے کسی آدمی کو مجھ سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ سیکرٹری صاحب نے بظاہر تو مجھے کچھ نہ کہا مگر ان کا رویّہ کچھ بدلتا سا چلا گیا، غالباً وہ کانوں کے کچّے تھے ورنہ خاندانی لحاظ سے وہ پست نہیں تھے۔ ایک دِن مجھے روپیہ داخل کرنے کے لئے تحصیل کیرانہ جانے کا حکم ہُوا۔ ہلکی ہلکی پھُوار پڑ رہی تھی۔ مَیں نے کہا اگر بارش تیز ہوگئی؟ ہیڈ کلرک نے کہا یہ بارش زیادہ نہیں ہوگی، بادل ہلکے ہیں۔ قہرِ درویش بر جانِ درویش، مَیں نے روپیہ لے کر جھولے میں ڈالا، اور چھتری لے کر چل کھڑا ہوا۔ کوئی میل بھر گیا ہوں گا کر ایک دَونگڑا[۵] پڑ کے بادل صاف ہو گیا۔ درختوں کے بھیگے ہُوئے پتّے دُھل کر سُورج کی روشنی سے جھلکنے لگے۔ راستے کے نشیبوں میں پانی سفید ریشم کی بکھری ہوئی کٹ پیس کی طرح نظر آ رہا تھا۔ راستے کے دو طرفہ درخت ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے یہ بھی کبھی انسانی مخلوق یا مسافر ہی تھے۔

مَیں ابھی نصف راستے تک پہنچا تھا کہ ایک بھنگی بھاگا ہُوا آیا اور کہنے لگا کہ واپس چلو۔ چالان بھرنے میں کچھ غلطی ہوگئی ہے۔ مجھے بڑا غصّہ آیا اور مَیں نے کلرک کا نام لے کر پانچ سات فحش گالیاں بک ڈالیں۔ واپس آیا تو کلرک نے بغیر کسی اظہارِ افسوس اور ندامت چالان کی غلطی بیک جنبشِ قلم درست کر دی اور مجھ سے کہا ”بس جاؤ اب داخل کرآؤ۔“

مَیں نے کہا۔ مَیں اپنی ڈیوٹی دے چکا ہُوں۔ اب دُوسرے چپراسی کو بھیجو۔ کلرک

---

۵ دَونگڑا:۔ تھوڑی دیر کی چلتی جاتی بارش۔

نے آنکھیں نکال کر طنطنے سے کہا "تمہیں ہی جانا ہوگا" میں نے کہا یہ بے انصافی ہے،
میں اسے قبول نہیں کرتا۔ اصول اور قانون کی بات مانتا ہوں۔ اس وقت میں ایسا محسوس
کر رہا تھا کہ یہ چپراسی اور کلرک دو بدو نہیں بلکہ کمزوری اور قوت کے درمیان گفتگو ہے۔
میں نے سوچ لیا تھا کہ آج یہ اپنی حدود سے بڑھا تو میں بھی اس سے نپٹ کر ہی دم لوں گا۔
لیکن تارا چند تہ بازاری کے محرر اور آسا رام محرر کانجی ہاؤس نے مجھے کلرک کی دشمنی کا نقصان
اور اس کی دم سمجھائی ہیں مصلحتاً خاموش ہو کر رہ گیا اور تھیلا اٹھا کر تحصیل کو روانہ ہو گیا۔

جب میں چل پڑا تو اس کلرک نے مجھے آواز دی اور کہا تھیلا رکھ دو اب میں ابھے رام
کو بھیج دیتا ہوں۔ تم تھک جاؤ گے میں نے کہا نہیں نہیں، میں ہی جاؤں گا۔ میرا نمبر ہے
ابھے رام بیچارے بوڑھے آدمی کو کیوں تکلیف دیتے ہیں۔ اتنا کہہ کر میں چلا آیا۔ کیرانہ تحصیل
میں جا کر روپیہ داخل کر دیا اور رسید لے کر فوراً واپسی کی سوچی۔ اس دن میری طبیعت بڑی
رنجیدہ سی تھی چنانچہ فوراً کاندھلے کی سڑک پکڑی۔ دن ڈھلاؤ پہ آگیا تھا۔ فاختاؤں کی مغموم
آوازیں ہواؤں میں مل کر دل تک کام کر رہی تھیں۔

راستے میں اونچے گاؤں سے نکلتے ہی ایک ڈھاک کا ڈرا بیہڑ پڑتا تھا جب گرمیوں کا
موسم شباب پر ہوتا تو نارنجی پھولوں سے جنگل بھر جاتا اور ایسا معلوم ہوتا کہ ڈھاک
کی ہر شاخ پر شعلے آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ میری فطرت ایسے ایسے مناظر
سے مجھے آواز دیتی معلوم ہوتی تھی۔ میں وہیں نہر کے پل پر بیٹھ کر چلتے ہوئے پانی پر نظریں
جما دیتا جس سے پل بہاؤ کی مخالف سمت کو دوڑتا ہوا نظر آتا اور پہروں اس سے
لطف اندوز ہوتا۔ میں آہستہ آہستہ چار پانچ بجے تک دفتر پہنچ گیا لیکن دل میں ایک قسم کا
غبار سا بھرا ہوا تھا جس میں تشویش کا عنصر بھی تھا۔

جب دفتر میں مجھ پر سختی ہوتی تو ایسے موقعوں پر اصغر جنگ[1] کے بعض فقرے سامنے
آجاتے اور میرے دل کی تلخی شیریں ہو جاتی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ شرابی کا نشہ اس قدر

[1] افسوس کہ اصغر جنگ کا انتقال ہو چکا، اس کی نگاہیں اب بھی اپنے خواب کی تعبیر دیکھنے کے لئے منتظر ہوں گی۔

ناپاک اور نقصان رساں نہیں ہوتا جتنا دولت کا غرور اور منصب کا پندار۔ اصغر جنگ کبھی کبھی مجھے یہ ایں الفاظ تسکین دیتا کہ یہ بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کو اپنی کمائی کا آلہ خیال کرتے ہیں کیونکہ ابھی انھوں نے کوئی انقلاب نہیں دیکھا، اور نہ اب سے تیس چالیس برس تک اِس کا کوئی اِمکان نظر آتا ہے۔ اس عرصہ کے بعد کچھ آثار اُبھریں گے اور وہیں سے انقلابات کی داغ بیل پڑ جائے گی! اور بہت جلدی تعمیری صورت اختیار کرلے گی۔ کاش اس وقت تک ہم تم جیتے رہیں اور اُس دَور کو دیکھ لیں تاکہ آسانی سے دم نِکلے۔

اصغر جنگ کی ان باتوں نے میرے لئے ایک تربیت کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ اس نے میری زندگی کو نازک مزاج مگر سخت جان بنا دیا تھا۔ دفتر والوں کی مخالفت سے میرا یہ حال تھا کہ جیسے ہر وقت میرے جسم میں زہریلا غم سُلگ رہا ہو۔ ایک دن دفتر سے واپسی پر مَیں اصغر کے یہاں چلا گیا اور دفتر کے عملے کی شکایت کی تو اُس نے لال پیلا ہو کر کہا کہ تمہیں ہزار بار تو کہہ دیا ہے کہ ان لوگوں سے رحم و انصاف کی اُمّید حماقت ہے یہ تو ہماری تمہاری قسمت میں ایک ذلّت کا دَور ہے، اسے گزار دو۔ اِن منہ زور اور ہرپادر[1] نِدول کی طرف نہ دیکھو۔ یہ تو عوام کے خون کی پیداوار پر پلتے ہی رہیں گے۔ یہی ایک فن تو انھیں لئے پھرتا ہے۔ اُن کے اندر کا اِنسان تو مدّت ہوئی جسم بدر ہو چکا ہے اور ان کی زندگی کے محاسن بگڑ چکے ہیں۔ یہ تو ہم تُم سے بالکل مختلف لوگ ہیں نہ تُم جیسے مکانوں میں رہتے ہیں نہ تم جیسا کپڑا پہنتے ہیں۔ نہ ان کے یہاں شادیاں اور تہوار عوام کی طرح ہوتے ہیں نہ اُن کا مذہب عوام کا مذہب ہے۔ یہ اپنے حِصّے کی حقیقتوں کی زبان تراش ڈالتے ہیں اور اِن کے کان اخلاقی اصُولوں کو نہیں پہچانتے۔ مَیں سُنتا رہا اور دل کو تقویّت سی پہنچتی رہی۔

دفتر میں آکر اچانک ہیڈ کلرک سے پھر جھونٹ[2] ہوئی اور مَیں نے جل کر کہا کہ یہ ذلیل چپراس

(بقیہ ص ۱۸۲) وہ حقیقی معنوں میں انقلاب پسند آدمی تھا۔ وہ دولت کی سفّاکی اور انسان کی مظلومی دونوں پر گہری نظر رکھتا تھا۔ اصغر جنگ کا لڑکا محمود جنگ اب کاندھلہ میں اچھّا طبیب ہے نہ جانے اُسے باپ کے خیالات کا ورثہ کہاں تک پہنچا ہو گا [1] ہرپادر۔ لاوارث۔ آزاد۔ چالاک اور مَرکھنے چوپائے جو بلا امتیاز عوام کے کھیتوں کو چرتے اور خراب کرتے ہیں [2] جھونٹ:۔ جھگڑا۔ تلخ کلامی

میرے لئے طرّۂ امتیاز نہیں ہے۔ مزدور کا بیٹا ہوں، اور مزدور کے لئے دُنیا کا گوشہ گوشہ کُھلا ہوا ہے۔ اِس گفتگو کے خاتمے پر دفتر کا وقت ختم ہونے سے پہلے ہی میں اس ادارے سے سبکدوش ہوگیا۔ منشی آسا رام اور تاراچند وغیرہ نے ہمدردی کے تحت مجھے بُہت روکا مگر میں تو اس دریا میں کشتی ڈال چکا تھا جس میں غرقابی ساحل رسی کی شرطِ اوّل ہے۔ اُس وقت میرے بدن میں برداشت کی حدوں سے باہر لے جانے والا تشنج آچکا تھا، مگر میں نے بمشکل تمام خود پر قابو پالیا۔

آزادی کے چند روز

اَب میں آزاد مگر متفکر انسان تھا۔ والد کی عمر روز بروز ضعیفی کا دامن کھینچ رہی تھی۔ اس ذہنی کشمکش کے تحت شفیق پارٹی میں بھی جانا کم ہوگیا۔ قاضی صاحب بُلوا بُلوا کر بھیجتے مگر میں ہفتوں میں ایک آدھ بار جاتا۔ وہ مجھ پر پھبتیاں بھی کستے جن میں محبّت کا پہلو ہوتا اور میں پی جاتا۔ مگر میری تنہائی میں اُن کے فقرے خود بخود میرے کانوں میں گونجنے لگتے۔ کبھی کبھی تو میں دِل پر جھٹکے سے محسُوس کرتا اور پہروں میرے سامنے یہ ذہنی عدالت لگی رہتی۔ کیونکہ میرے سامنے ناگفتہ حالات میں عمر کا سفر تھا۔

ایک دن قاضی صاحب نے بُلا کر چُپکے سے کہا کہ جب تک تم بے روزگار ہو تمہارے گھر کے لئے خورد و نوش کا سامان یہاں سے جائے گا۔ مگر میں نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا کہ ابھی میں ان منزلوں میں نہیں اگر خدانخواستہ ایسا موقع آگیا تو عرض کر دوں گا۔

میرے والد صاحب کو اُس وقت لالہ بُدھ سنگھ نے اپنے باغ میں میٹ کی حیثیت سے رکھ لیا تھا۔ موصُوف اُن کی بہت عزّت کرتے تھے۔ والد نے لالہ سے اجازت لے کر مجھے بھی مزدوروں میں رکھ لیا اور گزارا ہونے لگا۔ یہ کام تو چند روز میں ختم ہوگیا لیکن والد وہیں رہے۔ میں تمام مشکلوں کے باوجُود یہ ضرور جانتا تھا کہ میرے والد کی یہ عمر ملازمت کی نہیں۔ یہ صرف زندگی کی مجبُوریاں ہیں جو ضعیفی کو نوکری پر مجبُور کر رہی ہیں۔ کئی بار دل میں آیا کہ کہیں آنکھ بند کر کے نکل جاؤں اور جلد از جلد کوئی کام سیکھ کر اپنے والدین کو حتی الوسع آرام

پہنچاؤں۔ آخر یہاں کیا دھرا ہے؟ انسان کسی خاص مٹی یا آب و ہوا کا پابند تو نہیں اس کی فلمیں تو ہر زمین میں بار آور ہو جاتی ہیں لیکن گردش کے بھی تو حدود ہوتے ہیں اور فطرت کا لمحہ لمحہ اپنا ایک پروگرام رکھتا ہے۔

کچھ تو مطالعہ کی کثرت کے باعث اور کچھ خود ساز لوگوں کے حالات پڑھ پڑھ کر میری قوتِ عمل اور ذہنی بیداری، گرد و پیش کے ماحول اور اس موجودہ پستی کو حقیر سی جاننے لگی۔ اب میں دن رات سوچتا اور دُعائیں مانگتا رہتا کہ الٰہی جلد مجھے کوئی مناسب ماحول عطا فرما۔

شمعی نے کئی بار میری معاشی حالت پر گفتگو کرنا چاہی مگر میں اس سلسلہ کے ہر موڑ پہ گریز کرتا رہا اور میرا سخت جان افلاس کبھی بے پردگی پر آمادہ نہ ہوا۔ شمعی ان تمام باتوں کو سمجھتی تھی لیکن وہ شاید کسی موقع کے انتظار میں تھی اور چاہتی تھی کہ میری طرف سے کوئی بات چلے۔

معطر زخم

جب شفیق پارٹی کے کئی ارکان اللہ کو پیارے ہو گئے تو کچھ ایسی غم انگیز ہوا چل رہی تھی کہ کوئی شخص بھی اپنی جگہ خوش نہ تھا۔ اقرار کی اچھی خاصی پختہ منگنی معمولی سی خاندانی چپقلش سے ٹوٹ گئی اور وہ میرٹھ چلا گیا۔

اقرار کی منگیتر کے والدین رسم و رواج کے لوگ تھے۔ عرصہ تک تو اس پھول کی خوشبو کے پیغام ٹھنڈی ہواؤں کے ذریعہ قصبے کے کانٹے دار جھاڑ جھنکاڑ کو مہکاتے رہے آخر لڑکی پتھر کا اچار تو ہوتی نہیں، دُور پرے کے عزیزوں میں ایک نوجوان صارف نامی سے اس کی شادی طے پا گئی جو کسی اسکول میں مُعلّم تھا۔ اس کی لسانی کیاریاں تو لالہ و گل کو شرماتی تھیں لیکن وہ زمین سے اُبلا ہوا ایک ایسا کاریز[1] تھا جس کا کھاری پانی اپنی کھیتی کو بھی سیراب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ مگر مردوں کی صف میں رہنے کے لئے اپنی اس خامی کے اظہار سے معذور تھا یا خوف زدہ۔

مہینوں پہلے سے ڈومنیوں نے ہمسایوں کی نیند حرام کر دی کبھی تو آلیوں کا ہنگامہ

---

[1] کاریز: وہ چشمہ جو کہیں زمین کے اندر اندر بہے اور کہیں زمین کے اُوپر اُبل کر بہنے لگے۔

ہوا اور کبھی ڈھلتی رات میں ایسے ایسے نیم عریاں راگ الاپے گئے جن سے اتفاق: شگفتہ اور بے انواسے[1] کورے ہنڈوں میں سچے موتی رینگنے لگتے ہیں

ہر چند کہ اس محلے کی فضا میں عورتوں کی آواز کا باہر آنا تو درکنار باہر پھیرنے والی عورتوں سے آنکھ ملانا بھی گناہ میں داخل سمجھا جاتا تھا، لیکن بیاہ شادی کے موقعوں پر احتیاط کے ساتھ ڈومنیاں بے جھجکے کے گیت بھی الاپ جاتی تھیں۔ شاید اس لئے کہ معصوم و ناتجربہ کار جوانیاں اپنے اپنے فرائض سے آشنا ہو جائیں اور زندگی کے مخصوص گھریلو پہلو نظر میں آ جائیں۔ جو دو جسموں کو ایک جان کر دیتے ہیں۔

آخر وہ دن آ گیا کہ دو خاموش اخلاق و حیا کے ملزم رسم و رواج کی زنجیروں میں گرفتار ہو گئے اور شادی کے نام پر آس پاس سے آئی ہوئی لڑکیوں اور ڈومنیوں کی ساختی عورتوں نے ساری رات دھما چوکڑی مچائی، ڈھولک کی گت کی یکسانیت اور اُس پر کھٹ کھٹ کی مسلسل ٹھیک نے دماغ بلبلا کر دیا۔

شادی کا ہنگامہ ختم ہو گیا اور سب کو نصیبوں کا لکھا مل گیا۔ ڈومنیاں بیل پر لڑ جھگڑ کر رخصت ہو گئیں۔

عافیہ نئی نویلی دلہنوں کے لگے بندھے اصول و آداب پر چلنے لگی۔ کچھ روز تو گھونگھٹ اور گوشے چلے اور پھر رفتہ رفتہ تمام شریف عورتوں کی طرح گھر کا کام کاج کرنے لگی۔

ہر تیسرے چوتھے دن سر کے تیل کے لئے شور مچانا، چولہے پر تتہڑے[2] کی نمائش، اور بھیگے ہوئے گھٹنوں تک لمبے بالوں کو صحن میں پھیرا کرنا اُس کا معمول سا ہو گیا تھا۔

کبھی کبھی بڑی بوڑھیوں کی پیشانیوں کی شکنیں ناگواری کا اعلان بھی کرتیں لیکن اس خیال سے چپ ہو جاتیں کہ جوانی ہے آخر دیوانگی کی اور کون سی رت آئے گی۔ اُنھیں کیا خبر تھی کہ کھانے اور کپڑے کی آسودگی کی تہ میں اُس کی دائم الصوم اُمنگیں کس قیامت سے گزر رہی ہیں۔ اُس کی رُندھی رُندھی آواز اور اُترا اُترا چہرہ کبھی کبھی اُس کے کرب کی

---

[1] انواسا: کورے برتن کو تین دفعہ پانی سے دھو کر استعمال کے قابل کر دینا۔ [2] تتہڑا: وہ گھڑا جس میں علی الصبح نہانے اور منہ دھونے کے لئے پانی گرم کیا جاتا ہے۔

غمازی تو کرتا مگر عورتیں خیال کرتیں کہ راتوں کو زیادہ جاگنے سے چہرے کی رونق اونگھنے لگی ہے
عافیہ پان نہیں کھاتی تھی مگر اس کے باوجود اُس کے پتلے پتلے ہونٹ گلاب کی پتیوں کی طرح چکنے اور رنگین رہتے تھے جب کوئی لڑکی پان سے اس کی تواضع کرتی تو وہ سلام کرکے خاموش ہو جاتی اور طشتری آگے بڑھا دیتی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ عافیہ کی امنگوں اور خواہشوں کو تو دیس نکالا ملا ہوا ہے، شوخ چنچل ہم عمر لڑکیاں برابر ہنسی مذاق کا موبل آئیل اس کے کانوں میں بھرتی رہتیں اور وہ اُن کی چھیڑ چھاڑ کو کسیلی دوا کی طرح پی جاتی۔
عافیہ دن رات کشیدہ کاری اور سینے پرونے میں لگی رہتی اور جب اُسے عورتیں اپنے سے قریب کرنے کی کوشش کرتیں تو بڑے بودے اور ضعیف حیلوں حوالوں سے دامن بچا جاتی۔ مگر اُس کے بشرے سے محرومی کے اُترتے ہوتے پارے کو کوئی محسوس نہ کرتا۔
صارم تمام دن اسکول کے بچوں میں رہتا اور شام کو گھر آتا تو فوراً سیر کو نکل جاتا، اس کے ساتھ آئے دن نئے دوست ہوتے، ہنسی مذاق کے باوجود صارم کے چہرے پر اُس کی اُمیدوں کی علالت اور پیشانی پر مسرتوں کے سورج کی کجلائی شفق بولتی، لیکن ہماری سوسائٹی کے پاس وہ آئینے کہاں جن سے جذبات کو پڑھ سکیں وہ لوگ تو ان زبوں حالات اور جرم و گناہ کو عموماً نیکی اور تقوےٰ بتاتے ہیں وہ آنکھوں کی تتلائی ہوئی آواز کو نہیں سمجھتے نفسیات کے عمل سے خدوخال کو اُجاگر کرلینا اور آنکھ ناک کے اُتار چڑھاؤ سے زندگی کے نشیبوں میں جھانکنا اُن کے بس کی بات کہاں ہے؛ وہاں تو احکام شریعت اور رسم و رواج کے مبہم اندازوں پر کاروبار چلتے ہیں۔ روحانی علالت کی نشان دہی کرنا اور مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنا تو صاحبِ فکر لوگوں کا کام ہے۔
صارم اُستاد ہونے کے باوجود کبھی مجھے ڈھب کا انسان نہیں جچا۔ گفتگو میں نہ تو اس کا اقرار قد آور تھا اور نہ انکار تناور، یہ گومگو کا عالم کب تک رہتا رفتہ رفتہ اُس کے

احساسِ کمتری نے چپکے سے اس کا اعلان بھی کر دیا۔ کیونکہ بعض حقائق ضبط کے احاطوں اور دلوں کے اندھیروں سے نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں اور اُن کا آہستہ آہستہ اظہار ہوتا ہے چنانچہ اُس نے چوروں کی طرح اپنا علاج معالجہ بھی کیا مگر کچھ حاصل نہ ہُوا۔

عافیہ سے یوں تو حویلی بھر کی عورتیں خوش تھیں اور اُس کے سلیقے کی تعریف کرتی تھیں لیکن اُس کی کم آمیزی سے دلوں میں بہت سے سوال پیدا ہو گئے تھے اور اس کی ہر سہیلی ایک تذبذب سے گزر رہی تھی، آخر میں یہ خیال طے پا گیا کہ وہ شوہر کے سوا کسی کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتی، کئی بار اُس کی ساس نے اُسے بڑی محبت سے سمجھایا مگر وہ جواب میں "ہوں، ہاں" کر کے خاموش ہو گئی، حکم کی تعمیل کے لئے دو چار دن تو حویلی میں آنا جانا رہا مگر پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔

عافیہ صوم و صلوٰۃ کی پابند تھی اور آخر میں تو وہ اوراد و وظائف میں رُندھ گئی تھی وہ جانتی تھی کہ رُوح کی پاکیزگی جسم کو بھی متقی کر دیتی ہے اور زبان و جسم کی لذت پسندی روح کو اخلاقی رخنہ اندازی کی ذلت تک لے آتی ہے، خیرات و زکوٰۃ اس کا محبوب مشغلہ ہو گیا تھا، غریبوں کی امداد میں وہ یہاں تک آ گئی تھی کہ اس نے اپنی شادی کے جوڑے سے ایک بیوہ کی لڑکی کو دلہن بنا دیا، فقیر کی آواز کان میں آتی تو اُس کے بٹوے میں پیسے کلبلانے لگتے اور وہ دیوانوں کی طرح دوڑ کر بھیک دیتی۔

اُس کی عمر اُس منزل میں تھی جب جسم کا رونگٹا رونگٹا حساس ہو جاتا ہے اور رات دن ارتقائی انگلیاں شباب کی چٹکیاں بلاتی رہتی ہیں۔ اُس کا کاجل زمانہ سازی کی کناری سے تو پاک تھا مگر اُس کی سانسوں میں عصمت کا خسارہ بولتا تھا۔ جب وہ کسی سائل کو کچھ دیتی تو اُس کی نگاہ ایک خاموش سجدہ ہوتی اور چہرے پر تشکر کے آثار جیسے وہ سائل کی ممنون ہو رہی ہو۔

کبھی کبھار اُس کے ہاتھ پاؤں میں شرم و حیا کا تشنج اور انگلیوں کے پوروں کی

چیخ اُس کے جذبات کی ہلکی سی ترجمانی کرتی مگر اُس ماحول میں یہ زبان کون سمجھتا اور ان پیاس کی شدت سے گونگی رعنائیوں کا مفہوم کس کے پلّے پڑتا ہے

اُس کی بیاہی راتیں نظر بندی کے دنوں کی طرح گزر رہی تھیں لیکن ہونٹوں کے ٹانکے بدستور تھے آخر اُسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھوڑے ہی دنوں میں اس کی خوراک روٹی کی جگہ دوائیں ہو گئیں، علاج معالجہ برابر جاری تھا مگر اُس کی رُوح کا علاج اس دُنیا میں کیسے ممکن تھا؟

عافیہ کی ماں اُس کی بیماری کو دیکھ کر وہیں اُسی کے پاس رہنے لگی تھی جس سے دیکھ بھال میں کمی نہ ہو۔

ایک دن شام کے چار بجے ہوں گے اُس کی والدہ اُس کا سر زانو پر لئے بیٹھی تھی کہ خود بخود عافیہ کی پلکوں پر آنسوؤں کا بادل اُتر آیا جیسے شیشے پر بارش کی بوندیں رُکی رہ گئی ہوں، اُس کی ماں نے شفقت بھرے ہاتھ سے اُس کی پیشانی سہلاتے ہوئے پُوچھا! کیا ہے بیٹا؟ عافیہ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا" امّی جان اگر میں مر جاؤں تو میری چھوٹی بہن کی شادی ان (حارف) سے نہ کرنا۔ میں نے یہ سات سال کنوار پتے میں گزارے ہیں تاکہ محلّے کے لوگوں میں اُنھیں شرمندگی نہ ہو اور آپ کی نصیحت کے مطابق شوہر کے گھر سے جنازہ نکلے! خدا کا شکر ہے میں ثابت قدم ہوں، میں اُنھیں اپنا مہر بھی مُعاف کرتی ہوں"

شام نوعروس بیوہ کی طرح سُرخ دوپٹا اوڑھے زمین پر اُتر رہی تھی اور شفق کے زعفرانی پردے پر نیلے بادلوں کی چھائیاں پڑ رہی تھیں جیسے صرافے سے کالے عَلَم گزر رہے ہوں، عافیہ نے اپنی بوڑھی ماں کا جھریایا ہوا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا اور کلمہ پڑھتے ہوئے آخری ہچکی کے جھٹکے پر دَم دے دیا۔ اُس کی ٹھنڈی پیشانی مرمر کی طرح سفید ہو گئی تھی جس سے بھوؤں اور پلکوں کی سیاہی اَور اُبھر آئی تھی

صارف کو مردانے[1] میں رونے کی آواز گئی تو اُسے یقین ہو گیا کہ عافیہ کو بچ کر گئی وہ پچھاڑ کھا کر گر پڑا مگر چڑیاں کھیت چُگ گئی تھیں۔

عافیہ کا کمرہ خاموش، آئینہ ششندر اور سنگار کا سامان لاوارث رہ گیا تھا اس کی مسہری اُجاڑ پڑی تھی، جیسے کوئی اوقاف میں آئی ہوئی خانقاہ!

صارف کچھ دنوں بعد بھوپال چلا گیا وہاں اُسے کوئی اچھی ملازمت دستیاب ہو گئی تھی۔ نہ جانے پھر کیا ہوا۔

نمبر اندازی

جیسے موت اور گاہک کا کوئی وقت معیّن نہیں اسی طرح مزدور کو بھی اپنی مزدوری کا دار و مدار خدا پر ہی چھوڑنا درست معلوم ہوتا ہے۔ میری عمر ابھی مزدوری اور فکرِ معاش کے مراحل ہی طے کر رہی تھی، کبھی چار دن مسلسل کام لگا رہا، کبھی ہفتہ ہفتہ بیکاری میں گزر گیا۔ یونہی ناہموار حالات میں دن گزرنے گئے۔

ایک دن والد صاحب نے مجھے ڈانٹا کہ ”آخر دُنیا مزدوری کرتی ہے تمہیں مزدوری کیوں نہیں ملتی“۔ مَیں خاموش کھڑا تھا، کیا کرتا؟ میرے بس کی بات تو تھی نہیں۔ ڈپٹتے ڈپٹتے والد صاحب نے کہا ”تم اچھے لوگوں کی صحبت میں نہیں رہتے، مجھے خدشہ ہے۔ تمہیں کوئی اور لپکا نہ پڑ جائے۔ خود کو سنبھالو اور ہوشمندی سے کام لو بعض لوگوں میں پہلے ہی تمہارے متعلق اچھے خیالات نہیں“۔ مَیں سُنتا رہا اور سمجھ سوچ کے کُڑھتا رہا پھر سوچا شمعی کے پاس چلوں وہاں کچھ تو غم غلط ہو گا۔ لیکن پھر والد صاحب کے الفاظ کی تلخی رگ و ریشہ میں ایسی گھُلی کہ میں سر پکڑ کے بیٹھ گیا پھر یک بیک جی میں آئی کہ اس شہر ہی سے نکل چلو۔ اللہ مالک ہے، مُلکِ خدا تنگ نیست۔ چنانچہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور گھر سے صرف ایک چادر لے کر چل پڑا، والدہ سے صرف اتنا کہا کہ نہانے جا رہا ہوں نہر پہ!

مَیں نہر جمن کے پُل پر پہنچا تھا کہ محکمۂ نہر کے رینجر یار محمد خان ملے، اُنھوں نے پُوچھا کہاں جا رہے ہو میاں؟ مَیں نے رُک کر جی دار لہجے میں کہا ”فرمایئے“؛

---

[1] مردانہ: بیٹھک

"ہمایں پل کھیڑی[1] سے لے کر برّوت[2] تک نہر کے درختوں کی نمبر اندازی کرانا ہے اگر کر سکو تو ڈیڑھ آنے سینکڑہ ملے گا" انھوں نے فیصلہ طلب انداز میں پوچھا۔

"ہاں ہاں کیا مضائقہ ہے، اگر پیشگی کیا دیجئے گا؟" میں نے جواب میں کہا۔

"جو چاہو لے لو! پھر ہفتہ وار حساب ہوتا رہے۔ دو بیلدار تمہیں اور ملیں گے جو تم سے آگے آگے پرانے نمبر چھیلتے اور نئے نمبروں کے لئے جگہ بناتے جائیں گے اور وہی تمہاری روٹی بھی پکائیں گے"۔ رینجر صاحب نے کہا۔

"بہت اچھا، فی الحال دس روپے دے دیجئے" میں نے ذرا دبے دبے لہجے میں کہا۔ رینجر صاحب نے اسی وقت دس روپے نکال کر دے دیئے۔ میں فوراً گھر آیا اور والدہ کو سات روپے دے کر کہا نہر پر کام مل گیا ہے اب ہفتے عشرے میں گھر آیا کروں گا برّوت تک درختوں پر نمبر ڈالنا ہیں۔ والدہ نے منہ ہی منہ میں کچھ دعائیں دیں اور میں نے نہر کے بنگلے پر جا کر کولتار کا ڈول اور کھجور کا قلم اٹھالیا، شام تک بارہ آنے کا کام کیا، لیکن غلطی ہوگئی کہ ایک فرلانگ کا پتھر نظر سے اوجھل ہونے کے باعث ایک فرلانگ میں دو فرلانگ کے نمبر شامل ہوگئے اور صرف سات آنے کا کام رہ گیا۔ مگر میں نے اس پہ بھی خدا کا شکر ادا کیا کیونکہ مجھے گھر کی طرف سے قدرے اطمینان تھا، دوسرے دن صبح سے جو جان توڑ کر محنت شروع کی تو شام تک ڈیڑھ روپے کی مزدوری ہوئی اور جب تک کام ختم ہوا یہی اوسط رہا کبھی کچھ کم کبھی زیادہ۔

میں صبح کاذب میں بیدار ہو جاتا اور آسمان کے چاروں طرف دیکھتا رہتا جیسا اذان کی آواز تندرست روحوں کو بیدار اور بیمار روحوں کو تھپکیاں دے کر غافل کر دیتی ہے اس وقت میرے چاروں طرف کے اجزاء اپنے کل کی طرف مخاطب ہو جاتے اور کل ہر جزو کو آغوش میں لیتا ہوا نظر آنے لگتا۔

---

[1] پل کھیڑی ایک گاؤں ۔ [2] برّوت ایک قصبہ۔

اکثر اوقات جب میں شیشم کے درختوں کی خشک تنا ور پر بچھی ہوئی سابوں کی بندگی دار چادر کو کھوندتا ہوا جلدی جلدی قدم اُٹھاتا تو سوکھی ہوئی پتّیاں میرے پاؤں کے نیچے چرچرانے لگتیں۔ کہیں کہیں خشک پتوں کے نیچے پتلی پتلی خشک شاخیں بھی کڑکڑا کر رہ جاتیں، مگر میں مصروفِ کار رہتا۔

ایک دن بیلداروں نے جو مجھ سے آگے آگے نئے نمبروں کے لئے پُرانے نمبر چھیلتے جاتے تھے، شہد کی مکھیوں کے چھتّے کو چھیڑ دیا، وہ تو جلدی جلدی آگے بڑھ گئے، میں جب نمبر لگاتا ہوا اُن جھاڑیوں کے قریب پہنچا تو کئی مکھیاں مجھے لپٹ گئیں، میں نے گھبرا کے کولتار کا برتن رکھ دیا اور گنکا سا کھیلنے لگا، مگر خیر گزری زیادہ مکھیوں نے میرا پیچھا نہیں کیا اُدھر قریب کے کھیت سے ایک کسان سُلگتا ہُوا اُپلا لے کر میرے پاس آ کھڑا ہوا۔ دھوئیں کے اثر سے پھر کوئی مکھی میرے قریب نہیں آئی اور یُوں اَور بھی آسانی سے پیچھا چھوٹ گیا کہ وہ چھوٹی مکھیوں کا چھتّا تھا۔

جب تک نمبر صحیح پڑتے میں کام نہ چھوڑتا مگر عموماً سورج ڈوبنے سے ذرا پہلے کام ختم کر دیتا۔ اور قیام گاہ تک پہنچتے پہنچتے جھٹ پٹا ہو جاتا، کبھی پُرانے درختوں کی کھوکھلوں سے اُلّو کی آوازیں آتیں تو بوڑھے اور بیمار درختوں کی کراہیں معلوم ہوتیں اگر کوئی دُوسرا اُلّو قریب کے درخت پر آ بیٹھتا اور دونوں میں تبادلۂ آواز شروع ہو جاتا تو ایسا لگتا جیسے چڑیلیں اپنے سوکھیا مسان والے بچّوں کو لوریاں دے رہی ہیں اور اندھیرا پسلی کے درد سے گھر گھرا رہا ہے۔

ایک دن نمبر لگاتے لگاتے میں نے دیکھا ایک درخت کے ٹہنے کی جڑ میں کوئی چیز چمک رہی ہے جیسے کئی سفید اور سنہری مچھلیاں ایک جگہ ہو گئی ہوں۔ میں درخت پر نمبر لگا کر الگ سے کھڑا ہو کر دیکھنے لگا مگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئی، آخر میں اُس سے ذرا اور قریب ہو گیا۔ پھر بھی بات نہ کُھلی کہ آخر اتنی چمکیلی اور بے حس کیا شے ہو سکتی ہے؟

اتنے میں نہر کی پٹڑی سے ایک مسافر گزرا، میں نے اُسے بھی مخاطب کر لیا اور وُہ بھی اُس معمّے میں میرا شریکِ حیرت ہو گیا۔ ہم دونوں قیافے پر قیافے لگا رہے تھے مگر کوئی ٹھکانے کی بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اتنے میں پانچ سات بھینسیں لیئے ایک بیوپاری آیا، ہم نے اُسے بھی اپنی پریشانی بتائی۔ اُس نے بھینسیں روک لیں، پہلے تو ہماری طرح وُہ بھی متعجب سا ہُوا، پھر اُس نے ایک ڈھیلا اُٹھا کر تاک کے اُس جگہ مارا وُہ نشانہ تو نہ بن سکا مگر جب اس کے قریب ڈھیلا گودے میں لگ کر ٹوٹا اور چُورا اس پر گرا تو چُورا پڑتے ہی اس میں جنبش ہوئی اور ایسا معلوم ہُوا کہ ایک چربی کی چمکتی ہُوئی موٹی آنت پیٹوں بہتی ہُوئی چل رہی ہے۔ ہم تینوں میں سے کسی نے بھی زندگی میں اس رنگ کا سانپ نہیں دیکھا تھا۔ وُہ اس قدر خوبصورت تھا جیسے کسی ماہرِ فن نقّاش نے چاندی کے تاروں کی رسّی پر نقش و نگار کھود رکھے ہوں، جہاں جہاں اس پر سُورج کی روشنی پڑتی تھی آنکھیں چکا چوندھ کر دیتی تھی وُہ پگھلے ہُوئے آئینے کی طرح لہراتا ہُوا چری کی طرف گیا اور پھننگوں میں جا چھپا۔ بیوپاری نے خوفزدگی کے عالم میں کہا۔ بھاگو بھاگو یہ تو بڑا خطرناک سانپ ہوتا ہے، اُڑ کر کاٹتا ہے اڑکرا، وہ دونوں تو جلدی جلدی آگے بڑھ گئے اور مَیں نمبر اندازی میں مصروف ہو گیا۔ بڑی دیر تک مجھ پر اُس کی دہشت طاری رہی مگر جب وُہ روپہلی نقش و نگار سامنے آتے تھے تو ایک بار پھر دیکھنے کی آرزو جاگتی تھی۔ مگر واپسی پر اس تصوّر سے رستے ڈراؤنے ہو جاتے تھے۔

کھیتوں کی گرم و سرد سانسیں شام کی ٹھنڈک اور چاروں طرف کا حریری دھندلکا ستاروں کی بارگاہ میں قصیدہ خواں سا معلوم ہونے لگتا۔

دو تین روز بعد مَیں دن کا کام ختم کر کے بیلداروں کے ساتھ قاسم پور کھیڑی کے بنگلے پر جا رہا تھا کہ مشرق کی طرف سے ایک بادل اُٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے حدِّ نظر تک جنگل اندھیرے کی فصیل میں آ گیا، اور جھجھاتی بجلی تڑتڑانے لگی ایک تو شام اس پر دبیز

گھٹا ایسا اندھیرا ہوا کہ سیاہی سے نگاہیں اَٹ گئیں زمین اور آسمان کے درمیان تاریکی ہی تاریکی بھری معلوم ہونے لگی۔ رہ رہ کر بجلی کی جھلک ماحول کی آنکھ سی جھپکا دیتی جیسے کوئی دُور سے آئینے کا عکس پھینک رہا ہو۔ اُفقِ بعید سے بادل کی گڑگڑاہٹ مسلسل آ رہی تھی جیسے آسمانی پہاڑوں میں کوئی فرقہ وارانہ فساد ہو گیا ہو، چٹانیں لڑ رہی ہوں اور قوت و جبروت کے فرشتے اُن کی ہڈیاں توڑ رہے ہوں۔

میں اور میرے قُلی اپنی بساط کے مُطابق لپک تو رہے تھے مگر بادلوں کی گھڑگھڑاہٹ ہمارے ساتھ جھپٹ رہی تھی۔ بنگلہ دُور تھا ہلکی ہلکی بُوندیں شروع ہو گئیں ہم سب بھاگے مگر تھوڑی ہی دیر میں راستے کی زرد مٹّی کے گارے سے جُوتے بھاری ہو گئے۔ ہم نے جُوتے اُتار کے ہاتھوں میں لے لئے۔ کوندا لپکتا تو راستے میں بھرے ہوئے پانی کے بُلبلوں میں آرتی سی اُترتی معلوم ہوتی۔ خدا خدا کرکے ہم بنگلے پر پہنچے اور بھیگے ہوئے کپڑے نچوڑ نچوڑ کر پھیلا دیئے ہوا کے خنک جھونکے اس قدر تیز آ رہے تھے کہ مجھے تو کپکپی چھُٹ گئی اور دانت سے دانت بجنے لگے۔ قُلیوں نے جب میری یہ حالت دیکھی تو انھوں نے دفتر کھلوا کر محرّر کی چوکی پر سے دری نکالی لیکن یہ اہتمام کرتے کرتے وہ بھی تھر تھر کانپنے لگے آخر ہم نے دری اوڑھ کر دروازہ بند کر لیا۔ بند کواڑوں کے باوجود ایسا لگتا تھا کہ جھکّڑ ناخنوں سے در و دیوار کو نوچے ڈالتے ہیں اور ہوا کا زنّاٹا درختوں کی بانہیں مروڑ کر نچوڑ رہا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا کہ آج کی بارش ٹین کے چھپّروں کو چھلنی کر کے چھوڑے گی۔ رات بھر چھاجوں پانی پڑا اور جھراتی بارش سے کھڑکیاں بجتی رہیں۔

آخر ہم ایک دُوسرے کے سانسوں کی گرمی میں سو گئے اور باہر پانی کے لوٹے[1] راستوں کو چبا چبا کر اپنی راہیں بناتے رہے۔ مگر علی الصبح جب ہماری آنکھ کھُلی تو کواڑوں کی درزوں میں سے صُبح کا زرد اُجالا جھانکتا ہوا ملا۔ اس وقت تک ہمارے کپڑے بھی خشک ہو گئے تھے۔ دیکھا تو بادلوں میں چلا چلی لگ چکی تھی، کہیں کہیں بھورے بادلوں میں آسمانی

[1] لوٹ بروزن گوٹ یعنی سیل رواں

پیوند دکھائی دینے لگے تھے مگر ابھی سامنے اولتیوں[1] سے تللیاں[2] بندھی ہوئی تھیں۔ آہستہ آہستہ سورج کی تمازت کے سائے شرابور سبزے پر کرنوں کے پیراشوٹ اتر اتر کر پھیل گئے، مگر ابھی نیم کے درختوں کی بھیگی ہوا میں کڑواہٹ موجود تھی حالانکہ وقت کا چہرہ نکھر آیا تھا لیکن درختوں کے تلے تلے کچے راستوں میں ابھی ٹھنڈا سویرا پاؤں مل رہا تھا اور دھوپ تھی کہ برابر ہانکا لگا رہی تھی۔

میں حسبِ معمول کو نار کا ڈول اٹھا کر اپنے کام پر چلدیا اور بیلدار کلہاڑیاں اٹھا کر اپنے کام پر روانہ ہو گئے، زمین پر بچھے ہوئے نرم پودے اور پھیلے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ یوں معلوم ہو رہے تھے جیسے انھیں کوئی لشکر روندتا ہوا گزر گیا ہے، احاطے کے درختوں کے نیچے کا سبزہ نہا کر نکھر گیا تھا اور نہر کی پٹڑی کی پیلی مٹی راہگیروں کے قدموں کا انتظار کر رہی تھی، نہر کے کنارے کنارے پشتے کی ٹھنگنی[3] دیوار دور تک خطِ مستقیم بنی ہوئی تھی، اور درختوں کے سائے میں تیز ہوا آنکھیں ملتے خود رَو گھاس کو ہلکی ہلکی پینگیں دے رہی تھی جیسے سوتے میں بچوں کی انگڑائیاں۔

مجھے اِس مصروفیت اور جنگل کے ماحول میں کوئی کتاب مطالعے کے لیے نہ ملتی اور تمام دن اِسی نامعقول الجھن میں گزرتا۔ بعض بعض اوقات جنگل کے فطری مطالعے اور مشاہدے سے طبیعت اکتانے لگتی اور تصوراتی تنہائی گلوگیر ہو جاتی۔ رات کو فکر کے باوجود مجھے اپنے مستقبل میں کوئی دریچہ کھلا ہوا دکھائی نہ دیتا اور زندگی ایسی معلوم ہوتی جیسے میں کالے ریت کے ٹیلوں میں چل رہا ہوں، ہاں جب رات ڈھلتی اور جنگل کی خاموشی اندھیرے کو ہیبت ناک بنا دیتی تو شمعی کا خیال ہی ایک ایسا سہارا تھا جو مجھے اس ماحول سے نجات دیتا۔ چونکہ میرے مطالعے نے احساس میں رنگین بنا دی تھی، اس لئے ہر خوشی اور غم کی بات کو میں بہر دل نہ بھولتا، اکثر اوقات تو ہوا کے گرم و سرد جھونکے میرے دل کو چھو کر گزرنے لگتے، اوائل رات میں بیلداروں کی ناہموار گفتگو اور

---

[1] اولتی:۔ سائبان یا کھپریل والی چھت کا سرا جہاں سے بارش کا پانی نیچے گرتا ہے [2] تللیاں:۔ بلندی سے گرنے والی باریک دھار۔ [3] ٹھنگنی:۔ پستہ قد۔ کوتاہ قامت۔

نچی سطح کے مشوروں کے علاوہ چھوٹے افسروں کی مراعات و شدائد کے بے سر و پا قصّے مُجھے نہ بھاتے، بعض وقت تو دماغ کا تاریل تڑخنے لگتا اس وقت میں اپنے خون میں اونٹ کر رہ جاتا اور اپنی قوّت و جرأت کا افلاس مجھے نڈھال سا کر دیتا۔ نہر کے بنگلے پر رات کو رہنے والے چوکیدار اور قُلی جب اپنے افسروں کی شکایت کا سلسلہ شروع کرتے تو دیر تک یہ گندا دھارا بند نہ ہوتا اور درختوں کی تاریکی سے سڑے ہُوئے اُڑ کباڑ کی بُو اور بعض وقت دُور پڑے ہوئے کسی مردہ جانور کا تعفّن نیند حرام کر دیتا۔ علی الصُّبح جب درختوں کے نیچے اندھیرے کی پھٹی ہوئی جاذمیں اُجالے کے فرش میں تبدیل ہو جاتیں تو میں اور میرے بیلدار اُٹھ کر اپنے اپنے کام میں لگ جاتے اور مجھے یقین ہو جاتا کہ قدرت میرے ضبط کا امتحان لے رہی ہے۔ مجھے ضرور ایک دن آرام ملے گا۔ میں سُن چکا تھا کہ خُدا کی رحمت اور رسُولِ اکرمؐ کی شفاعت غریبوں ہی کا حصّہ ہے۔ بس ذرا وقت کا انتظار شرط ہے۔

مَیں نے یہاں کے لوگوں میں کبھی شراب کا ذکر نہیں سُنا البتّہ وہ کبھی کبھی عورتوں کی باتیں کرتے وہ بھی شادی کی صُورت میں، اب اس میں یا تو اجنبیت حائل تھی یا پھر محنت کے بعد تھکا ہُوا بدن آرام کے سوا کسی لذّت کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ دُنیا مزدُور دل کسانوں اور پس ماندہ طبقے کو اس قدر رگیدتی ہے کہ وہ مشقّت سے نکلنے کے تصوّر کو بھی مشقّت خیال کرنے لگتا ہے۔

چنانچہ مزدُوروں اور ناداروں میں تعلیم کے فقدان کا ایک یہ سبب بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کے متعلق بھی بہبُود کا کوئی پہلو نہیں سوچتے اور مزدوری اس قدر کم ملتی ہے کہ تعلیم کے مصارف اُنھیں پہاڑ معلوم ہونے لگتے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ جس قدر کارخانے ہیں ان میں نہ بُوڑھے نظر آتے ہیں اور نہ کم عمر، بلکہ جوانی سے لے کر چھتیس سینتیس سال کے اندر اندر کے مزدُور کام کرتے ہیں۔ پھر اُن کی

اُولاد مزدوری کے قابل ہو جاتی ہے اور وہ خود اُون، رُوئی اور گرد و غبار پھانک پھانک کر اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں کوئی مزدور اپنی طبعی موت نہیں مرتا۔ کم خوراک کے ساتھ مسلسل محنت اور شدید مشقت ان کی عمروں میں دراڑیں کھول دیتی ہے اور یہ اپنے تمام ترآلام و مصائب اور زہرہ گداز مشقت ورثہ میں اپنی اولاد کو دے جاتے ہیں۔ کوئی عادل حاکم ایسا نہیں آتا جو ان قتل گاہوں کی اصلاح کرے جہاں اس دور کے صناعوں اور مزدوروں کے خون سے سونے کے ذرات نکال کر کانجی ہاؤس کے جانوروں کی طرح سلوک کیا جاتا ہے، اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔

غیر متوقع ملاقات

جب شمی کو ہمارے گھر سے معلوم ہوا کہ میں کہیں نہر پہ نمبر اندازی کر رہا ہوں تو اُس نے نہ جانے کس طرح نہر کے کسی آدمی سے میرا پتا معلوم کیا، لیکن بتانے والے نے مخالف سمت بتا دی اور وہ تمام دن سات آٹھ میل پریشان ہو کر واپس آ گئی مگر اُس کی اُمید مُسلّم تھی۔

مَیں نے اِس اَثنا میں اپنے کو لتار سے رنگے ہوئے کپڑے جو چمڑا بن چکے تھے جسم سے علیحدہ نہیں کئے تھے اور کرتا بھی کیسے، دوسرے کپڑے تھے بھی کہاں؟ شدید گرمی کی دوپہریں کولتار سے لتھڑے ہوئے ہاتھ درختوں کے تنوں سے صاف کر کے یا راستے کی مٹی سے دھو کر روٹی کھاتا اور چوپایوں کی طرح نہر یا کُول[1] سے پانی پی لیتا، رات آتی تو بنگلے کی ہموار چھت پر سوتے ہوئے بیلدار ایسے معلوم ہوتے جیسے جگہ جگہ اچار کے مٹکے لُنڈھے پڑے ہوں۔

ایک دن پسینے میں شرابور، دن کے بارہ ساڑھے بارہ بجے نمبر اندازی کرتا جا رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر ایک آشنا آواز کان میں آئی، نظر اُٹھائی تو شمی ایک درخت سے لگی ہچکیاں لے لے کے رو رہی تھی، دیکھتے ہی میرے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہم دونوں نیچی نظر کئے ایک دوسرے کی طرف بڑھے، مَیں نے بہت کہا کہ مَیں تار کول میں سنا[2]

---

[1] کُول :- پانی کی وہ نالی جو کھیتوں کو سیراب کرتی ہے (گُول)، [2] سَنّنا: لتھڑنا۔ آلودہ ہونا۔

ہوا ہوں مگر اُس نے دوڑ کر میرے پاؤں پکڑ لئے اور کہنے لگی۔ خدا کے لئے خود پر نہیں تو مجھ پر رحم کریں اور میرے ساتھ چلیں، میں بہت پریشان ہو چکی ہوں۔ تین روز ہوئے شمالی کی طرف آٹھ میل تک دھکے کھا کر واپس ہوئی کسی نے غلط پتا بتا دیا تھا۔ عورت ذات ہوں زیادہ بے توجہی کی تاب نہیں لا سکتی۔ وہ اس دھوپ اور گرمی میں تھر تھر کانپ رہی تھی۔

میں اُسے لے کر جنگلی پھولوں کی خوشبو سے پٹے سائے میں جا بیٹھا جہاں دو غلی ہوا کا گزر نہیں ہوتا اور شہروں کی کثافت ملی فضا کے دھوئیں سے پُرخلوص گفتگو کے میلا ہونے کا امکان تصوّر سے بھی دُور ہوتا ہے۔ مگر اپنی حالت سے میری رُوح میں مرجھاہٹ ضرور تھی، وہ آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھی۔ میرے کان اُس کی شربائی ہوئی آواز کی کھرکھراہٹ کی گرید میں تھے اور آنکھیں پرچھائیوں کی طرف بیک رہی تھیں۔ اتنے میں بیلدار میرا کھانا لے کر آگیا، اُدھر شمعی بھی اپنے ساتھ کچھ پھل اور مٹھائی لے کر آئی تھی ہم دونوں نے اسی جان نواز سائے میں بیٹھ کر کھانا کھایا، شمعی برابر بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی اور بیلدار دُور کھڑے سرگوشیاں کرتے رہے۔

میں نے شمعی کو بڑی مشکل سے یہ کہہ کے رخصت کیا کہ میں انشاء اللہ پرسوں تک یہ کام ختم کر کے آجاؤں گا۔ مجھے ابھی چلنے میں بھی عذر نہیں لیکن کام اُدھورا چھوڑنے سے اب تک کی مزدوری گڑبڑ میں پڑ جائے گی۔ وہ بادلِ ناخواستہ اچھا کہہ کر خاموش ہو گئی اور چلتے ہوئے اُس نے اپنے ٹھنڈے گال میرے تپتے ہوئے ماتھے سے ملا دیئے اور مجھے ایسا لگا جیسے میرے دل کی آگ میں برفیلی لکیریں ڈھلک رہی ہوں۔

جب تک وہ نظر آتی رہی میں نے کام شروع نہ کیا۔ آخر نہر کے موڑ پر اُس کا تانگا نگاہوں سے اوجھل ہو گیا جیسے ایک سنہری بادل شراب برسا کر اُفق کی وسعتوں میں غائب ہو جائے۔ اب بھی کبھی کبھی اُس کا پگھلے ہوئے سونے جیسا رنگ اور گرد و غبار میں اَٹی لانبی پلکیں میرے سامنے بکھر جاتی ہیں۔

تیسرے دن میں کولتار کے کپڑوں میں لپٹا ہوا اپنے گھر پہنچا، شام ہو چکی تھی والد صاحب کھانا کھانے کے لئے بدھ سنگھ کے باغ سے گھر آئے ہوئے تھے "کیوں بھئی آ گئے ہو" اتنا کہا اور کھانا کھا کر چلے گئے۔

میں نے چالیس روپے نکال کر والدہ کو دیئے اور انھوں نے خدا کا شکر ادا کر کے رکھ لئے۔ میں نے کپڑے اُتارے تو اصل میں اسی دن مجھے اپنے جسم کو دیکھنے کا موقع ملا، جگہ جگہ کولتار کے اَنمٹ دھبے لگے ہوئے تھے جیسے افریقہ کے تیندوے پر ہوتے ہیں۔

ایک ضیافت

دوسرے دن صبح میں نے مٹی کا تیل مل مل کر مشکل سے وہ دھبے مدھم کئے مگر جگہ جگہ چھینٹوں کی سیاہی بدستور رہی جو مہینوں بعد خود بخود صاف ہوئی۔ صبح ہوتے ہی میں شمّی کے مکان پر پہنچا وہ مجھے دیکھ کر اس طرح اٹھی جیسے چھوئی موئی مرجھانے کے بعد شاداب ہوتی ہے۔ ہاتھ میں ہاتھ لئے وہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی اور نوکر سے چائے کے لئے کہا۔

ہم دونوں کو کمرے میں دیکھ کر اُس کی نانی نے بڑبڑانا شروع کر دیا جیسے اُس کے ضمیر میں خون آلود گندے چیتھڑے سُلگ اٹھے ہوں۔ شمّی بار بار کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس طرح خاموش ہو جاتی جیسے کوئی کڑوی دوا پی رہی ہو، اتنے میں چائے آ گئی اور ہم چائے پینے لگے۔ چائے پی کر میں نے اُٹھ جانا مناسب خیال کیا۔ شمّی بھی خاموش رہی مگر چلتے ہوئے کہا دیکھئے شام کو ضرور تشریف لائیں اور کھانا بھی یہیں کھائیں، باتیں کئے بہت دن ہو گئے ہیں۔ میں نے اقرار کر لیا اور ضرور ضرور کہتا ہوا باہر نکل آیا۔

شمّی سے ملاقات کے متعلق میرے تمام گھر والوں کو معلوم تھا اور اس پر وہ کبھی جزبز نہیں ہوئے۔ کئی بار لوگوں نے میرے والد صاحب سے شکایت کی اور بعض نے ہمدردی کے طور پر اظہار خیال کیا۔ مگر میرے والد نے کسی کے شک کو اہمیت نہ دی،

جواباً صرف یہ کہا "مجھے احسان سے کوئی غلط توقع نہیں وُہ کم پڑھا لکھا ضرور ہے لیکن میرا لڑکا ہے۔ بفرضِ محال اگر وہ غلط راہ پر بھی ہے تو اُس کا انجام اُس کے ساتھ ہے۔ کسی کی بھی جوانی ہو دُوسروں کے تجربوں پر کب اعتبار کرتی ہے؟ ٹھوکر کھا کے سنبھلنا۔ سنبھل کر ٹھوکر کھانے سے بہتر ہے۔"

چونکہ اب میں دوستوں کی پارٹی میں کبھی کبھی حاضری دیتا تھا اس لئے شفیق پارٹی میں میری آؤ بھگت پہلے سے زیادہ تھی۔ شمّی کا تعلق بھی اُن پر بے نقاب ہو چکا تھا لیکن اُنہی دنوں پارٹی کے ایک اہم رُکن نواب احمد کا اچانک انتقال ہو گیا تھا اس لئے سب مغموم اور فکرمند ہونے کے علاوہ سنجیدگی سے اپنی اپنی زندگیوں کا جائزہ لے رہے تھے! ورمعقولیتوں پر اکتفا تھا۔ البتہ ایک نئے ممبر مقصود علی کا اضافہ ہو گیا تھا جو ماسٹر محفوظ علی کا لڑکا تھا۔ یہ دونوں باپ بیٹے خیاطی کے اُستاد تھے اور شہر کے تمام شرفا انھیں سے کپڑے سلواتے تھے۔ سُنا ہے کہ ممبر بنتے ہُوئے اس لے وعدہ کیا تھا کہ میں تمام پارٹی کے کپڑے مُفت سیؤں گا۔ لیکن شفیق صاحب نے کہا کہ نہیں ہرگز نہیں، کپڑے سیؤ گے تو اُجرت ضرور دی جائے گی یہ الگ بات ہے کہ ہم لوگ رعایت چاہیں گے۔ کبھی کبھی سب جمع ہو جاتے تو ذرا دل بستگی سی ہو جاتی، جیسے کوئی دوپہر کا مسافر کہیں درختوں کے نیچے کسی پُلیا پر بیٹھ کر سستانے لگے۔

اگرچہ شفیق پارٹی اور قاضی صاحب کی بزم میں صرف میں ہی علمی اعتبار سے ہیٹا اور معاشی لحاظ سے تہی دامن تھا لیکن قاضی صاحب کی توجّہ سے کبھی محروم نہیں رہا۔ وُہ مُجھ سے بڑی ہی محبّت اور نرمی سے پیش آتے تھے حالانکہ وہ تھے بڑے غصیل اور تنک مزاج انسان۔

مَیں حسبِ وعدہ رات کو دس بجے شمّی کے مکان پر پہنچا وُہ لیمپ کے برابر گاؤ تکیہ پر کُہنی ٹیکے جنگلے میں سے راستے پر نگاہیں جمائے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کر فوراً اُٹھی اور نوکر سے کھانا لگانے کو کہا۔ نوکر لے کھانا چُنا اور وہ میری تمام دن کی مصروفیات کے متعلق پُوچھتی

رہی، پھر ہم دونوں کھانے کے کمرے میں چلے گئے ابھی بیٹھے ہی تھے کہ اس کے دونوں بھائی لڑتے ہوئے آ دھمکے، اگرچہ اُن کے آنے سے میری ذہنی آمد کے طائر واپس ایک اجنبی خلا میں گم ہو گئے۔ لیکن میں نے اُنھیں ساتھ بٹھا لیا حالانکہ یہ بات شمّی کی مرضی کے خلاف تھی، اُس کا چھوٹا بھائی شمشاد نہایت شریر قسم کا بچہ تھا اور مجھے اُس سے اس کی شرارت کے باعث یک گونہ دلچسپی تھی، اُس کے سر کے بال ریشم کی طرح نرم تھے حالانکہ وُہ انگریزی بال نہیں رکھتا تھا۔ جب وُہ میرے پاس آتا تو میں اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا کرتا اور ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی تالاب کے اُس زینے کی آخری بُرجی پہ ہاتھ پھیر رہا ہوں جو پانی میں رہنے کے باعث چکنی کائی میں لت پت رہتی ہے۔ وہ شریر ضرور تھا مگر جب وہ میرے پاس آتا تو نہایت سودھلا ہو جاتا، اور میری بغل میں گھس کر بیٹھتا، نہ جانے کیوں؟

کھانے کے بعد شمّی نے نوکر سے چائے کے لئے کہا۔ وُہ چائے کی بُری طرح رسیا ہو گئی تھی۔ اس کی نانی مجھ سے اسلئے اَور بھی جلتی تھی کہ اُس کا خیال تھا کہ میں نے اُسے چائے کا عادی کر دیا ہے۔

شمّی اُن دنوں کچھ شگفتہ سی نظر نہیں آتی تھی اُس کے کسی باطنی غم اور پوشیدہ کش مکش نے اُس کے چہرے میں سوالیے ہی سوالیے بھر دیتے تھے مجھ جیسے انسان کے لئے اس کی لب بستگی ایک زندہ غم تھا اور گویائی ایک جیتا جاگتا نوحہ۔

ہم دونوں دِلوں میں ایک دوسرے کے لئے ہمدردیاں لئے چائے پیتے رہے دونوں کے ہاتھوں میں چائے کی پیالیاں اختتام پہ تھیں اور دونوں ہاتھوں کے سائے دو ایسی پھول دار شاخوں کی تصویر بن گئے تھے جنھیں شام کے سائے چھو رہے ہوں، شمّی نے نہ جانے دل کی کتنی گہرائیوں سے جرأتیں لے کر کہا "احسان صاحب! اگر میں آپ کو کوئی چیز پیش کرنا چاہوں تو آپ قبول کر لیں گے؟"

سودھلا :- بھولا بھالا - سیدھا سادہ - معصوم - (سودھلا)

"اگر مناسب ہوا" میں نے پیالی رکھتے ہوئے کہا۔

اُس نے سونے کے کنگنوں کی ایک جوڑی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "میں نے یہ جوڑی عرصے سے آپ کے لئے رکھی ہوئی ہے مگر پیش کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔"

میں:۔ شکریہ! یہ تو میری جرأتِ قبول سے باہر ہے۔ اس میں شک نہیں، کہ تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے لیکن وقت پر ہر بات بھلی لگتی ہے۔ یہ موقع مناسب نہیں، یہ تو ہم تم میں فاصلہ پیدا کر دینے والی بات ہے۔ یہ کہتے ہوئے کنگن کی جوڑی میں نے اس کی طرف سرکا دی، اور اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے صرف اتنا کہا "طوائف بڑی ہی ذلیل ہوتی ہے۔ بہت ہی بے غیرت قوم ہے۔"

اُس وقت اس کا چہرہ صبح کے چراغ کی طرح بے رونق ہو گیا تھا اور اُس کی سانسیں مُعطّر لُو تھیں اور بات کا لہجہ بیاد طلب تھا۔

"ناراض ہو گئی ہو شمعی؟" میں نے تعجب آمیز لہجے میں پوچھا۔

"میں آپ سے کس طرح ناراض ہو سکتی ہوں احسان صاحب! میں آپ کے اس دل شکن جواب کی قیمت کو بھی سمجھتی ہوں مگر یہ تو میری ایک آرزو تھی جو آرزو ہی رہی میرا روحانی تقاضا ہے کہ میں آپ کے کسی کام آؤں اور آپ ہیں کہ ہر مقام پر ٹھکرا دیتے ہیں۔ اچھا جو آپ مناسب سمجھیں۔ عبادت اور محبت میں جذبہ ایک ہی معیار کا ہوتا ہے اور اُس کی قدر و منزلت سے میں خوب آشنا ہوں۔" شمعی نے سانس توڑ توڑ کر کہا۔

"شمعی! میں تمہارے خلوص کی قدر کرتا ہوں مگر ہمدردی سے ڈرتا ہوں۔ کیونکہ جب خود کو دیکھتا ہوں تو بیک فکر یہ فیصلہ سامنے آجاتا ہے کہ مجھ جیسے لوگوں کی تمہیں کیا کمی ہے" میں نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔

"احسان صاحب! اس میں شک نہیں کہ میں نے حرام کھانوں، ناپاک لباسوں،

اور اوباشں سوسائٹیوں میں زندگی بسر کی ہے اور بازاری عورت کہلاتی ہوں مگر شرافت کے جوہر کو بھی پرکھنا جانتی ہوں۔" شمعی نے جی دار انداز میں جواب دیا۔

رات کے بارہ ساڑھے بارہ بجے تک دِلوں کی صفائی میں وقت گزرا، اور صبح کی حاضری کے وعدے پر واپسی ہوئی۔

مَیں شمعی کی ہمدردی اور خلوص کے علاوہ اس کی نزدیکی اور جذب ہو جانے والی آرزو پر لہلوٹ[1] تھا۔ لیکن فرائض، اخلاق اور وفاداری کی جدوجہد کا ترک اور جنسی تشفی کی طرف قدم زنی میرے احساس اور ایمان کی جراُت سے باہر کی بات تھی۔ جب مَیں اس کا تصور کرتا تو طرح طرح کے مخدوش خیالات دِل کو پتنگوں کی طرح گھیر لیتے اور مَیں بوکھلا جاتا۔ آخر گھبرا کر خود کو کسی دوسری طرف متوجہ کر لیتا۔ راستہ چلتے میں کنو یروں کی ٹکڑیوں کی طرح مختلف نسلوں کے خیالات میرے ساتھ چلتے اور مجھ پر نہ جانے کیسا کیسا عالم گزر جاتا۔

نہر کے درختوں کی نبر اندازی کے بعد دو چار روز تو مَیں یونہی بے فکری سے پھرتا رہا لیکن کبھی کبھی یہ خیال بھی چٹکی لے لیتا کہ کسی دن پھر والد صاحب ناراض ہوئے تو اب کے کہاں جاؤں گا؟ اس تصوّر سے میری رُوح جسم میں بھٹکنے لگتی اور مَیں ایسی گھٹن محسوس کرتا جیسے مجھے کسی ایسے بِل میں داخل کر دیا گیا ہو جس کا اور چھور[2] معلوم نہ ہو۔

شروع سے تو قاضی محمّد زکی صاحب کی مخلصانہ محبّت و نوازشات اور شفیق پارٹی کی تفریحات، میرے دل و دماغ کو سنبھالے ہوئے تھیں، مگر جب سے شمعی کا ندھلے آئی تھی اُس وقت سے میرے دن ناہموار اور تلخ، مگر راتیں رنگین اور مسرور سی ہو گئی تھیں۔ کیونکہ شمعی میری دن بھر کی تھکن اور رُوحانی تشنج کا علاج جانتی تھی۔ اس کے باوجود جب دن کو کہیں گفتگو میں کسی کے مصائب و مشکلات کا ذکر چھڑتا یا کسی کی محبّت کی ناکامی کا تذکرہ ہوتا تو اپنا انجام سوچ کر میری بے سہارا زندگی کی خراشیں سر سرا کر اُبھرنے

---

[1] لہلوٹ:۔ قربان۔ فدا۔ عاشق ہونا۔ مرمٹنا [2] اور چھور:۔ طول و عرض۔

لگتیں۔ میں حاضرین کی طرف سے بالکل بے خبر ہو جاتا، مجھے میری فکری گتھیاں اور معاشی جنجال دُنیا بھر سے الگ کر دیتے ۔ مجھے اِس اُلجھن میں پاکر اُس پاس کے لوگ ایک دُوسرے کو اشارے کرنے لگتے اور میں گردوپیش کے کرمفرماؤں کو اپنے حالات کی سازگاری کے حق میں خیال کر کے خاموش ہو جاتا مگر اکثر اوقات یہ خیال بھی جھنجھوڑ ڈالتا کہ کہیں میں دیوانگی کی حد میں تو داخل نہیں ہو گیا؟

شمعی نے ایک دن پھر دوستی کی اہمیت اور اس کے فقدان پر ایک طویل گفتگو کی جس سے ظاہر تھا کہ اب وہ میرے سوا اپنی زندگی میں کسی کو داخل نہیں کرے گی اُس کی رُوح اُس کے جسمانی محاسن کو اور جسم روحانی لطافتوں کو سنبھالے ہوئے تھا۔ میں اُس کی ہر بات میں لطافت کے ساتھ گہرائی اور گہرائی میں ایک روشنی دیکھتا تھا۔

ایک دفعہ ہم دونوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے شمعی "ہم دونوں" کہہ کر نہ جانے کیا کہنے والی تھی کہ نوکر نے آکر کہا "نانی بلا رہی ہیں!" اُس کے ہونٹ گفتگو کے ارادے سے کُھل کر مصلحتِ وقت سے ذرا تھرتھرا کر بند ہو گئے۔ اُس وقت زبان ولب کا منظر ایسا معلوم ہُوا جیسے گلاب کے پھول میں بیر بہوٹی بند ہو گئی ہو۔ اس کے بعد ضبط اور خاموشی کا کھنچاؤ اُس کی پیشانی سے لے کر گلے تک محسوس ہُوا جیسے وہ کسی اہم ذکر کو بمشکل پی رہی ہو یا کسی دلی آواز کو نزاکتِ احساس سے نالو تک چھوڑ کر سینے میں کھینچ لیا ہو۔

میں نے دریافت کیا کہ آخر اس جبری ضبط کے کیا معنی؟ اُس نے نگاہیں جُھکا لیں اور جھجکاتے رہی اُس وقت میں بھی اُس کے چہرے پر ٹکٹکی باندھ کر خاموش ہو گیا۔ جب ذرا سی دیر کے بعد اُس نے نظر اُٹھائی اور میرا یہ عالم دیکھا تو بند ہونٹوں سے ہنس کر لپٹ گئی اور میں ایک دُھنکے ہوئے ریشم کے ڈھیر میں ڈوب گیا۔ پھر بولی نانی صاحبہ نے الگ ستم توڑا ہُوا ہے اور آپ نے الگ قیامت ڈھا رکھی

ہے ۔ مجھے نانی سے تو کوئی شکایت نہیں کیونکہ وہ آپ سے واقف نہیں لیکن آپ کے احساس سے شکوہ ہے کہ کہیں تو یہ ہوا کی رنق تک کو ناقابلِ برداشت بنا دیتا ہے اور کہیں ایسی غنودگی میں ہوتا ہے کہ نہ دل کی دھڑکنیں اسے بیدار کر سکتی ہیں نہ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی سانسیں ۔ اس میں شک نہیں کہ آپ میرے معاملے میں دُنیا کی انگشت نمائی کی پروا نہیں کرتے اور سوسائٹی کے وضع کئے ہوئے قوانین کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں مگر شاید میں آپ کی خاص توجّہ کے قابل نہیں ہُوں ۔ جب آپ مجھے متعفّن اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لائے ہیں تو کیا آپ کی دائمی خدمت کو میں اپنا فرضِ اوّل نہ سمجھوں ؟ میں اب اُن لوگوں میں رہنا نہیں چاہتی جن کی روحیں جسموں کو گندگی میں گھسیٹے پھرتی ہیں ، خُدا کے لئے مجھے سمجھنے کی کوشش کریں ، میں نظر انداز کر دینے کی چیز نہیں اور کسی عالم میں بھی نُقصان رساں ثابت نہیں ہوں گی ،

” خدا شاہد ہے ، کہ مجھے تمہارے خلوص ، محبّت اور ہمدردی کا یقین ہے ، میں تو تمہیں اپنی زندگی کی توانائی خیال کرتا ہُوں ۔“ میں نے قدرے ندامت سے جواب دیا ، اور یہ جواب جہاں میری مجبُوریوں کا پردہ تھا وہیں ممنونیّت کا اظہار بھی ۔

شمعی نے افسوسناک لہجے میں اتنا کہا جو آپ بیان کر رہے ہیں اور جو سمجھ رہے ہیں میری بات کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ! اچھا کبھی آپ بعد از وقت سمجھیں گے ، پھر پچھتائیں گے اور پچھتاتے ہی رہیں گے ، اُس وقت اُس کا چہرہ یُوں لگتا تھا جیسے اس کی رُوح کے کھیت بکس[۵] رہے ہوں ۔

شمعی سے میں جب کسی جائز نزدیکی کا تصوّر بھی کرتا تو میرے سامنے تباہی کے آثار اُبھرنے لگتے اور انجام سمیت ماضی کے مشاہدے الفاظ و معانی کی تشنگی لئے ٹھٹھ کے ٹھٹھ دکھائی دیتے ، اور جب اس تعلّق کے ڈرامے کا مفہوم نکاحِ ثانی کی صورت میں میرے سامنے آتا تو حال کے کسی گوشے پر یقین و عمل کو جی نہ چاہتا اور ایک طرح کے

---

۵ بکسنا ۔ مُرجھانا ۔

سرسامی خوف کا بار ذہن پر لد جانا یعنی زندگی کے کسی بھی رُخ سے کسی اقدام کی تائید نہ ہوتی، ایک بیاہتا بیوی کے تقدس وحقوق اور دوسری کے احساسات والتفات کا بیک وقت تحفظ اور عدل میرے بس کی بات نہ تھی۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ حتی المقدور شمعی کی دلدہی چاہتا تھا، میری آرزو تھی کہ میں اس کے کسی کام آسکوں اگر اس کے لئے میری جان بھی جائے تو خسارے کی بات نہیں بلکہ ایک فریضے سے سبکدوشی ہوگی۔

میں رات دن اسی خیال میں غلطاں و پیچاں رہتا کہ کسی طرح شمعی کو اس کے خلوص کا جواب ملے اور کوئی تدبیر ایسی نکلے کہ شمعی کا ساتھ بھی ہو اور اس کا وجود کسی پر بار بھی نہ بنے، انگشت نمائی بھی نہ ہو اور انسانی قدروں سے وابستگی بھی مُسلّم ہو، لیکن کوئی صورت سامنے نہیں آتی تھی، افلاس کا خیال، ماں باپ کی خدمت، بیگم کی سادگی اور شرافت، قصبے کا ماحول، بے روزگاری کی گرفت اور شمعی کی والہانہ فریفتگی یہ تمام حالات مجھے دیوانہ کئے ڈالتے تھے اور انھیں متعدل کرنے کی کوئی تدبیر میرے خیال میں نہیں آتی تھی، لیکن میرا یہ عالم تھا کہ میں نے اس فکر اور فیصلے کے علاوہ اپنے کانوں اور بھیجے کے سوراخوں میں موم بھر لیا تھا جس سے اور کوئی خیال داخل نہ ہو سکے میری اکثر و بیشتر راتوں نے اسی فکر وخیال میں صبح کا لباس پہنا مگر فیصلہ وہی پریشانی اور آئینہ ساماتی، اور دن تھے کہ ڈرامے کی راتوں کی طرح گزرتے جارہے تھے۔ میں بالکل اُسی کشمکش میں تھا جیسے کوئی شادی شدہ عورت شوہر کی وفادار رہ کر کنوارپنے کے دوست کو خوش رکھنے میں احتیاط کے خارزار سے دامن بچاکر چلتی ہے اُس وقت اُس کی گھٹن اور روحانی اذیت کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اب بھی شمعی کے دَور کا تصور جب میری تنہائی میں ماضی کا دریچہ کھول لیتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرے دل کے قریب کہیں سِتار پر بارش ہو رہی ہے اور چنبیلی کے گجرے بکھرے پڑے ہیں۔

ترکِ وطن

سرگذشت من چه می پرسی چه گویم سرگذشت
موئے سر از پا گذشت و خار پا از سر گذشت

ترکِ وطن

بے روزگاری سے تنگ آکر میرے محلّے کے کئی جیالے لوگ کاندھلے سے لاہور چلے آئے تھے، اُن میں کچھ صندوق ساز تھے کچھ معمار، جب وہ لاہور سے کاندھلے آتے تو لاہور کے ایسے عجیب وغریب حالات دواقعات بیان کرتے کہ دل بیتاب ہو جاتا۔ انار کلی کی رونق، شاہی مسجد کی عظمت، جہانگیر کے مقبرے کی صنّاعی اور شالامار باغ کے طبقات کی موزونیّت اور نورِجہاں کے مزار کی کس مپرسی اُن کے موضوعاتِ سخن رہتے، تڑپ تڑپ جانے کے باوصف میری مجبوریوں کی وارورسن اور فرائض کی صلیب مجھے کہاں راستہ دینے لگی تھی۔ کئی بار والدہ صاحبہ سے لاہور کے سفر کی اجازت چاہی مگر ہر بار اُن کی پیشانی پر غم کی ایک ایسی کیفیت محسوس کی جیسے اگربتّی کا دھواں آئینے پر عکس ڈالتا گزر رہا ہو اور ان کا یہ عالم دیکھ کر مَیں خاموش رہ گیا، البتہ میری اہلیہ نے ماحول کے پیشِ نظر کئی بار سفر کی عظمت بیان کی اور دوسرے لوگوں کے واقعات سُنائے مگر میرے لئے تو والدہ کی مرضی مقدّم تھی اور مَیں اُن کی اجازت کے بغیر سانس بھی لینا نہیں چاہتا تھا۔

مَیں نے شفیق پارٹی میں ترکِ وطن کا ارادہ ظاہر کیا تو اصغر جنگ کے سوا ہر شخص نے ہمدردی کے خیال سے مخالفت کی اور کہا جناب یہاں تو تمہارے چاہنے والے ہیں جو تمہاری قدر و منزلت ہوتی ہے، وہاں تم کس برتے پر جارہے ہو تمہارا کون ساسکا

بیٹھا ہے جو ترکِ وطن پر تُل گئے" میں خاموش رہا اور سنی اَن سُنی کردی۔

واپسی پر راستے میں اصغر جنگ سے گفتگو ہوئی، اُس نے کہا "آج تم نے ڈھب کی بات کی ہے۔ سیاحت بہت اچھی چیز ہے چپکے سے آنکھ بند کرکے نکل جاؤ، جس نے تمہیں پیدا کیا ہے وہ تمہاری مدد بھی کرے گا ہر صانع اپنی صنعت کا ذمّہ دار ہے۔ جب تخلیق کے مرحلے میں تمہارا کوئی مددگار و معاون نہیں تھا تو مصائب اور مشکلات میں خدا کے سوا کون ہاتھ پکڑ سکتا ہے؟ اس کے علاوہ مزدور کے لئے تو کسی غیر کی مدد کا تصوّر براہِ راست خالق کی توہین کرنا ہے۔ اُس نے انسان کو خود اپنی مدد کی قوّت و صلاحیت دی ہے۔ ذرا سوچو تو سہی کہ آنکھ ناک چہرہ یا کنپٹی پر کوئی کسی قسم کا حملہ ہوتا ہے تو ہاتھ بے ارادہ بڑھتے اور مقابلہ کرتے ہیں اور خطرے کے وقت ہاتھ پاؤں میں خود بخود چستی آجاتی ہے۔ اور پھر تم تو لاہور جانے کا ارادہ رکھتے ہو، وہاں تو مزدور طبقہ اچھا خاصا بیدار ہے۔ اب تو میں نے سُنا ہے کہ تمدّن کے ناخداؤں اور معاشرت کے اجارہ داروں سے پس ماندہ طبقہ اپنے حقوق کا مطالبہ کررہا ہے۔ اگرچہ اُس کی آواز میں ابھی بلندی نہیں، لیکن یہ بات رُکنے والی نہیں۔ اب نہیں تو دو چار برس میں یہ ضرور کامیاب ہوجائے گا اور یہاں سے تو اب بھی وہاں مزدوری زیادہ ہے اور وقت کے ساتھ بڑھتی جائے گی۔"

"وہاں کے لوگ اپنی پستی اور علمی بے مائگی کو زوال اور افلاس کا سبب خیال کرتے ہیں اور یہ بڑا جاندار تصوّر ہے۔ آئے دن وہاں اسکول اور کالج کھلتے رہتے ہیں اور لائبریریوں کی تعداد بھی اچھی خاصی سُننے میں آئی ہے۔ وہاں کاریگروں کا طبقہ تہذیب و تمدّن کی دھوپ چھاؤں کی تاثیریں جانتا ہے اور بہت جلد سمجھ لیتا ہے کہ مجھے کیوں مزدوری میسّر نہیں آتی، تم ہو کہ یہاں کی بے انصافی کو خدا کا قانون اور سرمایہ داروں کی بے رُخی کو اپنی تقدیر سمجھ کر رینگ رہے ہو، ایک دن مزدوری کرتے ہو اور چار دن

اُجرت مانگتے پھرتے ہو، یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ آخر یہاں کب تک اپنے ضمیر کو کچلتے رہو گے؟"۔

اصغر جنگ کی بات میری سمجھ میں آگئی اور مَیں نے تندرست لہجے میں اُسے اپنے سفر کا یقین دلایا۔ مَیں نے محسوس کیا کہ اصغر کی باتوں سے میری ہمت بندھ رہی ہے۔ اس دن سے قصبہ کے گلیاروں کی دُھندلی دُھندلی لالٹینیں میری رُوح میں افسردگی منتقل کرنے لگیں اور دگڑے دھندلکے میں ڈوبے ہوئے دکھائی دینے لگے۔

آخر مَیں نے والدہ صاحبہ کو لاہور کی سُنی سنائی خبروں کا یقین دلا کر بمشکل تمام اجازت حاصل کر لی اور یقین دلا دیا کہ مَیں جاتے ہی کہیں نہ کہیں ضرور ملازم ہو جاؤں گا اور یہاں پندرہ بیس روپے مہینہ بھیجتا رہوں گا۔

روانگی سے ایک دن پہلے مَیں شمی کے مکان پر گیا رات کے دس بج چکے تھے۔ مَیں نے کہا "شمی آج کوئی غزل سُناؤ" اُس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا "آج کیا بات ہے؟ آپ نے تو کبھی گانے کی فرمائش نہیں کی قصّہ کیا ہے کیا کہیں کوئی اور نیا گُل کھلایا ہے" مَیں نے کہا "آج طبیعت اچھی نہیں تم مجھ سے نزدیک ہو کر بیٹھو اور کچھ سناؤ"، اُس نے کہا "میری کہاں قسمت کہ آپ مجھ سے گانے کے لئے کہیں، مجھے آپ جیسا سامع کہاں میسّر آئیگا؟ مگر اس فرمائش کا سبب تو سمجھ میں آئے! اچھا غالب کی ایک غزل سُنئے۔"

شمی نے غالب کی وہ غزل شروع کی کہ "آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک"

مَیں حیران تھا کہ سارنگی کی میڑ اور طبلے کی ٹھکور جسم کے نظامِ حرکی پر کس قدر اثر انداز ہوتی ہے۔ شمی نے اس غزل سے میری رگ رگ میں درد بھر دیا، اُس لمے الاپ کی آریوں سے میرے ضبط کی چٹانیں کاٹ کے رکھ دیں اور مَیں آنسوؤں پر قابو نہ پا سکا مجھے آبدیدہ دیکھ کر شمی کی آنکھوں کے بھی دونوں پلوں میں ستارے ٹکنے لگے، مَیں نے پہلے کبھی اس کی پلکوں پر ایسا روپہلی چھلکا نہیں دیکھا تھا۔ اُس وقت میرے سینہ میں بھی

دیوارِ گریہ کا سا عالم ہوگیا۔ میں نے بصد دشواری صرف اتنا کہا "شمعی! میری معاش اور معاشقے کے درمیانی فاصلے میں آگ کے دریا اور خون کی جھیلیں ہیں اور مجھ میں عبور کی ہمت نہیں، میں بڑی ضیق میں ہوں۔"

شمعی :۔ "آخر آج یہ خلافِ معمول کیسی گفتگو ہے، کہیں میرے زخموں کو گہرا کرنے کا ارادہ تو نہیں؟ کاش مجھے روح کی تلاشی کا فن آتا اور میں آپ کے دل میں جھانک سکتی۔"

میں :۔ "آج نہیں کل بتاؤں گا!"

روانگی: میں دوسرے روز شمعی کو اطلاع دیئے بغیر کڑھتے ہوئے دل سے جب ایک شخص صدیق نامی کے ساتھ کاندھلے سے روانہ ہونے لگا تو میری والدہ کی آنکھوں میں بھرتے ہوئے آنسو تھے اور ہونٹوں پہ دعائیں، انھوں نے مجھے پیشانی چوم کر رخصت کیا اور اپنے کانپتے ہونٹ آنچل سے چھپاتے چھپاتے دروازے تک آئیں۔ جب میں گھر سے باہر آیا نور احمد بیوپاری میرے انتظار میں کھڑا تھا، اندرونی غم نے اس کے چہرے پر عجیب کیفیت طاری کردی تھی جیسے مسلسل جاگنے سے آنکھیں سرخ اور بشرہ پھیکا پڑ جاتا ہے، اُس نے میری جیب میں پچیس روپے یہ کہہ کر ڈال دیئے کہ "لو اپنی امانت لو!" میں پوچھتا رہا کیسی امانت، کونسی امانت مگر اُس کی ہچکی نہ رکی۔ روانگی کے وقت دوستوں کی پوری جماعت اسٹیشن تک چھوڑنے آئی حافظ لیاقت علی نے تو شاملی کے اسٹیشن تک ساتھ دیا۔ لیاقت کے بڑے بھائی عاشق علی[۵] میرے ہم جماعت تھے، مگر بدقسمتی نے مجھے اُن کی نوازشوں سے محروم کرکے مصائب میں پھنسا دیا، وہ دہلی میں ہیڈ ماسٹر ہوگئے تھے اُن سے ملاقات کو زمانہ گذر گیا، اُن کی طبیعت لیاقت کی طبیعت سے بالکل جدا تھی، جب شاملی کے اسٹیشن سے گاڑی روانہ ہوئی اور میں اکیلا رہ گیا تو مجھ پر ایسا کرب طاری تھا جیسے کوئی اندر ہی اندر شہ رگ کو دبا رہا ہو، اس وقت اپنے دوستوں اور ہم نشینوں کی محبت اور ہمدردی کے نہ جانے کتنے واقعات میرے

---

۵ عاشق علی اور میں نارمل کے امتحان میں ساتھ بیٹھے تھے اور دونوں کامیاب ہوگئے تھے، میں قصبہ ٹھڈولی میں تعینات ہوا تھا مگر چارج نہیں لیا تھا۔

سینے میں کفنائے جا رہے تھے جنھیں اب تک کسی موسم کی مرطوب سانسیں خراب نہیں کرسکی تھیں، کاندھلہ چھوڑ کر میں ایک مدت ایسی دستیاں کرتا رہا جیسے سورج کی تمازت سے دوپہر میں پرندے گھبرا کر گھنیری شاخوں میں عارضی پناہ لے لیتے ہیں۔

میرے بعد لیاقت بھی کاندھلے سے ترکِ سکونت کر کے دہلی چلا گیا اُس نے ترکمان گیٹ میں پیر چون کی دکان کر لی تھی۔ ایک زمانے کے بعد میں لاہور سے دہلی جاتا تو ہوٹل میں قیام کے باوصف ہم دونوں دکان میں بوریاں بچھا کر سویا کرتے اور میں لیاقت کے خلوص کے باعث بوریوں کے بستر میں ریشمیں گدیلوں سے زیادہ آرام محسوس کرتا۔ اُس میں اب تک وہی خلوص چلا آ رہا ہے تقسیم کے بعد وہ لاہور آ گیا تھا لیکن بعض گھریلو مجبوریوں کے تحت اُسے جھنگ میں سکونت اختیار کرنا پڑ گئی وہ اب وہیں ہے اور تبلیغی طبیعت کا انسان ہو گیا ہے۔ بچوں کی طرف سے مطمئن ہے کیونکہ وہ برسرِ روزگار ہیں۔

جب میں آ رہا تھا اُس وقت میرے محنتی بدن اور والدین کی نصیحتوں کے علاوہ میرے پاس اس قدر مصارف نہ تھے کہ مہینہ دو مہینے بیکار رہ کر کھا سکتا، بلکہ لاہور کا سفر اس طرح کر رہا تھا جیسے تبت اور چین سے آنے والے بدھ مت کے زائر عقیدتوں کے سہارے چلتے ہیں تو مشک، شلاجیت، مونگا اور چنور[1] بیچتے بیچتے اپنی زندگی کو کشی نگر[2] کے تیرتھ پر لا ڈالتے ہیں جہاں مہاتما بدھ کا سونے کا اسٹوپا ہے۔

سہارن پور سے بڑی لائن شروع ہو جاتی ہے اس لئے ہمیں گاڑی بدلنا تھی، میرے شریکِ سفر اور پردیس کے ساتھی نے کوئی قلی نہیں لیا اور بے جھجک اپنا صندوق اور بستر میرے سر پر لاد دیا، ہم پل سے اُتر کر لاہور جانے والی گاڑی میں سوار ہو گئے۔

گاڑی روانہ ہو گئی، غالباً بسنت کا زمانہ دم توڑ رہا تھا، پت جھڑ کے مارے درختوں کی عُریاں ٹہنیاں سوکھیا مسان میں مبتلا بچوں کے بازوؤں کی طرح فضا میں پھیلی ہوئی تھیں، میں گاڑی کے ہجوم میں کھڑکی سے لگا اپنے دھندلے اور خاموش مستقبل پر

---

[1] چنور ـ چنوری کا مکبر ہے۔ ایک دستے میں بہت سے سفید بال لگے ہوتے ہیں جس سے بڑے یا بزرگ لوگوں پر مگس رانی کی جاتی ہے [2] گورکھپور کے اُدھر پہاڑ کی ترائی میں ایک مقام جہاں مہاتما بدھ پیدا ہوا اور وہیں آکر جان دی

ناکام نظریں ڈال رہا تھا، میرے سامنے دقت کے میدان کی وسعتوں میں بے برگ و بار خاردار جھاڑیوں اور نوکیلے سنگریزوں کے سوا کچھ نہ تھا، صدیق نے اونگھتے اونگھتے میرے زانو پہ سر رکھ دیا اور خراٹے لینے لگا۔ تھوڑی دیر میں میرے پاؤں پر اس کے منہ کی رال کا تار بندھ گیا مگر میں خاموش تھا اگرچہ کراہت بار بار مجھے ٹھوکے دے رہی تھی لیکن میری قوتِ برداشت میں ابھی کس باقی تھا۔ میں پہلے ہی سمجھ چکا تھا کہ کمزور اور نادار انسان جہاں جائے گا دُوہا جائے گا اور دنیا اُسے اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے گی چنانچہ اس کا رفیقِ سفر ہونا اب بھی میری نظر میں قابلِ احترام تھا، جب جالندھر چھاؤنی کا اسٹیشن آیا تو چاند مغرب کی سیاہ خندقوں میں جھانک رہا تھا اور اس کے شریکِ سفر دھندلے ستارے اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے جیسے کسی بڑے حاکم یا تاجر کا دم نکل رہا ہو اور دولت و منصب کی تمام تر قوتیں اور اعزا و اقربا کے ہجوم یکے بعد دیگرے اُسے اکیلا چھوڑ رہے ہوں، رفتہ رفتہ سورج کا اُجالا غالب آگیا اور سڑک کے دو طرفہ کھیتوں کے ہلکے ہچکولے گہرے ہوتے چلے آئے۔

نرم دوپہر کے قریب گاڑی لاہور کے اسٹیشن پر آکر رُک گئی اور میں یہاں کی چہل پہل دیکھ کر ہکا بکا سا رہ گیا۔ میرا ساتھی اپنا بوجھ میرے سر پر لاد کر اسٹیشن سے باہر آیا اور پیسہ اخبار جانے کے لئے کسی سستے داموں والے تانگے کی تلاش کرنے لگا۔ ابھی تک میرے حواس بجا نہ تھے لوگوں کے چہروں پر انہماک اور ارادوں کے سہارے جسموں کی ناچ کود مجھے حیران کر رہی تھی مجھے رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ کیسی دنیا ہے کہ سر سے پاؤں تک شادمانیوں میں غرق اور لذتوں میں شرابور ہے، اُس وقت تک میری نگاہوں کو سیرت شناسی اور سینہ تلاشی کا فن نہیں آتا تھا۔

تانگہ آیا اور ہم پیسہ اخبار میں نصراللہ خاں کے احاطے میں جا اُترے جہاں صدیق نے دو روپے ماہانہ پر ایک کوٹھڑی لے رکھی تھی یہاں آئے ابھی ایک گھنٹہ بھی

ـــــه دوہنا سے ہے جس کے معنی ہیں دُودھ نکالنا لیکن یہاں کام لینا اور استعمال میں رکھنا اور محنت مشقت کے معنے ہیں۔

نہیں ہوا تھا کہ صدیق نے میرے لئے کام تجویز کر دیا "میں تمہارے لئے مزدوری یا ملازمت تلاش کروں گا، تم جتنے دنوں بیکار رہو روٹی وغیرہ پکا لیا کرو اور گھر پر ہی رہو! کل سویرے دونوں پیسے ملا کر کھانے کا سامان لے آئیں گے۔"

میں صبح و شام صدیق کے لئے روٹی پکا کر فراغت میں لاہور کی نئی گلیوں اور نامانوس بازاروں میں دیوانوں کی طرح حیران و پریشان پھرا کرتا۔ مجھ جیسے اجنبی کے لئے اس کارخانۂ تہذیب کی ہڑبونگ اور دکانوں میں سکوں کے ستاروں کے طلوع و غروب الامان والحفیظ صبح سے شام تک کا فاصلہ اسی دریائے حیرت میں طے ہوتا، کہیں کہیں حُسن کا فسوں اور صورتوں کا جادو دل کو جھنجھوڑتا ہوا گزر جاتا لیکن میرے دل و دماغ کے محاذ پر توغموں کے غنیم کی چڑھائی ہو رہی تھی علاوہ ازیں میری نگاہیں ہر نسوانی صورت میں شمعی کا معطر نور ڈھونڈھتی تھیں اور وہ ناپید تھا۔ کبھی کبھی ترقی کا فریب موت کے راستے کو اوجھل کر دیتا اور نشاط کے امکانات سے فریاد و شیون کی راہوں میں پھاٹک لگ جاتے۔ کسی کسی مقام پر نئی تہذیب گناہوں کی داغ بیل لگانے میں مصروف نظر آتی مگر میری غیرت نگاہوں کو للکار دیتی، شب و روز یہ تماشا ہوتا رہا اور میں اپنی کج فہمی سے یہ سمجھتا رہا کہ میرا شریک میرے لئے ملازمت تلاش کر رہا ہے، چونکہ وہ اس ماحول سے اچھی طرح آشنا ہے اس لئے مجھے تگ و دو کی ضرورت نہیں! چنانچہ ایک ہفتے سے زیادہ اسی طرح گزر گیا، اب میری پونجی میں چند سکے باقی رہ گئے تھے، مجھے دیوانگی سی ہونے لگی اور والدین کے پُر اُمید چہرے میرے سامنے پھرنے لگے، رہ رہ کر دل میں ایک تڑپ سی جاگتی اور رہ جاتی۔

میں پھر بھی صدیق کے جواب کا انتظار کرتا رہا آخر ایک دن میں صبح صبح ہی خاموش گھر سے نکل گیا اور گلی کے موڑ پر ایک معمار[1] کو جاتے دیکھ کر اس کے پیچھے پیچھے

---

[1] اس معمار کا نام محبوب اللہ تھا اور بجنور سے آیا ہوا تھا۔

ہو لیا۔ لیکن مزدوری کے لئے کچھ کہتے میری زبان نہیں اُٹھتی تھی مگر مجبوری بھی آخر مجبوری ہوتی ہے۔ مَیں نے بصد جرأت مستری کو مخاطب کیا۔

مَیں :۔ "مستری صاحب اگر آپ کو کسی مزدور کی ضرورت ہو تو مجھے کام پر لے چلیں۔"

مستری :۔ "کہاں سے آئے ہو بھائی تم؟"

مَیں :۔ "ضلع مظفر نگر کے ایک قصبہ کا رہنے والا ہوں ابھی چند روز ہوئے آیا ہوں۔"

مستری ۔ "وہاں کیا کام کرتے تھے، کھیتی کا سلسلہ تھا یا کچھ اور؟"

مَیں :۔ "بدقسمتی سے نہ مَیں زمیندار ہوں نہ کاشتکار، ایک مزدور باپ کا اکلوتا بیٹا ہوں تھوڑا بہت لکھا پڑھا بھی جانتا ہوں مگر مزدوری کر لیتا ہوں، وہاں بھی مزدوری ہی کرتا تھا، جب سے آیا ہوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے ٹھالی بیٹھا ہوں اور بوڑھے ماں باپ کے پاس کوئی رقم چھوڑ کر نہیں آیا تھا میرا خیال تھا اور میرے ساتھی نے مجھے یقین دلایا تھا کہ جاتے ہی کام مل جائے گا مگر اُس نے اب تک کوئی جواب نہیں دیا اور میری جان پر بنی ہوئی ہے، جو ساتھ لایا تھا، وہ نیگ[۵] لگ چکا ہے"۔

مستری ۔ "بھائی تم رہتے ہو کہاں؟"

مَیں ۔ "جہاں رہتا ہوں آپ اُس احاطے سے ذرا دُور آ گئے ہیں اگر گنجائش نکل سکے تو کل صبح یا جس وقت آپ فرمائیں اِسی جگہ آپ کا انتظار کروں گا۔"

مستری :۔ "کل صبح یہیں مل جانا انشاء اللہ کام ہو جائے گا۔"

جب مستری نے مجھے مزدوری کی امّید دلائی تو اُس کی آنکھوں میں بے غرضانہ رحم اور ہمدردی کی لہریں تیر رہی تھیں اور مجھے اس کی اس خدائی شفقت سے ایسی

---

[۵] نیگ لگنا۔ ٹھکانے لگنا۔ کام آ جانا۔ صرف ہو جانا۔

خوشی ہو رہی تھی جیسے خشک مٹی پر بارش ہونے سے سوندھی خوشبو طبیعت کو بحال کر دیتی ہے۔

دُوسرے دِن مُنہ اندھیرے سے ہی میں وہاں آ کر مستری کا انتظار کرنے لگا بہت انتظار کے بعد مستری صاحب آئے اور بولے چلو میں نے ٹھیکیدار سے پوچھ لیا ہے۔

نیلا گنبد کے قریب ایک بینک پر مدد لگی ہوئی تھی اور وہاں جے پور کے قریب جوار کے مزدور کام کر رہے تھے، اُنھوں نے مجھے نیا اور انجان آدمی دیکھ کر اینٹیں ڈھونے کا کام بتایا۔ میں نے مستری سے کہا مجھے اینٹیں ڈھونے کا ربط[۵] نہیں، چُونا اور گارا ڈھو سکتا ہوں۔

مستری نے تعجب سے کہا "تم تو کہتے تھے میں نے مزدوری کی ہے"

میں:- "جی ہاں اب بھی وہی بات کہہ رہا ہوں مگر جہاں میں نے مزدوری کی ہے وہاں اس طرح لکڑی کے تختے پر چودہ[۱۴] اینٹیں جوڑ کر اُٹھانے کا رواج نہیں، میں نیا آدمی ہوں جب لوگوں کو اُٹھاتے دیکھوں گا تو دو چار روز میں یہ بھی کرنے لگوں گا۔"

مستری:- "میاں یہاں تو یہی کام ہے۔"

اِدھر مستری نے یہ فقرہ کہا اُدھر مزدوروں میں سین مٹکا شروع ہو گئی، ایک نے بلند آواز سے کہا۔ وہ کانا، وہ گیا! مجھے ندامت سی ہو رہی تھی اور یہ خیال قدم گیر تھا کہ یہاں میرے پاس نہ تو کوئی ایسی رقم ہے اور نہ کوئی ایسا آدمی جو مدد کر سکے، ماں باپ میرے منی آرڈر کا انتظار کر رہے ہوں گے، اُن کا سہارا بھی تو وہاں خدا کے سوا کوئی نہیں۔ میں نے مستری سے کہا میں مزدوری کروں گا اور انہی مزدوروں کی طرح کروں گا آپ بے فکر رہیں۔"

اگرچہ بانس کی سیڑھی پر چودہ اینٹیں سر پہ رکھ کر چڑھنا میرے لئے مَوت سے کھیلنا تھا مگر میں نے اُسی جانکاہی میں شام کر دی، البتہ گھر پہنچ کر آدھی رات تک میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ کل مجھ سے مزدوری ہو سکے گی یا نہیں۔ ایک طرف تو بانس کی دو منزلہ

---

۵ ربط: عادت۔ مشق۔ یہ مقامی محاورہ ہے جو پس ماندہ طبقے میں بولا جاتا ہے۔

سیڑھی کا تختۂ دار میری نظر میں تھا دوسری طرف بوڑھے اور معذور والدین کے منتظر چہرے میرے سامنے پھر رہے تھے۔ اسی شش و پنج میں آنکھ لگ گئی اور صبح ہوتے ہی بوڑھے والدین کی زندگیاں اور بیوی کی روایت زدہ خاموشی کا خیال مجھے پھر اسی مزدوری پر لے گیا، ایک ہفتہ میں اینٹیں ڈھوتا رہا لیکن جوں جوں دن گزرتے جاتے تھے میں اس محنت اور مشقّت کا عادی ہوتا جارہا تھا، پندرہ سولہ روز کے بعد وہ مزدوری مجھے معمولی سا کام معلوم ہونے لگی اور میں اچھّی طرح سمجھ گیا کہ جب مشیّت کسی کو کسی رستے پر ڈالتی ہے تو اس کو اتنی ہی صلاحیت اور قوّت بھی عطا کرتی ہے اس وقت تکلیف کا احساس بھی زیادہ نہیں ہوتا۔ جیسے طویل سفر میں راہ گیر دو ایک منزلیں مار چکنے کے بعد ایسی اطمینان بخش طاقت سے متعارف ہوجاتا ہے کہ اس کے سنگین اور اٹل ارادے رکاوٹوں کی دیواروں اور حادثوں کی گرفت کو قابلِ تسلیم نہیں گردانتے اور اس کی اُمّیدیں اپنی قوّتوں کے سوا کسی اور پر دارومدار نہیں رکھتیں اس کا دھیان منزل پر ہوتا ہے۔

جب پندرھواڑے کا پچھا بنتا تو میں نے اپنے لئے معمولی سے مصارف رکھ کر سب روپیہ والد صاحب کے نام منی آرڈر کر دیا اس کے بعد پندرہ دن اور کام لگا اور پھر اللہ اللہ خیر سلّا!

سرّاجی میں اپنی بے روزگاری سے پریشان سا رہتا تھا، جہاں ملازمت یا مزدوری کے لئے پُوچھتا مخاطب کے ماتھے پر توجّہ کی کوئی شکن نہ اُبھرتی، اور نہ چہرے پر مخاطبت کی کوئی سلوٹ رینگتی اور میں اپنی سُونی آنکھیں لئے آگے بڑھ جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے معاملے میں لوگ پتھر کی آنکھیں تانبے کے ہونٹ اور لوہے کے دماغ لئے پھرتے ہیں ایک دن پھرتا پھراتا سرکلر روڈ سے برانڈرتھ روڈ کی طرف مُڑا تو میں نے دیکھا کہ ایک دکان پر گھوڑوں کے ساز بن رہے ہیں اور کچھ کاریگر ہاتھ سے سلائی کر رہے ہیں۔ چونکہ میں نے اپنے وطن کاندھلہ ہی میں چمڑے پر بخیہ کرنے

میں ہاتھ رواں کرلیا تھا۔ اس لئے کاریگروں کو دیکھنے کے لئے کھڑا ہوگیا وہ مشین کی طرح جلدی اور باریک سلائی کررہے تھے۔ جب مجھے ذرا دیر ہوگئی تو مالک دکان نے مجھ سے کہا "کیا دیکھتے ہو؟"

"کام دیکھ رہا ہوں" میں نے جواب میں کہا۔

مالک دکان نے پوچھا "کیا کام کرتے ہو؟"

"کام تو یہی کرتا تھا لیکن آج کل بیکار ہوں" میں نے جواباً کہا۔

مالک :- "کام کرنا چاہو تو کل سے آجاؤ۔ ترائی ہوجائے گی۔"

میں :- "تھوڑا بہت کام دے کر ترائی تو ابھی لے لیجئے"!

مالک :- "آجاؤ دکان میں آجاؤ۔ بیٹھ کے تھوڑا بہت کام کرو۔ یہ کہہ کر اُس نے ایک آر، زرد دھاگے کی ریل اور ایک بیگ کا پاکھا میری طرف پھینک دیا اور کہا "لو اس کی سلائی کرو۔"

اگرچہ مجھے کام چھوڑے زمانہ ہوگیا تھا لیکن میں نے اللہ کا نام لے کر سلائی شروع کردی۔ آس پاس کے کاریگروں نے کن انکھیوں سے دیکھ کر کہا "کاریگر تو ہے مگر چلے گا نہیں"، ایک کاریگر بولا "بہت دنوں سے کام چھوڑا ہوا لگتا ہے، دو چار روز میں دیکھنا یہ تو اُڑنے لگے گا، اناڑی نہیں ہے۔"

میں نے ایک گھنٹہ کام کرکے مالک کو دکھایا اُس نے ٹانکوں کی یکسانیت کو دیکھ کر کہا "برا نہیں، چل جائے گا مگر ابھی ہاتھ ٹھنڈا ہے اور صفائی بھی کچھ ایسی ہی ہے رفتہ رفتہ اپنی رفتار پہ آئے گا، کل سویرے سے کام پر آجاؤ جی!"

میں :- "کب سے کب تک کام ہوگا؟"

مالک :- "یہاں تو سب ٹھیکے پر کام کررہے ہیں اور شام تک دو ڈیڑھ روپے سے کم کوئی بھی کاریگر لے کر نہیں جاتا۔"

مَیں دُوسرے دن سویرے ہی دُکان پر جا دھمکا، اس وقت تک مالکِ دکان نہیں آیا تھا تھوڑی دیر میں وہ بھی آگیا اور آتے ہی اُس نے مجھے آر، رانپی، موم اور دھاگا دے دیا اور اپنے قریب ہی کام پر بٹھالیا، چِٹّھی رسانوں والے ڈاک کے تھیلے بن رہے تھے مَیں نے وہاں چھ سات روز کام کیا اور اچھّی خاصی مزدوری پڑی۔

ایک دن میں بیٹھا کام کر رہا تھا اور برابر کا کاریگر اپنی زبان میں کوئی راگ ہلکی ہلکی لَے میں گنگنا رہا تھا، نہ جانے اُس کے راگ کی طرف توجّہ تھی یا میری بے خیالی، میرے بائیں ہاتھ کی انگلی میں آر، پار ہو گئی، مَیں نے آر میں دھاگا ڈال کر آر کھینچی، خُون جاری ہو گیا۔ میں نے کھوسن[1] بہتے ہوئے خون کی جگہ رکھّا اور انگلی باندھ لی لیکن کام کے قابل نہ رہا، مالک روکتا بھی رہا مگر مَیں نے کہا کہ اب مُجھ سے کام نہیں ہو گا معافی چاہتا ہوں۔ مالک مُجھ سے بہت خُوش تھا اُس نے اُسی وقت میرا حساب بیباق کر دیا اور کہا جب بھی کام کے قابل ہو جاؤ اس دُکان پر تُمہارے لئے ہمیشہ کام رہے گا۔

اس کام میں مزدوری تو اچھّی تھی لیکن ساتھیوں کی گُفتگو اور چرس کے دھوئیں میں کام کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی، چنانچہ مَیں پھر اُس دُکان پر نہیں گیا۔ ایک دن راستے میں مالک دُکان سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی، وہ بڑے تپاک سے ملا اور میری خیریت پوچھ کر کام کے متعلّق دریافت کیا، مَیں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مَیں ایک اور جگہ کام کر رہا ہُوں۔

مالک نے ہمدردانہ لہجے میں کہا جب بھی تمہارا جی چاہے دُکان پر آ جاؤ، تمہارے لئے ہر وقت کام ہے۔

---

[1] کھوسن:- چمڑے کی باریک چھیلن۔

شورش کاشمیری

میرے محلے کے چھ سات آدمی اور بھی لاہور میں عرصہ سے مقیم تھے، اُن میں کچھ ٹرنک ساز تھے اور کچھ کلچوں اور باقرخانیوں کے کاریگر، اُن میں بشیر احمد تو بہت بڑا اُستاد تھا اور اُسی نے محلے کے کئی عزیزوں کو یہ کام سکھا کر لاہور میں برسرِ روزگار کردیا تھا۔ اسی بشیر کے قریبی عزیزوں میں منظور حسن اور شبیر حسن بھی تھے، جنہیں وہ ساتھ لایا تھا۔ وہ قریب ہی ایبک روڈ کے آخر میں اونچی مسجد کے سامنے ایک کلچوں کے تنور پر ملازم تھے، اتفاقاً ان سے ملاقات ہوگئی تو اُنھوں نے دوسرے دن صبح دکان پر آنے کے لئے کہا اور یہ بھی کہا کہ ہوسکتا ہے وہیں کہیں کوئی کام بھی مل جائے، ہماری دکان پر بہت کام کے لوگ آتے جاتے ہیں۔

میں دُوسرے روز منظور حسن کے پاس پہنچ گیا اُنھوں نے چائے اور کلچہ سے میری تواضع کی، دُکان کا مالک ایک کشمیری بزرگ امیر بخش نامی تھا۔ بڑا خوبرُو، جہاں دیدہ اور فراخ دل انسان۔ مَیں چائے پی رہا تھا اور وہ رہ رہ کر بڑے غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ غالباً منظور حسن اور شبیر حسن اُس سے میرے متعلق ذکر کر چکے تھے، اُس نے بڑے غور وخوض کے بعد مجھ سے پُوچھا "تُو کچھ تھوڑا بہت لکھا پڑھا بھی ہے؟"

مَیں نے کہا "کیوں؟ اچھا خاصا لکھ پڑھ لیتا ہوں اور حساب کتاب بھی بُرا نہیں جانتا"۔ مجھے خیال ہُوا کہ وہ دکان کے حساب کتاب کے لئے یہ سوال کر رہا ہے۔

امیر بخش "ہُوں! ہُوں" کہہ کر خاموش ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب مَیں چلنے لگا تو مالک دُکان نے کہا "کہاں جا رہا ہے بیٹھ جا" مَیں ٹھہر گیا اور اُس نے منظور حسن کو 'منظورا' کہہ کر متوجہ کیا اور کہا اس کے لئے چائے اور لا۔ چائے آگئی اور مَیں آہستہ آہستہ پینے لگا ابھی پیالی ختم نہیں ہوئی

تھی کہ ایک تپلا دُبلا مجھ جیسا ہی لڑکا آیا اور اس بزرگ سے پیسے مانگنے لگا، اُس نے نہایت محبت اور شفقت سے اُسے پیسے دئے اور جب وہ گھر جانے لگا تو اُس نے نہایت نرم لہجے میں اُسے " عبدالکریم " کہہ کر مخاطب کیا اور کہا " کم بختا کل سے صبح ہی کتاب لے کر آجایا کر اور اس منشی احسان سے پڑھ لیا کر۔"

عبدالکریم نے بڑی توجہ سے میری طرف دیکھا اور زبان کو اوپر کے ہونٹ پر پھیرتے ہوئے " اچھا " کہہ کر چل دیا، عبدالکریم جب گھر جا رہا تھا تو اس کی گردن اس کے دونوں کندھوں کی طرف باری باری جھکتی جا رہی تھی جیسے تیز ہوا میں کوئی گچھے دار شاخ جھومنے لگے، اس کے بڑے پائینچوں کی گوٹ ایک ایک انچ میل کچیل میں رنگی ہوئی تھی۔ جو زمین پر مٹی چاٹتی ہوئی چلتی تھی، اس کا سلیپر پاؤں سے نکل کر ایک ایک فٹ آگے چلنے کی کوشش میں تھا۔

دُوسرے دن علی الصبح میں عبدالکریم کے دادا کی دُکان پر آگیا اور تھوڑی دیر میں عبدالکریم بھی جھومتا جھامتا کتابیں لئے آپہنچا۔ مَیں نے اُسے دو گھنٹے پڑھایا اور اندازہ کیا کہ وہ فطرتاً ذہین لڑکا ہے۔ اس کے بعد وہ معمول کے مطابق اپنے دادا سے پیسے لے کر مجھے سلام کرتا ہوا چلتا بنا۔ یہ سلسلہ طویل عرصہ جاری رہا۔

چوتھی جماعت میں کامیابی کے بعد بھی عبدالکریم مجھ سے ملتا رہا، اور میرے شب و روز آلام و مصائب کی آندھیوں سے گزرتے رہے۔ مدّت کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ ظالم تو شعر کہنے لگا اور اُلفت تخلص کرتا ہے۔ مجھے وہ تخلص پسند نہ آیا اور مَیں نے اُسے اُلفت سے شورش کر دیا۔ وقت گزرتا گیا، اس کے بعد وہ کچھ دنوں مولانا ظفر علیخاں مدیر روزنامہ زمیندار اور کچھ روز حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کی خدمت میں تربیت پاتا رہا۔ جس سے اُسے اسلامی تاریخ کے اہم اہم پہلوؤں اور سیاست کے پیچ و خم پر عبور ہو گیا اور اس نے تقاریر شروع کر دیں، ہوتے ہوتے وہ ایک

شعلہ نوا مقرّر ہو گیا اور بڑے بڑے جلسوں میں لوگ اس کی تقریریں پسند کرنے لگے۔ اسی سیاسی جنون میں ملک کی فلاح و بہبود کے تصوّر سے اُس نے ایک طویل عرصہ جیل میں گزارا اور بڑی بڑی سختیاں برداشت کیں مگر مذہب اور سیاست نے اس کے سینے میں اپنی جڑیں پھیلا دی تھیں جب وہ جیل سے رہا ہوا تو اُس کا جنون پھر اُسی طرح آزاد ہو گیا، آج وہی شورش ہفتہ وار اخبار "چٹان" کا مالک و مدیر ہے اور زبان و قلم کا ایسا مجاہد کہ ملک کا بچہ بچہ اس کی تقریر و تحریر کے افسوں کا والہ و شیدا ہے اب وہ پاکستان کا نامور صحافی بھی ہے اور سیف زبان مقرّر بھی، اپنے علمی، ادبی سفر میں وہ کہیں کا کہیں پہنچ چکا لیکن شاعری کے معاملے میں وہ اب تک مجھ سے مشورہ کرتا ہے، شروع سے اب تک جو اس کی نظر میں میرا احترام ہے وہ اس دَور میں مُشکل ہی سے کسی اصیل شاگرد میں ملے گا۔

اپنی خوش فہمی کے تحت میرے پاس جب کوئی غریب، مفلس مصیبت زدہ یا طالب علم پریشانی میں امداد طلبی کی غرض سے آجاتا ہے تو میں رقعہ دے کر شورش کے پاس چلتا کر دیتا ہوں، وہ صرف میرے دستخط دیکھ کر غریبوں اور مستحق لوگوں کی خاطر خواہ امداد کر دیتا ہے۔ اور اب جوں جوں وہ عُمر کے بلند مقام کی طرف جا رہا ہے، اُس میں کچھ ایسی نیکیاں اُبھرتی آرہی ہیں جو اُسے سرمایہ دارانہ خصوصیات سے علیحدہ کرتی ہیں۔ وہ متلوّن مزاج، لاابالی اور مغلوب الغضب انسان ضرور ہے لیکن اپنی بُرائیوں پر نیکیوں کا لیبل نہیں لگاتا، اُس میں ایک مردانہ پندار ہے جس میں وہ ہوش سے بیگانہ نہیں ہوتا، اس میں ایک اسلامی رُوح بیدار ہوتی جا رہی ہے اور سرمایہ پرستی کی شدّت سے مخالفت کرتا ہے، وہ اس دَور کے ہزاروں مسلمانوں سے اچھا مسلمان ہے اور سینکڑوں صحافیوں سے بہتر صحافی، اُس کا قلم اور زبان دونوں پُرتاثیر ہیں۔ اس پر شاعرانہ گم شدگی اکثر اوقات ایسی طاری ہوتی ہے کہ آسیب زدگی کا گمان

ہونے لگتا ہے۔ وہ اسلام کا مرثیہ خواں بھی ہے اور مجاہدین کے ہراول دستے کا علمبردار بھی، وہ شدید الاحساس انسان ہے جو اچھے اور بلند شعراء کا طرۂ امتیاز ہوتا ہے، موجودہ وقت میں مقدار کار بڑھنے کے باوجود وہ مطالعہ سے غافل نہیں رہتا۔ تاریخ اسلام پر اُس کی گہری نظر ہے۔ اور غاصبوں کے پسینے کی بُو کو پہچانتا ہے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ وہ حکومت پر نکتہ چینی، اسلام پسندی، بیباکیٔ قلم اور جرأت بیان کی پاداش میں گرفتار ہو گیا تھا، چند روز کے بعد وہ عزت اور نیکنامی کے ساتھ رہا تو ہو گیا مگر جیل سے آکر ناموسِ رسول کے تحفظ کا جنون اور حق گوئی کا لپکا پھر اُسے شعلہ نوائی تک لے آیا اور جب اس کی زبان پہ فرشتوں کا لہجہ اعلان کرنے لگا تو پھر گرفتاری عمل میں آگئی۔ اب کی گرفتاری کے ساتھ "چٹان" کا ڈیکلریشن اور "چٹان" پریس بھی ضبطی میں آگیا، چند روز بعد اُس کا ہفت روزہ "چٹان" تو بحال کر دیا گیا مگر زندان کی آغوش نے اپنا فشار کم نہ کیا جب اُس نے دیکھا کہ زندان کے قید و بند سے اُس کے مشن کا کام نرم پڑ گیا تو اُس نے بھوک ہڑتال کر دی اور پینتالیس دن کا فاقہ کیا! جب ڈاکٹروں نے اس کی قوّت حیات بس چوبیس گھنٹے سے زیادہ کی سکت نہ پائی تو رات ہی کو مُلک کے صدر محمد ایوب خاں کو اطلاع دی گئی، اُس نے اُسی وقت اپنے گرد و پیش سے مشورہ کیا لیکن جواب ملا کہ ملک میں روزانہ ہزاروں آدمی مرتے ہیں یہ گورنمنٹ کی عزت کا سوال ہے لیکن ایوب خان نے بڑی دُور رَسی سے کام لے کر کہا کہ میں آغا شورش کی موت کا دھبا اپنی تاریخ کے دامن پر نہیں لے سکتا اُسے اِسی وقت رہا کر دیا جائے! پھر کیا تھا اُسی وقت تار کھڑک گئے ٹیلیفون ٹنٹنا گئے اور ریڈیو اسٹیشن کے بے زبانوں میں قوّتِ گویائی آگئی۔ آغا شورش کی رہائی سے ملک کے سوچنے سمجھنے والے طبقے میں محمد ایوب خان کی زیرکی اور حُسن انتظام کا سکّہ بیٹھ گیا۔ کاش اُس سے اُس کے دست و بازو کا نہ

کرتے اور وقت خراب نہ ہو جاتا۔ صائب نے کیا خوب کہا ہے ؎

دوست دُشمن میشود صائب بوقتِ بیکسی

خونِ زخمِ آہوواں رہ میدہد صیّاد را

جیل سے نکلتے ہی شورش نے اپنے حالات پر قابُو پا لیا۔ لیکن وہ ایسا مُسلمان ہے کہ اس کا خُون ٹھنڈا ہونے میں نہیں آتا، مَیں نے ہزار اُسے سمجھایا کہ جذبات سے زیادہ بصیرت سے کام لو! کیونکہ اگر حکومت بدگمان ہو جاتی ہے یا اچھے حاکم برسرِاقتدار آجاتے ہیں تو اُس وقت خفیہ پولیس شریفوں کے آگے سونگھتی پھرنے لگتی ہے اور یہ لوگ کھوکھلے قوانین کے ناجائز ہتھیار لے کر شکار کو نکل پڑتے ہیں۔ آبادیاں اُن کی شکارگاہیں اور شریفوں کے محلّوں میں نوادر کے علاوہ باعزّت لوگ ان کا شکار قرار پاتے ہیں اور ایسی ہر بڑی شکار پارٹی میں قوم فروش لیڈروں اور دین فروش علماء سے ہانکا لگوایا جاتا ہے۔

میرے سامنے تو وہ ہاں ہاں کر لیتا ہے لیکن اس کی فطرت کہاں جا سکتی ہے قریب قریب چار پانچ سال سے میں اُس کے سر ہوں کہ تم لکھنے پڑھنے کے آدمی ہو کوئی نہایت وسیع قسم کا ادارہ قائم کرو جس میں معیاری تصنیف و تالیف کے لوگ اچھّی اور مفید کتابیں لکھیں جس سے مُلک اور قوم کی یہ حالت بدلے وہ احتراماً سر جھکائے خاموش بیٹھا رہتا ہے۔

واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں ؏

شورش جسے اچھا سمجھتا ہے اس کی عزت کرتا ہے اور جسے بُرا خیال کرتا ہے۔ اُسے نظر انداز کر دینا ہی سب سے بڑی سزا گردانتا ہے۔ انہی الیکشنوں کے دنوں کا واقعہ ہے کہ جناب الطاف حسنؔ قریشی اپنی بعض تحریروں کے انجام اور بعض بیانات سے گھبرائے ہُوئے تھے[1] ایک دن اُنہیں کے دفتر کے معتبر لوگوں میں سے ایک شخص نے جناب الطاف حسن قریشی کے درون و بیرون میں کئی ایک مین میخ نکالیں اور شورش

---

[1] مدیر ماہنامہ اُردو ڈائجسٹ لاہور

سے کہا کہ یہ تمام باتیں آپ "چٹان" میں لکھیں اور اُسے مزا چکھائیں! ہر چند کہ شورش مُنہ پھٹ، گُلیر اور مغضوب الغضب انسان ہے اور اس کی زبان کا ٹانکا بھی ٹوٹا ہوا ہے لیکن اس بات پر اُس نے مرکھنے بیل کی طرح جو اپنی ناک چاٹتا رہتا ہے اُوپر کے ہونٹ پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "بھائی وہ بیچارا تو آج کل خود ہی بوکھلایا ہوا ہے، مَیں اُس کے خلاف کچھ نہیں لکھوں گا، اِس سے تو مَیں خود ظالموں کی صف میں آ جاؤں گا مَیں جانتا ہوں کہ الطاف حسین کی عظمت طلبی خود پسندی کی حدود کو بھی عبور کر رہی ہے لیکن ایسے وقت میں اُس کے خلاف لکھنا میرے اصُول اور مشرب میں نہیں آتا۔"

اِسی طرح جناب کوثر نیازی جب جیل گئے تو برادرانِ یُوسف کی طرح کئی لوگوں نے شورش کو بھڑکانا چاہا اور زور دیا کہ کوثر کے خلاف فلاں فلاں باتیں لکھو اور فلاں تشبیب کو رُسوا کرو۔ اُس پر شورش نے جواب دیا۔ "اُس سے پہلے مجھے موت آ جائے جب میں کسی مصیبت زدہ انسان کی پریشانیوں میں اضافہ کروں اور اپنے قلم کو اُس کے خلاف جنبش دُوں۔ اب تو اگر موقع آیا تو مَیں اُس کی مدد کروں گا، مَرد اس طرح دشمنی نہیں کرتے جس طرح آپ مشورہ دے رہے ہیں، خدا اُس پر رحم فرمائے، دُشمنی کا مزا تو آمنے سامنے رہ کر آتا ہے۔

مَیں اُس کھُردری طبیعت کے انسان کی اخلاقی بلندی سے حیران رہ گیا، وہ مُنہ کا ٹرّا[1] اور زبان کا کڑوا ضرور ہے لیکن اسی ناہمواری اور کھُردرے پن کے جنگلوں سے اخلاقی پگڈنڈیاں بھی نکلتی ہیں اور کہیں کہیں تو وہ اُن درویشوں کے اخلاق و محاسن کا حامل ملتا ہے جن کا وجود دُنیا کے لئے باعثِ رحمت خیال کیا جاتا ہے۔

اب لگے ہاتھوں اُس کی لااُبالی طبیعت کا بھی ایک واقعہ بیان کر دوں ایک دفعہ اس کی تحریروں سے متاثر اور تقریروں کا شہر دھالیہ ایک شخص کہیں دُور دراز سے اس کی مُلاقات کے لئے لاہور پہنچ گیا، شورش اتفاق سے اُس وقت

[1] ٹرّا: زبان زور۔ زبان دراز

غسل خانے میں تھا۔ ملازم نے غسل خانے کے کواڑ سے منہ ملا کر کہا، آغا صاحب! کہیں باہر سے کوئی صاحب ملاقات کو آئے ہیں، آغا رات بھر کچھ لکھتے رہے تھے اور غسل کر کے ذرا دیر سو جانا چاہتے تھے اور ملاقات کو آنے والے صاحب کا دل بھی توڑنا نہیں چاہتے تھے، جلدی جلدی نہانے لگے، آنے والے شخص نے اس کے ملازم سے کہا مجھے جلد واپس جانا ہے دیر ہو گئی تو گاڑی نکل جائے گی، ملازم نے یہی الفاظ پھر غسل خانے میں براڈکاسٹ کر دیئے۔ جناب اس قدر بوکھلائے کہ کپڑے پہننے کا خیال بھی نہ رہا اور ننگے تولیا کاندھے پر ڈالے غسل خانے سے باہر نکل آئے ملاقاتی حیرت میں گم ہو گیا، نوکر نے اشارے سے عریانی کی طرف متوجہ کیا تو وہ بھاگ کر دفتر میں جا گھسے اور اپنے کمرے میں جا کر نوکر سے کپڑے منگائے اور مہمان سے معافی چاہی، آنیوالا شخص جو شورش کو علامہ، مجاہد، ساحری زبان اور نہ جانے کن کن القاب سے یاد کر رہا تھا، دم بخود تھا، پھر کہنے لگا "یہ بھی ایک ادائے قلندری ہے"۔ ایسے لوگوں کو دنیا دار نہیں کہا جا سکتا، مجھے تو شورش کی اس ادا نے اور بھی دیوانہ کر دیا۔"

پریشاں روزگاری

میرا ساتھی صدیق میری پریشاں روزگاری سے کچھ خاموش سا رہتا تھا غالباً اُسے یہ احساس تھا کہ وہ روزگار کے سلسلے میں میرے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکا۔ اب چونکہ میں لاہور کے چند راستوں اور ہاٹ بازار کی بھیڑ بھڑکا سے آگاہ ہو چکا تھا اس لئے کچھ حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ میں کئی جگہ کام کی تلاش میں گیا مگر کسی نے نہ قبولا جس کی وجہ یہ تھی کہ لاہور کے مستری معماروں اور جمعدار مزدوروں سے اپنا محنتانہ بطور رشوت دو دو چار چار روز کی اُجرت لیتے تھے اور میں اس لین دین سے آگاہ نہ تھا، جب میری بے روزگاری کی عمر پندرہ دن ہو گئی تو میں گھبرا گیا کہ الٰہی اب کیا ہو گا، اگرچہ صدیق تسلّی دیتا رہتا تھا مگر مجھے اس کی تسلّیوں کے باوجود ماں باپ کی فاقہ کشی کا خیال اور بیوی کی مجبور خاموشی دیوانہ بنائے ڈالتی تھی۔

اِس دَوران میں شمعی کے دو خط آئے۔ پہلے میں اس نے لکھا " کاش آپ ترکِ وطن میں عجلت نہ کرتے اور اس میں ذرا مجھ سے مشورہ کر لیتے۔ آپ پردیس میں ہیں، نہ معلوم روزگار کب میسّر ہو اگر روپے پیسے کی ضرورت ہو تو مجھے بے تکلف لکھ دیں اور گھر کی طرف سے بے فکر رہیں۔" دُوسرے خط میں صرف عافیت خواہی تھی اور صرف ایک یہ فقرہ " میرے لئے بھی تو کچھ لکھیئے کیا کروں؟" چنانچہ وہ کئی بار میرے مکان پر گئی اور میری بیوی کو کچھ رقم دینا چاہی لیکن اس نے کہا کہ " منی آرڈر آ گیا تھا وہ روپیہ چل رہا ہے فی الحال کسی رقم کی ضرورت نہیں۔" مگر قاضی محمّد زکی صاحب نے ایک دن ملازم کے ہاتھ ایک بوری گیہوں بھیج دیئے، والد صاحب نے بہ اصرار واپس کرنا چاہے مگر نوکر کو تاکید تھی کہ ہرگز واپس نہ لائے۔

بیکاری کے باعث میں سخت پریشان تھا کہ والد صاحب کا خط پہنچا، اُنھوں نے لکھا تھا کہ قاضی صاحب نے ایک بوری گندم کی بھیجی ہے، شاید تم نے انہیں لکھا ہو گا، یہ کوئی اچھی بات نہیں اس طرح انسان نظروں سے گر جاتا ہے، ہم جس حال میں ہیں خوش ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ نیز تمہارے لئے دُعائیں تمہاری والدہ کا معمول ہے

خط پڑھ کر مَیں نادم سا تو ہو گیا مگر میرے تردّد کا وہ بخار اُتر گیا جو مجھے ناتواں بنائے دے رہا تھا۔ اور اس سے خوشی تھی کہ شمعی سے کچھ نہیں لیا گیا۔

نامہ نویسی

مَیں خاموش بیٹھا تھا کہ صدیق باہر سے آیا اور ماتھے پہ ہاتھ مار کر بولا۔ " دوست ایسا کام سُوجھا ہے کہ چاندی ہی چاندی ہے۔"

" وُہ کون سا کام ہے؟" مَیں نے جیتی جاگتی آواز میں پُوچھا۔

صدیق۔ " ٹبّی بازار[1] میں اگر تم خط لکھا کرو تو شام تک دس پانچ روپے کے پیسے

---

[1] لاہور کی ایک گلی جس میں کبھی پیشہ ور عورتیں بیٹھتی تھیں۔ اگرچہ حکومت نے ایسے کاروباری اڈّوں کو ختم کر دیا ہے لیکن گلی کا نام ابھی تک وہی چلا آتا ہے۔

لے کر اُٹھو گے اور تمہاری شعر بازی کا ڈنکا پٹ جائے گا۔

مَیں "۔ چلو جہاں بٹھا دو گے بیٹھ جاؤں گا" اُس بازار کا تصوّر بھی میرے ذہن میں نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی بارونق بازار ہو گا۔

"دوات قلم اور کاغذ تیّار کر دُوں ؟" صدیق بولا۔

"چلو دوات قلم میرے پاس ہے۔" مَیں نے جواباً کہا

صدیق مجھے ہمراہ لے کر چل دیا اور چلتے میں ایک حجّام کی دکان کی طرف اشارہ کر کے بولا۔" اس تھڑے پر ایک طرف کو بیٹھ جایا کرو اور تمام دن مزے سے کیمیا گری کرو۔"

جب صدیق یہ گفتگو کر رہا تھا اُس وقت میرا یہ عالم تھا کہ سامنے کے تمام مناظر اُداس ہوتے جا رہے تھے اور ایک نامانوس دھندلکا میری نگاہوں کے راستے روک رہا تھا۔ لیکن چونکہ مجھے بے روزگاری نوچ رہی تھی اس لئے میں کچھ نہ بولا اور بیدلی سے ہاں میں ہاں مِلاتا گھر آگیا، اُس نے اپنی تجویز کو زور دار بنانے کے لئے مختلف انداز سے بار بار گفتگو کی اور تان یہیں لا کر توڑی کہ "اس سے بہتر تمہیں کوئی جگہ نہ ملے گی، سینکڑوں لوگ یہاں آ کے بن گئے اور پھر تم تو شعر بھی جوڑ لیتے ہو، تمہارا کام تو ایسا چمکے گا کہ سب کچھ بھُول جاؤ گے۔" یہ اُس کی ہمدردی تو ضرور تھی لیکن گندے جسموں میں نیکی کا خیال بھی اندھیرے میں دھوئیں سے زیادہ نہیں ہوتا۔

مَیں ہاں ہاں کرتا رہا اور میری رُوح کُڑھتی رہی۔ دن ڈھل کھوٹن کے بعد جب مَیں نے رات کو سوچنا شروع کیا تو چارپائی میرے لئے عذاب قبر کی طرح ہو گئی۔ ہر لمحہ یہی بات سامنے آتی تھی کہ صبح ہوتے ہی مجھے اُس بازار میں دوات قلم لے کر بیٹھنا ہو گا جہاں اوباش لوگ بھُوکی ننگی عورتوں میں امراض کے لین دین کے لئے آتے ہیں۔ اِس تصوّر نے میرے ذہن پر جالا سا تن دیا اور مجھے ایسا محسُوس ہُوا جیسے میں کالی آندھی میں گھِرا ہُوا ہوں اور آنکھوں میں چھوٹی چھوٹی کنکریوں کے ریزے بھر رہے ہیں۔

خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور میں اذان سنتے ہی گھر سے نکل گیا، واپسی پر میں نے دیکھا کہ صدیق میرا انتظار کر رہا ہے قہرِ درویش برجانِ درویش ہم دونوں چلدیئے۔

صدیق مجھے اپنے اس ہم پیشہ کی دکان پر بٹھا کر پھیری کو نکل گیا، اور میں اکیلا اس طرح رہ گیا جیسے کسی زلزلے کے ہچکولے نے مجھے زمین کے دامن سے کسی نیم تاریک غار میں جھٹک دیا ہو۔ تھوڑی دیر تک تو میرے حواس قائم نہ رہے اور میں گردن جھکائے بیٹھا رہا، اس وقت میں بازار میں ہونے کے باوصف خود کو اکیلا محسوس کر رہا تھا، مجھے چاروں طرف سے بیکسی گھیرے ہوئے تھی اور خود کو ایک ایسا قیدی محسوس کر رہا تھا جسے حاکم نے نابرخاست عدالت کی سزا ابول دی ہو۔

آمد و رفت میں وہاں کی کئی عورتیں میرے سامنے سے ایسی بھی گزریں جن کے بشروں سے معلوم ہو رہا تھا کہ ان کے جسم اور روح دونوں کو کوئی شدید آندھیاؤ جھنجھوڑ کر گزر گیا ہے۔

میں حیران تھا کہ کیا یہی عورتیں مجھ سے خط لکھوائیں گی؟ کیا ان سے بھی کوئی خط و کتابت کرنا ہوگا؟ اس سے زیادہ مجھے اس کی فکر تھی کہ کیا میں یہی کمائی اپنے غریب والدین کو بھیجوں گا؟ مجھے کچھ اس قسم کا احساس بکل کر رہا تھا جیسے میں خود کو مچھلی منڈی میں نیلام پر چڑھانے کے لئے لے آیا ہوں اور اس دنیا سے دھڑکنوں کو محسوس کرنے کی طاقت اور صلاحیت سلب ہو گئی ہے۔

جب میرے دل میں اس کرب کا ہل چل رہا تھا اس وقت مجھے سامنے تحصیل کے باغیچہ میں پھولوں کی کیاریاں تعزیت کی جاجمیں معلوم ہو رہی تھی، پودوں اور درختوں کے نیچے دھوپ میں پھنسا ہوا سایہ دھواں سا دے رہا تھا اور صبح کے کھلے ہوئے پھول شاخوں پر موسمی سرطان نظر آ رہے تھے۔ مکانوں کی اونچی اونچی اٹاریوں پر پھیلی ہوئی دھوپ کفن کی طرح سفید بھک ہو گئی تھی میرا دل تو بھرا آ رہا تھا

مگر آنکھوں کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ جسم میں گردش کرنے والے زہریلے اجزاء میرے دماغ میں آکر دھندک رہے تھے مگر میں مجبوراً خاموش تھا۔

یوں تو ان کوٹھوں پر دن میں بھی اُن آدمیوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی جن کے نفس کے کُتّے طوائفوں کی گندگی کے زہر میں ڈوبے ہوئے ٹکڑے کھا کر کوٹھے سے نیچے راہگیروں کو بھونکتے رہتے تھے لیکن شام کے وقت شہر کے کچھ شوقین مزاج اور دفتروں کے کچھ ملازمین بھی رشوتوں سے جیبیں کھنکھنا تے زینوں میں جھانکتے پھرنے لگتے دریافت سے معلوم ہوا کہ ذرا رات گزرنے پر نااہل حُکّام اور چابک دست تاجر بھی اپنے دماغوں کا لرزتا ہوا مگر گندا پارہ یہاں کی متعفّن کٹھالیوں میں چرخ دینے کے لئے پہنچ جاتے ہیں بعض جھکے ہوئے سرمایہ دار اور بلند منصب شرابی انہی کوٹھوں سے صبح تک کے لئے یہ بارِ گناہ اپنی موٹروں میں بھی لے جاتے اور صبح کو واپس چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسے کارپوریشن کی گاڑی غلاظتوں کو اُس کے مرکز پر پہنچا دیتی ہے۔

مَیں نے اپنے یقین کے لئے کئی بار ڈھلتی راتوں میں جا کر اس بازار کو بڑے غور سے دیکھا اور شنید کو لفظ بہ لفظ درست پایا۔ اُس بازار میں تمام ہی عورتیں کریہہ المنظر نہیں تھیں، بعض کے نقوش تیکھے اور دھوئیں سے رچے ہوئے قمقموں کی ملگجی روشنی کی طرح تھے جب شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگتا تو وہ لیپ پوت کر کے اپنے جسموں کو ایک جھوٹی آب و تاب سے سجا لیتیں، لیکن میری نظروں میں کوئی تو دَلے مَسلے پھولوں سے لدا مزار تھی اور کوئی بوندوں میں سندھڑتی ہوئی پودر۔ اِن گھروں کی روشنی کا ہر قمقمہ عصمتوں کی راکھ میں لتھڑا ہوا لگتا تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی کئی کوٹھوں پر چند بھدے چراغ آنکھیں ٹمٹمانے لگتے اور یہ مظلوم دنیا دہ عورتیں تکیوں سے اُتارے ہوئے میلے غلافوں کی طرح چھجوں پر آجاتیں اور نگاہوں سے نپ نپ کے کرایہ طے ہوتا۔

جب کبھی تیز ہوا چلتی اور جھکڑوں سے ٹین کے چھجّے کھڑکھڑانے لگتے تو گوری

ے پودر:۔ اَلاؤ

چنچی عورتیں تو اندر کمروں میں ہوتیں اور معمولی خدوخال والی نچوڑی ہوئی صابیوں کی طرح چھجوں سے نہ ہٹتیں اور ایسی معلوم ہوتیں جیسے ہواؤں میں دُھند لکے کی پوٹلیاں بندھی ہوں اُس وقت میری رُوح میں احساس کے کانٹے گرم ہو جاتے اور میں اس افلاس میں دھنسی ہوئی مخلوق کو مظلوم سمجھنے پر مجبور ہو جاتا کیونکہ میری نظر میں تو شمعی کا معاشرہ اور اس کے عادات و خصائل تھے۔ وہ اس سطح سے بہت بلند تھی حد سے زیادہ بلند! حقیقتاً وہ اُنھیں عورتوں میں سے تھی جن کے گھروں میں شرفا کو تربیت ملتی تھی۔

سات آٹھ دن تک وہاں مجھ سے کوئی خط لکھوانے والا نہیں آیا اور آیا بھی ہو گا تو مجھے معلوم نہیں کیونکہ میرا رویہ یہ رہا کہ صبح ہی آ جاتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بیٹھ کر دوات قلم دکاندار کے سپرد کر کے کسی نہ کسی طرف تلاشِ روزگار میں نکل جاتا، کوچوں کوچوں، گلیوں گلیوں مارا مارا پھر کے شام کو اپنے مستقر پہ آ جاتا اور بازار کی چہل پہل دیکھنے لگتا۔

صدیق روز میری آمدنی پوچھتا اور میں اُسے صاف جواب دے دیتا۔ ایک دن میں نے اُسے ڈیڑھ روپے کی آمدنی بتائی، اُس نے کہا لاؤ میرے پاس جمع کر دو، لیکن میں تو وہیں فقیروں کو تقسیم کر چکا تھا، میں خاموش ہو گیا اور جب اُس نے اصرار کیا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں اُس بازار کی کمائی نہ تو خود کھا سکتا ہوں اور نہ والدین کو بھیج سکتا ہوں۔ میں جب وہاں بیٹھتا ہوں تو میرا ضمیر پشیمانی کے تازیانوں سے لہولہان ہوتا رہتا ہے۔ اب میں کسی ڈاکخانے کے سامنے جا کر خط لکھا کروں گا۔ تمھارے حکم کی تعمیل ہو گئی۔

صدیق بولا "بس میاں تم نے کر کے کھا لیا! تم تو مجھ سے قرض لے کر گھر جاؤ گے"۔ اُس کی یہ بات میرے رگ و ریشہ میں تیر گئی اور میں نے جھلّا کے کہا، "جناب میں کبھی آپ سے قرض نہیں مانگوں گا، اور کبھی آپ کے کہنے سے ذلیل روزی نہیں

ے پوٹلیں: گٹھڑیاں

کماؤں گا"۔ میں اپنی ناداری کے تدارک سے معذور نہیں ہوں، میں مرد ہوں اور مجھے ورثے میں جفاکشی ملی ہے۔"

اگرچہ میں صدیق سے جھگڑ چکا تھا لیکن یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں صبح کاذب میں مٹی کے گھروندوں سے نکل کر بل کھاتی ہوئی تنگ گلیوں سے گزرتا ہوا بستی کے باہر ایک نیم روشن الاؤ کے سامنے آ گیا ہوں جہاں فضا دھندلی ضرور ہے لیکن تاریک نہیں۔

صدیق نے لال پیلی آنکھیں تو نکالیں مگر پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گیا۔ صرف اتنا کہا کہ "تمہاری تقدیر کے ہیٹے پن کا کیا علاج، تم اس موقع کو یاد کر کے پچھتایا کرو گے۔" میں خاموش اپنے خون میں اونٹتا رہا، احاطے والوں میں صدیق نے میرے اس کفرانِ نعمت کو شکایتاً کئی ایک سے بیان کیا اور وہ مسکرا کر خاموش ہو گئے لیکن سب نے مجھے سراہا۔

احاطے کے مالک نصراللہ خاں میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے یہ کہتے ہوئے باہر نکل آئے "آؤ تمہیں داتا صاحبؒ کے مزار پر لے چلیں، لاہور کے بڑے مشہور اور صاحبِ فیض بزرگ ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر فاتحہ سے ثواب ہوتا ہے۔"

یوں تو میں پہلے ہی سے بزرگانِ دین کے مزاروں کو زمین کے زخموں کے پھاہے سمجھتا تھا لیکن حضرت داتا گنج بخشؒ کے دربار کا عالم دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی اور آنکھوں میں ترمرے[1] سے تیرنے لگے۔

میں بڑی دیر سوچتا رہا کہ یہ سڑک کے دو طرفہ دکھوں کی ماری ان گنت مخلوق اور نشوں کی بدصورت پرچھائیاں بے شکوہ شکایت کیسے زندگی بسر کر رہی ہیں بعض بعض فقیروں کے نعرے تو نعوذ باللہ ان کے پندارِ اتقا کو کفر تک رستہ دیتے تھے مگر میں تو اپنے ہی خیالات میں بہہ رہا تھا، بار بار یہی خیال آتا تھا کہ اس بھنگ اور چرس کی ماری ہوئی بھیڑ، میل کچیل سے رپے ہوئے ہزاروں چہرے اور بیماریوں سے نیجھے[2] ہوئے اجسام کی یہ ایک حضرت سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کا مزار کیسے کفالت کر رہا ہے اس

---

[1] ترمرے: چھوٹی چھوٹی بوندوں جیسے چکنائی کے نشان [2] نیجھنا: گُن لگنا، دیمک لگنا

بد رنگ اور مکروہ انسانوں کی پلپلی دلدل کی پرورش سے تو بڑے بڑے بادشاہ بھی عہدہ برا نہیں ہو سکتے، یہ تو ایک دھوئیں میں رچے ہوئے گرگٹوں کا گچ گچاتا ہوا جنگل ہے جو اس گلی کے دونوں پہلو دبائے ہوئے ہے اور انھیں دونوں وقت یہیں رزق پہنچتا ہے۔

اُس وقت میری نظر میں بزرگانِ دین صاحبانِ مزارات کی ڈیوٹیاں مجسّم ہو کر سامنے آ رہی تھیں اور مجھ پر ایک ایسے مسئلے کا انکشاف ہو رہا تھا میں جس میں ایک عرصہ سے اُلجھا ہُوا تھا، مَیں نے صدق دل سے فاتحہ پڑھا اور ایک اَتھاہ تسکین لے کر واپس ہُوا، جیسے میرے جسم کے مسامات میں باہر سے برفیلی ہَوا داخل ہو رہی ہو اور سینے میں بانچھر بھیگ رہا ہو۔

کُتب فروشی

ایک دن میں صدیق کے ہمراہ جا رہا تھا ہم دونوں ایک جگہ ہجوم دیکھ کر کھڑے ہو گئے، بازار میں کوئی شاعر کُتب فروش یا غیر شاعر کُتب فروش خوش الحانی سے کتابیں بیچ رہا تھا، صدیق نے طنزیہ انداز میں کہا "میاں تُجھ سے تو یہی اچھا ہے، شام کو پانچ سات روپے گھر لے جاتا ہو گا۔"

مَیں۔ "اگر میرے پاس کتابیں ہوں تو میں اس سے کس بات میں کم ہوں اس سے اچھّی نثر لکھ سکتا ہوں اس سے اچھّے شعر کہہ سکتا ہُوں۔"

صدیق "۔اگر اس سے اچھے شعر جوڑ لوگے تو کتابیں کیوں نہیں چھپوا لیتے؟"

مَیں "۔ چھپائی کے لئے رقم؟"

صدیق "۔ میں خرچ کر دوں گا نفع میں برابر سَر بَر۔"

مَیں "۔ منظور! چھپوا دو۔"

صدیق "۔ اپنی جوڑی ہوئی شعریں اکٹھّی کر لو۔"

مَیں نے صدیق کو آٹھ صفحے کا مسوّدہ دیا، جس میں کہیں کہیں میرے اشعار تھے

باقی جا و بیجا تصرفات! صدیق نے اپنے کسی دوست کی معرفت وہ آٹھ صفحے ایک ہزار کی تعداد میں چھپوا دیئے۔

یہ تُک بندیاں چھپ تو گئیں مگر اب بازار میں مجمع لگانے کا سوال آیا۔ میں تو چکّر کھا گیا اور ایسا معلوم ہوا جیسے مجھے شُدّھی پر مجبور کیا جا رہا ہے۔

مَیں اپنی ضروریاتِ زندگی اور معاشی تقاضوں سے زیادہ اپنے شریک کی ناراضی کے خیال سے نکڑ پر جا کر قریب قریب دو گھنٹے مجمع لگانے کے متعلّق سوچتا اور رہ رہ کر ارادہ کرتا رہا مگر ہمت نہ ہوئی اور شام کو کتابیں لئے ناکام واپس گھر آ گیا۔ صدیق نے دُور سے دیکھتے ہی پوچھا "کیوں میاں جُوں کے تُوں یا اُوپر تلے؟" مَیں نے دَبی زبان میں کہا جُوں کے تُوں!

صدیق کو یقین نہ آیا، مگر جب میں نے اپنی ناکامی کا سبب اپنا خوف، شرم اور اجنبیت کا احساس بتایا تو اُس نے کنّیا کے اس طرح دیکھا جیسے کوئی مرکھنی گائے سے اُس کا بچّہ چھین رہا ہو، تھوڑی دیر تک تو وہ خاموش گھُورتا رہا پھر نہایت تُرش اور سخت لہجے میں کہنے لگا "جب تو اس کام کو کرنا نہیں چاہتا تھا تو میرے چھ روپے کیوں برباد کرائے؟ اب مَیں ان چھپے ہُوئے کاغذوں کو کیا کروں یہ تو ردّی میں بھی نہیں بکیں گے۔ میرے چھ روپے پُورے کر! میں کچھ اَور نہیں جانتا! مَیں کتابوں کی سوداگری سے باز آیا، چل دفان ہو جا! اور میرے چھ روپے لا!!"۔

مَیں حق حیران پریشان اُس کے تمتماتے ہوئے چہرے پر بگڑے ہُوئے خدوخال کو دیکھ رہا تھا، اور چاہتا تھا کہ اگر زمین راستہ دے دے تو زندہ سما جاؤں، اتنے میں احاطے کے مالک نصراللہ خاں صاحب نے اُسے ڈپٹ کر کہا "صدیق! کیوں تنیے جھاڑ کر اس لڑکے کے پیچھے پڑا ہے۔ میاں آج نہیں کل، کل نہیں پرسوں، رفتہ رفتہ سب کام ہو جایا کرتے ہیں۔ کل اس کے ساتھ جا کر اپنے سامنے ایک مجمع لگوا دو اور بس،

پھر آگے یہ خود چل نکلے گا ہر کام کا طریقہ بھی تو جُدا جُدا ہوتا ہے۔"

صدیق کی سمجھ میں بات آگئی دوسرے دن وُہ شام کے وقت مجھے اپنے ساتھ انارکلی بازار میں لے گیا جو لاہور کا سب سے بارونق بازار ہے پھر چھڑا ہے کے ایک کنارے پر کھڑا ہو کر مجھے حکم دیا۔ لے شروع کر!

مَیں۔ "یہ لوگ تو گزر رہے ہیں کس کو سناؤں؟ کون سُنے گا؟"

صدیقؔ۔ آواز سن کر کھڑے ہو جائیں گے تو شروع تو کر! لے آئیں تیرے سامنے کھڑا ہوتا ہوں۔" مَیں نے ہزار کوششوں اور جراتوں کے بعد ہلکی سی آواز میں ایک مصرع پڑھا اور مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے میرے مُنہ پر کالک ملی ہُوئی ہے اور آئینے کے سامنے عکس میرا مُنہ چڑھا رہا ہے! وضمیر ہے کہ دم توڑ رہا ہے۔

مجھے اچھّی طرح یاد ہے کہ چار اشعار پڑھنے کے بعد جو مَیں نے اپنے سامنے نگاہ ڈالی تو مجھے اِردگرد اچھا خاصا مجمع نظر آیا۔ کچھ لوگ تو میرے اشعار سن رہے تھے اور کچھ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے، خُدا خُدا کر کے مَیں نے غزل ختم کی اور صدیق نے آواز لگائی" اس کتاب کی قیمت دو آنے ہے جو صاحب خریدنا چاہیں خرید سکتے ہیں۔"

میری آنکھوں میں اُس وقت ایسی دُھند سی بھری ہُوئی تھی کہ مجمع میں مجھے کسی بھی چہرے کے نقش ونگار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ مجمع میں سے خریداروں کے اس قدر ہاتھ بڑھے جیسے پکّی ہوئی کھیتیاں تیز ہَوا کے رُخ پر جُھک جُھک جاتی ہیں۔

صدیق کے ہونٹوں پر مُسکراہٹ تھی اور وُہ رہ رہ کر سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ سب کتابیں بِک گئیں اور مزید کتابیں لانے کے لئے صدیق گھر کو بھاگا اتنے وہ کتابیں لایا خریدار میرے پاس سے نہ ہٹے، صدیق نے آکر سب کو کتابیں دے دیں۔ شام کو جب گھر جا کر بکری سنبھالی تو چار روپے ہُوئے۔ یہ رقم دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ صدیق کے طعن و تشنیع سے تو چھٹکارا ملا۔ گھر سے کچھ اور کتابیں لے کر ہم دونوں

پھر بازار چلے گئے اور ایک بازار میں مجمع لگایا، غالباً تین روپے یا تین روپے دو آنے کی بکری مزید ہوئی اور ہم دونوں واپس گھر آ گئے، صدیق نے اصل لاگت وصول کر کے نو ۹ آنے مجھے بھی دیئے اور بولا "میرا حساب تو صاف ہُوا باقی کتابوں میں دونوں ہیں۔"

میرے شریک نے جب منافع کا یہ عالم دیکھا تو ایسی میٹھی زبان میں گفتگو شروع کر دی جیسے دُنیا میں اُس سے زیادہ میرا کوئی ہمدرد نہیں۔ اُس وقت وہ یوں بول رہا تھا جیسے مُنہ میں چاول بھرے ہُوئے ہوں۔

رات کو نصراللہ خاں (احاطے کے مالک) نے صدیق سے پُوچھا "کیوں میاں اصل وصول ہونے کی توقع ہے یا نہیں؟"

صدیق "خان صاحب! دو مجمعوں میں اصل وصول ہو کر نو نو آنے حصّے میں آئے ہیں۔"

خان صاحب۔ (خُدا بخشے) الحمد للہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

صدیق کو اب یہ فکر ہوئی کہ اگر احسان تمام دن مجمع لگاتا رہا تو بکری کی رقم تو آنکھوں سے اوجھل رہے گی، اس لئے اُس نے مجھے پاس بٹھا کر نہایت ہمدردانہ لہجے میں کہا "دن کو مجمع نہ لگانا! لوگ اپنے اپنے کاموں پر ہوتے ہیں! شام کو دونوں بھائی مل کر دو چار مجمعے لگا لیا کریں گے۔ میں لاہور کے چپّے چپّے سے واقف ہُوں اور جانتا ہوں کہ بھیڑ زیادہ کہاں کہاں لگتی ہے اور مجمع کہاں کہاں ٹھیک رہے گا۔"

مَیں "تمام دن بیکاری میں جی گھبرائے گا!"

صدیق۔ "مَیں کوشش کر کے تمہیں کل ہی کام دلوا دُوں گا!"

"مہربانی!"۔ مَیں نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔

لیکن مجھے افسوس تھا کہ میری ایمان داری صدیق کی نظر میں معتبر کیوں نہیں۔ دوسرے دن علی الصبح صدیق گھر سے نکلا، اور

ایک رنگساز

تھوڑی ہی دیر میں ایک کالے بھجنگ رنگ ساز کو ساتھ لے آیا، اُس نے دُور ہی سے صدیق کے اشارے پر مجھے سر سے پاؤں تک آنک لیا اور پھر دونوں اچھی خاصی دیر تک کھسر پھسر کرتے رہے، مجھے حیرت تھی کہ صدیق مجھ جیسے آدمی کے معاملے میں بھی سرگوشی کو روا خیال کرتا ہے اور علیحدگی میں گال سے گال ملا کر گفتگو کو عیب نہیں سمجھتا اس کمبخت کو ابھی تک یہ بھی خبر نہیں کہ میں اُس کے اندر کے مویشی کو اچھی طرح جانتا ہوں بلکہ اس قسم کے داخلی مویشیوں کا سلوتری ہوں۔

صدیق کہنے لگا "میں نے ان سے طے کر لیا ہے، تجھے بارہ آنے روز ملیں گے کام بہت آسان ہے بس جا! دوپہر کو آ کے کھانا کھا لینا، ریاض الدین[1] کی دکان پر حساب کھول لے۔ میں اُس سے کہہ دوں گا شاید تیرا اعتبار نہ کرے۔"

میں نے کہا "اُدھار کھانے کی مجھے عادت نہیں، بڑی مہربانی!"

میں چادر کاندھے پر ڈال رنگسار کے ساتھ ہو لیا، راستے میں اُس نے مجھے رنگسازی اور اس کی افادیت پر ایک چلتا سا لکچر پلایا جس میں اس کے عمر بھر کے معلومات اور ٹھیکیدارانہ ذہنیت کی کراہت بھی شامل تھی۔

میں ہر بات پر جی ہاں، جی ہاں، درست درست کہتا چلا گیا اور دونوں یونیورسٹی ہال میں پہنچ گئے، جہاں مجھ سے پہلے دو مزدور کواڑوں کی گھرچائی کر رہے تھے، اُس نے مجھے زمین لگانے کے لئے برش دے دیا اور رنگ کا ڈول میں نے خود بڑھ کے اُٹھا لیا۔

وہ مجھے گراؤنڈ دیتے ہوئے جھجک رہا تھا جس پر میں نے اُسے یقین دلایا کہ میرے لئے یہ کام نیا نہیں ہے میں اس سے بہت زیادہ جانتا ہوں۔ وہ کچھ مطمئن سا تو ہوا لیکن اُس نے کہا "اچھا ذرا میرے سامنے کام کرو!" مجھے گراؤنڈ لگاتے دیکھا تو بہت

---

[1] ریاض الدین جیسیر اخبار میں ایک روٹی کی دکان کا مالک تھا۔ یہاں رہنے والے مزدور عموماً اُسی کے یہاں کھانا کھاتے تھے

خوش ہوا اور یہ کہہ کر خاموش ہو گیا "تمہیں بہت جلد کام آجائے گا۔"

وہ شام کو چار بجے کے قریب پھر کام پر آیا، میں اُس وقت استر لگا رہا تھا اُس نے مشفقانہ لہجے میں کہا "کام چھوڑ دو اور میرے ساتھ چلو۔"

"بہت اچھا!" میں نے جواباً کہا۔

میں رنگ کا ڈول اور برش گودام میں رکھ کر اُس کے ساتھ ہو لیا وہ لاہور کے جنوبی حصّے میں محلہ "موج دریا" کے قریب ایسی جگہ رہتا تھا جو راستے سے علیحدہ اور عوام کی نظر سے ایک طرف تھی اُس نے گھر لے جا کر مجھے چارپائی پر بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا اور خود اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کوٹھڑی سے ایسا تعفّن آ رہا تھا جیسے ہسپتالوں کی گندی اٹی ہوئی بدبودار دواؤں کی پٹیاں اور پھاہے گل رہے ہوں۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ وہ کپڑے بدل کر باہر آ گیا اور ایک جوان لڑکی کی طرف جو چارپائی کے قریب بیٹھی روٹی پکا رہی تھی، اشارہ کر کے بولا "یہ میری لڑکی ہے" اِدھر اُس کی زبان سے یہ کلمہ نکلا اُدھر لڑکی کی نگاہیں شرم کے مارے چولھے کے باہر ایک سندھرتی ہوئی لکڑی پر جم کے رہ گئیں۔

میں "اچھا خوب" کہہ کر خاموش ہو گیا اور وہ حقّہ لے کر میرے قریب ہو بیٹھا پھر ایک لمبا کش لگا کر ناک سے دھواں نکالتے ہوئے بولا "تمہیں وہاں رہنے میں دقّت ہو تو یہیں آ جاؤ، اس کمرے میں آسانی سے دو پلنگ بچھ سکتے ہیں" میں نے کہا "ہم تو تین آدمی ہوں گے دو چارپائیوں سے کیسے گزارا ہو گا۔" ٹھیکیدار نے ایک منٹ کے توقف کے بغیر جواب دیا "تم اکیلے چارپائی پر سو جانا، میں اور لڑکی ایک پلنگ پر سو جائیں گے۔"

میں تو یہ سُن کر ہکّا بکّا رہ گیا کہ باپ اپنی جوان لڑکی کے پاس کیسے سو سکتا ہے؟ یہ بات میرے تصوّر سے باہر کی تھی میں رسمی "شکریہ" ادا کر کے خاموش ہو گیا۔

اس نے کہا یہاں رہنے میں تمہیں چار آنے روز کا اور بھی فائدہ ہے۔ میں نے

پوچھا "وہ کیسے؟" اُس نے جواب دیا "اب تو تمہاری دھیاڑی میں سے چار آنے روز تمہارے ساتھی یا شریک کے ہیں نا اور بارہ آنے تمہارے ہیں پھر روپیہ کا روپیہ تمہیں ہی ملے گا اور پھر جتنا ہاتھ صاف ہوتا جائے گا مزدوری بھی بڑھتی جائے گی۔"

اِس گفتگو سے میرا دماغ چکر کھا رہا تھا، کبھی تو مجھے صدیق پہ تاؤ آتا تھا اور کبھی رنگساز ٹھیکیدار میرے لئے تجارت کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں جنسی بھوک کی لپٹ اور چہرے کے خدوخال پر شقاوت کا لہریں لیتا ہُوا سایہ مجھے پریشان کر رہا تھا، اس سے مجھے یہ اندازہ ہُوا کہ یہاں کی معاشرتی زندگی تعفّن سے آلودہ ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ اس اخلاقی عدم توازن کی کسی کو شکایت نہیں۔

رنگساز سے میں نے نماز کے لئے اجازت چاہی اور دُوسرے روز کام پر آنے کا وعدہ کر کے نکل آیا۔ آدھی رات تک میرے احساس کی تپش ختم نہ ہوئی ہر پھر کر تصوّر مجھے رنگ ساز کے چرلھے پر لے جاتا تھا۔

صُبح اُٹھا تو مجھے ایسا محسُوس ہُوا جیسے میری رگ رگ تھکی ہوئی ہے اُس کے کام پر جانے کو میرا جی نہ چاہا۔ معمولی بُخار کا بہانہ کر کے چارپائی پر لیٹا رہا اور اپنے ساتھی صدیق سے نباہ کی صُورت سوچتا رہا، مَیں دل ہی دل میں کُڑھ رہا تھا الٰہ العالمین اس ماحول میں کیسے گزارا ہوگا۔

میں اس ماحول کو اپنے قصبہ کے ماحول سے بالکل جُدا پا کر انجام سے خوفزدہ ہو گیا تھا اور سلامتیٔ ایمان کی دُعا کر رہا تھا، اپنے وطن کی دُھوپ چھاؤں میرے سامنے سرسرا رہی تھی جیسے خشک پتاوں میں گلہریوں کے دوڑنے کی آواز، مگر یہاں تو مخلوق ہی دُوسری تھی یہ شب و روز قصبے کے سیدھے سادے انسان کے لئے جبر و تشدّد کی چکّی سے کم نہ تھے مگر مجبوری کا کیا علاج؛ طوعاً و کرہاً یہیں زندگی بسر کرنے پر مجبُور تھا۔

کبھی دس بیس دن کام لگتا اور کبھی ایک ہفتہ یونہی تگ و دو میں گزر جاتا۔ شام کو

جو کتابیں فروخت ہوتیں بکری میں سے صدیق مجھے نصف دے دیتا، لیکن وہ اس عالم میں بھی مطمئن نہ ہوا اور ایک دن بڑے اطمینان سے کہنے لگا "احسان بھائی ہم دونوں کیوں نہ الگ الگ مجمع لگایا کریں"، میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔

میں نے کہا "میاں میں تو لاہور میں یہ کتب فروشی عیب خیال کرتا ہوں کل سے آپ ہی مجمع لگایا کریں، میں مزدوری پر ہی اکتفا کروں گا۔ اس میں مجھے مطالعہ کا وقت نہیں ملتا جو میرے لئے مقصدِ حیات ہے"۔ وہ سُن کر خاموش ہوگیا اور خاموشی سے کتابوں کے اسٹاک میں سے آدھی کتابیں میرے حوالے کردیں۔

میں نے کہا "صدیق صاحب یہ کتابیں لاہور میں تو آپ ہی فروخت کریں۔ میں اپنی کتابیں لاہور سے باہر جاکر ختم کروں گا"۔ چنانچہ میں تیسرے دن لاہور سے باہر جانے والا ہی تھا کہ حکیم شفیق الرحمٰن کاندھلے سے آگئے اور میں انھیں ساتھ لے کر سفر پہ نکل گیا مختلف شہروں میں ایک ایک دو دو دن قیام کرتے ہم دہلی پہنچ گئے اور وہاں کتابیں ختم کرکے لاہور واپسی ہوئی۔

شادی ہال بلڈنگ کے پیچھے فلیٹ بن چکے تھے مگر ابھی کوارٹروں کی طرف تھوڑا بہت کام تھا میں وہاں کام کرنے لگا۔ حکیم شفیق دوپہر کو روز میرا کھانا پکا کر کام پہ پہنچاتے اور پھر کچھ دیر مجھے کام کرتا دیکھ کر سیر و تفریح کو نکل جاتے۔

ایک دن میں بلاوجہ مغموم سا تھا حکیم شفیق الرحمٰن صاحب نے سمجھا کہ میں افلاس سے پریشان ہوں اور مجھے مرضی کے مطابق کھانا نہیں ملتا۔ حکیم صاحب نے میری ڈھارس کے لئے ایک مختصر سا لکچر دیا کہ امیروں اور غریبوں میں کھانے پینے کے لحاظ سے زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ امیروں کی خوراک غریبوں سے کم ہوتی ہے حالانکہ اُن کی میزوں پر انواع و اقسام کے کھانے چُنے ہوتے ہیں اور غریب خشک یا معمولی لاؤن اور پیاز وغیرہ سے تین تین روٹیاں کھا جاتے ہیں اور یہ سادہ خوراک ہی ان کی تندرستی کا راز ہے۔ اُمرا کا

طبقہ زنگا رنگ نعمتوں سے بہرہ مند ہو کر بھی پیٹ بھر کھانا نہیں کھاتا، آئے دن ایک نہ ایک مرض ان کی تندرستی کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے۔

غریب پس ماندہ دیہات کے لوگ پھونس کے چھپروں کے جھروکوں اور جھریوں سے تازہ ہوا کا خیر مقدم کر کے صحت مند رہتے ہیں لیکن دولت مند کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہ کر ڈاکٹروں کے چارٹ کے مطابق کھانا کھانے پر مجبور ہیں۔ وہ گھر میں سامنے رکھی ہوئی نعمتوں سے بھی محروم رہتے ہیں کیونکہ انھیں اعتمادِ نفس میسّر نہیں رہتا۔

ایک دن انھوں نے کہا کہ میں کیوں نہ کاندھلے جا کر کاروبار کے لئے کچھ رقم لے آؤں، میں نے کہا کاندھلے جانا ہے تو جائیے، لیکن میں آپ کے کسی کاروبار میں شریک نہیں ہوں گا، انھوں نے کہا آپ فکر نہ کریں میں اکیلا مطب چلا لوں گا، یہاں میں گنجائش پا رہا ہوں، میں نے کہا آپ جائیں لیکن شمعی کو میرے حالات نہ بتائیں۔ حکیم صاحب کاندھلے چلے گئے اور میں اپنے حصّے کی تکلیفیں بھوگتا رہا۔

شیروانی

اگرچہ مجھے تھوڑے دنوں بعد ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں طاقت کو خدا اور کمزور کو خواہ مخواہ بندہ خیال کر لیا جاتا ہے یہاں قوّت اور دولت کے اُکسائے ہوئے لوگ شرافت کو کمزوری، درگزر کو بے بسی، عبادت کو بزدلی اور اخلاق کو جہالت و رجعت پسندی قرار دیتے ہیں لیکن منتشا کا خانہ ابھی بدستور تھا۔ مزدوری کے دوران میں مجھے خیال ہوا کہ ایک معمولی سی شیروانی سلوالی جائے تو کیا مضائقہ ہے، چنانچہ چٹّھا تقسیم ہونے پر میں نے چھ آنے گز کا ایک کپڑا شیروانی کے لئے خریدا اور بیبیا اخبار کے قریب ایک درزی کو دیدیا کہ شیروانی سی دے۔ تین روپے سلائی کے ٹھہرے اُس نے ناپ لے کر رکھ لیا اور کہا اتوار کی شام کو آنا اور پہن کر دیکھ لینا میں کچّا کر چھوڑوں گا۔

میں روز سوچتا کہ چلو شیروانی سل جائے گی تو لباس تو درست ہو گا۔ خدا خدا

کرکے اتوار کا دن آیا اور میں درزی کی دُکان پر پہنچا، معلوم ہُوا کہ ماسٹر صاحب تو سرِشام ہی دکان بند کر دیتے ہیں۔ میں خاموش ہوگیا اور سوچا کہ صُبح کام پر جاتے ہوئے دیکھ کر جاؤں گا ممکن ہے دکان کھُلی ملے، نو دس بجے آنے سے تو کام کا ناغہ کرنا پڑیگا میں نے کام پر جاتے ہوئے نظر ڈالی تو دکان بند پائی۔ وہیں سامنے کے ایک دکاندار نے بتایا کہ میاں یہ دکان تو اس کی برائے نام ہے اُس کا تو دُوسرا کاروبار ہے "تم کہاں آپھنسے ہو یہ تو ٹیکسیاں کرائے پر چلاتا ہے! مجھے یہ سُن کر تشویش تو ہوئی مگر پھر سوچا کہ کوئی معاصرانہ چشمک ہو گی جو ٹیکسی چلانے پر بھی معترض ہے میں اس وقت تک اس مقامی اصطلاح سے بالکل بے بہرہ تھا۔

چار پانچ روز کے بعد بڑے مستری کی بیوی کا انتقال ہوگیا اور کام بند کر دیا گیا۔ میں پہلے گھر آیا اور پھر کپڑے بدل کر درزی کی دُکان پر پہنچا وُہ نہایت اطمینان سے ایک حوالدار کے کوٹ میں بٹن ٹانک رہا تھا، میں نے سلام کیا تو ماسٹر نے ایک ریاکارانہ مُسکراہٹ سے میری طرف دیکھا اور یکدم بولا: ارے بھیّا کہاں ہو تم؟ میں نے تو کئی دن انتظار کرتے کرتے کل تمہارے کپڑے کے دو جواہر کٹ کاٹے ہیں۔

میں نے کہا، "جی؟ جواہر کٹ؟"

درزی۔ "ہاں کیا کرتا، شیروانی کے لئے تو کپڑا کم تھا، دو جواہر کٹ بھی مشکل سے ہوئی ہیں۔"

میں۔ "خُدا کے بندے مُجھ سے پُوچھا تو ہوتا، میں ان صدریوں کا کیا کروں گا؟ میں نے تو تمہیں شیروانی کے لئے کپڑا دیا تھا۔"

درزی۔ "اجی یہاں اب شیروانی کا رواج کہاں ہے، یہ تو یو۔پی کے بھیّا ہی پہنتے ہیں یہاں تو اس گلابندی کا رواج ہے۔"

میں۔ "کچھ بھی سہی میں نے تو شیروانی کے لئے کپڑا دیا تھا، تم نے صدریاں کیوں

کاٹ دیں۔ اگر کپڑا کم تھا تو میں اور لا دیتا۔"

درزی۔ "جناب یہ بھی تو آدھی شیروانی ہے اس میں بس دامن نہیں ہوئے باقی تو شیروانی ہی ہے۔"

میں جل بھن کے رہ گیا، مگر کیا کرتا؟ میں نے کہا مجھے وہ کٹی ہوئی صدریاں دیدو میں نہیں سلواتا۔"

درزی۔ "واہ جناب، وہ تو میں نے کچے کرنے کو بھیجے ہوئے ہیں، کٹا ہوا کپڑا کیسے دے دوں گا آخر اُن پر محنت نہیں ہوئی؟"

میں حیران تھا کہ کیا کروں؟ یہ تو کپڑا بھی دینے کو تیار نہیں اور سلائی نہ جانے اور کتنی مانگے۔ آخر میں نے پوچھا "اچھا ماسٹر صاحب اُن کی سلائی کیا ہوگی؟"

درزی۔ "سلائی؟ بس شیروانی سے آدھی! تم سے زیادہ تھوڑا ہی لیں گے۔"

میں۔ "پھر یہ کب مل جائیں گے؟ کب آجاؤں؟"

درزی۔ "بس اتوار ہی کو آؤ۔"

میں نے موقع پاکر پاس والے دکاندار سے پوچھا کہ یہ آپ کا پڑوسی اتوار ہی کا وعدہ کیوں کرتا ہے۔ اُس نے کہا "یہ اتوار ہی کو زیادہ مصروف رہتا ہے۔ اس کے گاہک اتوار ہی کو زیادہ آتے ہیں" میں نے سوچا ممکن ہے کہ اس کے پاس دفتری لوگوں کا کام زیادہ ہو۔ میں خاموش ہو گیا۔

صدریوں کے لئے میں نے اتوار کو ناغہ کیا اور کوئی دس بجے ہوں گے کہ درزی کی دکان پر جا پہنچا۔ درزی نے مجھے دُور سے دیکھ کر پریس کرنے والے لڑکے کو کپڑے کے گز سے مارنا شروع کر دیا۔

میں۔ "ماسٹر صاحب اس لڑکے کو کیوں مار رہے ہو، کیا بات ہے؟"

درزی۔ "بھتیجے تم نے شیروانی کا کپڑا کیا دیا ایک عذاب نازل کر دیا، میں گھر چلا

گیا تھا دکان پر یہ لڑکا تھا۔ تمہاری صدریوں کے دونوں پیش[1] کوئی اُٹھا کر لے گیا! تھوڑی دیر پہلے کہیں تم ہی تو نہیں آئے تھے"؟ لڑکے کو ڈانٹ کر کہا "ابے پہچان تو سہی یہی آدمی تو نہیں تھا"؟ لڑکے نے گردن ہلا کر نفی میں جواب دیا درزی نے اُسے چلم پکڑا دی اور وُہ حقّہ بھرنے چلا گیا ماسٹر صاحب نے کہا! "میاں جھک ماروں گا اور تمہارا کپڑا خرید کر لاؤں گا، یہ جرمانہ تو بھرنا ہی پڑے گا۔"

مَیں سمجھ گیا کہ یہ خبیث کپڑا بھی نہیں دے گا، یہ جان گیا ہے کہ میں غریب الوطن ہوں اور یہاں میرا کوئی یار و مددگار نہیں! اور مَیں اب اس کا کچھ نہیں کر سکتا۔ اب وہاں سے چلنے کے لئے میرے قدم نہیں اُٹھ رہے تھے، آخر میں نے ماسٹر سے پُوچھا۔ "جناب اب میرے لئے کیا حکم ہے؟"

ماسٹر نے ذرا فاتحانہ مسکراہٹ سے جیسے کسی گندی نالی میں سیپ کے بٹن کھنڈ گئے ہوں، "تُو کوئی اُس کپڑے کی کترن لے کر آ جانا، اُس کے ساتھ کا کپڑا تلاش کروں گا، اگر مل گیا تو کل ہی لے آؤں گا نہ ملا تو پھر سہی، غرض تجھے تیری صدریاں مل جائیں گی، بے فکر رہو یاد شاہو!"

آخر میں اُس کی نیّت کو دیکھ کر صبر کر کے بیٹھ گیا، کوئی ڈیڑھ ماہ کے بعد ماسٹر شام کے وقت ڈاکخانے کے سامنے ملا، اُس کے ساتھ ایک سانولے رنگ کی جوان لڑکی تھی جس کا برقع تو ریشمیں سا تھا لیکن سلیپر پُرانے اور گرد آلود تھے، مَیں نے ماسٹر کو سلام کیا اور پُوچھا "ماسٹر صاحب میرے کپڑے کا کیا ہُوا؟"

درزی:۔ "دکان میں چوری ہو گئی اور سب کپڑے چور لے گئے، کیا کروں؟ کس کو کیا جواب دوں؟ تم اپنے چار گز کپڑے کو رو رہے ہو میرا تو کئی ہزار کا نقصان ہو گیا جناب!"

---

[1] پیش: سامنے والے دونوں ٹکڑے۔

مجھے اُس ورزی کی ناانصافی اور بے رحمی پر بیحد افسوس ہُوا۔ اُس دن سے میں یہاں کے دکانداروں اور صنعت کاروں کو بھی اُسی زمرہ میں سمجھنے لگا جو غریبوں کا لہُو پی کر توانا ہوتے ہیں اور اہل و عیال کو حرام روزی سے پرورش کر کے جرائم پیشگی کو تقویت دیتے ہیں۔ اس قسم کے پس ماندہ لوگ اس لئے آلام و مصائب میں مبتلا نہیں رہتے کہ دولت سے خالی ہوتے ہیں بلکہ اس لئے جرائم پیشگی پر اُتر آتے ہیں کہ بے مقصد قوم کے فرد ہیں اور بے اصول و بے غیرت معاشرے میں بسر کرنے کو زندگی کا نام دیتے ہیں۔ ان کا رُوحانی تسکین سے تعارف نہیں ہوتا۔ میں خاموشی سے آگے بڑھ گیا اور وُہ خراماں خراماں مارکیٹ کی طرف چلا گیا۔

یہ میری اُمید اور توقع سے باہر کی بات تھی کہ صنعت کار یا کاریگر بھی ذلیل پیشہ اختیار کر سکتے ہیں یا اُنھیں پھاڑ کھانے پر فخر ہو سکتا ہے۔ لیکن معلوم یہ ہُوا کہ کچھ قطعات زمین ایسے بھی ہیں جہاں جہالت میں اُگی ہوئی اجسام کی فصلیں افراتفری کے موسم میں گاہ[1] دی جاتی ہیں اور بعض بعض مقامات پر تو ابھی بالیاں گدرانے بھی نہیں پاتیں، کہ درانتی پڑ جاتی ہے اور یہ وہی جنس ہے جو شہروں میں آکر مختلف قسم کے لبادے اوڑھ لیتی ہے اور اُسے تجارت کا نام دیتی ہے، اُنھیں کی ایک جماعت ہے جو اپنے ہمسایوں کو بھی بدراہ کر دیتی ہے اور حکومت کی نگاہِ احتساب بھی اُن کی طرف کم ہی اُٹھتی ہے۔ اُنھیں جدید زندگی کی بے غیرتی اور عریانی نے چکا چوندھ کر دیا ہے اور یہ بوکھلا کر تکمیلِ سفر اور اصُولِ شرافت سے منکر ہو گئے اُنھوں نے روشنی کے میناروں کی طرف سے مُنہ پھیر لیا ہے جس سے ان کے ارادے تلووں کے ناسوروں میں مبتلا ہو گئے لیکن قابلِ اصلاح ضرور ہیں ان کے اندر کا انسان ابھی زندہ ہے اور اس میں قوّتِ حیات کے آثار بھی ہیں۔

---

[1] گاہنا۔ غلّے کی بالیوں سے اناج نکالنا، جو لان پر بیلوں کے مسلسل چلانے سے اور چکّر دینے سے نکلتا ہے۔

مَیں یُونیورسٹی میں

پیسہ اخبار میں رہتے ہوئے ایک معمار محمد اسحاق نامی کی معرفت مستری بُدھو سے میری ملاقات ہو گئی، یہ نہایت شریف محنتی اور دیانتدار انسان ہونے کے علاوہ ایک مرتاض اور صاحب احتیاج آدمی واقع ہُوا تھا، جب بھی اُس سے ملاقات ہوتی نہایت خلوص سے پیش آتا۔

ایک دن وہ ملا تو مجھ سے پوچھنے لگا "کہو میاں کہیں کام کر رہے ہو یا نہیں" مَیں نے کہا "دو روز سے خالی ہوں" مستری بولا "دیکھو یونیورسٹی میں مدد لگی ہوئی ہے اور رہٹ پر ایک مزدُور کی ضرورت ہے بارہ آنے روز ملیں گے اگر جی چاہے تو سویرے ہی میرے ساتھ چلنا!"

مَیں نے ہامی بھر لی اور کہا "مَیں کل صبح یہیں آپ کا انتظار کروں گا" مستری اِملی والے تکیہ میں رہتے تھے جو یُونیورسٹی سے زیادہ فاصلے پر نہیں، چلتے ہوئے مستری بُدھو نے کہا "دیکھو اگر کہیں اور جانا ہے تو ابھی بتا دو تاکہ مَیں کسی دُوسرے آدمی کا انتظام کر لوں" مَیں نے مُسکرا کر کہا "نہیں، مَیں آپ کا انتظار کروں گا اور ساتھ چلوں گا!" لیکن مَیں سوچ رہا تھا کہ رہٹ پر تو صرف بیلوں کو ہانکنے کے لئے آدمی کی ضرورت ہو سکتی ہے اور یہ کام نہایت آسان ہے، اس میں کرنا ہی کیا پڑتا ہے۔ کھاڑی پر بیٹھے بیٹھے بیلوں ہی کو ہانکنا ہوگا نا؟ اس میں تو مطالعہ کا موقع بھی آسانی سے مِل جائے گا۔

دُوسرے دن علی الصُبح مَیں مستری بُدھو کے ہمراہ یونیورسٹی پہنچ گیا، مَیں نے دیکھا کہ یُونیورسٹی ہال کے شمال میں مسجد کے سامنے ایک پیپل کا درخت ہے اور اُس کے نیچے ایک کنوئیں پر ایک گورکھا قسم کا پستہ قد رہٹ لگا ہُوا ہے اس کی مال

ہیں ڈولچیاں آویزاں ہیں جن میں قریباً ایک ایک بڑا لوٹا پانی آجائے لیکن اُس میں نہ تو کوئی بیل جوتنے کا جُوا ہے نہ لاٹھ، ہاں مال سے نزدیک رہٹ کے دُھرے میں ایک آہنی پہیّا مرقد نما گہرے گڑھے میں لگا ہوا ہے اور پہیئے میں چاروں طرف لوہے کی کھونٹیاں، اُس گڑھے میں پہیئے کو چکر دینے کے لئے اُسے اتنا وسیع اور گہرا کر دیا گیا ہے کہ کرسی کی نشست کی طرح ایک آدمی پاؤں لٹکا کے بیٹھ سکے جیسے جولاہوں کی کارگہ۔

مستری بُدّھو نے کہا "دیکھو بھائی یہ رہٹ ہے اور یہ لوہے کا پہیّا ہاتھوں اور پاؤں کے زور سے گھماتا ہے اور گھما گھما کر پوری مدد کے لئے پانی دیتا ہے یہ نالی یہاں سے بڑے حوض میں جاتی ہے حوض ہر وقت بھرا رہنا چاہیئے اس میں اینٹیں بھی بھگیں گی گارا، چونا بھی بنے گا اور دیواروں پر بھی چھڑکا جائے گا غرضیکہ مدد کو جتنے پانی کی ضرورت ہوگی اس کے تم ذمہ دار ہوگے، ابھی اسی کام پر تمہارا ایک ساتھی اور بھی آتا ہوگا جو تمہارے ساتھ رہے گا اور مدد دے گا۔ ایسی ویسی مدد نہیں وہ تمہارے ساتھ برابر کا کام کرے گا"

پہلے تو میں گھبرایا کہ میں یہ بیل کا کام کیسے کروں گا لیکن پھر سوچا کہ آخر دوسرا آدمی بھی تو کام کرے گا، وہ کوئی لوہے کا بنا ہوا تو ہوگا نہیں اس خیال سے ذرا ہمّت سی بندھی اور میں مطمئن سا ہوگیا۔

اتنے میں ایک مزدور رتّا نامی آکر کھڑا ہوگیا، مستری نے اُس سے کہا "یہ آدمی تمہارے ساتھ کام کرے گا، تم شروع کرو یہ نیا آدمی ہے، تھوڑی تھوڑی دیر بعد ڈیوٹی بدلتے رہنا، رتّا اس مرقد نما گڑھے میں اُتر کر اطمینان سے بیٹھ گیا اور پہیئے پر لگی ہوئی لوہے کی اُوپر والی کھونٹیاں ہاتھ سے کھینچ کھینچ کر اور نیچے والی کھونٹیوں کو پاؤں سے دھکیل دھکیل کر پہیئے کو چکر دینا شروع کر دیا، میں اچھی طرح سمجھ گیا کہ یہ تو بیل کا کام آدمی سے لیا جاتا ہے۔ میرا حوصلہ ذرا پست ہوا لیکن دوسرے بیلدار کو دیکھ کر ڈھارس

بندھی اور میں دیکھتا رہا، تھوڑی دیر میں رتّا پسینے میں شرابور ہوکر رہٹ چھوڑ گیا اور اس کی جگہ میں اس قبرِ معاش میں اُتر کر اُسی طرح ہاتھوں پاؤں کی قوت سے رہٹ کھینچنے لگا کام تو بہت مشکل تھا مگر مجھے اُس میں یہ سہولت نظر آئی کہ میں سستانے کے وقت مطالعہ کر سکوں گا۔ میں مزدور ضرور تھا لیکن کبھی کبھی چھٹی کے بعد شام کو اپنے فکر و خیال کی دنیا میں خود کو آزاد اور با اختیار سا انسان محسوس کرنے لگا تھا۔

تمام دن رہٹ کھینچتے کھینچتے میرے بازو اور رانیں اکڑ گئیں اور میں پسلیوں میں دُکھن ہی نہیں سوجن سی محسوس کرنے لگا، میں نے شام کو گھر پہنچتے ہی تمام بدن پر تیل کی مالش کر کے گرم پانی سے غسل کیا، اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے مجھ پر ہوا کا دباؤ کم ہوگیا ہے یا زمین میں کشش کم ہوگئی، معلوم ہو رہا تھا کہ میرے رگ و ریشہ میں کنگھی سی ہوگئی، میں آرام ملنے سے جلدی ہی سو گیا، اور صبح کو اٹھتے ہی پھر مالش کی اور بغیر نہائے کام پر چلا گیا پانچ سات روز کے بعد مجھے اس مشقت کی عادت سی پڑ گئی، اور وہ رہٹ میرے لئے معمولی سی بات رہ گئی۔"

میں نے اپنے ساتھی رتّا سے کہا "اس طرح مجھے پڑھنے کا وقت زیادہ نہیں ملتا اس لئے اب سے ایک ایک گھنٹہ رہٹ کھینچیں گے تاکہ ایک گھنٹہ تو آرام کو مل جائے اس طرح تو انتڑیاں پک جائیں گی، رتّا کو کیا عذر ہو سکتا تھا، چنانچہ ہم دونوں ایک ایک گھنٹہ کام کرنے لگے اس طرح مجھے دن میں چار گھنٹے مطالعہ کرنے کو مل جاتے اور جسمانی مشقت کے ساتھ روحانی تسکین بھی ہو جاتی، بعض اوقات تو مطالعہ کرتے کرتے مجھے نیند آجاتی اور رتّا مجھے نہ جگاتا اور رہٹ کھینچتا رہتا وہ میرے آرام و سکون سے واقف ہو گیا تھا، چنانچہ کئی بار ایسا ہوا کہ مجھے نیند آگئی اور مستری یا میٹ پھرتا پھراتا اُدھر آگیا تو رتّا نے انھیں کہہ دیا کہ ابھی کام کرتے کرتے بیٹھا تھا آنکھ لگ گئی، انھیں تو اپنے کام سے کام تھا کہ بڑا حوض بھرا رہے اور پانی کی کمی نہ ہو چنانچہ وہ خاموش ہو کے رہ گئے، جب میں جاگتا تو رتّا

مجھے بتاتا کہ مستری یا جمعدار آیا تھا میں کسی فکر کے بغیر اپنے اُسی روزی کے مزار میں اُتر کر رہٹ کھینچنے لگتا اور اتنی ہی دیر کام کرتا جتنی دیر رَتّا کام کرتا۔

کچھ دنوں بعد رَتّا نے جمعدار سے کہا "میری جگہ کسی اور مزدور کو لگا دیا جائے میرے پیٹ میں تکلیف رہتی ہے" لیکن جمعدار نے پروا نہ کی اور پھر کوئی دوسرا مزدور اس کام پہ آنے کو تیار بھی نہیں ہوتا تھا تمام مزدور اس رہٹ کے چکر سے گھبراتے تھے۔ رَتّا مجبور تھا کیا کرتا برابر کام میں جُتا رہا۔ جب اُس کی تکلیف کے متعلق مجھے معلوم ہوا اور اُس نے اپنی کیفیت بتائی تو از راہ ہمدردی میں نے اُس سے کہا "اچھا تم ایک گھنٹہ کام کرنا میں دو گھنٹے رہٹ کھینچوں گا" رَتّا کی نگاہیں ممنونیت سے جھک گئیں اور وہ خاموش ہو گیا۔

رَتّا آنکھ نوک کا سجل، خوبصورت اور گٹھیلے بدن کا نوجوان تھا جب وہ کام سے فارغ ہو کے لٹ پٹی پگڑی باندھ کر چلتا تو ہرنوٹا[ـه] معلوم ہوتا۔ ہاڑ گوڑ کا نہایت مضبوط اور بڑا ہی سیدھا سادہ معصوم اور محنتی۔ نہ معلوم ماں باپ نے کن مجبوریوں کے تحت ایسے لعل شب چراغ کو اپنے سینے سے جدا کر کے اس جانکاہ مشقت کے جبڑوں میں دبا دیا تھا وہ راجپوتانہ کا رہنے والا تھا اور اس کے گاؤں کی سرحد جے پور سے ملتی تھی چنانچہ وہ مضافات کی زبان بولتا تھا رَتّا سے بات کرتے ہوئے حضرت امیر خسروؒ کا وہ تاثر مجسم سامنے آجاتا تھا کہ۔ ؎

یک ہندو بچہ بلی کہ عجب حسن دھرے چھے
بر وقت سخن گفتن مکھ پھول جھرے چھے،
گفتم کہ ازلب لعل تو یک بوسہ بگیرم!
گفتا کہ ہرے رام تُرک کائے کرے چھے

غرض کہ میرا یہ ساتھی رَتّا بڑا ہی نیک اور سودھلا۔ نوجوان تھا مسیں ابھی بھیگ

ـه ہرنوٹا:۔ ہرن کا بچہ۔

ہی رہی تھیں کہ تقدیر نے لاہور میں لا پھینکا اور بدقسمتی سے کام بھی ایسا ملا جو آدمی نہیں بیل کرتے ہیں۔

ایک دن رتنا کام پر نہیں آیا اُس کے ساتھیوں سے معلوم ہُوا کہ وہ بیمار ہے۔ مدد کے منشی نے میرے ساتھ اپنے لڑکے کو لگا دیا جو غالباً اسکول کی آٹھویں سے بھاگا ہُوا تھا، اور عمر بیس اکیس سال کی ہو رہی تھی بیکاری سے تنگ آکر اب باپ کی وجہ سے مزدوری کے لئے آمادہ ہو گیا تھا اس کا باپ اِس سے پہلے اُسے ہلکا پُھلکا کام دے دیتا اور اسی طرح دن گزر رہے تھے۔

اس کے باپ نے خیال کیا کہ جب احسان جیسا لڑکا بھی یہ کام کر لیتا ہے تو شاید یہ ریٹ کا چکر اتنا بھاری کام نہیں ہے کیوں نہ احسان کے ساتھ اپنے لڑکے کو گل جوڑ کر دوں ڈیل ڈول میں بھی وہ مجھ سے ذرا جیتا سا تھا۔

اُس نے میرے ساتھ صرف ایک دن کام کیا تھا جب دوسرے دن کام پر آیا تو لوگوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ جس کی جگہ منشی کا لڑکا کام پر لگا ہے وہ نوجوان رتنا انتقال کر گیا۔ اُسے تین چار خون کے دست آئے اور بس دُنیا کو خیر باد کہہ گیا۔ اُس کے تمام ساتھیوں اور ہمسایوں کو اس کی موت سے بڑا صدمہ ہُوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے کیسا گھبرو جوان ڈھے گیا، میری نظر میں تو وہ زندہ آدمی کی طرح ہفتوں مسکراتا رہا، وہ میرا بڑا ہی پیارا ساتھی تھا اور ایک جگہ خلوص کے ساتھ کام کرتے کرتے ہم ایک دوسرے سے بہت ہی مانوس ہو گئے تھے، وہ اپنے مذہب کی پروا کئے بغیر آنکھ بچا کر میرے ساتھ کھانا بھی کھا لیا کرتا تھا، موت کیسے کیسے عزیز چہروں کو اُچک لیتی ہے اور پھر پتا نہیں دیتی۔

میرا معمول تھا کہ جب مزدوری سے گھر جاتا تو پہلے تیل کی مالش اور پھر گرم پانی سے غسل ضرور کرتا، اس عمل سے دن بھر کی تھکن دُور ہو جاتی اور جسم پھول کی طرح ہلکا اور لطیف ہو جاتا۔ اُن دنوں مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ میری رگیں تانبے کے تاروں میں تبدیل ہو گئی ہیں

اور گوشت سیسے میں بدل رہا ہے ۔
منشی کے لڑکے کو میرے ساتھ کام کرتے چھٹا دن تھا کہ شام کو گھر پہنچتے ہی اُسے بھی ایک خون کا دست آیا، رتنا کی موت سے پہلے ہی مزدوروں میں ہیبت پھیلی ہوئی تھی، چنانچہ دوسرے روز منشی نے اپنے لڑکے کو کام پر نہ آنے دیا اور رہٹ پر میں اکیلا رہ گیا۔ مزدوروں کو کہا گیا مگر سب نے انکار کر دیا۔ آخر کار ٹھیکیدار نے مجھ سے کہا " یہ کام تُم اکیلے کر سکو تو تمہیں ہی ڈبل مزدوری دے دی جائے گی کیا خیال ہے ؟"

مَیں نے کہا " اچھّا کروں گا! مگر مجھ پر آنے جانے میں وقت کی قید نہ لگائی جائے مَیں چاہے جس وقت آؤں چاہے جس وقت جاؤں، کام کروں یا بیکار بیٹھا رہوں کوئی اعتراض نہ ہو۔ مَیں اس کا ذمّہ دار ہوں گا کہ حوض لبالب رہے اور پانی ٹوٹنے نہ پائے " ٹھیکیدار نے کہا " میاں جی ہمیں تو کام سے غرض ہے اور مدد کے لئے پانی چاہیئے "۔ مَیں نے خندہ پیشانی سے قبول کر لیا، مگر اس لئے کہ مجھے مطالعہ کے لئے وقت درکار تھا اور لائبریری بہت نزدیک تھی، اس کے بعد کسی شخص نے مجھے رہٹ کھینچتے ہوئے نہیں دیکھا اور حوض کا پانی کبھی کم نہیں ہُوا اس پر بعض لوگوں میں سرگوشیاں اور بعض میں چہ میگوئیاں بھی ہوئیں، کوئی کہتا تھا کہ یہ عامل ہے کوئی بنکار رہا تھا کہ اس کے تابع ہمزاد ہے ورنہ یہ کام کرتا تو اسے بھی رتنا کی طرح مر جانا چاہیئے تھا، اس کے پاس تو کوئی اوپری ہی طاقت ہے یہ تو برائے نام مزدوری کرتا ہے۔

مَیں صبح چار بجے تاروں کی چھاؤں میں اُٹھتا اور بدن پر تیل مل کر رہٹ کھینچنا شروع کر دیتا دن نکلنے تک حوض کناروں سے چھلکنے لگتا اور مَیں بے فکر ہو جاتا، اب رہٹ میرے لئے ایک ورزش ہو گئی تھی، میرے بازوؤں میں مچھلیاں اُبھر آئی تھیں اور رانیں ڈھولکیوں کی طرح ہو گئی تھیں۔ مَیں حوض بھر کے وہیں ٹہلتا رہتا اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مدد کی طرف چکّر لگا کے حوض کا جائزہ لیتا رہتا، جب پانی ٹوٹتا

فوراً رہٹ کھینچنے لگتا اور ذرا سی دیر میں حوض کو ڈنا ڈول[1] کر دیتا۔

جب یونیورسٹی سے مدد کم کی گئی اور تھوڑا سا کام باقی رہ گیا تو مجھے ایک چھلائی والے معمار محمد اکبر کے ساتھ لگا دیا گیا محمد اکبر لکھائی چھلائی اور مجسمہ سازی میں ید طولیٰ رکھتا تھا اُس نے چند روز کی نزدیکی سے میرے اندر بچپن کے سوئے ہوئے فنکار کو جگا دیا اور مجھ سے اپنا فن چھپانے کی کوشش نہ کی نتیجہ یہ ہُوا کہ مَیں چند ہی روز میں لکھائی چھلائی کی طرف چل نکلا، بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ یونیورسٹی میں سینیٹ ہال کے دروازے پر سیمنٹ سے بنے ہوئے P.U کے حروف میں بھی میرا گرم خون شامل ہے۔

ایک زمانہ کے بعد جب مَیں ممتحن کی حیثیت سے اپنا چیک وصول کرنے یونیورسٹی آفس میں گیا تو مزنگ کے رہنے والے کئی لوگوں نے مجھے پہچان لیا اور شاہ صاحب نے تو بڑے تعجب سے پوچھا " اچھا جناب یہ احسان دانش آپ ہیں؟" مَیں نے عرض کی " جناب آپ کی دعا سے میں وہی اِس پنجاب یونیورسٹی کا مزدور ہوں جسے آپ گارا ڈھوتے، رہٹ کھینچتے اور پھر معماری میں لکھائی چھلائی کرتے دیکھتے رہتے تھے " اُنھوں نے کہا " بس اب آپ کو مر جانا چاہیئے کیوں کہ ایسی ترقی ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی کمال ہے جہاں ایک شخص یونیورسٹی جیسے ادارے میں مزدور کی حیثیت سے اینٹیں گارا ڈھوتا ہو اور بیل بن کر رہٹ کھینچے وہ وہیں ممتحن کی حیثیت بھی اختیار کرلے یہ تو شاید اب تک ہندوستان بھر میں پہلی ہی مثال ہے "

مَیں نے عرض کی " جناب چونکیئے نہیں، مَیں تو مزدور یونیورسٹی بنانے کا ارادہ رکھتا ہوں اگر عمر اور وقت نے ساتھ دیا تو اپنی یادگار میں تصانیف کے علاوہ ایک اعلیٰ قسم کی لائبریری اور ایک یونیورسٹی چھوڑ کر جاؤں گا "

اسی طرح ایک دن میرے مزدوری کے دَور کے ایک شخص ماسٹر اللہ دتہ ملے اور جب اُنھیں معلوم ہُوا کہ میں صدرِ ممتحن ہوں تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے اور پھر خوشی

[1] ڈنا ڈول: لبالب، کناروں سے چھلکتا ہُوا۔

کے مارے پیٹ ما گئے اب تک مجھ سے ان کا وہی مخلصانہ انداز چلا آتا ہے۔

یونیورسٹی آفس میں محمد سبحان صاحب، احمد دین صاحب اور ماسٹر اللہ دتہ، وغیرہ میرے اُن دنوں کے کرم فرما ہیں اور مرزا عبداللہ بیگ انور ایڈووکیٹ بھی اُسی دور کے دل بڑھانے والوں میں سے ہیں اُن کا بھی مجھ سے اب تک وہی مخلصانہ برتاؤ ہے۔ پیر شریف احمد عثمانی بھی انھیں لوگوں میں سے ہیں جو میرے اُس ماضی سے آگاہ ہیں جو مَیں نے اس کتاب میں محفوظ کیا ہے (مَیں نے اسی جھانجھ میں عرصہ کے بعد اپنے گھر میں "دانش گاہ" کے نام سے ایک اسکول قائم کیا۔ مجھے وہاں یک گونہ مسرت ہوتی تھی کیونکہ وہاں سے میں وہی دولت تقسیم کرتا تھا جس سے دُنیا نے مجھے محروم رکھا تھا، پھر عرصہ کے بعد ایک اعلان ہوا کہ پرائیویٹ ادارے رجسٹریشن کرائیں اور یہ میرے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ اس سے مجھ پر بہت سی شرائط عاید ہوتی تھیں۔ مَیں نے عارضی طور پر اسکول بند کر دیا اور اب رات دن اس فکر میں ہوں کہ کہیں اچھی اور موقع کی جگہ مل جائے تو اب کے کالج قائم کروں اور پھر اُسی کو یونیورسٹی بناؤں)

یونیورسٹی سے کام ختم ہوا تو میرا دوست محمد اسحاق معمار مجھے اپنے ساتھ بلیبہ اخبار[1] سے قریب ہی کام پر لے گیا یہاں مرمّت کا کام تھا زیادہ محنت نہ پڑتی اور دوپہر کو بھی وقت مل جاتا جسے میں لائبریری میں صرف کرتا وہ کام بھی اُسی جمعدار کی تحویل میں تھا جو مجھے پہلے ہی جانتا تھا۔

اُستاد ممتاز

اسی اثنا میں ایک دن شام کو بلیبہ اخبار کے ایک عوامی ہوٹل میں دو تین آدمیوں سے ملاقات ہوئی، وہ میرے سامنے میز پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اور مَیں ایک شخص سے گفتگو میں مصروف تھا جب میرا مخاطب اُٹھ کر چلا گیا اور میں اکیلا رہ گیا تو اُن میں سے ممتاز احمد نامی شخص نے مجھ سے میرا نام پوچھا۔ میں نے اپنا نام بتا دیا تو ممتاز صاحب نے کہا "کام کیا کرتے ہو بھائی؟"

---

[1] مشرقی عراق بلیبہ اخبار

مَیں۔ ”مزدوری۔“

ممتاز احمد صاحب۔ ”مزدوری کہاں کرتے ہو اور کیا کام ہے؟“

مَیں۔ ”جہاں بھی جو کام مل جائے، چند روز ہوئے یونیورسٹی میں کام لگا ہُوا تھا پھر وہ کام ختم ہو گیا تو یہاں سے قریب ہی ایک جگہ مرمّت ہو رہی ہے وہیں مزدوروں میں شامل ہوں۔“

ممتاز احمد صاحب۔ ”یونیورسٹی میں کیا کام کرتے تھے؟“

مَیں۔ ”مدد کو پانی مہیا کرنے کے لئے رہٹ کھینچتا تھا اور حوض بھر دیتا تھا، اُس میں گارا، چُونا وغیرہ بھی بنتا تھا اور اینٹیں بھی بھیگتی تھیں، اس کے علاوہ دیواروں پر بھی چھڑکا جاتا تھا۔ الغرض پانی کی تمام ضرورتوں کو پُورا کرنا میری ذمّہ داری تھی۔“

ممتاز احمد صاحب۔ ”رہٹ کھینچتے تھے؟ رہٹ تو ہمارے یہاں بیل یا اونٹ کھینچتے ہیں؟“

مَیں۔ ”جی ہاں میں بیل ہی کا کام کرتا تھا۔“

ممتاز احمد صاحب۔ ”اور وہ آپ کو کیا دیتے تھے؟“

مَیں۔ ”پہلے بارہ آنے دیتے تھے اور جب سے مَیں دو آدمیوں کا کام اکیلا کرنے لگا تو ڈیڑھ روپیہ ملنے لگا تھا، دوپہر میں لائبریری میں جا کر کتابیں بھی پڑھتا تھا۔“

ممتاز احمد صاحب۔ ”دو آدمیوں کا کام اکیلے کرتے تھے اور پھر اتنی جان بھی رہ جاتی تھی کہ کتابیں پڑھی جا سکیں؟“

مَیں۔ ”جی کیوں نہیں۔ خُدا کا شکر ہے اب بھی میرا وہی مشغلہ ہے روز لائبریری میں جا کر کتابیں پڑھتا ہوں۔“

ممتاز احمد صاحب۔ ”اگر تم لائبریری کے بجائے میرے پاس کارخانے میں آ جایا کرو تو مہینے پندرہ دن میں ایسے ہو جاؤ گے کہ تنخواہ ملنے لگے گی۔ پھر رفتہ رفتہ اسّی نوّے تک پہنچ جاؤ گے۔ یہ میرے شاگرد قمر صاحب یا میاں محمّد نور تمہیں کام سکھائیں گے،

قمر صاحب باندی کھوئی کے رہنے والے ہیں اور شعر و شاعری کا بھی ذوق ہے انھیں۔"
میں "۔ آپ کے کارخانے میں کیا کام ہوتا ہے ؟"
ممتاز احمد صاحب۔ "نکل پالشنگ۔"
میں ۔ "بالکل نہیں سمجھا کہ نکل پالشنگ کیا بلا ہے ؟"
ممتاز احمد صاحب "۔ تم اسے صیقل گری سمجھ لو، آہستہ آہستہ پھر سمجھ میں آجائے گا، ذرا کام میلا ہے ۔"
میں "۔ میلے کام سے میں نہیں گھبراتا ، باعزت طور پر مزدوری کرنا چاہتا ہوں ، روز روز جو بھاگنا دوڑنا پڑتا ہے اس سے طبیعت الجھتی ہے ۔"
ممتاز احمد صاحب "۔ یہ کام تو ایسا ہے کہ ایک جگہ نوکر ہو گئے تو بس ہو گئے ، دوڑنے بھاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ایک در بند ہوتا ہے تو ہزار در کھل جاتے ہیں۔ محنت شرط ہے ، محنت ! کیونکہ کارخانے کا مالک تو یہ چاہتا ہے کہ کام زیادہ سے زیادہ ہو!"
میں "۔ (قمر الحسن کی طرف دیکھ کر) کہیئے جناب آپ کام سکھانے پر آمادہ ہیں؟
قمر "۔ کیوں نہیں ؟ استاد کہہ رہے ہیں تو ہماری کیا مجال ہے کام نہ بتائیں ۔"
محمد نور "۔ اگر تمہارے یہاں کام کم ہو تو میرے پاس بٹھا دو ، پندرہ دن میں کاریگر کر دوں گا ۔"
قمر "۔ نہیں میں خود سکھا دوں گا ؟"
میں "۔ کارخانہ کہاں ہے ؟"
قمر "۔ دھنی رام روڈ پر شروع ہی میں مستری نورالدین کا کارخانہ ہے ۔ میں وہیں ملوں گا کسی سے بھی پوچھ لیں ۔"
مستری نورالدین اور ان کا بڑا صاحبزادہ محمد عبداللہ دکان پر بیٹھتے تھے اور محمد یوسف چھوٹا لڑکا زیرِ تعلیم تھا ، میرے متعلق قمر نے مستری نورالدین اور عبداللہ سے

پہلے ہی بات چیت کرلی تھی، چنانچہ دُوسرے دن دوپہر کی چھٹی میں جب میں گیا تو قمر میرے انتظار میں تھا اُسی وقت میرا ہاتھ پکڑ کے مستری صاحب کے پاس لے گیا اور صرف یہ کہا "یہ وہ آدمی ہے جس کا میں نے ذکر کیا تھا" مستری صاحب نے کہا "دیکھو محنت سے عظمت ہے، جیسا کرو گے ویسا پاؤ گے، آگے تُم جانو۔"

قمر نے پہلے ہی دن مُجھے چند اصُولوں سے واقف کر کے مشین پر بٹھا دیا تھوڑی دیر میں میرے ہاتھ پاؤں کالے ہونے لگے، جیسے وہاں کام کرنے والوں کے تھے۔ اِس سے مجھے ایک مسرّت سی ہوئی کہ دیکھنے والے مُجھے کاریگر یا مستری خیال کریں گے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ کام پر جاؤں گا، تو مزدُور کیا کہیں گے؟ اور شاید جمعدار خیال کرے کہ کھانے کی چھُٹی میں کسی کارخانے میں جا کر کام کرتا ہے ممکن ہے وُہ مزدوری سے جواب دے دے،

مَیں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک طشتری جس پر میں بُف لگا رہا تھا میرے ہاتھ سے نکل کے زور سے دیوار میں جا کر لگی، آواز سُن کر ممتاز صاحب دوڑ کر میرے پاس آئے اور گھبرا کر پُوچھا "کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟ ذرا دھیان سے کام کرو اِس میں تو ہاتھ کی گرفت پر سارا مدار ہے، نکل کا پانی بنانا تو دو روز میں آجائے گا" مُجھے کام کرتے تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ نُور بولا "بھائی اب کام چھوڑ دو اور اپنی مزدوری پر جاؤ، وقت نکلا جا رہا ہے" مَیں یک دم چونک پڑا اور کارخانہ سے بھاگ دوڑ کر اُسی حالت میں کام پر جا لگا۔ دُوسرے مزدُور مجھے دیکھ کر حیران تھے کہ یہ کالا منہ، نیلے ہاتھ پاؤں، اِس رُوپ میں کہاں سے آیا ہے، لیکن اس میں کسی کا کیا تھا اور پھر کسی نے دیکھا کسی نے نہیں دیکھا، جمعدار جو تمام مزدُوروں کی دیکھ بھال کرتا تھا بڑا ہی جوکنّا قسم کا آدمی تھا وُہ پڑھا لکھا تو نہیں تھا لیکن جب وُہ صبح ہی مزدُوروں کو کام پر لگا کر ایک گشت کرتا تو اس کی نظر میں ہر آدمی کی جگہ بن جاتی۔ اگر کوئی مزدُور اِدھر اُدھر ہوتا تو وُہ فوراً تاڑ جاتا، چنانچہ جب میں پہنچا تو اُس نے دُور سے للکارا "احسان! کہاں سے آیا ہے تُم!" پھر آہستہ آہستہ مزدُور

کو دیکھتا بھالتا مجھ تک پہنچ گیا اور میرا حلیہ دیکھ کر بولا "کیوں جی یہ کیا حال ہے تمہارا!"
میں "جمعدار صاحب! کچھ نہیں تھوڑی دیر کے لئے ایک کارخانے میں چلا گیا تھا میرا ایک دوست بیمار ہو گیا ہے اس کی جگہ کچھ دیر یہ کام کرنے لگا تھا، جمعدار گردن ہلاتے ہوئے اچھا کہہ کر خاموش ہو گیا، جیسے وہ میرے کسی راز کو پا گیا ہے۔
میں دس پندرہ دن اسی طرح ممتاز صاحب کی نگرانی میں قمر کے ساتھ کام کرتا رہا۔
ایک دن میں نے پانی کے جگ پر پالش کی اور قمر نے ممتاز صاحب کو دکھا کر کہا "اب اسے چالیس تو مل جائیں گے نا؟"
ممتاز "کھرے! بلکہ اس سے زیادہ"
میں "اچھا تو میں چالیس روپے ماہانہ کے قابل ہو گیا ہوں؟"
ممتاز "کل کام چھوڑ کر آجاؤ تو یہیں اسی کارخانے میں چالیس ملیں گے، اور دوسرے کارخانوں میں زیادہ"
تین چار روز کے بعد جمعدار نے ہم تین چار مزدوروں کو غیر معیّن عرصہ کے لئے ایک اور شہر کے مکان میں سفیدی کے لئے تعینات کر دیا کیونکہ میں ڈنگا سنگھ بلڈنگ پر سفیدی کا کام کر چکا تھا اور اُن نئے کمروں میں قابلِ اطمینان کام ہو گیا تھا اس لئے جانا پڑا۔ قریب قریب پندرہ دن نہ تو میں ممتاز صاحب کے وہاں حاضری دے سکا اور نہ ہی نزدیک کوئی لائبریری تھی کہ اپنی تشنگی کو تسکین دیتا۔

مستری نورالدین

اچانک میری طبیعت مُحتاجی سے اُکتا گئی اور میں اپنا حساب لے کر دوسرے ہی دن ممتاز صاحب کے پاس پہنچ گیا اور کہا "لیجئے مزدوری تو میں ختم کر آیا ہوں! اب آپ مجھے کارخانہ سے کیا دلا سکتے ہیں؟"
ممتاز صاحب نے اُسی نورالدّین کے کارخانے میں مجھے چالیس روپے پر رکھوا دیا، میں بڑے لگاؤ اور محنت سے کام کرنے لگا۔

مستری نُورالدّین بعض دفعہ اپنے ٹھیے سے اُٹھ کر میرے اڈّے کے پاس آکھڑے ہوتے اور مجھے کام میں مصروف دیکھتے رہتے۔ بعض اوقات تو میرا انہماک اُن کی طرف آنکھ بھی نہ اُٹھاتا اور مَیں مشین کی کھڑکھڑاہٹ میں کچھ نہ کچھ گنگناتا رہتا۔ اُنہیں نہ جانے اتنی ہمدردی کیوں تھی کہ انھوں نے مجھ سے کئی بار کہا کہ اگر خرچ کی ضرورت ہو تو پیشگی لے لو۔ ایک دن میں نے اُن سے پانچ روپے پیشگی لے لئے مگر اُنھوں نے وہ رقم میرے حساب سے منہا نہیں کی، میں اگرچہ موصُوف سے دُور دُور رہتا تھا لیکن خالباً عبدالرحمٰن[1] صاحب نے مستری نُورالدّین سے میرے متعلّق کچھ کہہ دیا تھا اور مستری نُورالدّین مجھے قابلِ امداد خیال کرنے لگے تھے۔ لیکن یہ بارِ احسان اُٹھانا ہرگز میرے بس کی بات نہ تھی اس لئے میں نے اِس فضا سے بھی کنارا مناسب خیال کیا مستری صاحب سے بھی مجھے ہر وقت ایک ندامت سی رہنے لگی تھی اور مَیں اُن کے اِس جذبۂ رحم کی تاب نہ لا سکا۔

چندا جمعدار چندا جمعدار نہایت شریف انسان تھا اور میری طرف سے تو وُہ بہت ہی خوش خیال ہو گیا تھا حالانکہ ابھی میرا کوئی رُخ اُس کی نظر میں اصل رُوپ نہیں تھا اور میری طرف سے ابھی اس کی خوش خیالی اور جستجو کی عینک نہیں اُتری تھی۔

دوسرے ہی دن میں چندا کے پاس پہنچ گیا، اُس نے دیکھتے ہی پُوچھا "کیوں جی تم کہاں ہو کیا بات ہے"؟ مَیں نے شرم سے گردن جُھکالی اور کہا "جناب جمعدار صاحب مَیں بیوقوف ہوں، بیوقوف!" چندا نے بڑے پیار سے کہا "لاٹ صاحب کی پروا نہ کرو جی! مزدور کبھی بھوکا نہیں رہ سکتا مالک پر بھروسا بڑی چیز ہے، سب کام سِدھ ہو

---

[1] عبدالرحمٰن صاحب مستری نُورالدّین کے اعزا میں سے ہیں نہایت ذہین، طبّاع اور مسلمان قسم کے انسان ہیں آج بھی وُہ مجھ سے اُسی محبّت سے پیش آتے ہیں۔

ہو جائیں گے ، گول باغ کے پاس لیبارٹری میں آجاؤ مگر دوپہر کو غائب ہو جانا اچھی بات نہیں ! تم اب کہیں نہیں جاؤ گے ۔ میں اچھا کہہ کر چپ ہو گیا ۔ اور دوسرے دن کام پر جا لگا ۔

جوں جوں دن گزرتے گئے روزمرہ کی مشقت میرے لئے عادت بنتی گئی ۔ جب دوپہر کو سب مزدور آرام کرتے یا سوتے تو تھکن کے باوجود مجھے نیند نہ آتی اور سب سے علیحدہ ایک طرف قولنج کے مریض کی طرح کروٹیں بدلتا رہتا ایک دن جو طبیعت گھبرائی تو میں اُٹھ کر پھر لائبریری چلا گیا اور کام کی گھنٹی بجی تو واپس آگیا ۔ اس کے بعد لائبریری میں جانا میرا معمول ہو گیا ۔

اُستادی

ایک دن چیندا جمعدار نے مجھے دوپہر کو مزدوروں میں نہ پایا تو خاموش ہو گیا مگر جب واپس آیا تو اُس نے پوچھا ! "احسان تم دوپہر کو کہاں چلے جاتے ہو جی ؟ کیا پھر کارخانے جانے لگے " ؟

میں ۔" کارخانے تو نہیں لائبریری چلا جاتا ہوں وہ میرے ڈھب کی جگہ ہے ۔"

چیندا ۔" لائبریری میں کوئی دوست ہے ؟"

میں ۔" کتابوں سے زیادہ کون دوست ہو سکتا ہے ؟"

چیندا ۔" اچھا تم کتابیں بھی پڑھ سکتے ہو ؟"

میں ۔" جمعدار صاحب اسی دیوانگی میں تو برباد ہوا ہوں اور گھر در چھوڑے پھرتا ہوں "

چیندا ۔" کیا تم مجھے اس قابل کر سکتے ہو کہ مزدوروں کے نام لکھ سکوں اور حاضری بھر سکوں ؟"

میں ۔" ہاں ہاں ! کوشش ہو تو بہت جلد ایسا ہو سکتا ہے ۔"

چیندا ۔" تو پھر میرے پاس حاطے میں کیوں نہیں آجاتے ؟ جہاں سب مزدور رہتے ہیں ۔"

میں ۔" کہاں ہے یہ احاطہ ؟"

چندا ”شاہو کی گڑھی کے قریب پردہ اسکول کے سامنے ہے ۔“

مَیں ”مجھے شہر میں یہ آرام ہے کہ مزدوری تلاش کرنے میں آسانی رہتی ہے ۔ یہاں کرایہ بھی کم ہے ۔“

چندا ”میرے پاس تو بارہ مہینے کہیں نہ کہیں کام لگا ہی رہتا ہے ۔ مَیں تمہیں بیکار نہیں رہنے دوں گا اور کرایہ بھی شہر سے کم رہے گا ۔ تم اکیلے آدمی تو ہو کسی کے بھی ساتھ کر دوں گا ۔“

مَیں ”جمعدار صاحب مَیں کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتا اور شاید نہ کوئی دُوسرا میرے ساتھ رہ سکے گا ۔“

”یہ کیوں ؟ ایسی کیا بات ہے ؟“

مَیں ”مَیں بہت کم سوتا ہُوں ۔ ساری رات پڑھتا ہُوں ٹہلتا ہُوں اور گنگناتا ہُوں اور یہ ایسی عادت ہے جو دوسروں کے لئے تکلیف رساں ہے ۔ مَیں سوتے ہُوئے لوگوں میں دانستہ پھرتا ہُوں اور سوچتا ہُوں کہ مرنے کے بعد رُوح اسی طرح اپنے گھر آتی ہوگی اور اس میں مجھے بڑا لطف آتا ہے ۔“

چندا ”تو پھر مَیں تمہارے لئے سب سے الگ جگہ کا بندوبست کر دوں گا ۔“

مَیں نے اقتصادی رُو سے اس موقع کو غنیمت جانا اور شام کو نصراللہ خاں کے احاطے سے سامان اُٹھا کر ڈیورنڈ روڈ پر کوئین میری کالج[1] کے سامنے والے احاطے میں چندا جمعدار کے اُستاد کی حیثیت سے جا بسا ۔ اس فیصلے کے بعد مَیں نے پیسہ اخبار کو اس طرح خیرباد کہا جیسے کوئی بے قصُور انسان حکّام کی مخالفت کے باعث دماغ سے دِلیوالیہ لوگوں میں نظر بندی کے دن پورے کر چکا ہو ۔ چندا جمعدار نے مُجھے چھ آنے مہینے کا ایک غسلخانہ دے دیا اور سیمنٹ کی تین چار خالی بوریاں جھاڑ کر بچھا

[1] ڈیورنڈ روڈ پر کوئین میری کالج ۔

دیں۔ میں نے اپنے کپڑوں کی پوٹلی اور ایک چیڑ کا کھوکھا وہاں رکھ دیا۔ غسلخانہ لمبان میں تو غنیمت تھا لیکن چوڑان میں صرف اتنا کہ اگر دو آدمی آمنے سامنے بیٹھ جائیں تو ایک دوسرے کی سانسیں اپنی پیشانی یا چہرے پر باسانی محسوس کر سکیں۔ لیکن ان دنوں میں چونکہ تنہائی کا جویا تھا اس لئے اُس غسلخانے کو ہی غنیمت سمجھا۔ اس احاطے میں یُوں تو سب سخت اور کھُردرے جسم کے مزدُور تھے لیکن میرے لئے کوئی بھی باعثِ تکلیف نہیں تھا۔ میں صبح اُٹھتے ہی کھانا پکا کر اُن کے ساتھ کام پر چلا جاتا۔ دوپہر لائبریری میں گزرتی شام کو واپسی پر چندا جمعدار کو پڑھایا کرتا۔ اس کے بعد جب تک جاگتا لکھتا پڑھتا رہتا۔ طبیعت اُکتاتی تو احاطے سے باہر نکل کر سڑک پر ٹہلنے لگتا جہاں اسکول اور کوئین میری کالج کے درختوں اور باڑ کے سایوں سے گوروں کی چھوٹی سانسوں اور سرگوشیوں کی کھڑکھڑاہٹ راہگیروں کو سنائی دیتی اور بعض اوقات نیم عریاں اجسام اسکول کے احاطے کی طرف لپکتے نظر آتے تھے۔ کبھی کبھی جب موج آتی تو قریب ہی شملہ پہاڑی پر چلا جاتا جہاں کا سکوت اور نم آلود زمین کی سانسیں میرا خیر مقدم کرتیں۔ بعض بعض اوقات وہاں بھی ترسے ہُوئے اجسام گتھے ہوئے نظر آتے اور کبھی 'نامی' آپس میں تبادلۂ خیال میں منہمک ملتے۔

اس احاطے میں دن گزرتے رہے۔ چندا کو نام لکھنا اور حاضری بھرنا آگیا اور اس کی جمعداری ٹھیکیداری میں تبدیل ہوگئی۔ جس رفتار سے چندا کی جمعداری ٹھیکیداری تک پہنچی اُسی رفتار سے میری بیلداری بھی معماری کے نزدیک آگئی اور اب مجھے اٹھارہ آنے روز ملنے لگے اور بڑھتے بڑھتے دو روپے چھ آنے روز تک آگئے۔ مگر میں نے کبھی رقم کو معیار نہیں بنایا اور نہ کسی کام کو مستقل سمجھا۔ میرا نظریہ تو یہ رہا کہ بے روزگاری نہ ہو اور میرا رُوحانی تقاضا پُورا ہوتا رہے۔

چندا جمعدار اپنے وطن جانے لگا تو جاتے ہوئے اپنے قائم مقام کو تاکید کر گیا

کہ میرے اُستاد کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ یہ بہت کام کے انسان ہیں اس لئے وُہ لوگ بڑی رواداری برتتے تھے۔ لیکن چند ا کے بعد وہاں سے میری طبیعت اُچاٹ رہنے لگی اور کسی دُوسری جگہ کی تلاش نے میرے ذہن میں راہ کر لی۔ معماروں[1] کی دوستیوں اور دلچسپیوں نے میرے وقت پر یہاں تک شب خون مارا کہ مطالعہ کا وقت تفریح نے لے لیا مگر ان کی صحبت سے میری طبیعت جلد ہی سیر ہو گئی۔ کیونکہ معماری میری منزل نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ اُن کی صحبت مجھ پر بار گزرنے لگی اور میں اِس ماحول سے اِس قدر اُکتایا کہ پندرہ دن کام کرتا اور جیتنا ملتے ہی کچھ رقم گھر بھیج دیتا اور جو بچتا اس سے کھانے پینے کا سامان لے آتا اور جب تک وہ ختم نہ ہوتا کام پر نہ جاتا۔ بس لائبریریوں میں مارا مارا پھرتا اور آوارہ خوانی کرتا۔ آہستہ آہستہ میں نے کتابوں کی خریداری بھی شروع کر دی۔ ضروریاتِ زندگی روک کر بھی اچھی کتاب ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ شاعری کے جذبے نے یہاں تک زور پکڑا کہ جو دیوان بھی سامنے آتا اس کے ردیف قافیئے لے کر غزلیں کہنا شروع کر دیتا۔ پھر موازنہ میں اچھے بُرے کا فیصلہ دینے لگتا۔ یُوں تو میرا دل ہر کام سیکھنے کو چاہتا مگر کچھ روز کے بعد یہ معلوم ہوتا جیسے مَیں کسی چمنی کے دھوئیں کی پرچھائیں پکڑنا چاہتا ہوں صرف کتاب ہی ایسی چیز تھی جو مجھے بہرعنوان اپنی طرف کھینچتی تھی اور مطالعہ کی ہر نشست کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے رنگ رنگ کے عریاں فانوس مجھے نزدیک بلانے کو اشارے کر رہے ہیں۔ اُس وقت نہ تو نظموں کی کتابیں اتنی تھیں اور نہ مجھے نظم کے محاسن و معائب کی اتنی زیادہ خبر تھی لیکن احساس میں نزاکت اور دل و دماغ میں غور و فکر جاگ رہے تھے۔ اس زمانے میں جب کوئی ذرا ناشائستگی سے پیش آتا یا اصلیت کے خلاف بات منوانے پر مجبور کرتا تو مَیں تکلیف محسوس کرتا جیسے میرے استحکام و عزائم میں پت جھڑ اُتر رہا ہو۔ اور

---

[1] محمد اسحاق۔ ننھے بریلوی۔ بنّے بریلوی۔ فضل حسین وغیرہ

جراثوں میں طاعون پھیل گیا ہو لیکن پھر تنہائیوں کا غور و فکر مجھے چمکار چمکار کر انسان کی مجبوری کی طرف لے آتا اور میں اپنی بساط پر نظر ڈال کر خاموش ہو جاتا۔

حسن ایک دن میں کام کر کے گھر آ رہا تھا کہ اچانک ایبٹ روڈ پر مجھے ایک درخت کے قریب کسی سریلی آواز نے متوجّہ کر لیا۔ آگے آگے ایک لڑکا یہ مصرع پڑھتا جا رہا تھا ؎

روز دیوانے کو دیوانے خیال آتے رہے

میں لپکا اور نزدیک ہو کر چلنے لگا اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا لیکن اُس وقت میں چونے اور مٹّی میں سنا سنایا کام سے آ رہا تھا۔ اس نے میری ہیئت کذائی کو دیکھ کر بے پروائی سے پھر اُسی طرح گانا شروع کر دیا لیکن جب اس نے یہ دیکھا کہ میں نے اپنی رفتار مدّھم کر لی ہے تو اس نے پھر ایک بار میری طرف دیکھا، اور خاموش ہو گیا۔

میں نے ذرا نزدیک ہو کر کہا " جناب آپ یہ کیا گنگنا رہے تھے ذرا پھر ایک بار سنائیں۔" اس نے متعجّب ہو کر پہلے تو بغور میری طرف دیکھا جیسے میں نے اُسے کسی دُوسری دُنیا کی بات بتانے کو کہا ہو لیکن پھر تأمّل کے بغیر کہنے لگا۔ " آپ سمجھتے ہیں کچھ؟"

میں :- " ہاں سمجھنے کی کوشش کروں گا۔"

اس نے ایک غزل چلتے چلتے سُنائی اور چلتے چلتے ہی تعارف ہو گیا۔ چند منٹ اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد اُس نے میرا پتا پُوچھا۔ میں نے کہا میں یہاں قریب ہی پردہ اسکول کے سامنے والے احاطے میں رہتا ہوں۔ وہیں اور بھی بہت سے مزدور رہتے ہیں۔

حسن :- " کیا مزدوری کرتے ہیں آپ؟"

میں :- " جو بھی مزدوری میسّر آ جائے۔ گارا ڈھوتا ہوں۔ اینٹیں اٹھاتا ہوں۔

رہٹ کھینچتا ہُوں۔ سفیدی کرتا ہُوں۔ سڑکیں کوٹتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔"

حَسن :۔"آپ تو پڑھے لکھے لوگوں کی طرح باتیں کرتے ہیں۔"

مَیں :۔"ایک مزدُور کا پڑھے لکھے لوگوں کی طرح باتیں کرنا جُرم تو نہیں"۔

حَسن :"جرم تو نہیں مگر آپ کا تلفّظ صحیح اور صاف ہے، جاہل مزدُوروں والا نہیں۔"

مَیں :"تلفّظ کی درستی تک ہی میری تعلیم نہیں بلکہ الفاظ سازی اور اس کا استعمال بھی جانتا ہوں۔"

حَسن :"کیا مطلب؟ مَیں نہیں سمجھا۔"

مَیں :"مَیں غلط سلط شعر کو پسند نہیں کرتا، نہ داد دیتا ہوں۔ اور خود بھی شعر کہتا ہوں۔"

اس نے پھر مُجھے تعجب سے دیکھا اور نیچے سے اوپر تک ایک جائزہ کی نظر ڈالی۔ اتنے میں چوراہہ آگیا۔ جہاں سے میری قیام گاہ کو سڑک مُڑتی تھی۔ مَیں نے حَسن سے کہا "مجھے تو اس طرف جانا ہے۔ اُس سامنے والے احاطے میں ہوں۔"

حَسن نے کہا "اچھّا آپ اِس طرف جائیں گے؟ چلیئے وہاں تک میں بھی چلتا ہوں۔ پھر میں مال روڈ کی طرف چلا جاؤں گا۔ آپ کا احاطہ دیکھ لوں، جب مجھے فرصت ملے گی آجایا کروں گا۔"

مَیں نے کہا "بھئی مَیں تو صبح کام پر جاتا ہوں اور اس وقت واپس آتا ہوں اب کام سے واپس آرہا ہوں۔"

حَسن :"کہاں کام لگا ہُوا ہے؟"

مَیں :"چنگڑ محلّے میں۔"

حَسن :"مَیں کل آپ کو کام کرتے دیکھوں گا، آپ کس طرح کام کرتے ہیں۔"

مَیں: "شوق سے آئیں اور عبرت حاصل کریں۔"

حسن احاطے تک مجھ سے باتیں کرتا چلا گیا اور جب اُس نے دیکھا کہ میں ایک غسلخانے میں رہتا ہوں تو وہ اور بھی حیران ہُوا اور کہنے لگا "اس غسل خانے میں رہتے ہیں؟"

مَیں: "جی ہاں یہیں رہتا ہُوں، کیوں؟"

حسن: "میرے ساتھ چلو۔ جہاں مَیں رہتا ہوں وہاں تمہارے لئے بھی گنجائش نکل سکتی ہے۔"

مَیں: "شکریہ! مَیں یہیں خوش ہُوں۔ آپ چاہیں تو یہیں آجایا کریں مگراسی وقت"

حسن: "خیر میں تو آہی جایا کروں گا اور روز آؤں گا لیکن اگر میری ذات سے تمہیں کچھ آرام پہنچے تو مَیں خوش ہوں گا۔"

مَیں: "آپ فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کریں۔ آپ کہاں رہتے ہیں؟"

حسن: "مَیں فلیٹی ہوٹل میں رہتا ہُوں۔ میرے والد میر منشی ہیں۔ انگریزوں کو اُردو پڑھاتے ہیں۔"

مَیں: "میر منشی کہہ دینا ہی بہت تھا۔"

حسن: "معافی چاہتا ہوں۔"

حسن دسویں جماعت پاس کر چکا تھا لیکن بڑی ضیق میں تھا۔ اس کی والدہ مر چکی تھی اور یہ دوسری والدہ کے سائے میں پل رہا تھا۔ اُسے حسن ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا اور اس کا والد کسی سنگین مقدمے کے چکر میں تھا۔

حسن نے بلا ناغہ میرے یہاں آنا شروع کر دیا۔ اس کی بڑھوتی کی عمر تھی اور ہلکی ہلکی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ اس کے گال پر ایک چاند نما کسی زخم کا نشان تھا جو اس کے صندلیں رنگ پر ناگوار معلوم نہیں ہوتا تھا۔ حسن تھا تو جالندھر کا رہنے والا لیکن اس کی عمر اور شائستگی سے پتا چلتا تھا کہ اس کی تربیت کسی اچھے ماحول میں ہوئی ہے۔ یہی

سبب تھا کہ وہ مجھ سے نزدیک ہوتا چلا گیا۔

اسی اثنا کا ذکر ہے کہ ایک دفعہ جب میں مال روڈ پر ایک بلڈنگ پر پینٹ کر رہا تھا، شام کو حسن سوٹ کیس اُٹھائے میرے گھر آیا اور اُسے چوکھٹے کے پاس رکھ کر دروازہ میں چپکا کھڑا ہو گیا۔ میں نے پوچھا "خیریت ہے"؟ حسن نے کہا "کچھ دنوں تک یہیں آپ کے پاس رہوں گا۔"

میں نے ذرا وقفہ دے کر پوچھا "بات تو بتاؤ کیا ہے؟ کیا گھر سے ناراض ہو کر آئے ہو"؟ حسن نے کہا "گھر کہاں ہے؟ والد صاحب کا انتقال ہو گیا وہ جالندھر گئے ہوئے تھے سال کی خبر سن کر والدہ تمام سامان لے کر جالندھر چلی گئیں اور مجھے یہاں چھوڑ گئیں"۔ یہ کہتے کہتے حسن کے آنسو بہنے لگے اور وہ مجھ سے لپٹ کر بچوں کی طرح رو پڑا۔ میں نے اسے ڈھارس دی اور کہا "گھبرانے کی بات نہیں۔ انشاء اللہ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ صبر کرو، ماں باپ کا صدمہ تو سبھی کو اُٹھانا پڑتا ہے یہ قسمت کی باتیں ہیں اس میں رونے دھونے سے حاصل کچھ نہیں ہوتا آخر صبر ہی کرنا ہوتا ہے۔

حسن بڑا ہی ذہین لڑکا تھا۔ اگر میرے حالات ذرا بھی اجازت دیتے تو میں اُسے تعلیم دلواتا لیکن میں تو خود غربت و افلاس کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا تاہم میں نے اُسے دلاسا دے کر اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگایا اور پھر دونوں سڑک پر سیر کو نکل گئے میں سارے راستے اس کی دلدہی کرتا رہا۔ پہلے تو میں حسن سے کبھی کبھی کوئی غزل سُن لیتا تھا لیکن اس حادثے کے بعد میں نے کبھی اُس سے اِس قسم کی کوئی فرمائش نہیں کی۔ حسن مجھ پر کسی صورت سے بھی بار نہیں تھا۔ لیکن میرے حالات کا اُسے شدید احساس تھا۔ اس نے کئی بار کہا میں شرمندہ ہوں کہ اپنا بار آپ پر ڈال دیا۔ آپ مجھے جلد سے جلد کہیں نوکر رکھا دیں۔ جب میں نے دیکھا کہ اس کا احساس اسے تنگ کر رہا ہے تو میں نے کوشش کر کے اپنے ایک دوست کی معرفت ریلوے میں ملازم کرا دیا۔

اس وقت سے حسن مجھے صرف دو بار ملا۔ ایک بار تو عرصہ ہوا وہ لاہور ریلوے اسٹیشن پر پارسلوں کی جانچ پڑتال کر رہا تھا اور اچانک سامنا ہو گیا۔ دوسری بار کراچی میں فریر روڈ پر اتفاقاً مڈبھیڑ ہو گئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ اب کراچی ہی میں کہیں سپرنٹنڈنٹ قسم کا ملازم ہے۔

نیا سہارا

کشامت تو ہر وقت مزدور کے ساتھ چلتی ہے چنانچہ میں پھر بے روزگاری کے چکر میں آگیا ہے جتنے دن میں نٹھلا[1] پھرا، میری نظر میں تہذیب و تمدّن کے داغ دھبّے اور رستے ہوئے ناسوروں کے علاوہ کچھ نہ آیا۔ اب مجھے اپنے روزگار سے زیادہ اپنے جیسے خستہ حال لوگوں کا خیال رہنے لگا تھا۔ کیونکہ اب میرے علم میں بے شمار آدمی ایسے آگئے تھے جو مجھ سے بھی زیادہ مصائب میں مبتلا تھے۔ جن کا حال اپنے ماضی اور مستقبل دونوں سے نامانوس تھا، اور زندگی کے معنی ہی اُن کی نظر میں جُدا تھے، جنھوں نے آزادی کی فضا میں اب تک ایک سانس بھی نہیں لی تھی۔ مَیں سوچا کرتا کہ کیا یہ لوگ اپنی محنت و مشقت اور جانکاہی کی ذمّہ داریاں اپنی اولاد کے سپرد کر کے یُونہی دُنیا سے رخصت ہو جائیں گے؟ اِنہی خیالات میں بعض اوقات زندگی مجھے ایسی لگتی جیسے شکاری کی گرفت سے بھاگی ہوئی نیل گائے کہیں تھک کے گر پڑی ہو۔ اس وقت میں خیالات کا رُخ جلدی سے کسی دوسری طرف موڑ دیتا۔

مال روڈ پر ملکہ وکٹوریہ[2] کے اسٹیچو کے اِردگرد بے روزگار بیروں اور خانساماؤں کا ہجوم رہتا تھا۔ کبھی کبھی مَیں اُن میں جا بیٹھتا تو اُن کی افلاس میں ڈوبی ہوئی دُنیا داری دیکھ کر ترس آتا۔ اُن میں بعض جو بالکل قلاّش تھے ایسی ایسی ڈینگیں مارا کرتے کہ خُدا کی پناہ! مَیں اُٹھ کر بھاگ دیا کرتا۔ اُنہی میں ایک شخص جان محمّد خانساماں بھی تھا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے واحد انسان

---

[1] نٹھلا: بے کار۔ بے روزگار۔ فارغ رہنا۔ [2] اب اس جگہ ملکہ وکٹوریہ کا بُت نہیں ہے لیکن چبوترہ باقی ہے۔

تھا۔ اچھا خاصا موٹا اور بے ڈھبی قسم کا آدمی، ایک آنکھ بڑی اور ایک چھوٹی۔ بڑی آنکھ جھلّائے ہوئے بجار کی طرح سُرخ، بھرے ہوئے چہرے پر خشخشی داڑھی اور جسم کی فربہی کے ساتھ آواز ایسی جیسے کوئی کنستر میں مُنہ ڈال کر بول رہا ہو۔ مگر نیک اور وضعدار قسم کا انسان!۔ آن اور زبان کا ایسا پکّا کہ اس وقت پانچ سو ماہانہ سے کم کی ملازمت کو گناہ خیال کرتا تھا۔ جب میری اس سے ملاقات ہوئی تو وہ تین ماہ سے بیکار تھا مگر اُسی مہینے اُسے نوکری مل گئی تھی۔ جس انگریز کے یہاں اُسے جگہ ملی وہ ہندوستان میں نو وارد تھا۔ کئی خانساماں اس کے ہاں سے ایک ایک دو دو دن کام کر کے بھاگ چکے تھے مگر اِس جان محمدؐ نے نہ جانے اُس پہ کیا افسوں پھونکا تھا کہ صاحب کہ وہ بچوّں کی طرح ڈانٹتا اور مشتعلی سے اپنا سارا کام لیا کرتا۔ باورچی خانے کے باہر اس کی کرسی پڑی رہتی اور وہ کوٹھی کے سب نوکروں پر حکم چلاتا رہتا صاحب کو اُس کی یہ ادا نہ جانے کیوں پسند تھی۔

معلوم نہیں جان محمد سے میرے تعلقات کیوں اور کس طرح بڑھ گئے تھے۔ وہ ایک دِن مجھے اپنے گھر لے گیا اور اپنے ایک عزیز محمد اسمٰعیل کو نعت خوانی میں میرا شاگرد کرا دیا۔ اس طرح اُس کے پورے خاندان سے میرے مراسم اُستوار ہو گئے۔

فاطمہ حویلی میں اُن کا ایک عزیز عبدالرحمٰن نامی بھی رہتا تھا جو واٹر لاک کمپنی میں پوشش کا کام کرتا تھا اور اپنے فن میں یکتائے روزگار تھا۔ عبدالرحمٰن کی اہلیہ مجھے اپنا بھائی کہنے لگی اور مَیں اُسے اپنی بہن!

بعض بعض اوقات تو مَیں فاطمہ میں اپنی حقیقی بہن سے بھی زیادہ محبت اور شفقت محسوس کرتا۔ جب مَیں اُن کے گھر پہنچتا تو دونوں میاں بیوی باغ باغ ہو جاتے اور طرح طرح سے خاطر و مدارات کرتے۔

شاہی قلعہ لاہور میں مزدوری

شاہی قلعہ لاہور کے جنوبی حصے کو توڑ کر سیر گاہ بنائی جا چکی تھی اور میں وہاں مزدوروں میں کام کر رہا تھا۔ نہ جانے کس طرح لوہے کی وہ موٹی نالیاں جن کے سرے دیوار میں تھے ڈھیلی ہو گئیں اور سرے سرک کر نالیاں نیچے کو باہر کی طرف جھک گئیں۔ میں نے جونہی تختے پر پاؤں رکھا تختہ مجھے لے کر ایسی تیزی سے نیچے گرا کہ میں سنبھل نہ سکا، اور خندق میں آ رہا۔ لیکن نہ جانے کیوں زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ میں اپنے پاؤں باہر نکل آیا لیکن مجھ سے کام نہ ہو سکا۔ کچھ ایسی گم چوٹیں آئیں کہ مجھے سانس لینا دشوار ہو گیا۔

چند احمعدار کے ایک نائب نے یہ کہہ کر مجھے لٹا دیا "چھٹی ہو جائے گی تو تمہیں گھر لے چلوں گا۔ میں دیوار کے سائے میں ایک تغاری پر سر رکھے لیٹا رہا آخر چھٹی کا وقت آ گیا اور سب مزدور اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ نائب جمعدار نے مجھے سائیکل پر بٹھا کے اپنی لوہے کی بید مجھے پکڑا دی کہ آگے لئے بیٹھے رہنا۔ جب سائیکل چلی تو میں نے وہ بید سیدھے سبھاؤ آگے ہینڈل میں لٹکا دی ایک جگہ سائیکل ڈھلوان پر آ کر تیز ہوئی اور ناہموار رستوں میں جھٹکے لگے تو لوہے کی بید سائیکل کے اگلے پہیے میں اٹک گئی اور میں قلابازی کھا کر کوئی چھ فٹ دور سڑک پر جا گرا۔ میرے ماتھے نے اس زور کی رگڑ کھائی کہ پیشانی کی کھال چھلتی چلی گئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو میں اپنی قیام گاہ (غسلخانہ) میں پڑا تھا اور چھوٹا جمعدار میرے پاس کھڑا پنکھا جھل رہا تھا۔ اتنے میں فاطمہ کا ایک عزیز اور میرا شاگرد محمد اسماعیل کہیں سے آ رہا تھا۔ اتفاق سے میرے پاس بھی آ گیا۔ مجھے اس وقت نیند آ گئی تھی اور میں مردے کی طرح خون میں لت پت سو رہا تھا۔ اسماعیل نے جب میری یہ حالت دیکھی تو گھر جا کر سب سے پہلے فاطمہ کو میری سرگذشت سنائی وہ اسی وقت

ترنگ سے تانگے پر سوار ہو ڈیورنڈ روڈ پر میرے پاس پہنچ گئی۔

میرے سر سے خون بہہ کر چہرے کو رنگتا ہوا سینہ تک آگیا تھا اور کرتا خون میں تر بتر تھا۔ میری یہ حالت دیکھ کر فاطمہ نے رونا شروع کر دیا۔ جب اُس کے آنسو میرے مُنہ پر ٹپکے تو مجھے اُس وقت قدرے ہوش آ رہا تھا۔ آنکھ کھُلی تو وُہ مجھے اس طرح پکار رہی تھی جیسے اُس کا گلا جواب دے چکا ہو اور الفاظ میں جھنجھناہٹ بھر گئی ہو۔ مَیں نے فاطمہ کو اپنے اُوپر جھُکا ہُوا دیکھا تو کوششوں کے باوصف میری پلکوں سے آنسوؤں کے اُبال کو نہ سہارا گیا۔ مَیں اپنے سینے میں ایک ایسی گھٹی ہُوئی آواز پا رہا تھا جو پاک اور روشن تھی، اُسی کے ساتھ اس میں تشکّر کا جذبہ بھی تھا اور احسان مندی بھی۔

میرے مزدور پڑوسیوں نے بہُت روکا مگر وہ مجھے وہاں سے اُٹھا کر اپنے گھر لے گئی اور ایک کمرے میں چارپائی بچھا کر میری تیمارداری شروع کر دی۔ جب عبدالرحمٰن کو اس حادثے کی خبر لگی تو وہ کارخانے سے کام چھوڑ کر گھر آگیا اور رات تک مجھے تسلیاں دیتا رہا۔ اس نے فاطمہ سے کہا "دیکھنا احسان صاحب کو کوئی تکلیف نہ ہونے پائے"

فاطمہ نے مضمحل آواز میں جواب دیا" اللہ مالک ہے آپ بے فکر رہیں"

فاطمہ جب تچمچے سے مجھے حریرہ پلاتی تو مَیں جذبۂ تشکر میں خود کو تحلیل ہوتا محسُوس کرتا۔ اُس کی آنکھوں اور چہرے میں ایک ایسی مُقدّس چیز تھی جو بہن بھائی کے رشتے سے گہری محبّت کے تعلّق سے شیریں اور عزیزداری کے علاقے سے بلند تھی۔ مَیں اظہارِ تشکّر کے لئے بے تاب رہتا۔ مگر شدّتِ جذبات میں زبان و لب کو بے سکت پاتا تھا مجھے اس موقع پر یقین ہُوا کہ ایثار کا جذبہ صفتِ خُداوندی ہی کی ایک شکل ہے جو اچھے انسانوں کا حصّہ ہے اور جذبۂ ممنونیّت اظہارِ عبودیت کا ایک پہلو اور شرافت کا ایک ورثہ

تقریباً بیس بائیس دن تک وہ دونوں میاں بیوی میری دیکھ بھال کرتے

رہے اور ڈاکٹر صدرالدین صاحب نے وقتاً فوقتاً خبر گیری سے گریز نہیں کیا۔ رفتہ رفتہ تکلیف سے افاقہ اور زخموں سے اندمال اُبھرتا چلا آیا اور پھر دہی راتوں کو میلاد اور دن کو مزدوری کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ زندگی تھی کہ پاؤں تل تل کر آہستہ رو ہر منظر سے آنکھیں کھولے گزر رہی تھی۔

فاطمہ کا گھر میرے لئے اپنے گھر جیسا ہو گیا تھا وہ ہر دُکھ تکلیف میں میری خدمت کرتی اور اُس کا شوہر برادرانہ حیثیت سے میرا ساتھی رہتا۔

فاطمہ کے دو بچے، ایک لڑکی اور ایک لڑکا پیدا ہوئے، اور اُس نے دونوں کے نام مجھ سے ہی تجویز کرائے مگر فاطمہ کو وقت نے اُن کی تعلیم و تربیت کی فرصت نہ دی اور موت نے بچوں کے سیانا ہونے سے پہلے فاطمہ سے زندگی کی نعمت چھین لی۔

فاطمہ جب بیمار ہوئی تو اس کے چہرے پر پہلے دن سے ہی مُردنی کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ میرا خیال تھا کہ گوراچٹا رنگ ذرا سی تکلیف میں پیلا پڑ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کا چہرہ بے رونق اور پیشانی دُودھیا ہوتی چلی جا رہی ہے۔

وہ ایک دن بخار کی شدت میں سیاہ بُند کی دار رُلائی اوڑھے نیم وا آنکھوں سے سامنے والی دیوار کی ایک تصویر کو دیکھ رہی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ستر دھوپ کا چاند آدھا چھپ گیا ہو۔ میں نے پُوچھا "فاطمہ! کیا دیکھ رہی ہو؟" فاطمہ بولی "سامنے والی تصویر میں خانۂ کعبہ کا غلاف دیکھ رہی ہوں، میری بار چپالی کچھ اس رُخ پر بچھی ہوئی ہے کہ یہ تصویر اصل معلوم ہوتی ہے اور مجھے ایسا نظر آ رہا ہے جیسے میں غلافِ کعبہ سے بہت نزدیک ہوں۔"

جب فاطمہ مرنے لگی تو اس نے ایک بار اپنی پوری آنکھیں کھول کر چاروں طرف دیکھا اُس کی آنکھوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ عقبیٰ کا ماحول دُنیا کے نقش و نگار کو دبا چکا ہے۔ وہ غیر مرئی اور بے رنگ تاروں میں جکڑی ہوئی لگتی تھی اور اس کی

رُوح کو کوئی اجنبی قوت آہستہ آہستہ دبوچ رہی تھی۔ اُس کی ہر سانس اُسے چارپائی کے چوکھٹے میں ڈبوئے دیتی تھی۔

عزیز و اقربا اسے برابر تسکین دے رہے تھے اور اس کے چہرے پر یاس و اُمید کی گنگا جمنی کیفیت مسلسل لڑکھڑا رہی تھی جیسے زندگی مَوت کے آئینے میں مُنہ دیکھ رہی ہو۔ فاطمہ کا اصرار تھا کہ میں اُس کے سرہانے سے نہ ہٹوں۔ وہ بار بار میرے ہاتھ میں ہاتھ دے دیتی تھی اور اس کی ڈوبتی ہوئی نبضیں مجھے بے قابو کئے ڈالتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس وقت میں زندگی کی کون سی شئے قربان کر دوں کہ فاطمہ بچ جائے۔

میں نے بہت چاہا کہ مرنے کے بعد اس کا چہرہ دیکھ لوں مگر آنسوؤں سے نگاہوں کے راستے رُکے ہوئے تھے اس سرچشمۂ ایثار کو میں دیکھ کر بھی سیر نہ ہو سکا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

آج فاطمہ دُنیا میں نہیں لیکن اس کے احسان سے میری رُوح میں جو کیفیت ہے اس کے اظہار کے لئے مجھے الفاظ نہیں ملتے۔ اس کا غم میرے دل میں ایک ایسے مرثیے کی طرح ہے جس نے ہنوز شعر کا جامہ قبول نہیں کیا اور الفاظ میسّر نہیں آئے۔

احاطہ بی بی پاکدامن

اگرچہ مزدوروں کے ساتھ اُس چھ آنے مہینہ والے غسل خانے میں مجھے کوئی تکلیف نہیں تھی، لیکن چند آ کی عقیدت مندانہ محبّت میسّر نہ تھی حالانکہ وہاں کا ہر مزدور میرا احترام کرتا تھا اور سب دل سے عزیز رکھتے تھے لیکن پھر بھی مجھے سکون نہ تھا چنانچہ میں نے اُس احاطے سے قریب ہی احاطہ بی بی پاکدامن میں ایک کمرہ لے لیا۔

اب مزدوری کے اعتبار سے میں نیم معمار تھا جس میں مزدوری بھی رَوا تھی۔ ایک کمرے میں ہم ایک ہی طرح کے تین جنونی رہتے تھے ایک عبدالرحمٰن عرف امان دُوسرے

صوفی عبدالغفور صاحب جو آج کل کراچی میں مقیم ہیں میرے اور اُن کے ذمّے پانی ڈھونا اور کھانا وغیرہ پکانا تھا اور صوفی عبدالغفور کے ذمّے صفائی کا سارا شعبہ۔ اُن کا یہ حال تھا کہ ہفتہ وار کوڑے کباڑ کا ایڈیشن نکالتے اِسی طرح جھاڑو وغیرہ کا کام بھی اُنہیں کو کرنا پڑتا یہاں تک کہ بیت الخلا کی بالٹی رات کو صوفی عبدالغفور صاحب ہی سر پر اُٹھا کر لے جاتے اور نہر میں صاف کر کے لاتے ہم صوفی صاحب سے ڈرتے تھے اس لئے کہ یہ کام ہم میں سے کسی کے بس کا نہیں تھا۔ وہ جب میلے کی بالٹی دھو مانجھ کر قوالی کا کوئی شعر گنگناتے اور بالٹی کی تلی پر تال لگاتے واپس آتے تو ہم لوگ انھیں تحسین کی نگاہوں سے دیکھتے۔ کئی مہینے اسی طرح گزر گئے۔ اور صوفی عبدالغفور صاحب حسب دستور تہذیبِ نفس کے منازل طے کرتے رہے۔ اُس وقت احاطۂ بی بی پاک دامن ایک طویل و عریض قبرستان تھا جب بارش ہوتی کئی ادھیڑ عمر کے گورکن نوکدار بانس لئے قبروں میں سوراخ کھولتے پھرا کرتے تاکہ بارش کا پانی قبروں کے نشیب میں مرجائے اور دوسری قبروں کے لئے گنجائش نکل آئے۔ کبھی کبھی وہ بیٹھی ہوئی قبروں میں سے جھانکتی ہوئی ریڑھ کی ہڈیاں، کھوپڑیوں کے کاسے اور ہاتھ پاؤں کی سفید پتلی جیسی ہڈیاں اکٹھی کر کے ایک کھدان میں بھی پھینکتے دکھائی دیتے اور یہ غالباً اس لئے تھا کہ لوگ کھوپڑیوں اور بڑی ہڈیوں کو خستہ و خوار پا کے قبرستان سے بیزار نہ ہو جائیں جو ان کا مدتوں سے کاروبار چلا آرہا ہے لیکن قبرستان کی وسعتوں کو قائم رکھنا صرف گورکنوں کا کام نہیں ہے۔ اگر عوام میں اسلامی ظرف و ضمیر ہے اور موت سامنے ہے تب تو قبرستان کی حدود باقی رہتی ہیں ورنہ آبادیاں راتوں رات قبرستان کی طرف بڑھ جاتی ہیں۔ چنانچہ ۱۸۶۷ء کے اشتمال اراضی کی فہرست میں بی بی پاکدامن کے احاطے کی زمین ایک میل درج ہے جس پر مکانات کی یلغار نے آبادی کا بیل لگا دیا ہے۔ اگر کچھ قبر پرست نہ ہوتے تو قبرستان کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔

ایک دن صوفی عبدالغفور صاحب کہیں سے چلے پھنکے آئے اور آتے ہی ڈاڑھی کو جھٹکار پھٹکار کر برسنے لگے۔

مزدور کو سرمایہ دار اس لئے بُرا بتاتا ہے کہ اس کے پاس دولت ہوتی ہے، اور مزدور ضرورت مند ہوتا ہے۔ خدا شاید ہماری طرف اس لئے متوجہ نہیں ہوتا کہ اُسے اپنے دولت مند بندوں کے کاروبار سنبھالنے سے فرصت نہیں ملتی۔ یہی سبب ہے کہ ہماری موت اور زندگی میں امتیاز نہیں ہے۔

بعض وقت جب خدا انسانوں کی زبان سے بولتا ہے اُس وقت مزدور مصروف ہوتے ہیں اُمرا دیے پروا اور شراب میں دُھت۔ مگر اُس کی ربوبیّت کے قربان جایئے۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ لاکھوں پیغمبر ظلم و تشدد کا سدِّباب کرنے آئے لیکن بیچارے سربلندی سے خدا کو کوئی مژدہ نہ سُنا سکے۔ تبلیغ کے لیے شمار ہنگامے تحریص و تحریف نے بھوان کر رکھ دئے اور آج تک کبھی اہل حق کے ماتھوں کا پسینہ خشک نہیں ہوا۔ شیطان کے ایجنٹ کس قدر چست و چالاک اور اپنے کام سے باخبر ہیں کہ ہر ظالم جابر، ڈاکو، قاتل اور دشمنِ انسان کی پشت پناہی میں اپنی موجودگی کا ثبوت دیتے چلے آرہے ہیں۔

مَیں نے کہا: صوفی جی! پھر شیطان ہی کی خلافت قبول کرلیں کام تو چلے گا۔

صوفی عبدالغفور: اور اِس زندگی کے بعد؟

اگر اس زندگی کے بعد کی زندگی کا تصوّر بھی ہے تو سر جُھکا کر چلے چلو، اللہ مالک ہے بولنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جواباً کہا۔

اس تقریر کا اماں پر یہ اثر ہُوا کہ ہائے ہائے کرتے کمہار کے چاک کی طرح تیزی سے رقص کرنے لگا اور اسی وقت بھگوے رنگ کر بن باس لے لیا اور زخمی کونج کی طرح ڈار سے کٹ کر آج تک نہیں باہوڑا۔[ء] بہت کم لوگ ہیں جو زندگی کے بے مقصد

ء باہوڑا۔ واپس آیا، لوٹا۔

دھاروں اور بے غیرتی کے چکراتے ہوئے بگولوں کو اس طرح اپنی بغلوں کی محرابوں سے گزار دیتے ہیں اور آتشیں پانی پی کر چلنے والے جمِ غفیر کے قدم پر قدم رکھ کر نہیں چلتے کیونکہ ان کے خاندانی شجرے اور اساسی مواد ان کی نظر میں ہوتا ہے، وقت کا پھنپھناتا ہوا سیلاب خود بخود انسانی رکاوٹوں کو ہٹانا اور جھاڑ جھنکاڑ صاف کرنا اپنا فرض خیال کرتا ہے۔

صوفی صاحب نے اُس دن سے اپنا درزی کا کام باقاعدہ سنبھال لیا۔ میں نے جب اُن سے دریافت کیا تو اِس فقرے کے علاوہ کچھ نہ کہا۔ کہ سب ڈھونگ ہے۔ سرمایہ دار پر کوئی جادو اثر نہیں کرتا وہ ظالم کا ظالم ہی رہتا ہے اور غریبوں کے خُون کا ایثار اسے اور بھی چٹورا بنا دیتا ہے۔ مجھ میں اگر سکت آسکی تو کبھی اِس طبقے کو نہیں بخشوں گا۔ میرا تو خیال ہے کہ مظلوموں اور مقتولوں سے کبھی باز پُرس ہوگی کہ تُم نے قاتلوں اور ظالموں کو ایسا موقع کیوں دیا کہ وُہ ظلم کریں اور قتل کا بیڑا اُٹھائیں، اس کا سدّباب کیوں نہیں کیا۔

مُجھے اُن کا نہر پر سے بالٹی بجاتے اور گنگناتے ہوئے آنا ہمیشہ یاد رہے گا۔ کیسا اچھّا زمانہ تھا۔ مُجھے ایسے مخلص لوگ بہت ہی کم ملے، اُن سے جو رُوحانی خوشی تھی پھر میسّر نہ آئی اور مَیں اُسی معاشی کشمکش میں غلطاں و پیچاں پھرنے لگا۔

ان دنوں کی مشق و مزاولت اور اوراد و مشاغل سے اتنا تو ہو گیا تھا کہ مَیں اپنے باطن پر نظر ڈالنے لگا تھا۔ جب میرا وجود مجھ سے الگ ہو جاتا اُس وقت کی تنہائی میں اَن دیکھے حالات اور اَن بیتے واقعات بھی سامنے آجاتے جو میرے لئے تماشے سے کم نہ تھے۔

مَیں راتوں کو اپنے وجود کی دلدل سے اپنی ذات کی طرف ہمکتا رہتا لیکن یہ مٹّی کا حصار اور کائنات کے مختلف رشتے میری راہ میں حائل ہو جاتے اُس وقت ایک قسم کی گھٹن کے ساتھ انسانی مجبوری کا احساس میرے دانت کھٹّے کر دیتا، مَیں تھوڑی دیر سستا کر اپنے یقین و عقائد کی لالٹین لے کر پھر چل کھڑا ہوتا لیکن اس وقت میری

لالٹین کی روشنی میری حدود سے آگے نہیں بڑھتی تھی جس سے میرے عمل کی رفتار سُست تر ہو جاتی جس میں میرے ذوقِ سفر اور جنونِ پرواز کے لئے کوئی تسکین کا سامان نہیں تھا۔

اِس ناکامی اور خامی کے باوجود میں جانوروں کی طرح زندگی بسر کرنے سے گھبراتا تھا اور خصوصاً اُن لوگوں سے دُور رہنا چاہتا تھا جن کی انسانیت میں حیوانیت اور درندگی کی دھاریاں اُبھری ہوئی ہوتی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے انھیں کی کثرت تھی۔

تلاشِ روزگار

لاہور میں میرا کوئی قابلِ اعتماد دوست تو تھا ہی نہیں، ہر کام خود ہی سوچ سمجھ کے کرتا اور ہر راستے پر خود ہی قدم اُٹھاتا اِسی لئے مجھ میں بڑی منہ زور اور ضدی قوّتِ اعتماد جنم لے رہی تھی۔ اُسی نے مجھے اس ناسازگار فضا کی سختیاں اوٹنے کی ہمّت دی۔ جہاں میں آدمیوں کے اِس جنگل میں خود کو اکیلا اور کمزور محسوس کرتا تھا وہیں دست و بازو کے سہارے کے علاوہ کسی دُنیاوی سہارے کو نظر میں نہ لاتا۔ مَیں ہمیشہ سعی و عمل کے بعد نتیجہ خُدا پر چھوڑ دیتا۔ میری نظر میں یہی ایک طریقہ ایسا تھا جو خود داری کو محفوظ اور غیرت کو نازک مزاج رکھ سکتا تھا اور یہی مجھ جیسے لوگوں کی دولت ہوتی ہے۔

ایک دُور اندیشی کے تحت میں کالجوں میں چپراسی اور بورڈنگوں میں بیرے کی ملازمت کے لئے بھی سرگرداں رہا۔ جیسے ایک پیاسا زبان پر کانٹے پاکر پانی کے بند نالوں کی طرف بھی دوڑنے لگتا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ کسی طرح مَیں کسی تعلیمی ادارے کے تحت باقاعدہ تعلیم حاصل کروں لیکن بدنصیبی کہاں ساتھ چھوڑ سکتی تھی؟ نہ کسی اسکول میں چپراسی ملی اور نہ بورڈنگ میں خدمتگاری۔ آخر مرتا کیا نہ کرتا، تھک ہار کر کبھی لکڑی پھاوڑے اور کبھی اینٹیں ڈھونے پر ہی اکتفا کیا حالانکہ یہ کام بہت سخت تھے۔

دُکان پر کام کاج کرنے کی ملازمتیں بھی ملتی رہیں، لیکن میں ہمیشہ اس قسم کی نوکری سے ڈرتا رہا جس میں آقاؤں کے احکام میرے عزائم میں حائل ہو جائیں اور میں مطالعہ کا بھی

نہ رہوں۔ جو میری غذا تھی اور جس کے لئے میں نے کانٹوں جیسا وطن، ماں باپ جیسی دولت اور شمع جیسی غیر معمولی نعمت کو تج رکھا تھا۔ اب میں کتابیں پڑھ کر کچھ ایسا محسوس کرتا تھا جیسے میری زندگی آہستہ آہستہ روشنی کی طرف آ رہی ہے اور دل و دماغ سے ایک مٹ میلا دھواں چھٹ رہا ہے۔ میں زندگی کے جھگڑوں اور زمانے کے ہنگاموں کی تیز رفتاری کے ساتھ قدم ملا کر دوڑنے کو اچھا خیال کرتا تھا۔ میرا عقیدہ ہو گیا تھا کہ ہر آنے والی قیامت انسانوں ہی کے لئے ہوتی ہے۔ مردوں کی طرح بے حسی زندگی کے اوصاف میں سے نہیں ہے کم ہمتی، سہولت پسندی اور کاہلی وقت سے بے وفائی نہیں تو طوفان سے جھجک ضرور ہے۔ اس لئے مردانہ داری یہی ہے کہ انسان نبرد آزمائی کے لئے کمر بستہ رہے اور حادثات کو للکارنے میں وقفہ نہ پڑنے دے۔

ایک آواز میں نے پہلے نماز کی پابندی والدین کے حکم کی تعمیل میں کی۔ اور جب دنیا نے شکنجے میں کسا تو صرف خدا کے لئے سجدے میں جھکا۔ پھر ایک وقت ایسا آ گیا کہ مزدوری کے دوران جب نماز کا وقت آتا تو مجھے کسی طرف سے آواز آنا شروع ہو جاتی جیسے کوئی میرا نام لے کر پکار رہا ہے۔ پہلے پہلے تو میں نے اپنے ساتھیوں کو متوجہ کیا کہ دیکھو مجھے یہ کون آواز دے رہا ہے لیکن جب انھوں نے یہ کہا کہ ہمیں تو سنائی نہیں دیتی تو میں خاموش ہو گیا۔ چونکہ یہ آوازیں مجھے نماز ہی کے وقت آتی تھیں۔ اس لئے پھر جب ایسی آواز آتی تو میں فوراً نماز کو چل دیتا۔ یہ بات صرف لاہور تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ لاہور سے باہر بھی جب میں کہیں جاتا تو یہ اجنبی آواز وہاں بھی میرے ساتھ ہوتی۔ اور آج بھی اگر میں عشا کی نماز پڑھے بغیر سونے لگوں تو غنودگی میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے تکیئے کے قریب سے آواز دی ہے۔ بعض اوقات تو میں جواب میں 'ہاں، یا جی،' کہہ اٹھتا ہوں اور آس پاس کے لوگ پوچھنے لگتے ہیں کہ کیا بات ہے۔ میں خاموش ہو جاتا ہوں کیونکہ جانتا ہوں کہ یہ بات کسی ماورائی

طاقت کی ہے جس سے میں ہنوز خود بھی متعارف نہیں ہوں اور اس سے زیادہ اُس طرف سے کوئی نزدیکی یا تحریک قربت نظر آتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ میری خود فریبی ہو لیکن یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آخر یہ معاملہ ہے کیا؟ اور جب تک خود اس کے کسی راز تک نہ پہنچوں یا ماخذ کا پتہ نہ لگے اُس وقت تک دوسروں کو کیا بتاؤں اور کیا سراغ لگ سکتا ہے؟ البتہ مطمئن ضرور ہوں کہ یہ کوئی نقصان رساں چیز نہیں ہے۔

میں دن میں بھی کبھی کبھی یہ آواز سنتا ہوں لیکن ایسی جیسے آندھی میں ہلکا ہلکا شور جس کی سمت کا تعین ممکن نہیں۔

جب میں اونچی اونچی عمارتوں میں مزدوری کرتا اور سنگین کوٹھیوں میں سفیدی پھیرنے جاتا تو ایک اجنبی تحیر میرا احاطہ کر لیتا اور میں سوچنے لگتا کہ اتنے کمروں میں ایک ہی خاندان کیوں رہتا ہے۔ آخر یہ خالی کمرے کس کام آتے ہیں۔ مالک مکان کا علم اور تجربہ اُسے اِس غلط راستے سے کیوں نہیں روکتا اور ان کی دولت مندی اِس بے مصرفی پر کیوں مصر ہے؟

کبھی جب میں کسی بنگلے کی چھت پر کھڑے ہو کر ارد گرد کے ماحول پر نظر ڈالتا تو پہروں یہ خیال دل کا دامن نہ چھوڑتا اور دھندلا سا یقین ہوتا کہ کبھی نہ کبھی ایسی حکومت ضرور ہوگی جو ان محلات کے کمروں اور کوٹھیوں کے کئی کئی مربعوں کے پلاٹوں میں عوام کے کوارٹر بنوائے گی۔ آخر اس ویران زمین کے غیر آباد قطعے کب تک بد دعائیں دیتے رہیں گے۔

اُردو پنجابی کا تقابلی احساس

لاہور سے میرے محلے کے جو لوگ کاندھلہ جاتے تھے وہ بعض اوقات شیخی میں ایسی ثقیل پنجابی بولنے لگتے جس سے دوسروں پر یہ اثر پڑے کہ یہ پنجابی زبان بھی جانتے ہیں جو مشکل اور اجنبی زبان ہے۔ لیکن لاہور میں آ کر میں نے اور ہی بات پائی۔ یہاں کی

زبان پر مجھے بالکل حیرت نہیں ہوئی اور نہ کوئی ایسی مشکل پیش آئی جس سے اُلجھن ہوتی کیونکہ یہاں کا چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا دکاندار اُردو بولتا تھا اور عموماً گاہکوں سے بھی اُردو ہی میں لین دین کا رواج روا رکھتا تھا۔

البتہ جب دُور دراز کے دیہات کا کوئی جانگلی[1] آجاتا اُس وقت پنجابی کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ حالانکہ لاہور کی پنجابی بھی اس کے لئے اُردو ہی کے برابر تھی۔ بلکہ اُردو کو وُہ لوگ لاہور کی پنجابی سے زیادہ سمجھتے تھے کیونکہ دیہات میں اسکولوں کے اُستاد، ڈاکخانوں کے کارکُن، پٹواری اور پولیس کے اکثر لوگ اُردو ہی سے کام چلاتے تھے۔

لاہور میں ہر مزدور خواہ وُہ پنجابی تھا یا راجپوتانہ کا، سندھ کا تھا یا پشاور کا، اُردو ہی میں بات چیت کرتا تھا۔ کیونکہ یہی ایک ایسی رابطے کی زبان تھی جسے مشترکہ طور پر تھوڑا بہت سب ہی جانتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وُہ معیاری اُردو نہیں تھی مگر چھوٹی دکانوں پر حساب کتاب اور خط و کتابت سب اسی اُردو میں ہوتی تھی کبھی جب دو پنجابی آپس میں پنجابی بولتے تو بعض الفاظ نامانوس سے معلوم ہوتے میں ان کا مفہوم متعلقات کے آثار و قرائن اور محلِ وقوع کے تقاضے سے نکال لیتا بعد میں ایک ایک دو دو لفظ سیکھ کر مجھے اس پنجابی پر بھی عبور ہوگیا جو روزمرّہ یہاں رائج تھی اور اس میں کوئی ایسی پیچیدگی بھی دکھائی نہیں دی کیونکہ پنجابی میں اردو کے ہزاروں الفاظ پائے جاتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ بعض بدلی ہوئی صورت میں ہیں۔

اسی طرح پنجابی کے ہزاروں مصادر اُردو میں آئے ہیں اور ان سے صاف ظاہر ہے کہ اُردو زبان کی ریڑھ کی ہڈی پنجابی ہے جو سینکڑوں برس میں اس صورت میں ڈھلی ہے۔

اب تو الحمد اللہ میں پنجابی لٹریچر اور شعر و شاعری کو یہاں کے عام پنجابی سے زیادہ سمجھتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ ایک فقرہ بھی بول نہیں سکتا۔ جس کا سبب یہ ہے

[1] پنجاب کے قدیم باشندے۔

کہ دن رات کا واسطہ اُردو دان طبقے سے رہتا ہے۔ یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے
کہ پنجابی زبان کی ترقی یافتہ صورت کا نام اُردو زبان ہے۔ رہا یہ سوال کہ پنجابی زبان
کا ماخذ کیا ہے؟ یہ اہلِ تحقیق کا کام ہے۔ اگرچہ موجودہ دَورِ تحقیق و تدقیق سے جی چُراتا
ہے لیکن اس کے باوجود مَیں مایوس نہیں۔ مَیں کئی ایسے حضرات[۱] کو جانتا ہوں جو اس
کام کے اہل ہیں۔ بفرضِ محال اگر کسی نے یہ کام نہ کیا اور میری زندگی نے وفا کی تو مَیں خود
اس پہ قلم اٹھاؤں گا (انشاء اللہ)۔ میرے کتب خانہ میں اس نوعیت کا لٹریچر کم نہیں
ہے۔ سرِدست اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ پنجابی کے تنے سے پھوٹی ہوئی شاخوں اور پھولوں
پھلوں کا نام اُردو رکھ لیا گیا ہے۔ پنجابی زبان کی تحقیق سے اُردو کے ماخذوں کا پتہ چلتا
ہے اور یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ اُردو کی مخالفت میں پنجابی زبان پر اصرار کرنا جہاں
اُردو کی ترقی میں تاخیر کا باعث ہے وہیں پنجابی زبان اور معاشرے کو دو سو برس پیچھے لے
جانا ہے جو نہ اس دَور کا تقاضا ہے اور نہ ارتقا کی ہمقدمی۔ ہمیں تو اب سائنس کی ترقی
کا ساتھ دینا ہے وہ جس طرح بھی ممکن ہو۔ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ مَیں دہلی اور لکھنؤ کی زبان
پر اصرار کر رہا ہوں ہرگز نہیں! مَیں اُس زبانِ اُردو کی ترویج کا قائل ہوں جو ہمارے آج کے
معاشرے اور علوم کی متحمل ہو سکے کہیں اس کی وسعت اصطلاحات سے عاجز نہ ہو بلکہ اصطلاح
سازی ہی اُس کی خصوصیت ہو۔ اک ذرا سی توجہ درکار ہے یہ کام کوئی مشکل بھی نہیں۔

مہرباں کیسے کیسے!

جب مَیں مزنگ[۲] آنے جانے لگا تو رفتہ رفتہ لوگ مجھے
جاننے پہچاننے لگے۔ ان میں جہاں میرے اور کرم فرما
تھے وہیں ڈاکٹر صدرالدین بھی تھے جنہوں نے میرے زخمی ہونے پر بڑی شفقت اور
توجہ سے میری دیکھ بھال کی تھی۔ اُن کی نیلی آنکھیں، گورے چہرے پہ سنہری حسین ڈاڑھی
کے ساتھ بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں اور اُس پہ اُن کی آہستہ کلامی اور بھی جاذبِ توجہ
ہو جاتی تھی۔

۱۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر شوکت سبزواری، سید قدرت نقوی، عین الحق فریدکوٹی، علی عباس جلالپوری، خلیل احمد
نثار احمد فاروقی، خلیق انجم، معین الرحمان، ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر گیان چند اور ڈاکٹر گوپی چند۔
۲۔ مزنگ لاہور کے جنوب کی طرف ایک بستی جو اب لاہور کا ایک حصہ ہے۔

وہ ملتے ہی ایسے معلوم ہوتے جیسے مدتوں کے جاننے پہچاننے والے ایک دوسرے سے بے تکلف ہوتے ہیں۔ یہی سبب تھا کہ میں صدرالدین صاحب سے قریب ہوتا چلا گیا۔ اس قُرب میں میلاد کی ان پاکیزہ مجالس کو سب سے زیادہ دخل تھا جن میں گاہے گاہے ہم دونوں شریک ہوتے تھے۔

اسی اثناء میں میری ملاقات ایک نوجوان محمد شفیع نامی سے ہوئی۔ اس وقت اس کی عمر قریب قریب سولہ سترہ سال کی ہوگی۔ آنکھیں کنجی، گورا رنگ، متناسب الاعضاء مگر پیشانی اُبھری ہوئی اور کشادہ۔ ایک دن وہ مجھے اپنے گھر لے گیا اس کی ماں دہلی کی رہنے والی اچھی خاصی لکھی پڑھی عورت تھی مگر نہ جانے کیوں اس وقت وہ ایک شخص کے نکاح میں تھی جو کوئین میری کالج میں ملازم تھا اور یہ خود بھی کسی ایسے ہی کام پر مامور تھی لیکن اس کی زبان اور اطوار سے معلوم ہوتا تھا کہ گذشتہ عمر میں اس نے کبھی اس قسم کا کام نہیں کیا۔

اب اس کی عمر کا سایہ دراز ہو چلا تھا اور بالوں میں سفیدی تاک جھانک شروع ہو گئی تھی اس کے مزاج میں چڑچڑاپن شاید اس لئے آ گیا تھا کہ وہ اپنی موجودہ زندگی اور گردوپیش کے ماحول سے بیزار تھی وہ سارے دن یا تو اپنے شوہر پر برستی یا پھر اپنے لڑکے محمد شفیع کے سر رہتی۔

اس کی شربتی آنکھوں کے حلقے گہرے ہو چکے تھے اور جسم کی کھنچی ہوئی کھال میں چکنا پن آ رہا تھا۔ شفیع کو اس نے خود پڑھا کر آٹھویں کے قابل کر دیا تھا مگر نہ جانے وہ کیوں آگے نہیں چل سکا اس بیٹے کی ناکامی کے احساس نے اُسے اور بھی مرکھنی کر دی تھی اب شاید آسودگی کے لئے اثاثہ اکٹھا کرنے کی اس میں بے حد خواہش آ گئی تھی۔ وہ بعض اوقات تو محمد شفیع کی ضروریات کو بھی نظر انداز کر دیتی تھی محمد شفیع کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ موجودہ شخص اس کا سوتیلا والد تھا اس لئے شفیع کو باپ کی شفقت میسر نہیں آتی تھی۔ ماں کی رات دن کی ڈانٹ ڈپٹ سے تنگ آ کر اس نے اپنی موسمی وجاہت کے بل پر

ریلوے میں کہیں معمولی قسم کی کوئی نوکری کر لی تھی۔ وہ تھا تو گاؤدی مگر اُردو اور انگریزی میں اسے قدرے شُدبُد تھی۔ والدہ کے ماحول کے باعث اس میں کھانے پہننے کا سلیقہ بھی تھا اور یہی دکھاوے کا شعور اُسے مجھ تک لے آیا تھا۔

آہستہ آہستہ اُس سے تعلقات گھر سے ہوتے چلے گئے اور مجھے اس سے ہمدردی اور اس کے حالات و واقعات سے ایک خاص قسم کا لگاؤ سا ہو گیا۔ اِس دَوران میں ڈاکٹر صدرالدین صاحب کو ایک دوا ساز کی ضرورت پڑی اور مَیں نے محمد شفیع کو صدرالدین صاحب کے سپرد کر دیا۔ صدرالدین صاحب نے چھ ماہ تو اسے کوئی تنخواہ نہ دی اُس کے بعد وہ تنخواہ دار ہو گیا اور اچھّی خاصی گزر ہونے لگی۔

ڈاکٹر صدرالدین صاحب کے یہاں اُس وقت کوئی اولاد نہ تھی اور اس نام و نمود کی حسرت نے اُنھیں شعر و شاعری کا دلدادہ اور صوفیاء کا پرستار بنا دیا تھا ان کی آرزو تھی کہ تاریخی طور پر تصنیف و تالیف کی صورت میں اپنی یادگار چھوڑیں اور ایک پیر طریقت کی حیثیّت سے عوام میں زندگی بسر کریں یہی وجہ تھی کہ مقامی صوفیوں اور تیسرے درجہ کے خستہ حال شاعروں سے ان کا میل جول بڑھ رہا تھا۔ جن میں میری شمولیّت بھی تھی،

مزے کی بات یہ تھی کہ جو اُن سے ملتا تھا وہ اس سے اپنے ماحول کی گفتگو کرتے تھے سننے والا خواہ کوئی بھی شعبۂ حیات رکھتا ہو۔ کبھی کبھی وُہ اور اُن کی اہلیہ محمد شفیع سے ایسی محبّت اور شفقت سے پیش آتے کہ جب وہ مجھے بتاتا تو معاً یہ خیال گزرتا کہ شاید صدرالدین صاحب محمد شفیع کو لے پالک کے طور پر اپنا لیں گے۔ مگر یہ میری خوش خیالی تھی۔ جب کسی کو اولاد کا سکون میسّر نہیں ہوتا تو اولاد کے حصّے کی مامتا دولت سے محبّت کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور پھر انسان "چمڑی جائے دمڑی نہ جائے" والے مقولے کے مطابق بسر کرنے لگتا ہے۔

چنانچہ بہت دِن نہیں لگے کہ وُہ بھی کھُل گئے اور اپنی آرزوؤں کو مجھ سے پردہ

کرانا چھوڑ دیا۔ وہ حافظ محمد حسین صاحب گھیرا شریف والوں سے بیعت ہیں۔ حافظ صاحب نے ان کے استغراق و احترام کی بنا پر اُنھیں خلافت دے کر صاحبِ ارشاد کر دیا تھا۔ اب ڈاکٹر صاحب باقاعدہ پیری مُریدی کرنے لگے تھے ان کے پیشِ نظر شاید دولت تو نہ رہی تھی لیکن نام و نمود کی حسرت اور خصوصاً خواہشِ اولاد ضرور تھی وہ پہروں مجھ سے تصوّف کے مختلف مسائل پر گفتگو کیا کرتے اور مَیں ان کی دلداری کے لئے ہاں میں ہاں ملاتا رہتا۔ ایک دن بڑی آسانی سے اُنھوں نے انکار کے باوجود مجھے بھی صاحبِ ارشاد کر دیا اور فرمایا بیعت لے لیا کرو۔ مَیں خاموش رہا کہ دیکھوں شاید شیخ کی طرف سے کچھ تصرّف کا سلسلہ شروع ہو لیکن ایسا نہ ہُوا اور مَیں جس درویش[1] سے لڑکپن میں بیعت تھا انھیں کا سلسلہ جاری رہا، اور اب تک ہے۔

صوفی صدرالدین جب محفلِ سماع میں بیٹھتے تو ان کے مُریدانِ باصفا ان کے احترام میں دوزانو ہو جاتے اور قوّالی شروع ہوتے ہی جہاں پیر صاحب کی زبان سے واہ نکلتی تو دو کچے صوفیوں کی جماعت یوں جھومتی اور جھومتی جیسے آندھی درختوں سے گھس کر گزر رہی ہو۔

چونکہ صوفیاء اور بزرگانِ طریقت میں عموماً صاحبِ دیوان گزرے ہیں اس لئے صوفی صدرالدین صاحب کو دیوان مرتّب کرنے کی لگی اور روز ایک آدھ غزل کا مسوّدہ میرے سامنے لا ڈالتے کہ ذرا اس کی نوک پلک دیکھ لو۔ اپنی استعداد کے مُطابق مجھ سے اُس وقت جو ہو سکتا انکار نہ کرتا لیکن ان کے عزائم پر مجھے حیرت ضرور تھی۔ پھر سوچتا کہ شاید مشق بڑھ جائے اور ان کے اندر سے مدفون شاعر اُبھر آئے۔

جب وہ جرائد میں میری نظمیں چھپی ہوئی دیکھتے تو بڑے شوق سے پڑھتے اور سراہتے رفتہ رفتہ اُنھوں نے بھی نظموں کی طرف باگ موڑ دی لیکن یہ میدان ان کے لئے ایسا نہیں تھا کہ آسانی سے کامیابی ہو جاتی۔ چنانچہ مجھ سے فیصلہ ہُوا کہ مزدوری پر نہ جاؤں تو بیس روپے ماہانہ کے حساب سے صبح سے شام تک میری غزلوں اور نظموں کی اصلاح کرنے

---

[1] قصبہ گھیرہ ضلع مظفر نگر کے حافظ محمد حسین صاحبؒ۔

چلے جائیں، فکر نہ کریں۔

ڈاکٹر صدرالدین صاحب کے کہنے پر میں نظموں کی اصلاح تو کرتا لیکن اُن میں میری محنت زیادہ حصہ دار ہوتی اور میں بے پروائی گوارہ نہ دیتا۔ بعض اوقات مجھے خیال آتا کہ کہیں مجھے اوپری دل سے شعرگوئی کی عادت نہ پڑ جائے۔ چنانچہ اسی خیال کے تحت میں شعر میں نوک پلک کی درستی کا خیال بھی رکھنے لگا، اس طرح میں نے غزلوں کے علاوہ بڑی محنت اور کاوش سے تصویری اور نیچرل نظمیں بھی درست کیں۔ کبھی کبھی میں خود بھی نظم کے خدوخال میں اس قدر محو ہو جاتا کہ اردگرد کے ماحول کی بالکل خبر نہ رہتی اور یہ کاوش شام کے وقت ڈاکٹر صاحب کے یہاں جا کر پھینک آتا۔

اس سخن آرائی کے لئے ڈاکٹر صاحب دوپہر کو مجھے ایک سبز رنگ کی دوا دُودھ یا لسّی میں ملا کر روز پلا دیتے اور خود بھی پیتے اس سے میں اپنے جسم میں تندرستی کی ایک لہر سی محسوس کرتا اور بعض اوقات مجھے اپنے رگ و پے کسے ہوئے معلوم ہونے لگتے۔ میں نے کئی بار ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ اس سرجیون کا نام و عمل تو بتائیں مگر ڈاکٹر صاحب اڑان گھائی کر کے رہ گئے جیسے عموماً کیمیا ساز پہلو تہی کیا کرتے ہیں۔ میں یہ سمجھ کے چُپ ہو جاتا کہ شاید ڈاکٹر صاحب اس نسخے کو خاص خیال کرتے ہیں اور روایتی طور پر اُنھیں بتانے سے گریز ہے یہ تو اس ملک کے صاحب کمال لوگوں کا رویہ چلا آتا ہے کہ عناصر کے تاثرات اور نسخے سینے میں لے کر مرتے ہیں جو ایک طرح کی بددیانتی ہے انسانیت کے ساتھ۔

ایک دن وہ دوا ختم ہو گئی تو دُوسرے ہی دن لیبارٹری سے تیار کرالی گئی۔ کیونکہ صدرالدین صاحب دواؤں کی ایک بڑی فرم میں با اعتبار ملازم کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ اب کی بار وہ دوا مقدار میں بھی اچھی خاصی تھی اور رنگ بھی ذرا سیاہی مائل سبز ہو گیا تھا۔

دوپہر کو جب سخن آرائی کا وقت آیا تو کچھ دیر پہلے اُنھوں نے چند قطرے تو مجھے

تھے اور مجھ سے غالباً دوگنی دوا خود دودھ میں ملا کر پی گئے۔ میں شعر گوئی میں مصروف ہو گیا اور قریب قریب ایک گھنٹہ ماحول سے بالکل بے خبر رہا۔ لیکن میں ایسا محسوس کر رہا تھا، جیسے مجھے کوئی چاروں طرف سے ہلکے ہلکے دباؤ دے رہا ہے۔ اتفاقاً میری نظر ڈاکٹر صاحب کی طرف اُٹھی۔ تو وہ خاموش شعلے کی طرح سُرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا، کیا بات ہے؟ اُنھوں نے گونگوں کی طرح ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ مجھ میں گویائی نہیں۔ اُس کے ساتھ ہی وُہ اُٹھ کر غسل خانے کی طرف چلے تو گر پڑے۔ میں نے اُن کی بیگم کو آواز دی اور انھیں تاکید کی کہ انھیں سنبھالو۔ انھوں نے کچھ پیا ہے اور جو خود پیا ہے وہ مجھے بھی دیا ہے۔ میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔ مجھ پر ابھی ایسا اثر نہیں کہ گھر نہ پہنچ سکوں۔ بیگم نے فوراً ڈاکٹر کو بلوایا ڈاکٹر نے ایک انجکشن دے کر کسی دوا کا کوئی اور ڈوز دیا اور پھر اُن کا بیان قلمبند کیا۔ جس میں ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ میں نے اسپرد زیادہ مقدار میں کھائی ہے اور تھوڑی سی احسان صاحب کو بھی دی ہے۔

میں ابھی تھوڑی ہی دُور گیا تھا کہ میرے پاؤں جواب دینے لگے اور نگاہوں کے سامنے مچھلیوں کے باریک جال جیسی کوئی سبز رنگ کے تاروں والی کیفیت تنتی نظر آنے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہی اثر مجھ پر شروع ہو چلا ہے چنانچہ میں راستے میں ایک جگہ اس خیال سے بیٹھ گیا کہ کوئی جان پہچان کا آدمی آئے تو اس کے سہارے گھر تک پہنچوں۔ اب میں جسم میں ہلکا ہلکا تشنج سا محسوس کرنے لگا تھا جو بہت ہی ہلکی رفتار سے بڑھتا جا رہا تھا۔

اتنے میں ایک شخص محمد نذیر خانساماں میرے پاس سے سلام کر کے گزرا۔ اس نے کبھی مجھے کسی محفل میلاد میں دیکھا تھا۔ میں نے اُسے آواز دی اور کہا کہ میری طبیعت اچھی نہیں ہے، مجھے ذرا گھر پہنچا دو اس نے مجھے سائیکل کے کیرئیر پہ بٹھا لیا اور میری قیامگاہ کی بجائے اپنی قیام گاہ پہلے گیا جہاں وہ رات دن کا ملازم تھا۔ غریب لوگ ہمیشہ مخلص ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہاں اُس نے مجھے چارپائی دے دی اور خاطر و مدارات میں مصروف

ہو گیا۔ اتنے میں اس کا ایک دوست آ دھمکا جو اسے فلم دکھانے پر مصر تھا۔ نذیر نے جواب دیا کہ میرے یہاں ایک مہمان ہے اور اس کی طبیعت خراب ہے، میں آج فلم دیکھنے کیسے جا سکتا ہوں؟ میں نے کہا آپ شوق سے فلم دیکھنے جائیں میں آپ کے آنے تک یہیں رہوں گا بے فکر رہیں میری طبیعت ایسی خراب نہیں کہ آپ کی تفریح میں حائل ہو جاؤں۔ نذیر نے بہت پاؤں پٹکے لیکن میں نے سر ہو کر اُسے بھیج ہی دیا۔

میری طبیعت خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی اور دل اس پر تُلا ہوا تھا کہ جو کچھ کھایا پیا ہے وہ سب نکال ڈالا جائے تو طبیعت درست ہو جائے گی۔ اُسی وقت میں نے محسوس کیا کہ سینے میں سانس کے لئے جگہ کم ہو رہی ہے۔ میں ہڑبڑا کے اُٹھا اور باورچی خانہ کی طرف گیا سامنے ہی نمک کا ڈبا رکھا تھا دل نے کہا دوا تو سامنے ہے یعنی نمک کا ڈبا اُٹھا کے نل پر آ بیٹھا اور ڈبا پانی سے بھر کے غٹاغٹ کر پی گیا۔ اس کے بعد حلق میں انگلی ڈال کر قے کر دی۔ قے میں سبز رنگ کا لعاب نکلا اور میں نے محسوس کیا کہ جسم میں جو عمل ہو رہا تھا وہ اب نہیں۔ میں نے اس ڈبے میں پھر پانی بھرا اور آنکھیں بند کر کے پھر پی لیا۔ اسی طرح تین چار بار قے کی اب وہ سبز رنگ سفیدی میں تبدیل ہو گیا تھا اور میں جیسا پانی پیتا تھا ویسا ہی نکلتا تھا میں نے محسوس کیا کہ زمین سے آسمان تک کی فضا صاف ہے تو میں چادر اوڑھ کر لیٹ گیا اور فوراً نیند آ گئی۔

جب نذیر سینما دیکھ کر واپس آیا تو میں سو رہا تھا۔ اس نے فوراً چائے پکائی۔ مجھے جگا کر دو پیالیاں پلائیں اور طبیعت پوچھی۔ میں نے کہا میں اب تندرست ہوں اور ساتھ ہی سارا معاملہ کہہ سنایا۔ وہ حیرت سے سنتا رہا بالکل اسی طرح جیسے کوئی جِن بھوت کا قصہ سن رہا ہو اور پھر میری اطلاع کے بغیر ایک ڈاکٹر کو بلا لایا۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا میں بالکل تندرست ہوں یہ جو آپ کو لائے ہیں اُنھیں مغالطہ ہوا ہے مجھے

اَب علاج کی بالکل ضرورت نہیں لیکن نذیر کہاں ماننے والا تھا، اس نے ڈاکٹر سے کہا آپ احتیاطاً دیکھ لیں، چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے کانوں کی عینک کا پھندا میرے سینے پر لگا دیا اور وہ اچھی خاصی دیر تک جگہ بدل بدل کر غور کرتے رہے۔ آخر خوب دیکھ بھال کر فرمایا کوئی خاص بات نہیں اور اپنے بیگ سے ایک مکسچر اور دو پڑیاں نکال کر دے دیں اور قیمت وصول کر کے تشریف لے گئے۔ مجھے دوا کی ضرورت نہ تھی مگر نذیر کے اصرار پر کھانا پڑی۔ اور نذیر میرا دوست ہو گیا۔ وہ جب بھی ملتا ہے اُسی خلوص سے پیش آتا ہے۔

علی الصبح جب میں بیدار ہوا تو سب سے پہلا خیال یہی آیا کہ اگر ڈاکٹر صدرالدین اللہ کو پیارے ہو گئے ہوں گے تو اب لوگ میری ہی لاش کو ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے چنانچہ میں نے نذیر سے کہا کہ میاں سب سے پہلے ڈاکٹر صدرالدین صاحب کے مکان پر جاؤ اور اگر وہاں رونا پیٹنا ہو تو چپکے سے چلے آؤ اور اگر خاموشی ہو تو ڈاکٹر صاحب کو بتا دو کہ میں خیریت سے ہوں انھیں میری بڑی فکر ہوگی۔

نذیر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر گیا تو کوئی شور و غل نہ تھا نذیر نے آواز دی، اور ڈاکٹر صاحب نے اندر بلوا لیا۔ اس نے سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب کی طبیعت پوچھی اور وہ الحمدللہ میں جواب دے کر فوراً کہنے لگے ارے بھائی! اگر تم احسان دانش کا مکان جانتے ہو تو ذرا ان کی خیر خبر لاؤ، ایسا نہ ہو کہ غریب کہیں سڑک کے اِدھر اُدھر مرا پڑا ہو اور ڈر کے مارے کسی نے پولیس کو بھی اطلاع نہ دی ہو۔ نذیر نے مُسکرا کر کہا جناب انھوں نے ہی تو آپ کی خیریت دریافت کرنے کو مجھے بھیجا ہے اور وہ شام سے میرے یہاں ہیں انھوں نے مجھے بھی اصل واقعہ نہیں بتایا اور اپنا علاج خود کر لیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا، انھیں جلدی لاؤ۔ نذیر آیا اور مجھے تانگے میں بٹھا کر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر لے گیا اور ہم دونوں تجدیدِ حیات کی تقریب سے بغل گیر ہوئے اور فوراً چائے منگوائی گئی۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا میاں اب تو بتا دو وہ دوا کیا بلا تھی؟ اُس کا عمل تو معلوم ہو ہی گیا اب نام بھی تو

کھول دو۔ انھوں نے بڑی بے پروائی سے کہا کچھ نہیں وہ کچلے کا ست ہے۔ میں نے پوچھا "کیا وہی کچلا جس سے کتے مارے جاتے ہیں؟" فرمایا ہاں وہی! وہ زہر تو ضرور ہے مگر اعصاب کیلئے اس سے بہتر دوا کوئی نہیں ہے اگل ہیں ہم زیادہ پی گئے، ورنہ اس کا استعمال عام ہے۔

میں جب نظم درست کرتا ڈاکٹر صدرالدین صاحب خاموش دم سادھے بیٹھے رہتے اور جب ختم کر چکتا اور انھیں سناتا تو وہ اس پر رائے زنی کرتے، بعض وقت تو ان کی رائے درست ہوتی اور اکثر اوقات اعتراض برائے اعتراض۔ شاید اس لئے کہ جہاں تک ہو شعر میں حسن پیدا ہو جائے۔ انھیں یہ مطلق معلوم نہیں تھا کہ شعر تو آئینے سے بھی نازک شے ہے۔ جیسے آئینہ بھاپ سے میلا ہوتا ہے شعر مشاطگی اور اصلاح اصلاح میں مسخ ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر کبھی اسے بلندی نصیب نہیں ہوتی۔ ان کی اس قسم کی تنقیص سے بعض دفعہ تو مجھے ہنسی آجاتی اور میں بھی ایک تغلیط جڑ دیا کرتا۔ ہم دونوں میں یہ تلخی ترشی تھوڑی دیر کے لئے کھا کھی پیدا کر دیتی اور پھر ڈاکٹر صاحب کی بیگم اندر سے چائے بھجوا دیتی۔ وہ ایک نیک دل اور عبادت گزار عورت تھی وہ غریبوں کے ساتھ وقتاً فوقتاً روپے پیسے کا سلوک بھی روا رکھتی اور کھلانے پلانے میں بھی بخل نہ کرتی

اُسے غالباً اس دُنیا کی بے ثباتی نے اس قدر مغموم کر دیا تھا کہ اب اولاد کی آرزو بھی نہیں رہی تھی۔ وہ خدا سے عقبیٰ کے لئے دعا کیا کرتی اور اپنے شوہر کی اطاعت کو اپنا فرض خیال کرتی۔ جب پیری مریدی میں ڈاکٹر صاحب کے پاس عورتوں کی آمد و رفت شروع ہوئی تو اُن کی خواہشِ اولاد جو برسوں سے خاموشی کے لبادوں میں گھات لگا رہی تھی ہر اچھی صورت کو دیکھ کہ گھڑ گھڑانے لگی اور آخر کار صوفی صدرالدین صاحب نے ایک معتقد عورت کو اپنے نکاح میں لے لیا اور اُس سے اُن کے ماشاء اللہ کئی بچے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو جب اولاد کی طرف سے سکون ہوا تو تصوف کی وہ ہماہمی نہ رہی۔ اُن کی جوانی اور طلب اولاد کا آسیب فکرِ دُنیا نے اُتار دیا۔ تمام اوراد و اشغال

ماضی مرحوم کی چیز ہو کر رہ گئے۔ بلکہ وہ اُن مسائل سے دُور نظر آنے لگے۔ ایک دن جو اُن سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے ایک بچّے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا میاں صحیح تصوّف تو یہ ہے۔ ہم جس حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ اِنھیں معصوم صورتوں میں ملتی ہے۔ اب ڈاکٹر صاحب ہیں اور ان کے یہ تصوّرات! وہ ٹمپل روڈ مزنگ لاہور میں ایک ڈرگ ہاؤس کے مالک ہیں اور اپنی دُنیا میں مگن ہیں۔

مگر ڈاکٹر صدرالدین کی بڑی بیگم عبادت کی ہو کے رہ گئیں۔ اب اسے اُولاد بھی عقبیٰ کی منزل میں سنگِ راہ معلوم ہوتی ہے اور وہ دُنیا کی ہر خوشی کو تج کر ایک درویشانہ زندگی میں محو ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کا تصوّف اُن کی بیگم کی طرف منتقل ہو گیا اور جس کا حق تھا اُسے پہنچ گیا۔

شیرازگی

شمعی کا ہر ہفتے ہمدردیوں سے لبریز خط آجاتا جس سے میں پہروں اپنے ماضی کے دُھندلکوں میں ڈوبا رہتا۔ اُس کی دلی آرزو تھی کہ "ہمیشہ کے لئے میری ہو کر رہے" لیکن میرے عقیدوں کے کفن میں ملفوف اور روایات کے کافور میں لپٹے ہوئے خیالات مجھے اُس کی تائید سے قاصر رکھتے اور میرے پاس نہ ایسے الفاظ تھے نہ خیالات جو اس کے سینے میں تسکین کا اُجالا کر دیتے مگر مجھے ایسی اذیّت ہوتی تھی کہ سانس کی نالی پھوڑے کی طرح دُکھنے لگتی۔

میرے سامنے ایک طرف تو شمعی کی پُر خلوص محبت تھی اور دُوسری طرف قدیم معاشرہ کے والدین کا خیال دیوانہ بنائے رہتا اور مَیں کوئی ایسا فیصلہ نہ کر سکتا جس سے دونوں طرف اطمینان ہو سکے۔ کئی بار اس معاملہ کو مَیں نے صوفی ڈاکٹر صدرالدین اور ان کے خسر نبو شاہ[1] صاحب کے سامنے رکھا۔ لیکن میری بدنصیبی سے وہ بھی کوئی معقول فیصلہ نہ کر سکے اور وقتاً فوقتاً جب مجھے کسی وجہ سے مغموم دیکھتے تو مزاحاً کہتے احسان صاحب کیا شمعی یاد آ رہی ہے؟ اور مَیں اُن کے مُنہ سے یہ لفظ سُن کر اور بھی بجھ جاتا کیونکہ اُن

---

[1] نبو شاہ غالباً لاہور کارپوریشن میں محکمۂ صفائی سے منسلک تھے۔

کی نظر میں نہ شمعی کا سراپا تھا اور نہ حسنِ سیرت ۔ ادھر محمد شفیع دواسازی میں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا اور میرا خیال تھا کہ کسی اُونچے مقام پر جا کر دم لے گا لیکن پھر خیال آتا کہ کہیں افلاس اِس کا راستہ کٹھن اور منزل دشوار نہ کر دے ۔ ایک دن اچانک شمعی کا خط آیا جس میں اُس نے اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا اور لکھا تھا ۔

" اس میں شک نہیں کہ آپ کی معاشی مجبوریاں آپ کو مجھ سے چھین رہی ہیں ۔ لیکن یہ سب آپ کی احتیاط اور خیالات کے کرشمے ہیں ورنہ اگر یکسوئی سے سوچیں تو میں آپ کی خادمہ ہوں اور میرے پاس جو اثاثہ ہے وہ سب آپ کا ہے ، میں ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ آپ اپنی بیگم کو کسی طرح بھی ناراض کریں ، میں تو خود اُس کے حقوق کی محافظ ہوں گی میں تو آپ سے قریب رہنا چاہتی ہوں وہ کوئی صورت بھی ہو ۔ اس میں شک نہیں کہ جب جسموں کی تمام ضروریات جسموں سے پُوری نہیں ہوتیں تو فاصلے پیدا ہو جاتے ہیں لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ روحیں جب ایک دوسرے سے نزدیک ہو جاتی ہیں تو دُوری اختیار کی بات نہیں رہتی ۔ میں تو آپ کے بغیر جاں کنی سی محسوس کر رہی ہوں نہ جانے آپ کا کیا حال ہے ۔ "

مجھے دفعتہً خیال آیا کہ محمد شفیع کی شادی اگر شمعی سے کر دی جائے تو دونوں فریق رُو بہ سکون ہو جائیں گے ، میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا اور یہ دو زندگیاں کے یکساں پریت سل کر ایک جان ہو جائیں گے ۔

میں نے محمد شفیع سے اپنے خیال کا اظہار کیا اور وہ فوراً راضی ہو گیا ۔ دُوسرے دن میں اسے ہمراہ لے کر کاندھلے کے لئے گھر سے روانہ ہو گیا ۔ شام ہو چکی تھی سورج کے ڈوبنے کا ہراول پہلی رات کے چاند کو چارج دے رہا تھا ۔ ہم ذرا انتظار کے بعد ہوڑہ ایکسپریس میں سوار ہو گئے ۔ میں ایک طرف تو اِس پروگرام میں کھویا تھا دوسری طرف محمد شفیع مجھ سے بار بار شمعی کے حالات و واقعات حیثیت اور عادات و خصائل پُوچھ رہا تھا ۔

رات اپنے نیلے پردے میں دُنیا کو چھپاتی جا رہی تھی اور ریل کی ڈگمگ ڈگمگ کے علاوہ جنگل پر اندھی خاموشی مسلّط تھی۔ چھوٹے اسٹیشنوں کی جھنکار اور گاڑی کے پہیّوں کی مسلسل گت پٹڑیوں سے اُچٹ اُچٹ کر اندھیرے کی دلدل میں دھنستی جا رہی تھی۔

تھرڈ کلاس کے ڈبّے میں میلے کچیلے مسافر بیٹھے اونگھ رہے تھے جنگل کی ٹھنڈی اور تازہ ہوا نے مجھے بھی نیند کے جھونکوں سے بے قابو کر دیا۔ اتنے میں ایک کانسٹیبل میرے کان کے برابر آ کر کھنکارا جیسے بجلی کے فرشی پنکھے کے پَر چلتے چلتے یکایک تاروں کے خول میں اٹک جائیں۔ "خبردار، ہوشیار رہو مسافرو! چور چکار کا اعتبار نہیں دیکھو کوئی پلیٹ فارم نہ صاف کر جائے۔ تھرڈ کلاس کے غریب مسافروں کے پاس ہوتا ہی کیا ہے کسی نے انٹی پر ہاتھ مارا، کوئی ٹٹوا ٹٹولنے لگا اور کسی کا ہاتھ اپنے آزار بند میں بندھے ہوئے پیسوں پر پہنچا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی لوگوں کو پھر نیند کی گُھمیر چڑھ گئی اور ڈبّے میں غنودگی بکھر گئی۔ گردنیں گھٹنوں سے ملنے لگیں۔ میں بھی اپنے ساتھی کا سہارا لے کر بے خبر ہو گیا۔

صبح چار بجے کے قریب سہارنپور کے اسٹیشن پر گاڑی رُکی اور ہم دونوں کاندھلے جانے کے لئے اُتر پڑے۔ اس اسٹیشن سے تھوڑی دُور پر چھوٹی لائن ایس۔ ایس۔ آر لائٹ ریلوے کا اسٹیشن ہے۔ گاڑی اس اسٹیشن سے روانہ ہو کر شاہدرہ دہلی تک جاتی ہے مگر ابھی اس کے جانے میں خاصی دیر تھی یہاں مسافر خانے میں ایک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ نل کے نزدیک کُتّے کاغذ اور پتّے چاٹ رہے تھے اور وہیں کھمبے سے لگا ایک چائے فروش میلی دھوتی کے پلّے سے اپنے خوانچے صاف کر رہا تھا۔ پاس کی بنچ پر گاؤں کا ایک پہلوان ڈنڈ پر تعویذ باندھے زنانہ مسافر خانے میں بیٹھی ہوئی ایک عورت کو گھور رہا تھا۔ ہم دونوں اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے اور پھر موقع پا کر ایک بنچ پر جا بیٹھے۔ اس کے بعد جب قلیوں نے چھوٹی لائن پر جانے والے مسافروں کے اسباب اُٹھائے تو ہم بھی خراماں خراماں اسٹیشن پہنچ گئے اُس وقت آٹھ کے لگ بھگ ہوں گے آدھ پون

گھنٹے کے بعد گاڑی چل پڑی اور دوپہر تک ہم کاندھلے پہنچ گئے۔

مَیں اُسے ساتھ لئے شمعی کے مکان پر پہنچا۔ شمعی دیکھتے ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ خوشی کے مارے اس کی آنکھوں میں آنسو تیر نے لگے اور کہنے لگی اب میری تحریر میں اثر آیا ہے مگر میرے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر سنبھل گئی۔ مَیں نے محمد شفیع کا تعارف کرایا۔ اور اسے وہیں چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا۔ پہلے میری والدہ نے اور پھر میری بیوی نے اچانک بغیر اطلاع آنے کا سبب پُوچھا اور مَیں اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا کہ ضروری کام تھا کل واپس چلا جاؤنگا۔

شمعی نے میرے ساتھی کو مردانے میں بٹھا کر نوکر کو خاطر و مدارات کی تاکید کر دی۔ مَیں حکیم شفیق الرحمٰن، قاضی زکی صاحب، اصغر جنگ اور نور احمد بیوپاری سے ملتا ہوا شمعی کے مکان پر پہنچا تو دن رُو بہ شام ہو رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر شمعی اُٹھی جیسے کسی کمان کی تانت کھُل گئی ہو۔ اس نے اپنے اُسی دیرینہ انداز میں گفتگو شروع کر دی۔ اُس کے لہجے میں ایسی کھنک تھی جیسے کوئی ستار کے ٹوٹے ہُوئے تاروں کو رہ رہ کر مضراب سے چھیڑ رہا ہو۔

آج شمعی پہلے سے کچھ کمزور معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ سردیوں کی صبح جیسی زردی تھی اور کپڑے بھی کچھ میلے سے ہو گئے تھے۔ مَیں نے کہا یہ کیا جوگ لے رکھا ہے آجکل؟ اُس نے بڑی بے پروائی سے ایک مَوت کے دروازے تک سُنی جانے والی گہری سانس لی اور ناتواں لہجے میں کہا۔ احسان صاحب! آخر کتنے دنوں کے لئے بناؤ سنگار کیا جائے، زندگی کے مصائب تو اب قبر کے مورچے کی تلاش میں ہیں۔ زندگی ہمیشہ انسانی آرزو کی پابند نہیں رہتی۔ اور ہاتھ پاؤں بغاوت کرنے لگتے ہیں۔

اُس وقت شمعی کے سامنے والی دیوار پر اُترتے ہُوئے سورج کی دھُوپ پیلی مٹی کی تہ دے رہی تھی، اور دیوار علیل سی معلوم ہو رہی تھی شمعی نے کہا آپ رات بھر کے جاگے ہُوئے ہیں گھنٹہ دو گھنٹہ سو جائیں تو طبیعت ٹھکانے آ جائے گی۔ مَیں نے کہا۔ مَیں مزدور ہوں مجھے اس ساز و سامان میں نیند نہیں آئے گی شمعی یہ سُن کر بھڑک اُٹھی، اور

تیزی سے اُگتی ہوئی آواز میں کہا "خدا ان چیزوں کے استعمال پر غریبوں سے ناراض ہو جاتا ہے"
اُس وقت شمی کے چہرے پر ایسی نکھری ہوئی سی روشنی لرزی جیسے دم توڑتے ہوئے چراغ کو اُکسا دیا جائے۔ پھر یک بیک وہ خاموش ہو گئی اور ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا "اصل میں ابھی بعض دلوں میں محبت کی شبنک[1] نہیں پھوٹی۔ یہاں کے لوگ سرکس کے جانوروں کی طرح زندگی گزارنے کے عادی ہیں اور سوچنے سمجھنے سے گریز کرتے ہیں۔ ان میں دن رات کی بود و باش اصلی جوہر کو زنگ لگا دیتی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں نے تو کسانوں اور مزدوروں کو اُصولِ محبت اور شہری آداب سکھائے ہیں مگر ہمارے یہاں شُرفا کا طبقہ بھی اس رُخ پر نہیں سوچتا۔

"جن ملکوں نے پس ماندہ طبقوں کو سہولتیں دی ہیں اُن میں کون لوگ بستے ہیں؟"
مَیں نے پوچھا۔

"سینکڑوں قومیں بستی ہیں" شمی نے بے جھجک جواب دیا۔

مَیں۔ "یہ ہمارا ملک غلامی کی زندگی کیوں بسر کر رہا ہے"؟

شمی۔ "یہاں کے باشندے خود غرض ہیں، مُردہ احساس ہیں کسی کے سامنے وطن پرستی اور انسانیت کا جذبہ نہیں ہے۔ اپنے لئے ہر آدمی زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنا چاہتا ہے اور موت کی سختی سے بے خبر ہے"

مَیں۔ "آخر اس کا علاج؟"

شمی۔ "اُس کا علاج ناممکن تو نہیں دشوار ضرور ہے۔ پس ماندہ طبقے کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے"

مَیں۔ "ہم تم یہ کام کر سکتے ہیں یا نہیں؟"

شمی۔ "آپ کر سکتے ہیں، میری بات کون مانے گا؟ مَیں تو ٹھہری طوائف! ایک قابلِ نفرت معاشرہ کی گندی موری میں اُگی ہوئی ھمبی"

---

[1] جسے عرفِ عام میں سمنک کہا جاتا ہے اور سوہن حلوہ اِس سے بنتا ہے۔ اور وہ اس طرح بنتی ہے کہ گیہوں بھگو دیئے جاتے ہیں اور ایک رات بھگو کر پھر ہرا کر کے گیلے کپڑے میں لپیٹ دیتے ہیں اس ہلکی نمی سے گیہوں کے اکھوے پھوٹ آتے ہیں اور وہ اکھوے شبنک ہے۔

میں نے شمعی کو ذرا نزدیک کر لیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر کہا "تمہارا یہ خیال کوئی معنی نہیں رکھتا۔ معیارِ شرافت تم جیسی ہستیاں ہی بدل سکتی ہیں۔ جب دلوں کو بدلنے میں تمہیں مہارت ہے تو معیارِ شرافت بدلنے میں کیوں نہیں ہو سکتی؟"

شمعی۔ "یہ بھی آپ نے کوئی بات کہی ہے اصل میں آپ شاعر ہیں اور ہر بات میں شاعری ہی سے کام لیتے ہیں جناب یہ کام بڑے لوگوں کا ہے جن کا عوام پر اثر ہو ہم لوگوں کا نہیں۔"

میں۔ "عوام تو اپنے مقاصد یا خوف کی وجہ سے چپ رہتے ہیں ورنہ عوام کو ان سے جنہیں تم بڑے لوگ کہتی ہو کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ کیا تمہارا زندگی بھر کا تجربہ یہ نہیں کہتا کہ بڑے لوگ عموماً بڑے نہیں ہوتے۔ میں تو خم ٹھونک کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ چھوٹے آدمی عموماً چھوٹے نہیں ہوتے۔ اُنہیں چھوٹا بنا دیا جاتا ہے اور علم کی کمی کے باعث وہ خود کو چھوٹا خیال کرنے لگتے ہیں! اور اسی احساسِ کمتری میں قوموں کی قومیں تباہ ہو گئی ہیں۔"

شمعی۔ "یہ تو سب درست ہے لیکن میں زندگی کی جدوجہد میں آپ کا ساتھ کیسے دے سکتی ہوں؟ البتہ ایک خادمہ کی حیثیت سے خدمت کر سکتی ہوں اور اسے اپنی خوش نصیبی خیال کروں گی۔ سنا ہے کہ سید احمد شہیدؒ اور اسماعیل شہیدؒ وغیرہ کی جماعت سے دہلی کی ایک مشہور طوائف بھی منسلک ہو گئی تھی جو مجاہدین کے گھوڑوں کا دانہ دلتی تھی اور راستے میں اُنہیں کے ساتھ شہید ہوئی کاش مجھے بھی آپ کے ساتھ اللہ ایسا ہی مقام دیدے۔"

اتنے میں ملازم چائے لے کر آ گیا اور شمعی نے پیالیوں میں چائے ڈھالنا شروع کر دی مجھے اب شمعی عورت یا طوائف معلوم نہیں ہو رہی تھی بلکہ اُس پر ایک اچھے اور زیرک دوست کا گمان ہونے لگا تھا اور چونکہ میری تعلیم ناقص تھی اس لئے ہر بات اور ہر ارادہ وہیں آ کر پاؤں ملنے لگتا تھا کہ معاش پا در ہوا ہے۔ ماحول پر نظر ڈالتا تھا تو ہر طرف ایک گندی اور بلبلی دلدل پھیلی ہوئی نظر آتی تھی۔ دل راستہ چاہتا تھا اور عقل دست بستہ

سر جھکا کر کھڑی ہو جاتی تھی۔ چائے کی پیالی دھری رہی اور میں اس کے ایک جستی کیس پر نظر جمائے اپنی مجبوریوں اور خامیوں کے تانے بانے میں مصروف رہا۔ شمعی نے پیالی اُٹھا کر میرے ہونٹوں سے لگا دی۔ چائے پیجئے جناب چائے!

"اچھا شکریہ!" میں نے چونک کر کہا اور چائے پینے لگا۔

شمعی نے پوچھا "آپ کاندھلے سے جاکر مطمئن ہیں نا؟"

میں"۔ ہرگز نہیں، لیکن یہاں جیسی بے روزگاری نہیں ہے۔ وہاں مزدور بیکار نہیں رہتا آخر بڑا شہر ہے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی کام نکلتا ہی رہتا ہے اور پھر یہاں سے چار گنا نہیں تو تین گنا مزدوری تو ضرور ملتی ہے۔"

شمعی"۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ گھر والوں کو یہاں سے بلوالیں۔ اب نہیں تو کچھ دنوں بعد انتظامات کر کے یہ کام ضرور کریں۔ جب تک آپ اہلِ خانہ کو ساتھ نہیں رکھیں گے کلی طور پر مطمئن نہیں ہو سکتے۔ مزدوری کے بعد کھانا پکانا کس قدر دشواری ہوتی ہوگی۔"

میں۔" بازار سے کھانا کھاتا ہوں۔"

شمعی۔" بازار کا کھانا تو مہنگا بھی ہوتا ہے اور ناصاف بھی۔ وہ تو آپ اپنی صحت سے دشمنی کر رہے ہیں۔ دیکھئے کھانا تو آپ خواہ بالکل سادہ کھائیں لیکن اس کی صفائی میں کسی طرح کا شک نہ ہونا چاہیئے اور یہ بات بازار میں میسّر نہیں آسکتی، آپ کم از کم کھانا تو گھر ہی پکایا کریں۔"

گفتگو میں ذرا سا وقفہ دے کر" اور اگر مجھے بلوالیں تو پھر انشاء اللہ آپ کو کبھی کوئی تکلیف ہوگی ہی نہیں۔"

میں۔" گھر سے پہلے کیوں نہ تمہیں بلالوں تاکہ باقی انتظام بھی تمہیں کر دے۔"

شمعی۔" ایسی کوئی لکیر نہ میرے ہاتھ میں ہے نہ آپ کے، یہ تو ہم راہ میں مسافروں کی طرح مل رہے ہیں۔ دُنیا اور زندگی دونوں کا اعتبار نہیں، خدا انجام بخیر کرے۔"

مَیں ۔ ”آمین! ثم آمین!!“

اسی عرصہ میں محمد شفیع سو گیا تو میں نے بڑے رازدارانہ طور پر علیحدگی میں شمعی سے مشورہ کیا۔ کئی نشیب و فراز پر خاصی گفتگو کی، اور ملازم چائے لاتا رہا۔ کدوکاوش کے بعد شمعی نے گردن جھکا کر جواب میں صرف یہ کہا کہ ”مجھے آپ کے حکم کی تعمیل سے کسی طرح بھی گریز نہیں مَیں تو آپ سے قریب رہ کر زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں“ اور بس۔

صبح ناشتے کے بعد جب میں نے محمد شفیع سے اس کا ارادہ معلوم کیا تو اس نے کہا کہ لاہور چل کر والدہ سے مشورے کے بعد جواب دے سکوں گا۔ وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر شمعی کے مکان، اُس کے سازوسامان اور اس کی اُجلی معاشرت کو دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے اِس جواب سے حیران تھا۔ مَیں نے شمعی سے کہا کہ میں اِسے صرف اس لئے ساتھ لایا تھا کہ ایک دوسرے کو دیکھ لیں، اب مَیں اس کے ماں باپ سے جا کر اس کے متعلق معلوم کروں گا، تُمہارا ارادہ تو معلوم ہو ہی گیا ہے۔

ہم دوسرے دن لاہور روانہ ہو گئے میرے ساتھی کے چہرے پر ایک قسم کی رازدارانہ ندامت آ گئی تھی مگر وہ اُسی پہلی وضعداری کی شرائط پر پُورا اُترنے کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ لاہور پہنچ کر وہ دو روز مجھ سے نہ ملا اور پھر دبی زبان سے کہنے لگا کہ اس بات پر والدہ راضی نہیں ہیں مجھے اُس کی اِس بات پر غصہ بھی آیا اور شرم بھی، لیکن پھر اُس کی عمر پر خیال کر کے خاموش ہو گیا اور یہ فیصلہ کیا کہ یہ سب قصور میرا ہے شمعی اب تک ہر امتحان میں پُوری اُترتی چلی آ رہی ہے اور ہر بار میری ہی طرف سے کوتاہی ہوتی ہے۔

مَیں غصے اور ناامیدی کے باوجود محمد شفیع سے چوں توں کر کے نباہے چلا گیا جب اُس نے میری کم توجہی دیکھی اور میرے جذبات کو بے نیازانہ پایا تو رفتہ رفتہ اجنبی بننے لگا مگر قطعاً علیحدگی اختیار نہیں کی، شاید اس لئے کہ ڈاکٹر صدرالدین جو اُس کے

دوا سازی میں اُستاد تھے میرے بے تکلّف دوست تھے چنانچہ وُہ اب تک اُسی انداز میں ہے مجھے مسرّت ہے کہ بہت اچھّے حالات میں ہے لیکن عام روش پر گامزن ہے شاید اس کا مقصدِ حیات بھی یہیں تک تھا۔

مجھ سے علیٰحدہ ہو کر اس نے لاہور کے ایک محلّے میں پریکٹس شروع کر دی تھی اور اس کی والدہ نے وہیں قرب و جوار میں کہیں اس کی شادی بھی کر دی تھی۔ کچھ دنوں بعد اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور شاید اس کی چھوڑی ہوئی پونجی سے محمد شفیع نے پانچ چھ کوارٹر بنا لیے تھے۔ پھر سُنا ہے کہ وُہ کوارٹروں کو کرائے پر دے کر لندن چلا گیا ہے وہاں سے عرصہ تک کوئی خط موصول نہ ہُوا، اب پھر وہ لاہور ہی آ گیا ہے۔

ایک بار میرے یہاں بھی آیا مگر کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی۔

شمعی کا آخری خط

مَیں پریشان تھا کہ شمعی کو کیا جواب دوں کہ اس کا ایک طویل خط موصول ہُوا۔

”احسان صاحب! آپ کے خیریت نامے کا انتظار کرتی رہی پھر سوچ کر خود ہی خط لکھ رہی ہوں کاش آپ دو ایک روز اور قیام کرتے تاکہ مَیں آخری بار آپ سے جی کھول کر مل لیتی اور آپ سے باتیں کر کے دل کو خالی کر دیتی۔ آپ کی نوازشات کا شکریہ میرا فرض ہے! خُدا کا اَجر خُدا کی بات رہی، میرا خیال ہے آپ کا ساتھی خام عقل کا انسان ہے مَیں آپ کی ہمدردیوں سے بھی آگاہ ہوں اور مجبوریوں کو بھی جانتی ہوں مَیں قیامت میں بھی آپ کی احسان مند اُٹھوں گی کیونکہ آپ نے مجھے جہنّم کے راستہ سے ہٹایا ہے۔

مجھے یہ آرزو ہی رہی کہ آپ میرے ساتھ نہ سہی میرے سامنے معاشی طور پر پابند ہو جاتے اور آسودگی کی زندگی بسر کرتے۔ اس میں عقد ضروری نہیں تھا اگرچہ اُس کا نہ ہونا بھی زندگی کا ایک گہرا خلا ہے، مگر شاید مَیں اور آپ دونوں اپنے اپنے مشرب میں

پُورے اُترتے، کیونکہ خود غرضی دونوں میں نہیں تھی، لیکن محبت اور تعلق کو کوئی نہ کوئی نام تو دینا پڑتا ہے اور جب نام دے دیا جاتا ہے تو اُس کے شرائط بھی عائد ہو جاتے ہیں۔

مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ اِس امتحان میں اِس لئے نہیں پڑے کہ آپ کے معاشی حالات اچھے نہیں اور ایک شریف اور سچا انسان یہی سوچ سکتا ہے مگر شاید ایسا نہ ہوتا اب مَیں بھی یہ سوچتی ہوں کہ اگر بفرضِ محال دونوں شرعی طور پر ایک ہو بھی جائیں اور پھر ایک فریق بھی اندازے کے مطابق پُورا نہ اُترے تو یہ ہمارے مُقدس تعلقات میں ایک ایسا گہرا زخم لگے گا جو زندگی بھر نہ بھر سکے گا۔

احسان صاحب! آپ نے جو کچھ مجھے دماغی طور پر عطا کیا ہے اس کا بدلہ تو میری ساری زندگی کی غلامی بھی نہیں ہو سکتی تھی تاہم میں چاہتی تھی کہ خادمہ بن کر رہوں اور میرے پاس جو سرمایہ ہے اُس سے آپ کے بچوں کی تعلیم و تربیت ہو لیکن آپ بڑے بے نیاز انسان واقع ہوئے ہیں حالانکہ اِن حالات میں بے نیازی بڑی دشوار چیز ہے۔ بڑے بڑے جغادریوں کے اتقا میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں مگر قدرت نے آپ کو مضبوط دل اور ناقابلِ شکست عزائم دیئے ہیں۔

اَب مَیں آپ کے دیئے ہوئے چراغ کی روشنی میں ایک اور راستے کی طرف قدم بڑھا رہی ہُوں جس کا انجام بھی مجھے معلُوم ہے لیکن اطمینان یہ ہے کہ اب مَیں فاحشہ نہیں اور دُنیا کی تمام لذات سے تائب ہو چکی ہُوں۔ اب ایک دشوار وقفے کے لئے اندھا دھند بڑھ رہی ہوں تاکہ میرے گناہ اسی طرح معاف ہو جائیں۔ اس خط کے بعد میرا کوئی خط نہیں آئیگا اور آپ بھی جواب کی زحمت نہ اُٹھائیں! اگر ایسا ہُوا تو میرے حق میں مناسب نہ ہوگا مجھ سے جو خطا ہوئی ہو معاف کر دیں! خدا را معاف کر دیں! خدا حافظ!"

آپ کی ممنون

شمعی کے اس خط نے مجھے بے تاب کر دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شمعی خودکشی کر لے
مَیں نے اُسی وقت اپنے دوست نُور احمد بیوپاری کو تار دیا کہ شمعی کے حالات سے اطلاع
دو۔ اس نے جواباً تار سے بتایا کہ شمعی نے شیخ محمد صدیق[1] صاحب سے نکاح کر لیا ہے
آپ کو مُبارک ہو، کہ ایک طوائف پیشے سے دست بردار ہو گئی۔

میرے ہونٹوں پر مہر لگ گئی اَب مجھے ہر وقت شمعی کا خیال رہنے لگا اور مَیں نے محسوس کیا کہ میری غریب الوطنی میں مصائب کا اضافہ ہو رہا ہے اور جراتوں میں مسکینی آ رہی ہے۔ میری تنہائیاں یتیم اور مجلسیں سُونی ہو گئیں۔ اب مُجھے اپنی روایات کا تحفظ اور عقیدوں کے حصار بے قیمت معلوم ہو رہے تھے۔ جیسے توانا تندرست انسان طویل بیماری میں اپنے قوّت و حیات کے عرصے کو یاد کرتا ہے۔ شمعی نکاح کے بعد طویل عرصے زندہ نہیں رہی۔ مگر جب تک اُس کی روح نے جسم کا ساتھ نہیں چھوڑا وُہ میری خوشدامن سے برابر میری خیریت پُوچھتی رہی۔

وہ حسین اور پاک ساعتیں جو شمعی کی معیّت میں گزریں اِس قدر نشاط اور نغمے میں سموئی ہوئی ہیں کہ اُن کا عشرِ عشیر بھی الفاظ کی گرفت میں نہیں آ سکتا اور میری قوتِ گویائی اُس وقت کی سنجاف[2] کو بھی نہیں چھو سکتی۔ میرا خیال ہے کہ اگر انسان کو اپنی نفسانی آرزوؤں اور خواہشوں کے تھرما میٹر سے نہ ناپا جائے اور جسمانیت کو نظر انداز کر کے صرف حُسن کا مطالعہ کیا جائے تو ہر محبوب میں اس قدر جاذبیت ضرور ہے کہ دُوسری زندگی کو جذب کر کے سفر کا صحیح رُخ متعیّن کر دے۔

شمعی مر چکی لیکن مَیں اب بھی جب اُس کا تصوّر کرتا ہوں تو وُہ وقت کی پابندیوں سے میری زندگی کے دھندلے غاروں پر ٹکٹکی باندھے جُھکی دکھائی دیتی ہے۔ شمعی کے بعد مجھے سینکڑوں اُلجھنیں لپٹ گئیں اور نامعلوم غموں نے آ لیا۔

---

[1] شیخ محمد صدیق کاندھلے کے رئیس اور نوٹیفائیڈ ایریا کے چیئرمین تھے [2] سنجاف: گوٹ۔ کنارہ۔ چوڑی مغزی

مزدور جب دوپہر کو آرام کرتے تو میں روڑی کے چھٹّے پر اینٹ کا تکیہ لگا کر لیٹتا، اور کروٹیں بدل بدل کر وقت گزارتا۔ میری یہ حالت دیکھ کر میرا ایک معمار دوست ننھے بریلوی مجھے لائبریری لے گیا۔ اسے طبّی کتابوں کے مطالعہ کا شوق تھا۔ اُن دنوں ننھّے بریلوی مجھے نہ سنبھالتا تو نہ معلوم میں اب کہاں ہوتا؟ اُس کی دن رات کی تسلّی آمیز گفتگو نے رفتہ رفتہ مجھے صبر و استقلال کے راستے پر ڈال دیا۔ اس کے باوصف جب کوئی مشکل پڑتی اور رات کو شمعی کی آمد۔ دیوں کی طرف خیالات کا دریچہ کھل جاتا تو آنکھوں آنکھوں میں رات گزر جاتی۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ جب شمعی کے تصوّرات کا اُلجھاوا پڑا تو نیند حرام ہو گئی۔ آخر کار رات کی تاریکی سے باسی پن کی بُو آنے لگی۔ ستاروں کی آنکھوں میں دیکھتے دیکھتے سفید موتیا اُتر آیا اور میرے بدن میں تشنّج آگیا۔

جاروب کشی کا ارادہ

مزنگ کی آمد و رفت کے دوران ایک دفعہ مجھے کئی روز تک مزدوری نہ ملی کیونکہ میں اس بستی میں مزدوروں کے ہتھکنڈوں سے ناواقف تھا جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہُوں کہ یہ جمعدار ہمیشہ اپنے تال میل کے لوگوں کو کام پر لگاتے ہیں اور جب چھٹّا تقسیم ہوتا ہے تو اکثر جمعداروں کو حِصّہ ملتا ہے۔ یہ حصّہ دینے کا سوال میرے یہاں کبھی پیدا نہیں ہُوا کیونکہ میں خود کو ناکارہ انسان خیال نہیں کرتا تھا اور مجھے اپنے اندر سے آواز آتی تھی کہ اپنے خُون پسینے کی حلال کمائی کو حرام کر لینا کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔ شاید اسی وجہ سے میں کہیں جم کر کام نہیں کر سکتا تھا اور مجھے ہمیشہ مزدوروں کا جمعدار مشکل سے مشکل کام دیتا تھا۔ جب مجھے بے روزگاری سے تکلیف ہونے لگی تو میں نے اپنے ایک کرم فرما نبّو شاہ سے جو کارپوریشن میں داروغہ صفائی تھے بڑی لجاجت سے کہا ”شاہ صاحب! اگر آپ میرا نام بدل کر رجسٹر میں کچھ اور لکھ لیں اور مجھے اپنے یہاں صفائی کرنے والوں میں رکھ لیں تو میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ نبّو شاہ نے ایک بھرپُور قہقہہ لگایا اور کہا ”یار کیوں مذاق کر رہے ہو؟“

مَیں۔ ”مذاق نہیں شاہ صاحب، مزدوری میں کیا عیب ہے آخر میں اینٹیں اُٹھاتا ہوں، گارا ڈھوتا ہوں سڑکوں پر کنکر روڑی کوٹتا ہوں اُن سے تو یہ کام آسان ہے۔“

شاہ صاحب۔ ”کام تو آسان ہے لیکن جب لوگ تمہیں بھنگیوں کے ساتھ جھاڑو دیتے ہوئے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟“

مَیں۔ ”جب مَیں اُنھیں کچھ نہیں کہتا تو لوگ مجھے کیا کہہ سکتے ہیں اور کیوں کہیں گے؟ آخر کوئی بات بھی تو ہو۔“

شاہ صاحب: ”مَیں یہ کبھی یقین نہیں کر سکتا کہ تمہارے جاننے پہچاننے والے مجھ پر لعن طعن نہیں کریں گے۔“

مَیں: ”شاہ صاحب قبلہ! اگر آپ براہِ نوازش مال روڈ کا علاقہ مجھے دے دیں، مَیں گیارہ بجے رات سے ہی صفائی شروع کر کے پَو پھٹنے سے پہلے ہی کام نپٹا دیا کروں گا اور اگر دیکھوں گا کہ کوئی جاننے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے تو جھاڑو کے اور دو ہاتھ دبا کے مار دوں گا۔ ظاہر ہے کہ گرد و غبار سے ہر شریف آدمی بچ کر چلتا ہے اور میرے لئے یہ گرد و غبار اور خاک دھول کا پردہ بچت کا مضبوط پہلو ہے۔“

شاہ صاحب: ”بات تو یہ ٹھیک ہے، مگر سوچ لو علاقہ تو میں ایسا دے دوں گا جہاں رات کو آدمی کا گزر ہی نہیں ہوگا۔“

مَیں: ”سوچ لیا صاحب! محنت میں کیا سوچنا؟ بسم اللہ کر کے میرا کوئی نام رکھ دیجئے!“

شاہ صاحب: ”اس کے لئے درخواست کی ضرورت ہوگی اُس میں کیا لکھو گے؟“

مَیں: ”لکھوں گا کیا جو بات ہے صحیح لکھوں گا بیکار ہوں مجھے یہ کام دیا جائے! میں آخر جھوٹ کیوں بولوں گا؟“

شاہ صاحب: ”تم تو لکھ دو گے میں اس پر رپورٹ کیا کروں گا؟ بھائی ذرا

میں سوچ لوں کل بات ہوگی۔ تم بھی اور سوچ لو جلدی کا کام اچھا نہیں ہوتا۔"

میں: "میں بیکاری میں دن گزارنا جرم بھی خیال کرتا ہوں اور گناہ بھی آپ جلدی سوچ لیں، مجھے ایک ایک گھڑی دوبھر معلوم ہو رہی ہے۔ میں اکیلا آدمی نہیں ہوں میرے ساتھ ایک کنبہ ہے جس کی کفالت میرا فرض بھی ہے اور عبادت بھی۔"

شاہ صاحب: "کل بات ہوگی تم نے تو مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔"

یہ کہہ کر شاہ صاحب اُٹھ کر چلے گئے، دوسرے دن ملے تو فرمایا کہ آئندہ جمعہ کو ایک جگہ خالی ہونے والی ہے تم اپنا نام تجویز کر لو میں نے دل ہی دل میں احسان الحق کا مفہوم "کرپارام" بنایا۔ نبوشاہ نے پھر ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگے "ہندو بنے جا رہے ہو؟" میں نے کہا جناب ہندو نہیں بھنگی بنا ہوں بھنگی، لیکن اس میں ہندو مسلمان کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہ تو صرف نام ہے! کوئی کچھ بھی کہے کسی نام سے پکارا جائے۔ میں کون سا بھنگیوں کی دعوتوں میں شامل ہوں گا اور اگر ایسا وقت بھی آجائے تو میں گاندھی سے بڑا انسان تو نہیں جب وہ بھنگیوں میں قیام کرتے ہیں تو آخر اُن کی کیا توہین ہوتی ہے؟ گاندھی تو ان کے تہواروں میں بھی شریک ہوتے ہیں مجھے تو ایسا موقع نہیں آئیگا۔

نبوشاہ سر پکڑ کے بیٹھ گئے اور کہنے لگے "عجیب انسان سے واسطہ پڑا ہے اچھا میاں جمعہ تو آنے دو۔"

دو روز کے بعد مجھے گنگارام مینشن پہ پتائی کا کام مل گیا اور میں نے نبوشاہ کو یہ خبر سنائی تو اُنھوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا "بھائی مجھے بڑی کشمکش سے نجات مل گئی۔ خدا کرے، تم کبھی بے روزگار نہ ہو۔ تم تو قیامت کے انسان ہو۔ ایسا انسان کبھی بھوکا نہیں مرسکتا۔ یہ کردار تو روحانی لوگوں کا ہوتا ہے مگر تم تو صوفیاء کے خلاف بھی ہو۔ پھر تم میں یہ بات کہاں سے آگئی۔"

میں نے کہا جناب صوفیاء کے خلاف نہیں ہوں البتہ جعلی صوفیاء سے نفرت کرتا ہوں جو مسمریزم، ہپناٹزم اور کالے علم کے بل پہ خود کو ولی منواتے ہیں اور شیطنت

کو خدارسی کا لقب دیتے ہیں اُن کے اس مقام سے میں جاروب کشی کی حلال روزی کو افضل و برتر خیال کرتا ہوں۔ اُن کی روحیں ہماری روحوں کے مقابلے میں اَچھوت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ تو عورتوں کے سڈول جسموں اور جُہلاء کے حلقوں کی معلومات سے آگے نہیں بڑھتے۔"

نبوّ شاہ نیک انسان تھے میری باتوں پر خاموش رہے اور" اللہ فضل وکرم کرے ہر مسلمان پر" کہتے ہوئے گھر چلے گئے۔

منافقین کا رویّہ

اب میں کئی ایک ایسے لوگوں کو جان پہچان گیا تھا، جو بظاہر میری تعریف کرتے اور عدم موجودگی میں ہونٹ پچکاتے اور مُنہ چڑاتے۔ جب میں ان کی گھریلو زندگی کے قریب گیا تو معلوم ہُوا کہ غیروں کی تکلیف سے تو ان کے تبسم پر آب آجاتی ہے اور دوسروں کی نرمی اور عاجزی سے ان کی باطن کی سختی شدّت اختیار کر لیتی ہے۔ میں پہروں سوچا کرتا، کہ الٰہ العالمین یہ کس قماش کے لوگ ہیں آخر ان کا اصل کردار کیا ہے؟ یہ کس مذہب اور اخلاق پر کاربند ہیں، کہ اپنے مقصد کے سوا ان کے یہاں ہر چیز عارضی اور گذشتنی ہے۔ نہ دوستی کو ثبات ہے نہ دُشمنی کو، نہ وعدے میں پختگی ہے نہ کردار میں استحکام۔ بیوی بچوں سے بھی گاہکوں کی طرح حساب رَوا رکھتے ہیں۔ دوستی میں منافقت کو عیب نہیں سمجھتے عزیزوں سے بدگمانی کو روا خیال کرتے ہیں۔ اپنوں سے پردہ ہے مگر غیروں سے بے تکلفی کی حد تک کُھل کھیلنا عیب میں شمار نہیں ہوتا۔ میں یہ سوچ سوچ کر اپنے خون میں کھولتا رہتا لیکن اصلاح کا کوئی سجھن میری سمجھ میں نہ آتا۔

آخر تنگ آکر میں اس نتیجے پر پہنچتا کہ ہر غریب اور نادار کو بھی اسی طرح غیر مخلص زمانہ ساز، طوطا چشم اور خود غرض کے علاوہ انتقام کا خوگر ہونا چاہیئے لیکن پھر خیال آتا کہ جب تک پس ماندہ طبقے میں تعلیم عام نہ ہو جائے اس معاشرے کی اصلاح ممکن ہی نہیں

اور یہ بڑے لوگ ایسی تعلیم کو عام نہیں ہونے دیں گے۔

اس قسم کے خیالات سے بعض اوقات تو میرا سر پھٹنے لگتا اور کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا جیسے میرے فمِ معدہ میں دُکھن ہو رہی ہے نہ جانے ایسا کیوں تھا اس کا سبب مجھے اب تک معلوم نہ ہو سکا میرا شعور جس قدر ترقی کرتا گیا اُسی قدر زندگی میرے لئے کانٹوں کا بستر بنتی گئی۔ میری مٹی کی گہرائی میں جہاں سے نمی شروع ہوتی ہے شکم پُری بدن پوشی اور فرائض کی ادائی کی جڑیں تو ضرور تھیں لیکن اس سے ذرا گہرائی میں شکرِ نعمت کی قلمیں اور ادائے سجدہ کے بیج بھی موجود تھے اور اب تک اُنھیں موسم کے کسی گرم و سرد نے خراب نہیں کیا تھا مصائب پر تشکّر کی عادت فطرتِ ثانیہ بن گئی تھی لیکن یہ گرد و پیش کا ماحول مجھے اِس خطّے کے دین، اخلاق، کردار اور طاقت پرستی کے انجام سے خائف رکھتا تھا۔

سبزگاہ کی چوکیداری

میرے یتیم دن اور مظلوم راتیں اِسی اُدھیڑ بن میں بیت رہی تھیں کبھی دریائے راوی پر جا نکلتا تو بھرن پُل پر سے گزرتی ہوئی ریل گاڑیوں کے عکس دل کو بیتاب کئے رکھتے۔ شام کی لہو اُنڈھاتی شفق دل و دماغ میں اور بھی خونیں چراغ جلا جاتی۔

اِسی اثنا میں میری ملاقات گول باغ کے ہیڈ مالی میاں امام الدین صاحب سے ہوئی اور اُنھوں نے ازراہِ شفقت اپنے اسسٹنٹ سراج الدین صاحب سے کہہ کر مجھے شملہ پہاڑی (ڈیوس روڈ پر ایک مشہور سبزگاہ) پر رات کی چوکیداری دلوا دی جس میں چودہ ۱۴ روپے ماہانہ تنخواہ تھی۔

شملہ پہاڑی (نعیبر ماؤنٹ)، یہ سبزگاہ اسٹیشن سے قریب قریب ایک میل جنوب مشرق میں واقع ہے لیکن رات کے سناٹے میں گاڑیوں کی شنٹنگ کی آواز اور گاڑیاں جڑنے کے وقت ٹکروں کے دھڑاکے یوں آتے تھے کہ جیسے سبزگاہ کی

بغل میں لوکو شاپ کھُل گئی ہو۔

جب میں نے پہلے دن چوکیداری سنبھالی تو مہینے کے آخری دن تھے رات کا ٹھٹھرا ہوا سناٹا اور سانس لیتی ہوئی خاموشی مجھ میں اُتری جا رہی تھی دیر تک میں ایک شرابی کی طرح اس مقدس تنہائی کے مزے لیتا رہا۔ جب رات کا طلسم ہلکا پڑا، چاند مغرب کی طرف مدفون بچے کی لاش کی طرح زرد ہو رہا تھا، اس وقت مَیں نے اپنے اندر ایک عجیب و غریب کیفیت محسوس کی اس سے پہلے کبھی مجھے اس قسم کی لذت سے واسطہ نہیں پڑا تھا جیسے اندر سے ہلکے ہلکے میرا سینہ پگھل رہا ہے اور کسی سیّال کی ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں میرے دل پر ٹپک رہی ہیں اُس وقت مجھے دل سے تصورات و تخیلات کی آہٹیں اور عزائم کی گونج سُنائی دے رہی تھی۔ جب صبح کے پہلے اُجالے نے مشرق کے ہونٹ رنگ دیئے اور درختوں کی پھننگیں مفلش کے گُچھے معلوم ہونے لگیں اس وقت مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میری تمام کثافتیں مجھ سے بغاوت پر تُل گئی ہوں۔ اور مَیں خود سے علیحدہ ہو کر بھی خود کو دیکھ سکتا ہوں۔

چاندنی راتوں میں جب پچھلے پہر کی شبنم سبزے پر موتی ٹانک دیتی اور پھولوں پر نیم بیہوشی کا سا عالم طاری ہو جاتا اُس وقت میری آنکھوں میں بھی نیند چبھنے لگتی اور پپوٹے اندر سے کھُردرے معلوم ہونے لگتے ہیں اُس وقت آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے لگاتا اس لئے کہ مَیں کسی سے سُن چکا تھا، کہ ٹھنڈے پانی کے چھینٹے آنکھوں کو کئی بیماریوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اس طرح نیند بھی اُچٹ جاتی اور سکون سا بھی محسوس ہونے لگتا۔ اس احتیاط کے باوجود میری آنکھوں میں روہے پڑ گئے اور پھر اس قدر تکلیف ہوئی کہ ڈاکٹر متھرا داس کے ہسپتال جانا پڑا ڈاکٹر متھرا داس موگہ منڈی سے لاہور آ گئے تھے ان کے یہاں غریبوں کا علاج مفت ہوتا تھا، اور ناداروں کی دیکھ بھال دولت مند مریضوں سے زیادہ تھی۔ میرا ایک غریب[1] دوست

---

[1] مہربان حسن آج باسٹھ سال کی عمر میں جو پاک فوج میں ملک و قوم کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

روز میرا ہاتھ پکڑ کر ہسپتال لے جاتا اور کاسٹک بچ کرا کے گھر چھوڑ جاتا۔ جب تک میری آنکھیں بیمار رہیں اس وقت تک وہ "مہربان" برابر مہربانی کرتا رہا اور اُس نے ایک رات بھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑا اُس کی پُرخلوص خدمت میرے دل پر نقش ہے اور میں ہمیشہ اُس کے لئے دُعاگو ہوں۔ وہ بڑا ہی محنتی اور وفادار انسان ہے۔

مہربان کی اِس وفاداری نے مجھ سے سینکڑوں تَن کے اُجلے اور مَن کے میلے دوستوں کو چُھڑا دیا آج بھی میں وفاداری کے لحاظ سے غریبوں، مزدوروں، کسانوں اور پریشان حال لوگوں کو بڑے بڑے زمینداروں، عہدہ داروں، جاگیرداروں اور ملوں کے مالکوں پر ترجیح دیتا ہوں کیونکہ ایثار کا جذبہ اور جدوجہد کے عزائم انھیں کے یہاں تاباں و درخشاں رہتے ہیں۔ لیکن اس جوہر کو کون دیکھتا ہے؟

جب تک انسان مصائب کے انعام اور افلاس کی افادیت سے آگاہ نہیں ہوتا وہ دُنیا کی خدمت اور خُدا کی عبادت کے قابل نہیں ہوتا، کیونکہ افلاس پر تشکّر اور مصائب پر صبر فطرت کے احسانات کی غیر جانب دارانہ گواہی ہے، یہ لوگ آلام و مصائب کی برکتوں سے تو آگاہ نہیں ہوتے لیکن افلاس اور ناداری سے لرزتے نہیں اور یہ بڑی بات ہے۔

ایک علم دوست

شملہ پہاڑی کی چوکیداری میں میرے لئے اس سے زیادہ اور کیا کشش ہو سکتی تھی کہ نوکری کی نوکری اور مطالعہ گاہ کی مطالعہ گاہ

ایک طرف تو میرے ہاتھ میں کتابِ ادب ہوتی اور دوسری طرف کتابِ فطرت! یہاں آکر مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ جب کسی صاحبِ احساس کو مشاہدہ کا چسکا پڑ جاتا ہے تو اُس کے سامنے پھولوں کے رنگوں میں گویائی آجاتی ہے اور پتّی پتّی کنیا[1] کر دیکھنے لگتی ہے۔ اسی اثنا میں میرا تعارف خواجہ عبدالکریم صاحب سے ہوا جو اسی سیرگاہ کے آنے والوں میں سے ایک تھے جب اُنھوں نے دیکھا کہ ایک چوکیدار ہر وقت کتاب لئے بیٹھا رہتا ہے تو اُنھوں نے

---

[1] کنیانا: نظر بچا کے، ٹیڑھی نظر سے دیکھنا، ترچھی نظر سے دیکھنا۔

مجھ سے میرے حالات دریافت کئے اور کچھ دیر کے سوال و جواب کے بعد میونسپل لائبریری میں میرا نام درج کرادیا پھر لائبریرین سے کہہ دیا کہ یہ شخص جتنی بھی کتابیں طلب کرے انکار نہ کریں۔ اور مطالعہ کے بعد واپس لے لیا کریں! مجھے اور کیا چاہیئے تھا میں تو پھولا نہ سمایا اور اسی وقت سے میں نے کتابوں کا انتخاب شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے کہ اُس دوران میں میرا مطالعہ کم از کم چار سو صفحے روز کا تھا۔ اس زمانے میں صرف خواجہ عبدالکریم صاحب کی کرم فرمائی سے مجھے بہت کچھ ملا۔ مجھے حیرت تھی کہ خواجہ عبدالکریم صاحب نے مجھ سے یہ حُسنِ سلوک کیوں روا رکھا؟ ایک عرصہ کے بعد جب میں ان سے قریب ہُوا تو معلوم ہوا کہ وُہ فطری طور پر خدمتِ عوام کے آدمی ہیں اور سیاسی تحریکوں میں ہر اُس تحریک سے منسلک رہے ہیں جس میں پس ماندہ طبقے کے حقوق کی حفاظت کا سوال اُٹھا ہے۔

میری نظر میں صحیح سیاست کا شعور ہی اُسی وقت بیدار ہوتا ہے جب لیڈر دلی طور پر مزدوروں، کسانوں اور پس ماندہ طبقوں سے ہمدردی رکھتا ہو اور ان لوگوں پر کڑی نظر رکھے جو انسانیت اور فرائض کی ادائی میں ریاکاریوں کی دیواریں اُٹھاتے اور خیانتوں کے حصار کھینچتے ہیں۔ ایسے لوگ نہ تو تعلیم کو عام ہونے دیتے ہیں اور نہ ارزاں، وہ رات دن اپنے مقابر کی تعمیر کے لئے غریبوں کی ہڈیوں کا چُونا اور مزدوروں کے خون کا گارا فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ عمل نہ جانے کب تک جاری رہے گا۔

ایک دفعہ چاندنی رات تھی، ہَوا بند سی ہو گئی۔ درختوں کی ٹہنیوں نے گردنیں ڈھلکا دیں۔ آسمان پہ ہلکے ہلکے ابر پارے تیرنے لگے مگر پھر ہوا کے جھونکوں سے سرسراہٹ پیدا ہوئی۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا تو چاند پہ ایک مرے ہوئے چنکبرے خرگوش کی شکل کا ابر پارہ رینگ رہا تھا میں پہاڑی کے اوپر چلا گیا اور بلندی سے ماحول پہ نظر ڈالی۔ اُس وقت میرے جسم میں پھریریاں تیر رہی تھیں۔ آس پاس کے

بنگلے خانقاہوں کی طرح خاموش تھے اور ملازمین کے کواٹر مقابر کی طرح نظر آ رہے تھے، اُن دنوں میری شاعری میں میرا مشاہدہ اور مجاہدہ میناکاری کر رہا تھا اور ان ٹوٹتی راتوں کا قوام میرے شعور و فکر کے ذخیرے میں اپنا کام دکھا رہا تھا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ علی الصبح جب میں پھولوں کو ذرا نزدیک سے دیکھتا تو مجھے پنکھڑیوں کی رگیں متحرک معلوم ہوتیں اور میں اسی مشاہدے کو شاعری کا مسالہ تصوّر کرتا۔ ٹیوب ویل کے برابر دن بھر کی مشقت سے ٹوٹے ہوئے مزدور اور قلی سوئے ہوئے ایسے معلوم ہوتے جیسے بھیڑیں ذبح ہوئی پڑی ہوں۔ جب صبح کی روشنی میں ستاروں کے بجرے ڈوبنے لگتے تو میں اُجالے میں خوشبو اور خوشبو میں لہک محسوس کرنے لگتا۔ سورج کی نکلتی ہوئی کندنی کرنیں جب پھولوں کی کیاریوں پر قہقہے برسائیں اُس وقت میں نم آلود خاک کے ذرات کو پسینہ میں شرابور دیکھتا اور میرے خیالات و احساسات کی تاریکی کو روشن ستارے تاپنے لگتے۔ مزدوروں اور اردگرد کے بیلداروں سے زیادہ مجھے اُن پودوں سے مل کر مسرّت ہوتی جنھیں میں پانی دے کر سانس لیتا تو ایک توانائی سی ملتی جیسے میرے رگ و ریشے میں مومیائی سرایت کر رہی ہے۔

کچھ دنوں تو میں ادبی کتابوں کے لفظوں اور اُن کے مفہوم و معانی کے مزے لیتا رہا اور پھر کتاب فطرت کے، اس کے بعد رفتہ رفتہ کتاب سے صاحبِ کتاب کو سمجھنے کی لو لگ گئی جو کتاب پڑھتا اس سے میرے سامنے مصنّف کی فطرت، عادت اور اطوار و اخلاق جھلملانے لگتے۔ پھر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہر مصنّف اپنے دل کا بخار اور ظرف و ضمیر کے تقاضے کو اپنی تصنیف و تالیف میں انتہائی چابکدستی سے قلمبند کرتا ہے۔

مصنّفین کو سمجھتے سمجھتے ایک ایسا وقت آیا کہ میں ایسے ادب اور اس قسم کے لٹریچر کو پسند کرنے لگا جس میں بات صاف اور کھول کر بیان نہیں کی جاتی اور یہ رجحان اچھے خاصے عرصہ تک رہا اُن دنوں محذوفات کا حسن میری شاعری میں یافوقی کا کام

کر رہا تھا، یہ رَو بعض دیگر شعراء تک بھی پہنچی مگر وہ ابہام کے اندھیروں میں گھر کر رہ گئے
اب ان کے سامنے بے مقصدی کے جنگل تو تھے لیکن شاعری کے کناروں سے بھی نکل چکے
تھے۔ ایمائیت اور اشاریت کوئی عیب نہیں لیکن سلیقہ درکار ہے کیونکہ اس میں تو الفاظ
کو ذرا سا رُخ دے کر مفہوم کو ناظرین و سامعین کے احساس و شعور پر چھوڑ دیا جاتا ہے
اب اگر شاعر اندازِ بیان اور قوّت اظہار میں کامل ہے تو ناظرین اس کے معانی و مطالب
کو فوراً سمجھ لیتے ہیں اور اگر ابہام دبیز ہے یا اندازِ بیان ناقص ہے تو اچھّا خاصا
خیال بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔

مَیں اس اشاریت کے معنی یہ لیتا رہا کہ ہر خیال ایک اشارہ ہے دُوسرے بلند خیال
کی جانب اور ہر مضمون ایک داغ بیل ہے کسی دوسرے قیمتی مضمون کی۔ چنانچہ معترضین اور
منتقدین سے بے نیاز ہو کر میری نظر ہر فقرے اور ہر جملے سے آگے کی طرف اُٹھنے لگی
اور مَیں اِس لفظ اشاریت اور ایمائیت سے ایسے غیر متعارف دائروں میں جھانکنے
لگا جن میں قوسِ قزح کے جنین زیرِ پرورش تھے اور میری تنقید یہ کے کرنوں سے زستے
ہوئے سُورج کے گرد سرخ فصیل پھیل رہی تھی۔

دیوانِ غالب کا مطالعہ مَیں نے اُسی زمانے میں شروع کیا تھا مجھے اس کے
ہر شعر میں اشاریت اور ایمائیت نظر آتی تھی۔ لیکن کہیں کہیں بیان اُلجھا ہوا معلوم ہوتا
اِس اُلجھن کو دُور کرنے کے لئے مَیں نے غالب کی زندگی پڑھی۔ اس کے رجحانات اور
اندازِ بیان کو سوچا اور سمجھا۔ لیکن غالب کا مطالعہ مجھے بہت جلد لُغت کی طرف لے آیا
اور لُغت کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ غالب کے وہ الفاظ جن کو میں نگینہ سمجھتا تھا، وہ
تو ہیرا ہیں اور لُغت کے مطالعہ ہی سے اس کی غلط ترکیبیں اور اخلاقی نشیب
بھی سامنے آ گئے پھر غالب بھی دیگر بلند شعراء کی صف میں نظر آنے لگا اور مَیں آگے بڑھ گیا
کیونکہ میری رُوح کے زہر کو اتارنے کے لئے ہیرے ہی کافی نہیں تھے اور کچھ چیزیں بھی

درکار نہیں۔

مَیں اِس چوکیداری میں معاشی طور پر تو خوش نہیں تھا کیونکہ چودہ روپے کی قلیل رقم میرے اور میرے متعلقین کی ضرورتوں کی کفالت نہیں کرتی تھی مگر میرے ذوق کے لئے یہ جگہ قابلِ اطمینان ضرور تھی اور کبھی کبھی مجھے مصارف کے لئے پریشانی بھی ہوتی مگر دن تھے کہ گزرے چلے جا رہے تھے۔ صبح سیر کرنے والوں کے بعض بعض چہروں سے ایمان تازہ ہو جاتا اور رُوح لہلہا اُٹھتی۔ میری نظر میں خود کفیل عورتوں کی پشوازیں بھی تھیں جن سے رقص میں ناظرین کی نگاہیں تو چاند کی سی کرنوں کا جھما کا محسوس کرتی ہیں لیکن جسم کے اعضا کی ساخت نظر میں نہیں آتی لیکن یہاں بعض بعض لباس ایسی اعضا نمائی کرتے کہ نگاہیں گدگدا کے واپس لوٹ آئیں اور مَیں دُنیا کی اس ترقّی کا انجام سوچنے لگتا۔ کئی شوہر تو میری نظر سے ایسے گزرے جو اپنی بیویوں کو تحفوں کی طرح بنا سنوار کر ساتھ لاتے اور دوستوں سے تعارف کراتے۔ ان کے ہونٹوں پر ایک تاجرانہ تبسم اوچھے پن کے علاوہ نمائشی خدوخال کی اونچ نیچ سے اپنی کراہت کا اعلان کرتا رہتا تھا مگر وہ لوگ گردن ہلا ہلا کر ٹہلتے رہتے یا بنچ پر بیٹھے کندھے اونچے نیچے کرتے رہتے۔ جو گفتگو میں انگریزوں کے بیشتر مقلّدین کا رویّہ ہے۔

ذہنی مزدوری

ایک دن ایک شخص سے سیر گاہ میں ملاقات ہوئی۔ وہ گجرات کا رہنے والا تھا۔ اثنائے گفتگو میں اسے معلوم ہو گیا کہ مَیں شعر کہتا ہوں چنانچہ اُس نے کہا کہ آپ تمام دن بیکار رہتے ہیں مَیں کیوں نہ آپ کو ایک پبلشر کا کام دلوا دوں وہ دو روپے فی نظم دیتا ہے اور قومی نظمیں لکھواتا ہے لیکن اُن پر شاعر کا نام نہیں ہوتا۔ مجھے شاعر کے نام ہونے نہ ہونے سے کیا غرض تھی مَیں نے اس شرط کو منظور کر لیا، دو تین دن کے بعد وہ آیا تو تیس چالیس عنوان لکھوا لایا اور ساتھ ہی مجھے دس روپے پیشگی دے گیا۔ مَیں نے خدا کا شکر ادا کیا اور چار روز میں سب نظمیں کہہ ڈالیں اور اُسے خط لکھ دیا کہ آپ جب آئیں تو تمام نظموں کا معاوضہ لے کر آئیں۔ وہ دس بارہ روز

پشواز:۔ گھگرے یا لہنگے کی قسم کا ایک لباس ہے جو رقاصاؤں میں مروج ہے اور یہ لباس نہایت قیمتی ہوتا ہے

کے بعد آیا اور علی الحساب سو روپیہ دے گیا۔ اسی کے ساتھ بیس مصرعے بھی لایا اور کہا ان کا معاوضہ بھی دو روپے فی غزل ہوگا مگر کوئی غزل سات اشعار سے کم نہ ہو۔

مَیں نے دوسرے دن وہ سو روپے تو گھر منی آرڈر کر دیئے اور مصرع گنگناتا پھرنے لگا شام تک ایک غزل ہوئی اور اس کے بعد میں نے فکر نہیں کی۔ طبیعت اُکتا سی گئی تھی۔

رات کو جب دُور درختوں کے پیچھے سے چاند نے اُجالی لی اور نرم شعاعوں نے تتلیوں کے پروں پر مختلف رنگ جگا کر پھولوں پر بادلہ بکھیر دیا۔ میں اُس وقت ایک بنچ پر بیٹھ کر فکر کرنے لگا۔ چاند سفیدے کے پیڑ کی چوٹی سے ذرا اُبھر چکا تھا جیسے کسی حسینہ نے کوٹھے پر چڑھتے ہوئے زینے کی آخری سیڑھی پر سیاہ برقع کا نقاب اُلٹ دیا ہو ذرا سی فکر پر اشعار ہونا شروع ہو گئے اور میں ہر مصرع پر یکے بعد دیگرے غزلیں کہتا چلا گیا۔ آسمان کو مدّھم ستاروں کا مقتل بننے سے پہلے پہلے مَیں نے ان مصرعوں پر غزلیں کہہ ڈالیں صرف ایک مصرع باقی رہ گیا۔ مَیں نے طبیعت پر زور بھی دیا مگر بات نہ بنی اور تمام تر توجّہ صُبح کے منظر کی طرف رجوع ہو گئی۔ میں نے آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیئے اور ٹہلنے لگا۔

چور پکڑا

کچھ روز بعد کارپوریشن نے سڑک کا ایک درخت کٹوا کر اسی سیرگاہ کے قریب پزاوہ[1] کے دامن میں ڈال دیا اور چوہدری سراج الدین صاحب نے مجھے تاکید کی کہ دیکھنا خیال رکھنا لوگ رات کو لکڑیاں باندھ باندھ کر نہ لے جائیں۔ "بہت بہتر جناب" کہہ کر خاموش ہو گیا۔

چار پانچ روز کے بعد سراج الدین صاحب پھر تشریف لائے اور کہنے لگے دیکھو تم رات کو اُدھر نہیں جاتے وہاں سے لکڑیاں چوری ہو رہی ہیں۔ مَیں حیران تھا کہ مَیں نے تو کسی شخص کو بھی لکڑیوں کا گٹھا لے جاتے نہیں دیکھا پھر بھی مَیں شرمندگی کے ساتھ خاموش

---

[1] پُرانا بھٹّا۔ آوہ یا پجاوا

ہوگیا۔ اُس دن شام تک میں نے ایک تانگے کے پہیے کا دستہ چھیل کر ہنٹر بنایا اور کمر سے باندھ لیا شام ہوتے ہی جب میں نے ڈیوٹی لی تو رات کے آغاز ہی سے اس طرف کی آہٹ پر کان لگا دیئے۔

رات کا ایک بجا ہوگا سڑک پر درختوں کے سائے گوذڑ کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور جھاڑیاں خاموشی سے ہلکی ہلکی سانسیں بھر رہی تھیں میں نے دُور سے دیکھا کہ لکڑیوں کے ڈھیر کی طرف سے ایک آدمی لکڑیوں کا بھروٹا[٥] لے کر مجھ سے دُور ایک گھاٹی سے ڈیوس روڈ پر اُتر گیا ہے اور ایک شخص وہیں گٹھا باندھ رہا ہے میں نے پہلے آدمی کا تو پیچھا نہ کیا مگر لپک کے راستہ بچاتا ہوا گھاٹی میں جا چھپا اُس شخص نے زمین پہ بیٹھ کر اُسی ترکیب سے گٹھا اُٹھایا جیسے میں کبھی بکریوں کا چارہ لاتا تھا پھر جلدی جلدی چل دیا۔ جب وہ گھاٹی میں آیا تو میں نے جھپٹ کر راستہ روک لیا اور ڈپٹ کے ساتھ تین چار ہنٹر تسلسل سے جما دئے۔ لکڑیوں کا بوجھ اس کے سر سے گر گیا اور اُس نے لجاجت سے میرے قدم پکڑ لئے۔ میں نے کہا سر پر لکڑیاں اُٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو تو پھر بات ہوگی اس نے وہ گٹھا اُٹھانا چاہا مگر اُس وقت وہ بار اس سے نہ اُٹھ سکا جب میں نے یہ دیکھا کہ واقعی بوجھ زیادہ ہے تو میں نے ہاتھ لگایا اور گٹھا سیر گاہ میں لاکر ڈلوا دیا اور اُسے اُس کے بوجھ کے پاس بٹھا لیا۔

میں: "تم کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟"

وہ: "اجی جناب میں تو خانساماں ہوں اور چھ نمبر کوارٹر میں رہتا ہوں"۔

میں: "لکڑیاں چوری کرنے کیوں آئے تھے اور وہ دوسرا کون تھا؟"

وہ: "وہ کوٹھی کا بیرا ہے ہم دونوں کو پندرہ پندرہ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ اس کے چار بچے ہیں اور میرے چھ۔ وہ تین چار بار یہاں سے لکڑیاں لے گیا اور آج مجھے ساتھ لے آیا کہ کم سے کم لکڑیوں کے دام بچیں گے تو بال بچوں کے کام آئیں گے لیکن وہ مجھ سے

---

٥ بھروٹا:۔ گٹھا

پہلے بوجھ لے کر نکل گیا اور مَیں پکڑا گیا۔"

مَیں: "اب تم جیل سے نہیں بچ سکتے یہ سرکاری مال کی چوری ہے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا اچھا مہربانی کریں کہ میرے گھر خبر کرا دیں۔"

مَیں، "جب تم گھر نہیں پہنچو گے تو وہ خود تمہیں تلاش کریں گے۔ تمہارا ساتھی تو آخر وہیں رہتا ہے نا؟"

سیر گاہ کے دُوسرے نوکر چاکر جاگ چکے تھے اور اس پر لعنت ملامت کر رہے تھے کہ اتنے میں اُس کی بیوی میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس دو ننگے بوچے بچّوں کو ساتھ لئے روتی ہوئی آ پہنچی اور میرے پاؤں پر گر پڑی۔ میرا تو کلیجا پھٹنے لگا لیکن دوسرے تمام نوکر دیکھ چکے تھے کہ مَیں نے چور پکڑا ہے، اس لئے مَیں اُسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر ننگے بچّوں کو دیکھ کر مجھ پر قیامت گزر رہی تھی آخر مَیں نے اُس سے کہا کہ "دیکھو تمہیں اب چھوڑنا تو میرے بس کی بات نہیں لیکن اگر تم یہ وعدہ کرو اور قسم کھاؤ کہ پھر چوری نہیں کرو گے تو مَیں تمہیں بے داغ نکال دوں گا۔" اُس نے بچّوں کے سروں پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ "مَیں زندگی بھر چوری نہیں کروں گا۔" میرا دل تھا کہ پگھلا جا رہا تھا۔ مگر میری پلکوں نے میرے آنسوؤں پر کٹہرے لگا دیئے تھے۔ مَیں نے اس سے کہا "دیکھو جس طرح مَیں کہوں اس طرح کرتے رہنا تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔" اُس نے ہاتھ جوڑ کر "اچھا" کہا اور زمین پر اُکڑوں بیٹھ گیا۔ مَیں نے اُس کے بیوی بچّوں کو یقین دلایا کہ تم گھر جاؤ یہ ڈیڑھ دو گھنٹے تک گھر آ جائے گا لیکن اُنہوں نے تو وہیں ڈھنی دے دی۔ مَیں نے کہا کہ "دیکھو اگر تم یہیں رہے تو مَیں اِسے بچا نہیں سکوں گا، اب آگے تم جانو!" یہ سُن کر وہ ٹھنڈی سانسیں بھرتی ہُوئی اُٹھی اور پاؤں ملتی ہوئی صدر دروازہ سے نکل گئی۔ بچّے دُور تک مُڑ مُڑ کے باپ کی طرف دیکھتے رہے۔ اُس وقت میری جان پر بن رہی تھی ضبط سے مَیں بات نہیں کر سکتا تھا۔

اب دھوپ اچھی طرح پھیل چکی تھی اور سارے زمین سے سرک سرک کر شاخوں کو لپیٹ رہے تھے کہ چودھری سراج الدین گشت کرتے ہوئے آگئے۔ میں نے کہا۔ "حضور آپ کا چور موجود ہے جو چاہیں سلوک کریں۔ یہ یہیں اس بغل والی کوٹھی کا خانساماں ہے اس کے ساتھ اسی کوٹھی کا بیرا بھی تھا جو بھاگ گیا ہے۔"

چودھری نے کہا "اسے لاؤ اور نام وغیرہ لکھواؤ"۔ میں نے اسے چپکے سے کہا "دیکھو نام اور پتہ وغیرہ سب غلط لکھوانا آؤ میرے ساتھ اٹھو!"

چودھری سراج دین:۔ "کیا نام ہے تمہارا؟"

وہ:۔ "سرکار میرا نام شبراتی ہے اور دو نمبر میں خانساماں ہوں۔"

چودھری سراج دین:۔ "دوسرا کون تھا؟"

وہ۔ "حضور اسی کوٹھی کا بیرا تھا۔"

چودھری۔ "اس کا کیا نام ہے؟"

وہ:۔ "نصیب اللہ" جناب!

چودھری: (مجھ سے مخاطب ہو کر) "احسان تم اسے ساتھ لے جاؤ اور اس بیرے کو لاؤ۔ یہ بے ایمان تمہیں بتائے گا اور اسے پہچانے گا۔"

میں:۔ "بہت اچھا! چلا جاتا ہوں۔"

میں اسے ساتھ لے کر سڑک پر آگیا اور کہا "بس اب تم چلے جاؤ۔ میں خود دیکھ بھال لوں گا"۔ وہ تو اپنے بال بچوں میں چلا گیا اور میں تھوڑی دیر گھوم پھر کے چودھری کے پاس جا کھڑا ہوا۔

چودھری:۔ "وہ چور کہاں ہے؟"

میں:۔ "اپنے گھر ہے اور کہاں ہوتا۔"

چودھری:۔ "تم نے کیوں جانے دیا؟"

مَیں :۔ "حضور مَیں تو اُسے پکڑنے کا ذمہ دار تھا، اس سے میری کشتی تو نہیں بدی گئی تھی، میری ڈیوٹی کا تو یہ وقت بھی نہیں۔ یہ تو آپ کی ذمہ داری تھی کہ اُسے پولیس کے سپُرد کرتے یا ہاتھ پاؤں باندھ کر بٹھاتے۔"

چودھری :۔ "بات کیا ہوئی؟"

مَیں :۔ "بات کیا ہوئی، اُس نے کوٹھی میں پہنچتے ہی کہا کہ بیرا یہاں نہیں ہے گھر گیا ہُوا ہے۔ مَیں ذرا اندر اور دیکھ لوں، وہ اندر گیا اور تھوڑی دیر میں ایک انگریز آستینیں چڑھائے نکلا اور کہا "تُم کوٹھی میں کیوں آیا؟" اب بتائیں مَیں کیا جواب دیتا، کیا مَیں اُس سے لڑتا؟"

چودھری :۔ "اچھا دونوں کے متعلق سمن بھجوا دیں گے۔"

مَیں :۔ "ذرا اس معاملے کے قانونی پہلو پر غور کر لیں! اس کی کیا گارنٹی ہے کہ اُس نے دونوں نام صحیح بتائے ہیں، یہ لوگ تو ایسے ہی لُچّے لنگاڑے ہوتے ہیں، اگر نام ہی غلط ہوئے تو پھر؟"

چودھری :۔ "اچھا چھوڑو، اب کی بار ہاتھ آئے تو جہنّم رسید کر دوں گا، رات کو ہوشیاری سے پہرا دو اور جس طرح ہو سکے پکڑ لو!"

مَیں :۔ "مَیں ہوشیاری سے پہرا نہ دیتا تو پکڑتا کیسے، آپ آئندہ ہوشیاری سے سنبھالیں۔"

چودھری :۔ "اب تو میرے کان ہو گئے۔ اب دھوکا نہیں کھاؤں گا۔"

اس کے بعد چودھری صاحب سائیکل لے کر گشت کو نکل گئے اور مَیں سیدھا اپنے گھر پہنچ گیا۔ بڑی دیر تک وہ اور اس کی افلاس میں ڈوبی بیوی اور بچے میری آنکھوں تلے پھرتے رہے۔

اس سبزگاہ میں عموماً خوش ذوق لوگ ہی آیا کرتے تھے اس لئے رفتہ رفتہ میری ملاقات چند[1] اچھے اور بلند ذوق لوگوں سے ہو گئی، شام سے رات کے بارہ بجے تک

---

[1] سردار اللہ نواز خان عارف مرحوم، سردار کریم نواز خان انور، محمد زمان غزنوی، محمد اکرم شامی، محمد ابراہیم بیق، محمد ابراہیم شمیم، مولانا جمیل احمد، محمد سرفراز، عبدالسلام اختر، تاج الدین، شمس الرحیم زتخی، امیر رحمٰن دلوی، حبیب اللہ خان سعدی، منظور احمد وغیرہ۔ ان میں اب کئی بڑے عہدوں پر ہیں

اچھے خاصے سلجھے ہوئے دل و دماغ کے لوگوں کا ہنگامہ رہا کرتا اور وقت گزرتا معلوم نہ ہوتا۔

مخلص منشیر

سیر گاہ کی چوکیداری نے مجھے کئی اچھے اور قابل قدر لوگوں سے ملایا مثلاً ملک حبیب احمد خاں مرحوم، قاضی عبد العزیز صاحب پٹیالوی مرحوم، سید محمد جعفری، اوّل الذکر دونوں رات کے بارہ بارہ بجے تک وہیں میرے پاس ٹاٹ پر بیٹھے رہتے اور اپنی اپنی زندگی کے مختلف واقعات و تجربات ایک دُوسرے کو سُناتے اور میں خاموش بیٹھا استفادہ کرتا رہتا۔ سید محمد جعفری اکثر وہیں آکر مطالعہ کیا کرتے کیونکہ وہ وہاں سے نزدیک ہی ایمپرس روڈ پر نواب بلیس میں رہتے تھے۔ محمد جعفری سے بعض بعض اوقات شعر و شاعری پر گفتگو ہوتی تو وہ کبھی تو مسکرا کر رہ جاتے اور کبھی میری حوصلہ افزائی کرتے۔ لیکن آخر آخر مسکراہٹ کی جگہ تحیّر اور تذبذب نے لے لی تھی۔ پھر مجھے قدر و منزلت کی نظر سے دیکھنے لگے تھے اور اب تک ان کا وُہی خلوص ہے۔

اِس سیر گاہ میں مستقل سیر کو آنے والوں میں سے ایک صاحب تاج الدین نامی بھی تھے، تھے تو وہ میرٹھ کے رہنے والے لیکن اُنھیں لاہور میں جلد سازی کرتے ایک زمانہ ہو گیا تھا، وہ اُن دنوں غالباً گورنمنٹ پریس میں ملازم تھے۔ نہایت نیک سیرت اور بھلے انسان، وُہ عموماً مجھے اس طرح سمجھاتے جیسے بُزرگ اپنے چھوٹوں کی تربیت کیا کرتے ہیں۔

ایک دن نہ جانے کیا ذکر تھا کہ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ دیکھو تم قصبے کے رہنے والے ہو۔ شہر کی بد اخلاقیوں پر کبھی نہ جانا، یہاں کے لوگ عزیز و اقارب کی عزت اور عصمت سے بھی گریز نہیں کرتے ہر بڑا شہر اخلاق کا کمیلا[1] ہے کمیلا! عصمت اور اخلاق کو یہ نظر میں کم ہی لاتے ہیں، یہاں اس بدراہی کو معیوب نہیں سمجھا جاتا کیونکہ یہ سب ایک ہی مرض کے مریض ہیں مگر ابھی بدی کو نیکی کہنے کا ان میں یوتا نہیں۔ یہاں قریب قریب ہر انسان شراب پیتا ہے اور جو نہیں پیتا وہ پینے کی آرزو میں بیتاب ہے یا جواز کا موقع تلاش کر رہا ہے۔

---

[1] کمیلا۔ مذبح۔ جہاں ڈنگر ذبح کیے جاتے ہیں۔

مَیں نے عرض کی "جناب مجھے ان باتوں سے کیا واسطہ؟ یہ تو اُن لوگوں کے اوصاف ہیں جو گھر سے آسودہ اور کھانے کمانے کی فکر سے آزاد ہیں۔ مَیں تو مزدور ہوں اور مزدور بھی تیسرے درجے کا، مجھے چودہ روپے کُل تنخواہ ملتی ہے اور یہ قلیل رقم میرے اچھے خاصے کُنبے کی کفیل ہے، مجھے اس قسم کی سوسائٹی کے جرائم اور گناہوں پر ایمان لانے کے لئے کونسی قوّت مجبور کر سکتی ہے؟ مَیں بھی یہ سمجھتا ہوں کہ اس زمانے میں ایمان فروشی کے بغیر کوئی شخص آسودگی سے زندگی بسر نہیں کر سکتا اور میرے مشرب میں اس سے بڑا جُرم کوئی نہیں! پھر بھلا اس ماحول کا مجھ پر کیا اثر ہو سکتا ہے؟ مجھے تو بھوک میں روکھی سوکھی مل جاتی ہے اور مُرغ و مزعفر کا مزہ دے جاتی ہے۔"

تاج الدین نے اپنی ایک انگلی میری ناک کی سیدھ میں بڑھاتے ہوئے کہا "دیکھو اگر تم عمر بھر یونہی سوچتے اور اسلامی شعار پر کاربند رہے تو یہاں کی مقامی بُرائیوں سے بچے رہو گے اور اگر زبان کے چٹخارے اور جسم کی آسائش کے لئے رُوح کو گدلا کر لیا تو سمجھ لو کہ دین و دُنیا دونوں کھو بیٹھو گے۔"

مَیں نے کہا "جناب آپ کا یہ خیال کیوں ہے؟ کیا میں اپنے بوڑھے ماں باپ کو جنھوں نے مجھے اپنے پاکیزہ خون سے پرورش کیا ہے ضعیفی میں حرام لقمے کھلاؤں گا؟ مجھے شہر کی زرق برق زندگی کی ضرورت نہیں، مَیں ایسا سامان کبھی مہیا نہیں کر سکتا جو میرا رستہ کھوٹا کر دے اور میرے والدین کی عقبیٰ سے روشنی سمیٹ لے! مَیں تو محنت و مشقّت کر کے خدا سے اس کے صلے کی اُمّید رکھتا ہوں، یہی میرا مسلک ہے یہی تعلیم۔"

تاج الدین نے ٹھوڑی سینے کے نزدیک کر کے سر ہلایا اور کہنے لگا "تم تو بڑے راسخ العقیدہ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اچھا اب میں تمہیں احتیاطاً مشورہ دیتا ہوں کہ کوئی اچھی قسم کی دستکاری سیکھ لو یا پھر کوئی چھوٹی موٹی تجارت کر لو اور اس میں اپنا یہی اصول پیشِ نظر رکھو، محنت اور دیانت کے بعد خدا سے اُس کے صلے کی اُمّید رکھنا، بندوں کا حق

ہے! اب تو تم میری نظر میں اور بھی قابلِ قدر ہو گئے ہو، کیونکہ غصّے میں بھی تم انسان نظر آتے ہو اور گرمی میں بھی پٹڑی سے نہیں اُترتے ماں باپ کی خدمت گزاری اور اپنا رستہ، دونوں تمہاری نظر میں ہیں اور سعادت مندی اسی کا نام ہے۔ ایسے آدمیوں کی عزت تو مومنوں والی ہوتی ہے لیکن آخری عمر کے لئے سرمایہ جمع نہیں ہوتا۔ اُس وقت یار دوست دامن کش، اولاد بے پروا اور حکومت بے رحم ہو جاتی ہے، سمجھے نا؟"

مَیں نے کہا "جناب جس نے مجھے اب تک سنبھالا دیا ہے کیا میرے بڑھاپے پر رحم نہیں کرے گا؟ مَیں تو اُسی پر بھروسا رکھتا ہوں جو رحمِ مادر میں پرورش سے غافل نہیں رہا اور پیدا ہونے پر میری عمر، قوّت اور استعداد کے مطابق سامان مہیّا کرتا چلا آ رہا ہے"۔

تاج الدین: "میری دلی دعائیں ہیں کہ خدا تمہارے ایمان میں پختگی اور عزائم کو استحکام عطا کرے۔ مگر مَیں پھر بھی کہوں گا کہ زندگی کے معاشی پہلو کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا اور اکتفا کو نیکی خیال کر لینا معمولی غلطی نہیں ویسے مجھے تم سے اُمید ہے، کہ تم زندگی کے دونوں پلّوں کو برابر رکھ سکو گے، کیونکہ ذرا ذہین اور محنتی معلوم ہوتے ہو۔"

مَیں نے خوش ہو کے کہا "اگر یہ توفیق مل جائے تو سارے دلدر دُور نہ ہو جائیں؛ خُدا آپ کی زبان مبارک کرے۔ میرا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ میں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جاؤں گا۔ مَیں تو مزدور کا بیٹا ہوں اور مزدور ہوں میرا ایمان ہے کہ خُدا اپنے بندوں سے غافل نہیں رہتا۔ وہ جب کیڑے مکوڑوں کی پرورش پوری توجّہ سے کرتا ہے تو مَیں تو پھر بھی انسان ہوں، اُس سے کیسے مایوس ہو جاؤں؟ الحمد للہ کہ میری آرزو جس طرح تھی اب بھی اُسی طرح ہے یعنی ع

ہم فقط رکھتے تھے اک حسرتِ تعمیر سو ہے   غالب

اگر مجھے کبھی ضروریاتِ زندگی میں روپے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے تو بوکھلایا

تو پھرتا ہوں جیسے شام کے قریب کوئی مسافر بانسوں کے جنگل میں گم ہو جائے جہاں ہر جھنڈ ایک دُوسرے سے مشابہت رکھتا ہے اور ہر دڑے میں دوسرے دڑے کی ہو مارتی ہے لیکن اِس کے باوصف آج تک میرا کوئی کام رُکا نہیں رہا یہ سب اُس کا کرم نہیں تو کیا ہے ؟"

تاج الدین نے کہا "تم جواب برائے جواب اچھا بول رہے ہو آگے چل کر کوئی نہ کوئی خاص کام ضرور کرو گے خواہ وہ معمولی کیوں نہ ہو؟"

یہ تاج الدین صاحب ملازم تو ضرور تھے لیکن ان پہ سرمایہ داروں کی فطرت کا دباؤ ایسا تھا کہ وہ بعض وقت اپنے آقا کی برائی اور اپنی بے حسی کا اعتراف کرتے کرتے سب کو لپیٹ میں لے لیتے تھے۔

ایک دن میں کچھ سوچ رہا تھا اچانک تاج الدین آگئے۔ مَیں سلام کے بعد خاموش سوچتا رہا، بس پھر کیا تھا تاج الدین صاحب تو آگ بگولا ہو گئے "مَیں جب بھی آتا ہوں تم خاموش ہو کے بیٹھ جاتے ہو جیسے مَیں تمہاری مخبری کر دوں گا۔"

مَیں نے کہا "جناب زندگی کی سڑک بڑی ناہموار ہے کیا آپ پر کبھی ایسا وقت نہیں آیا کہ میری طرح فکر بند ہوئے ہوں، میری مخبری مجھے کیا سزا دے سکتی ہے میری زندگی کی سزا کچھ کم ہے جو مجھے مل رہی ہے؟"

تاج الدین "زندگی تو اسی کا نام ہے لیکن کسی سے خاموشی کا سبب دریافت کرنا کوئی گناہ تو نہیں۔"

مَیں "کیا بتاؤں کیا سوچ رہا تھا بس یہی جو چاروں طرف ہو رہا ہے۔ شراب خوار زانی، ریاکار اور بے ایمان لوگ آسودہ ہیں اور ہمیں پیٹ بھر روٹی بھی بمشکل تمام میسّر آتی ہے، یہ کیوں ہے اور ایسا کب تک رہے گا؟ دیکھتے نہیں؟ لاکھوں بدنصیبوں پر چند خوش نصیب مسلّط ہیں۔ آخر یہ خدا کا منشا ہے یا ہماری کوتاہی؟ آپ نے بھی تو کبھی اِس رُخ پر سوچا ہو گا؟"

ہو۔ مشابہت۔ ہم صورتی۔ بمشکل۔

تاج الدین: "یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے، ارے میاں خدا نے کائنات میں سب کچھ انسان کے لئے پیدا کیا ہے، اب نعمتوں کی تقسیم انسانوں کا کام ہے اور اس کے طریقے پیغمبر آخرالزماں صلعم نے بتا دیتے ہیں۔ اصل میں یہاں تو بے انصافیوں نے طاقت کے ساتھ ساز باز کر لی ہے، اس لئے جگہ جگہ شریف دشمنی کے ادارے کھلے ہوئے ہیں، سیدھے سادے مزدور اور کسان ان کی صورتوں، لباسوں اور تقریروں کا فریب کھا کر مارے جاتے ہیں۔ ان لوگوں سے اِس بے انصافی اور ریاکاری کا مواخذہ ضرور ہوگا۔ اغراض و مقاصد کے لئے دائرۂ انسانیت سے نکل جانے والوں کو قدرت کبھی معاف نہیں کرے گی۔ سوچو تو سہی، تاریخ انسانی میں جس قدر جنگیں ہوئی ہیں اس تعداد میں کتوں، بھیڑیوں یا کسی بھی قسم کے درندوں کو اس بے رحمی سے لڑتے، حقوق غصب کرتے اور خون بہاتے دیکھا ہے؟ یا سنا ہے؟ توبہ توبہ"

تاج الدین نے بولتے بولتے میری طرف دیکھا جیسے قریب رکھے ہوئے ہیٹر کا سوئچ کھول کر بند کر دیا جائے۔

مَیں: "اس انسانوں کی بے انصافی اور دولت کی غلط تقسیم کا بھی کوئی علاج ہے یا نہیں؟ ایک مدت سے ہماری نسلیں تو اسی طرح گھسٹ گھسٹ کر مرتی چلی آرہی ہیں۔ اگر قدرت نے ان سے کبھی مواخذہ بھی کیا تو آخر ہم لوگوں کو کیا فائدہ ہوگا؟ ہماری زندگی تو ہر لمحہ اُبھرتی ہوئی ڈِیک* اور لپلپاتے ہوئے شعلوں سے دوچار رہے گی نا؟"

تاج الدین: "ارے بھائی پھر کیا کیا جائے، تمہارا مقصد یہ ہے کہ میں بغاوت کردوں؟ اپنے پریس کے افسر کو قتل کرنے کی ٹھان لوں؟ کون نہیں جانتا کہ یہ نسل غلامی کے چکّر سے بمشکل ہی نکلے گی۔ یہاں کے سرمایہ داروں کی چالبازیوں اور قانون کے خلاؤں کو بھولے بھالے عوام کیا دیکھ سکتے ہیں اور دیکھ بھی لیں تو دولت پرستی اور حکام رسی نے ان کے گرد طلسمی دیواریں کھینچی ہوئی ہیں۔ اگر پس ماندہ طبقہ سوچنے لگے تو آسانی سے سمجھ

---

* ڈیک۔ لپک۔ آگ کے بلند ہوتے شعلے۔

میں آ جائے گا کہ طبقۂ اوّل تمام کا تمام اس میں اوچھے تاجر ہوں یا نااہل حکام، جاگیردار ہوں یا جتھے بند، سب غریبوں اور مزدوروں کا لہو پی کر نشوونما پاتے ہیں اور انہی طاغوتیوں نے مفلسوں اور ناداروں کو زندگی کی ضروریات کم کرنے پر مجبور کر رکھا ہے۔ بیچارے نہ اچھا کھا سکتے ہیں نہ اچھا پہن سکتے ہیں بعض اوقات تو یہ اپنے خون کے معاوضے سے بھی محروم کر دیئے جاتے ہیں، رات دن محنت اور مشقّت کے باوجود ان کے لہو کا تمام سونا یا تو ٹھیکیدار لے جاتا ہے یا پھر دولت مندوں، حاکموں اور تاجروں میں تقسیم ہو جاتا ہے طبقۂ اوّل کے لوگوں میں آئے دن زندگی کی ضروریات میں زیورات اور سامانِ آرائش کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور رات دن محلّے محلّے معیارِ زندگی بڑھانے کے لئے تقریریں ہوتی رہتی ہیں۔ ان سے کوئی پوچھنے والا نہیں کہ بیچارے غریب معیارِ زندگی کیسے بڑھائیں؟ اُن کے معیارِ زندگی کی رُوح تو موٹروں، موٹر سائیکلوں اور دیگر آرائشی سامان کی خریداری میں چلی جاتی ہے پھر اُنھیں کہاں سے اتنا مل جائے گا کہ وُہ اپنی ضروریاتِ زندگی کا معیار اونچا کر لیں گے؟ دیکھنے کو تو قومی ادارے قائم ہیں۔ اسکول اور کالج بھی کھلے ہیں لیکن تعلیم اس قدر مہنگی کہ صرف اہلِ سرمایہ کے بچے ہی تعلیم پا سکتے ہیں اور علاج اس قدر گراں کہ مریض زندگی کے نام سے موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں مجبُوراً یہ کہنا پڑتا ہے کہ تعلیم و ترقّی کے حقدار ہیں تو سرمایہ پرست، امراض سے محفوظ ہیں تو دولت مند، دوائیں ایجاد ہوتی ہیں تو اہلِ سرمایہ کے لئے اور اسکول یا کالج کھُلتے ہیں تو تاجروں یا جاگیرداروں کے لئے کسی غریب فرد یا جماعت میں اتنی سکت نہیں کہ اس راستے کو جھاڑیوں سے بند کر دے کئی مزدور لیڈر مزدوروں کی ہمدردیاں بگھارتے پھرتے ہیں، کوئی اُن سے پُوچھے کہ کبھی اپنی لڑکیوں کو لاکھوں کا جہیز دینے والے اور کوٹھیوں میں ایک ایک رات میں ہزاروں کی روشنی صرف کر دینے والے بہروپیوں کے خلاف کوئی جلوس نکالا ہے؟ یا کوئی جلسہ کیا ہے؟ کیا یہ ہمارے معاشرے کا اندھاپن نہیں ہے؟

آج عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش چلنے اور برابر کے حقوق لینے کی سعی کر رہی ہیں ، آئے دن عدالتوں میں طلاق نامے پیش ہوتے رہتے ہیں ، کوئی کہتی ہے کہ شوہر میرے مصارف کا کفیل نہیں ، کسی کو شکایت ہے کہ بیوی کے ہوتے دُوسری عورت سے آشنائی رکھتا ہے ، کسی کو شکوہ ہے کہ اپنے باپ دادا کا راستہ چھوڑ کر چلنے لگا ہے ۔ مَیں دریافت کرتا ہوں کہ کیا عدالت میں ایسے طلاق نامے بھی آتے ہیں جن میں شوہر کی دروغ بافی ، رشوت ، نا انصافی ، بے ایمانی ، ملاوٹ یا شراب نوشی کو بنائے طلاق قرار دیا گیا ہو ۔۔ میرا خیال ہے کہ نہیں ، اور اگر ہیں تو خال خال ، کیونکہ یہاں مذہب رتوندی میں مبتلا ہو گیا اور اخلاق کرائے کی چیز ہو کے رہ گیا ۔ یہ لوگ انسانیت سے دامن بچانے لگے ہیں اور عقبیٰ کی طرف سے ان کی آنکھیں مُند گئیں ہیں ۔"

تاج الدین غصّے میں سُرخ ہوا جا رہا تھا اُس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا اور بدن کانپنے لگا ۔" مَیں نے کہا جناب ٹھنڈا پانی پیجئے زیادہ گرم ہونا اچھا نہیں ، مجھے اور آپ کو ابھی جیل خانہ راس نہیں آئے گا ۔ اگر ہو سکے تو پس ماندہ طبقے کو صرف تعلیم سے بہرہ مند کریں ۔ مجھے اگر خُدا نے توفیق دی تو میں زندگی بھر غریبوں اور ناداروں ہی کی فلاح و بہبُود پر سوچوں گا اور خصوصاً تعلیم پر زور دوں گا ۔ جس سے اُن میں گندی بلندیوں اور مقدس پستیوں کا احساس دا فتیاز پروان چڑھے" اتنے میں ایک شخص ریوڑیوں کا خوانچہ لے کر گزرا اور تاج الدین نے دو آنے کی ریوڑیاں لے کر آدھی آدھی بانٹ لیں اور اوٹ پٹانگ گفتگو ہونے لگی ۔

اس وقت میری شاعری ذرا توجہ سے سنی جانے لگی تھی اور شاعر کی حیثیت سے عوام میں ذکر و اذکار رہنے لگے تھے میری یہ ہنگامہ پرور زندگی یا تو کسی کارپوریشن کے افسر کی نظر میں کھٹکی یا مزدوروں میں سے کسی نے شکایت کی کہ ایک دن اچانک میری چوکیداری کی اسامی تخفیف میں آگئی ، میرا کام دوسرے بیلداروں کو دے دیا گیا اور مَیں پھر

رتوندی :۔ شب کوری جسے رات کو نظر نہ آئے (اندھراتا)

بے روزگاری کی لپیٹ میں آکر پہلے کی طرح سرگرداں رہنے لگا۔

درزی خانہ

چوکیداری کے بعد مجھے کوئی کام نہ ملا، جب بے روزگاری میں کئی روز ہوگئے تو میں دھنی رام روڈ انارکلی میں ایک درزی کی دکان پر منشی کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ آس پاس کے دکاندار مجھے نکل پالش کے زمانے سے جانتے تھے جب بھی کسی سے ملاقات ہوتی بڑی خوش خلقی سے پیش آتا۔

مستری عبدالرحمان تو خصوصیت کے ساتھ مجھ پہ مہربان تھے اور کئی بار انھوں نے کہا، کہ مجھے کوئی خدمت بتاؤ اگر کچھ رقم کی ضرورت ہو تو وہ بھی حاضر کرسکتا ہوں، جو واپسی کے لئے نہیں ہوگی، میں اسے ایک دوست کی خدمت خیال کروں گا مگر میرے یہاں اس بارِ احسان کی جرأت کہاں تھی؟

یہ دکان کیا تھی ایک بڑا درزی خانہ تھا وہاں سلنے والے تمام کپڑوں کی ترتیب اور سلیقے سے رکھنا اسلائی کابل بنانا اور گاہکوں کو نکال کر دینا میرا کام ٹھہرا تھا، وہاں میں نے غالباً ڈیڑھ ماہ کام کیا اور پھر طبیعت ایسی اُکتائی کہ دکان کے ماحول میں ایک ایک پل گزرنا مشکل ہوگیا کیونکہ وہاں کی ہنگم مصروفیت نے میرا مطالعہ چھین لیا تھا نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات کہ میں نے ملازمت سے علیحدگی اختیار کرلی۔ اصل میں میری نظر میں شہری گلیوں کی کثافتیں اور بازاروں کی دروغ بافیاں جچتی ہی نہیں تھیں، تاجروں کے خودغرضانہ حربے اور اُن کی جھوٹی آبرو کی کھوکھلوں میں انڈے سینے والی مُردار خواہشیں کبھی میرے احاطہ انتخاب میں نہیں آئیں بعض اوقات اگر میں اس طرف توجہ کرتا اور روزی کی تلاش مجھے اُدھر متوجہ کردیتی تو میری ناف کی کوڑی سے ابکائی اُچھل پڑتی اور میں اپنے سے شرمندہ ہوکر کسی دوسری طرف سوچنے لگتا۔

اب فراغت ملی تو میں شام کو اپنی اُسی سیرگاہ میں تفریح کے لئے جانے لگا جب میں وہاں پہنچتا تو وہاں کے تمام بیلدار میری عزت کرنے اور محبت سے پیش آتے

آج بھی جب مَیں اُس طرف کو نکل جاتا ہوں اور اپنے ہاتھوں کے لگائے ہوئے درختوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے ایک مسرّت سی ہوتی ہے۔ کیونکہ وُہ بھی میری طرح ہی راہِ حیات پر گامزن ہیں اور نیکی کے معاملہ میں مجھ سے کہیں زیادہ۔ وہ اپنے سائے کی تقسیم کے معاملہ میں دوست دشمن کا امتیاز نہیں کرتے اور بلا معاوضہ خدمتِ انسانی میں محو ہیں۔ چلچلاتی دُھوپ ہو یا کڑکڑاتی سردی وہ برابر راتوں کو عبادت اور دن بھر انسانی خدمت میں منہمک رہتے ہیں اور یہ مقام مجھے میسّر نہیں۔

اب وہ موقع آگیا تھا کہ بہت سے نوخیز شاعر اصلاحِ شعر کے لئے مجھ سے نزدیک ہونے لگے تھے حالانکہ مَیں خود کو تادمِ تحریر محتاجِ اصلاح خیال کرتا ہوں لیکن اپنے سے کم استعداد کے لوگوں کو راستہ بتانے میں بُخل نہیں کرتا ہاں اس بات کا خیال رکھتا ہُوں کہ کوئی طالب علم شاعری کی راہ پر نہ آئے میرا خیال ہے کہ شاعر ہو کر انسان بمشکل تمام ہی دُنیا کے کام کا رہتا ہے چنانچہ بہت سے طالب علموں کو میں خود شعر کہہ دیتا تھا لیکن ان کے اشعار کی اصلاح کر کے ان کی شعری تربیت کو گناہ خیال کرتا تھا۔ مجھے یہ خیال ہوتا تھا کہ شاعری سے نہ جانے کون سا صالح دماغ اُلجھن میں پڑ جائے اور انسانیت کو نقصان پہنچے کیونکہ میں آج تک ماحول اور معاشرہ کے لئے صالح دماغوں کی کمی شدّت سے محسوس کرتا ہُوں اور نوجوان دوستوں کو شاعری جیسے فنِ لطیف کی طرف نہیں آنے دیتا، اور جن میں شعری ذوق مُنہ زور ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔

امرتسر کا ایک مشاعرہ

ابھی میری شاعری کُرینڑ سے نہیں نکلی تھی اور خیالات و تصورات نئی کلیاں نکال رہے تھے کہ امرتسر سے بزمِ سروش کا دعوت نامہ موصول ہُوا، اس سے مجھے خوشی تو اس لئے ہوئی کہ مَیں مشاعرے کے قابل سمجھا گیا اور تشویش اس لئے کہ وہاں تک آمد و رفت کے مصارف اپنے کیسہ سے جائیں گے اس سے زندگی کی دوسری ضروریات روکنا پڑیں گی لیکن مَیں نے جی کڑا کر کے مشاعرے

کُرینڑ :- پرندوں کا وُہ موسم جس میں پرانے پَر جھڑ کر نئے پَر نکلتے ہیں۔

میں شرکت کی ٹھان لی، چونکہ یہ دعوت نامہ مجھے مشاعرے سے ایک ہفتہ پہلے مل چکا تھا اس لئے اب جو دن انتظار میں گزر رہے تھے وہ کامیابی اور ناکامی کے تصوّرات و خیالات پر گامزن تھے۔ آخر مشاعرے کا دن آگیا اور میں ایک کالی کھدّر کی شیروانی پہن کر امرتسر کی لاری میں سوار ہوگیا۔ راستے میں لاریوں کی آمد و رفت سے اس قدر گرد اڑ رہی تھی کہ امرتسر تک جاتے جاتے میری کالی شیروانی بھورے رنگ میں بدل گئی اور راستے کی دُھول نے میرے چہرے کو اور بھی دلکش بنا دیا۔

یہ مشاعرہ ٹاؤن ہال میں منعقد تھا۔ اسٹیج پر شیخ سر عبدالقادر صاحب اور راجا نریندرا ناتھ فروکش تھے۔ میں وہاں پہنچا تو ہال آدمیوں سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا، میں نے ہر دروازے کے اجارہ دار کو دعوت نامہ دکھایا لیکن میری ہیئت کذائی سے کسی کو بھی میرے شاعر ہونے کا یقین نہ آیا، اور سب نے مختلف انداز میں ایک ہی جواب دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ ہمیں بیوقوف بناتا ہے؛ اپنی رائے سے جب میں شاعروں والے دروازے کی طرف گیا تو ایک نے دُوسرے کو مخاطب کیا "آپ سے ملاقات کیجئے آپ مشاعرے کی شرکت کے لئے اُترے ہیں۔"

جب میں مایوس ہوگیا تو ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا اور سوچنے لگا کہ یہاں تو مشاعرے کی شرکت کے لئے بھی پوزیشن کی ضرورت ہے اکاش مجھے پہلے سے معلوم ہوتا، اب اگر غزل نہ پڑھی گئی تو آنے جانے کا کرایہ بھی گیا۔

لوگوں کی پارٹیاں کی پارٹیاں آرہی تھیں اور چہروں کے اُجلے پن کے علاوہ لباس کی نمائش بھی باعثِ افتخار تھی، جب میں نے یہ حال دیکھا تو ایک غول کے ساتھ میں بھی اندر داخل ہوگیا لیکن ہال میں ابھی ایک قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ دروازے کے فرشتے نے میری گردن پر ہاتھ ڈال دیا اور ایسا دھکا دیا کہ میں برآمدے سے باہر آکے رُکا، اب مجھے ایک اور خیال پیدا ہوا کہ جس مشاعرے کے دروازے پر یہ حال

ے مسلمانوں میں شیخ عبدالقادر اور ہندوؤں میں راجہ نریندر ناتھ معزز شخصیتیں شمار ہوتے تھے۔

ہے تو اندر شعراء کی دھڑے بندی کس معیار کی ہوگی، اور وہ نہ جانے کیا مظاہرہ کریں اس لئے کیوں نہ لاہور واپس ہو جاؤں؟ بے کار وقت کھونے سے کیا فائدہ؟ اس خیال کا آنا تھا کہ میرے قدم خود بخود باہر کی طرف اُٹھنے لگے۔ میں ابھی دو چار قدم ہی چلا تھا کہ ایک خوش وضع اور خوش پوش انسان مشاعرے کی طرف آتا ہوا ملا۔ میں نے سوچا یہ ضرور کوئی مشاعرے کی بزم کا رکن ہوگا، میں اس کی طرف بڑھا اور پوچھا کیا آپ مشاعرے میں جا رہے ہیں جناب کا اسم شریف؟ میرا نام ڈاکٹر شفاعت علی ہے۔ کیوں کیا بات ہے؟ میں نے انھیں وہ دعوت نامہ دکھایا اور کہا۔ میں لاہور سے آیا ہوں اور یہاں اس قدر گڑبڑ ہے کہ مجھے کوئی مشاعرہ گاہ میں گھسنے نہیں دیتا! انھوں نے دعوت نامہ دیکھ کر مجھے اپنے ساتھ لے لیا اب دروازے کے فرشتے نے کچھ نہیں کہا اور میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ مشاعرے میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر شفاعت علی نے میرا نام فرخ امرتسری کو بھجوا دیا اور اشارے سے بتا بھی دیا کہ وہ شخص ہے جو بیچ کے کونے پہ کھڑا ہے۔

فرخ صاحب مشاعرے کے اسٹیج سکریٹری تھے انھوں نے عینک اٹھا کر میری طرف دیکھا اور تیوری چڑھا کر خاموش ہو گئے، اس مشاعرے میں اچھی غزل کے لئے ہندو مسلمانوں نے مل کر نقرئی اور طلائی میڈل بھی رکھے تھے۔ ایک میڈل مسلمانوں نے رکھا تھا ایک ہندوؤں نے، اسٹیج پہ دو آدمی اور بھی تھے جو ہر غزل پر چپکے چپکے آپس میں گفتگو کرتے جاتے تھے، عوام تھے کہ حسبِ توفیق داد اور بیداد دونوں میں فراخ دلی سے کام لے رہے تھے۔ جب مشاعرہ رنگ پر آگیا اور اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری جیسے لوگوں کے اسٹیج پہ آلے کے امکانات نظر آنے لگے تو سامعین بھی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اب میں نے سمجھ لیا کہ اسٹیج سکریٹری مجھے پڑھنے کا موقع نہیں دے گا، تو میں کرسیوں کے درمیانی راستے سے سرک سرک کر اسٹیج تک پہنچ گیا اور فرخ صاحب سے عرض کی کہ مجھے پڑھوا دیا جائے میں لاہور سے حاضر ہوا ہوں۔ فرخ صاحب نے جواب دینے کے

بدرے میرے سر پہ ہتھیلی رکھ کر اس زور سے دبایا کہ میں بیٹھتا ہی چلا گیا، اُن کے اس سلُوک سے میں تھوڑی دیر تک تو خاموش رہا لیکن پھر گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر وہی عرض کی۔ فرّخ صاحب نے پھر وہی دباؤ کا نسخہ استعمال کیا۔ اس وقت میر منظور و کی وارثی نے فرّخ صاحب سے آہستہ آہستہ کچھ کہا، جس سے وہ پہلے تو کچھ منہ سا بناتے رہے پھر ذرا چمک کر کہنے لگے اچھا آپ کہتے ہیں تو پڑھوا دیتا ہُوں، میر منظور و کی بیٹھ گئے اور فرّخ صاحب میرے سر پہ چٹکی مار کر کہنے لگے غزل دکھاؤ کیا لے کے آئے ہو؟ میں نے سنجیدگی سے کہا کہ میں آپ کی غزل سُن چکا ہُوں اور آپ سے اچھی غزل کہتا ہُوں، فرّخ صاحب کو غُصّہ آگیا اور سٹیج پر جا کر فوراً میرے نام کا اعلان کر دیا اور مجھے چپکے سے کہا "چل تیری خبر لوگ ہی لیں گے، وہیں گت بنے گی۔"

میں پیشانی پر گرد اور پلکوں پہ زرد دھول لئے شیروانی کے دامن جھاڑتا ہُوا اسٹیج پر پہنچ گیا۔ میرا اسٹیج پر آنا تھا کہ تالیوں اور سیٹیوں کی مِلی جُلی آواز سے لوگوں نے ہال سر پر اُٹھا لیا۔ ایک من چلے نے دُور سے آواز دی "ملائی کا برف" دُوسرے نے کہا مقطع پڑھیئے! تیسرا بولا خوب منگایا ہے، اس ہنگامے میں فرّخ صاحب منہ میں رومال لئے میری طرف کو گردن مٹکا رہے تھے اور میں اس وقت خود کو اسٹیج پر اُس مجرم کی طرح محسُوس کر رہا تھا جس نے پُوری قوم کے کسی خاص پروگرام میں رخنہ اندازی کی ہو۔

جب یہ سیلاب تعارف نہ رُکا تو سر عبدالقادر صاحب اُٹھے اور میز پر زور سے دستک دے کر فرمایا "حضرات بس آپ کی تفریح ہو چکی ہے وقت میں اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا اب شعر سُنیئے۔"

میں مشاعرے کے رُخ اور سامعین کی طبیعتوں کا اندازہ لگا چکا تھا کہ یہاں شعر کی رُوح کو کم اور نغمہ کی جھنکار کو جاننے والے زیادہ ہیں، چنانچہ میں نے ترنم میں اپنی غزل کا مطلع پڑھا، مطلع سرزد ہونا تھا کہ مجمع پر ایک سکوت کا عالم طاری ہو گیا اور دُوسرے

شعر پہ داد و تحسین کے ڈونگڑے برسنے لگے، مَیں نے غزل ختم کی اور مقطع پڑھ کر وہیں نیچے زمین پہ جا بیٹھا۔ عوام نے مکرّر مکرّر کے شور سے خلا کو بھر دیا۔ شیخ عبدالقادر صاحب اُٹھے اور یہ مشہور شعر پڑھا:

ہر بیشہ گماں مبر کہ خالیست
شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

مشاعرہ چلتا رہا آخر میں اختتام سے کچھ پہلے شیخ صاحب نے اعلان کیا کہ بزم سرورش نے جو اچھی غزل کے لئے میڈل رکھا ہے اس کے مستحق احسان صاحب قرار دئے گئے ہیں میں اُن سے ایک اور غزل کی فرمائش کرتا ہوں اس وقت میرا یہ عالم تھا کہ جیسے آنسو آنکھوں سے پلٹ کر دل پہ ٹپک رہے ہوں، مَیں اُٹھا اور دُوسری غزل ادا کی جب میں نے غزل کے مقطع کا اعلان کیا تو فوراً ایک آدمی اسٹیج پر آیا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اعلان کیا کہ ہم دوسرے میڈل کا بھی (جو ہندوؤں کی طرف سے تھا) مستحق احسان صاحب ہی کو سمجھتے ہیں شیخ صاحب نے مجھے ایک اور غزل کے لئے مجبور کیا، اور سامعین نے تائید کی، مَیں نے اُن کے ارشاد کی تعمیل میں تیسری غزل پڑھی، ابھی غزل ختم نہیں ہوئی تھی کہ ایک سردار صاحب اُٹھے اور شیخ صاحب سے کچھ کان میں کہہ کر اپنی جگہ جا بیٹھے اُن کے فوراً بعد شیخ صاحب نے کھڑے ہو کر کہا کہ ہمارے بھائی سردار صاحبان نے مجھ سے کہا ہے کہ میڈل کا تو اب وقت نہیں ہم احسان صاحب کی خدمت میں بیس روپے کی حقیر رقم پیش کرتے ہیں، مَیں بیس روپے کی رقم کا اعلان سُن کر خوش ہُوا، کیونکہ وُہ تو میری ڈیڑھ ماہ کی تنخواہ کے برابر تھے لیکن رسماً قبول کرنے میں پس و پیش کرنے لگا، سر عبدالقادر صاحب نے فرمایا کہ یہ خلوص کی چیز ہے اور اس کا مقام میڈلوں سے بلند ہے اس سے انکار نہ کرنا! میں خاموش ہو گیا۔ سونے اور چاندی کے تمغوں اور نقد انعام کے علاوہ مجھے اس مشاعرے میں بزم سرورش کی طرف سے "شاعر فطرت"

کا خطاب بھی دیا گیا۔[1]

مشاعرہ ٹوٹا تو فرخ صاحب نے مجھے سینے سے لگا لیا اور اپنی کم توجہی کی معافی چاہی، میر منظور دلی وارثی مجھے اپنے مکان پہ لے گئے، یہ امرتسر کے ایک معزز خاندان کے فرد ہیں، شعر بھی خوب کہتے ہیں اور فراخ دل ہونے کے باعث دسترخوان بھی وسیع رکھتے ہیں۔ میر منظور دلی سے اُس رات کی ملاقات عمر بھر کی ملاقات ہو گئی۔ وہ آج کل لاہور میں ہیں اور اُنہی شریف مہاجرین میں شمار ہیں جو افسروں کے دروازوں کی ذلّت برداشت نہیں کر سکے اور حق گوئی کی سزا بھگت رہے ہیں۔

دوسرے روز پھر مشاعرہ ہوا اور توقّع سے زیادہ حوصلہ افزائی ہوئی۔ اس کے بعد امرتسر میں آنا جانا ہو گیا اور کئی شاعر طبع اور شعر پسند ہمدرد پیدا ہو گئے۔

پہلی جھرجھری

اسی اثناء میں ایک دن میں سودا سلف کے لئے بازار گیا تو یہیں قلعہ گوجر سنگھ میں محمد عمر خاں اور سلیمان خاں کی بیٹھک میں ایک نوجوان عبدالحیٔ نامی سے ملاقات ہوئی۔ اُس نے چند منٹ رواروی میں مجھ سے گفتگو کی وہ چبلا لڑکا نہیں تھا بلکہ اچھا نستعلیق قسم کا انسان اور بلند ذوق لوگوں کی صحبتیں اُٹھاتے ہوئے۔ اس نے میرے متعلق نہ جانے کیا سوچا اور کیا اندازہ لگایا ہو گا۔

مَیں اُٹھ کر چلا تو وُہ آپ ہی آپ میرے پیچھے پیچھے ہو لیا، جب مَیں سودا سلف خرید کر اپنی قیام گاہ پر جانے لگا تو اُس نے بڑھ کے مرچ مصالحے کے لفافے اور آٹے کا کنستر اُٹھا لیا مَیں نے منع بھی کیا لیکن اُس کی مخلصانہ ضد نے مجھے خاموش کر دیا، وُہ گھر تک سامان لایا اور کہنے لگا "میاں یہ جگہ تو ہم سے بہت قریب ہے، مَیں تو اب روز آیا کروں گا"!

عبدالحیٔ پتلا دُبلا بادامی رنگ اور لچکیلے بدن کا نوجوان تھا دانت چمکیلے گتھی بتیسی

---

[1] خطاب کا اعلان امرتسر میونسپل کمیٹی کے وائس پریذیڈنٹ رائے بہادر پرکاش چند مہرہ نے کیا اور تمغوں کا اعلان سردار سوہن سنگھ بارایٹ لا اور رائے بہادر گوربخش رائے سیٹھی نے کیا۔

سیاہی مائل شربتی آنکھیں، آواز میں لوچدار پیسے کے ساتھ ایک نسائی کھنک، اور چال میں فنر جیسی لپک! اُس وقت تو وہ چلا گیا، لیکن شام سے بہت پہلے پھر آ گیا اور کہنے لگا، "آج آپ کا کھانا مَیں پکاؤں گا"، مَیں نے کہا "بھئی مَیں تو مزدور ہُوں اور معمولی کھانا کھاتا ہوں جس کی تیاری میں مجھے کوئی کسالا نہیں اُٹھانا پڑتا اس لئے میں تُمھیں کیوں تکلیف دُوں"؟ اُس نے کہا "جناب کھانا اور پکانا بہت کم لوگ جانتے ہیں، آپ میرے ہاتھ کا کھانا کھا کر خوش ہوں گے"! مَیں نے اُس کی خوشی کے لئے خاموشی اختیار کر لی اور وہ ہنڈیا چولھے میں لگ گیا۔

اُس نے ماش کی دُھلی دال اور چپاتیاں پکائیں اور ایسی پکائیں کہ میں ہکا بکا رہ گیا، مَیں نے کہا "عبدالحیٔ تم تو کھانے پکانے میں بڑے صاحبِ فن معلوم ہوتے ہو، تم نے تو کھانا پکانے میں کمال کر دیا، گھر سے نکل کر آج عرصے کے بعد اچھا کھانا میسّر آیا ہے تم کہیں ہوٹل کیوں نہیں کھول لیتے" وہ تھوڑی دیر تو خاموش رہا اور پھر بڑی جیتی جاگتی آواز میں کہنے لگا "جناب مَیں تو شاہی کھانے پکانا جانتا ہوں مگر طبیعت بڑی نازک پائی ہے، مَیں اپنے وطن میں ایک جگہ ملازم تھا، مگر لوگ ملازموں سے جو برتاؤ کرتے ہیں، مَیں اُس کا متحمّل نہیں ہو سکتا، اسی لئے میری کسی سے بنتی نہیں اور پریشان ہوں! اب جب تک میں بیکار ہوں، آپ کا کھانا پکایا کروں گا اور مجھے اس سے خوشی ہوگی" مَیں نے گھبرا کر کہا "میاں مجھے باورچی کی کیا پڑی ہے مَیں تو اس قدر قلیل آمدنی کا انسان ہوں کہ اکثر ضروریں مُنہ دیکھتی رہ جاتی ہیں اور وقت گزر جاتا ہے۔

عبدالحیٔ:۔ "میاں گھبرا کیوں گئے، مَیں کیا آپ سے تنخواہ لُوں گا؟"

مَیں:۔ "لیں یا نہ لیں جو بات کان میں ڈالنا تھی ڈال دی۔"

عبدالحیٔ:۔ "آپ اپنے یہاں آنے والوں کو اپنے اشعار تو سُناتے ہو گے نا؟ بس مَیں بھی سُن لیا کروں گا اور یہ معاوضہ مجھے بہت ہے!"

---

۵ کسالا:۔ مشکل، تکلیف۔

القصہ اُس کا اصرار اس قدر بڑھا کہ مجھے شرمندگی کے ساتھ خاموشی اختیار کرنا پڑی، مگر ذرا سی دیر کے بعد مَیں نے کہا "ایک بات تُم میری بھی مان لو، کھانا میرے ساتھ کھایا کرو۔"

عبدالحیٔ: "منظور! یہ تو میرے لئے نعمت ہے بس کام بن گیا۔"

اُس دن سے عبدالحیٔ نے گھر کا تمام کام اپنے ہاتھ میں لے لیا، جھاڑو دینے پانی لانے، مصالحہ پیسنے، آٹا گوندھنے، پیوند لگانے اور بٹن ٹانکنے سے میرا کوئی واسطہ نہ رہا۔

اُس نے پہلے ہی دن بریانی تیار کی، جب مَیں نے پُوچھا "یہ سامان کہاں سے آیا" تو وُہ بولا "آپ پروا نہ کریں، ہزار ڈیڑھ ہزار روپے میرے پاس ہیں، جب تک چلیں گے۔ اسی طرح کام ہوتا رہے گا، اس کے بعد وُہ مالک ہے! ہمارا خُدا کا دل تو نہیں گیا۔"

مَیں نے کہا "عبدالحیٔ یہ نباہ کی صورت نہیں مجھے خراب کرنے کی کوشش نہ کرو اگر کچھ تعلقِ خاطر رکھتے ہو تو جو کھانا مجھے میسّر آتا ہے وہی کھاؤ۔ میں زبان کے چٹخاروں کا عادی نہیں" اُس نے سُن کر گردن جُھکا لی اور ناتواں لہجے میں کہا "اچھا پھر جو آپ کی مرضی۔"

عبدالحیٔ روز آتا رہا اور کھانا پکاتا رہا جب ہم دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے تو وُہ بڑی خوشگوار فضا پیدا کر دیا کرتا اور اس میں اُسے ملکہ حاصل تھا، وُہ عموماً زمینداروں تاجروں اور افسر قسم کے لوگوں کے گھریلو واقعات سُنایا کرتا اور مَیں بڑی دلچسپی سے سُنتا۔

اُسے میرے یہاں آتے جاتے پندرھواڑا ہی گزرا ہوگا کہ ایک دن علی الصبح سوُرج کوئین میری کالج کی چھت سے اُبھر رہا تھا اور اس کی کرنیں نارنجی روشنی کے فوارے کی طرح اُبل رہی تھیں جیسے زمین دُور سے آسمان کے نیلے فرغل پر سُرخ رنگ کی پچکاریاں مار رہی ہو! عبدالحیٔ کی عدم موجودگی میں اچانک ایک شریف صورت انسان تشریف لائے، اور تعارف بعد کہا "مَیں آپ کی خدمت میں نگینے سے حاضر ہُوا ہُوں۔"

مَیں: "میرے لئے خدمت؟"

حکیم صاحب جانے کب سے بھرے ہوتے تھے، ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے

ساری ڈاڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔

مَیں نے عرض کی "جناب کچھ فرمایئے تو سہی، آپ کو کیا تکلیف ہے میں تو پریشان ہو گیا ہوں! اور میرے کام پر جانے کا وقت بھی نزدیک آ رہا ہے۔"

حکیم صاحب نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا "آپ کے یہاں جو عبدالحی ملازم ہے۔"

مَیں نے وہیں روک کر عرض کی "جناب میرا ملازم نہیں آقا ہے آقا! اس سے آپ کو کچھ شکایت ہے؟"

حکیم صاحب "ارے صاحب یہی تو اُس ظالم کا فن ہے، اس سے آگے وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتے تھے مگر کنّی کاٹ گئے اور ذرا سنبھل کر بولے "ارے صاحب، اُس کے بغیر تو میرا تمام کاروبار چوپٹ ہوا پڑا ہے وہ تو جہاں رہتا ہے مالک کو اپنا محتاج بنا لیتا ہے، نگینے میں میرا مطب ہے اور مطب کا تمام کام یہی کم بخت سنبھالتا تھا، ذرا سی بات پر ناراض ہو کر یہاں چلا آیا اور مَیں وہاں اپنے کاروبار سمیت مفلوج ہو کر رہ گیا، کیونکہ مطب کے تمام شربت، تمام معجونیں، تمام جوارشیں اور دیگر ادویہ یہی تیار کرتا تھا اور اب مطب میں خاک اُڑ رہی ہے، براہِ کرم اُسے میرے ساتھ بھیج دیں میں زندگی بھر ممنون رہوں گا۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ عبدالحی آ پہنچا، حکیم صاحب کو دیکھ کر اُس کی بھوَیں تن گئیں جیسے غلیل کا تانت کس دیا ہو، وہ باہر ہی ٹھٹک گیا۔ مَیں نے اشارے اور حکیم صاحب نے کھنکار کر لجاجت سے اندر آنے کو کہا، حکیم صاحب کے الفاظ سُنتے ہی وہ ہتھے سے اُکھڑ گیا اور بڑی نفرت سے بولا "کیا آپ مجھے یہاں بھی نہیں رہنے دیں گے؟ مجھے آپ سے اور آپ کے حلقے سے سخت نفرت ہے آپ نمودار لوگ وفادار ملازموں سے داشتاؤں کی طرح فریب کاری کو روا رکھتے ہیں، اب جایئے! مجھ جیسا بے وقوف اور کوئی تلاش کیجئے! آپ کے رذیلے

میں بڑی طاقت ہے۔ آپ کے افسر دوست اور کسی غریب نوجوان کو آپ کی نذر کر دیں گے
آپ سب لوگ بھیڑیے ہیں بھیڑیے۔''

اُس کی آواز کے تڑاقوں سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ الفاظ میں اس کا دل بول رہا ہے، عبدالحی نے غصّے میں اور نہ جانے کیا کیا بک ڈالا، اس کی گرم گفتاری صاحب فہم لوگوں کے لئے فکر و خیال کا پٹیا چھوڑتی جا رہی تھی، اور حکیم صاحب بغلوں میں ہاتھ دبائے خاموش، جیسے سردی لگ رہی ہو۔

میں نے عبدالحی کو نرمی سے ٹھنڈا کرنا چاہا اور کہا ''دیکھو حکیم صاحب کے لئے یہ جگہ نئی ہے اِن کی توہین نہ کرو!'' عبدالحی نے اُنگلی سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا ''جناب آپ کو کیا خبر کہ اس دُنیا میں تقدس اور شرافت کے چولوں میں کتنے ابلیس چھپے پھرتے ہیں، یہ تو ہم ہی جانتے ہیں جو ان کی خدمت کرتے ہیں اور ان کی پستیوں کے راز دار ہیں۔ حالانکہ یہ عمر کے اُس موڑ پر ہیں جب حافظہ کمزور اور طبیعت چڑچڑی ہو جاتی ہے، مگر یہاں خود غرضانہ انداز دیکھئے۔

حکیم صاحب عبدالحی کی باتیں سُن کر جھلا تو گئے مگر میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا ''یہ شخص میرے یہاں ہی رہے گا اور دُنیا میں کہیں اِس کا گزارا نہیں ہو سکتا! میں طبیب ہُوں طبیب! میں نے اس کے لئے ایسا جہنم کھول دیا ہے کہ آبرومندانہ زندگی نہیں گزار سکتا'' یہ کہتے کہتے وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور لمبی لمبی سانسوں سے مصافحہ کر کے دروازے سے نکل گئے، میں اُنھیں روکتا بھی رہا لیکن وہ ہاتھوں سے انکار کرتے ہوئے آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد عبدالحی نے ذرا چمک کر کہا ''حکیم صاحب اب میرے ماموں کے پاس جائیں گے جہاں میں مقیم ہوں! اچھا میں بھی اجازت چاہتا ہوں'' وہ آنکھوں میں آنسو لئے اُٹھا اور معانقے کے ساتھ میرے کندھے اور کان کی پاپڑی کے درمیان گال ملا دیا

اس طرح کہ مجھے جھُرجھُری آگئی جس سے اب تک میرے رگ و ریشے آشنا نہیں تھے میرے احساس کے لئے یہ پہلا سانحہ تھا! میں پہروں نہ جانے کیسے کیسے بدرنگ خیالات میں ڈوبتا اُبھرتا رہا اور اس تاثر کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔

میں اُسی طرح قصداً شام تک کئی دوستوں سے معانقہ کرکے ملا لیکن بدن میں وُہ سنسنی نہ دوڑی، میں نے دوستوں میں ذکر کیا تو کئی تجربہ کار لوگوں نے بتایا کہ یہ بھی ایک فن ہے اور اس کا فنکار بیش قیمت اِنسان ہوتا ہے۔

پھر عبدالحی سے مُلاقات نہیں ہوئی، ایک بار سُنا تھا کہ وہ ٹانڈہ ضلع مرادآباد میں چودہری حیّا کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کی ایک منڈلی ہے، میرے کانوں میں حکیم صاحب کے وہ الفاظ گونجتے رہے کہ میں نے اس کے لئے ایسا جہنم کھول دیا ہے کہ کہیں آبرومندانہ زِندگی نہیں گذار سکتا۔

کپورتھلے کا مشاعرہ

امرتسر کے مشاعرے سے میرا اچھا خاصا چرچا ہوگیا تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں بعد شاید اسی وجہ سے کپورتھلہ کے مشاعرے کا ایک دعوت نامہ ملا جس میں غالب کی غزل کا یہ مصرع، مصرعِ طرح قرار پایا تھا۔

ع

پھر ہُوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

غزل کہنے کے لئے صرف ایک دن تھا چنانچہ گنگناتا ہُوا کپورتھلہ روانہ ہوگیا۔ جالندھر کے بعد لاری کا سفر شروع ہُوا اُس دن کا سورج رکوع میں جا چکا تھا اور ہماری لاری اس سورج کی جلتی ہوئی چتا کی طرف جارہی تھی، کوئلتار سے چمچاتی ہوئی سڑک برساتی ندی کی طرح سامنے چمک رہی تھی اور وقت شاید لاری کی رفتار سے بھی

تیز چل رہا تھا چنانچہ راستے ہی میں شام پڑ گئی اور کھیتوں سے زمین کی بھاپ نے سر اُبھارنا شروع کر دیا، رفتہ رفتہ ساری فضا میں ہلکی ہلکی دھند بھر گئی اور سامنے کی جھاڑیاں کھاد کوڑے کی ڈھیریاں نظر آنے لگیں۔ ڈرائیور نے بتّیاں روشن کر لیں لاری انسانی اذہان کی طرح اپنی حدود تک سامنے کے راستے کو اُجالتی مصروفِ سفر تھی اور فضا میں سیتٌ بڑھتی جا رہی تھی۔

اس مشاعرے میں بھی لاہور کے مقتدر اور صفِ اوّل کے شعراء شریک تھے۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے بفضلہٖ تعالیٰ میری غزل بھی مکمّل ہو گئی۔ میں شروع سے اپنے کلام پر فوراً نظرِ ثانی کرنے کا عادی نہیں۔ ہاں اگر کوئی دوسرا شخص سنائے تو پھر اس میں ترمیم، تنسیخ اور حک و اصلاح پر طبیعت لپکتی ہے۔ یہی وجہ ہے میں اپنی کتابوں پر اصلاح کرتا رہتا ہوں اور طباعت کے آخری مرحلے پر بھی میں اپنے کلام سے مطمئن نہیں ہوتا۔

مَیں نے مشاعرے کی غزل مکمّل کر کے رکھ لی اور بے فکر ہو گیا لیکن کوئی دُوسرا آدمی ایسا میسّر نہ آیا جو میری غزل پڑھتا جاتا اور مَیں سُنتا جاتا، اس کے باوصف مجھے اطمینان سا تھا دوسرے شاعروں کی طرح دُھکڑ پکڑ اور دُگدا میں نہیں تھا، اراکینِ مشاعرہ نے مہمانوں کے لئے معقُول انتظامات کیے تھے خوش قسمتی سے مجھے ایک چھوٹا سا کمرہ ملا جو دوسرے شعراء کے ہنگاموں سے بچا ہُوا تھا اور شاعر پسند لوگوں کی زد سے بھی باہر تھا۔ میرے ہم عصروں نے تو مجھے تحقیر کے طور پر الگ تھلگ رکھا تھا لیکن وہ علیحدگی میرے لئے آرام رساں ثابت ہوئی۔ اُسی رات اُنھیں شعراء میں سے ایک نے معاوضہ پر مجھ سے قصیدہ لکھوا کر پیش کیا اور انعام پایا۔

مشاعرے کا انعقاد ایک میدان میں کیا گیا تھا۔ جہاں زمین پر دریاں اور دریوں پر کچھ قالین اور قالینوں کی حدود تک رسّیاں کھینچ کر چھوٹے بڑوں میں حدِ فاصل کھینچ دی تھی تاکہ کوئی نچلے درجے کا سامع یا غیر مدعو شاعر معززین کے سامنے آڑ نہ بن جائے۔

ٌ سیت، سردی، خنکی، ٹھنڈک

شاعروں کے لئے سامعین سے آگے مگر اسٹیج کے سامنے ایک جگہ مقرر تھی میں وہیں جاکر بیٹھ گیا۔ لیکن جو آیا وہ میرے ہی سامنے بیٹھا اور میں پیچھے سرکتا رہا آخر قالین سے دری تک رسائی ہوگئی اُس وقت وہ جگہ خالی تھی جسے مشاعرے کی درمیانی گلی کہا جاسکتا ہے اجب میں نے دیکھا کہ یہ اخلاقی جبر مسلسل ہے تو میں دُور سامعین کے ساتھ دری پر جا بیٹھا، مگر یہ مشاعرہ نہ جانے کتنے دنوں بعد ہُوا تھا کہ سامعین کے دَل کے دَل چلے آرہے تھے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ دری کی حدود بھی میرے قبضے سے نکل گئیں اور میں ذرا دُور ایک موٹر کے مڈگارڈ کے سہارے جا کھڑا ہُوا، لاہور کے اوچھے اور مغرور شاعر میرا یہ عالم دیکھ کر نہ جانے کیا کیا کھُسر پھُسر کر رہے تھے مگر میں مطمئن اس لئے تھا کہ اُن کی شاعرانہ حیثیت مجھ پر بے نقاب ہو چکی تھی۔

مشاعرہ شروع ہُوا اور چاروں طرف سے داد و بیداد کے جھکّڑ چلنے لگے لیکن داد پر بے داد حاوی تھی کیونکہ سامعین میں عوام زیادہ تھے اور عوامی مشاعرہ ہونے کی وجہ سے روک ٹوک بھی ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ شاعر تھے کہ غزلوں پر غزلیں سناتے جا رہے تھے اور حاضرین تھے کہ دل کھول کر تل چاولی داد و تحسین میں کمی نہ کرتے تھے۔ میں ہر شاعر کے بعد گوش بر آواز ہو جاتا کہ شاید اب میرا نام پکارا جائے۔ رفتہ رفتہ بزرگ و برتر شعراء کا لگّا لگ گیا جو اُس دَور کے دھنتّر اور دلی کھنگر مشہور تھے، اُس وقت مجھے گھبراہٹ ہوئی کہ ایسا نہ ہو امر تسر کی طرح میرا ہی نام بٹّے کھاتے میں ڈال دیا جائے، چنانچہ میں نے اپنا نام لکھ کر بھیجا اور کہا کہ ظالمانہ غفلت روا نہیں ہے۔ اُس پر اسٹیج سیکرٹری صاحب چونک پڑے اور معذرت کے ساتھ میرا نام پکارا۔

اب رات کا وہ حصہ آگیا تھا جس میں انسان بے سبب نہیں جاگ سکتا مشاعرے کے چاروں طرف روشنی اور میدان کی گرد رات کی سرمئی چادر سے دبی ہوئی تھی اور ستارے زمین کے ذرّوں پر متوجہ ہونے کے منصوبوں میں تھے۔

اب مشاعرے میں صاحبِ ذوق اور مذاقِ سلیم رکھنے والے وہی سامعین رہ گئے تھے جن کی رُوحوں تک رسا ہونے کے لئے شعر کی راہوں میں کوئی پھاٹک نہیں لگتا۔ میں نے ترنم سے غزل شروع کی مطلع سُننا تھا کہ سامعین چونک پڑے اور اپنی اپنی جگہ پھیلے ہوئے اجسام تکیوں کے سہارے ہو بیٹھے، ہر شعر پر میری اُمید اور توقع سے زیادہ داد دی، ہر مصرع پر مکرر مکرر کی آوازیں گونج رہی تھیں، میں نے غزل کا مقطع پڑھا اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوا اپنی جگہ کھڑے ہونے کے لئے چلا لیکن وہیں بٹھا لیا گیا، میری غزل کی کامیابی پر جو لوگ زمین پر میرے ساتھ کھڑے ہوئے تھے اُنھوں نے شور مچایا کہ ہمارے شاعر کو ہمارے پاس بھیجو! یہ خواص کا شاعر نہیں ہے۔ میں زبردستی وہاں سے اُٹھا اور اُنھیں لوگوں کے پاس جا کر کھڑا ہُوا کیونکہ میں اُن کے شور و شغب میں خلوص کی جھنکاریں سُن رہا تھا۔ وُہ مجھ سے بڑی عزت اور احترام سے پیش آئے، سب نے باری باری مصافحہ کیا اور گلے لگایا۔ پان سگریٹ سے تواضع شروع ہو گئی۔ مجھے ایسا محسوس ہُوا جیسے یہ لوگ میری رُوح سے نزدیک آ گئے ہیں، اب مجھے اپنا مستقبل ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بادلوں کے اسفنجی لبادوں میں کھنکھناتے ہوئے طوفان۔ آخر یہ مشاعرہ ختم ہُوا اور لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

لاہور کے کچھ ایسے شاعر بھی تھے جو یہ کہتے پھر رہے تھے کہ احسان کی غزل میں ایک ایک شعر ہر شاعر نے دیا ہے، کوئی کہتا تھا یہ چپراسی ہے کوئی بکارتا تھا، یہ چوکیدار ہے اسے شعر و شاعری سے کیا واسطہ، یہ بھنک میرے کان میں بھی پڑی اور مجھے اُن شعرا کی بداخلاقی پر افسوس ہُوا لیکن اس کا کوئی فوری تدارک میری سمجھ میں نہ آیا۔

میں قیام گاہ پر پہنچا ہی تھا کہ وہاں کے ایک بزرگ شاعر جناب بھورام باگل میرے پاس آئے اور دوسرے دن کے کھانے اور نشست کی دعوت دی، مجھے فوراً بات سُوجھی، میں نے اُن سے عرض کی کہ مجھے شرکت میں تو عذر نہیں لیکن میں نے سُنا ہے کہ

بعض شعراء میرے متعلق یہ افواہ پھیلا رہے ہیں کہ احسان تو معمولی قسم کا مزدور ہے، وہ ہرگز شاعر نہیں ہو سکتا لاہور میں چپراسی ہے یا شملہ پہاڑی کا چوکیدار۔ رات کی غزل کے متعلق بھی وہ لوگوں سے یہ کہتے پھر رہے ہیں کہ ایک ایک شعر ہر شاعر نے دے کر غزل پوری کر دی ہے۔ آپ سے اتنی عرض ہے کہ کھانے کے بعد جب نشست ہو تو پندرہ منٹ کے لئے سب شعراء کو کوئی مصرع دے دیں کہ اس وقفے میں جو صاحب جتنے شعر کہہ سکیں کہہ لیں اس کے بعد غیر طرحی کلام ہوگا۔ اس سے میرا یہ مقصد تھا کہ ایک تو میری طرف سے غلط فہمی رفع ہو جائے، دوسرے اسی رسوا کرنے والی جماعت میں کچھ ایسے لوگ بھی شریک تھے جو مجھ سے اشعار لیتے تھے، اس موقع پر اُن کی معذوری سے اُن کا غیر شاعرانہ رُخ بھی بے نقاب ہو جائے گا۔

لبھو رام صاحب نے میری پیٹھ تھپتھپا کر کہا جناب بے فکر رہیں یہ کام کر دوں گا اور ضرور کروں گا۔ دوسرے روز دوپہر کو لبھو رام صاحب کے دولت کدے پر اچھا خاصا اجتماع ہو گیا۔ شہر کے حکّام اور رؤسا کے علاوہ بلند ذوق لوگ بھی آئے۔ کھانے کے بعد لبھو رام صاحب نے اعلان کیا کہ "بھئی میں تو پرانے زمانے کا انسان ہوں اور طرحی مشاعرے کو مشاعرہ خیال کرتا ہوں، لہٰذا پندرہ منٹ کے لئے ایک طرحی مصرعے پر سب صاحبان غور و فکر کر کے جتنے جتنے شعر موزوں ہو سکیں کریں، اس کے بعد غیر طرحی دَور ہوگا، چنانچہ مرزا داغ کا مصرعہ دے دیا گیا ؎

دل کو تھاما اُن کا دامن تھام کے

نقلی لوگوں نے اختلاف کیا۔ بعض نے کہا شاعری کے لئے ماحول کی ضرورت ہے، بعض شہزادے بولے، "شعر لوازمات چاہتا ہے، کوئی چھوٹا شراب منگا دیجے"۔ ایک صاحب جو نقلی شعرا میں سے تھے اُٹھے اور بولے "جناب شاعری کو آپ نے رنگریز کی دکان خیال کیا ہے کہ اُٹھایا اور رنگ میں ڈبا دے دیا، یہ شاعری ہے شاعری! اس کے

کچھ آداب و شرائط بھی ہیں ان میں سب سے پہلی شرط تنہائی ہے۔ بھو رام صاحب نے فوراً جواب دیا، آپ کمرے میں تشریف رکھیں یہ کونسی بڑی بات ہے جو لوازم آپ کہیں گے مہیا ہو جائیں گے۔ وہ کھسیانے ہو کر رہ گئے اور سب لوگ فکر کرنے لگے۔ کسی نے ایک کسی نے دو، کسی نے پانچ اشعار تک کہے۔ میں نے نیرہ منٹ میں نو اشعار کہے اور صاحبِ خانہ کو دے دیئے۔ قابل گلاؤٹھوی نے مجھ سے بھی زیادہ کہے لیکن انھوں نے دیر بھی لگائی، باقی سب لوگ اس تعداد سے پیچھے تھے۔ حالانکہ اُن میں مجھ سے پہلے کے کہنے والے لوگ ظفر حسین اشک، ساحر کپور تھلوی، جناب زار، جناب عرش، جناب رسا اور حضرت تاثیر وغیرہ سب تھے، اور ظاہر ہے کہ انھوں نے مجھ سے بہتر شعر کہے لیکن یہاں تو شعر کہنے کی بات تھی تقابل کا معاملہ نہیں تھا۔ میں نے بعض لوگوں کو جتانے کے لئے بلند آواز سے کہہ دیا بحمد اللہ، میں اسٹیج پر فی البدیہہ غزل کہہ سکتا ہوں۔ میرے متعلق بعض منافقین نے یہ بھی کہا ہے کہ احسان کو ہر شاعر نے ایک ایک شعر دیا ہے وہ آئیں تاکہ میں اُنھیں دکھاؤں کہ میں کس رفتار سے شعر کہتا ہوں، اور حقیقت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ اُن دنوں روزنامہ "ملاپ" میں پورا مشاعرہ میں اور امر چند قیس ہی مختلف ناموں سے لکھتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی سینکڑوں اشعار دوسروں کے نام سے اخبارات اور رسالوں میں آتے تھے۔

حاضرین پر کچھ دیر تو سکوت طاری رہا لیکن پھر لوگ بات کو سمجھ گئے کہ روئے سخن بعض خاص لوگوں کی طرف ہے پھر غیر طرحی مشاعرہ شروع ہو گیا اُس نشست میں نہایت اچھی اور بلند پایہ غزلیں سننے میں آئیں جناب جوش ملسیانی اور جناب کبیر خاں رسا نے تو اپنے کلام سے داغ اور صفی وغیرہ کی محفلوں کی یاد تازہ کر دی، اور وہ وہ غزلیں سنائیں کہ طبیعت جھک ہو گئی، مصرعے مصرعے پر روح میں لطافت کے دریچے کھلتے محسوس ہو رہے تھے۔

ے امر چند قیس آج کل بمبئی میں ہیں۔

میرے اس تقابلی اعلان کو بعض کم سمجھ لوگوں نے پندار بتایا اور بعض لوگوں نے جرأت کا لقب دیا، بعض "اچھا پھر سہی" کہہ کر رہ گئے۔ کئی مقامی دوستوں نے میری پیٹھ ٹھونکی اور کہا کہ تم نے بہت اچھا کیا، یہ لوگ اپنی ٹولی کے سوا کسی کو سامنے نہیں آنے دیتے ان کا یہی علاج ہے اور انھیں اسی طرح توڑنا درکار تھا۔ اب اِن پھسڈی لوگوں میں کوئی تمہارے منہ نہیں آئے گا، یہ سب، بڑبولے، ریاکار، خودغرض اور ڈینگیں مارنے والے لوگ ہیں ان کی موجودگی، گندے پانی کے تالاب اور کیچڑ کے ڈوک سے زیادہ نہیں جو ہُوا بہت اچھا ہو گیا۔

اس کے بعد میں کئی بار کپور تھلے گیا، ظفر حسین اشک، ساحر کپورتھلوی، جناب زار اور جناب مسرور میرے دوست ہو گئے۔ میں نے کپور تھلے کے لوگوں میں عوام کو سادہ خاطر اور خواص کو چاق چوبند اور صاحب تدبیر دیکھا ہے۔

جناب کبیر خاں[1] صاحب رسا اور جناب جوش ملسیانی سے میری پہلی ملاقات کپورتھلے ہی میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد جوش صاحب نے مجھ پر ہمیشہ استادوں جیسی شفقت فرمائی اور آج تک اُسی طرح لطف و کرم روا سمجھتے ہیں جو بزرگوں کا شیوہ ہے۔ جناب صُوفی خورشید عالم صاحب مخمور بھی کپورتھلے کے باشندے ہیں جو خطاطی کے اساتذہ میں اپنا ایک مقام رکھتے ہیں اور شعر بھی صاف ستھرا کہتے ہیں۔ اگرچہ ان کی مصروفیت اُنھیں مشاعروں تک نہیں آنے دیتی لیکن اُن کا کلام کبھی نہ کبھی منظرِ عام پر ضرور آئے گا، کیونکہ حقائق زیادہ عرصہ پردے کی گھٹن برداشت نہیں کرتے۔

---

[1] جناب کبیر خاں رسا جالندھری اب لاہور میں مقیم ہیں ان کا دیوان کتابت ہو چکا ہے دیکھئے طباعت کا مرحلہ کب تک ہوتا ہے

اَدبی ماحول

جب مجھ میں اِدھر اُدھر نظر اُٹھانے کی جرأت ہوئی تو مَیں نے دیکھا کہ لاہور میں بھی شاعری کا وہی قدیم رنگ ہے، لیکن اخبارات اور جرائد کے باعث یہاں کا ادب منجمد نہیں بلکہ متحرک ہے، کالجوں کے اساتذہ جو انگریزی ادب سے بہرہ ور تھے مغربی خیالات کو اُردو کا پیراہن دے رہے تھے اور یہی عمل اُن کی عظمت و شہرت کا باعث تھا۔

جگہ جگہ تصدق حسین خالد کی شاعری پر جا و بیجا تبصرے تھے اور اسی کے سائے میں غیر مقفیٰ شاعری کا شگوفہ پھوٹ رہا تھا جس کے مقلدین بھی موجود تھے، لیکن اچھی سمجھ بوجھ کے لوگوں کا خیال تھا کہ یہ شاعری یہاں بار آور نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہاں عوام و خواص سب نغمہ پسند ہیں اور ہندوستان میں تو الہامی کتابیں بھی اوزان و بحور اور ردیف و قافیہ کی سواری پر اُترتی ہیں لیکن اُنہی میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اپنے قدیم نغموں کے سانچوں میں نئے خیالات کا مسالہ ڈال کر نئی نئی صورتیں پیدا کر رہے تھے اُن میں سب سے بلند اور قابلِ تقلید صرف ڈاکٹر اقبالؔ اور جوشؔ ملیح آبادی تھے۔ ڈاکٹر اقبالؔ کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کی بہبود کا سوال تھا اور جوشؔ ملیح آبادی ادبی قافلے میں ہراول کے پیش قدم تھے۔

حضرت اقبالؔ اور جناب جوشؔ ملیح آبادی میں اجمال و تفصیل اس انداز سے تقسیم ہوئی تھی کہ حضرت اقبالؔ کے یہاں کئی کئی صفحات کا مواد ایک ایک شعر میں سمٹ آتا

ہے اور مغز کے علاوہ چھلکے کا نام تک نہیں ہوتا، جناب جوشؔ کی تفصیل کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک بات کو ہزار ہزار انداز سے بیان کرتے ہیں مگر کہیں شعر کی ساحریت کم نہیں ہوتی اُن کے یہاں قوت مطالعہ و مشاہدہ اپنے شباب پر نظر آتی ہے اور صحیح ادب معاشرے کی عکاسی ہی کا نام ہے۔

اسی صف میں مولٰینا ظفر علی خاں بھی آتے ہیں جو صحافت کی دُنیا میں سیف قلم، اور بدیہہ گوئی میں اپنا جواب خود تھے ان کے یہاں اسلامی قدریں محفوظ تھیں اور سچے مُسلمان کی طرح شعروادب میں اپنے اندازِ رقم کے واحد مالک تھے، ہر چند کہ اُنھوں نے ہنگامی نظمیں بھی کہی ہیں لیکن قدم قدم پر اُن کا علمی تبحّر اپنا اعلان کرتا ہے۔

ان کے بعد ان کا جانشین صرف شورشؔ کاشمیری کو کہہ سکتے ہیں جو اُس ٹکلخے کا آدمی تو نہیں لیکن پُورے مُلک میں رئیسؔ امروہوی کے سوا کوئی بھی اس سے قدم ملا کر نہیں چل سکتا۔

حضرت علامہ اقبالؔ اور جوشؔ ملیح آبادی اندازِ بیان کے اعتبار سے قدیم اور رُوحِ کلام کے اعتبار سے جدید لٹریچر کے خالق ہیں اگرچہ اس طرزِ ادب کی داغ بیل حالیؔ نے ڈالی تھی لیکن ان دونوں حضرات نے جو قیمتی سرمایہ اُردو ادب کو دیا ہے وُہ پوری صدی میں میسّر نہیں آیا تھا، آج کے تمام لکھنے والے انھی تناور شخصیتوں کی شاخیں اور پتّے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کہیں کہیں خشک پتّا اور سوکھی ہوئی ٹہنیاں بھی دکھائی پڑتی ہیں، اور یہ اصولِ فطرت سے باہر کی بات نہیں۔

مَیں قدیم رنگ میں شعر کہنے کا عادی ضرور تھا جو نتیجہ تھا نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کے مطالعے کا لیکن چونکہ مغربی علوم سے بے بہرہ تھا اس لئے مجھے یہی بہتر معلوم ہوا کہ فطرت کے حسن اور اپنے اردگرد کے مشاہدات و تجربات کو قلم بند کروں، آخر یہ بھی نوشاعری ہے، چنانچہ میں اسی رُخ پہ چل نکلا، میری اکثر نظمیں مزدوری کے ایام کی روداد یں اور ساتھیوں کے تجربات و مشاہدات کے مرقعے ہیں اور اتفاق سے یہ رُخ

ایسا ہے جس کے ڈانڈے اقبال اور جوش دونوں سے ملتے ہیں۔

پھر میں نے تراجم کے ذریعہ انگریزی خیالات و نظریات کا مطالعہ بھی کیا اور اکثر نئے لکھنے والوں کی تحریریں بھی پڑھیں لیکن کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے اس ملک میں لٹریچر سے سیاسی پالیسیوں اور مذہبی رجحانات کا چولا بدلا جا رہا ہے اور بعض جماعتیں اپنے ذاتی اغراض کے لئے مذہب اور اہلِ مذہب کی ساکھ خراب کر دینا چاہتی ہیں۔ جب میں نے اس پہلو پر مزید غور کیا تو یہ کھُلا کہ یہ زہر تو بڑی تیزی سے نوجوانوں کے رگ و ریشے میں تیرتا جا رہا ہے چنانچہ میں نے اس نئی روش کی طرف سے نظر ہٹا کر صرف مزدوروں، کسانوں اور پس ماندہ طبقے کی عکاسی کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دے لیا، اس کے سوا اور چارۂ کار بھی کیا تھا، ویسے بھی میں اسے خدمتِ خلق کا ایک پہلو خیال کرتا تھا جو سعادت میں شمار ہوتا ہے۔

یہ ایک اتفاق ہے کہ اب تک میرے سوا اس میدان میں کوئی ایسا شاعر پورے ملک میں نہیں تھا جو مشقت کے شکنجوں سے نکل کر ادب کے میدان میں داخل ہوا ہو، اس عظمت کو میں اپنی سعی و عمل کا نتیجہ خیال نہیں کرتا بلکہ جب غور کرتا ہوں، تو فطرت کے لائحہ عمل کے سامنے دُنیا اور اہلِ دُنیا کی طاقتوں کا اعتراف غلط ثابت ہوتا ہے اور میں اپنی موجودہ حالت کو اُسی ذات کا عطیہ گردانتا ہوں۔

مغربی تعلیم کے "تنوع پسند حضرات بھی بیکار نہیں بیٹھے تھے"، قدیم لٹریچر سے نفرت پھیلانا اور قدما کے خیالات و نظریات پر بہتان باندھنا ان کا مشغلہ قرار پا گیا تھا، حالانکہ اگر وہ اس تخریبی کارروائی کے بجائے تعمیر میں اس قدر جان کھپاتے اور کھکھیڑیں اُٹھاتے تو اُنہیں اپنے خیالات کے پرچار میں زیادہ سہولت ہوتی اور اس سے کہیں زیادہ کامیابی نظر آتی، اِس افسوں کے توڑ اور کوشش میں مولانا تاجور نجیب آبادی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، خواجہ دل محمد اور میلارام وفا وغیرہ

ڈانڈے: راستے۔ جادے۔ پگڈنڈیاں

نے بھی رات دن ایک کر رکھا تھا۔

آگے چل کر نئے گھان کے لوگوں میں جناب ن ۔ م ۔ راشد اور میرا جی نے اپنا ایک جدا انداز وضع کیا جس میں قدیم ہیئت اور جدید خیالات کے امتزاج سے تاثر کی سعیٔ بلیغ تھی، چنانچہ میرا جی بھی ایک مخصوص طبقے میں پسند کیے گئے اور ن ۔ م ۔ راشد طیلسانی طبقے میں زیرِ غور آئے اور دونوں نے اپنی اپنی جگہ شہرت پائی اور تانیے کی تختیوں پہ نام کندہ کر دیئے اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی کیونکہ اُس وقت اردگرد، علی اختر، فانی اختر شیرانی، سیماب اور اسی قسم کے کئی جمنتول اپنے اپنے پرچم بلند کر چکے تھے۔

اصل میں یہ وُہ زمانہ ہے جب لاہور میں جدید علوم قدیم ادب سے اور قدیم علوم کے اساتذہ جدید علوم سے دامن بچانے لگے تھے، بعض سرپھرے زباں دانوں اور اکثر جُہلا نے صرف و نحو پر بھی حملے شروع کر دیئے تھے اور اس کا اثر یہ تھا کہ مشاعروں مناظموں اور مباحثوں میں الفاظ اور فقروں کی معنویت پر جانکنی طاری ہونے لگی تھی۔ سنجیدہ اور متین قسم کے دانشور سوچ رہے تھے کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔

ارتقا کی برق ردی سے کچھ دنوں بعد اسی ماحول سے نامعلوم طور پر ایک اور ہیولیٰ اُٹھا اور ترقی یافتہ انداز کی ایک اور صورت سامنے آئی جس کے نمایاں علمبردار فیض احمد فیض اور احمد ندیم قاسمی ہیں، فیض کے یہاں بڑا ہی ہلکا پھلکا اور لطیف اندازِ شعر تھا جس میں ہر مصرع اپنے مفہوم کی طرف ایک کنایہ تھا اور بس۔ ندیم کے یہاں اخلاقی قدروں کی حفاظت اور انسانی قدر و قیمت پہچاننے پر زور تھا جو میرے مشرب سے بہت نزدیکی کی بات تھی مگر فیض کا لہجہ سامعین کو ذاتی زندگی کے سائے میں لے جاتا اور جو فیض کہتا اُسے لوگ شاعر کی آپ بیتی محسوس کرنے لگتے تھے۔

وقت کے کئی پڑاؤ کے بعد انہی کی قطار میں مصطفےٰ زیدی اُبھرے۔ اُن کے یہاں ابہام کی نہایت حسین و جمیل صورت ملتی ہے اُن کا کوئی اشارہ یا کنایہ ایسا نہیں ہوتا

جمنتول۔ اپنا مقام نہ چھوڑنے والا۔ ڈٹ کر لڑنے والا۔ ثابت قدم۔ اٹل۔

جو اپنی تصویر قاری کے ذہن پر مرتسم نہ کر دے اور جس شاعر میں یہ بات موجود ہو وہ اپنے دَور کا بڑا شاعر ہوتا ہے۔

مرتضیٰ برلاس مصطفیٰ زیدی کے بعد کے شاعر ہیں لیکن ان کے داخلی احساسات کی تصویریں خارجی رنگ و روغن کو بھی نکھا کر دیتی ہیں اور یہ اپنے دَور کے تمام بڑے شاعروں کے شانہ بہ شانہ بڑھ رہے ہیں۔ لہجے کے اعتبار سے وہ مصطفیٰ زیدی کے بہت قریب ہیں۔ اگرچہ ابھی مصطفیٰ زیدی اور ندیم جیسا گہرا تاثّر نہیں دیتے لیکن کاغذ پر اُن کا شعر بہت جاندار ہوتا ہے۔ ندیم کے یہاں راہیں تو وہی ہیں جو فیض اور مصطفیٰ میں مشترک ہیں لیکن ان کے یہاں معنوی اعتبار سے عوام کی روحوں کی طرف زیادہ دریچے کُھلے معلوم ہوتے ہیں۔ انھیں کی صف میں شورش کاشمیری اور رئیس امروہوی بھی ہیں جنکی انفرادیت مسلم ہے۔

مرتضیٰ برلاس کے کلام میں روحانی آنچ اُن کے تمام معاصرین سے زیادہ ہے، بعض اوقات اُن کا شعر خود اُن پر بھی طاری ہو جاتا ہے اس وقت اُن کی سانسوں کا یہ عالم ہوتا ہے جیسے گندم کے خشک کھیتوں سے ہوا کا جھونکا گزر رہا ہو۔

کچھ ایسا ہی افسونی دوران کے معصر سیف الدین سیف، عارف عبد المتین، یوسف ظفر، وزیر آغا مجید امجد، مختار صدیقی، شکیب جلالی، شہزاد احمد، شہزاد صلاح الدین ندیم، قیوم نظر، لطیف انور اور قتیل شفائی کے یہاں بھی چہروں کے رنگ بدلتا نظر آتا ہے اور اُنھیں کی صف میں جب نظر اُٹھا کر دیکھیں تو اس کارواں کی لین ڈوری، عبد العزیز خالد، جمیل الدین عالی، جیلانی کامران، محمد صفدر، احمد فراز، ابن انشا، جعفر طاہر، جمیل ملک، خلیل رامپوری۔ اور اُن کے سینکڑوں ساتھیوں سمیت طویل ہوتی چلی گئی ہے اور ان میں ایسے ایسے ظالم شاعر ہیں کہ جب ان کا کوئی نشتر اچانک سامنے آتا ہے تو خون میں تیرتا محسوس ہوتا ہے۔

مَیں نے اپنی اس کتاب کی دوسری جلد "تذکرۂ جہانِ دانش" میں ان لوگوں کا ذکر ذرا تفصیل سے کیا ہے۔

کراچی کا مشاعرہ

میرے مطالعے اور استعداد کے ساتھ میری مشقِ سخن تجربات اور مشاہدات کے سہارے بے لے کر بڑھتی رہی ایک دن صبح کو میرے ایک ہندو دوست جگدیش نے مجھے کراچی کا دعوت نامہ لاکر دیا اور کہا فوراً تیار ہو جائیں پرسوں مشاعرہ ہے۔ میں کراچی کے مشاعرے کے لئے اکیلا جاتے ہوئے ذرا ہچکچایا تو جگدیش نے کہا کہ جناب آپ تنہا نہیں اور لوگ بھی لاہور سے آج ہی جا رہے ہیں۔ میں مطمئن ہو گیا اور سامانِ سفر سے لیس ہو کر تیسرے درجے کے اپنے ہی جیسے لوگوں میں کھڑکی سے لگ کر جا بیٹھا۔

گاڑی لاہور کے اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ میرے خیالات کی طرح انجن کا دھواں ریلوے کی عمارتوں پر ساتے کی ابریاں بناتا گزر رہا تھا۔ پٹڑی کے قریب پیپلوں کی ہوا سے چرچراتے پتوں کی ٹکڑیوں کی ٹکڑیاں بھڑکتی جا رہی تھیں۔ گاڑی کے ہر موڑ پر سورج اپنا زاویہ بدل دیتا تھا اور وقت ریل گاڑی کی رفتار سے ہم آہنگ گزر رہا تھا۔ آخر شام قریب آگئی۔ سورج بینگنی دھندلکوں میں تازہ گوشت کے لوتھڑے کی طرح خون میں لت پت دکھائی دینے لگا۔ میں نے کئی بار ایسا محسوس کیا کہ فضائیں میری سانسوں کے ساتھ دبازت کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور یہ تھا اندھیرے کا وزن۔

شاید یہ وقت کا اثر تھا کہ ڈبے میں تمام لوگ خاموش تھے اور میں اپنے سینے میں ایک سیّال مگر بوجھل شئے کا بہاؤ سا محسوس کر رہا تھا رفتہ رفتہ جب میدانوں میں اندھیرا بھر گیا اور گاڑی کے دروازوں پر سیاہی کے پردے پڑ گئے تو میں نے ڈبے کے اندر کی طرف رخ بدل لیا۔ اب برقی قمقموں کی روشنی سے مسافروں کے چہروں پر زندگی کے آثار ابھر رہے تھے کوئی ناشتہ دان کھول کر سفر کے بیچ رہا تھا کوئی ایک میلے کپڑے میں گڑ کا ملیدہ لئے بیٹھا تھا۔ میرے برابر والا مسافر گوچنی کی خشک

روٹیاں لئے بیٹھا تھا۔

میں نے چلتے وقت گیہوں کی روغنی روٹیاں اور آلو کا بھرتا ساتھ لے لیا تھا اگرچہ مجھے بھی بھوک لگی تھی لیکن اپنا کھانا کھول کر کھاتے ہوئے جھجک رہا تھا کیونکہ میرا کھانا میرے برابر والے مسافر کے کھانے سے قدرے بہتر تھا۔

اتنے میں میرے بازو کے مسافر نے مجھ سے کہا کہ آپ روٹی کھا لیں میں نے کہا بھائی بھوک تو لگی ہے میرا کھانا جو اُوپر رکھا ہے وُہ میری مرضی کا نہیں ہے مَیں سادہ کھانا کھاتا ہُوں۔ اُس نے کہا یہ کون سی بات ہے آپ میری روٹی کھائیں اس میں نمک مرچ تو ضرور ہے اور کوئی گھی وغیرہ نہیں ہے۔ مَیں نے اُوپر سے کھانا اُتارا اور دونوں نے آمنے سامنے بیٹھ کر سیر ہو کے کھایا تیسرے مسافر کے پاس پانی کا لوٹا تھا اس نے خود پانی پیش کر دیا جیسا کہ تیسرے درجے کے لوگوں میں رواج ہے

گاڑی مختلف اسٹیشنوں پر رُکتی رُکاتی مصروفِ سفر رہی ایک مسافر کو دوسرے مسافر کے سفر سے آگاہی نہیں تھی اور نہ یہ معلُوم تھا کہ کون کہاں سے آیا ہے اور یہ چہرہ کہاں تک سامنے رہے گا۔ جیسے ہر شخص کے لئے زندگی کا سفر بعض راستے کی اُلجھن کم کرنے کے لئے ایک دُوسرے سے مختلف گفتگو کو اپنی تدبیر کی حد تک روا خیال کر رہے تھے۔ اور اس سلسلہ میں سیاست بھی زیرِ بحث تھی مذہب بھی، حکومت کا رویّہ بھی اور ہنسی مذاق بھی۔ لیکن میرے دائیں بائیں اس قسم کے لوگ نہیں تھے اس لئے سوتے جاگتے رات گزر گئی۔ جب صبح کے سورج نے زمین کے پردے پر روشنی ڈالی تو حدِّ نظر تک، ذرّات سے لے کر آسمانی فضا تک زندگی کے آثار کلبلانے لگے اور اس خاک کے پردے پر فلم کی طرح مختلف مناظر اور رنگ رنگ کے ہنگامے جاگ پڑے۔ ریل گاڑی کے اندر مسافروں میں بعض مسافر صفائی اور بعض عبادت میں مصروف تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے چائے اور ناشتہ فروشوں کی دلخراش آوازوں نے سماعت

پر کُھرچائی لگادی اور بڑی دیر بعد ان خراشکار آوازوں سے چھٹکارا ملا۔

گاڑی تیز جا رہی تھی اور کھڑکیاں بند ہونے کے باوجود باہر کی ریت چہروں کو مسخ کئے ڈالتی تھی ایک نوجوان دیہاتی اپنی نئی نویلی دُلہن سے مصروفِ گفتگو تھا، مگر دونوں کے جوان چہرے ریت سے لپے جا رہے تھے دُلہن تھوڑی دیر کے بعد آنچل سے مُنہ پُونچھ لیتی تھی لیکن اس کے باوصف اس کے خدوخال کا تیکھا پن ہلکا ہو رہا تھا جیسے کوئی مشّاق مصوّر اپنے شاہکار پر ہلکے سفیدے کی زمین لگا دے اور تصویر کی جاذبیّت کچھ کی کچھ نظر آنے لگے۔

مجھ سے پانچ چھ مسافروں کے بعد ایک کالی بھجنگ عورت اپنے تین سوکھے سڑے بچّوں کو لئے اونگھ رہی تھی۔ اس کا بہا ہُوا نہیں، رخساروں پر پھیلا ہُوا کاجل عجیب منظر پیش کر رہا تھا۔ جیسے چہرے پر بارُود کے دھوئیں کی پرچھائیاں پختہ ہو گئی ہوں۔ میں انہی مٹتے اُبھرتے مناظر میں، ڈوبتا تیرتا کراچی کے اسٹیشن پر جا اُترا۔

مشاعرہ کے ارکان پلیٹ فارم پر موجُود تھے وُہ نہایت عزّت اور احترام سے تمام شعراء کو قیامگاہ پر لے گئے جہاں ہر قسم کی آرائش و آسائش کا سامان مہیا تھا مگر اُس کے باوصف فرمائش کی گنجائش تو باقی رہتی ہے۔ شعراء حضرات اپنے اپنے معمُولات میں مصرُوف ہو گئے، اور مَیں غسل کر کے ابھی بیٹھا ہی تھا کہ چائے کا بلاوا آگیا اور سب شعراء چائے پینے چلے گئے۔ واپسی پر جس کے جہاں سینگ سمائے اپنے اپنے ذوق اور آرزو کے مُطابق راہیں ڈھونڈھ لیں۔ رات کو مشاعرہ شرُوع ہُوا تو اہلِ کراچی نے نہایت سکُون اور اطمینان سے ہر شاعر کو سُنا اور داد و بیداد سے نوازا، مگر تعریف اور تنقیص دونوں اپنی حدود سے نہ بڑھیں جس سے اہالیانِ کراچی کی شرافت اور تہذیب کا پتہ چلتا تھا۔ مشاعرہ نہایت خوش اسلُوبی سے رات کے ایک ڈیڑھ بجے تک جاری رہا اور خاتمے پر شعراء اور سامعین ہنستے بولتے اپنی اپنی

خوابگاہوں کی طرف روانہ ہو گئے لکھے پڑھے لوگوں میں شاعروں سے زیادہ مشاعرہ کے صدر جناب نجم الدین جعفری کے نقروں کی تعریف ہو رہی تھی اور یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو خلاف توقع ہوتی کیونکہ موصوف نہایت فاضل، اور ادب دوست ہونے کے علاوہ خود بھی ادیب شہیر اور نغزگو شعراء کی صف میں شمار ہوتے تھے۔ اُن کے قلم سے نکلی ہوئی کئی ایک کتابیں ادب میں ان کا مقام متعین کرتی ہیں۔ سامعین کے تبصروں سے شہر کے خاموش راستے گونجتے جا رہے تھے اور ہر سامع اپنی رائے کو بلند و بالا کر کے ساتھیوں تک پہنچا رہا تھا۔ اراکین مشاعرہ ہمارے ساتھ قیام گاہ تک آئے اور آ کر سب سے فرمائش کی کہ ایک چائے کا دور رہے۔ چائے آگئی اس کے بعد مہمانوں کی چارپائیوں پر نظر ڈالتے ہوئے اراکینِ مشاعرہ بھی آرام کرنے چلے گئے۔

اُن کے جانے کے بعد میں نے جناب عرشؔ ملسیانی سے کہا کہ رات کو سمندر کی سیر بہت پُر لطف ہوتی ہے کیوں نہ اس موقع سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ عرشؔ صاحب تیار ہو گئے اور ساتھ جگن ناتھ آزاد کو بھی لے لیا۔ تیار تو سب ہو گئے لیکن کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ اگر رات کو سردی بڑھ گئی تو کیا ہو گا۔ مشاعرے سے آتے ہوئے مجھے تو خیال آیا تھا اور میں نے معمولی طور پر ذکر بھی کیا، مگر کراچی کے رہنے والوں نے میری بات مذاق میں اُڑا دی اور کہا "یہ لاہور نہیں کراچی ہے، یہاں ناقابلِ برداشت سردی نہیں پڑتی۔ بڑی خوشگوار قسم کی ٹھنڈک ہوتی ہے۔" چنانچہ ہم چار پانچ آدمی جن میں سے دو آدمیوں کے نام مجھے یاد نہیں رہے مل کر ہنسی مذاق کرتے منوڑا پہنچ گئے۔ پچھلی رات کا چاند دریا کو چاندی کا تختہ بنائے ہوئے تھا اور کنارے کے قریب دھاں دھاں کرتی موجیں چاند کے ڈھلوان کی طرف ریت پر چڑھتی آ رہی تھیں، ہر موج کچھ گھونگھے اور کچھ چھوٹی چھوٹی سیپیوں کے علاوہ دسیوں بیسیوں قسم کے اَڑنگ باڑ ریت پر پھینک کر واپس ہو جاتی تھی۔ کیونکہ سمندر کسی مُردہ جسم کو اپنے اندر نہیں رکھتا۔ آخیر رات میں سردی اس قدر

بڑھ گئی کہ ہم سب کے دانت بجنے لگے۔ جب حالت ناقابلِ برداشت ہو گئی تو سب نے مشورہ کیا کہ کسی ہوٹل یا دکان پر چل کر چائے پی جائے ورنہ انتقال پُرملال یقینی ہے۔

چنانچہ ہم لوگ آبادی کی طرف روانہ ہو گئے چاندنی میں دُور سے مکانات کا سلسلہ ٹیلے کے قبرستان کی طرح معلوم ہو رہا تھا ہم جس قدر نزدیک ہوتے گئے مکانوں کے خدوخال، دروازے اور کھڑکیاں اپنے اصلی رُوپ میں نظر آتی گئیں۔ آبادی میں دیکھا تو نہ کوئی ہوٹل کھلا تھا نہ کوئی دکان ایسی تھی جہاں چائے مل سکے۔ صرف ایک دُکان کھلی ہوئی ملی۔ دُکاندار نے بھی جب یہ دیکھا کہ سردی سے ہم لوگوں کی گھگھی بندھی ہوئی ہے اور دانت کڑکڑا رہے ہیں تو اُس نے ہمیں بٹھایا اور چولھے میں آگ سلگا کر کیتلی میں پانی رکھ دیا ہم چولھے کے قریب ہو کر بیٹھ گئے اور تاپنے لگے ابھی پانی میں پھول بھی نہیں پڑے تھے کہ عرشؔ ملسیانی نے کہا "چائے ڈالو بھائی!" دکاندار نے چائے ڈال دی اتنے چائے نے جوش کھایا ہم لوگوں کی سانسوں کا تسلسل بھی درست ہو چکا تھا۔ سب نے مزے لے لے کر چائے پی اور پھر دوکاندار کو بل ادا کر کے مشرق کی طرف روانہ ہوئے۔ اب ذرا اُجالا ہو چلا تھا، سمندر کا رنگ ایسا ہو رہا تھا۔ جیسے سرمے میں جست مل جائے۔ ادھر زرد رُو چاند ایک بیمار حسینہ کی طرح سجدے میں جھکا ہوا تھا۔ رات بھر کی ٹھنڈک سے لدے ہوئے برگ و بار نے ابھی پلکیں نہیں اُٹھائی تھیں، کہ جگن ناتھ آزاد نے کہا "احسان صاحب! پو کب پھٹے گی؟" مجھے مذاق سوجھا اور وقت کو خوشگوار بنانے کے لئے مضحکہ خیز سا جواب دیا اتنے میں ساحل آ گیا۔ ہم نے ایک کشتی والے کو آواز دی، وُہ کشتی لایا اور ہم سب اُس میں اطمینان سے بیٹھے جیسے کسی ناگہانی میں پھنسے ہوئے تھانے سے چھوٹ کر آئے ہوں۔ اب سُورج کا جھُومر رہی سہی تاریکی کو ہنکا رہا تھا، کرنوں کی چھوٹ سے کشتی کے سامنے والے وہ نشانے پانی پر نظر نہیں جمتی تھیں۔ جب کماڑی کے گھاٹ پر کشتی لگی اُس وقت اچھی خاصی روشنی ہو گئی

برن: رُوپ، صُورت، شکل، ہیئت کذائی، لباس، چولا۔

تھی اور سمندر کی موجوں کا نیلا قالین دُور تک ہلکورے لے رہا تھا خُدا خُدا کرکے قیام گاہ پر پہنچے۔ مَیں تو فوراً سو گیا کیونکہ رات کو برپا ہونے والے مشاعرے کی صلیب پھر میرے سامنے تھی۔ عرشؔ ملسیانی[1] کسی کراچی کے کھلاڑی سے شطرنج کھیلنے لگے اور جگنؔ ناتھ تھک کر چارپائی پر دراز ہو گئے۔

بساطِ ادب

جب مَیں ادبی دُنیا میں آنکھیں کھول رہا تھا اس وقت جناب جوشؔ ملسیانی، تلوک چند محرومؔ، محمد دین تاثیرؔ، مولینا تاجورؔ، عبدالمجید سالکؔ، میلارام وفاؔ اور نشترؔ جالندھری کے علاوہ حفیظؔ جالندھری، عبداللطیف تپشؔ، اختر شیرانی اور عدمؔ میری سطح سے بلند اور عمر کے اعتبار سے قابلِ احترام تھے اس کے بعد جب ذرا ان لوگوں کے نزدیک سے گزرا تو صُوفی غلام مصطفٰے تبسّمؔ، سیّد عابد علی عابدؔ اور رہبر چند اخترؔ کو بھی اسی صف کے لوگوں میں پایا لیکن وہ میرا ایسا زمانہ تھا کہ ابھی میری صلاحتیں چھان پھٹک تک نہیں آئی تھیں۔

مَیں ان میں سے کسی کے فن سے بھی متاثر نہیں ہُوا، اس کی اصل وجہ غالباً یہ تھی کہ ان میں کوئی بھی میرے طریقِ فکر کا شاعر نہیں تھا یعنی کسی کے کلام میں طبقاتی کشمکش سے بیزاری اور پس ماندہ طبقے سے ہمدردی کا اظہار نہیں تھا، یہ لوگ علمی، ادبی طور پر اپنی اپنی جگہ ایک ستوُن کی حیثیت ضرور رکھتے تھے لیکن جو چنگاری میرے سینے میں سلگ رہی تھی وہ ان کے حلقۂ ذوق سے باہر کی چیز تھی، ان میں کوئی بھی مزدوروں کی زبوں حالی اور کسانوں کی پائمالی سے آگاہ نہیں تھا، ان کا رنگِ تغزّل اُس دَور کے جمالیاتی رُخ کا پابند تھا۔ یہی سبب تھا کہ اکثر اجارہ دار دولت کو سینت کر رکھنے والے اور خوش حال دانشور، میری نظموں پر ناک بھوں چڑھاتے اور سُننے والے اُن کے رویّے سے اپنے خون میں کھولن لے کر جاتے اور پھر مجھے اپنے حلقے میں اچھے الفاظ سے یاد کرتے۔

---

[1] جناب عرشؔ ملسیانی شطرنج کے ماہر کھلاڑیوں میں سے ہیں

میری نظر میں وہی آدمی بلند اور وہی شعر معیاری تھا جو عوام کے معاشی اور اقتصادی مسائل کا حامل تھا اور وہی دانشور میری نظر میں دانشور کہلانے کا مستحق تھا جو نوجوانوں میں سیاسی شعور بیدار کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسے دانشوروں کو آنکھیں ترس جاتی تھیں کیونکہ ایسے افراد تو ہر دور میں آٹے میں نمک کی طرح پائے گئے ہیں۔

اس وقت جناب فیض گورنمنٹ کالج لاہور کے طلبائے قدیم میں آ گئے تھے اور احمد ندیم محکمہ آبکاری کی سب انسپکٹری کی خدمت سے سبکدوش ہو چکے تھے، احمد ندیم میں شروع ہی سے انسان دوستی کا جذبہ بیدار تھا، ان کا دل طبقاتی کشمکش سے نالاں اور انسانی ہمدردی سے لبریز تھا لیکن ابھی اُن میں آج جیسے تصوراتِ حیات کے وہ تیور تیکھے نہیں ہوئے تھے جن پر بعد میں ایک جان لیوا آب و رنگ آیا ہے۔ مجھے اُسی وقت سے ندیم سے ایک والہانہ سی محبت ہے، اس میں جہاں ان کے شاعرانہ کمال کا دخل ہے وہیں کلام میں اخلاقی قدروں کا ایک حسین انداز سے کاغذ پر اُترنا بھی ہے اور اندازِ بیان بھی،

فیض احمد کالج کے زمانے میں بھی آج کی طرح ہی شعر کہتے تھے اور اس وقت بھی ان کے کلام میں ایسے ہی افسوں تھے جیسے آج ہیں، یہی سُبک سُبک اشارات اور یہی جاذبِ توجہ اظہارِ جذبات ان میں شروع ہی سے موجود تھا، وہی لطیف ایمائیت اور طلب افزا ایہام جو آج بھی اُن کا طرۂ امتیاز ہے۔ اُس وقت بھی لہجے اور بیان کے اعتبار سے دھار دار اور دل نشین تھا۔

البتہ تقسیم ملک کے بعد جب ان کا رجحان اور عمر کی اُٹھان سیاست اور مطالعۂ سیاست کی طرف رجوع ہوئی تو اُن کی رومانی شاعری کو اپنے تصورات کے ساتھ عزائم اور عزائم کے ساتھ عمل پہ مجبور ہونا پڑا یہ دیوانگی سہی لیکن اس جنون میں فیض نے اس دور کے ادب کو ایک خوشنما اسلوبِ بیان دیا ہے جس سے ملک کا ہر نوجوان متاثر ہے اور

...ن فیض کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ ہے لیکن ان کی تقلید کرنے والے یہ نہیں جانتے کہ فیض کا کلام فیض کے کردار کے سائے میں جھلکار دیتا ہے اس کا معمولی سا معمولی اشارہ عوام کے تصورات کو اس کے ماضی کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور اس کا یہ وصف ہمیشہ ماضی کے ہاتھ میں ہاتھ لے کر چلا ہے ع

ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اس بلندی کے لئے تو ارتکابِ عمل کی ضرورت ہے۔ ہر چند کہ آج ان کی ابہامیت اور اشاریت کو نوجوان شعراء نے فیشن کے طور پر اختیار کر لیا ہے اور بعض نوجوان تو گمراہ ہو کر بے معنویت کے جھاڑ جھنکاڑ میں پھنس گئے۔ یہ لوگ خود کو ندیم اور فیض سے بلند خیال کرتے ہیں مگر فیض اور ندیم کے یہاں یہ الجھاؤ اور بعید از فہم ابہام کہاں ہوتا ہے کہ شعر سُن کر انسان مفہوم تک نہ پہنچ سکے۔

دورِ حاضر کے اِن مقلدوں کا گروہ تو جلد اور صاف مفہوم دینے والے اشعار کو اپنے فن کی توہین سمجھتا ہے، ہر شخص گرتے پڑتے بننے کی فکر میں ہے اور دو چار دس سمیل لئے پھرتا ہے اگر شعر کے معنی دریافت کئے جائیں تو اٹ شنٹ بیان کرتا ہے۔ نہ جانے اس گمراہی کا ذمہ دار کون ہے؟ اور آنے والی نسلیں اِن کی اِس بے مقصد شاعری سے کیا اخذ کریں گی، جبکہ وہ رفتار کی دھول میں چھپ کر منزل کی تلاش کے دعوے دار ہیں۔

گورنر ہاؤس

اب میری آدم آشنائی یہاں تک آ گئی تھی کہ بعض بعض اوقات تفریحاً آنے جانے والے لوگ بار گزرنے لگے تھے، آخر میں نے تنگ آکر فیروز الدین سے کہا کہ اپنے والد صاحب سے کہہ کر مجھے گورنر ہاؤس کے مالیوں یا قلیوں میں جگہ دلوا دو۔ اس کے والد میاں مہتاب الدین وہاں کے ہیڈ مالی تھے۔ فیروز کی سفارش سے

اُنھوں نے مجھے نائب باغبان کے طور پر رکھ لیا، اگرچہ وہ بھی ایک طرح کا قلی ہی ہوتا ہے مگر باغبانی کے اصول وضوابط اور موسموں کے مزاجوں کے علاوہ پھولوں کی نشوونما اور آب وہوا سے نباتات کے رشتوں اور تعلقات پر اچھی خاصی سوجھ بوجھ ہو جاتی ہے لیکن میرے پیشِ نظر یہ بات نہیں تھی میں تو صرف تنہائی اور زیادہ سے زیادہ مطالعہ اور مشاہدہ چاہتا تھا، جس کا وہاں امکان تھا۔ کیونکہ کوئی بھی اجازت کے بغیر گورنمنٹ ہاؤس کے احاطے میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا۔ میں نے دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی دیکھا کہ درخت زعفرانی پتّوں کے فرغل پہنے کھڑے ہیں اور روشوں پر رنگ رنگ کی کلیاں سبز پتّوں کی اوڑھنیوں میں مُنہ لپیٹے ٹہنیوں پر جھول رہی ہیں وہاں جاکر جب مجھ پر باغبانی کے متعلق رازہائے سربستہ کھُلنے لگے تو میں نے شدّت سے محسوس کیا کہ باغبانی تو نہایت وسیع اور بلند فنِ لطیف ہے۔ اگر قدرت ساتھ دے اور ذوقِ نظر عطا کر دے تو پودوں کی خوراک کے کارخانے پھولوں کے رنگوں اور خوشبوؤں کے فارمولے سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ جنگلی خود رَو پھول بوٹے اور عقاقیر کی مختلف النوع نسلیں اپنی ذات پات اور اصل وطن بتانے پر مجبور ہو جاتی ہیں، یہی نہیں آخر میں تو کانٹے دار جھاڑیاں اپنے خاندانی شجرے بیان کرنے لگتی ہیں اور مہکیلی ہوائیں اپنے مرکزوں کا پتا دینے میں عذر نہیں کرتیں۔ علی الصّبح جب جنگل کی پاکیزہ ہوا میں معصوم کرنوں کی آمیزش ہر شے کو بیدار کرنے لگتی اور زرد کرنیں سبزے کی پلکوں کے قطرے چننے میں مصروف ہو جاتیں تو میں اس بے تکلف اُجالے میں کھُرپی اور قینچی لے کر کام کی طرف چل پڑتا۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا تھا کہ اب مجھے تمام دن لالہ وگُل کی نبضیں دیکھنے، رنگوں کے تغیّر وتبدّل، چھالوں کی دھاریوں اور سلوٹوں کے علاوہ پتّوں کی سبز شکنوں کے ساتھ زرد جھُرّیوں سے اُن کے امراض پہچاننے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا جب کام کا وقت ختم ہو جاتا تو کبھی کہیں سبزے پر کبھی ٹیلے پر جا بیٹھتا اور فضا کی حریری چادر سے چھن کر آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے میری پیشانی سہلانے لگتے

اور مجھ پر ایک قسم کی غنودگی طاری ہو جاتی۔

اسی طرح کبھی کسی کنج میں اور کبھی تالاب کی بلندی سے ڈھلوان پر بیٹھ کر مطالعہ اور مشاہدہ میرا مشغلہ قرار پا گیا تھا۔ بجلی کی روشنی میں شفاف سڑکیں اور چاندنی میں سوئے ہوئے پھولوں کے قطعات مجھ سے مخاطب ہوتے معلوم ہوتے تھے۔ علی الصبح جب میں اُٹھ کر کام پر جاتا تو سبزے کے شبنم آلود پلاٹ کھلے ہوئے ستاروں کے قطعے نظر آتے۔ سبزے کی ہری جاجم پر کرنوں کے کندنی تاروں کی جھنکاریں اور صبح کی ٹھنڈی ہواؤں کے سیلاب میں خوشبوؤں کے بجرے اور اُجالے کے چھالے مجھے چھو کر گزرنے لگتے۔ دوپہر کو کھانے سے فارغ ہو کر جب میں کسی درخت کی چھاؤں میں اپنے بازو کا تکیہ لگا کر لیٹ جاتا تو کانٹوں پہ جھینگریوں کی تھرک اور پھولوں پہ تتلیوں کے رقص کے دائرے اور پیپل کے سایوں کی پتی پتی سے سرگوشی مجھے سونے نہ دیتی، میں آرام کی غرض سے کروٹ بدل لیتا لیکن اُدھر بھی ہلکتے سایوں سے لپٹا ہوا اُجالا آواز دے لیتا، میں آنکھوں پر اپنی پھٹی آستین ڈھک لیتا لیکن کسی نہ کسی درز سے کوئی نہ کوئی اُجالے کی لکیر میرے سامنے آنکھیں مٹکانے لگتی۔ غرضیکہ آرام کے وقت میں بھی قدرت مجھ سے برابر یہی "دائیں مچونا" کھیلتی رہتی اور وقت گزر جاتا۔

میری رُوح اور بدن کو وقت اور ارتقا کی بھٹیوں میں جس قدر آنچیں دی جا رہی تھیں، اُسی قدر میرے احساس میں شدّت اور عزائم میں پختگی آتی جا رہی تھی، رات کو کبھی کبھی جب میں تالاب پر جا بیٹھتا تو پانی میں جگنوؤں کے عکس سے شراروں کی لچکتی ہوئی کمانوں کا میلہ سا لگا معلوم ہوتا۔

ایک دن مجھے مالی کے ساتھ گملوں میں پھول لگانے کے لئے گورنر صاحب کی کوٹھی میں جانا پڑ گیا، وہاں کے ٹھاٹھ دیکھے تو عقل دنگ رہ گئی۔ میری نگاہوں میں غریبوں کے جھونپڑے پھرنے لگے اور یہ خیال میرے درپئے آزار ہو گیا کہ اس آرام و آسائش کے

چھالا:- چھال - بوچھاڑ

بادصف گورنر جو اس کوٹھی میں رہتا ہے اور تمام صُوبے کا اَن داتا کہلاتا ہے مزدوروں، کسانوں اور پس ماندہ طبقے کے لئے کیوں سہُولتیں بہم نہیں پہنچاتا ؟ آخر کون سی مجبُوری ہے اور ان لوگوں کی بیداری کا کونسا موسم آئے گا ۔ بلندی اور پستی اپنی جگہ درست ، لیکن یہاں محنت کا صلہ اور مشقّت کی قیمت کیوں نہیں ملتی ۔ اگر مزدوروں ، مالیوں ، چپراسیوں اور چوکیداروں کو پیٹ بھر کھانے اور تن ڈھانکنے میں آسانی ہو جائے تو کیا وہ ان بلند منصب لوگوں کے وفادار نہیں رہیں گے ؟ آخر ایسا کون سا خطرہ ہے جس کے تحت یہ لوگ نچلے طبقے کی پرورش کی طرف قدم نہیں بڑھاتے اور انھیں اپنا محتاج بنائے رکھتے ہیں ؟

نکلتے ہُوئے نومولُود سورج کی روشنی شربتی آئینوں سے چھن کر پالش سے چمکتے ہوئے زینے پر پڑ رہی تھی ، میں مالی کے ساتھ نکلا تو سامنے سرو کی چوٹی پر مُسکراتا ہُوا سُورج دار پر منصُور کے چہرے کی طرح جھلک رہا تھا ، پھر تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ جب بھی میں تنہا بیٹھتا تو گورنر ہاؤس کے ٹھاٹھ باٹ اور مزدوروں کے خستہ و خراب حال کے درمیانی فاصلے ہی پر سوچتا رہتا ، اگرچہ اُس وقت مجھے اپنی خاموشی میں نغموں کی آہٹ اور تنہائی میں مستقبل کا سراغ ملنے لگا تھا لیکن نغموں کے جنین ابھی حرکت و حیات سے محروم تھے اتنا ضرور تھا کہ مجھے غزلوں کی گھسی پٹی روایتی شاعری اور حسن و عشق کے اچھے سے اچھے چٹکلوں سے نفرت ہوتی جا رہی تھی ، میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ اب تک شعراء کا طبقہ انسانی زندگی کے مطالعہ و مشاہدہ سے محروم کیوں ہے ؟ ان کی نظر میں یہ بلندی و پستی کا تقابل ابھی تک کیوں نہیں آیا ؟ وہ بادشاہوں اور نوابوں کے نمک خواروں کی تقلید میں اُن ہی جیسی شاعری کرتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ قدیم شعراء تو بادشاہوں ، نوابوں اور رئیسوں کے وظائف پر پلتے اور زندہ رہتے تھے اس لئے ان کی شاعری بھی انھیں کی خوشنودی کے لئے تھی اور وہ اپنے مسلکِ وفا میں بالکل درست تھے لیکن آج جو شعراء عوام کا کھاتے ہیں ، عوام کے رحم و کرم پر پلتے ہیں وہ عوام کی ترجمانی کیوں نہیں کرتے ؟

وہ عوام کے خیر خواہ کیوں نہیں بنتے ؟ عوام کے دُکھ تکلیف کو ادب کیوں نہیں بناتے ؟ اور اُن کے مصائب پر قلم کو جنبش کیوں نہیں دیتے ؟ کیا یہ دم توڑتا ہُوا ماحول اور نیم جان معاشرہ شعر و ادب میں منضبط نہیں ہو سکتا ؟

یہی سبب تھا جس نے مجھے میر انیس، نظیر اکبر آبادی، ڈاکٹر اقبالؒ، جوش ملیح آبادی کے علاوہ ان تمام شعراء و ادبا کی طرف متوجہ کر دیا تھا جن کے کلام اور دیگر اصناف ادب میں انسانی زندگی کی ترجمانی جھلکتی تھی۔ کیونکہ ان کے شعر و ادب میں مجھے اپنی آرزوں کے عکس بولتے نظر آتے تھے حالانکہ ان میں کوئی بھی میری سطح سے اُٹھکر نہیں آیا تھا لیکن ان کی بیانیہ اور ایمائی شاعری میں مجھے اپنی شاعری کی سمتیں اُبھرتی دکھائی دیتی تھیں۔

گورنر ہاؤس میں جو قُلی میرے ساتھ رہتا تھا وہ کوئی ایسا بُرا شخص تو نہیں تھا، لیکن کام چور، سہولت پسند اور گھس قسم کا آدمی تھا، یہی وجہ تھی کہ وُہ بادلِ ناخواستہ جو کام کرتا راند کاٹتا اور بیگار خیال کرتا۔ چھٹی کے بعد میرا کھانا بھی پکا دیتا تاکہ میں بڑے مالی سے اُس کی شکایت نہ کروں، لیکن یہ دھاندلی کب تک چلتی بڑے مالی نے بھی اس کی اس حرام خوری کو بھانپ لیا، اور اُسے بُری طرح ڈانٹا، وہ یہ سمجھا کہ مَیں نے ہی بڑے مالی سے اُس کی شکایت کی ہے۔ چنانچہ اُس نے اچانک مجھ سے کہا کہ آج سے یا تو ہم تم الگ الگ روٹی پکایا کریں یا پھر ایک دن تمہاری روٹی میں پکاؤں اور ایک دن میری روٹی تم پکاؤ!۔ اُس کے تیور کچھ تلخ سے تھے، مَیں نے پُوچھا آخر یہ کیا اور کیوں ہو رہا ہے ؟ اُس نے کوئی جواب نہ دیا اور یہی کہتا رہا کہ اپنا کام خود ہی کرنا اچھا ہوتا ہے میں نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں کہا کہ تُمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اور کچھ نہیں! اگر تُم کچھ کہو تو میں تمہیں مطمئن کر دوں لیکن وُہ چپ سادھ گیا۔ میں نے کہا اچھا ایک دن تم میری روٹی پکاؤ اور ایک دن میں تمہاری روٹی پکاؤں گا،

کچھ دنوں یہی سلسلہ چلتا رہا ایک دن وہ روٹی پکاتا اور دوسرے دن یہ فرض میں انجام دیتا لیکن اس کے باوجود میں محسوس کرتا اور دیکھتا کہ وہ مجھ سے خوش نہیں ہے اور ذرا ذرا سی بات پر اپنے چڑچڑے پن کا اظہار کرتا ہے۔ میں نے اسے ڈانٹا اور کہا کہ یاد رکھو اس طرح تم میرے پاس نہیں رہ سکتے کوئی اور جگہ تلاش کرو ورنہ میں تمہاری شکایت میاں صاحب سے کر دوں گا، اس نے اس فقرے پر باولے کتے کی طرح میری طرف دیکھا اور ذرا سوچ کر کہا کہ تم میاں صاحب سے شکایت نہ کرو جس طرح تم کہہ گے میں اسی طرح رہوں گا۔ میں یہ سن کر مطمئن ہو گیا۔ اسی دن شام کو وہ سودا سلف لینے بازار گیا، اور واپسی پر جب وہ اپنے کپڑوں کے بکس کی طرف جھکا تو اس کی جیب سے ایک شیشی نکل پڑی اور لڑھک کر میرے پاؤں تک آگئی میں نے اسے اٹھایا تو وہ خلاف توقع وزنی تھی جیسے فولاد پگھلا کر بھر دیا ہو، میں نے پوچھا اس میں اس قدر وزنی چیز کیا ہے؟ اس نے صرف اتنا کہہ کر شیشی میرے ہاتھ سے لے لی کہ "کچھ نہیں دوائی ہے"۔ میں نے اس پر حجت کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس نے اسے فوراً بکس میں رکھ لی۔

اب اس نے کھانا پکانے کے معاملے میں میری باری منسوخ کر دی تھی اور روزمرہ خود ہی کھانا پکانے لگا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ بڑے مالی سے کس قدر ڈرتا ہے کہ مجھے شکایت سے باز رکھنے کے لئے روز دونوں وقت خود ہی روٹی پکانے لگا، چونکہ بڑے مالی میاں مہتاب دین مجھ پر مہربان تھے اس لئے ان کی مہربانی میرے حق میں اور بھی قیمتی ہو گئی میں نے اپنے ساتھی سے کہہ دیا کہ تم اپنا آٹا خرید کر نہ لایا کرو میرے ساتھ ہی کھانا کھا لیا کرو، اس پر اس نے ایک دو بار رسمی سا انکار کیا اور پھر خاموش ہو گیا۔ شام کو کھانا تیار ہوا اور میں نے اسے اپنے ساتھ کھلانا چاہا مگر اس نے انکار کر دیا اور کہا۔ تم کھا لو میں بعد میں کھا لوں گا، اس دن سے میرے بعد کھانا اس کا معمول ہو گیا، اب کھانا پکانے کے وقت کی بچت میرے لئے اور بھی نعمت غیر مترقبہ تھی میں نے اس فرصت کو

بھی اپنے مطالعہ اور مشاہدہ میں شامل کر لیا، جس میں شعر و شاعری بھی داخل تھی۔

وہاں کے مزدوروں اور قلیوں میں میرا دل بالکل نہ لگتا اگر کبھی کچھ دیر اُن میں رہنا پڑتا تو خوشی کے بجائے اُن کی چھیچھلی اور ہلکی باتوں کے علاوہ بازاری مذاق سے گھٹن سی ہوتی اور یہ آرزو زیادہ شدید ہو جاتی کہ کسی طرح ان کی محنت و مشقت کی صحیح داد ملے کم از کم کھانے پہننے اور بچوں کی تعلیم کے لئے کوئی پریشانی نہ ہو مگر ماحول میں ایسے آثار دُور دُور تک پتا نہ تھا۔ دن بھر خون پانی ایک کر کے مزدور کو صرف دس بارہ آنے ملتے تھے اگرچہ یہ میرے وطن کاندھلہ کی مزدوری سے تین گُنا تھے، لیکن یہاں کا معیارِ زندگی شرفا کی زندگی کو اجیرن کئے ڈالتا تھا۔

سیماب دے دیا

مہینہ بھر کے بعد ماہِ صیام شروع ہو گیا اور حسبِ سابق سحری اور افطاری کی تیاری میرے ساتھی نے اپنے ہی ذِمّے رکھی، اور بڑے اطمینان سے کھانا پکاتا رہا۔ ایک دن رات کو مغرب کے بعد کوارٹر سے باہر میں مسور کی دال سے روٹی کھا رہا تھا۔ کھاتے کھاتے رکابی میں موتی کی طرح چمکتی ہوئی کوئی شے دکھائی دی۔ میں نے اُسے اُٹھانا چاہا تو ہاتھ نہ آسکی بلکہ پس کر چٹکی سے نکل گئی۔ میں نے روٹی کے ٹکڑے سے دال اِدھر اُدھر کر کے نکالنا چاہا تو معلوم ہوا کہ دال کی تہ میں تو پارہ ہی پارہ بھرا پڑا ہے اور نہ معلوم میں کس قدر کھا چکا ہوں۔ میرا ساتھی تو فوراً رفو چکر ہو گیا، مگر مجھے فکر ہوئی کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ کیونکہ میں پارے کے متعلق مختلف قسم کے نقصانات سُن چکا تھا۔ میں اُسی وقت ڈاکٹر کے یہاں گیا تو وہ بھی متعجب ہو گیا اور مجھے فوراً قے کرائی اور کچھ دستوں کی دوا دی جس سے مجھے رات بھر دست آتے رہے اور صبح تک نڈھال ہو گیا، میں نے چاہا کہ کام پر نہ جاؤں مگر میرے فیرسٹ چودھری فیروز نے کہا چھٹی نہ لو اور تمام دن میرے ساتھ رہو، وہ کوٹھی میں جا رہا تھا۔ گلدانوں میں پھول سجانے کے لئے مجھے ساتھ لے گیا، مجھے نقاہت تو تھی ہی، اس کے ساتھ طرح طرح کے خیالات نے میرے دل و دماغ

میں ہل چل سی مچا دی، میں چودہری فیروز کے ساتھ چل پھر تو رہا تھا مگر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے قدم زمین پر نہیں اور میں فضا میں ڈول رہا ہوں، کملائے ہوئے کراہتے غنچے اور سردآہیں بھرتا سبزہ مجھے متوجہ کر رہا ہے۔ میری آنکھوں کے سفینے ریت برساتی ہوئی آندھی میں پھنسے ہوئے ہیں، اور کہیں کہیں غبار میں پھنسا ہوا اُجالا رحم طلب نگاہوں سے سورج کی طرف تک رہا ہے، اس وقت مجھے انگیٹھیوں پر پھولوں بھرے گلدان زخموں کے گلدستے اور شبنم سے چھپے ہوئے سبزے کے اونچے نیچے پلاٹ آنسوؤں کے کھلیان نظر آ رہے تھے۔

سامنے والی سڑک پر سفیدے اور سرو کے درخت سولیوں کی طرح خاموش تھے اور ان کی شگفتہ بری سے میری رُوح لرز رہی تھی، میں شیرخوار سورج کی درختوں سے چھنی ہوئی دھوپ میں عجیب عجیب غمگین تصریریں اور شکستہ مکانوں کے ڈیزائن پا رہا تھا۔ مگر پاؤں فیروز دین کے ہم قدم چل رہے تھے۔ جب فیروز کوئی بات کرتا تو میں اُس کی مرضی کے مطابق مختصر سا جواب دے دیتا، تاکہ بات طول نہ پکڑ جائے کیونکہ نقاہت کے باعث زندگی کی لَو مدھم ہو رہی تھی۔ اِس عالم میں نوشگفتہ گُلِ تسبیح کے دہکتے ہوئے قطعے بہاروں کی تعزیہ داری سے ملنے لگے تھے۔ مجھے گُم سُم دیکھ کر فیروز نے کہا جاؤ کوارٹر میں آرام کرو آج کام کچھ زیادہ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے میں خود کر لوں گا۔

اتنے میں بڑے مالی چودہری مہتاب دین آگئے اور مجھ سے کہا۔ اُٹھو چلو اس واقعہ کی تھانے میں اطلاع دو، میں خاموش رہا۔ اُنھوں نے پھر وہی فقرہ دُہرایا۔ اور میں نے جواب میں صرف یہ کہا کہ "جناب جو کچھ ہونا تھا ہو گیا، میں تھانے میں جا کر وقت ضائع کرنے کو تیار نہیں"۔ چودھری صاحب منہ پھیر کر چلدئے جیسے ناراض ہو گئے ہوں میں نے آواز دی کہ چودہری صاحب "سنیئے تو سہی!" اس پر اُنھوں نے دُور سے ہی میری طرف منہ کر کے صرف اتنا کہا، "مجھے تمہارے پیغمبری معاملات میں کیا دخل ہے"؛ آرام

کردآرام!"

میں خاموش رہ گیا نہ جانے میرے دل میں کن کن خیالات کی بھیڑ لگ گئی اور طبیعت ایسی گھبرائی کہ پسینے آگئے۔ میں وہاں سے اٹھ کر گلاب باڑی کے قریب آکر بیٹھ گیا، میری غموں سے پٹی ہوئی عمر اور ویران و پریشان ماضی میرے سامنے موجود تھا لیکن حال کے متعلق کوئی فوری فیصلہ میرے بس کی بات نہیں تھی، اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ یہاں سے مجھے کوئی پگڈنڈی مستقبل کی بلندی کی طرف جاتی نظر نہیں آتی تھی۔ آخر بڑی دیر کے بعد دل نے فیصلہ کیا کہ اس محدود فضا میں ہر چیز محدود ہے۔ باہر کی کھلی فضا میں ممکن ہے کوئی روشنی نظر آئے یا کوئی رہنما نصیب ہو جائے۔ یہ خیال دماغ میں اس ہنگامے کے ساتھ آیا کہ مجھے وہاں سانس لینا دوبھر ہو گیا اور اسی وقت استعفےٰ دے کر باہر نکل آیا۔ دروازے پر آیا تو فیروز نے مجھے پکڑ لیا اور کہا "بھائی! کہاں چلے؟" میں نے صرف اتنا کہا "ملک خدا تنگ نیست۔ شام کو ملاقات ہوگی۔"

شام کو میں فیروز کے گھر گیا اور اُن کے والد مہتاب دین کا شکریہ ادا کیا اور انھیں یقین دلایا کہ "مجھے آپ کے رویے سے کوئی شکایت نہیں وہاں سے میرا جی اُچاٹ ہو گیا تھا اس لئے نکل آیا ہوں!" مہتاب دین صاحب نے کہا "اچھا میاں تم جانو اگر تنخواہ کے دن تو آجانا، وہ تو تمہارا حق ہے، تمہاری محنت ہے۔"

پھر میں اور فیروز باہر آگئے اور مختلف ذکر و اذکار ہونے لگے۔ اس کے بعد میں نے مزدوری کی تلاش شروع کر دی اور شب و روز افکار و ملال میں گزرنے لگے مگر اب میں زیادہ پریشان نہیں تھا کیونکہ میرا جسم مصائب کی نوعیتوں کو پہچان چکا تھا۔ لیکن بے روزگاری تو آخر بے روزگاری ہے۔ دل کو یکسوئی نصیب نہیں ہوتی۔

نقل مکانی

ایک دن فکر معاش میں پھرتے پھرتے شام کو گھر پہنچا تو بُری طرح تھک گیا اور اُسی اعضا شکنی میں خیال کیا "بی بی پاکدامن"

کے احاطے کے بجائے اب سکونت کسی اور جگہ کیوں نہ اختیار کی جائے کیونکہ اس احاطے کے تمام ساتھی ایک ایک کر کے مستقر بدل چکے تھے اور پڑوس میں ایسے لوگ آ بسے تھے جن کی ہمسائیگی مجھے پسند نہ تھی۔ اُنھیں دنوں ایک معتبر شخص سے معلوم ہُوا کہ مزنگ[1] کے محلہ کوٹ عبداللہ شاہ کے شروع میں دائیں طرف کا دوسرا مکان خالی ہے مگر یہ افواہ بھی ہے کہ یہ مکان چار برس سے اِسی طرح خالی چلا آ رہا ہے کہا جاتا ہے کہ اس میں آسیب ہے جو یہاں آ کر رہتا ہے چند روز میں تباہ و برباد ہو جاتا ہے، امراض و اموات دونوں اِس مکان کی خصوصیات میں سے ہیں۔

مَیں مالک مکان کے پاس گیا تو اُس نے یہ چودہ روپے ماہانہ کرایہ کا مکان مجھے ساڑھے چار روپے ماہانہ پر دے دیا۔ آس پاس کے کئی لوگوں نے مجھے سمجھایا کہ یہ مکان بھاری ہے اس میں جو بھی رہا جنازے پر ہی نکلا، سامنے کے مکان والوں نے کئی بار اس میں جنوں کو چلتے پھرتے دیکھا ہے اور وقتاً فوقتاً اب بھی دیکھتے ہیں۔ مَیں نے جواب میں کہا "جناب اگر مجھے جِنوں نے مار ڈالا تو زندگی کے عذاب سے نجات ملے گی اور اگر دوستی ہو گئی تو وارے نیارے ہیں، مزے آ جائیں گے۔ اب تو مالک مکان کو زبان دے دی ہے جو خدا کرے سو ہو۔"

اس مکان کے بالمقابل بلوچوں کی ایک حویلی ہے جو یہاں کے قدیم باشندے ہیں اُن میں بزرگ تصوّف کی طرف مائل ہیں اور نوجوان تجارت یا ملازمت کرتے چلے آ رہے ہیں۔

مَیں نے جس دن یہ مکان لیا اُسی دن شام کو اُن کے دو بزرگ صوفی شبیر علیخاں اور صوفی جلال الدین میرے پاس آئے اور رسمی سلام دُعا کے بعد فرمایا "ہم آپ کو جانتے ہیں، آپ شریف انسان ہیں اور آپ کو آگاہ کرتے ہیں کہ اس مکان میں کوئی

---

[1] لاہور شہر کے جنوب میں ایک نواحی بستی ہے جو اب تنگ کر کے لاہور کا ایک محلہ شمار ہوتی ہے۔

آسیب وغیرہ نہیں آپ اطمینان سے رہیں"۔ چنانچہ اُن لوگوں کی ہمسائیگی سے مجھے ایسا اطمینان ہُوا کہ بالکل اعزّا کی طرح تعلقات ہو گئے اور اب تک اُن کے خاندان بھر سے ویسے ہی مراسم چلے آ رہے ہیں۔ شادی اور غم کے موقعوں پر اپنے عزیزوں کی طرح شرکت ضروری ہے۔ ابھی اس مکان کو لئے دو چار دن ہی گزرے تھے میں دن بھر کا تھکا ہارا رات کو دوسری منزل کے شہ نشین پر جا کر لیٹ گیا۔ برساتی کا اگلا حصّہ تمام لکڑی کا تھا اور لکڑی کی دیوار سے ملا ہُوا چولھا جس پر توا صاف کرنے کی صافی پڑی تھی اس کا کچھ حصّہ پارٹیشن کی دیوار سے مل گیا تھا۔ میں نے سگرٹ پی کر پھینکا تو اتفاق سے صافی پر جا گرا اور میں سو گیا۔

سگرٹ سے صافی سلگتی رہی آخر آہستہ آہستہ پارٹیشن نے آگ پکڑ لی جب پارٹیشن بھڑک اُٹھا تو پڑوسیوں نے مجھے آوازیں دے کر جگایا، میں اُٹھا تو قدِ آدم تک چوبی دیوار جل رہی تھی۔ اور شعلوں کی جھرجھراتی نیلی زبانیں ایک دوسرے کی طرف لپلپا رہی تھیں۔ ان شعلوں کی جھڑپ میں ابھی ہار جیت باقی تھی میں لپک کر گھڑوں کی طرف گیا، وہاں دیکھا تو صرف ایک گھڑے میں پانی تھا، میں نے حواس درست کر کے نیچے صحنی رکھی اور شعلوں سے اوپر پارٹیشن پر کبھی گلاس اور کبھی دونوں ہاتھوں سے پانی ڈالنا شروع کیا۔

تھوڑی دیر میں آگ تو بجھ گئی لیکن لکڑی کے پارٹیشن کو جھنجھلاتے ہوئے شعلوں نے بھنبھوڑ ڈالا تھا، تمام چوبی دیوار پر کوئلوں کے چٹخنے سے درزیں ہی درزیں کھل گئی تھیں جیسے گرمیوں میں خشک ہونے پر تالاب درزوں کے مختلف خطوط سے بھر جاتے ہیں۔ اسی وقت سے جب کبھی میں سگرٹ پھینکتا ہوں تو وہ آتش زدگی سامنے آ جاتی ہے۔

صوفی شیر علی اور صوفی جلال الدین اکثر مجھے اپنی جوانی کے کارنامے سنایا کرتے

جن میں بہادری کے ساتھ غریبوں کی امداد کا عنصر بھی پایا جاتا اور یہی سبب تھا کہ میں اُن سے بہت جلد مانوس ہوگیا تھا وہ دونوں بزرگ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ خدا اُنھیں جنّت عطا فرمائے اُن کے بچّے میرا اُسی طرح ادب کرتے ہیں۔ جلال الدین صاحب کے ایک بھائی احمد خان بھی تھے جن کا انتقال اُن کے بعد ہوا۔ وہ بھی اپنی خاندانی اور نسلی خصوصیّات سے بھرپُور تھے۔

معاصرانہ چشمک کوٹ عبداللہ شاہ میں چھوٹا جرم کر کے بڑا شور مچانے والوں کی بھی کمی نہیں لیکن مہر جنن دین[1] جیسے بُردبار مہر محمد شفیع جیسے شریف لوگ بھی ہیں جن کے بشرے اُن کی شرافت اور کردار کے آئینہ دار ہیں چودہری محمد حسین بھی کوٹ عبداللہ شاہ ہی کے ایک فرد ہیں جو اپنی جگہ منفرد سوجھ بوجھ کے انسان ہیں۔ ایک دن مجھے ایک نوجوان نے گھر سے نکلتے ہی للکارا اور پُوچھا "تُو کون ہے، کہاں سے آیا ہے؟"

مَیں۔ "ابھی بتاتا ہُوں" یہ کہہ کر میں نے سامنے کتب خانہ کا دروازہ کھول دیا اور اندر بُلا کے بٹھالیا، پھر چُپکے سے اُٹھ کر دروازہ بند کر کے اندر کی کنڈی لگا دی، مَیں نے دروازہ بند کیا تو وہ ذرا گھبرایا لیکن اپنی جگہ سے اُٹھا نہیں کیونکہ ڈیل ڈول میں وہ مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔

مَیں۔ "تم نے مجھ سے جس انداز میں گفتگو کی ہے وہ شریفانہ انداز نہیں بلکہ بدمعاشوں کا طریقہ ہے میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ لڑنا جانتے ہو یا سیکھا ہے؟"

وہ۔ "سیکھا ہو یا نہ سیکھا ہو، جانتا ہوں۔"

مَیں۔ "کھڑے ہو جاؤ اگر جانتے ہو؟"

وہ جھلا کے کھڑا ہو گیا اور ہاتھ مروڑنے کے لئے پکڑا، مَیں نے وہیں خونی دستی[2] کی۔ وہ آن کی آن میں زمین پہ آرہا اور میں نے "تک و دو نہیں کی۔

---

[1] مہر جنن دین کا بھی عرصہ ہُوا انتقال ہو گیا [2] فن ہوٹ کا ایک داؤ۔

مَیں ڈر کے کھڑے ہو جاؤ۔" وہ فوراً کھڑا ہو گیا اور بجلی کی طرح میرے پاؤں کی طرف لپکا۔ مَیں نے ناک پر گھٹنا مارا اور گرا کر "کلسری" ڈالدی اور ایک دو جھٹکے دے کر چھوڑ دیا۔ اس کے نکسیر پھوٹ پڑی لیکن وُہ گھبرایا نہیں اور اُس نے پھر میرا بازو پکڑا۔ مَیں نے گھوم کر "نماز بند" ڈال دیا اور چاہتا تھا کہ "بندِ کفن" لگا دوں مگر وہ چیں بول گیا اور خدا کا واسطہ دینے لگا۔ مَیں ٹانگ نکال کر علیحدہ ہو گیا اور وہ سر پکڑ کے بیٹھ گیا مَیں نے کہا "لڑائی کو روزگار بنانا چاہتے ہو تو پہلے لڑنا سیکھو۔ اس کے لئے تو بڑی محنت درکار ہوتی ہے" وہ بیدم ہو چکا تھا لیکن مَیں نے کوئی ایسی ضرب نہیں لگائی تھی جس سے ہاتھ پاؤں بیکار ہو جائے یا سانس کی نالی بند ہو جائے۔ مجھے تو صرف اپنا اور اپنی عزّت کا تحفظ مقصود تھا۔ مَیں بھاگ کر گیا اور اس کے لئے چائے لایا اُس نے شرم آمیز انکار کیا مَیں نے اس کا حوصلہ بڑھایا اور کہا "اگر تم نے یہ چائے نہ پی تو یاد رکھو کہ یہاں سے اپنے پاؤں گھر نہیں جاؤ گے مارتے مارتے ڈھیر کر دوں گا۔ سمجھے؟"

اُس نے چائے کی پیالی اُٹھالی اور کہنے لگا "مجھے تو فلاں شخص نے کہا تھا، کہ احسان دانش کو تنگ کر کے نکال دو" اور جب اُس نے اُس شخص کا نام بتایا تو موصوف میرا اچھا خاصا دوست تھا۔ مَیں نے کہا "اُس سے کہہ دینا کہ مَیں مکان کی تلاش میں ہوں اچھا مکان ملتے ہی چلا جاؤں گا۔" اُس نے کہا اب آپ کیسے جا سکتے ہیں؟

اس کے بعد یہ نوجوان مجھ سے فنِ بنوٹ میں استفادہ کرنے لگا تھا لیکن مَیں نے اُسے تنگ ظرف دیکھ کر کوئی خاص گُر نہیں بتایا چند نمائشی بندشوں پر اکتفا کیا حالانکہ اس کے لئے یہ بھی ناقابلِ ضبط بات تھی فن کا کمال اور قوّت کا جوش ہضم کر لینا معمولی معدے کے انسان کا کام نہیں۔

مزنگ کا ذکر کرتے ہوئے اگر میں پیر شریف احمد عثمانی کا ذکر نہ کروں تو یہ ایک ناانصافی ہو گی کیونکہ میرے لاہور آنے میں اُن کا مشورہ بھی شامل تھا۔ لیکن جب مَیں

لاہور آگیا تو وہ اپنے گردوپیش میں ایسے رندھے ہوئے تھے کہ اِدھر توجّہ نہ دے سکے، وہ اپنی بلندی کی کنگنیوں پر ٹکٹکی باندھے ہُوئے تھے اور ان سے ملنے کے شرائط پہ ملنا میرے بس کی بات نہیں تھی کیونکہ مَیں اپنی جگہ خیالات کو آزادی اور زبان کو گویائی سے محروم رکھنا گناہ خیال کرتا تھا اور اس کے تحفّظ کے لئے میرے ضمیر کی قوتیں اور بدن کے محنت کش اعضا مِرقت دوش لئے تیار رہتے تھے۔

شریف احمد عثمانی اصل میں نہایت ذہین اور فطین قسم کے انسان ہیں۔ مگر کچھ ایسی جذباتی طبیعت پائی ہے کہ زندگی کا بہترین حصّہ صحبت ناجنس اور در و دیوار جیسے بحیس لوگوں سے گفتگو میں برباد کر دیا۔ اب بھی جب مَیں اُن سے گفتگو کرتا ہُوں تو اُن کی مفلوج صلاحیتوں اور مسلول امنگوں میں زندگی کی لہریں بے تاب پاتا ہوں، افسوس ہوتا ہے کہ کیسا کار آمد انسان غلط ماحول کی نذر ہو گیا۔ اب وہ جوانی کے نشیب کو بوڑھاپے کے ملبے سے پاٹنے کی کوشش میں ہیں اور عمر ہے کہ ڈھلوان کی طرف دوڑی جا رہی ہے۔ کاش وہ اب بھی اپنی قیمت کو سمجھیں اور اپنی خدا داد صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی سعی کریں۔ اصل میں ذوق بھی فطرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ حوصلہ افزائی اس میں چار چاند لگا دیتی ہے اور غفلت بے قیمت بنا دیتی ہے مگر شاید یہ دور نہیں کہ مقتدر لوگ علمی بلندیوں کی طرف متوجہ ہوں

چونکہ مجھے لڑکپن سے ورزش کا شوق تھا، لہٰذا مزنگ آ کر مَیں خان اکبر خان اور سید امانت علی شاہ وغیرہ کے اکھاڑے میں جانے لگا جب اُن لوگوں سے نزدیکی ہوئی تو معلوم ہُوا کہ یہ لوگ تو بڑے ہی قابلِ قدر انسان ہیں چنانچہ اُن سے اب تک وہی وفادارانہ انداز کے مراسم چلے آتے ہیں اور مَیں ان کے رویّے میں بھی اب تک وُہی خلوص محسوس کرتا ہُوں۔ بحمداللہ وہ اب مزنگ کے معزّزین میں شمار ہیں اور غربا کے لئے ان کا وجُود غنیمت ہے اکبر خان کو مَیں نے جب بھی دیکھا کسی نہ کسی غریب کی امداد

کے سلسلے میں غلطان وپیچان پایا ہے کاش اس ملک میں اس قسم کے کارکنان کی تعداد بڑھ جائے اور معاشرہ روبراہ ہو جائے۔

ورزش کا اکھاڑا میانی صاحب کے شمالی حصے میں واقع تھا اور مجھے اس فضا سے ایسی دلچسپی ہو گئی تھی کہ جب بھی ذرا میری طبیعت گھبراتی دن ہو یا رات میں اسی جنازگاہ والی مسجد میں جا بیٹھتا اور کبھی کبھی قبرستان کی پگڈنڈیوں پر بھی چل نکلتا۔

جب بھی بارش ہوتی میں اس گورستان کی طرف نکل جاتا اور گورکنوں کو قبروں کی توڑ پھوڑ کرتے دیکھتا بعض بعض قبروں میں تو گورکن پندرہ دن بعد ہی دوسرے اجسام کو جگہ دے دیتے اور پھاوڑوں کے ساتھ مٹی میں گندھا ہوا انسانی گوشت گارے کے لوندوں کی طرح پھینکا جاتا لیکن یہ لوگ اور کرتے بھی کیا؟ زمین کا احاطہ کم اور شہر میں مرنے والوں کی قطار ہر سانس پر قبرستان کی طرف سرکتی رہتی ہے اور یہ زمین دن رات جماہیاں لے لے کر انسانوں کے اجسام پیتے پیتے سیر نہیں ہوتی۔ جب مُردوں کے ہنگاموں اور میتوں کی افراط سے گورکنوں کی باچھیں کھلتیں تو مجھے یہ ضرور خیال آتا کہ قدرت نے ان کے سینوں میں نہ جانے کون سی دھات کے دل رکھ دیئے ہیں جو پسیجنے ہی میں نہیں آتے اور روزگار کی صورت میں گورکنوں سے معاشرے کی کیسی اہم خدمت لی جا رہی ہے۔

مزنگ سے لارنس گارڈن (جناح باغ) زیادہ فاصلے پر نہیں اس لئے میں مُنہ اندھیرے سیر کو نکل کھڑا ہوتا۔ اس وقت آبادی کے در و دیوار بھی دھندلے رہتے تھے اور گلیوں میں ابھی چہل پہل بھی نہیں جاگتی تھی کچھ دنوں تو ایوب[1] شاہد نسیم اور میرے

---

[1] ایوب شاہد نسیم، مولانا تاجور مرحوم کے قریبی عزیزوں میں ہیں اور اپنی کم فرصتی کے باوصف شعر اچھا اور صاف کہتے ہیں جدیدیت سے انھیں دلچسپی نہیں وہ شعر میں روایتی اور اخلاقی نکتہ آفرینی کو ہاتھ سے نہیں دیتے اور ترنم ان کے شعر کو اور بھی چار چاند لگا دیتا ہے۔ عمر نے جوانی سے دامن چھڑا لیا لیکن گلے میں آواز کی وہی پتی موجود ہے۔

ایک کرم فرما کاظمی صاحب بھی ساتھ چلے لیکن دُنیا کی مصروفیات سحر خیزی کو کہاں مستقل ہونے دیتی ہیں۔ چند روز کے بعد وہ ساتھ چھوڑ گئے۔

لیکن جہاں مجھے ہڑک اُٹھتی میں اکیلا ہی آبادی سے باہر نکل جاتا۔ کئی تیز قدم مرد و زن پاس سے گزرتے اور سڑک کے دو رویہ درخت باادب مُریدوں کی طرح آنکھیں جھکائے کھڑے رہتے ٹھنڈی ہوا سے فضا میں ایسی خنکی بس جاتی جس میں ایک الہیاتی مسرت بھی شامل لگتی۔

صبح کی خوشبو ملی ہوا پیشانی سے مَس ہوتی تو سارے بدن میں گُدگُدیاں سی رینگ پڑتیں اور ہر جھرجھری پہ رگوں کی جھنکاریں سنائی دیتیں۔

جوں جوں ہوا تیز ہوتی شاخیں انگڑائیاں لے کر جاگتیں اور مَیں دیر تک اس جاگتی ہوئی ہلچل میں ایک خوشگوار غنودگی محسوس کرتا، مگر جیسے جیسے سورج کی کرنیں پہنچتیں شہر کی کثافتیں باغ کی لطافتوں کو کھوندتی پھرنے لگتیں اور پرانے فضا شناس سحر خیز لوگ گھروں کو لوٹ پڑتے۔

ریلوے میں چپراس

جس قدر شاعری میں توانائی آتی گئی اُسی قدر رجحان کاری میں اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن جب مَیں نے ماحول کو چھان پھٹک کر دیکھا تو شعراء کا طبقہ منافقت اور تعصّب سے لت پت تھا، اور شعر پسند لوگ شاید بے خبر تھے۔ بہت کم لوگ میرے حالات دریافت کرتے اور کرتے بھی تو سُن کر خاموش ہو جاتے۔ بعض تو یہ کہہ کر بات ٹال دیتے کہ ادیب اور شاعر تو اسی طرح پریشان حال رہتے ہیں اور بس۔ لوگوں کی اس بے رُخی سے میں اکیلے میں خود کو بے یار و مددگار پاتا۔ البتہ کچھ طالبِ علم ایسے تھے کہ بے بضاعتی کے باعث مجھے کہیں کوئی اچھی

ؔ اللہ نواز خان۔ کریم نواز خان، افضال الرحمٰن خان، محمد اکرم شامی، محمد ابراہیم نسیم، مسٹر لشیال، زمان غزنوی، سید خالد محمود ایم اے۔ ظفر اللہ خان نیازی، نظر ڈاکٹر محمد ابراہیم، مولانا جمیل اور گردش وغیرہ

نوکری تو نہیں دلا سکتے تھے مگر انھوں نے میری ہمّت شکست نہیں ہونے دی وہ دل سے میری قدر کرنے اور اس خلوص سے ملتے کہ میری نظر سے عزیزوں کا تصوّر اوجھل ہو جاتا اس طرح میں اپنے حالات میں لپٹا لپٹایا چلتا رہا جیسے بھیڑ گلّے کے ساتھ دھول میں چلتی رہتی ہے اور گڈریے کی آواز اور منشا پہ دھیان رکھتی ہے۔

غالباً گورنر ہاؤس سے نکل کر چند روز بعد ہی مَیں نے ریلوے پاور ہاؤس میں چپراسی کر لی تھی۔ روز کتاب ساتھ لے جاتا اور باہر اسٹول پر بیٹھا پڑھتا رہتا۔ میری زندگی جوں جوں ماہ و سال کی منزلوں میں بڑھ رہی تھی میرا تجربہ و مشاہدہ بھی وسیع ہوتا جا رہا تھا، اور جسمانی مجاہدہ نے اس میں اور بھی رنگ آمیزی کی ٹھان رکھی تھی۔ ذوقِ مطالعہ اور غور و فکر سے میرا جسم محنت و مشقت میں بھی آنکھیں رکھنے کا عادی ہو چکا تھا۔ اب مجھے مظلوموں سے ہمدردی اور ظالموں سے انتقام کی دھن بے تاب رکھنے لگی تھی۔ مطالعۂ کتب کے بعد کبھی کبھی شدّت سے یہ محسوس کرتا کہ میں روز بہ روز کچھ نازک مزاج ہوتا جا رہا ہوں اور میرا ذریعہ معاش ایسا تھا جس میں خودداری و غیرت پاش پاش ہو جاتی ہے چنانچہ روز جب سورج کی للچائی ہوئی کرنیں کوٹھوں کی منڈیریں چاٹنے لگتیں تو کارخانے کا وسل ہوتا اور مجھے یہ سائرن کی آواز اپنے بیمار معاشرے کی کراہ معلوم ہوتی مگر مَیں وردی پہن کر گھر سے نکل کھڑا ہوتا۔

جس سینئر فورمین صاحب بہادر کے دروازے پر میری ڈیوٹی لگی وہ نہ جانے مجھے کیوں محنتی اور دیانت دار خیال کرنے لگا تھا چنانچہ انھیں فرضی صفات کے صلے میں ایک دن اس نے مجھے حکم دیا ”او تم ہماری کوٹھی پر بھی کام کرے گا۔ تمہیں پانچ روپیہ تنخواہ سے جادہ ملے گا“۔ مَیں تو آخر جبراً سی تھا عذر کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ دوسرے دن سے مَیں صاحب کی کوٹھی پر رہنے لگا۔ اب باورچی خانہ کا سودا سُلف بھی میرے کام میں شامل ہو گیا لیکن اتنا ضرور تھا کہ مجھے مطالعے میں یکسوئی میسّر آنے لگی ریلوے پاور ہاؤس میں جب مَیں اپنے

صاحب بہادر کے دروازے پر بیٹھتا تو اندر کی آواز پر کان لگے رہتے۔ سامنے ہی پاور ہاؤس میں مشینیں لگی تھیں جہاں ہزاروں لاکھوں ٹن لوہا اپنے تاثرات اور اہمیت کا اعلان کرتا رہتا تھا اور کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی لیکن صاحب کی میز کی طرف سے آواز کا انتظار اور بجلی بنانے والی مشینوں کی دھڑ دھڑاہٹ میرے مطالعے میں حائل نہیں ہوتی تھی۔

مَیں لکھتے پڑھتے اور شعر کہتے وقت مطلق خاموشی محسُوس کرتا اور یہ ہزار ہا آدمیوں کا ہجوم میری نگاہوں سے اوجھل رہتا بعض وقت تو صاحب کے کمرے سمیت ماحول غائب ہو جاتا اور مَیں جس ماحول میں چاہتا اپنی جسمانی ہیئت سے علیحدہ ہو کر وہیں پہنچ جاتا۔

یہ مشقِ تصوّر شاید اُسی وقت کا عطیّہ ہے کہ مَیں آج تک شعر کے لئے فضا کا محتاج نہیں، ہزار انسانوں کا ہجوم ہو اور شور و شغب سے قیامت برپا ہو رہی ہو مَیں یک فکر تنہا ہو جاتا ہوں میرے مطالعے اور فکر میں کوئی دُنیاوی رکاوٹ حائل نہیں ہوتی۔ ماضی کے پردوں سے واقعات و حادثات کے علاوہ مناظر تک سامنے آکر بیان دینے لگتے ہیں اور اُن کے ساتھ وقت کی دُھول میں اَٹے ہُوئے چہرے اُسی طرح ہنستے بولتے سامنے آجاتے ہیں جیسے اُنھیں کبھی دیکھا تھا۔

صاحب کی کوٹھی پر مجھے دفتر سے بھی زیادہ سکون میسّر تھا۔ اور آمدنی میں تھوڑا سا ہی سہی اضافہ بھی۔ جب میم صاحبہ کہیں جاتیں تو ساتھ مجھے بھی لے جاتیں اور جتنی دیر وہ اِدھر اُدھر رہتیں مَیں موٹر میں بیٹھا کتاب پڑھا کرتا۔ اس نے کئی بار مجھ سے پُوچھا "ویل تُم کیا کرتا ہے؟" مَیں جواب میں صرف اتنا کہتا "مَیں پڑھنا سیکھ رہا ہوں" وہ مُسکراتی اور "اچّا اچّا" کہہ کر رہ جاتی۔

ایک دن وہ مجھے بازار لے کر چلی اور انارکلی میں پہنچ کر کچھ سامان خریدا۔ واپسی پر موٹر سٹارٹ کرنا چاہی تو انجن میں سے کچھ ایسی آواز آئی جیسے صُبح کے وقت دمہ کا مریض

کھانس رہا ہو۔ اس نے مجھے حکم دیا "چپراسی! ہینڈل مارو" میں نے کبھی ہینڈل نہیں مارا تھا۔ مجھے کہنا پڑا کہ مجھے بتاؤ ہینڈل کیسے مارا جاتا ہے۔ میم صاحبہ نے جھلا کر کہا "ڈیم اٹ تم ہینڈل نہیں مار سکتا؟"

مَیں "کیوں نہیں مار سکتا، مجھے ذرا بتا دو دیکھو مارتا ہوں کہ نہیں؟" وہ موٹر سے اُتری اور گاڑی میں ہینڈل لگا کر مجھے اشارے سے کہا "زور سے گھماؤ۔"

میں نے جو ہینڈل زور سے گھما کر چھوڑا تو گاڑی تو اسٹارٹ ہو گئی مگر اس نے BACK مار کر میرا ہاتھ بیکار کر دیا۔ مَیں بنگلے تک تو چلا گیا مگر وہاں تک جاتے جاتے تکلیف اس قدر بڑھ گئی کہ ذرا سی حرکت ہوتی تو جان پر بن جاتی۔ باورچی نے گھی میں ہلدی پکا کر میرے ہاتھ کو سینکا تو مجھے قدرے سکون ہوا اور اس نے مزید گھی اور ہلدی میں پھایا پکا کر ہاتھ پر باندھ دیا۔ میم صاحب نے جب میرا ہاتھ بندھا ہوا دیکھا تو پوچھا "کیوں؟ یہ ہاتھ کیوں باندھا ہے؟"

مَیں: "حضور! موٹر نے BACK مار دیا تھا۔"

میم صاحب نے افسوس کیا اور ایک پرچہ لکھ کر میرے حوالے کر دیا۔ "تم اِسی ڈکٹ (اسی وقت) ہاسپٹل جائے گا۔" مَیں نے کہا "مَیں ہسپتال نہیں جاؤں گا میرے ہاتھ کی کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی، یہ یہیں اچھا ہو جائے گا۔" میم صاحب نے بات کاٹ کر کہا "تم جلدی اچھا نہیں ہوگا۔ ہاسپٹل جاؤ!" مَیں اپنی ضد پر اَڑا رہا اور ہسپتال نہیں گیا۔

شام کو باورچی سے معلوم ہوا کہ اُس نے صاحب سے میری بڑی تعریف کی ہے اور ساتھ ہی ہمدردی کا اظہار بھی کیا۔ صاحب نے مجھے بُلا کر پانچ روپے دیئے اور کہا "یُو تم ہاسپٹل چلے جاؤ۔ تمہارا دیسی آدمی ڈوا نہیں جانتا۔" مَیں اچھا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

صاحب نے بڑی مہربانی سے کہا "تم سے میم صاحب بہت خوش ہے تم بیرا کے پاس کھڑا ہو کر میم صاحب کو کپڑا لگانا سیکھو۔" میں تو خاموش ہو گیا مگر صاحب نے بیرے کو بلا کر کہا "دیکھو بیرا! اس چپراسی کو کپڑا لگانا سیکھاؤ۔" اس نے اثبات میں جواب دیا اور پینٹری میں چلا گیا۔

دوسرے دن علی الصبح بیرے نے مجھے آواز دی اور میم صاحب کے کمرے میں مجھے ساتھ لے گیا۔ اس نے میم صاحب کو کپڑے پہنائے اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مجھ سے پوچھتا رہا تم سمجھے؟ کچھ سمجھ میں آیا؟ میں ہاں ہاں تو کرتا رہا لیکن میری خاک سمجھ میں نہ آیا کہ کیا دھندا ہے؟ مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ میری نوکری کا ایک رُخ یہ بھی ہو سکتا ہے۔

باہر آکر بیرے نے کہا "دیکھو احسان! اگر تمہیں یہ کام آگیا تو عمر بھر مزے کرو گے۔"

میں: "مزے کروں گا، وہ کیسے؟"

بیرا: "کام کم اور تنخواہ معقول، یہ مزا نہیں تو اور کیا ہے۔" دوسرے دن پھر مجھے اسی تختۂ دار کے سامنے لیجایا گیا اور کپڑے پہنائے گئے۔ میرا یہ عالم تھا جیسے میں خود آئینے کے سامنے ننگا ہو گیا ہوں۔ میم صاحب نے مجھ سے پوچھا "چپراسی اب تم کپڑا جان گیا؟" میں حیران تھا کہ کیا جواب دوں، اگر کہا کہ جان گیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ فوراً کہے کہ کل اکیلے مجھے کپڑے پہناؤ اور اگر جواب دیا کہ میری سمجھ میں نہیں آیا تو سر ہو جائے گی میں نے بوکھلا کر جواب دیا "جان تو گیا ہوں مگر حضور میرا تو ہاتھ بیکار ہے اس سے کوئی کام نہیں ہوتا۔" میم صاحب نے زیر لب مسکرا کر کہا "اچھا اچھا ابھی تم اچھا ہو گا تو کپڑا لگائے گا۔ دیکھو پانچ روپیہ تنخواہ میں اور جادہ ہو جائے گا۔"

میں اس دن ساری رات سوچتا رہا کہ اس عذاب سے کیسے نجات ملے، اگر کوئی توڑ سمجھ میں نہ آیا، میں نے باورچی کو سارا ماجرا سنایا اور بتایا کہ "صاحب اور میم

دونوں مجھ پر مہربان ہیں لیکن بڑی مصیبت یہ آگئی کہ مَیں کپڑے پہنانے کا کام نہیں کر سکتا جب سے میم صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں کپڑے پہنانا آگیا کہ نہیں؟ میرے دِل پر جھٹکے سے لگ رہے ہیں۔ خدا کے لئے مجھے کسی ترکیب سے بچاؤ۔"

باورچی:۔ "پانچ روپیہ مٹھائی کے لئے دلواؤ تو ابھی ترکیب بتاتا ہوں اور اگر کہو تو ایسی ترکیب بتاؤں کہ وہ تمہیں نوکری سے ہی نکال دیں۔"

مَیں:۔ "نوکری سے تو ابھی نہیں مجھے اس کوٹھی کے عذاب سے نکلواؤ۔"

باورچی:۔ "پانچ روپے ڈھیلے کرو اور پھر دیکھو یاروں کے ہاتھ!"

مَیں:۔ "قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تنخواہ ملنے پر پانچ روپے نذر کر دوں گا۔"

باورچی:۔ "اچھا کل سے کام پر نہ آؤ اور پچیس کا ڈاکٹری سارٹیفکٹ بھیج دو۔"

مَیں:۔ "ڈاکٹری سرٹیفکیٹ میں کہاں سے لاؤں گا؟"

باورچی:۔ "مجھے ایک روپیہ دو مَیں لا دوں گا۔"

دُوسرے دن میں نے باورچی سے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ منگا لیا اور درخواست کے ساتھ نتھی کر کے باورچی کو تھما دیا صاحب نے اسی وقت میری جگہ دُوسرا آدمی بلوا لیا اور درخواست پر لکھ دیا کہ جب چپراسی آئے اُسے دفتر میں بھیج دیا جائے اور وہ وہیں کام کرے۔

باورچی نے مجھے خوشخبری سنائی اور بتایا "ہمارا صاحب پچیس سے بہت ڈرتا ہے، اگر کہیں وہ یہ سُن لے کہ فلاں کو پچیس ہے تو اس کے قریب سے نہیں گزرتا بڑا وہمی آدمی ہے لیکن خیر تمہاری مراد تو پوری ہو گئی۔ اب مَیں پوچھتا ہوں کہ کوٹھی پر تمہیں کیا تکلیف تھی؟"

مَیں:۔ "بس میاں تکلیف ہی تکلیف تھی جو آرام تھا میں اُسے پسند نہیں کرتا اور نہ کسی ایسے کام میں اُلجھنا چاہتا ہُوں جو مجھے جکڑ لے اور میرے راستے روک دے۔ میری منزل نوکری نہیں ہے۔"

اُس وقت کے کئی کلرک مجھے آج بھی جانتے پہچانتے ہیں کئی تو اُن میں اچھے ممتاز عُہدوں پر فائز ہیں میں جب کبھی اُن سے ملتا ہُوں مجھے بڑی قدر و منزلت سے دیکھتے ہیں اور نہایت خلوص سے پیش آتے ہیں۔

انہیں دنوں غالباً گورنمنٹ کی حمایت میں ایک روزنامہ نکلنے والا تھا اور ایک پراچہ صاحب اُس کے کرتا دھرتا تھے۔ نہ جانے میں ان کی دریافت میں کیسے آگیا اور میں نے ان کی لسانی قلابازیوں میں آکر ادارت قبول کرلی اور ان سے کہا "میں ریلوے میں چپراسی ہوں خود استعفا نہیں دوں گا۔ آپ ریلوے سے مجھے مانگ لیں"؛ چنانچہ پراچہ صاحب نے ڈپٹی کمشنر سے ایک چٹھی حاصل کی جس کا مطلب یہ تھا کہ ہمیں اپنے اخبار کے لئے احسان کی ضرورت ہے۔ جب یہ تحریر دفتر میں پہنچی تو صاحب نے ہیڈ کلرک کو بلوایا اور دیر تک آپس میں گفتگو ہوتی رہی۔

ہیڈ کلرک صاحب آتے ہی مجھ پر برس پڑے "تم جیل جانے کے قابل ہو تم نے خود کو چھپایا اور کہا کہ میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتا اور اب اخبار میں کام کرنے کے قابل ہو گئے ہو۔ یہ فراڈ، یہ جھوٹ!" میں نے کہا "جناب یہ کوئی جرم نہیں ہے یہ تو ایک احتیاط ہے اپنی اور اپنے علمی ذوق کی" آہستہ آہستہ وہ نرم ہو گئے اور کہنے لگے "صاحب بہادر تم سے بہت خوش ہیں اور تمہاری تعریف کرتے ہیں۔ تم شوق سے اخبار میں جا سکتے ہو۔ ہم تمہاری ترقی میں حائل نہیں ہوتے"۔

میں نے اُسی وقت استعفار دے دیا اور وہ منظور بھی ہو گیا۔ نوکری چھوڑ کر مجھے معلوم ہُوا کہ اخبار میں ہر سخت مضمون میرے نام سے ہوگا اور اس سلسلے میں جیل جانا بھی ایڈیٹر کی سُنّت میں شامل ہے۔ میں نے فوراً انکار کر دیا اور کہا "جن لوگوں کے خلاف آپ کا منصُوبہ ہے مجھے ان سے نہ کوئی شکایت ہے اور نہ دشمنی، میں تو مزدور ہی اچھا ہُوں قلم کاری کو میں ابھی اپنے لئے مناسب خیال نہیں کرتا"۔ اللہ اللہ خیر سلّا۔ دن پھر اُسی

غربت و افلاس سے گتھم گتھا میں لڑھکتے پڑھکتے گزرنے لگے۔

کاندھلے کا ایک سفر

مزنگ میں یہ مکان مل جانے کے چند روز بعد میں اپنے والدین اور اہلیہ کو لینے لاہور سے کاندھلہ روانہ ہو گیا۔

یہ مکان اچھا خاصا وسیع تھا اور ہم چار افرادِ خاندان کے لئے کفایت کرتا تھا۔

جب میں کاندھلہ پہنچا تو اپنے اُستاد قاضی محمد زکی اور دوسرے کرم فرماؤں سے ملا مگر کسی سے یہ ظاہر نہ کیا کہ میں والدین اور بیوی کو بھی ہمراہ لے جاؤں گا۔ اُن دنوں میری اہلیہ وہیں محلے ہی میں اپنے میکے گئی ہوئی تھی اور جب میں نے اس پہ لاہور لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو وہ خاموش رہی اور صرف یہ کہا "جو آپ کی مرضی" البتہ میری خوشدامن نے ایک دو ہفتہ قیام کے لئے کہا جو میرے لئے ناممکن تھا، چنانچہ میں بیگم کو روانگی سے ایک دِن پہلے اپنے گھر لے آیا۔ اگرچہ فاصلہ تو طویل نہ تھا لیکن بیکسی ایسی تھی جیسے اپنی صلیب خود کندھے پر اُٹھا کر چل رہا ہوں۔ دُوسرے روز میں کاندھلے سے گھر کا کاٹھ کباڑ لے کر لاہور کو روانہ ہو گیا۔

والدین اور اہلیہ کے آنے سے مجھے سیکڑوں اُلجھنوں سے چھٹکارا مل گیا، اور قدرے اطمینان بھی ہوا کہ میرے والدین میری دین و دُنیا کی دولت میرے سامنے ہیں۔ اب تنور پہ بیٹھ کر کھانا کھانے سے نجات مل گئی۔ لہٰذا لاہور کی معاشی زندگی میری فکر کا مرکز و محور تھا اور بس مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے امکانات بھی آہستہ آہستہ روشن سے روشن تر ہوتے جا رہے تھے، مشاعروں میں میری مقبولیت بڑھ رہی تھی اور مجھے اِس کا اندازہ اِس طرح ہوا کہ روز بروز للّٰہی بغض رکھنے والے اور جگہ جگہ بیجا شکایت کرنے والے معرضِ وجود میں آ رہے تھے۔

جب میں سیر کو جاتا تو مجھے دُور دُور شاعر اور ادیب نظر نہ آتا، ہاں عطاء اللہ کلیم، میاں بشیر احمد اور مولینا ظفر علی خاں صاحب سے بلاناغہ لارنس گارڈن میں ملاقات ہوتی، میں حیران ہوتا کہ جو شاعر

---

۵۰ عطاء اللہ کلیم صاحب ابتک میرے کرمفرماؤں میں ہیں اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

یا ادیب سحر خیز نہیں وہ نہ جانے شعر و ادب کی تخلیق کیسے کرتا ہے، ادبی تخلیق کے لئے تو میدانوں، راستوں اور نہر کی پٹڑیوں کے درختوں تلے کے سرد سویروں سے زیادہ کوئی وقت موزوں و مناسب نہیں۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ مناظر پسند ادیب ہو یا شاعر اس میں ایک حسِ لطیف موجود ہوتی ہے لیکن جو بازاروں، طوائفوں کے بالاخانوں اور امراء کی مجلسوں کے علاوہ تیسرے درجے کے لفنگوں اور لُقّوں میں زندگی کے شب و روز کو موت کے گھاٹ اُتارتے ہیں ان کی شاعرانہ بصیرت بے نُور ہو جاتی ہے وُہ گھُوروں اور کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں پر کھِلے ہُوئے پھُول تو دیکھتے ہیں لیکن چڑیوں، کوئلوں، پپیہوں اور میناؤں کی زبان نہیں سمجھتے حالانکہ وُہ انسان کی نزدیکی سے خوش ہوتی ہیں، صرف شکار ہو جانے کا خوف انھیں قریب نہیں آنے دیتا، مَیں نے کئی بار دانہ ڈال ڈال کر جنگلی کبوتروں کو مانوس کر لیا اور وہ میرے ہاتھ پر بیٹھ کر دانہ چُگنے لگے تھے۔

یہی کم سواد ادیب اور شاعر جب چائے کی میز پر ہنکارتے ہیں تو خدا کی پناہ اُس وقت ان کا احساسِ کمتری ان کی بے بصیرتی کو بلند بانگی میں تبدیل کر دیتا ہے اور یہ میز کے اردگرد کی فضا میں اپنا لسانی تعفّن پھیلا دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں، کہ ہماری کج راہی حاشیے میں طویل سایہ نہیں رکھتی، حالانکہ جاننے والے ان کے لباس اور گفتگو کے متن کے تضاد کو اچھّی طرح جانتے ہیں مگر وہ ہیں کہ اس طلسمی دلدل سے نکلنے کا نام نہیں لیتے۔

ایک خبر ایک دن میرے ایک ہمدرد محمد نذیر خاں نساماں نے آکر مجھے دو افسروں کی گفتگو سُنائی جن میں ایک ہندو تھا دُوسرا عیسائی۔

ایک افسر:۔ "آپ کا احسان دانش کے متعلّق کیا خیال ہے؟"

دُوسرا افسر:۔ "اس کی فوراً روک تھام کر لی جائے تو مناسب ہو گا۔"

پہلا: "یہ نہیں کوئی ایسے خطرے کی بات نہیں، اس ملک میں ابھی پچاس، سو برس مزدور منظم نہیں ہو سکتے اور نہ تعلیم اس قدر عام ہو سکتی ہے کہ جس سے عوام اپنے معاشی مسائل پر اس قدر ضد پکڑ لیں کہ حکومت کے مقابلے میں آ جائیں"۔

دوسرا: "جناب من احسان دانش سُنی سنائی یا پڑھی پڑھائی بات نہیں کہتا وہ ظالم تو خود مزدور ہے اور مزدور کے حالات و واقعات کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ مشاعرے میں مرد اور عورتیں دونوں رو دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور یہ شاعر کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ آپ مشاعروں کی روداد یں نہیں دیکھتے۔ ہر مشاعرے کے متعلق اسی بات پر زور ہوتا ہے کہ احسان دانش نے مزدور کی نظم سے مجمعے پر رقت طاری کردی، یہ یہاں کے تمدن میں ایک ایسا خط ہے جو کبھی نقشے کا احاطہ بھی کر سکتا ہے وہ باقاعدہ لکھا پڑھا آدمی تو بے شک نہیں لیکن کم بخت فطری شاعر ہے اور اس کے تجربات و مشاہدات علم کی حیثیت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اگر ابھی سے اس پر پابندی نہ لگائی تو شاید یہ تاریخ میں پہلا شخص ہو گا جو اس ملک میں بغاوت کا نقیب ہو گا۔ اور حالات ساز گار نہ ہوتے تو اس کا کلام اسی قسم کے سینکڑوں لوگ پیدا کر دے گا اس وقت اس کا سدّ باب دشوار تر ہو جائے گا، اور اس کا کلام[1] دوسرے ملکوں تک پہنچے گا"۔

دوسرے افسر نے جواباً کہا "جناب یہ مقام بڑی مشکل سے ملتا ہے۔ احسان دانش تو نہ بدّی نہ بدی کا شعور رہا! یہ کیا اور اس کی آواز کیا؟ ایک دو نظمیں کہے گا اور ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اسی طرح سینکڑوں ابھر ابھر کر بیٹھ جاتے ہیں"۔

پہلا افسر: "ہاں درست ہے لیکن اس کے متعلق پطرس بخاری کی یہ رائے ہے کہ یہ مرنے والا شاعر نہیں، اس کے یہاں بڑی قوتیں پلتی ہیں اگر اسے سہارے اچھے مل گئے تو اس ملک کی تاریخ کا روشن باب اس کی شاعری سے طلوع ہو گا۔

---

[1] آج میری نظمیں روس، چیکوسلاویکیہ، ہندوستان اور دیگر ممالک میں ترجمہ ہو کر چھپ رہی ہیں، اور روس میں تو میری پچاس نظموں کا ترجمہ وہاں کی متعدد زبانوں میں چھپا ہے

دُوسرا افسر بولا "درُست ہے مگر پطرس ان باتوں کو کیا جانے وُہ انگریزی کا ماہر ہے نہ کہ ہمارے فن کا، اِس معاملے میں ہم لوگوں کی بات زیادہ وقیع ہے۔"

خانساماں نذیر کی اس گفتگو نے جہاں میرے دِل میں ذرا سا خوف کا جھٹکا دیا وہیں مجھ میں اپنی اور اپنے لٹریچر کی اہمیّت کا احساس بھی بیدار کر دیا۔ اب مَیں نے اپنا مشاہدہ اور مطالعہ اُسی رُخ کے لئے مخصوص کر دیا جس سے آزادی اور آزادہ روی کی جدولیں اُبھرتی ہیں۔

عرصہ کے بعد ایک دن میں پبلک لائبریری سے نکل رہا تھا کہ دو آدمیوں نے ایک دوسرے کو مخاطب کر کے کہا "دیکھو دیکھو یہ ہے وہ مزدور جو شاعر ہے اور مزدوروں ہی کے متعلّق نظمیں لکھتا ہے۔ اُس نے جواب میں کہا، ہاں دیکھ لیا ہے یہ کوئی اہم شخصیّت تو معلُوم نہیں ہوتی۔"

میں ذرا خوف زدہ سا ہو گیا کیونکہ وُہ آدمی مجھے سرکاری معلُوم ہوتے تھے میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ گھر میں اپنے ذوق کے مطابق ایک مختصر سی لائبریری ہونا بھی لازمی ہے۔ چنانچہ میں نے اُسی دن سے کتابوں کی فراہمی پر اور بھی زور دے دیا اور اب تک وہی عالم ہے۔ جب کوئی اچھّی کتاب دستیاب ہو جاتی ہے اسے خُدا کی رحمت سمجھتا ہوں، مَیں اس سلسلے میں قاضی اطہر مبارک پوری[1] اور شیر محمّد خان اعوان کا ممنون ہوں جو میرے لئے اچھّی کتابوں کی ٹوہ میں رہتے ہیں

میرٹھ کا مشاعرہ

میری شاعرانہ صلاحیتیں ابھی دھندلکوں کی جالیوں سے باہر نکل ہی رہی تھیں اور میں اس گومگو کے ماحول اور نئے لوگوں کے ہجوم میں اپنی جگہ ڈھونڈھ ہی رہا تھا کہ ایک دن اچانک میرٹھ سے

---

[1] قاضی اطہر مبارکپوری عربی کے فاضل اجل ہیں عربی اور اُردو میں اُن کی کئی تصانیف اہل علم کے لئے سرمایہ ہیں وُہ رسالہ معارف اعظم گڈھ کے مستقل لکھنے والوں میں ہیں اور فن شعر میں میرے شاگرد، شیر محمد خاں اعوان کالاباغ کے شرفاء سے ہیں ایک دو کتابیں بھی ان کی تالیف یا تصنیف ہیں میرے مخلص کرم فرما ہیں۔

مشاعرے کا دعوت نامہ ملا اور ساتھ ہی جناب ساغر[1] کا خط بھی جس میں مجھے شرکت کے لئے تاکید کی گئی تھی۔ نہ جانے کیوں خود بخود میری طبیعت مانع ہوئی اور میں نے انکار لکھ بھیجا اس کے بعد ساغر صاحب کے تین خط آئے اور ہر خط میں مشاعرے میں شرکت کی تاکید کے لئے مختلف طریقوں سے زورِ قلم کا مظاہرہ کیا گیا تھا۔ طوعاً و کرہاً میں نے شرکت کا وعدہ کر لیا اس وقت میری پونجی صرف چوبیس ۲۴ روپے تھی، میں وہی لے کر چل دیا اور بروقت میرٹھ پہنچ گیا۔

مشاعرے کی صدارت کے لئے سر سیتا رام صاحب کا نام چھپا ہوا تھا، اس لئے معزز سامعین کے علاوہ شعراء کی تعداد بھی اچھی خاصی ہوگئی تھی اور مشاعرہ بھی کامیاب ہوا۔ مجھے اس مشاعرے میں توقع سے زیادہ داد و تحسین ملی، کئی حضرات[2] نے تو میری قیام گاہ پر آکر سراہا اور حوصلہ افزائی فرمائی۔

مشاعرے کے بعد جب میں ساغر صاحب سے اپنے مصارفِ سفر لینے کے لئے گیا تو وہ کچھ اس طرح پیش آئے کہ اُن کے قول و عمل کا تضاد پل کے پل میں تعجب انگیز ہو گیا۔ اُن کی گفتگو میں کوئی شاعرانہ یا مخلصانہ پہلو نہیں تھا وہ مطلق بھول چکے تھے کہ میں نے لاہور سے احسان دانش کو کئی خط بھیج کر بلایا ہے۔ اُن کی بول چال کے بے پروایانہ انداز میں ایک قسم کا سوقیانہ لہجہ، کھوکھلا پن اور اوچھے تاجروں والا لین دین بول رہا تھا جیسے اُن شہریوں میں ہوتا ہے جو دیہات میں فصل کے اُدھار پر تجارت کرتے ہیں، اُس وقت مجھے اُن کی باتوں سے ایسی مایوسی ہوئی کہ اثنائے عمر کے کئی اور خد و خال کو گھما پھرا کر باتیں بنانے والے میری نظر میں پھر گئے، خیر ساغر صاحب نے اپنے اسی مخصوص انداز میں دوسرے روز کا وعدہ کیا۔ مجھے اُن کی شاعرانہ عظمت اور جوہرِ کردار کے معاملے میں اپنے قیاس و فکر کے آلات بیکار نظر آ رہے تھے۔ اور اُن کے متعلق اُس افواہ پر یقین کرنا پڑ رہا تھا جو اُن کی شہرت کی سنجیدگی میں حائل چلی آتی ہے۔

---

[1] ساغر سیمابی جو بعد میں ساغر نظامی ہو گئے اب دہلی ریڈیو میں ملازم ہیں۔ [2] جناب نجم آفندی، ہوشیار میرٹھی، پیر حسن انہار (رام نوری) اور بخشش حارجوی وغیرہ۔

دُوسرے دن علی الصبح میں پھر اُن کے گھر گیا اور انھوں نے حسبِ عادت ایک لچھے دار گفتگو کے بعد اُڑان گھائی سے ایک دُوسرے رُکن کے گھر کا راستہ بتا دیا۔ مَیں وہاں پہنچا تو اُس نے نہایت شرافت اور اصُول کے ساتھ بتایا کہ مصارف تو مشاعرے سے بھی پہلے ساغرؔ صاحب لے چُکے ہیں، آپ اُنھیں سے بات کریں۔ ایسے ایسے ہنگاموں کا روپیہ تو پہلے ہی کسی ذمّہ دار کو دے دیا جاتا ہے۔

مَیں ساغرؔ صاحب کا مطلب سمجھ گیا، وُہ تو خیر گزری کہ واپسی کے لئے میرے پاس اتنی رقم تھی جس سے لاہور تک کا ٹکٹ خریدا جا سکے چنانچہ میں ساغرؔ صاحب کے دروازے پر جانے کے بجائے لاہور آنے والی ریل گاڑی میں سوار ہو کر دوسرے دِن لاہور آ اُترا۔

اِس حادثے کے بعد عرصہ تک میرا یہ عالم رہا کہ جہاں کوئی بے رحمی، یا بے انصافی دیکھتا تو ساغرؔ صاحب کا جعلی مُسکراہٹ سے دانت دکھاتا چہرہ نظر میں پھر جاتا مجھے ساغرؔ کے اس رویّے سے کوفت تو ضرور ہوئی لیکن سوچتا ہُوں کہ اس حقیر رقم میں یہ تجربہ مہنگا نہیں پڑا، مجھے اِس زُود اعتباری کے سینکڑوں نقصانات سے نجات مل گئی، اس وقت میں چلتے پھرتے خدوخال کے خوش پوشوں، ایکٹروں یا بھگت بازوں کی قسم کے فنکاروں، تتلیوں کی طرح بانکے چھبیلے شاعروں اور شکل و صورت میں داسیوں اور راج رانیوں کے چرلوں والے ادیبوں کو غیر معتبر سمجھنے پر مجبور ہو گیا، رفتہ رفتہ یہ راز بھی کھُل گیا کہ جن کی شہرت نشیب کی نم آلود فضا میں جنم لیتی ہے وہ ذاتی تخلیقات اور شرافت کے معاملے میں ہمیشہ مشکوک ہی رہتے ہیں۔ اِلّا ماشاء اللہ۔

مَیں آج ساغرؔ صاحب کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔ اگر یہ حادثہ پیش نہ آتا تو میں جانے کہاں کہاں نقصان اُٹھاتا۔ لاہور آ کر جب میں نے دوستوں سے ذکر کیا تو انھوں نے جواب انجواب کر کے انتقام لینا چاہا مگر مَیں نے اُنھیں یہ کہہ کر منع کر دیا کہ کیا مجھے بھی

تم بے رحموں، ناانصافوں اور مسافر دشمنوں کی فہرست میں لانا چاہتے ہو؟ اگر ایسا ہوا تو میں انسے اپنی دشمنی خیال کروں گا دوستی نہیں! سب دوست دم بخود ہو کر رہ گئے میں نے ان سے کہا "ساغرؔ صاحب. بیچارے اُس وقت نہ جانے کن حالات میں ہوں گے کہ انھوں نے اس ارتکابِ جرم کو اپنے نام لکھوالیا ورنہ ایک شاعر سے یہ توقع ناممکن ہے۔"

جب میں تقسیم کے بعد دہلی گیا اور ساغرؔ صاحب سے ملاقات ہوئی تو خوش حالی کے علاوہ مجھے اُن میں کوئی خرابی اُبھرتی ہوئی نہ ملی، وہاں کے کئی لوگوں سے میری ملاقات ہوئی جو ساغرؔ صاحب کے سباق وسیاق اور درون و بیرون سے آشنا تھے۔ اُنھوں نے بھی ساغرؔ کی اقتصادی ترقی کا اعتراف کیا اور ساتھ ہی اُن تشبیبوں سے بھی آگاہ کیا جنھیں اِس قسم کی اقتصادی ترقیاں پہلے سے زیادہ گہرا اور تاریک کر دیتی ہیں لیکن مجھے اِن باتوں سے کیا مطلب تھا۔ میرا مشرب تو انسان کو انسان سے مایوسی کی تعلیم نہیں دیتا۔ میرٹھ کے اس مشاعرے میں جہاں ساغرؔ صاحب کی طرف سے میرا دل میلا ہُوا تھا وہیں مسعودؔ[1] جاوید اور قیصر کاظمی[2] کی ملاقات سے مسرّت بھی تھی، یہ دونوں حضرات ابھی تک مجھ پر اسی طرح کرم فرماتے ہیں، نہ جانے ان حضرات کے مزید قلمی کارنامے اور کیا کیا ہوں گے کیونکہ عرصہ ہو گیا اہلِ سیاست نے تو علمی و ادبی تبادلے کا راستہ بھی مسدود کر رکھا ہے۔ رسالوں اور کتابوں کی آمد و رفت بالکل بند ہے۔ حالانکہ علمی و ادبی لٹریچر کا تبادلہ بہرصورت ملکوں ملکوں ہوتا رہتا ہے اور ہوتا چلا آیا ہے۔ خُدا رحم فرمائے دونوں کے حال پر۔

---

[1] مسعود جاوید ایک بلند مرتبت شاعر اور ادیب ہیں ان کی کئی تصانیف عوام سے خراجِ تحسین لے چکی ہیں۔ شاعر اور ادیب ہونے کے علاوہ وہ نہایت شریف انسان اور لاجواب قسم کے دوست واقع ہوئے ہیں۔

[2] قیصر کاظمی صاحب رسالہ "آجکل" دہلی میں تھے عرصہ سے ملاقات نہیں ہوئی، بلا کے ذہین انسان ہیں ان کے مطالعہ میں خاص بات یہ ہے کہ جب اُن کا علم ذہن سے زبان پر اُترتا ہے تو اجمال سے تفصیل کے دریا اُبل پڑتے ہیں اور اس میں گھاس کوڑا ہی نہیں اچھے اچھے تناور شجر بھی جھومتے نظر آتے ہیں۔ سُنا ہے کہ آج کل جامعہ ملیہ میں اُستاد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ خدا کرے بعافیت ہوں۔

میرے گرد و پیش کی سطح جتنی ناہموار اور ماحول جتنا بے انصاف، بے رحم اور تاجرانہ گندگیوں سے آلودہ نظر آتا میری جراتِ اظہار بڑھتی جاتی چنانچہ میں نظموں میں بے باکی کے راستوں پر چلنے لگا۔

جب میں نوجوانوں کو عیاش طبع اور بداخلاقیوں کا رسیا دیکھتا تو مجھے بڑی شدت سے یہ محسوس ہوتا کہ موجودہ نظام منہ زور حیوانوں کو غیر ملکی غذا سے کٹ کھنے کر رہا ہے اور انسانیت کی تعلیم کے دامن سمٹتے جا رہے ہیں طالب علموں کا تو کیا ذکر دانشور طبقہ بھی انسانیت کے راستوں کی دیواریں بن رہا ہے۔

جہاں نئے نظریات بے دردی سے مذہب اور انسانیت کی قدروں کا مذاق اڑاتے مجھے دل ہی دل میں بڑی کوفت ہوتی لیکن ع مُنگ تنگ دیدم دم نہ کشیدم بعض بعض اوقات تو میں ایک گلو فشار تکلیف محسوس کرتا اور منہ کا ذائقہ خراب ہو جاتا، لیکن افسوس کہ میرے پاس نہ تو اس قدر دولت تھی کہ نظامِ تعلیم بدلنے میں پوری مسافت میرا ساتھ دیتی نہ اتنی علمی قوت تھی کہ فانوناً بھیڑیوں کے منہ سے انسانیت کو چھین سکتا اور نہ مستقبل کے لئے کوئی منصوبہ ایسا تھا کہ کاغذ پر نقشہ کی صورت اختیار کر کے آگے کی راہ گری کرتا مجبوراً سُلگ سُلگ کر بیٹھ جاتا۔

میری اہلیہ

میری اہلیہ چونکہ ایک شریف اور غریب کسان خاندان کی لڑکی ہے جہاں لڑکیوں کا کیا ذکر، لڑکوں کو بھی تعلیم میسر نہیں آتی ۔چنانچہ وہ بچوں کے لئے ایک جاں نثار ماں اور میرے لئے ایک وفادار بیوی کے سوا کچھ نہیں میں اس کی اس حیثیت کو اپنے لئے خوش بختی تصور کرتا ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں خدا مجھے جنت میں حور و غلمان کے انعام کے باوجود اس شریکِ حیات سے بھی محروم نہ کرے ۔آمین۔

جہاں تک بچوں کی پرورش کا معاملہ ہے میری نظر سے ابھی تک ایسی اصیل عورت نہیں گزری ۔اس کی مامتا بچوں کی زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے اور ایسی کہ جیسے وہ اس

ماشا کے فن کے علاوہ دُنیا کے کسی شعبہ سے آشنا ہی نہیں ۔

جب میں اس کی اس ادا پہ غور کرتا ہوں تو مردانہ زندگی کے تمام جمال و کمال اس کے سامنے ہیچ نظر آنے لگتے ہیں اس کی ہی نہیں عورت ذات کی علمی محرومی نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے ۔

زندگی بھر نہ اُس نے اچھا کھانا طلب کیا نہ اچھا لباس وہ میری فاقوں کی زندگی میں برابر کی شریک رہی اور کبھی پیشانی پر اُکتاہٹ کی شکن نہیں رینگی، حالانکہ اگر وہ اپنے میکے چلی جاتی تو میرے گھر سے کہیں بہتر زندگی بسر کر سکتی تھی لیکن اُس نے کبھی اس پہلو پر گفتگو ہی نہیں کی اور نہ وہ اس رُخ پر سوچنے کی عادی ہے ۔

رات دن بچوں کی دیکھ بھال اور ناز برداری اس کا محبوب مشغلہ رہا ہے اور اب تک اُسی روش پر چل رہی ہے، اس ترقی کرتی ہوئی دُنیا کے کرّو فر کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتی بلکہ اس موجودہ دُور میں عورتوں کی نیم عریانی کو بے غیرتی کا نام دیتی اور اپنے اسلامی شعار کے منافی بتاتی ہے ۔

جب میں اہلِ خانہ کو لاہور لایا تو شروع شروع میں سینکڑوں سوال میرے دل و دماغ کو گھیر لیتے تھے ۔ اور اکثر و بیشتر مجھے دیر میں نیند آتی تھی لیکن گرد و پیش پر نظر ڈالتے ہوئے دل یہ فیصلہ کرتا کہ ایسی سیدھی سادی عورت کو شریکِ زندگی جاننے کے باوصف زندگی کے نفع و نقصان سے باخبر رکھنا کوئی اچھی بات نہیں، عورت تو بہر نوع عورت ہے اُسے اپنے دوش بدوش خیال کر لینا کوئی معقولیت نہیں، عورت صرف عورت کی حد تک تو اپنا صحیح مصرف ہو سکتی ہے، زندگی کے تمام تر شعبوں میں اس کی شرکت و شمولیت نقصان رساں ہے، یا یُوں کہئیے کہ بے فائدہ عورت تو مرد کے تھکے ہوئے دل و دماغ اور محنت سے چُور جسم کے آرام و سکون کا ذریعہ ہے جس مرد کو یہ میسّر آجائے تو زندگی میں بڑی سے بڑی مصیبت مرد کے لئے کچھ نہیں رہتی ۔

میرا مشاہدہ ہے کہ عورت کو جب زندگی کے ہر رُخ سے باخبر کر دیا جاتا ہے تو وہ دل و دماغ کی تسکین کے قابل بھی نہیں رہتی کیونکہ اُسے احساس کی شدت، اور غم پسندی کا ملکہ اوّل ہی سے ودیعت ہوتا ہے اور اس کی اس نرمی سے دُوسروں کے دل بھی رُندھے رہتے ہیں۔

شروع شروع میں میری اہلیہ دُنیا کے رسم و رواج اور آئین و ضوابط سے صرف اتنی بہرہ مند تھی کہ ایک دفعہ نہ جانے کس بات پر مَیں نے تنبیہہ کی مگر اس کی حاضر جوابی پر اس قدر غصہ آیا کہ میرے مُنہ سے یہ فقرہ نکل گیا "میرے ساتھ تمہارا نباہ مشکل ہوگا میرا پیچھا چھوڑو اور اپنی راہ لو۔"

اُس نے میری برہمی سے بے پروا ہو کر لمحہ بھر کے توقف سے جواب دیا۔ "اچھا مَیں ابھی اپنے ماں باپ کے گھر چلی جاؤں گی خُدا رکھے میری ماں اور میرے بھائی موجود ہیں۔ آپ میرا مہر معاف کر دیں۔" میرا یہ سُننا تھا کہ غم و غصہ فرو ہو گیا اور مسکراتا ہُوا باہر نکل آیا اور خُدا کا شکر ادا کیا کہ اس دَور میں مجھے خُدا نے کیسی شریک حیات عطا فرمائی ہے جو یہ بھی نہیں جانتی کہ مہر کی ادائی کس کا فرض ہے اور اس کی طلبی و معافی بیوی کی طرف سے ہوتی ہے یا شوہر کی طرف سے۔"

میری اہلیہ ایک معمولی کسان کے گھرانے کی پروردہ سہی مگر کبھی اس کی نظر میں دولت کی اہمیت نے جگہ نہیں لی۔ اکثر اوقات ایسا ہُوا کہ گھر میں کھانا کم ہونے کے باوجود سوالی کو ہاتھ خالی نہیں جانے دیا اور مہمان آ گئے تو خود کھانا ملتوی کر دیا اور مہمانوں کے لئے بھیج دیا۔ جب کہیں سے تھوڑا بہت روپیہ آ گیا تو ایسی شاہ خرچ ہو گئی کہ بے ضرورت بھی چیزیں خرید ڈالیں، اپنے اچھے خاصے کپڑے غریبوں اور بیواؤں کو دے دینا اس کے لئے معمولی سی بات ہے، اور کمال تو یہ ہے کہ وہ میرے کپڑے بھی اسی طرح غریبوں اور فقیروں کو تقسیم کر دیتی ہے۔ جب مَیں جز بز ہوتا ہوں تو کہتی ہے کہ

"آپ تو پہنتے ہی ہیں فقیروں والے کپڑے، ادھر تو بنا لیں!"

اُس کی نظر میں مستقبل کی کوئی قیمت نہیں، حالانکہ جس کا ماضی غمناک ہو وہ مستقبل سے غافل نہیں رہتا مگر یہاں معاملہ ہی دُوسرا ہے جب کبھی میں نے اُسے مصارف کے معاملے میں محتاط ہونے کو کہا اُس نے ہمیشہ یہی جواب دیا وہ جس نے دیا تن کو وہی دے گا کفن کو۔ اُس وقت میرے پاس خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ ہوتا کیونکہ اس فقرے میں جہاں خدا پر بھروسا ثابت ہے وہیں خود اعتمادی بھی اپنی معراج پر نظر آتی ہے

وہ ضرورت سے زیادہ اچھی چیزیں خریدنے کی عادی ہے مگر احتیاط سے بالکل بے نیاز۔ ایک دو روز کے بعد وہ اچھی سے اچھی اور قیمتی سے قیمتی شے سے بے پروا ہو جاتی ہے۔ برتنوں کے ٹوٹنے اور کپڑوں کے گم ہونے سے اُسے مطلق افسوس نہیں ہوتا بڑے سے بڑے نقصان کو ایک "اونہہ" کے ساتھ نظر انداز کر دیتی ہے۔ اور لطف یہ کہ اس کی بے نیازی دیکھتے دیکھتے میں بھی بے پروا ہو گیا ہوں اور بعض اوقات تو روزمرّہ کی ضروریات کے لئے بھی خاموش رہ جانا پڑتا ہے۔

مجھ پر بڑے بڑے زہرہ گداز وقت آئے ہیں اور میرے ساتھ میری بیگم کو بھی فاقوں سے دوچار ہونے کی نوبت آگئی، مگر میں نے مشکلات اور مصائب کی یلغار میں کبھی اس کے چہرے کو اُترا ہوا نہیں دیکھا، بعض اوقات جب میں ہمّت ہار دیتا اور ناسازگاریِ روزگار کا شکوہ کرنے لگتا۔ اُس وقت وہ میری ہمت بڑھاتی اور کہتی "ہم تو کوئی چیز نہیں معمولی مزدور ہیں، بُرا وقت تو بادشاہوں پر بھی آجاتا ہے اور کھاتے پیتے بھی افلاس اور ناداری کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، گھبرانے کی کونسی بات ہے؟ میں پردہ نشین ہوں، میرا رزق تو یہیں پہنچنا چاہیئے اور ایک آدمی کی خوراک میں دو آدمی یقیناً زندہ رہ سکتے ہیں۔ ذرا انتظار کریں کہیں نہ کہیں سے رقم آرہی ہو گی۔"

اِس سے مجھے مسرّت بھی ہوتی اور غم بھی، مسرّت تو اس لئے کہ کیسی ثابت قدم

عورت ملی ہے اور غم اس بات کا کہ ایسی بیوی کو اس کے حسبِ منشا، آسائش نصیب نہیں ہوئی، مگر اسے اس ناداری کی بالکل پروا نہیں ہوتی جیسے حال پر افسوس اس کی فطرت میں ہی نہیں ۔“

ایک دفعہ اس نے ذراسی آسائش پاکر یا کفایت شعاری کر کے دو تین زیور بنا لئے۔ اس سے تیسرے روز بڑے لڑکے محمد ذیشان دانش کو جامعہ ملیہ دہلی میں داخلہ کے لئے رقم کی ضرورت پڑی تو اس نے کانوں کی بالیاں اور گلے سے جگنی مصرت رساں مرہم کے پھاہے کی طرح اتار کر میرے سامنے پھینک دی اور اس کی پیشانی پر افسوس کی کوئی سلوٹ نہ آئی، البتہ کبھی کبھی وہ مکان کے لئے کہتی کہ کچا ہی سہی اپنا مکان ہونا بہت ضروری ہے، اور میں کہتا ”بیگم اب ہمیں تمہیں مکان سے کیا غرض، اپنے مکان کے مستحق تو نسے لوگ ہوتے ہیں اور پھر موجودہ حالات میں مکان کیسے بن سکتا ہے علاوہ ازیں ہم مکان بنا بھی لیں تو کتنے روز کے لئے؛ مجھے تو روز قبر یاد کرتی ہے اور سوتے وقت ہچکیاں آتی ہیں لیکن اس کی سمجھ میں یہ باتیں کہاں آتیں وہ جھلا کے کہتی ”ہم تو آدمی ہیں چیل کوے بھی بچوں کے لئے گھونسلا چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔“

لاہور کی نمائش کا مشاعرہ

لاہور میں ایک آل انڈیا نمائش ہوئی جس میں مصنوعات کے اسٹال، تفریح کے لئے کھیل تماشے اور پہلوانانِ بیل تن کے لئے اکھاڑے کا انتظام بھی کیا گیا، عوام الناس کی تفریح کے ساتھ ساتھ ادب دوست اصحاب کی روحانی ضیافت کے لئے ”انجمن اردو پنجاب“ کی طرف سے ایک عظیم الشان مشاعرے کا اہتمام بھی کیا گیا جس میں نظموں کے عنوان اور غزلوں کے لئے طرح کے مصرعے بھی رکھے گئے۔ ”انجمن اردو پنجاب“ اور بعض تاجروں کی طرف سے تمغوں کا اعلان بھی کیا گیا، جہاں سنجیدہ مذاق لوگوں کے

لئے نظمیں اور غزلیں تفنن کا سامان تھیں وہیں مزاحیہ اشعار پر بھی میڈل کا اعلان موجود تھا۔

انجمن اُردو کے سیکرٹری میاں بشیر احمد بار ایٹ لا[1] مرحوم اور صدر جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی مرحوم تھے جن کی تمام زندگی اُردو ادب کی خدمت میں گزری، اسی طرح میاں بشیر احمد صاحب نے اپنے رسالہ "ہمایوں" سے جو اُردو کی خدمت کی وُہ فراموش نہیں کی جا سکتی ویسے وہ صاحبِ قلم اور صاحبِ تصنیف بھی تھے۔

جناب دتاتریہ کیفی نے جو اُردو ادب کو دیا اور شعراء و ادبا کی حوصلہ افزائی کی اُسے دیکھا جائے تو اُردو زبان میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مشاعرے میں بھی بنیادی کام اُنھیں کا تھا، اور حیرت کی بات یہ تھی کہ منتظمہ نے لاہور میں اتنا بڑا مشاعرہ نہایت خوشگواری سے انجام کو پہنچا دیا، ورنہ لاہور میں تو بڑے بڑے شاعر عموماً ناکام رہتے تھے اور لاہور کی پبلک اس معاملے میں بڑی ہی بدنام تھی، سبب اس کا یہ ہے کہ یہاں نغمہ پسند لوگ زیادہ اور شعر فہم لوگ کم ہیں چنانچہ یہاں کوئی مشاعرہ ہو یا مناظمہ عموماً نغمہ گری کے پہیّوں پر ہی چلتا تھا، اور نتیجہ اس کا یہ ہوتا کہ مشاعرہ کی شہرت کی تشنگی کو تو نغمہ کی تحسین پُورا کر دیتی لیکن مضامین کی بلندی توجہ سے محروم رہ جاتی تھی، اس کے علاوہ دھڑے بندی اور پارٹی بازی اس قدر تھی کہ خُدا کی پناہ! ہمیشہ لوگ ایک دوسرے کی مخالفت پر تُلے رہتے۔ روز روز کے ہنگاموں سے اخبارات کے کالم گندگی سے آلودہ اور کوڑے کرکٹ سے پُر رہتے۔ آئے دن مشاعروں میں بھی اسی قبیل کے لوگ شور و غُل مچاتے جس سے صحیح مذاق اُبھرنے نہ پاتا اور بازاری اندازِ بیان قبولِ عام کی سند پاتا، اس مشاعرے میں کئی سامع اور شاعر شباب اور شراب کے نشے میں دُھت آئے جبکہ اس عالم میں انسانیت شیطان کی توجہ کا مرکز ہو جاتی ہے اور اس میں سینکڑوں بے تمیزیوں کے دریچے کھل جاتے ہیں مگر کوئی حدود سے نہیں بڑھا سبب یہ تھا کہ اس میں آٹھ آنے، ایک روپیہ اور تین روپے کی شرح سے ٹکٹ

[1] میاں بشیر احمد انتقال کر گئے لیکن ان کی شرافت اور خلوص ہنوز میرے دل میں تازہ ہیں۔ خُدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

رکھا گیا تھا اور اس سے یہ فائدہ ہُوا کہ بدمذاق لوگوں کی اکثریت نہ ہو سکی۔ مزید برآں مشاعرے سے پہلے ہی منتظمین مشاعرہ نے ہر کرسی پر ایک مطبوعہ اپیل کا کاغذ رکھ دیا تھا جس میں کہا گیا تھا "لاہور کے دامنِ ادب کو دھبے سے بچائیں اور مشاعرے کو خراب نہ ہونے دیں"۔ اس درخواست پر سامعین نے ضبط سے کام لے کر رطب و یابس کو بھی کڑوے گھونٹ کی طرح برداشت کر لیا اور مبتدی سے لے کر منتہی تک ناکام نہیں ہُوئے۔ اگرچہ موسم کی ناہمواری سے کچھ برہمی سی بھی رہی لیکن سامعین اور شاعروں پر آسمان کی اَبری اور بھی رنگ لے آئی، ترشّح کی وجہ سے لوگ نمائش میں کم آئے اس طرح یہ مجمع صرف صاحبانِ ذوق تک رہا۔ مشاعرہ کی صبح و شام کی دونوں نشستیں بڑی کامیابی پر تمام ہُوئیں، دوپہر کو ایک گھنٹہ گشت دگزر کے لئے دیا گیا اس کے باوصف سامعین دل جمعی سے مشاعرہ سُنتے رہے اور شعراء کو مناسب داد و تحسین ملتی رہی۔

پہلی نشست کے صدر جناب دیوان نریندرا ناتھ تھے اور موصُوف نے اپنی افتتاحی تقریر میں مشاعروں کے انعقاد پر ایک معلومات افزا روشنی ڈالی جو اُن کی ذہانت اور قابلیت کی آئینہ دار تھی۔

دُوسری نشست کی صدارت سرشیخ عبدالقادر صاحب نے کی، اُن کے متعلق کچھ کہنا سُورج کو چراغ دکھانا ہے، اُن کی اُردو نوازی سے کون انکار کر سکتا ہے؟ وہ صرف اُردو ہی کے دلدادہ نہیں تھے بلکہ اُن کی نگاہِ انتخاب نے بڑے بڑے شعراء و ادباء کو پرواز کی قوتیں بخشی ہیں، اور بعض کو تو کمر سے باندھ کر اُڑے ہیں جو اُن کے بعد اب تک بلند ایوانوں کے منڈیروں پر تھرک رہے ہیں۔

اس انجمن کے مشاعرے میں شعرائے پنجاب کے علاوہ جو شعراء موجود تھے اُن میں جناب جوش ملیح آبادی، اثر رامپوری، سراج لکھنوی، قدیر لکھنوی، بدر غازی پوری اور شاعر سیمابی وغیرہ قابلِ ذکر تھے اور مقامی حضرات میں جناب پنڈت

برج موہن دتاتریہ کیفی، حفیظ ہوشیارپوری، مولانا حامد علی خاں، مولانا تاجور نجیب آبادی، عبداللطیف تپش، چودھری خوشی محمد ناظر، عرش ملسیانی، محمد دین تاثیر، رام پرشاد ناشاد، خواجہ دل محمد دل، صوفی غلام مصطفےٰ تبسم، حاجی لق لق، پروفیسر فیض احمد فیض، احمد یار خاں دولتانہ، وِتسنہ پرشاد فدا، جلال الدین اکبر، خلیفہ عبدالحکیم، اودے سنگھ شائق، دینا ناتھ مست، تاجور سامری، سید عابد علی عابد، میاں بشیر احمد اور راقم الحروف بھی شامل تھے۔

مَیں چونکہ انعامی مشاعرے میں شامل نہیں تھا اس لئے انعامی مشاعرے کے شعرائے کرام کے متعلق مجھے کچھ یاد نہیں کہ کون کون اس معرکے میں شامل تھے، مقابلے کا کلام منتظمین نے چار روز پہلے منگا لیا تھا۔ ہاں اتنا معلوم ہو سکا کہ میڈل کے لئے تین شعراء منتخب ہوئے۔ نظم کے سلسلے میں زیب عثمانیہ۔ غزل کے مقابلے میں جناب عرش ملسیانی۔ میڈل دیتے وقت صاحب صدر نے فرمایا "مجھے خوشی ہے کہ یہ انعام دوآبہ کے رہنے والے ایک پنجابی کو ملا ہے" مزاحیہ کلام کا انعام حاجی لق لق نے پایا، غیر طرحی کلام میں بھی کچھ کم لطافتیں نہ تھیں، خواجہ دل محمد[1] صاحب نے اپنے ہندی دوہوں سے داد و تحسین لی، اور میری نظم "پردہ" پسند کی گئی۔

میاں بشیر احمد کی کوٹھی پر دوپہر کو دعوتِ طعام کے بعد شعرا کا فوٹو لیا گیا اور "ہمایوں" میں شائع ہوا، اس مشاعرے اور میری نظم نے میرا تعارف کئی ہزار آدمیوں سے کرا دیا بہت سے لوگوں نے خط بھیج بھیج کر وہ نظم منگائی۔

اس مشاعرہ کے بعد بعض ایسے لوگوں نے مجھ سے ملنا شروع کر دیا جنھیں میرا ذہن دھتکارتا لیکن میں اخلاقی مجبوری سے خاموش رہتا، میں اُن کی باتوں کا جواب بھی کم دیتا اور بے توجہی بھی برتتا لیکن نہ جانے اُنھیں اپنا وقت کیوں عزیز نہیں تھا، جب وہ میری رُوحانی تلخی کو محسوس نہ کرتے تو نتیجے میں پھر میرا ضمیر مجھے دھتکارنے لگتا تھا۔

[1] خواجہ دل محمد صاحب وفات پا گئے ہیں۔ نے پنجاب کی زندگی میں اپنے مخلص اور انسان دوست بہت کم دیکھے ہیں افسوس کہ ابھی ان پر کام نہیں ہوا۔

یہ لوگ اُدب سے تو کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے لیکن سیاستِ حاضرہ پر اس طرح گفتگو کرتے کہ میرے دماغ میں تنکے سے اُڑنے لگتے اور مَیں سوچنے لگتا کہ یا تو جبلّی طور پر انھیں اس گفتگو کا حق حاصل ہے یا پھر یہ دیوانگی کی کوئی شاخ ضرور ہے۔

بعض لوگ جب پہلی دفعہ مجھ سے ملنے آتے تو اُن میں خلوص جھلکتا لیکن جب وہ ماحول کو نرم پاتے تو دوسری بار اپنے اندر کے مرکھنے مویشیوں کو بھی آزاد کر دیتے جن کے اخورٗ میرے یہاں نہیں تھے، بعض اوقات تو میں اُن کی اُوٹ پٹانگ گفتگو سے ایسا اُکتا جاتا کہ دماغ میں یہ خیال جھانکنے لگتا "کیا میرا خدا ان جانوروں کا بھی خالق ہے"؟ اور یہ سوالیہ مجھے بڑی دیر تک پریشان رکھتا۔

م۔ حسن لطیفی

ادھیانہ کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ غیر منقسم ہندوستان میں اس دَور کے مشہور شاعر اختر شیرانی نے جب اپنے ماہنامہ "خیالستان" کا اجراء کیا تو اس کی ادارت میں لطیفی کا نام بھی تھا، اس کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے جناب اختر شیرانی نے اُسے آغاز ہی میں قابلِ رشک شہرت دے دی۔

جب لطیفی لندن سے جرنلزم کی ڈگری لے کر آیا تو آس پاس کے دست نما دشمنوں نے اس کی ثنا خوانیوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اختر شیرانی کی مجلسوں سے بھی دست بردار ہو گیا؛ ہاں اُس کے گھر پر خوشامدی اور زمانہ ساز لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے رہتے اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے۔ کوئی مخلص دوست کچھ مشورہ دیتا تو لطیفی نظر انداز کر دیتا۔

زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ خاندان میں جائداد کی تقسیم کا سوال اُٹھا اور لطیفی کو اچھا خاصا زر پہنچا۔ لطیفی کے پاس اس وقت بھی نہ دیگ کے طور پر اتنا اثاثہ تھا کہ جس سے شریفانہ زندگی بسر ہو سکتی تھی۔

اخور: مویشیوں کے چارہ کھانے کے لئے جو تھان لکڑی یا اینٹوں سے بنائے جاتے ہیں۔ کھرلی۔ ناند۔

اچھے وقت کی سحر گر ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ دماغی خلجان میں پھنس کر ایسے لوگوں کی دریافت میں آگیا جو ضوابطِ حیات سے دامن بچا کر شیطنت کے ہاتھ پر بیعت کر لیتے ہیں، ان کی گنگا جمنی خرافات نے لطیفی کو ایسے مقام پر پہنچا دیا۔ جہاں چہرا ہے اور قصاب کا فرق نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

میں جب لدھیانہ کے مشاعرے میں گیا تو وہاں کے شعراء[1] سے لطیفی کی بہت تعریف سُنی اور دُوسرے روز میں اس سے ملنے کے لئے اس کے بنگلے پر گیا اُس وقت تک وہ دوستوں کی تواضع کو بار نہیں سمجھتا تھا مگر اردگرد کے لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ لطیفی ہمارے علم و فن کو نظر میں نہیں لاتا تو اُنھوں نے روزانہ اپنے طرح طرح کے پاکیزہ خواب بیان کر کر کے لطیفی کو احساسِ مہدیت کی طرف راغب کر دیا چنانچہ اُس نے کُچھ روز تو دبے دبے الفاظ میں خود کو مہدیت کے گملے کا ایک ہونہار پودا ظاہر کیا اور پھر اُسی تصور کو بڑھا کر ایک کتاب "نظریۂ مہدی" لکھ ماری جو اب تک میرے کتب خانے میں موجود ہے۔

پھر تو لوگوں کا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ لطیفی دماغی طور پر تلپٹ ہو گیا ہے چنانچہ اخبار اور رسالے اس کا کلام چھاپنے میں تامل کرنے لگے لیکن چونکہ وہ حوصلے کا جری انسان تھا اُس نے اپنے بنگلے میں اپنا ایک پریس قائم کر کے اپنے کلام کی اشاعت کا ذریعہ بنا لیا، اس کی دو تین کتابیں غالباً اسی "شاطو پریس" سے چھپی تھیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس کی یک ورقی نظمیں اور پمفلٹ تقسیم کے ہنگامے میں ضائع ہو گئے۔ ہاں اس کی تین کتابیں میرے کُتب خانے میں موجود ہیں۔

جب ملک تقسیم ہُوا اور لطیفی لدھیانہ سے نکلا تو اُس کے ساتھ صرف اس کا

---

[1] نیاض ہریانوی، عرش ملیانی، نور لدھیانوی، ساحر لدھیانوی، اعجاز اکرم یوسفی، احمد یمانی، عبداللہ گرد، شبیر احمد خاموش، ظہور نظر، زین العابدین محشر، صادق نیازی، حافظ لدھیانوی، حافظ انصر لدھیانوی وغیرہ لدھیانہ کے نوواردِ شاعر تھے۔

ایک بچّہ تھا جو لاہور آتے آتے اللہ کو پیارا ہوگیا، مگر اس کی مایوسی اور ہراس کے خلا کو اس کی جراتوں نے پُر کر رکھا تھا جیسے دو چار شاخیں کٹنے سے تناور درخت نہیں سُوکھتا۔

آخر آخر ایسا دیکھا گیا کہ جہاں سے باعزّت طور پر تھوڑا بہت مل جاتا کھا پی لیتا ورنہ خاموش گلی کوچوں میں پھرا کرتا، اب اس کی لائبریری کباڑیوں کی دکانیں تھیں، اور اس کی آرام گاہ میرا مکتبۂ دانش،

لطیفی کو جب کہیں سے کھانا یا رقم ملتی تو وہ سب فقیروں کو تقسیم کر دیتا، اِرد گِرد جب فقیر نہ ہوتے تو روٹیوں کے باریک باریک ٹکڑے توڑ کر کسی بھی پارک میں جا بیٹھتا اور چڑیوں، کوّوں کو چُگاتا رہتا، اس کی یہ پرند پروری یہاں تک بڑھ گئی کہ جہاں لطیفی کھڑا ہوتا وہیں چڑیاں اور کوّے جمع ہو جاتے، جنگلی کبوتر اس کی لے صرفِ فطرت سے اتنے آشنا ہو گئے تھے کہ اس کے کندھوں پر آبیٹھتے اور ہاتھوں پر دانا چگتے!

میرے منجھلے لڑکے فیضان* دانش سے لطیفی بہت مانوس تھا۔ اکثر وہ میرے یہاں ہی آکر نماز ادا کیا کرتا اس کی ایک ایک، دو، دو، گھنٹے میں ہوتی تھی، جب وہ دُعا کو ہاتھ اُٹھاتا تو عموماً اس کی آنکھیں برس پڑتیں اور ہونٹ لجاجت میں ڈوب جاتے وُہ کبھی کبھی میرے کُتب خانے میں سو بھی جاتا میں نے اُسے رات کے آخری حصے میں گریہ وزاری کرتے دیکھا ہے! فیضان اُس سے کبھی کبھی انگریزی کے مشکل الفاظ کے معنی بھی پوچھا کرتا اور وُہ ایک شفیق اُستاد کی طرح سمجھایا کرتا۔

بعض وقت خود بخود اس پر ایک رازدارانہ معرفت مسلّط ہو جاتی ہے جس کے اصول و ضوابط دُنیاوی ہنگاموں سے جُدا ہوتے ہیں، گفتگو کرتے کرتے اُس کی زبان لڑکھڑا جاتی۔ جیسے ایک سوکھا پتّا بگولے میں چکرانے لگے، اُس کے پگھلے پگھلے لہجے میں الفاظ کے

---

* ڈاکٹر فیضان دانش ایم اے، پی ایچ ڈی جو تعلیمات سے منسلک ہے

خدوخال بھی مدھم ہو جاتے اور وہ اُسی ٹھکتے ہوئے انداز میں اپنوں کی بیوفائی کا گلہ کرتے کرتے خاموش ہو جاتا ۔ جیسے کوئی کہانی کہتے کہتے اونگھ جائے، اُس وقت اس کے چہرے پر شیر خوار معصوم بچوں کی سی جاذبیت عود کر آتی

حیرتناک بات تو یہ ہے اس گئے گزرے عالم میں بھی اس کی سخاوت نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔ ہر وقت دو چار فقیر اُس کے آزو بازو رہتے

ایک دن لطیفی کو اس کا ایک پُرانا شناسا مل گیا، جو اس کی لدھیانے کی زندگی، حیثیت اور وقار سے آگاہ تھا، اُس نے بڑی لجاجت سے شام کے کھانے کی دعوت دی، لطیفی نے کہا "آپ کی مہربانی، مگر میں اکیلا نہیں ہوں : وہ سمجھا کہ یونہی کوئی دوست ہوں گے، اس نے نہایت خندہ پیشانی سے کہا " ضرور ضرور"

جب شام کو لطیفی پندرہ بیس محتاجوں، فقیروں اور معذوروں کو لے کر اس کے مکان پر پہنچا تو اُس کے ہوش اڑ گئے، اُسے کیا خبر تھی کہ جس لطیفی کے دستر خوان پر شہر کے لکھے پڑھے اور معززین کا ہجوم رہتا تھا اب اس کی برادری میں میلے کچیلے بھیک منگے اور لنگڑے لولے لوگوں کا ایک سیلاب ہے۔ جیسے کوئی بند روبند ہو جائے اور میلا پانی بازار میں بہنے لگے! میزبان نے بازار سے روٹیاں اور سالن منگا کے وقتی طور پر اُس ناگہانی کو بھگتا، مگر لطیفی اس کی نظر میں ایک تصویرِ عبرت تھا۔

اچانک ایک دن دیکھا کہ لطیفی ڈاڑھ پر ایک سفید پھاہا چپکائے پھرتا ہے ۔ میں نے کہا ۔ میاں یہ کیا کر لیا؟ کہنے لگا کچھ نہیں ڈاڑھ پک گئی ہے، شاید عقل ڈاڑھ اب نکل رہی ہے، جب میں عقل کا قائل ہی نہیں رہا۔

کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ لطیفی تو ہسپتال میں ہے اور کینسر میں مبتلا ہو گیا۔ آخر اُس نے بے یار و مددگار ماحول میں جان دے دی۔ خدا اُسے جوارِ رحمت عطا فرمائے! آمین۔

مولانا تاجور نجیب آبادی

جب مجھے پہلی بار مولانا تاجور نجیب آبادی سے ملنے کا اتفاق ہوا، اس وقت وہ ماہنامہ "ادبی دنیا"[1] نکالتے تھے۔ معیارِ مضامین اور حُسنِ ترتیب کے اعتبار سے بہت کم ماہنامے اس درجے پر آئے ہیں۔ حالانکہ زمانہ کوسوں آگے بڑھ چکا ہے۔ اس ماہنامے کے لئے ایک حصہ، (جہاں اب لاہور ہوٹل ہے) استعمال میں تھا جہاں پر اسلوب کی یکساں وردیاں، اڈیٹر کے کمرے میں ٹیلیفون اور کام کرنے والوں کو ہر قسم کی سہولتیں۔ حیرت ہوتی تھی کہ یہ کام کیسے چل رہا ہے اور مولانا اکیلے اسے کیسے سنبھالے ہوئے ہیں۔

مولانا تاجور اس ماہنامے کی ادارت کے ساتھ ساتھ دیال سنگھ کالج میں اُردو، فارسی کے پروفیسر بھی تھے۔ زبانِ اُردو کی جس قدر خدمت مولانا تاجور نے کی ہے یہاں اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ ہندوؤں اور سکھوں میں متھرا داس آ ہوجہ کرپال سنگھ بیدار، اودے سنگھ شائق، چونی لال کاوش، پنڈت چاند نرائن اور مسلمانوں میں عبدالحمید عدم، اختر شیرانی اور فاخرہ ہریانوی جیسے لوگ اُن کی توجہ اور تربیت کے شاہکار ہیں۔ علمی، ادبی بلند پائیگی کے ساتھ اُن کی طبیعت کا پُر وقار مزاح تھا جو اُن کے مزاحیہ مضامین کے نثری شاہپاروں میں بولتا تھا۔ "ادبی دنیا" اور دُوسرے جرائد میں "بیوی سے چھیڑ چھاڑ" مستقل چھپتی رہی ہیں۔ اگر وہ کبھی کتابی صورت میں آگئیں تو اُردو زبان کے طالب علموں کے لئے کارآمد لٹریچر ہوگا۔ زبان و بیان، محاورات و ضرب الامثال کے اعتبار سے اب تک ایسا ادب یہاں کی تخلیقات میں ناپید ہے۔ "ادبی دنیا" میں اُنھوں نے اُردو زبان کی تاریخ بھی شروع کی تھی لیکن مکمل نہ ہو سکی۔ اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کاش

---

١ مولانا تاجور کے بعد مولانا صلاح الدین نے "ادبی دنیا" کو سنبھالا اور ان کے بعد سے عبداللہ قریشی ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔

وہ تاریخ اُسی اندازِ عبارت سے اختتام پذیر ہو جاتی۔

لاہور میں مولانا تاجور کے مخالفین کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی جو اُنھیں ہر وقت ہدفِ ملامت بنائے رکھتے تھے۔ لیکن وہ جب تک اِس دُنیا میں رہے اِس پُورے گروہ کے وار اکیلے اوٹتے اور نئی پود کو ٹنڈ والتے رہے۔ اسی مقامی سیاست کی وجہ سے مولانا اپنی قلمی تخلیقات کو جمع نہ کر سکے، لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ اُن کے مخالفین سے بھی کوئی علمی، ادبی تاریخی کام نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ادب میں ان کا نام بہت کم لیتے ہیں، کیونکہ نام کی زندگی تو قابلِ قدر کام اور تعمیری ادب سے عبارت ہے۔ اگر ہم غور کریں تو اِس دھینگا مشتی میں ایسے اچھے اچھے دماغ تخریب کی لپیٹ میں آ گئے جن سے آنے والی نسلوں کے لئے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ اُن میں بعض تو ایسے بھی تھے جن کے سر پر سفید بالوں کا سورج طلوع ہو رہا تھا اور یہ وہ وقت ہوتا ہے جب بڑے بڑے گنہگار اور عادی مجرم صحیح راستوں پر لوٹ آتے ہیں اور ان کی نگاہوں سے حیات جھنکاڑ ہٹ جاتے ہیں، اس وقت بعض تو یکسر برائیوں سے دست بردار ہو جاتے ہیں اور بعض اتفاق اور اخلاق سے عارضی قربت اختیار کر لیتے ہیں لیکن مولانا کے مخالف ایسی مٹی کے انسان تھے کہ اس عمر میں بھی اپنی پستیوں پر نازاں اور جرائم پر ثابت قدم تھے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض نا اہلوں کو مولانا تاجور اور اُن کے مخالفین کی تیا دُکی سے ایسا فائدہ پہنچا کہ وہ اپنے اصل مقام سے بلند ہو گئے، اگرچہ مستقبل میں تحقیقی جائزے سے کوئی بات چھپی نہیں رہے گی لیکن وقتی طور پر تو ہنگم غل غپاڑے میں زندگی افروز خیال اور جنوں پرور نغمے ڈوب کر رہ گئے۔

ہر چند کہ شاعری ایک فطری جذبہ ہے لیکن اہلِ علم کی صحبت اور مطالعۂ کتب اُس میں چار چاند لگا دیتا ہے۔ پھر ابتدائی مرحلوں کے لئے تو یہ نہایت ضروری ہے مولانا کی صحبت میں مجھے یہ تمام نعمتیں میسّر تھیں مطالعہ بھی، مشاہدہ بھی، تہذیب بھی،

ٹنڈ والنا: سنبھالنا۔ چوکسی کرنا۔ گھیرے رکھنا۔ تربیت کرنا

تربیت بھی۔ اور جب تک مولانا زندہ رہے وہ ایک ہنگامے سے دوچار رہے۔ بعض تاریک ضمیر تو ان کی موت کے بعد بھی الزام تراشی سے باز نہ آئے۔ وہ یہ بھول گئے ہیں کہ موت کے بعد اُن کے لئے لوگ کیا لکھیں گے۔ اُنھیں یہ خبر نہیں کہ جن ادبی مقامات اور شہرت کی زمینوں پر وہ قبضہ کرنا چاہتے ہیں اس سے پہلے زمین اُن پر قابض ہو جائے گی۔

مولانا تاجور جہاں ایک بلند مرتبت اور عدیم المثال عالم اور ادیب تھے وہیں وہ کانوں کے کچے بھی اس قدر تھے کہ جیسا کسی نے کہہ دیا ویسا یقین کر لیا اور شاید اسی وجہ سے یہ آپس کی لاگ ڈانٹ طول پکڑتی چلی گئی تھی۔

مولانا سے جب میرا تعارف ہوا اُس وقت یہ گرد و غبار بیٹھ رہا تھا، لیکن ہر انسان اپنی جگہ چوکنا ضرور تھا۔ ملتے ہی مولانا بڑی شفقت سے پیش آئے اور فرمایا کچھ سناؤ میں نے تعمیل حکم میں ایک غزل سنا دی، پھر ارشاد ہوا کچھ اور! میں نے ایک نظم پڑھی مولانا بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے، اگر کچلا نہ گیا تو جاندار معلوم ہوتا ہے، میں سمجھ گیا۔ میں نے مولانا سے کہا "میں مزدور ہوں اور مزدوری ہی سے پیٹ پالتا ہوں ادبی ماحول میں میرا رزق نہیں اُترا۔ اس لئے مخالفت کی مجھے پروا نہیں، میرے ذوقِ مطالعہ کے لئے جگہ جگہ لائبریریاں موجود ہیں"۔ مولانا نے ذرا آنکھیں کھول کر بل دار پیشانی سے میری طرف دیکھا اور مسکرا کر کہا۔

اچھا! "جناب کو اس حالت میں مطالعہ کا شوق بھی ہے؟"

میں:۔ "اسی لئے تو میں نے ترکِ وطن کیا ہے جناب!"

مولانا متاثر سے معلوم ہوئے اُن کی گفتگو میں خلوص کے ساتھ ایک قسم کی محبت اور ہمدردی بھی تھی جیسے ایک کڑوے مزاج کے باپ میں ہوتی ہے۔

مولانا نے اُسی مہینے کے "ادبی دنیا" میں میری ایک نظم "کوششِ رنگیں" کے

عنوان سے ایک مختصر نوٹ کے ساتھ شائع کی اور وہ اس قدر مقبول ہوئی کہ مولانا کے پاس کئی تعریفی خطوط آئے۔ پھر تو ادبی دنیا میں وقتاً فوقتاً میرا کلام بھی چھپنے لگا۔

مولانا تاجور کا علم و فضل تو مسلّم تھا، وہ دیو بند کے فاضل تھے اور پنجاب سے مولوی فاضل بھی کر لیا تھا لیکن وُہ اُستاد بھی اس قسم کے تھے کہ جب کبھی میں اُن کے پاس گیا ہوں اپنی معلومات میں اضافہ لے کے اُٹھا ہوں۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے مولانا بہت کم شعر کہتے تھے لیکن ایک بار کہہ کر نظرِ ثانی کے عادی نہ تھے مگر شعر سُن سُن کر معائب و محاسن پر تبصرہ اُن کا حصّہ تھا، ان کی فاضلانہ تقریر اور اُستادانہ طرزِ گفتگو ہر نہج سے بصیرت افروز ہوتی تھی کیونکہ اُنھیں ہر صنفِ ادب پر عبور تھا۔ بڑی بات یہ تھی کہ اُنھیں تعلیم سے زیادہ تفویض کا فن آتا تھا، جو ہر اُستاد کے بس کا روگ نہیں، صرف صاحبِ باطن لوگوں ہی کو ملتا ہے۔ یہ حقیقت عموماً بڑے بڑے لوگوں ہی میں پائی گئی ہے کہ شاگرد کو محسوس بھی نہیں ہوتا اور اُستاد باتوں باتوں میں مالا مال کر دیتا ہے۔

چنانچہ جناب برجموہن دتاتریہ کیفی، جناب نوح ناروی، مولوی عبدالحق، فراق گورکھپوری جناب جوشؔ ملیح آبادی، جناب مجنوں گورکھپوری، جناب حکیم کبیرالدین صاحب۔ حکیم رضوان احمد صاحب، جناب جوشؔ ملسیانی۔ جناب لالہ تلوک چند محروم اور اپنے اُستادِ اوّل قاضی محمد زکی صاحب زکیؔ کاندھلوی میں یہ فن مجھے بدرجۂ اتم ملا ہے۔

مولانا تاجور نے جو مجھے شعور عطا کیا ہے وُہ فراموش نہیں کیا جا سکتا، اگرچہ جناب جوشؔ ملسیانی، جناب محرومؔ کے علاوہ جناب کیفیؔ، فراقؔ گورکھپوری، جوشؔ ملیح آبادی، مجنوںؔ اور جناب نیازؔ فتحپوری کے علمی سرچشموں پر بھی مجھے بڑی ٹھنڈی چھاؤں ملی ہے اور اُن لوگوں کی نوازشات نے بھی مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ میری رُوح اُن کی شکر گزار ہے۔

ابھی سال بھر بھی نہیں ہوا تھا کہ مولانا سے میں رفتہ رفتہ بے تکلف ہو گیا، اور

مولانا بھی اپنی جوانی کے جذباتی حادثات بیان کر دیتے تھے جو میرے لئے مشعل راہ ثابت ہوتے تھے۔ وہ جہاں مجھ پر کرم فرماتے تھے وہیں موقع موقع سے ڈانٹ ڈپٹ بھی روا رکھتے تھے، مگر ایسی جس میں خلوص ہی خلوص تھا۔ رفتہ رفتہ انھوں نے مجھے اس قدر گستاخ بنا دیا کہ بعض گندے اور فحش اشعار بھی مولانا کے سامنے پڑھ دیتا اور وہ لاحول پڑھ کر ہنستے ہنستے دوہرے ہو جاتے اور پھر کہتے کس خبیث کا شعر ہے اور جب میں یہ بتاتا کہ یہ شعر میرا ہے تو کہتے کہ ظالم تجھ میں بڑا شاعر ہونے کے آثار ہیں، گمراہی کی کوشش نہ کر۔"

جب مولانا کسی سے میرا تعارف کرائے تو کہتے "یہ احسان دانش اردو زبان کا بہت بڑا شاعر ہے" اور جب میں یہ کہتا "یہ سب مولانا کا فیض ہے" تو کڑک کر فرماتے "میرا شاگرد ہرگز نہیں جھوٹ بولتا ہے جھوٹ!" اور جب میں پوچھتا۔ "مولانا کیا آپ مجھے اپنے شاگردوں کے زمرے میں نہیں سمجھتے"؟ تو جواباً کہتے "ہرگز نہیں، جب میرے اصل شاگرد جنھیں میں نے شروع سے سنبھالا ہے میری مخالفت کرتے پھرتے ہیں تو کیا تجھے میں اپنا شاگرد کہہ کر ایک دشمن کا اور اضافہ کر لوں؟ اور پھر تُو تو کمبخت ایسا منہ پھٹ، بے ادب اور گستاخ انسان ہے کہ تیرا تو سایہ بھی بُرا ہے! بس تو جہاں اور جس طرح ہے وہیں درست ہے۔"

لیکن مولانا نے میری کبھی دل آزاری نہیں کی اور میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ وہ مجھ پر نہایت مہربان ہیں بلکہ ناز بے جا بھی اٹھاتے ہیں اور بعض بعض اوقات مجھے اُن سے بڑی ہی ندامت ہوتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ میں اُن کے سامنے گستاخ ضرور تھا لیکن میری نظر میں اُن کا احترام بھی یہ تھا کہ کہیں اُن کی مخالفت سنتا تو بگڑ بیٹھتا اور جب مولانا سے آکر ذکر کرتا تو وہ مجھے اُلٹا ڈانٹنے لگتے اور کہتے، میرے معاملے میں تجھے بولنے کی کیا ضرورت تھی، میں جانوں میرے حریف جانیں! تو میرا کہاں کا

خیر خواہ نکل آیا؟ وہ میرے دشمن سہی لیکن تیری علمی حیثیت اُن کے مقابلے میں کیا ہے؛ خواہ مخواہ تو اُن کے مُنہ آتا ہے۔" جب مولانا اس طرح بگڑتے تو میں سُنی اَن سُنی کر کے خاموش بیٹھ جاتا اور سوچتا رہتا کہ اس اخلاق کے لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے جب مولانا خاموش ہو جاتے اور دِل کی بھڑاس نکال لیتے تو میں چپکے سے اُٹھ کے چل دیتا اور وہ ڈانٹ کر کہتے کہاں جا رہا ہے چائے تو پیتا جا!"

جب مَیں کئی روز مولانا سے نہ ملتا تو مولانا خود تشریف لاتے اور اُس وقت اُن کی بات چیت سے ایسی شفقت ٹپکتی کہ مَیں اُن سے لپٹ جاتا اور یہ جی چاہتا کہ کسی طرح اُن میں جذب ہو جاؤں اور وُہ خاموشی سے مجھے الگ کر دیتے اور کہتے "جا! میری جیب تو خالی ہے۔"

علّامہ اقبال کے گھر

مولانا تاجور، علّامہ اقبال کے مدّاحوں میں سے تھے اور کہا کرتے تھے کہ "پنجاب کی سرزمین نے یہ بہت نادر انسان پیدا کیا ہے، لیکن یہاں کی پبلک کے دماغ ابھی اونگھ رہے ہیں۔"

یہاں اِس یگانۂ روزگار کے لئے بھوپال کے تین سو روپے ماہانہ کے وظیفے کو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ اقبال کی زندگی کے لئے یہ بہت ہے، یہاں قوم اور اس کے نشو و نما کا تصوّر سرے سے مفقود ہے۔"

ایک دن میں نے عرض کی "مولانا زندگی میں جس قدر اقبال کی شہرت ہے یہاں اور کس کو یہ رُتبہ ملا ہے، مولانا تُنک مزاج تو تھے ہی بگڑ گئے جیسے ان کی خموشی کے پھوڑے کو چھیڑ دیا ہو، بولے "اَبے اُلّو تجھے کیا خبر کہ علّامہ اقبال کس مقام کے انسان ہیں، یہاں ایسی شخصیتوں کے جوہر تو مرنے کے بعد کھُلا کرتے ہیں، کیونکہ مُردہ قومیں مُردوں کو پُوجتی ہیں اور زندہ قومیں زندہ لوگوں کے جوہر کو سراہتی ہیں۔"

مَیں نے مولانا سے کئی بار کہا "مولانا! مجھے علّامہ اقبال کو دکھا تو دیں۔ آپ

کی بڑی نوازش ہوگی۔" مولانا نے کہا "ہرگز نہیں، مَیں تجھے اپنے ساتھ ہرگز نہیں لے جا سکتا کسی اَور کے ساتھ بھیج دوں گا، دیکھ آنا۔"

مَیں نے کہا "مولانا میں تو آپ ہی کے ساتھ جاؤں گا آپ سے زیادہ یہاں میرا ہمدرد کون ہو سکتا ہے ؟"

مولانا بولے "! تو بڑا بے ادب اور مُنہ پھٹ آدمی ہے تجھے ساتھ لے جا کر مَیں کیا اپنی توہین کراؤں ؟"

مَیں نے نہایت لجاجت سے کہا "مولانا! مَیں وعدہ کرتا ہوں جب تک وہاں سے واپس آئیں گے اُس وقت تک میں ہونٹ سیئے رہوں گا۔ ایک لفظ بھی مُنہ سے نہیں نکالوں گا" مولانا سُن کے خاموش ہو گئے۔

ایک دن مولانا نے مجھے گھر سے بلوایا اور کہا "ذرا کپڑے ڈھنگ کے پہن آ!"

مَیں نے پوچھا "کیا گورنر صاحب کے یہاں جانا ہے ؟"

مولانا:۔ "اَبے جاہل! علامہ اقبال کے یہاں جانا ہے علامہ اقبال کے! جس کے لئے تو روز میرے سر رہتا ہے۔"

مَیں:۔ "مولانا اُنھیں میرے کپڑوں سے کیا غرض وُہ تو آپ کو دیکھیں گے آپ اپنے مقام کا لباس پہن لیں، مَیں تو آپ کے خادم کی حیثیت سے آپ کے ساتھ جاؤں گا اور میرے پاس کپڑے ہیں بھی کہاں، دو جوڑے ابھی دھو کے سوکھنے کے لئے ڈال کے آیا ہوں، وہ بھی کئی جگہ سے گونتھ رکھے ہیں۔"

مولانا:۔ "اچھا چل یونہی چل لیکن جب تک وہاں رہے، زبان سی لینا زبان!"

مَیں:۔ "جیسا حکم ہو، میری کیا مجال ہے کہ سرتابی کروں۔"

اِس کے باوجود مولانا تمام راستے مجھے تلقین کرتے گئے کہ "وہاں زبان کھولنا گستاخی ہے گستاخی۔"

جب مولانا، علّامہ کی کوٹھی کے دروازے پر پہنچے تو مولانا نے پھر مجھے خاموش رہنے کی تاکید کی اور مَیں تیوری پر بَل ڈال کر خاموش ہوگیا۔

مولانا نے جھلّا کے کہا "کچھ مُنہ سے تو پھُوٹ سُن رہا ہے کہ نہیں؟"

مَیں "آپ ہی نے تو کہا ہے کہ خاموش رہنا۔ مَیں تو بڑی دیر سے خاموشی پر عمل پیرا ہوں۔"

مولانا مُسکراتے ہُوئے علّامہ کے یہاں ایک نیم روشن کمرے میں پہنچ گئے۔

مولانا تاجور اور علّامہ تو باتیں کرتے رہے اور مَیں اُن دونوں بزرگوں کو ایک پُجاری کی طرح دیکھتا رہا۔

جب چلنے لگے تو علّامہ نے مولانا سے میرے متعلق دریافت کیا مولانا نے فرمایا "غریب مزدور آدمی ہے۔ نہ جانے شعر و شاعری کا روگ کہاں سے لگا لیا اور میرے یہاں آنے جانے لگا، عرصہ سے آپ کو دیکھنے کا متمنّی تھا۔" علّامہ نے میرا نام دریافت کیا مَیں نے شرماتے ہوئے لہجے میں کہا "احسان"! علّامہ نے فرمایا "نام تو مزدوروں والا نہیں، اچھّا خُدا اِسم بامسمّٰی کرے۔"

مولانا جب سڑک پر آئے تو کہنے لگے "احسان تُو نے بڑے آدمی کو دیکھا ہے" مَیں نے عرض کی "حضور مَیں بلاشبہ آپ کا ممنون ہوں!"

مولانا: "مَیں نے تجھے اسی لئے خاموش رہنے کو کہا تھا کہ تو بات نہ کرنا جانتا ہے نہ سُننا، بھلا مجھے تیری ممنونیّت سے کیا فائدہ؟" مَیں نے کہا "مولانا شکریہ کوئی جُرم تو نہیں" مولانا نے کہا "چُپکا چُپکا چل بات نہ بڑھا، مَیں تجھے اچھّی طرح جانتا ہوں اور پھر کہتا ہوں کہ تُو خوش نصیب ہے کہ علّامہ سے مل بھی لیا اور دُعا بھی لے لی۔"

فیروز پور کا ایک مشاعرہ

مولانا تاجور نجیب آبادی کو ایک دفعہ فیروز پور سے سردار اودے سنگھ شائق نے خط لکھا "یہاں ایک مشاعرہ ہے آپ لاہور سے کچھ اچھے شعرا لے کر آجائیں تو مجھے سہولت ہو جائے گی" مولانا لاہور سے کئی شاعروں کو لے کر چل پڑے، ریل گاڑی جب فیروز پور کے قریب پہنچی تو مولانا کی کسی بات پر مجھے ملال ہوا، میں نے مولانا سے کہا "آپ نے میری توہین اس لئے کی ہے کہ آپ مجھے اپنے شاگرد کے مشاعرے میں لے جا رہے ہیں، لہٰذا اب میں اِس مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گا اور ابھی دوسری ٹرین سے لاہور واپس جاؤں گا یہ بارِ احسان میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔"

گاڑی فیروز پور کے اسٹیشن پر رکی سب شعراء اُتر کر اسٹیشن سے باہر چلے گئے لیکن میں گاڑی سے اُتر کر لاہور کو جانے والی ٹرین کے انتظار میں ایک بنچ پر جا بیٹھا۔ اُس وقت میرا یہ عالم تھا کہ جیسے ایک اعلیٰ معیار کا مغنی اجنبی ماحول میں قدر ناشناسی سے اُکتا کر اپنے ساز کے تاروں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر توڑ رہا ہو مولینا نے اسٹیشن سے باہر جا کر جب مجھے نہ دیکھا تو پوچھا "احسان کہاں ہے؟ اُسے بھی لاؤ نا؟"

مشاعرے کے کچھ لوگ میرے پاس آئے اور میں نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گا یہ میرا اور مولانا کا معاملہ ہے آپ لوگ اِس میں دخل نہ دیں۔ مولانا خود تشریف لائے اور کہنے لگے "دیکھ! اگر تو مشاعرے میں نہ گیا تو میری بڑی بھد اُڑے گی، اِس وقت یہ نشترِ غمزے نہ کر اُٹھ میرے ساتھ چل۔" میں نے کہا "مولانا میں اپنی ذلت کے لئے مشاعرے میں نہیں آیا۔ آپ کے

شاگرد کا مشاعرہ ضرور ہے لیکن میرے لئے اس قیمت پر مہنگا ہے کہ میں اپنی توہین سن کر بھی مشاعرے میں شریک ہوں۔ اب مشاعرے میں تو شمولیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اور آپ سے بھی ہمیشہ کے لئے ترکِ تعلق ہی بہتر ہوگا۔" مولانا نے مسکرا کر کہا "ترکِ تعلق تو بہت ہی اچھی بات ہے جس بات کو میں خود کہنے والا تھا وہ تو خود کہہ رہا ہے لیکن اب تو مشاعرے میں چل، کمبخت یہ تو میری عزت کا سوال ہے۔" جب میں نے دیکھا کہ واقعی مولانا بہت پریشان ہیں تو میں نے کہا "اچھا ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ یہاں میرے پاس بنچ پر بیٹھ کر ترنم سے ایک غزل سنائیں۔"

مولانا نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگے "یہ تو ہرگز ممکن نہیں۔" میں نے کہا "اگر یہ ممکن نہیں تو میں لاہور جاؤں گا مشاعرے میں شریک نہیں ہوں گا۔"

مولانا:۔ "ارے بیوقوف تو اچھی طرح جانتا ہے کہ میں کالج میں اُستاد ہوں اور یہاں نہ جانے مخلوقِ خدا میں مجھے کون کون جانتا ہے یہ لوگ کیا کہیں گے؟"

میں:۔ "مشاعرے میں جب آپ غزل پڑھیں گے اُس وقت لوگ کیا کہیں گے وہ تو تعداد میں یہاں سے زیادہ ہوں گے اور پھر ریل چلی گئی اب تو پلیٹ فارم ویران سا ہو رہا ہے۔"

مولانا:۔ "ابے گدھے! وہ تو مشاعرہ ہُوا، وہاں کوئی ہرج نہیں، یہ ضد نہ کر"

میں:۔ "مولانا یہ فیصلہ تو یُونہی ہوگا۔"

مولانا جھلّا کے چل دیئے اور جا کر تانگے میں سوار ہو گئے لیکن تھوڑی دُور چل کے تانگہ رُکوایا اور اکیلے واپس آئے کہنے لگے "خبیث! بتا کون سی غزل گاؤں؟" میں نے کہا "جو جی چاہے"! مولانا نے بنچ پر بیٹھ کر دھیمے دھیمے سروں میں اپنی وہ غزل سُنائی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

بندگی کسی کی ہو بندگی نہیں اچھی تو اگر خدا بھی ہے میں تجھے نہ مانوں گا

میں نے مولانا کے ہاتھ چوم لئے اور کہا "میں تو آپ کا خادم ہوں میرا طرّہ امتیاز جو ہے سب آپ کی توجّہ کا نتیجہ ہے ورنہ من آنم کہ من دانم، اگر آپ خود نہ آتے تو شام کو میں مشاعرے میں سر کے بل پہنچتا" چنانچہ میں مولانا کی معیت میں مشاعرے میں گیا اور بخیر و خوبی مشاعرہ انجام کو پہنچا۔

مولانا سے جب کوئی میری بُرائی کرتا تو وہ ہاں میں ہاں ملا دیتے اور کہتے "ارے بھائی! وہ کوئی پڑھا لکھا انسان تو ہے نہیں، مزدوروں میں زندگی گزری ہے، اُنہی میں اب تک اُٹھتا بیٹھتا ہے وہ سوسائٹی کے لحاظ سے محنت کش طبقے کا آدمی ہے آپ اس سے مہذّب لوگوں جیسا برتاؤ کیوں چاہتے ہیں؟ اُس سے تو جہاں تک ہوسکے بچ کے رہنا چاہیئے، وہ دل میں بات نہیں رکھتا فوراً بک دیتا ہے، میں بھی اُس کی رات دن کی گستاخیوں اور بیباکیوں سے تنگ ہوں، اسے شعراء و ادباء کی صحبتیں بھی بھلی معلوم نہیں ہوتیں۔ یہ شکاری جانور کی طرح دانشوروں کی سوسائٹی سے بھی نفرت کرتا ہے۔ میں نے اُسے بڑے اخلاقی درس دیئے مگر وہ ہے کہ مزدوروں اور کسانوں کی معاشرت سے باہر کی گفتگو جانتا ہی نہیں اور نہ اس میں کسی اور بلندی کی طرف جانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ تو ایک کالا بِلا ہے جو خود بخود مجھ سے ہِل گیا مگر سدھایا نہیں جاسکتا!"

لیکن جب کوئی میری شاعری کے معاملے میں تنقیدی رُخ سے گفتگو کرتا تو وہ فوراً برہم ہو جاتے اور کہتے "احسان دانش کی زندگی اور کج خلقی کے متعلق جو کہہ دو درست سمجھ لوں گا مگر جہاں تک اُس کی شاعری کا تعلق ہے وہ میرے اور آپ کے دونوں کے بس کا نہیں، وہ دُور نکل چکا ہے۔ یہ تو اُس کی شرافت ہے کہ اپنے حدود میں ہے ورنہ جہاں وہ شاعری میں ہے وہ مقام ہر شخص کو حاصل نہیں ہوتا۔ رہا عیوب کا سوال، وہ کرمِ کتابی ہے خود سنبھل جائے گا اُسے مطالعہ کرنا آتا ہے

اور بڑے اچھے مضبوط دِل و دماغ کا مالک ہے۔ ہاں یہ بھی بتا دُوں کہ اُس سے اُلجھنے کی کوشش نہ کرنا، وہ گالی بھی طبعزاد دیتا ہے اور مار دھاڑ کے معاملے میں فن پنوٹ کا ماہر ہے وہ اگر شاعر نہ ہوتا اور ماحول سازگار نہ مل جاتا تو شاید پھانسی چڑھ چکا ہوتا۔ اِس میں ایک کچلی ہوئی بغاوت اور زخمی غیرت بولتی ہے جسے وُہ اپنی شاعری کا نام دیتا ہے۔ اُس کی خاندانی شرافت اور اسلامی تہذیب کی دیواریں اُسے روکے ہوئے ہیں ورنہ اب تک کیا تھا!

اُور اب تو اُسے ہر سوسائٹی کے آدمی قبول ہی نہیں کرتے بلند مقام بھی دیتے ہیں اُس کی زندگی ایسی ایسی گھاٹیوں سے گزر کر آئی ہے کہ کوئی دُوسرا ہوتا تو ڈھیر ہو گیا ہوتا، لیکن تمام مصائب کے باوجود اس کا دِل کمزور اور رُوح گدلی نہیں ہوئی ہاں تھان کا ٹرا ضرور ہے۔ اِسے چمکار کر جس روِش پر چلانا چاہو چل جائے گا لیکن سوچنے کا عادی ہے اور یہ عادت اُسے ایک مقام پر ٹھہرنے نہیں دیتی۔

حکیم نیرؔ واسطی

اگرچہ میں ادبا و شعرا میں اجنبیت کے دِن گذار رہا تھا مگر اب اس طبقے کے لوگ مجھ سے جھجکتے نہیں تھے بلکہ بعض لوگ جن میں منصفی، خُدا ترسی اور انسان دوستی کا جذبہ تھا وُہ مجھ سے نزدیک ہونے لگے تھے اور بعض بعض موقعوں پر میرے کلام کو سراہنے میں بھی بُخل سے کام نہیں لیتے تھے جو میری نظر میں حوصلہ افزائی سے زیادہ بات نہیں تھی۔

ایک دِن اخترؔ شیرانی صاحب مجھے اپنے دوست حکیم نیرؔ واسطی کے وہاں بھی لے گئے اُن دنوں نیرؔ صاحب اِتنے نامی گرامی طبیب نہیں تھے اُن کی شہرت ابھی اُجالی لے رہی تھی۔

جناب نیرؔ واسطی تکمیل الطب کالج لکھنؤ کے فارغ التحصیل اور حضرت میاں شیر محمدؐ شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ کے معتقدوں میں ہیں۔

جب حکیم صاحب نے میاں صاحب[1] سے اپنے کاروبار میں برکت کے لئے دُعا کو کہا تو آپ نے فرمایا "حکیم صاحب مریضوں سے فیس لینا چھوڑ دیں یہ روزی دائرۂ جواز میں نہیں آتی" پیر صاحب ایک دفعہ کو تو تیورا گئے لیکن اُن کی عقیدت نے آمنّا و صدّقنا کہلوالیا اور انھوں نے اُسی دن سے فیس سے توبہ کر لی، کچھ دنوں تو شاید امتحاناً انھیں مالی پریشانی رہی لیکن بقولِ حضرت اقبال ۔

ع نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

پھر جو اُن کی تشخیص و تجویز کی شہرت ہوئی تو یہ عالم ہو گیا کہ دن کو ایک بجے تک مکان کے سامنے ٹریفک بند رہنے لگی بس ایک میلہ سا بھرا رہتا تھا حکیم صاحب نے یہ عالم دیکھا تو وُہ اپنا مطب شہر سے باہر الگ تھلگ ایک جگہ لے آئے ۔ جہاں اب اُن کی دو عالی شان بلڈنگیں ہیں اور آج وہ لاہور کے ہی نہیں پاکستان کے اُن اطبا میں سے ہیں جنھیں تذکرہ و تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں وہ ایک جیّد طبیب ہیں وہیں ہفت زبان ادیب اور شاعر بھی ہیں ؛ کردار کے اعتبار سے بھی ان میں وہ تمام خُو بیاں پائی جاتی ہیں جو عموماً بڑے آدمیوں کی طبیعتوں کا خاصہ تسلیم کیا گیا ہے ۔

ایک بار کے تعارف کے بعد حکیم صاحب میرے کرم فرماؤں کی فہرس میں آگئے اور مَیں اُن سے جس قدر نزدیک ہوتا گیا اُن کے جوہر نمایاں ہی ہوتے گئے۔

وُہ اچھّے خاصے متقی باشرع انسان ہونے کے علاوہ حضرت شیر محمد صاحبؒ شرقپوری کے مزار پہ حاضری دیتے ہیں اور اس وقت اُن کا خلوص دیکھنے کے قابل ہوتا ہے ۔ حکیم صاحب کے ہمراہ کئی بار مجھے بھی وہاں حاضری کا شرف حاصل ہُوا ہے اور وہاں میں نے ایک روحانی تسکین اور قلبی اطمینان محسوس کیا ہے جو عموماً بزرگان دین کے زندہ مزاروں پہ وارد ہوتا ہے ۔

---

[1] میاں شیر محمد شرقپوری بڑے باشرع بزرگ گذرے ہیں۔

نیّر واسطی صاحب قلم کے دھنی ہیں اُن کے شعری کلام کے مجموعے اور کئی نثری کتابیں شائع ہو چکی ہیں وہ اپنی مصروفیات مطب و تصنیف کے باعث مشاعروں میں تو بہت کم شریک ہوتے ہیں لیکن نجی نشستوں میں اصرار پہ انکار کے بھی عادی نہیں۔

مطب کے معمولات میں یوں تو وُہ اپنی اَنا اور خدمتِ خلق کے خیال سے کسی کے گھر یا عام سوسائٹیوں میں نہیں جاتے لیکن جہاں اُن کے احساس پر کوئی گہرا گھاؤ لگتا ہے اس وقت وہ ڈھیر ہو کر رہ جاتے ہیں اور کوئی اصُول اصُول نہیں رہتا۔ ایک دن اُن کے مطب میں ایک مفلوک الحال اور نادار قسم کا انسان آیا اور نہایت عاجزی سے کہنے لگا "حکیم صاحب میری لڑکی بیمار ہے آپ اللہ کے لئے اُسے چل کر دیکھ لیں" اس فقرے کے ادا کرتے کرتے اُس کی پُتلیاں آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔ وُہ بیکو کمپنی کا ایک مزدور تھا جو حکیم صاحب کے گھر سے تقریباً چار فرلانگ کے فاصلے پر ایک معمولی سے کوارٹر میں رہتا تھا۔

نیّر صاحب نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور خاموشی سے اُٹھ کر اُس کے ساتھ ہو لئے۔ مَیں حیران تھا کہ یہ تو بڑے بڑے اُمرا کے یہاں اس طرح نہیں جاتے اور پھر اس وقت جب کہ مطب مریضوں سے بھرا ہوا ہے۔

حکیم صاحب اُس کے کوارٹر میں گئے تو انھوں نے دیکھا کہ ایک کمزور مگر جوان لڑکی ایک جھلنگے کے جھکٹے میں ڈوبی ہوئی لیٹی ہے اور ٹانگوں پہ پُرانے اخباری کاغذ ڈھکے ہوئے ہیں۔

حکیم صاحب نے پوچھا "یہ اس کی ٹانگوں پر اخبار کیوں ڈالے ہوئے ہیں انھیں ہٹاؤ"۔ لڑکی کے اُس مزدور باپ نے جھکی ہوئی نظر سے جواب دیا۔ حکیم جی بے پردگی کے خیال سے کاغذ ڈھک دیئے ہیں۔ بچّی کا پاجامہ کئی جگہ سے پھٹا

ہوا ہے" حکیم صاحب تو یہ سنکر سناٹے میں آ گئے کھڑے کھڑے آنسوؤں سے گلہ بھر گیا اور ہونٹ کانپنے لگے۔ انھوں نے بمشکل ضبط کیا اور نبض دیکھ کر کچھ اور سوالات کیئے جو لڑکی کی بیماری سے متعلق تھے۔ اس کے فوراً بعد لڑکی کے باپ کو ساتھ لے کر مطب میں آ گئے اور اپنے دواساز سے جلد دوا تیار کرنے کے لئے تاکید کر کے فوراً اپنے زنانخانے میں گئے اور دوا کے تیار ہونے تک اپنی بیگم کے دو نئے جوڑے، ایک چادر اور بیس روپے دیتے ہوئے کہا "دیکھو یہ کپڑے اُس بچی کو پہناؤ، چادر اُڑھاؤ اور اس معمولی سی رقم سے کھانے پینے کا سامان لاکر گھر میں رکھو، بلاناغہ دواخانے سے آکر دوا لے جایا کرو! اور بھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دینا" پھر نہ جانے کب تک دوا جاتی رہی ہوگی۔

یہ مراعات ایک دو آدمیوں کے ساتھ ہی نہیں نیر صاحب کسی غریب سے، طالب علم سے، دینی معلّم سے، شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ صحافیوں اور مزارات کے خادموں سے کبھی کوئی پیسا نہیں لیتے اور جب وہ کسی سے اس قسم کا سلوک کرتے ہیں تو اُن کے چہرے پر ممنونیت ہوتی ہے! نہ کہ خُدائی پندار۔

وہ میرے گھر بھر کا علاج معالجہ کرتے ہیں اور کبھی آج تک کوئی مطالبہ نہیں، حالانکہ دواؤں میں پیٹنٹ ادویہ بھی ہوتی ہیں اور انجکشن وغیرہ بھی۔

وہ فرمایا کرتے ہیں کہ مجھ پر ایک درویش کی دعا سے خُدا نے کرم فرمایا ہے تو میں خُدا کے نیک بندوں اور فقیر دوست لوگوں سے دواؤں کی قیمت کیسے لے سکتا ہوں۔

مجھے معلوم ہے کہ ایک والئ ریاست نے حکیم صاحب کو بطورِ فیس دس ہزار روپے پیش کیئے اور انھوں نے بڑی بے نیازی سے واپس کر دیئے اور کہا۔ "یہ روپیہ میرے لئے جائز نہیں، میں ایک درویش سے وعدہ کر چکا ہوں کہ فیس کبھی

نہیں لوں گا۔ آپ میرے لئے صرف دُعا کریں۔

ایک دن حکیم صاحب فرمانے لگے "احسان دانش صاحب اگر آپ دو چار روز میرے ہمراہ رہیں تو میں آپ کا ممنون ہوں گا" میں نے عرض کی "میں ہر وقت حاضر ہوں فرمایئے کیا کام ہے؟"

فرمایا "دو چار روز کے لئے کہیں لاہور سے باہر چلیں، جہاں ہمیں کوئی نہ جانے رات دن کی یکسانیت سے طبیعت گھبرا رہی ہے۔"

میں :- "جناب یہ تو آپ نے میرے دل کی کہی ہے ایسا پروگرام تو آپ ہمراہ رکھیں تو بندہ حاضر ہے انشاءاللہ خادم کی طرح رہوں گا۔"

حکیم صاحب :- "اچھا کل صبح آجائیں، بستر ساتھ لیتے آئیں اور بس۔"

میں دوسرے دن علی الصبح ایک کمبل اور دری لے کر حکیم صاحب کے گھر جا دھمکا، حکیم صاحب نے اپنی موٹر نکلوائی اور کہا "بتایئے کدھر چلیں" "جہاں چاہیں چلیں" میں نے جواباً کہا۔

اتنے میں اندر سے بیگم نے کہا "آج کل ایبٹ آباد کا موسم اچھا ہے اب کوہ مری سیر کے لئے مناسب مقام نہیں رہا وہ گندی اور متعفن جگہ ہے" ہم دونوں نے صاد کیا اور چل پڑے۔

راستے میں قیام کرتے ہوئے دوسرے روز ایبٹ آباد پہنچے اور ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ علی الصبح ناشتے کے بعد سوچ رہے تھے کہ مسجد الیاسین چلیں یا نواں شہر بیگم نے کہا "جو نزدیک ہو" دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ نواں شہر، مسجد الیاسین سے نزدیک ہے۔ چنانچہ ہم لوگ نواں شہر پہنچ گئے۔ نواں شہر نہایت پُرفضا مقام ہے جہاں بڑی دُور تک ٹھنڈے پانی کے چشمے اپنی فطری آب و تاب اور رفتار سے بہتے رہتے ہیں، کئی جگہ ان چشموں کے بہتے ہوئے پانی پر چار دیواری کی آڑ دے کر

غسل خانے بنائے ہوئے ہیں۔

فطری مناظر کی پسندیدگی میں حکیم صاحب میرے ہم خیال نکلے۔ بڑی دیر تک آپس میں گفتگو رہی اور خیال و نظر کو نہایت مقوی غذا میسّر آئی۔ میں نے حکیم صاحب سے کہا "حکیم صاحب اگر اس پانی میں غسل کر لیا جائے تو کیا ہرج ہے"؟ کوئی ہرج نہیں، آیئے! تیرنا آتا ہے"؟ حکیم صاحب نے پوچھا۔

"مَیں مزدور ہوں مزدور! اچھا خاصا تیراک ہوں"، مَیں نے جواباً کہا۔

ہم دونوں تہ بند باندھ باندھ کر کود تو پڑے لیکن دونوں کے دانت بجنے لگے جب مَیں نے دیکھا کہ حکیم صاحب کی مجھ سے زیادہ گِگھی بندھ رہی ہے تو ہم دونوں باہر نکل آئے اور تولیوں سے بدن پونچھ کر جلدی سے کپڑے پہن لئے۔

حکیم صاحب نے کہا "دانش صاحب ایسے میں ایک پیالی چائے مل جائے تو کیا بات ہے مزا آ جائے"۔ مَیں نے کہا کوشش کرتا ہوں"۔

مَیں نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر کسی طرف بھی تسکین کا سامان نظر نہ آیا وہاں سے ذرا ہٹ کے ایک مندر تھا۔ مَیں مندر کی طرف چل دیا، وہاں پہنچا تو مَیں نے دیکھا کہ چند سیڑھیوں کا ایک صاف ستھرا سا زینہ ہے۔ مَیں نے دل میں کہا کہ ممکن ہے یہاں کوئی محافظ قسم کا انسان رہتا ہو اور کسی چائے کی دکان کا پتا ہی بتا دے، یہ خیال کرتے کرتے اُوپر چڑھ گیا، مَیں نے دیکھا کہ ایک درویش اندر ڈھونی رمائے راکھ کی ڈھیری پر نظر جمائے بیٹھا ہے اور پُشت کی طرف دیوار پر ایک تبر لٹکا ہُوا ہے اور دائیں جانب دیوار سے ملی ہوئی نیلے رنگ کی چائے کی پیالیاں بھی رکھی ہیں۔ مَیں نے سلام کیا اور ایک روپیہ بھی نذر کیا، درویش نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا "کہاں سے آئے ہو بچّہ"

مَیں:۔ "لاہور سے"۔

درویش :۔ "اچھا اچھا داتا کی نگری سے، اچھا اچھا، واہ داتا، تو ہم جیسے کتوں کا خیال بھی رکھتا ہے، بیٹھ جاؤ اب تو چائے پی کے جانا۔"

میں :۔ "میرا ایک ساتھی ہے اُسے بلا لوں۔"

درویش :۔ "بلا لو"!

میں باہر آیا اور دیکھا تو حکیم صاحب فاصلے پر کھڑے ہیں، نیچے اُترا اور حکیم صاحب کو چائے کی خوشخبری دی، حکیم صاحب بہت خوش ہوئے اور ساتھ ہو لیے، زینے کے قریب جا کر میں نے کہا "حکیم صاحب جاتے ہی آپ دو روپے نذر کریں" حکیم صاحب نے کہا "دو نہیں، پانچ!"

چنانچہ وہاں پہنچتے ہی حکیم صاحب نے ایک پانچ کا نوٹ درویش کی نذر کیا، درویش نے ایک قہقہہ مارا اور آنکھیں بند کر لیں، دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی بند آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے، ہم دونوں حیران تھے کہ یہ کیا ماجرا ہے لیکن پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی، ہاں رہ رہ کر ایک سوالیہ مجھے ضرور تنگ کر رہا تھا، مگر اتنے میں درویش نے چائے بنا کر ایک ایک پیالی ہمیں دی، اور خود بھی چسکی سے چائے پینے لگا، میں نے سلسلہ گفتگو کے لئے پوچھا "جناب آپ یہاں کب سے بیٹھے ہیں؟"

درویش :۔ "جوانی ہی سے۔"

میں :۔ "عجیب جوانی تھی کہ اچھے خاصے انسان کو قید کر دیا اور کھیلنے کھانے نہ دیا۔"

درویش :۔ "جوانی نے نہیں بٹھایا، بٹھانے والے نے بٹھایا ہے بیٹا۔"

میں :۔ "کیا آپ کی مراد خدا سے ہے"؟

درویش :۔ "جی نہیں! خدا کے ایک خاص بندے سے۔

میں :۔ "وہ کون سا خاص بندہ تھا؟"

درویش: "تھا نہیں اب بھی ہے"

میں: "مطلب؟"

درویش: "بتاؤں، سنو گے؟ کیا کرو گے سن کے!"

میں: "ضرور سنائیں صاحب! ممکن ہے ہمیں کوئی روشن راستہ مل جائے"

درویش: "میں اس علاقے کا نامی گرامی چور تھا اور اسی مندر میں یہیں ایک درویش بیٹھا تھا جو دن بھر مستحق لوگوں کی مدد کرتا تھا۔ میں یہ سمجھا کہ یہ مالدار اسامی ہے اس سے اس کی جمع جوکھوں ہتھیا لینا چاہیئے۔ چنانچہ رات کو دو بجے ایسا اندھیرا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سُجھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا فوراً چل پڑا اور اس مندر میں آکر درویش سے کہا بتاؤ دولت کہاں ہے؟" اُس نے نہایت اطمینان سے کہا "تجھے کتنی دولت چاہیئے؟" میں نے کہا جتنی تیرے پاس ہے سب دے، اُس نے کہا "آجا میری جگہ آجا" میں اس کے پاس گیا تو اس نے بوریئے کا ایک سرا اُٹھایا اُس کے نیچے بہت سے روپے پھیلے ہوئے تھے، کہنے لگا "یہاں میری جگہ بے فکری سے بیٹھ جا اور چائے پکا دودھ بھی کمنڈل میں رکھا ہے، میں تیرے لئے اور دولت لاتا ہوں یہ بوریئے کے نیچے تو بہت تھوڑا مال ہے میں تجھے خزانہ دوں گا تو بھی کیا یاد کرے گا۔ جلدی چائے تیار کر، چائے پی کر جاؤں گا" مجھے اس کی باتوں سے اطمینان ہوگیا اور میں اُس کی جگہ بیٹھ کر چائے پکانے لگا۔ چائے تیار ہوگئی تو اُس نے کہا "پہلے مجھے دے دے ایسا نہ ہو کہ صبح ہوجائے اور تیرا کام گل پر جا پڑے" میں نے گرم گرم چائے کی ایک پیالی اُسے دی، اُس نے اُس میں سے ایک گھونٹ چائے پی اور پھر مجھے پکڑا دی کہ بس لے تو پی لے، میں تیرے کام کے لئے جاتا ہوں، میں نے وہ پیالی پی لی اور وہ میری کمر پر ایک تھپکی دے کر چلا گیا۔

"مَیں چائے پی کر بیٹھ گیا اور آپ کے سامنے بیٹھا ہُوں! اس کا انتظار ہے اور وُہ اب تک نہیں آیا، یہاں جو خدمت وُہ کرتا تھا میرے سپرد ہے کہ مَیں صُبح سے شام تک بچّوں اور غریبوں کو پیسے تقسیم کر دوں، اُس دن سے بھوکا کبھی نہیں سویا اور ضمیر میں کوئی کانٹا نہیں کھٹکتا۔ جتنا مولا دیتا ہے اُتنا ہی تقسیم کر دیتا ہُوں اور ہر رات یہ محسوس کرتا ہوں کہ وُہ صُبح ہی آجائے گا۔ بعض وقت اپنے آس پاس کوئی سایہ سا بھی محسوس کرتا ہُوں مگر کوئی جسم سامنے نہیں آتا، مَیں چرس نہیں پیتا، بھیک نہیں مانگتا، خشک روٹی کھاتا ہوں، خُدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا۔ بس ایک نشہ ہے جس کی لذّت میں بیان نہیں کر سکتا"۔

ہم دونوں حق حیران و پریشان رہ گئے کہ دیکھئے کیسے لوگوں کو کیسے باکمال لوگ مل جاتے ہیں اور ہمیں شہروں میں بے وفا دوستوں کے علاوہ کوئی نہیں ملتا۔

بزمِ اُردو شملہ کا مشاعرہ

مَیں شملہ میں پہلے پہل شیخ ناظر حسین عقیل کے ساتھ مشاعرہ میں گیا تھا عقیل صاحب ہر سال شملہ میں چندہ اور عطیّات لے کر ایک مشاعرہ کیا کرتے تھے اور لاہور کے علاوہ امرتسر، جالندھر اور لدھیانہ وغیرہ سے اُن شعراء کو لے آتے تھے جن سے اُن کے کچھ مراسم تھے یا اُن کے دوستوں میں سے کسی کی جان پہچان تھی۔

مَیں بھی عقیل صاحب کے شناساؤں میں سے تھا اور میرا کیا ذکر عقیل صاحب کی گفتگو ایسی لچھے دار ہوتی ہے کہ ناواقف انسان برسوں اُس گرداب سے نہیں نکل سکتا۔ چنانچہ مجھے بھی انکار کی سپر ڈالنی پڑی۔

جب مجھے عقیل صاحب نے شملہ کے مشاعرے کے لئے کہا تو ایسے سبز باغ دکھائے کہ اَن دیکھا شملہ ایک حسین خواب کی طرح نظروں میں لہلہانے لگا، اور مَیں نے ہامی بھر لی۔ عقیل صاحب نے گاڑی کا وقت بتا کر کہا کہ اسٹیشن پر

پہنچ جانا۔ مَیں انتظار کروں گا۔ لیکن لحاف بستر وغیرہ لے کر آنا وہاں سردی ہوتی ہے۔ مَیں نے دری میں لحاف لپیٹ کر رسّی پوری دی اور وقت مقررہ پر بستر لے کر اسٹیشن پہنچ گیا۔ عقیل صاحب میرا تیسرے درجے کا ٹکٹ لئے کھڑے تھے اُنھوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک کھچا کھچ بھرے ہوئے ڈبے میں دھکیل کر کہنے لگے۔ مَیں دوسرے ڈبے میں بیٹھا ہوں۔ صبح ملاقات ہوگی۔ گاڑی چلنے پر جگہ نکل آئے گی۔ یہیں آرام سے بیٹھ جانا۔ باقی شاید مَیں بھی کسی نہ کسی اسٹیشن پر ملوں۔"

وہ تو چلے گئے اور گاڑی روانہ ہوگئی۔ گاڑی جس قدر تیز ہوتی جاتی تھی رہی سہی جگہ بھی جسموں سے پُر ہوتی جا رہی تھی جیسے لوگ نامعلوم طور پر پگھل پگھل کر پھیل رہے ہوں۔ مَیں زمین پر بستر رکھ کر بیٹھ گیا۔ جب گاڑی جالندھر پہنچی تو زور سے دروازہ کھلا اور ڈبے میں دو سپاہی ہتھکڑیاں لگے ہوئے دو ملزم لئے داخل ہوئے سپاہیوں نے بینچوں پر جگہ لے لی ملزم میرے برابر بیٹھ گئے۔ مجھے اُن کے پسینہ کی بُو کے بھپکارے آنے لگے۔ وہ تو خیر گزری کہ مَیں ایسے معاشرہ کا عادی تھا، جہاں بیٹھے بیٹھے سونے کا ملکہ ہوتا ہے، گھوڑی بنے بنے بھی نیند لے لیتے ہیں، مَیں بھی وقت کا تقاضا پا کر گھٹنے پیٹ سے ملائے دَم سادھے بیٹھا رہا۔ علی الصبح گاڑی کالکا پہنچ گئی۔ عقیل صاحب نے درمیانہ درجہ سے اُتر کر چند شعرا کے ساتھ مجھے آسنبھالا۔

کالکا سے شملہ جانے والی چھوٹی گاڑی ایسی ہی تھی جیسے سہارنپور سے شاہدرہ دہلی تک جاتی ہے لیکن اس شملہ والی گاڑی کا انجن ہتھیاروں سے لیس ایک گورکھا معلوم ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر میں شملہ کو گاڑی روانہ ہوگئی اور مَیں کھڑکی سے قریب ہو کر بیٹھ گیا۔ گاڑی پہاڑوں کے حسین نشیب و فراز میں ناگن کی طرح بل کھاتی چلنے لگی۔ کہیں تو آسمان نزدیک معلوم ہونے لگتا تھا اور کہیں زمین کی سطح نیچے

دبتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ پہاڑوں کی جھکی ہوئی کھال میں چیل اور دیار کے شاداب درخت زمین کی سینہ زور نسل کے سلوگن* معلوم ہو رہے تھے۔

ہمالیہ کی یہ سبز پوش اور چھوٹی بڑی اولاد دور کے میدانوں پر ہنس رہی تھی اور میں ایک سیال خواب گوں منظر میں گم بہا چلا جا رہا تھا۔

ایک اسٹیشن پر شملے سے کالکا آنے والی گاڑی بھی ملی اور دونوں گاڑیوں کے مسافر آمنے سامنے ہو گئے۔ دونوں گاڑیوں کے تیسرے درجے کے ڈبے یا تو ملازم پیشہ لوگوں سے بھرے ہوئے تھے یا پھر مجھ جیسے پسماندہ طبقے کے لوگ کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے جیسے سردی سے ٹھٹھرے ہوئے قیدی دھوپ لے رہے ہیں۔ اکبر کی طبیعت ذرا خراب ہوئی اور سر چکرانے لگا۔ طبیعت سنبھل ہی رہی تھی کہ گاڑی سرنگ میں داخل ہو گئی۔ پچھلے ڈبوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ایک کالی چھپکلی دیوار کے سوراخ میں گھس رہی ہے۔ سرنگ کے دھوئیں نے طبیعت کو اور بھی الٹ پلٹ کر دیا۔ آخر مجھے متلی ہو گئی اور طبیعت ذرا ہلکی ہوئی۔ ایک خانساماں نے جو قریب ہی بیٹھا ہوا تھا مجھے کلی کے لئے پانی دیا اور میں اب پھر تازہ دم ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے ساتھی نے مجھ سے کہا اب تم باہر نہ دیکھو ورنہ طبیعت پھر خراب ہو جائیگی۔ میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ رفتہ رفتہ گاڑی شملہ کے اسٹیشن پر آ ٹھہری اور عقیل صاحب ہم سب کو ایک ہوٹل میں لے گئے۔ شام کو جب ہم سب مشاعرہ گاہ میں پہنچے تو شعراء کی اچھی خاصی تعداد تھی اور مشاعرہ بھی اچھا خاصا ہو گیا۔

صدر نے ادارۂ ادبیہ کے لئے پانچ ہزار(۵۰۰۰) روپے کا اعلان کر دیا لیکن عقیل صاحب جن کے پاس عطیات کے علاوہ چندے کی رقم اور ٹکٹ کا سب

---

* سلوگن :- نعرہ۔

بھی تھا نہ جانے کس خیال یا کس مجبوری کے تحت کہیں ایسی جگہ چلے گئے کہ کسی کو دستیاب نہ ہو سکے۔ مَیں تو چونکہ پہلے ہی اپنے آمد و رفت کے مصارف لے چکا تھا، اس لئے پانچویں دن لاہور چلا آیا؛ باقی شعراء پر نہ جانے کیا بیتی ہو گی۔ بہر حال اس مشاعرہ میں آنے والے بعض بعض شعراء اہلِ شملہ کے انتخاب میں آ گئے اور بعض ملنسار لوگوں سے خط و کتابت ہونے لگی۔

سر عبدالرحیم اور نواب محمد اکبر خاں

شملے میں جہاں اور اہلِ علم و ادب سے ملاقات ہوئی وہیں سر عبدالرحیم صاحب اور نواب محمد اکبر خاں آف ہوتی سے بھی ملا۔ سر عبدالرحیم صاحب کے متعلق میرا خیال تھا کہ وہ یونہی سے آدمی ہوں گے گورنمنٹ نے انھیں کسی قومی بے وفائی اور افرنگ پرستی کے صلے میں خطاب دے دیا ہو گا لیکن اُن سے نزدیک ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ تو بڑے ہی صاحب علم[٥] اور اسلامی ذہن کے انسان ہیں، اُنھوں نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے ایک مثنوی مولانائے رُوم دکھائی جو اپنی قدامت اور خط کے اعتبار سے بڑی ہی قابلِ قدر چیز تھی۔ اسی سلسلے میں انھوں نے بہت سی ایسی کتابوں کا ذکر کیا جو اُس وقت میری نظر سے نہیں گزری تھیں وہ اچھی خاصی دیر تک اسلامی اور حالیہ سیاست پر گفتگو کرتے رہے اور مَیں ایک معمول کی طرح سنتا رہا اور اُن کے پاس سے ایسی شگفتہ خاطری لے کر اُٹھا جو بڑے آدمیوں کی صحبت میں کم میسر آتی ہے۔ اُن کا اخلاص آج تک میرے دل پر نقش ہے

نواب محمد اکبر خاں صاحب، بڑے ہی بارعب اور دبنگ قسم کے انسان تھے مشاعرے کی صدارت سے تو کچھ پتا نہیں چلا تھا لیکن جب مَیں اُن سے ملا تو معلوم ہوا کہ وہ شخص تو تاریخی معلومات کا بحرِ ذخار ہے۔ ان کے سامنے تاریخ کے موضوع پر زبان کھولنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی، دورانِ گفتگو میں یہ بھی معلوم

---

٥ اسلامی قانون پر سر عبدالرحیم صاحب کی قابلِ قدر کتاب ہے۔

ہوا کہ تاریخ کے موضوع پر اُن کی ذاتی لائبریری میں اس قدر مواد ہے کہ شاید ہی ملک میں کسی کے پاس نکلے، اُنھوں نے مجھے اپنے یہاں آنے کی دعوت بھی دی تھی لیکن مَیں اس وقت ایسے حالات میں نہیں تھا کہ حاضر ہوتا، میری مفلسی نے میرے دامن میں کیلیں ٹھونک رکھی تھیں، نواب محمد اکبر خاں جیسا انگریز سے نفرت کرنے والا انسان میری نظر سے کم ہی گزرا ہے۔ وہ انگریز کے نام سے عریاں گفتاری تک آجاتے تھے لیکن میری نظر میں وُہ کھُردری اور ناہموار شخصیت ایسی محترم ہو گئی کہ دل احترام پر مجبور تھا۔

ویسے وہ امارت اور دولت میں بھی اپنے علاقے میں یکہ و تنہا انسان تھے لیکن اُنھوں نے رئیسوں اور نوابوں سے جُدا طبیعت پائی تھی، وہ صاحبِ علم ہونے کے ساتھ کھرّے مزاج کے انسان نہیں تھے بلکہ اُن میں شاعرانہ رنگینیاں اور ایک باطنی گداز بھی موجود تھا، وہ آزادہ روی اور آزاد خیالی کے باوصف مسلمان ذہن رکھتے تھے اور عزّت و تمکنت سے بسر کرنا شرافت خیال کرتے تھے، نہ جانے اب اُن کے جانشین کس طبیعت کے اِنسان ہوں گے۔

شملے میں جناب غلام جیلانی عاصی[1] راغب مرادآبادی سعید الٰہ آبادی، راجندر کرشن احساس، شیخ محمد حسن امرتسری اور زین العابدین محشر سے میرے اچھے مراسم ہو گئے۔ شیخ محمد حسن حسن اور عاصی بینائی دونوں بزرگانہ شفقت فرماتے تھے زین العابدین محشر قالینوں کے سوداگر تھے۔ فارسی، اردو کی چلتی استعداد کے ساتھ شعر بھی کہتے تھے اور گھاٹ گھاٹ کے پانی نے اُنھیں اور بھی دلچسپ انسان بنا

---

[1] عاصی بینائی، شیخ محمد حسن امرتسری اور زین العابدین محشر کا انتقال ہو چکا ہے سعید الٰہ آبادی کہیں ریڈیو میں ہیں اور راجندر کرشن بمبئی میں فلمی دُنیا کی مشہور و معروف شخصیت ہیں۔ عاصی بینائی کے صاحبزادے مقبول اور منظور سے کراچی میں ملاقات ہوئی اپنے مرحوم والد کی طرح وہ بھی بڑے مخلص، سعادت مند نوجوان ہیں ابھی اُنھوں نے جناب عاصی بینائی کی رُباعیات کا مجموعہ متاعِ سخن کے نام سے شائع کیا ہے اور ان کے باقی کلام کی اشاعت کی فکر میں ہیں۔

دیا تھا راغب مرادآبادی بھی میرے اسی وقت کے دوست ہیں جو بلا کے بدیہہ گو اور ذہین انسان ہیں۔

شملے کی صاف فضا میں جب مطلع ابر آلودہ نہ ہوتا اور نشیب کی آبادی میں بجلی کے قمقمے روشن ہوتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ستاروں کا عکس ایک کالی جھیل میں پڑ رہا ہے اور ہم ایک بلندی سے یہ منظر دیکھ رہے ہیں۔ میں پہروں اکیلا کھڑا اس سے لطف اندوز ہوتا رہتا اور مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔

جب کبھی کسی موٹر کی بتیوں کی روشنی فضا میں تیرتی یا بیڑی کے اشاروں سے کوئی من چلا کسی کھڑکی پر عکس ڈالتا تو ایسا لگتا جیسے بجلیاں بچل گئی ہوں۔

صبح کو جب سورج نکلتا اندھیرے کی گرفت سے نکلی ہوئی بیتاب کرنیں سنگریزوں اور برف کی ڈلیوں کو سلمے ستارے سے لاد دیتیں اور جوں جوں سورج بلند ہوتا مکانوں کی دیواریں چھتوں اور ٹین کے سائبانوں پر لحاف، بچھونے، چادریں اور بچوں کے نہالچے پھیل جاتے۔ اُس وقت شملہ گوروں کا قبرستان معلوم ہونے لگتا، اور جب آسمان بادلوں کی سیرگاہ بن جاتا اور ہوائیں گھنگھور گھٹا کی کملیاں اوڑھے پھرنے لگتیں تو میں سوچتا کہ یہ کائنات کا اتنا وسیع کارخانہ اور یہ آب و ہوا کا باردانہ آخر کیوں اور کس لئے ہے؟ یہ انسان کے لئے ہے یا انسان اِس کے لئے کہاں سے آتا ہے اور پھر کہاں چلا جاتا ہے؟ آمد و رفت کا یہ بیکراں ہنگامہ آخر کس لئے؟ اِس سے خالق کا کیا قصد ہے؟ پہروں ذہن میں انہی خیالات کی لین ڈوری لگی رہتی۔

علی الصبح سحر خیز نوجوان اور صحت مند بوڑھے گھروں سے سیر کرنے نکل پڑتے اور آپس میں خوش گپیاں کرتے سڑکوں پر غول کے غول نظر آتے۔ چاروں طرف اونچی نیچی چٹانوں پر پھیلا ہوا سبزہ زمین کے زمرّدیں زیورات اور شیرخوار کرنوں کے عکس سے دمکتے ہوئے رنگ برنگے سنگریزے موسم کا جہیز معلوم ہوتے۔

جب میں سیر کو نکلتا تو سعید الہ آبادی اور راجندر کرشن احساس بھی میرے ہمراہ

؎ بچلنا: راستہ بھول جانا۔ گمراہ ہونا۔

ہوئے۔ یہ دونوں بڑے اصیل قسم کے نوجوان تھے اور میں نہ جانے انھیں کیوں اپنے

سے قریب محسوس کرتا تھا۔

سعید شملہ کے چپے چپے سے آگاہ تھا۔ ہر راستہ کا نام اور راستہ میں خاص خاص

کوٹھیوں کی خصوصیات اور اُن میں رہنے والوں کے عادات و اطوار اُسے ازبر

تھے یُوں کہئے کہ وُہ شملہ کی اچھی خاصی چلتی پھرتی ڈائریکٹری تھا۔

سعید الہ آبادی شعر بھی کہتا تھا اور مجلسی قسم کا اچھا اور قابل برداشت

انسان تھا۔ گفتگو بڑی دلچسپ اور اپنی حد تک ایثار و قربانی سے بے دریغ انسان،

وُہ مجھے کئی بار ایسے ہجوم رنگ و بو میں بھی لے گیا جہاں میرے اندر کا انسان اور

حیوان دونوں ٹکروں لڑنے لگتے تھے میں نے ہمت کر کے اپنے داخلی حیوان کو چھینکا

چڑھا دیا اور اگاڑی پچھاڑی بھی لگا دی وہ کچھ دنوں تو عمدہ کھانے اور اچھی صورتیں

دیکھ کر ڈکراتا رہا بالآخر خاموش ہو گیا اور آج تک رسّی نہیں تڑائی۔

راجندر کرشن احساس سیدھا سادا، بھولا بھالا مگر صاحب فکر نوجوان تھا

قیافے کی رُو سے اس کے خدوخال اُس کی خوش بختی اور ترقی کا پتا دیتے تھے

لیکن ابھی خطوط میں تفصیل نہیں آئی تھی۔

سعید مجھ سے بے تکلف تھا اور راجندر ہر مقام پر میرا احترام کرتا تھا کچھ دنوں

بعد راجندر شملے سے لاہور آگیا اور جب تک لاہور میں رہا میرے یہاں اُس نے خاندان

کے ایک فرد کی طرح وقت گزارا۔ اس کے بعد وہ دہلی چلا گیا اور وہاں سے قضا

سازگار پا کر بمبئی روانہ ہو گیا۔ اب بھی وُہ بمبئی میں ہے اور میرے لئے مسرّت کا باعث

ہے کہ اس کے حالات سازگار ہیں اور میرا آج تک وُہ اسی طرح احترام کرتا ہے

جو اس کے مذہب نے بزرگوں کے لئے متعین کر دیا ہے اور چونکہ اس نے مجھ سے

اپنے کلام پر اصلاح بھی لی ہے اس لئے اس کا احترام مستحکم اور قابل اعتماد ہے۔

اس مشاعرے کے بعد بھی کئی بار شملے گیا اور راستے میں ہرے بھرے مناظر دیکھ کر طبیعت بشاش ہوتی رہی، پہاڑوں کی ٹوٹی پھوٹی چٹانوں اور ندی نالوں کے گرے ہوئے ساحلوں کے علاوہ دروں اور گھاٹیوں کے کٹاؤ دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا کہ وقت اور فطرت کو کتنے کتنے گرانڈیل عناصر کے قلعوں پر فوقیت حاصل ہے، خالق نے زمین سے کیسے کیسے پتھروں کے ٹیلے اُگا دئیے ہیں جو آسمان کی طرف گردنیں اُٹھائے چاند، سورج اور ستاروں کو تکتے رہتے ہیں، میدانوں کے سبز فرش کے مقابلے میں ناہموار سنگ زاروں کی نیلوں سے کیسے کیسے جھلملاتے ہوئے چشمے نکال کر اونچ نیچ میں پھیلا دئیے ہیں۔

اس مشاہدے سے بعض اوقات یہ تصور پختہ سا ہو جاتا کہ فطرت کا محبوب مشغلہ تخلیق ہے لیکن جب اس تخلیق کی تزئین میں پھولوں کے رنگوں کی تقسیم اور پھلوں کے کھٹاس مٹھاس پر نظر جاتی تو فنون لطیفہ کے اس ہنگامے کے ہر رُخ سے خُدا کا تصوّر اُبھر کر سامنے آجاتا اور سجدۂ شکر ادا کرنے کو جی چاہنے لگتا۔

مَیں جب بھی کسی پہاڑی مقام پر گیا ہوں حسب معمول میں نے صبح کی سیر کبھی قضا نہیں کی، میرا یہ یقین آج تک تازہ و شگفتہ ہے کہ فطری مناظر کی سیر، اُن پر غور و خوض اور اُن کی محافظ ہوائیں، انسانی مزاج کی سینکڑوں کھولتوں کو دُور کرتی ہیں، اور رُوحانی غنودگیوں میں بیداریاں اُتر آتی ہیں، زندگی کی بے اعتدالیوں اور مختلف النوع بیزاریوں کے علاوہ مُنہ زور دُکھوں کا یہ ایک ایسا چارۂ کار ہے جو طبعی مناسبتوں کے ساتھ بدخلقی اور رُوحانی تھکن کو دُور کرتا ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ شب بیدار عابدوں اور سحر خیز لوگوں کے دل پر مستقبل میں ڈوبے ہوئے حالات و واقعات منکشف ہو جاتے ہیں، کیونکہ خاموش رات میں ستاروں کا پرتو اور صبح کی کُندنی کرنوں کی سُنہری روشنی خیالات کی پرواز اور رُوح کی بالیدگی کے لئے کیمیا اثر ہے۔

میں جب سری نگر کے مشاعروں میں جاتا تو سیر کا یہی چسکا مجھے علی الصبح بستر تج دینے پر مجبور کر دیتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سری نگر میں مجھے جناب ناصر اور جناب اقبال نسیم باغ میں لے گئے اور ایک درویش سے ملایا۔ مجھے اُن سے مل کر رُوحانی مسرت ہُوئی اور جب رُخصت ہُوا تو بڑی دیر تک یہ محسُوس ہوتا رہا کہ مجھے یاقوتی میں حنا کا عطر ملا کر پلا دیا گیا ہے جس سے میرا رُواں رُواں مہک رہا ہے اور میری تعمیرِ حیات میں کئی سمنٹ کے رَدّے لگ گئے۔

اس درویش کے متعلق جہاں تک میں نے اندازہ لگایا ایسے صاحبِ کمال اور صاحبِ باطن لوگ جوق در جوق اور گروہ در گروہ پیدا نہیں ہوتے کیونکہ اصل میں بزرگی تو نام ہے رُوحانی اخلاق کے تواتر و تسلسل کا جو معقولیت کی بنا پر استوار ہو اس قسم کے انسان تو فطرت کی طرف سے استحکامِ عزائم اور سالمیتِ فکر کے نمونے بن کر ظہور میں آتے ہیں اور عصمتِ حق کا تحفظ ان کے فرائض میں داخل ہو جاتا ہے اسی لئے یہ ہر بات کو حق و صداقت کے پیمانوں سے آنکتے ہیں۔ انھیں باکمال لوگوں کو قدرت اپنی نمائندگی عطا کرتی ہے۔ یہ ہمیشہ نیکی حسن اور خیر و برکت کی مشعلوں کے دونوں سرے روشن رکھتے ہیں اور اسی روشنی کی تقسیم کو فطری فرائض کے احکام اور قدرت کے پیغام کی تعمیل سمجھتے ہیں۔

ان کا مذہب صداقتوں کا یقین اور روحِ کائنات کا اعتراف ہوتا ہے اور اس میں شریعتِ محمدی کو فقہ انسانی سے تعبیر کرتے ہیں وُہ نہ تو ماضی کے ادب کا موضوع قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ حال کے مباحثوں کا، وُہ تو اُس صالح فکر و عمل کا حاصل ہوتا ہے جو قدرت کو عقل و وجدان کی عینک سے دیکھ کر اور کلیات کے مرکز دل کی طرف مڑ کر سوچا گیا ہے وُہ ایسا جوہر ہے جو اپنی انفرادیت سے حق کا آئینہ بن جاتا ہے ایسے زنگار آئینہ جس میں صرف جوہر ہی جوہر ہوتا ہے۔ اسی تبلیغ اور اسی

اندازِ حیات سے پیدا شدہ کردار ایک ایسا اعلیٰ دستورِ سفر ہے جو ہر انسان میں آگے بڑھتے اور پس ماندہ لوگوں کو ہم سفر بنانے پر مُصر رہتا ہے، یا یوں کہیئے کہ وہ ایک ایسا فکرِ واحد اور فدیہ مجرّد ہے جو فکر و عمل کا پلّے سے پلّہ باندھ دیتا ہے اور اپنی بلندی کے اظہار میں بھی کانپ نہیں کھاتا کیونکہ اُسے بصیرتِ فکر کا دعویٰ بھی ہوتا ہے۔

اس مقدّس ہستی سے اجازت لے کر کوئی دو فرلانگ چلے ہوں گے کہ سامنے ہی سر بفلک پہاڑوں میں گھرے ہوئے ایک چشمے نے شفّاف حوض کی صورت اختیار کر لی تھی اور اس کے بیچوں بیچ چوکی کی طرح کا چورس اور چکنا پتھر پڑا ہُوا تھا اُسے دیکھا تو مجھے بیک وقت حیرت اور مسرّت کے ملے جُلے جذبات نے اس قدر مجبور کر دیا کہ میں پائینچے چڑھا کر اس حوض میں گھُس گیا اور اس پتّھر پر بے سمت سوچے بغیر سربسجود ہو گیا اور اچھّی خاصی دیر اس فضائے رحمت کے مزے لیتا رہا۔

اصل میں اس وقت مجھے قدرت شاعری کا مصالحہ تفویض کر رہی تھی کیونکہ ادب ہو یا شاعری، حکمت ہو یا فلسفہ قدرت کی لامحدود وسعتوں اور رنگارنگ کیفیتوں کا اظہار ہے جسے ہر اہلِ فکر اپنے اپنے اسلوب میں بیان کرتا ہے اور فطرت کا یہ انعامِ جاریہ قیامت تک اسی طرح چلتا رہے گا، مگر کس قدر کٹھن ہوتی ہے اس وقت، جب کسی حادثے یا واقعے کے لئے الفاظ ساتھ نہیں دیتے اور مشاہدے کا مفہوم ادا نہیں ہوتا

ایک اور مشاعرہ

بزمِ اُردو شملہ کے مشاعرے میں بھی مجھے اہلِ شملہ کے منتخبہ شعراء کی صف میں دعوتِ شرکت دی گئی۔ یہ مشاعرہ سر سلطان احمد صاحب ممبر تجارت (گورنمنٹ آف انڈیا) کی صدارت میں منعقد ہُوا اور سیوائی ہال میں دس بجے صبح سے سات بجے شام تک جاری رہا۔ سامعین تھے کہ ٹکٹ کے باوجود جوق در جوق چلے آ رہے تھے اور ہال میں کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ

تھی ۔ مجبوراً ٹکٹوں کی فروخت بند کرنا پڑی ۔

سامعین میں شیخ عبدالحئی وزیر تعلیم ، سر سکندر حیات وزیر اعظم پنجاب ، سر جگدیش پرشاد ممبر (گورنمنٹ آف انڈیا) اور سر عبدالرحیم جیسی بہت سی شخصیتیں تھیں ۔ شعراء میں نواب سراج الدین سائل دہلوی ، حضرت بیخود دہلوی ، مرزا ثاقب لکھنوی ، بہزاد لکھنوی ، روش صدیقی جوالا پوری ، رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری ، جگر مرادآبادی ، حفیظ ہوشیارپوری ، ایشور لکھنوی ، پنڈت کرشن کانت مالویہ ، عرش ملسیانی ۔ تفتیل شفائی اور راقم الحروف تھے ۔ یہ مشاعرہ ۵½ بجے سے ۶½ بجے شام تک براڈ کاسٹ بھی کیا گیا اور مجھ سمیت غالباً بارہ شعراء نے اس میں شرکت کی اور مشاعرہ نہایت کامیابی سے اختتام کو پہنچا ۔

ہاں اسی مشاعرہ کے سامعین میں سے کراچی کے ایک رئیس سیٹھ موٹا نے اپنی طرف سے پنڈت کرشن کانت مالویہ ، عرش ملسیانی ، بہزاد لکھنوی اور میرے لئے انعام کا اعلان کرایا ۔ چنانچہ کرشن کانت مالویہ کو ایک سو ایک روپیہ ، بالمکند عرش ملسیانی کو ایک سو ایک روپیہ ، بہزاد لکھنوی کو پچاس اور مجھے ایک سو ایک روپیہ دیا گیا ۔ پنڈت کرشن کانت مالویہ نے اپنا یہ انعام اپنے استغناء سے مختلف یتیم خانوں میں بھجوانے کی ہدایت کر دی تھی ، اس انجمن کے ہر رکن میں کوئی نہ کوئی خوبی ایسی جگہ ہوتی تھی کہ میں حیران تھا ۔

اصل میں ہر بزم اپنے اراکین کے خلوص پر ہی کامیاب ہوتی ہے چنانچہ اس بزم میں بھی جناب اسد ملتانی اور منور علی[1] کا دم تھا کہ شملہ میں اس قدر کامیاب مشاعرہ کر لیا جس کی کیفیت لوگوں کے دل و دماغ سے دوسرے سال تک زائل نہیں ہوئی ۔ اس بزم کے صدر غلام محمد صاحب[2] تھے جو ان دنوں ڈپٹی ڈائریکٹر

---

[1] منور علی کا سیکرٹری کے عہدہ سے کراچی میں انتقال ہوا اور اسد ملتانی ان سے پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے ۔
[2] غلام محمد صاحب پاکستان بننے کے بعد گورنر جنرل کے عہدہ تک آ کر فوت ہوئے ۔

پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف تھے اور تمام اراکینِ بزم اُنہیں کے اشاروں اور تجاویز پر کام کرتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس انجمن یا ادارہ میں اراکین خلوصِ نیت سے کام کریں وُہ کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کے خلوص اور ان کی زندگی میرے سامنے ہے جس نے اپنے ماحول، وقت اور ساتھیوں سے جتنا خلوص برتا ہے اس کی زندگی اسی اعتبار سے ناکام اور کامیاب نظر آتی ہے۔

مَیں تو یہ بھی کہوں گا کہ زندگی کوئی بھی اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ اُسے اچھا یا بُرا سمجھنا زندہ لوگوں کی بات ہے، زندگی کو غلط راستے پر گامزن کرنا جرم بھی ہے اور گناہ بھی، کیونکہ وہ تو انعامِ الٰہی ہے جس کا احترام اور تحفظ فرض قرار پاتا ہے جو زندگی کو ذلیل اور بے قیمت بناتے ہیں، زندگی اُن کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتی ہے اور اس کا یہ سلوک امیر و غریب سب سے برابر کا ہے۔

فلاکت کے سبب اور ناداری کے گرد و غبار کو بُرا خیال کر لینا عوامی سوجھ بوجھ تو ہو سکتی ہے اسے سنجیدہ فکر نہیں کہا جا سکتا۔ مَیں کسی وجہ سے مشاعرے سے دوسرے دن ہی لاہور واپس ہو گیا

شعرا و اُدَبا سے نزدیکی

جب مَیں شاعروں اور ادیبوں کے ہنگاموں میں شرکت کرتا تو وہاں غیبت اور تیسرے درجہ کی بدمذاقی کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ پست درجہ کے اوچھے شاعر بیشتر اساتذہ پر کیچڑ اچھالتے دکھائی دیتے۔ بعض بعض بزعمِ خود اپنے کو ایسا عالم و فاضل سمجھتے کہ مذہبی پیشواؤں اور پیغمبروں کو بھی گالی گلوچ میں نہ بخشتے۔ وہ اپنی قابلیت کے اظہار کے لئے جب تقریر کرتے تو اُلٹی سیدھی بے مغز سنی سنائی باتوں کے سوا ان کی گرہ میں کچھ نہ نکلتا مگر بہ ایں متاع وہ لوگ ہمچو ما دیگرے نیست،

کا نعرہ لگاتے ہی رہتے۔

کسی کے فن کو سراہنا ان کے بس کی بات نہ تھی البتہ ان کے ترکش تخریب کے تیروں سے بھرپور رہتے تھے۔ چونکہ کسی کی عدم موجودگی میں کسی کو برا کہنا سب سے آسان کام ہے۔ اس لئے ان میں سے اکثر اسی تن آسانی کے مریض تھے غیبت میں کسی فنکار کے فن کی تعریف و تحسین ان کے ظرف و ضمیر سے باہر کی بات تھی البتہ اندھا دھند ستائش باہمی ان کے دلوں کا شیرازہ تھا۔

جب مَیں مشاعروں میں اپنا کلام پڑھتا تو یہ لوگ طرح طرح منہ بناتے جیسے یہ سب مسوڑوں کے درد میں مبتلا ہو گئے ہوں، مگر وہ تھے کہ اپنی جتھے بندی سے باز نہ آتے اور اسی پر اپنی زندگی کو نازاں رکھتے، جب مَیں نے انھیں اپنی حدود میں اس طرح کی حرکات میں مصروف پایا تو مجھے ان کی مجالس میں تضیع اوقات کے سوا کچھ نظر نہ آیا، لہٰذا مَیں نے بھی آہستہ آہستہ ان لوگوں سے کنارا کر لیا۔

یہی سبب ہوا کہ میں اپنے دَور کے کسی شاعر سے متاثر نہ ہو سکا مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان پرانے لوہاروں کی زنجیروں کی کڑیاں یکساں نہیں اور ان کی جھنکاروں میں نئے دَور کی نغمگی کی صلاحیتیں سرے سے مفقود ہیں۔ ان کی شاعری جنس پرستی کی شاعری تھی اور میرے دل میں بھڑکی ہوئی آگ کا علاج ان کی رنگین بیانی اور فنی اچھل کود میں نہیں تھا۔

مَیں تو دنیا کا ٹھکرایا ہوا اور معاشرہ کا ستایا ہوا انسان تھا اس لئے مجھے سوقیانہ شاعری کیسے مطمئن کر سکتی تھی لاہور میں کالجوں کے مشاعروں میں یہ لوگ مجھے بیٹھنے کے لئے سٹیج پر جگہ نہ دیتے اور میں بنچوں پر بیٹھے ہوئے طالب علموں کے ساتھ بیٹھتا۔ شعراء اپنی اپنی ٹولیاں لے کر یا تو سٹیج پر بیٹھتے یا پھر قصابوں کے شکم سیر بیلوں کی طرح اینڈتے رہتے۔ جب کوئی اپنی ٹولی کا شاعر

غزل پڑھتا تو چاروں طرف سے واہ واہ کا شور مچتا اور جب کوئی اجنبی آتا تو کچھ منہ بسورنے لگتے اور کچھ بیٹھے بیٹھے آنکھیں مٹکاتے۔

مجھے اُن کی تنگدلی اور کج نظری کی بالکل پروانہ تھی کیونکہ مَیں جانتا تھا کہ یہ تو مشاعرہ باز لوگ ہیں سُننے والے تو یہ ہیں جہاں میں بیٹھا ہوں اور ان میں بھی میرا کوئی نہیں۔ یہاں تو صرف فن کا خلوص ہی ساتھ دے گا اور جگر کاوی ہی کام آئے گی۔ چنانچہ اکثر یہ ہوتا کہ جب میں شعر پڑھتا تو شعراء کے تو ہونٹ سل جاتے اور سامنے بیٹھے ہوئے سامعین داد و تحسین میں فراخدلی سے کام لیتے۔ ہر چند کہ بعض شعراء اور بعض اساتذہ ناک بھوں چڑھاتے مگر طالب علم اُن کی اس تنگدلی سے کوئی اچھّا اثر نہ لیتے۔ البتہ حفیظؔ[1] ہوشیارپوری جتنا نغز گو شاعر تھا اتنا ہی پرخلوص انسان تھا۔

جب یہ غزل باز شاعر اور مشاعرہ باز اساتذہ طنز یہ ہنسی ہنستے اور منہ چڑانے کے لئے دانت نکالتے تو ایسا لگتا جیسے کیچڑ میں نئی ریزگاری بکھر گئی ہو۔ میں ایک تحقیر آمیز نگاہ سے ان کے مُنہ دیکھ کر رہ جاتا، جب یہ مُنہ بناتے تو ان کے ہونٹوں کی غیر فطری جنبش ان کے کلّوں کی کھال سے کان کی لَو تک جھُرّیوں کی لکیریں کھینچ دیتی اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ یہ درندوں کی خصلت رکھنے والے پست فطرت اور بداخلاق لوگ اچھّے حالات میں کیوں ہیں جبکہ یہ وحشیوں سے بھی زیادہ حقیر ہیں، کہیں یہ کوئی شیطان کی سازش تو نہیں کہ آدم آزاروں کو بلند منصب اور آراستہ مکان دے کر انسانی ہمدردی سے خالی کر دو۔ تاکہ یہ بندگانِ خُدا پر غُرّائیں اور اپنے ہم جنسوں کو سراہیں۔ مَیں ان کے پُرشکوہ مکانات میں رنگ رنگ کے دسترخوان اور کمروں کو آرائشی سامان سے مالامال دیکھ کر حیران رہتا کہ الٰہ العالمین یہ کیا ناہمواری ہے لیکن آج دیکھتا ہوں تو اُن سجے سنورے مکانوں نے جواری، شرابی، خائن، ملک دشمن، مغربی جاسوس اور محسن کش اجسام کو تو جنم دیا ہے لیکن

---

[1] افسوس کہ ۱۰ جنوری ۱۹۷۳ء کو حفیظ ہوشیارپوری بھی راہیٔ عدم ہو گئے۔ اللہ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

کوئی فلسفی، سائنٹسٹ، عالم، قائد یا معیاری شاعر یا ادیب پیدا نہیں کیا۔

جب وہ علم سے بہرہ مند ہو کر بھی منصفی کی بات نہ کرتے اور پارٹی کی بیچ کرتے تو مجھے اُن کے علم کی نجابت پر شک گزرنے لگتا۔ ان میں بعض بعض جگر دار تو ایسے تھے کہ میرے منہ پر میری بُرائی کیا کرتے مگر حوصلہ شکنی کرتے کرتے اپنے حوصلے پست کر لیتے ایک دفعہ میں مری کے ایک مشاعرہ میں گیا ہُوا تھا وہاں ڈاکٹر تاثیر مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے میرے ساتھ چہل قدمی کرتے کرتے بتایا کہ جب پطرس بُخاری نے اپنے حلقہ کو آپ کی مخالفت پر غیر سنجیدگی میں مبتلا دیکھا تو اُنھوں نے کہا "تم لوگ احسان دانش کا پیچھا چھوڑ دو۔ وُہ تمہارے بس کا آدمی نہیں ہے۔ وہ فطری شاعر ہے اور فوج کے بغیر لڑنے والے سپاہیوں میں سے ہے۔ بفرضِ محال اگر اس کا کوئی علاج کرنا ضروری ہی سمجھتے ہو تو اُسے تعریف اور تنقیص دونوں میں نظر انداز کر دو! مگر اُس کے دبنے کا مجھے پھر بھی یقین نہیں تاہم تُمہارے تمام اوچھے ہتھیاروں سے یہ حربہ زیادہ کار آمد ہے۔"

چنانچہ یہ تجویز قبول کر لی گئی اور مجھے کلیتہً نظر انداز کر دیا گیا۔ عرصے تک لاہور کے کسی اخبار یا رسالے نے میری حوصلہ افزائی نہیں کی نہ کوئی قابلِ ذکر شخصیت میری پُشت پناہی پر آمادہ ہوئی۔ چونکہ لاہور سے باہر کے اخباروں اور رسالوں پر ان کا زور نہیں چلتا تھا اس لئے باہر کے اہلِ ادب نے کچُھ نہ کچھ میرے لئے ضرور لکھا جن میں سب سے پہلے عزیز احمد ہیں اور ان کے بعد محی الدین قادری زور مرحوم اور عبدالقادر سروری، فراقؔ گورکھپوری، پروفیسر اعجاز حسین، احمد صدیق مجنوںؔ گورکھپوری وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ باہر سے اخباروں اور رسالوں میں بھی میرے متعلق مضامین چھپے مگر لاہور نے عرصہ تک اپنی روایت قائم رکھی۔ میری اس محرومی کو میرا قصور بھی بتایا جا سکتا ہے کہ میں ان کے سانچے میں کیوں نہیں ڈھل

گیا مگر کیا کر دل میرے ظرف و ضمیر کا مسالح پگھلنے والے اجزاء سے مُرکّب نہیں بلکہ شاید آتش گیر بادوں کا آمیزہ اور بھک سے اُڑ جانے والے ذرّات کا ملغوبہ ہے۔

مَیں نے کئی بار چاہا کہ مَیں بھی اپنے ماحول کے شعرا اور اساتذہ کا ساتھ دوں اور اسی کارواں کا مسافر ہو جاؤں لیکن جب میں نے دیکھا کہ اس قافلے میں تو بہت سے لوگوں کے سرے سے پاؤں ہی نہیں وہ تو دوسروں کے کندھوں پر لد کر علَم بلند کرتے ہیں تو میرا دَم رُکنے لگا اور اس تاثر سے جب میں اُدھر سے پلٹا تو بُہت سے بیساکھیوں پر سفر کرنے والوں نے گھر تک میرا پیچھا کیا، لیکن مَیں نے مُڑ کر نہ دیکھا، ہاں اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ مشاعروں اور دواوین کے علاوہ اخباروں اور رسالوں میں چھپنے والے عموماً اپنے پاؤں سے نہیں چلتے۔ ان میں جو تندرست بھی دکھائی دیتے تھے وہ بھی انجکشنوں کے بل پر چل پھر رہے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ جب انجکشن کا اثر ختم ہو گا یہ مجسّمے گر جائیں گے، اب ان کے رنگ و روغن جگہ جگہ سے چٹخ رہے تھے اور کہیں کہیں اصل زمین بھی نظر آنے لگی تھی یہ حقائق کو نہیں چھپا سکتے تھے مگر خامیاں ایسی پختہ ہو گئی تھیں کہ بال پک جانے کے با وصف خون سفید کا سفید نظر آتا تھا۔ پھر وقت کی تمازت سے گھبرا کر ان میں سے بعض پٹڑی سے اُتر گئے اور بعض بدن کے قید خانے کی چار دیواری پر گوری پھیرتے پھیرتے حسرت بھری نگاہیں لئے زخمی ہرن کی طرح ادب و زندگی کی ڈار سے کٹ گئے۔ کوئی کہیں لکچرر ہو گیا کوئی اپنی زبان کے بل پر اعلیٰ منصب سنبھال بیٹھا کوئی تاجر بن گیا اور کسی نے اپنے زندہ مرقد کی لیپ پوت کے لئے کوئی رسالہ نکال لیا اور چونکہ موت کی آمد کے لئے سمتوں کا تعیّن نہیں ہوتا اس لئے بعض اپنے کارنامے ادھورے چھوڑ کر آخر وقت کی لپیٹ میں آ گئے اور بعض ابھی تک شعر و ادب کی دہلیز پہ ڈھنی دئے پڑے ہیں حالانکہ یہ عمر کا ڈھلوان تو صرف عبادت کے لئے ہوتا ہے نہ کہ منافقت کے لئے،

ڈھنی دینا: - دھرنا مارنا۔

ایسے وقت میں تو جو دنیا داری میں آلودہ ہوتا ہے خود دُنیادار اُسے قابل نفرین خیال کرنے لگتے ہیں۔

میں اور علی گڑھ

جب میں ریڈیو پر اپنا کلام پڑھنے لگا اور مشاعروں کی روئداد میں میرا نام بھی خصوصیت کے ساتھ آنے لگا تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشاعروں سے دو تین بار دعوت نامے آئے لیکن میں اس لئے ٹالتا رہا کہ بعض شعراء نے علی گڑھ کے سامعین کی طرف سے مجھے بدگمان کر دیا تھا۔

اب کی بار مجھے رشید احمد صدیقی صاحب نے دعوت نامے کے ساتھ اپنا ایک رقعہ بھی بھیجا جس میں میری حاضری کی تاکید تھی۔ رشید احمد صدیقی کا میرے دل میں بڑا احترام ہے کیونکہ وہ میرے پسندیدہ اہلِ قلم میں سے ہیں اور پورے دور کے طنز نگاروں میں کوئی اُن سے لگا نہیں کھاتا۔ ان کی سنجیدہ تحریر میں معانی کی شگفتگی قلم کی ساحریت سے کم نہیں اُن کے اسلوب بیان میں برجستگی اور متانت کا ایسا امتزاج ہے جو مسکراہٹ کو قہقہہ نہیں بننے دیتا اور ذہن پر ایک کیفیت منڈلاتی رہتی ہے متنوں میں اس شان کا قلمکار نظر آتا ہے۔ اُن کا حکم تھا اس لئے میں نے اللہ کا نام لے کر حاضری کا وعدہ کر لیا اور دن کے دن علی گڑھ پہنچ گیا۔ مشاعرے کے ہال میں سامعین کا سلیقہ دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا اور یقین نہ آیا کہ یہ لوگ بھی غیر ذمہ دار اور ایسے کج خُلق ہو سکتے ہیں جیسا کہ بعض شاعروں کا بیان ہے۔

وقت مُعیّنہ پر مشاعرہ شروع ہوا اور میں نے دیکھا کہ ہر اچھے شعر پر شعوردار سلیقے سے داد دی جا رہی ہے اور جہاں کہیں شعر میں جھول ہوتا ہے وہاں کسی طرف سے ایک ہلکا سا آوازہ بھی کس دیا جاتا ہے۔ یہ حال دیکھ کر میں بالکل مطمئن ہو گیا کیونکہ

اس معمولی آوازے پر مجمع کی معقولیت حاوی تھی۔

یہ آوازہ عموماً ان اشعار پر کسا جاتا تھا جہاں شاعر اس قسم کی تعلّی سے کام لیتا کہ "حضرت شعر سُنیئے"۔ "یہ مضمون آپ پہلی بار سنیں گے!" "اِس نظم میں میں نے اپنے موقف کو پیشِ نظر رکھا ہے"۔ "اس شعر میں ایک لطیف سی بات ہے!" "اس شعر میں ایک ذرا سا اشارہ ملاحظہ ہو! وغیرہ۔ یہ اصل میں جہاں شاعر کی غلط فہمی کا ثبوت تھا۔ وہاں سامعین کے علم و آگہی پر بھی ایک چوٹ تھی جسے میں نے زندگی بھر کسی صورت بھی روا خیال نہیں کیا چنانچہ میں نے کبھی اس قسم کی نثر کو اپنا سہارا نہیں بنایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اچھا شعر بہر نوع اچھا شعر ہے اس پر سامعین کو متوجہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مشاعرہ جاری رہا اور کوئی بھی شاعر اپنے حِصّے کی داد اور بیداد سے محروم نہ رہا۔ میری باری آئی تو لوگوں نے نہایت دلچسپی سے سُنا اور میری توقع سے زیادہ میرے کلام کو سراہا۔ رشید احمد صدیقی صاحب نے مبارک باد دی اور کہا کہ علی گڑھ میں آج تک ایسی کامیابی کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ مستورات کو افسوس ہوا کہ احسان دانش کا کلام سُننے کے لئے ہم اپنی بچیوں کو کیوں ساتھ نہ لائے۔ اُنھیں بھی معلوم ہوتا کہ شاعر کا کلام ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس سے ماں، باپ، بچّے اور بچیاں یکساں طور پر مستفید ہوتے ہیں۔

مشاعروں میں صرف غزلیں ہی کامیاب نہیں ہوتیں بلکہ خلوص سے کہی نظموں میں بھی ایک قوّت ہوتی ہے لیکن اس کے لئے ویسے ہی مخلص اور حقیقت پسند شاعر کی ضرورت ہے جو احساس کی طرف سے دیوالیہ اور مشاہدے کی طرف سے کھوکھلا نہ ہو۔ سب کے بعد جناب جوش ملیح آبادی کا نام پکارا گیا۔ جناب جوش اسٹیج پر تشریف لائے اُنھوں نے اپنی ایک نظم "کھیلے ہوئے ہیں، جھیلے

ہوتے ہیں" شروع کی۔ ابھی دو ہی شعر پڑھے گئے تھے کہ پروفیسر ظفر احمد صاحب اُٹھے اور فرمایا کہ "جوش صاحب آپ کی بہت سی معرکہ آرا نظمیں ہیں اُن میں سے ارشاد فرمائیں"۔ اس بے وقت کی فرمائش پر جوش صاحب جزبز ہو گئے اور فرمایا کہ میں شعر سُنانے آیا ہوں تراویح کے لئے نہیں آیا۔ بعض اور لوگوں نے بھی جوش صاحب سے کوئی دوسری نظم پڑھنے کو کہا مگر جوش صاحب نہ مانے اور مشاعرہ درہم برہم ہو گیا۔

بعد میں پروفیسر محمد داؤد اور رشید احمد صدیقی صاحب نے جوش صاحب کو سمجھایا بجھایا اور جوش صاحب بادل ناخواستہ ہاں ہاں کہہ کر خاموش ہو گئے جیسے اب اُن کا دل صاف ہو گیا ہے اور کوئی شکایت باقی نہیں رہی لیکن اس تلخی نے ان کے دل کا دامن نہ چھوڑا اور اُنھوں نے اپنے رسالے "کلیم" کے مدیرانہ حصے میں اِس احساس کو تفصیل کے ساتھ لکھا۔

میرا چونکہ علی گڑھ جانے کا یہ پہلا اتفاق تھا اس لئے میں نے ماحول کے دونوں پہلوؤں سے بقید ہوش و حواس استفادہ کیا، پھر تو یہ عالم ہو گیا کہ کئی کئی دن علیگڑھ میں گزرنے لگے۔ بورڈنگ میں رشید احمد مودودی اور ابو مسلم وغیرہ ایسے اخلاق کے لوگ نکلے کہ علی گڑھ چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ رات دن شعر و شاعری کے علاوہ ایسے ایسے ہنگامے برپا رہے کہ اب بھی خیال آتا ہے تو وہ تمام فضا خواب پریشاں کی طرح سامنے آنے لگتی ہے۔ اُس وقت جاں نثار اختر، شکیل بدایونی، راحت مولائی اور راز مراد آبادی جیسے لوگ زیر تعلیم تھے اور ظاہر ہے کہ یہ شاعرانِ کرام جب شباب پر ہوں گے تو ان کی زندہ دلی اور خوش طبعی کا کیا حال ہو گا اور کیسی کیسی قیامتیں ڈھاتے ہوں گے۔

مسعود اختر جمال کا سیدھا سادا انداز مجاز کی تفریح کا ایک ایسا پہلو تھا

جس کے چرچے چپکے چپکے ہاسٹل بھر میں رہتے تھے۔ مسعود اختر جمال کا ہر سال دیدہ و دانستہ فیل ہونا علی گڑھ کے زندگی افروز ماحول کا ایسا ثبوت ہے جس سے اُس دَور کا کوئی علیگ اِنکار نہیں کر سکتا۔ ان لوگوں کے بعد سے شاید علی گڑھ پر وہ روایتی شباب نہیں رہا جو علی گڑھ کو علی گڑھ بناتا تھا کیونکہ اُس وقت شخصی سیاسیات کے پودے کی کونپلیں مُرجھا چلی تھیں۔ پتیاں سبزی سے زردی کی طرف مُڑ رہی تھیں شاخوں میں لچک کی بجائے سختی آچلی تھی اور چھال کہیں کہیں سبز سے سیاہ ہو رہی تھی۔

اُس کے بعد سیاسیات نے ایسا پنجہ گاڑ دیا کہ مذہب سے لے کر عشق تک کوئی چیز بھی اپنی جگہ پُرسکون نہ رہ سکی اور اب تک ذرّہ ذرّہ متزلزل چلا آ رہا ہے۔

علی گڑھ میں آج کے اساتذہ سعید احمد اکبر آبادی، آل احمد سرور، ظفر احمد وغیرہ بھی قابل قدر لوگوں میں سے ہیں لیکن ماحول کے اثرات نے نہ جانے کیا کیا تبدیلیاں کر دی ہوں گی اور اسلام پسند اساتذہ پر کیا ہیبت رہی ہوگی۔

زندہ درگور

ایک دن ایک طرحی مشاعرے سے واپسی ہوئی تو چند دوست غریب خانے پر آ بیٹھے۔ بحر کی یکسانیت اور مضامین ہی نہیں مصرعوں کے توارد سے طبیعت اُکتائی ہوئی تھی۔ میں نے چائے کا آرڈر دے دیا اور انھیں کہا کہ شعر و شاعری کا بالکل ذکر نہ کریں ہاں اپنی اپنی زندگی کے اہم واقعات سُنائیں تاکہ معلومات میں اضافہ ہو، سب سے پہلے میں نے اپنا الیاٹیال والا واقعہ سُنایا۔ میرے بعد جناب شفیق کوٹی نے اپنا ایک شیر کا شکار، حزین صدیقی نے اپنے رویائے صادقہ، حسرت بہاری نے سانپ اور اُس کے منتروں کا اثر اسی طرح سب نے یکے بعد دیگرے کچھ کچھ جھاکا دیا، اس نشست میں مجھے ڈاکٹر قمر میرٹھی کا واقعہ عجیب و غریب معلوم ہُوا، جو انھیں اُن کی پھوپھی صاحبہ اور والدہ صاحبہ نے سنایا تھا۔ چونکہ یہ اُن کا خاندانی واقعہ ہے اس لئے اس میں شک و شبہ کی گنجائش نظر

نہ آئی اور میں اُسے تشکیل دے رہا ہوں۔

جناب قمر نے کہا میرے دادا کے یہاں بڑی دُعاؤں اور منّتوں کے بعد ڈھیر عمر میں خُدا نے ایک نہایت حسین اور تندرست بچہ عطا کیا۔ حسبِ توفیق خاندان بھر میں خوشیاں منائی گئیں اور بچہ دن دونی رات چوگنی رعنائیوں کے ساتھ پرورش ہوتا چلا گیا۔

اب اس کی عمر قریب چھ ماہ کی ہوگی کہ میری دادی (اُس بچہ کی ماں) کسی ضرورت کے لئے کوٹھے پر گئیں اور اُلٹے پاؤں واپس آگئیں، واپس آکر دیکھا تو کلیجا پکڑ کے رہ گئیں اور دل دُھک دُھک کرنے لگا۔

اب اس بچّے کے پنگوڑے میں اُسی عمر کا ویسا ہی کوئی اور بچہ پڑا ہوا تھا۔ بچّے نے ماں کو دیکھ کر قہقہے مارنا، آنکھیں مٹکانا اور انگوٹھے دکھانا شروع کر دیا، اور کبھی تو وہ سمجھدار آدمی کی طرح اشارے کرتا اور غصّے میں بلّی کُتّے جیسا انداز اختیار کر لیتا۔ ماں دہشت کے مارے اس بچّے کے پاس نہ گئی اور گھبرا کے اپنے شوہر کو بلوا بھیجا، جب وہ آیا تو وہ بھی اُسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا اور سمجھ میں نہ آیا کہ اس بچّے کو یہ کیا ہُوا کہ اس کم عمری میں بڑے لوگوں کی طرح اشارے کرتا اور گردن مٹکاتا ہے اور کبھی کبھی غُصّے میں جھنجھلاتے ہوئے درندے کی طرح غرّاتا اور ٹکّے دکھاتا ہے۔

دہلی گزری بازار کی اونچی مسجد میں ایک حافظ فہیم الدین صاحب رہتے تھے، جو عالم باعمل ہونے کے علاوہ عاملین میں سے بھی تھے۔ دادا صاحب بوکھلائے ہوئے اُن کے پاس گئے اور اس بچّے کا سب حال کہہ سُنایا، وہ دادا صاحب کے ہمراہ گھر آگئے اور اُنھیں دیکھ کر بچّے نے ان کی طرف بھی آنکھیں نکالیں اور غصّے میں کچھ عجیب عجیب حرکات کیں جیسے دو بلّیاں لڑ رہی ہوں۔

حافظ صاحب نے فرمایا "جتنی جلدی ہو سکے اس بچّے کو زندہ گاڑ دو"

اس کی موت تو لازمی ہے لیکن اگر یہ تمہارے گھر مر گیا تو آئندہ تمہاری نسل ختم ہو جائے گی۔ دیر نہ کرو جلدی سے جلدی اس بلا کو دفن کر دو" حافظ صاحب نے یہ الفاظ کچھ اس انداز سے کہے کہ دادا صاحب اُس کی تدفین کے لئے آمادہ ہو گئے اور کہا "جناب یہ کام ماں باپ کے بس کا تو ہے نہیں، یہ تو آپ ہی کر سکتے ہیں اور آپ ہی کریں۔" حافظ صاحب نے کہا "اچھا اسے اُٹھاؤ میں ساتھ چلتا ہوں، میں خود دفنا دوں گا" چنانچہ حافظ صاحب پھاوڑا لے کر ساتھ ہو لئے اور قبرستان میں خود اپنے ہاتھ سے گہرا گڑھا کھود کے کچھ پڑھ کر دم کیا اور اس بچے کو زندہ دفنا دیا۔ پھر اگر حافظ صاحب سے پوچھا گیا کہ آخر معلوم تو ہو کہ یہ معاملہ کیا تھا یہ تو ایک طلسمی سا واقعہ ہو گیا، آپ نے فرمایا "تمہارا حسین اور تندرست بچہ اکیلا پڑا ہوا تھا کسی جن کا گزر ہوا وہ اُسے اُٹھا کر رفو چکر ہوا اور پنگوڑے میں کوئی اور غیر انسانی مخلوق کا بچہ ڈال گیا۔ یہ انسانوں میں ہرگز نہ پلتا اور آئے دن نہ جانے کس کس کو نقصان پہنچاتا، اس کی وجہ سے گھر میں جنات کی آمد و رفت شروع ہو جاتی اور محلہ بھر تنگ ہوتا۔ اس کا یہی علاج تھا جو میں نے کیا۔" یہ واقعہ سن کر سب حیران تھے!

میری نظموں کا تاثر

مشاعروں میں سبھی قسم کے انسان ہوتے ہیں لیکن مجھ سے ہمیشہ مزدوروں اور پسماندہ طبقے کی نظمیں سننے کے لئے بعض لوگ بڑا جی کڑا کر کے بیٹھتے لیکن جب نظم ثنت* پر آتی تو غم سے لبریز دلوں کی کیفیت کو چھپانے کے لئے ہونٹ بند رکھنے کی کوشش میں بسورنے لگتے، بعض بعض ضبط سے تنگ آ کر بلند آواز سے آہ کھینچتے اور بعض دل کھول کر روتے، اُنھیں روتے دیکھ کر بعض وضعداری قائم رکھنے کے لئے جو خود پر قابو رکھتے کبھی کبھی وہ بھی پھوٹ پڑتے اور دوسرے لوگوں کی نسبت ان کی حالت زیادہ خراب ہو جاتی، عورتیں تو اس قدر متاثر ہوتیں کہ آنسوؤں سے آنچل بھیگ جاتے اور پردے اُٹھا اُٹھا کر

---

* ثنت = شباب۔ معراج۔ کلائمکس۔

مجھے اس طرح دیکھتیں جیسے پھواروں میں بھیگی ہوئی تصویریں! کئی بار ایسا ہوا کہ سب کو روتے دیکھ کر مجھے بھی ضبط پر قابو نہ رہا اور میری نظم خود مجھ پر بھی طاری ہوگئی جیسے کوئی جادو اُلٹ جائے، گلے میں آواز اٹک گئی، ہونٹ تھرتھرا گئے اور معلوم ہوا کہ رندھے ہوئے دل سے آنسوؤں کا فوارہ پلکوں کو چھونے لگا، اسٹیج سے نظم پڑھ کر جب میں اپنی نشست پر آتا تو دل پر گرد و غبار کی کمی سی محسوس کرتا جیسے تمام جسم کی شریانوں میں ٹھنڈک بہ رہی ہو۔

جب میں کسی غریب یا مزدور کو بیماری یا پریشانی میں دیکھتا یا کہیں بے یار و مددگار اور مجبور و معذور پاتا تو میرا ناریل چٹخنے لگتا اور خود بخود ایک جھنجھل سی چڑھنے لگتی، کیونکہ میں اُن کی خستہ حالی کو سرمایہ دار اور تاجر طبقے کی بے انصافی، بے رحمی اور خود غرضی پر محمول کرتا تھا، میرا خیال تھا کہ یہی لوگ مزدور کے لہو کی تمام دن کی کھولن کو چند پیسوں میں خریدتے ہیں اور غریب ملازموں کو سارا سارا دن تھکا تھکا کر مہینے کے بعد چند سکے دے کر احسان جتاتے ہیں، اور چاروں طرف نظر دوڑاتا تھا تو یہی مشقتوں کو جھپٹنے اور محنتوں پر شبخون مارنے والوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ نظر آتے تھے، میں نے جب بھی قوم کے رِستے ہوئے زخموں اور تمدن کے بہتے ہوئے ناسوروں کے اسباب کا جائزہ لیا ہے تو مجھے ہر رُخ سے یہ تباہی کا ہنگامہ اور بربادیوں کا ہجوم جہالت اور دین سے دوری کی بنیاد پر لڑکھڑاتا دکھائی دیا ہے۔ کبھی کبھی تو اس کا سدِّباب سوچتے سوچتے میری کروٹیں سُلگ اُٹھتیں اور بعض اوقات خیال کرتا کہ جگہ جگہ اسکول قائم کیے جائیں اور شروع ہی سے بچوں کو آزاد فکری اور خودگری کی تعلیم دی جائے لیکن جب روپے کی فراہمی تک بات جاتی تو میرے عزائم کی کمر ٹوٹ جاتی اور دودھ کے اُبال کی طرح تمام جذبات بیٹھ جاتے پھر حکومت کے راہ راست پر آنے کی دُعا کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہ آتا۔ مگر یہ کوئی علاج نہ تھا،

بلکہ مجبوری، جو عموماً لوگوں کو مشیّت کی طرف سے بدگمان کر دیتی ہے۔ ممکن ہے کہ میں کسی خام سیاست کی طرف نہ نکلتا، مگر میرا مطالعہ مجھے روکے ہوئے تھا اور دل یہی کہتا تھا کہ اگر تعلیم عام ہو جائے تو ممکن ہے کہ یہ گرفتیں نرم پڑ جائیں اور اچھے دماغوں کے لئے راستے کھل جائیں۔ میرا خیال یہ نہیں تھا کہ ہر مزدور میں بلندی کی صلاحیتیں ہوتی ہیں بلکہ اس طبقے کے اچھے دل و دماغ جو ٹوکری اور پھاوڑے کی مشقتوں سے ناکارہ ہو جاتے ہیں اُن سے ہمدردی مجھے بے چین کئے ہوئے تھی کیونکہ میں بہت سے چھوٹے لوگوں میں بڑے آدمیوں کو پامال ہوتے دیکھ رہا تھا۔

اگرچہ آج ہمارا ملک اچھی خاصی ترقی کر رہا ہے لیکن پس ماندہ طبقے کے لئے اِن اجارہ داروں کے یہاں آج بھی رحم و انصاف نہیں ملتا اور یہ نسب پرست آج بھی تعلیم کو عام نہیں کرتے اور انجام سے باخبر ہونے کے باوجود غلط روی سے باز نہیں آتے، کاش وہ یہ سمجھ سکیں کہ اس طرح تو انقلاب اور بھی قریب آ جاتا ہے۔ میں خونریز آندھیوں کی سنسناہٹ اور نصرخور دھماکوں کی دہل سُن رہا ہوں وہ دن دُور نہیں جب ہزاروں انسانوں کی خوراک کو دبا کر بیٹھنے والے ملبوں میں دب جائیں گے، بے رحموں اور ناانصافوں کے پندار کی دستاریں ٹھوکروں میں پامال کر دی جائیں گی، اُن کے جسموں سے جعلی لبادے اُتار کر دھجی دھجی کر دئے جائیں گے، اب کا انقلاب وہ انقلاب ہوگا کہ بدکاروں اور ظالموں کے سینوں پر وقت کا تشدد نیزوں کے ہل چلائے گا تاکہ ان کی گندی و متعفن مٹی پاکیزگیوں کی کاشت کے قابل ہو جائے غاصبوں، زانیوں اور وطن دشمنوں کی زندہ قبروں کے ڈھیر کھاد کی طرح بکھیر دئیے جائیں گے اور اس کوڑے کرکٹ سے وفاداری اور مروّت کی پنیریاں غذائیں گی آخر کب تک اس خود پروری کی دوغلی پالیسی سے دُنیا بے خبر رہے گی؟ اور خونِ انسانی شیر مادر کی طرح حلال سمجھا جائے گا حکام اور ان کے عیوب عوام کی نظروں میں آ جاتے ہیں۔

ایک دیوانۂ وطن

حفیظ قندھاری جب لاہور میں آیا تو وہ سوا سال یا ڈیڑھ سال تک غریب خانے ہی پر رہا، وہ باقاعدہ تعلیم سے بہرہ ور نہیں ہو سکا تھا لیکن اُردو، پنجابی اور فارسی رواں بولتا اور سمجھتا تھا، فارسی اس کی آبائی زبان تھی، پنجابی مادری اور اردو مرغوب اُس کے والد کابل میں ڈاکٹر تھے، وہ براہِ راست حفیظ کو مصارف نہیں بھیجتے تھے بلکہ مولانا اسمٰعیل غزنوی امرتسری کی معرفت؛ اور غزنوی صاحب حفیظ کو رقم یکمشت نہیں دیتے تھے بلکہ ہاتھ روک کر مصارف کے مطابق تنبیہ و تاکید کے ساتھ۔ اس میں ان کی کوئی مصلحت ہوگی جس سے مجھے سروکار نہ تھا۔

غالباً حفیظ کے والد کو برخوردار کی لاأبالی طبیعت کا علم تھا اور غزنوی صاحب کو بھی اس کی شوخی اور آزادہ رَوی کا اندازہ ہوگیا تھا، حفیظ مولانا کے اس رویے سے خوش نہیں تھا، بعض وقت تو بڑا جز بز ہوتا لیکن مولانا اُسے امرتسر بُلا کر بالمشافہ کئی کئی بار کے تقاضوں سے تھوڑی رقم دیتے اور اس میں بھی کفایت شعاری کی تاکید رہتی۔

حفیظ تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن مولانا اسمٰعیل کے بالاقساط مصارف دینے سے وہ اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا۔ مولانا غزنوی یہ چاہتے تھے کہ وہ امرتسر رہ کر زندگی بسر کرے لیکن حفیظ لاہور میں تنگی ترشی کی زندگی کو اس پر ترجیح دیتا تھا، وہ کبھی تو کوئی کام سیکھنے کا ارادہ کرتا اور کبھی اخباروں اور رسالوں کے دفاتر میں اپنی گنجائش دیکھتا پھرتا تھا۔

اسی چکر میں اس کی آمد و رفت ایسے شعرا و ادبا اور آرٹسٹوں میں ہوگئی، جو کوئی کام تو نہیں کر سکتے تھے لیکن دینیات اور سیاست بگھارنے میں انھیں کمال حاصل تھا۔ چنانچہ حفیظ کو آرٹ کی کم اور سیاست کی زیادہ چینک[1] لگ گئی اور دماغ میں ایک نیلے رنگ کا شعلہ حب الوطنی کے نام سے لپلپانے لگا اور رات دن انٹ شنٹ

---

[1] چینک: لگن۔ دُھن۔ لَے۔ عشق۔ چاٹ۔

مسائل پر بحث و مباحثہ میں دماغ سوزی کا عادی ہو گیا۔ لیکن اُس کی ہر تقریر اور ہر گفتگو کی تان اس پہ ٹوٹتی کہ کابل بڑا ہی زرخیز اور قابلِ قدر خطہ ہے، مگر ابھی اس کی ترقی کی طرف کسی نے صحیح رُخ سے نہیں سوچا۔

یہ جنونِ وطن پرستی یہاں تک بڑھا کہ ہر آدمی اس پر حیرت کا اظہار کرتا اور اس کی غیبت میں کئی کئی دوست از راہِ ہمدردی یہ سوچتے کہ یہ نوجوان غلط راہ پہ بگ ٹُٹ جا رہا ہے ایسا نہ ہو کہ ایک اچھا ذہن ضائع ہو جائے۔ مگر حفیظ تھا کہ ہر بزم کے سامعین کے کانوں میں اپنے اقوال و آرزو کی کیلیں ٹھونکتا پھرتا تھا بعض بعض اوقات تو سُننے والوں کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا، جو لوگ اُس کی تقریر کو با دلِ ناخواستہ سُنتے بھی تو اس کان سُنتے اُس کان اُڑا دیتے۔ کئی لوگ تو ایسے بھی تھے جو اشارتہً کنایتہً مذاق بھی اُڑاتے لیکن وُہ اس معاملہ میں اپنی دُھن کا پکا تھا مگر معصوم! وُہ لوگوں کے خول تو دیکھ سکتا تھا لیکن ابھی اُسے درون بینی کی ہوا بھی نہیں لگی تھی۔

جب اُسے پیسے ملتے تو ڈاڑھ گرم کرنے والے دوست اس کا احاطہ کر لیتے اور یہ گا دُدی اِن کی نزدیکی اور چاپلوسی کا مفہوم بالکل نہ سمجھتا بس گھن چکروں کی طرح اپنی دیوانگی میں غلطاں و پیچاں رہتا۔ بعض بعض ٹھلوئے[۱] تو اس کی ٹوہ میں رہتے اور لگام رسّی لئے ڈھونڈتے پھرتے اور جب گھر کا پتہ چلتا تو وہیں آکر دھرنا دے دیتے، میں قہرِ درویش برجانِ درویش خاموش رہتا اور جب وہ چلے جاتے تو حفیظ کو بڑی نرمی سے سمجھایا کرتا۔ مگر وہ کہاں سُننے والا تھا۔ بعض دفعہ تو وہ میری ہمدردانہ تلخی سے ناراض ہو کر اَٹر ٹانٹے[۲] دے دیتا اور پھر میں اُسے فسادھرمی سے ٹھنڈا کرتا۔

رفتہ رفتہ ایک وقت ایسا بھی آگیا کہ لوگوں نے اُسے دخل در معقولات کے جرم پر ٹوکنا شروع کر دیا، کیونکہ جب حفیظ بولتا تو دُوسروں کے بولنے کی گنجائش نہ نکلتی۔ حفیظ نے بہت جلد لوگوں کی اس بے اعتنائی کو محسوس کر لیا، اور اب اس کا

---

[۱] ٹھلوے :۔ بیکار۔ بے مصرف۔ ناکارہ [۲] اَٹر ٹانٹے دینا:۔ بلند آواز سے رونا۔ بے اختیار رونا۔

یہ روتیہ ہو گیا، کہ رات کو جب بھی اُس کی آنکھ کھُل جاتی وُہ فوراً مجھے جگا لیتا اور حکیم اخفش کی طرح تقریر شروع کر دیتا اور مَیں بُزِ اخفش کی طرح بے سوچے سمجھے ہاں ہاں کرتا اور سر ہلاتا رہتا، اُس کے فکر و خیال کی پھرکی اَدبدا کے قندھار کی طرف ہی گھومتی اور کوئی دُوسری ہوا اُسے اپنی طرف نہ گھما سکتی۔

ایک دن رات کو دو ڈیڑھ بجے کا عمل ہو گا کہ حفیظ نے مجھے جگایا اور کہا کہ ذرا اُٹھ بیٹھو، مَیں نے کہا نہ جانے کیا بات ہو گی، مَیں بیٹھ گیا، حفیظ دروازے کے پاس دیوار سے تصویر کی طرح لگ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا، جنابِ من قندھار کی تعلیم کا نظام درستی چاہتا ہے اور وہاں کے قابلِ قدر نوجوان جہالت کا شکار ہو رہے ہیں، کسی طرح ان کے لئے سہولتیں پیدا کی جائیں۔ مَیں نے کہا، اگر میں کسی کام آ سکوں تو اُٹھوں ؟ اور چلوں ؟ یہ کام تو نہایت ضروری ہے حفیظ بولا نہیں صرف رائے دیں کہ مَیں ٹھیک کہتا ہُوں نا ؟

مَیں نے جواباً کہا حضور ٹھیک ہی کہتے ہوں گے ! اگر اجازت ہو تو آرام کر لُوں، تمام دن کا تھکا ہُوا ہُوں، آپ بھی ذرا سانس لے لیں" وُہ خاموش چارپائی پر جا لیٹا اور مَیں بھی سُلگتا ہُوا سو گیا۔

تین چار روز گزرے ہوں گے سخت سردی تھی ٹھنڈی ہوا کے جھکّڑ کواڑ دل کو تھپتھپا رہے تھے جیسے کاغان کی بھیانک راتیں کھڑکیاں اور دروازے بجاتی رہتی ہیں۔ مَیں سارے دن کا تھکا ماندہ ابھی سو یا ہی تھا کہ حفیظ نے کچھ اس طرح آواز دی کہ جیسے برسات میں کوئی زنگ آلود کواڑ کھُلتے وقت چرچراتا ہے۔ مَیں چونک پڑا اور پُوچھا کیا ہے ؟ حفیظ خاموش تھا اس نے آسیب زدہ کی طرح میرے چہرے پر ٹکٹکی باندھ دی، مَیں نے کہا مُنہ سے تو پھُوٹو کیا بات ہے ؟ حفیظ نے بڑے رازدارانہ لہجے مَیں کہا "کوہ سلیمان والی سڑک سُنا ہے کہ کابل تک

جائے گی اس سے میرے وطن کو بڑا اقتصادی مفاد پہنچے گا، خشک میوے کی تجارت بڑی چمکے گی!" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا" حفیظ! اگر تم زندہ رہے اور میں خدانخواستہ اسی طرح شب بیدار رہا تو اس سڑک پر میرا جنازہ بھی جائے گا۔"

حفیظ :۔" نہیں نہیں بڑا لطف رہے گا دیکھئے تو سہی۔"

میں :۔" آپ یقین کریں کہ چند روز میں آپ تو پاگل خانے جائیں گے اور کچھ دنوں بعد میں علاج سے مایوس ہو کر آپ سے وہیں ملاقات کروں گا! کان کھول کر سن لیجئے کوئی دن جا رہا ہے۔" مجھے اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے دماغ میں شہد کی مکھیاں چھتہ بنا رہی ہیں اور ان کی بھنبھناہٹ کانوں میں آرہی ہے۔

حفیظ :۔" ناراض ہوگئے ہیں آپ، بھلا یہ بھی کوئی ناراضی کی بات ہے آدمی اکیلا ہوتا ہے تو دوسرے سے مشورہ کر ہی لیتا ہے۔"

میں :۔" یہ مشورہ ہے، خود پر رحم کرو اور سو جاؤ" میرا دماغ کھولنے لگا۔

حفیظ چارپائی پر جا لیٹا اور ایک ہفتہ آرام و سکون سے گزر گیا۔ اب حفیظ اس طرح پھرتا جیسے گرمی کی گھٹا برسنے سے پہلے! آخر ایک دن پھر حفیظ کڑکڑاتے جاڑے میں اٹھا اور میرا لحاف اتار کر ایک طرف ڈال دیا، پھر پائنتی کی طرف ہو کر ذرا زوردار لہجے میں بولا" یہ سونے کا وقت ہے، کابل کے لوگ تو پریشان ہیں" حفیظ کی نندای آنکھوں کے پپوٹے بھاری بھاری لگ رہے تھے اور اس کے چہرے پر ایک بیمار تقدس کا عکس جما ہوا تھا، میں اٹھا، اور پہلے تو اس کا کمبل چھین کر اپنے لحاف پر ڈال دیا۔ پھر حفیظ کا ہاتھ پکڑ کر کہا" آؤ دونوں بیٹھ کر باتیں کریں گے" آج میں باتیں کرنا چاہتا ہوں" حفیظ تذبذب کے عالم میں اکڑوں بیٹھ گیا، میں نے کہا" اطمینان سے آلتی پالتی مار کر بیٹھو" وہ میرا نرم لہجہ دیکھ کر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔

میں نے اسے ازراہِ ہمدردی مشورہ دیا کہ تمہاری یہ تقریر اور گلا پھلا پھلا کر

ہاتھ نچاتا بیکار جاتا ہے، میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں، اکیلا چنا کیا بھاڑ کو پھوڑے گا؛ کوئی مجمع ہو تو اُس میں دس بیس ہم خیال بھی دستیاب ہو جاتے ہیں اور ایک ہی مسئلے پر مل کے سوچتے ہیں تو کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تمہاری تقریر حب الوطنی سے لبریز اور خلوص سے درخشاں ہوتی ہے لیکن ہر بات کا محل ہوتا ہے، یہ تو درست ہے کہ میں متاثر ہوتا ہوں لیکن میں کیا اور میری بساط کیا، موتیوں کو مٹی میں بکھیر کے آخر کیا اُگانا چاہتے ہو؟"

حفیظ:- "میں تقریر کروں تو کیا لوگ سُنیں گے؟"

میں:- "کام کی بات کرو گے تو کیوں نہیں سنیں گے؟"

حفیظ:- "اچھا اب تو سو جاؤ سردی ہو رہی ہے۔ صبح کو تفصیل سے بات ہوگی۔"

حفیظ صبح ہی اُٹھا اور غسل کرنے چلا گیا، واپس آکر کپڑے بدلے اور ناشتہ کر کے باہر نکل گیا، میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے رات کی بات یاد نہیں رہی لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ اُن دنوں حکومت دینی اور سیاسی دونوں قسم کے لوگوں کو گرفتار کر رہی تھی۔ حفیظ نے شاہی مسجد میں جا کر جمعہ کی نماز پڑھی اور نماز کے بعد ایک گرما گرم تقریر داغ دی۔ عوام نے تالیاں بجائیں اور نعرے لگائے تو حفیظ کا خون جوش کھانے لگا اور نہ جانے کیا کیا پکارا ہوگا، تقریر ختم کر کے مسجد سے باہر آیا تو گرفتار ہو گیا، اراکینِ احتساب کو کیا پڑی تھی کہ اُس کے دماغ کا معائنہ بھی کراتے نفسیاتی طور پر جرم کی غایت معلوم کرتے، انھیں ابھی جرم و گناہ کے خاندانوں کی تحقیق کا کیا علم، اُن کی پیشانیوں پر تو تہذیب کے لہو کے قشقے جھلکار دیتے ہیں اور ان کی روحیں عموماً فنونِ لطیفہ سے بے بہرہ ہوتی ہیں۔

اس سے اگلی منزل پر مجسٹریٹ یہ بھی جانتے ہیں کہ پولیس کے ادارے میں گناہوں کی تحقیق اور جرائم کی تفتیش قابلِ اعتبار نہیں ہوتی یہ تو اپنے مفاد کے قبلہ کی طرف

سربسجود رہتے ہیں۔ مگر یہ لوگ با اختیار ہونے کے باوصف مجبور سے پائے جاتے ہیں ان کے علم و یقین میں یہ نہیں ہوتا کہ صحیح قانون تو احکام خداوندی اور شریعتِ پیغمبری کی تعمیل و اتباع کا نام ہے، یہی سبب ہے کہ ان کے سامنے غیبی روشنی نہیں ہوتی اور یہ عوام کی تکالیف کا سدِ باب نہیں سوچ سکتے، بلکہ مشاہدہ یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے قرب و جوار کے خیر خواہوں کو بھی غلط راہ پہ ڈال دیتے ہیں اور پھر اُن کی زندگیاں بھی چھنالے پہ اُتر آتی ہیں۔

شام کو جب حفیظ نہ آیا تو مَیں پریشان تھا کہ نہ جانے کیا بات ہے کہ حفیظ اَب تک گھر نہیں پہنچا۔ چنانچہ مَیں تلاش میں گھر سے نکلا تو ایک شخص نے بتایا کہ اُس نے تو تقریر بہت اچھی کی تھی اس میں بڑے کام کی باتیں تھیں لیکن تقریر کے بعد مسجد سے نکلتے ہی پولیس نے دھر لیا، مجھے بڑا افسوس ہوا۔ مگر یہ سیاسی گرفتاری تھی اور ایسے میں ضمانت "کارے وارد" پھر یہ کہ اُن دنوں میری ضمانت کی پوزیشن بھی کہاں تھی؟

کئی روز بعد حفیظ کا خط آیا کہ میں سنٹرل جیل میں ہوں آپ میرے لئے رسالوں کے سالنامے اور صابون وغیرہ لے کے آجائیں، مَیں نے خط ملتے ہی مختلف رسالوں کے سالنامے اکٹھے کئے اور صابون وغیرہ لے کر ملاقات کے لئے سنٹرل جیل پہنچ گیا۔

حفیظ وقتِ مقررہ پر سلاخوں کے پیچھے آگیا اور میرا شکریہ ادا کرنے لگا، مَیں نے ازراہِ تمسخر کہا "جو خدمت ہوگی بسر و چشم بجا لاؤں گا انشاء اللہ کبھی روگردانی نہیں ہوگی مگر خدارا سردیاں سردیوں یہیں رہنا رہائی کی کوشش نہ کرنا، ایسا نہ ہو کہ معافی مانگ کر آدھمکو، اس سے مجھے بھی کچھ دنوں آرام مل جائے گا اور تمہاری حب الوطنی بھی اعتدال پر آجائے گی بلکہ کرنے کھانے کے لائق ہوجاؤ گے۔

چنانچہ حفیظ جیل سے آکر شریفوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگا۔ رہائی کے کچھ روز بعد اُس نے ایک شریف خاندان میں شادی کرلی اب اس کے غالباً پانچ بچیاں

ہیں اور خود فوٹو گرافی کرتا ہے، میرا خیال تھا کہ اب اس کے مستقبل کے مصائب آسائیوں اور اندھیرے روشنیوں میں بدل جائیں گے لیکن یہ دَور شریفوں کو کہاں پنپنے دیتا ہے یہ لوگ تو خود پروری کے جنگلوں میں گھرے ہوئے ہیں اور ان کی روحیں اغراض کی چھوری ہو گئی ہیں، یہ اُس پستی میں تیزی سے اُترے چلے جا رہے ہیں۔ جہاں سے نیکی کے راستے دشوار نظر آنے لگتے ہیں۔

جہاں تک حفیظ کی تصویر کشی کا تعلق ہے وہ معمولی فنکار نہیں، اُس کے لئے ہوئے فوٹو اخباروں اور رسالوں میں آتے ہیں جن سے اس کی ذہنی صلاحیت اور فنکارانہ سیٹنگ کا پتا چلتا ہے۔ مَیں نے کئی اچھے فوٹو گرافروں کو اس کی تعریف کرتے سُنا ہے لیکن اس کی مالی حالت کچھ اچھی نہیں کیونکہ موجودہ ماحول فنکاروں کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھتا، یہاں تو اندھیرا جمانے والے ادارے اور چھالا ڈالنے والی دواؤں کی فیکٹریاں چلتی ہیں، یہ لوگ زبانوں پر تالے اور دماغوں میں پنکڑے لگانے کے ماہر ہیں، یہاں لوگ انسانی کاشت میں اکثر رشوتوں کی کھاد اور بے ایمانی کا بلیہ لگا کر خطابوں اور تمغوں کے کھلیان سمیٹنے میں مصروف ہیں۔

ویسے بھی یہی دیکھنے اور سننے میں آتا ہے کہ فنکاروں سے سرمایہ پرستوں، مغرور افسروں اور اوچھے تاجروں کا تعلق گہرا نہیں ہوتا، کیونکہ وہ تو غیرت و ناموس سے دُور اور عدل کے سائے سے پرے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایمانداروں اور صالح لوگوں کی ہمسائیگی بھی قبول نہیں کرتے۔ ان کے گرد و پیش کا دھوم دھڑکا انھیں تاجرانہ خود غرضیوں کے گورکھ دھندوں سے نہیں نکلنے دیتا۔ اس قسم کے تمام آدمی فنونِ لطیفہ سے نابلد دیکھے گئے ہیں کیونکہ یہ پاکیزگیاں جنھیں فنونِ لطیفہ کا نام دیا جاتا ہے، خرید و فروخت کی سطح سے بلند اور کچہریوں کی اصطلاحات سے ناآشنا ہوتی ہیں، فنِ لطیف کا ماہر اخلاقی اقدار کا پیمانہ اور انسانی عظمتوں کا جریب ہوتا ہے

بُک ڈپو کی مُلازمت

مزنگ کے دورانِ قیام ہی میں میرا تعارف جناب بشیر ہندی سے ہو گیا تھا۔ یہ خاندان مزنگ کے نمو دار خاندانوں میں ہے اور علمی شغف کے اعتبار سے بھی ساری آبادی میں ہنوز ممتاز چلا آتا ہے۔

بشیر ہندی کے والد سیّد مُبارک علی شاہ خود بھی فاضل تھے اور اہلِ علم سے بھی اچھا خاصا استفادہ کر لیا تھا۔ وہ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کے معزز دوستوں میں تھے۔ یہی سبب تھا کہ مولانا شرر کے مضامین کا مکمّل سیٹ اور ان کی بعض کتابیں شاہ صاحب نے اپنے ہی مطبع "گیلانی پریس" سے شائع کی تھیں۔ غالباً اِسی خاندانی روایت کے پیشِ نظر یا اپنے فطری تقاضوں کے تحت بشیر ہندی کو بھی ادب سے لگاؤ تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے خلیل جبران کی کئی کتابیں اُردو میں ترجمہ کر کے شائع کیں۔ اور یہ اُس وقت کے اردو ادب کی ترقّی میں صحتمند اضافہ تھا۔

اِس جنونِ مشترک کے باعث ہندی صاحب سے روز ملاقات ہونے لگی اور تعلقات اُستوار ہوتے چلے گئے۔ چنانچہ مَیں نے اپنی بیکاری کا ذکر کیا تو ہندی صاحب کے ایما پر مجھے گیلانی بک ڈپو میں بیس۲۰ روپے ماہانہ پر ایک جگہ مل گئی اگرچہ دوسری جگہ مجھے اس سے بہتر ملازمت مِل سکتی تھی لیکن مطالعہ کے لالچ سے میرے قدم گڑ گئے اور مَیں دُوسرے روز سے گیلانی بک ڈپو میں جانے لگا۔

بشیر ہندی صاحب کے والد بزرگوار یُوں تو بڑے پڑھے لکھے آدمی تھے مگر اب علم اُن کے یہاں زیور کی طرح رہ گیا تھا۔ وہ پریس اور زمینوں کے معاملات کے علاوہ دُنیا کی بہت سی پیچیدگیوں میں ایسے مصروف رہتے تھے کہ ان پر علمی و ادبی شخصیت کا گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ بس دن رات مقدمات کے مشورے تھے اور وہ! جاگیر دار ہونے کے باوجود وُہ درویش بھی تھے، اور درویشی کے باوصف رنگین

طبعی کے ساتھ حد درجہ کے کفایت شعار واقع ہوئے تھے۔ بکڈپو میں تمام دن میرے پاس یار دوستوں کی آمد و رفت رہتی لیکن وہ کبھی معترض نہ ہوتے بلکہ اکثر اوقات تو یہ ہوا کہ جب دُکان پہ جگہ گھری دیکھی تو سامنے والی دُکان پہ بیٹھ گئے اور جب لوگ چلے گئے اُس وقت مجھ سے دُکان کے متعلق بات ہوئی اور حالات دریافت کئے۔ میں جب تک وہاں رہا کبھی کوئی تلخی کی بات نہیں ہوئی۔

اُنھوں نے آخری ایام میں اپنے قدیمی قبرستان میں زیادہ وقت صرف کرنا شروع کر دیا تھا۔ اور مجھ پہ اُسی طرح مہربان تھے۔ اب اُن کی جگہ بشیر ہندی صاحب حضرت شیخ طاہر بندگیؒ کے مزار کی خدمت پہ مامور ہیں اور بڑے ہی دل سے کام کر رہے ہیں۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد جب سے ہندی صاحب نے قبرستان سنبھالا ہے اور حضرت طاہر بندگیؒ نے رُوحانی طور پر خدمت کا اعزاز بخشا ہے احاطہ طاہر بندگی ایسا خوش منظر ہوگیا ہے کہ موت سے پہلے ہی مر جانے کو جی چاہتا ہے اور آبادی کا حسن اس کے سامنے گرد ہے۔

مَیں شام کو بُک ڈپو سے اُٹھتا تو کبھی کسی دوست کے ساتھ اور کبھی اکیلا انارکلی ہی میں دھنی رام روڈ کے سامنے دوسری منزل میں ماسٹر دلیس راج فوٹوگرافر کے اسٹوڈیو میں جا بیٹھتا۔ وہ نہایت شریف، محنتی، فنکار اور بے تعصب انسان تھے۔ اپنے فن میں بے بدل اُستاد، لیکن اُن کا زیادہ وقت تقسیم فن میں صرف ہوتا تھا، ان کے یہاں دو چار شاگرد ہر وقت تحصیل فن میں منہمک رہتے جن میں دولت رام کوہلی کے علاوہ جو اُن کے عزیزوں میں تھے، رشید احمد اور روشن لال اُن کے نکلتے ہوئے شاگردوں میں شمار تھے۔

ماسٹر دلیس راجؔ کے یہاں ہندو ہو یا مسلمان سب شاگردوں سے یکساں سلوک اور ہمدردی تھی۔ مذہب و ملت کا وہاں کوئی مُنشا نہیں تھا، صرف انسانیت کی خدمت، فن کی تقسیم اور ہمدردی اُن کا شیوہ رہا، مَیں نے ہندو مسلمان دونوں میں

ے ماسٹر دلیس راج کا آجکل دہلی میں چاندنی چوک فوارے کے نزدیک اسٹوڈیو ہے

اس طبیعت کا انسان نہیں دیکھا اور مجھ سے تو وہ اس قدر مانوس ہو گئے تھے، جیسے ہمیشہ سے ایک ہی جگہ رہتے ہوں۔

دولت رام کوہلی سے میری خط و کتابت اب تک جاری ہے وہ آج کل بمبئی میں ہے لیکن لاہور سے جاکر اُسے ماحول راس نہیں آیا وہ افلاس کی گرفت میں مجھے بڑے بڑے دردناک خط لکھتا ہے جس سے میری رُوح پگھل پگھل جاتی ہے اور میں جواب میں تاخیر اس لئے کرتا ہوں کہ اس کے خطوں کا جواب میرے بس کی بات نہیں کیونکہ یہ مُلک کی سیاست اور احتیاط الفاظ کو معنی دینے میں مہارت تامہ رکھتی ہے۔ نہ جانے کیا کا کیا سمجھ لے اور کیسے معنی گلے میں ڈال دے۔

ماسٹر دیس راج کا شاگرد روشن لال جو نہایت ذہین اور اعلیٰ آرٹسٹ تھا، سُنتا ہے کہ بمبئی میں ہے اور اس کی محنت نے اس کو اور بھی پر لگا دئے ہیں، خُدا اُسے اور ترقی دے۔ اس کا خلوص بھی یادگار ہے۔

مجھے دیس راج کے یہاں بڑا سکون ملا ہے اور میری رُوح اُن کی ممنون ہے۔

"دیوانہ بکارِ خود ہشیار"

(عسکری علی خاں مجازی)

جب بھی مجھے فرصت ملتی میں مولانا تاجور نجیب آبادی کے وہاں چلا جاتا، اور وہاں ہنستے ہنساتے وقت گزارتا، مولانا کے یہاں آنے جانے والوں میں ایک شخص عسکری علی خاں مجازی بھی تھا، وُہ لکھنؤ کے کسی شریف اور پڑھے لکھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا، نوجوان مگر نہایت متین، سنجیدہ انگریزی کے علاوہ اُردو، فارسی میں اچھی خاصی دسترس، شہر میں گھوم پھر کر اخباروں اور رسالوں میں مختلف جگہوں پر مضمون نویسی اور ترجمہ اُس کا پیشہ تھا۔ کثرتِ فکر نے اس میں حلم اس درجہ بڑھا دیا تھا کہ سخت سے سخت اور بُری سے بُری بات پر بھی وہ برافروختہ نہ ہوتا اور سوچ سمجھ کر بڑی نرمی سے جواب دیتا۔

اس کا نظریہ تھا کہ "مذہب کے بغیر بھی انسان آرام اور سکون سے زندگی بسر کر سکتا ہے بلکہ زندگی میں نصف سے زائد مصائب اور مشکلات صرف مذہب کی وجہ سے پیش آتے ہیں۔" وہ ہر گفتگو میں اسی رُخ پر آجاتا، اور جب کبھی وہ اپنے سے کم درجے کے لوگوں میں ہوتا تو بڑی محبت اور نرمی سے گفتگو کرتا اور جب کسی پڑھے لکھے آدمی سے بات کرتا تو اس کی آنکھوں میں جلال اور چہرے پر ایک وحشت سی عود کر آتی۔

اُس کے اِس تصور نے اُسے لاہور میں کسی کام کا نہیں چھوڑا تھا، اکثر لوگ جب اس سے گفتگو کرتے تو ہونٹ بچکا بچکا کر پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے۔ کیونکہ مجازی کا فلسفہ ایسا نہیں تھا جسے ہر کس و ناکس سمجھ سکتا۔ مگر بعض یہ ضرور کہتے کہ یہ آدمی بیوقوف یا پاگل نہیں ہے بلکہ بیوقوفوں میں گھر کر بیٹھنے کا عادی ہے۔

مجازی تھا کہ مختلف سوسائٹیوں میں اپنے خیالات کے ٹکڑے پھینکتا پھرتا تھا جب کہیں وہ پورے جذبات سے اپنے مشرب پر بولتا تو اس کے خدوخال بھی متحرک ہو جاتے اور ایسا معلوم ہوتا جیسے اس میں کوئی اُس کا مجازی خدا بول رہا ہے یا کوئی غیر مرئی قوت بھری ہوئی ہے۔

جب اُس نے دیکھا کہ یہاں مذہب کے بغیر کوئی میری بات ماننے کو تیار نہیں اور نہ مجھ ایسے آدمی کو پنپنے دیا جاتا ہے تو اُس نے دو کتابچے مرتب کئے یہ ایک ہی سلسلے کے دو حصے تھے "تجدید عمل حصہ اوّل اور حصہ دوم، لیکن اِس غریب کے پاس اس قدر رقم کہاں تھی کہ وہ چھپ سکتے۔ چنانچہ وہ کچھ دنوں تو پبلشروں میں مارا مارا پھرا لیکن کوئی پبلشر اُس کے دونوں کتابچے چھاپنے کو تیار نہ ہوا اور اس کے افلاس کا یہ عالم تھا کہ دسمبر کی یخ بستہ راتوں میں وہ شاہی قلعے کی پشت کی طرف میدان میں جہاں پس ماندہ طبقے کی عورتیں اُپلے پاتھا کرتی تھیں وہ رات کی سردی کا مارا نکلتے

ہوئے سورج کی شعاعوں میں سُکڑا ہُوا بیٹھا رہتا ۔ جب سورج بلند ہوجاتا اور رات کے ٹھٹھرے ہوئے ہاتھ پاؤں کُھل جاتے تو آبادی میں آتا اور اخباروں ، رسالوں کے دفتروں میں حسبِ معمول دھکّے کھاتا پھرا کرتا ، شام تک اگر کہیں سے کچھ ملا کھا لیا نہ ملا تو خیر سلّا ، فاقوں کا وہ عادی ہوچکا تھا مگر اس میں سوال کرنے کا عیب نہیں تھا ، وہ نہایت غیر تند اور سنگین ارادوں کا انسان تھا ، وُہ دُنیا کے جھگڑوں اور روٹی کی کشمکش کا سبب مذہب ہی کو قرار دیتا تھا اور چاہتا تھا کہ اپنی تشنگی اور سینے کا الاؤ عوام کے سینوں میں کھپا دے ۔

وہ دن رات انھیں خیالات کی تبلیغ میں محو رہتا اور باقی دُنیا کے کسی اچھے بُرے سے اُسے کوئی تعلق ہی نہیں تھا جس کسی نے زبردستی کھانے پر بٹھا لیا ، بیٹھ گیا ۔ چائے پر دعوت دی تو کھینچا تانی سے چلا گیا اور کچھ کھا پی لیا ورنہ اُسے کسی کا بارِ احسان اُٹھانا پسند نہ تھا ۔

کپڑے میلے ہوجاتے تو بعض دفعہ صابون سے ورنہ عموماً بغیر صابون نل پر خود ہی دھو لیتا تھا ، لانڈری یا دھوبی کے لئے اُس کے پاس پیسے تھے بھی کہاں ؟

وُہ اکثر میرے یہاں آتا اور اپنے خیالات کی تبلیغ کے علاوہ اپنا کلام بھی سُناتا ایک دن اُسے کسی ستم ظریف نے مشورہ دیا کہ تم فلاں آدمی کے پاس چلے جاؤ وہ تمہاری قدر کرے گا ۔ حالانکہ جس شخص کے پاس اُسے بھیجا جا رہا تھا وہ بہت کٹر مذہبی اور بڑا جلالی قسم کا آدمی تھا ۔ لوہاری دروازے کے اندر جا کر کہیں دُور گلی میں اس کی بیٹھک تھی ۔

اُن دنوں مَیں جس مکتبے میں ملازم تھا وہ لوہاری دروازے کے اندر تھا ۔ سیدھے سبھاؤ بیٹھے بیٹھے نظر اُٹھی تو دیکھا کہ مجازی چلا آرہا ہے اور اس کی کنپٹی کے اوپر سے لہو کا سوتا بہ رہا ہے جسے وہ اُنگلی سے سونت سونت کر اِدھر اُدھر زمین پر چھڑکتا آتا ہے ، مَیں نے آواز دی اور کہا بھائی یہ کیا ہُوا ؟

مجازی نے نہایت اطمینان اور ٹھنڈے دل سے جواب دیا "میرے ایک ہمدرد کو غلط فہمی ہوئی وہ ایک شخص کو غلط سمجھا اور مجھے اس خیال سے اُس کے پاس بھیج دیا کہ وہ میری مدد کرے گا۔ یعنی ایک مذہبی اور غبیل کو میرا ہم مشرب اور حق پرور سمجھ لیا۔ جب میں اُس کے پاس گیا اور اپنے خیالات کا اظہار کیا تو کچھ دیر تو وہ سنتا رہا اور پھر مجھے زینے کی طرف لاکر میری گردن پر گھونسا مارا، میں نیچے آگرا اور اتفاق سے میرا سر نلکے میں لگ گیا اور خون جاری ہوگیا۔ وہ تو خیر گزری کہ زیادہ چوٹ نہیں لگی، ورنہ زیادہ پریشانی ہوتی۔"

میں نے کہا "جلدی ہسپتال جاؤ اور پٹی کرا کے واپس آؤ۔ دونوں جائے پئیں گے آج دو روپے فالتو ہیں۔" وہ اچھا، کہہ کر چل دیا، شام تک میں انتظار کرتا رہا مگر مجازی نہ پلٹا۔ پھر نہ جانے کس طرح مجازی کی دونوں کتابیں شیخ مبارک علی کے یہاں چھپیں، جن کا ایک سیٹ ہنوز میرے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔

عسکری علی خاں مجازی کچھ دنوں مولانا تاجور کی مہربانی سے "ادبی دنیا" کے دفتر میں سونے لگا تھا مگر جب اُس نے چوکیداروں، چپراسیوں، کاتبوں اور دوسرے لوگوں میں اپنے خیالات پہنچائے تو لوگ اُس سے رات کو انسانی ہمدردی کے بجائے خرمستیاں کرنے لگے اور رکیک حرکات پر اتر آئے، بالآخر مجازی بیچارے کو وہاں سے بھاگنا پڑ گیا اور صبح کو مولانا تاجور سے ایسے صاف اور عریاں الفاظ میں شکایت کی کہ مولانا اُس وقت تو منہ بنا کر خاموش رہے اور مجازی کو دم دلاسا دیا لیکن مجازی کے جاتے ہی مولانا نے کاتب کو دفتر سے نکال دیا، جب دوسرے دن مجازی آیا اور اُس نے سنا کہ میری وجہ سے ایک آدمی بے روزگار ہوگیا تو مولانا سے کہا کہ اُس کو نوکری پر بلائیے! اس کا روزگار چھیننے کی کیا ضرورت تھی اُس

کے بیوی بچّوں نے میرا کیا بگاڑا ہے وہ تو ایک مذہبی جنون تھا جو اُسے اس بستی میں لے آیا، میرے مشرب میں تو اخلاقیات کی مستقل قیمت ہے مَیں کسی صورت میں بھی انسان سے مایوس نہیں ہوتا، آپ اُسے بحال کر دیں یہ مجھ پر احسان ہوگا، ورنہ مجھے قلق رہے گا۔

مجازی کے دونوں پمفلٹ تو چھپ گئے لیکن پھر وہ جلد ہی لاہور سے چلا گیا۔
مجھے اس شخص سے بہت ہمدردی تھی، کیونکہ وہ انسانی عظمت کا علمبردار تھا، لاہور شہر کی ذلّت اور فاقے بھی اُسے مایوس نہیں کر سکے اور وہ اپنی راہ پر گامزن رہا۔

ابھی چار پانچ ماہ ہوئے کسی نے بتایا کہ مجازی بمبئی سے لکھنؤ آگیا ہے۔ بڑا ہی پیارا اور قابلِ قدر انسان ہے، نہ جانے اُس کا جنون کن منزلوں میں ہوگا۔

عجیب الخلقت بچّہ

ایک دفعہ جناب اسحاق شورؔ مجھے اپنے ایک ہم وطن دھوبی کے مکان پر لے گئے اس کا مکان انار کلی کے وسط میں ایک احاطے میں تھا، مَیں نے شورؔ کے ساتھ جانے میں لیت ولعل کیا تو شورؔ نے کہا۔ مَیں آپ کو ضرور لے جانا چاہتا ہوں، سُنا ہے کہ اُس کا بچّہ عجیب و غریب بچّہ ہے، مَیں اور بھی گھبرایا کہ وقت کے بہکے ہوئے ہاتھوں سے بنے ہوئے کھیل کھلونے عموماً خوفناک ہو جاتے ہیں جیسے کمہار کے آوے کے ٹیڑھے میڑھے برتن ، مگر شورؔ نے میری ایک نہ مانی اور مَیں طوعاً و کرہاً اُس کے ساتھ ہولیا۔

جب ہم انار کلی میں جا کر اُس احاطے کے قریب پہنچے تو ایک دھوبی شورؔ کا انتظار کر رہا تھا، وہ خوشی خوشی ہمیں اندر لے گیا اور دُور سے وہ بچّہ دکھایا۔ اس کی عمر زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کی ہوگی، دھوبی نے کہا "قریب جا کے دیکھئے" مَیں نے کھٹولے کے قریب جا کر ڈرتے ڈرتے اوپر سے چادر ہٹائی تو ایک بچی سی سو رہی تھی۔ مَیں نے کہا "میاں یہ تو لڑکی ہے، تم تو لڑکا بتاتے تھے" دھوبی نے کہا، "نہیں جناب یہ لڑکا ہے، مَیں نے کہا پھر وہ کوئی اور بچّہ ہوگا، یہ تو لڑکی معلوم ہو

رہی ہے۔" اس کا باپ آیا اور اس کے جسم کو چوڑا کر اندر سے لڑکے کی علامت بھی نکال دی، مَیں حیران ہوگیا اور اُس سے پوچھا "کیا اس میں لڑکی کی علامت بھی ہے"؛ اس نے کہا بالکل نہیں، میری حیرت اور بھی بڑھی کیونکہ مَیں خُنثہ مُشکل کے متعلق تو پڑھ چکا تھا کہ اُس میں عورت اور مرد دونوں کی علامتیں ہوتی ہیں، مَیں نے اسی شش و پنج میں اور جُھک کر دیکھا تو اُس کی مُسلمانی میں پیشاب کا سوراخ نہیں تھا، مَیں نے پُوچھا "میاں یہ جوان پیشاب کہاں سے کرتا ہے، اس پر اُس کے باپ نے اُس کی مسلمانی کے نیچے جڑ میں ایک سوراخ دکھایا اور کہا یہ اس سُوراخ سے پیشاب کرتا ہے اور جب پیشاب کی حاجت ہوتی ہے تو اُس کی مسلمانی میں حرکت آجاتی ہے یہ کہہ کے اُس نے پھر دونوں پَرت ملا دئیے اور وہ بچّہ لڑکی معلوم ہونے لگا، پھر نہ معلوم اس کا کیا انجام ہوا ہوگا اور نہ جانے کہاں ہوگا یا کون سی صنف میں شمار ہوتا ہوگا۔

دو لاشیں یہی محمد اسحاق شورؔ بابری (ضلع منظفر نگر) کے رہنے والے نہایت خوش اخلاق، یار باش، بے تکلّف اور سادہ لوح انسان ہیں ایک بار ملنے تو معلوم ہوگا کہ برسوں سے تعلّقات چلے آتے ہیں اپنی طرف سے بات بنھانے میں کوشاں مگر دُنیا کو سمجھنے میں مجھ سے بھی زیادہ نا اہل۔ وہ اپنی طرح ہر شخص کو بے ریا اور بغیر استر خیال کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ وہ اب تک دُنیاوی لحاظ سے کسی خاص مقام پر نہیں پہنچے۔ اچھا خاصا شعر کہتے ہیں اچھے خاصے مصوّر ہیں خوش نویسی میں بلند مقام حاصل ہے اور فن سپاہ گری میں تو گرد و نواح میں اپنا جواب نہیں رکھتے مگر اُن پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

چلتا ہُوں تھوڑی دُور ہر اک تیز رَو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہُوں ابھی راہبر کو مَیں۔ (غالبؔ)

وُہ آج بھی اسی طرح میرے بے تکلف دوست ہیں جیسے پہلے تھے،

حالانکہ اس اثنا میں حالات و واقعات کا ایک طوفان خیز جوار بھاٹا گزر چکا ہے اور ہماری دوستی کے سامنے سینکڑوں ہزاروں دوستیوں نے دَم توڑ دیا ع

اکثر ہمارے ساتھ کے بیمار مر گئے

اسحاق شور سے جب ملاقات ہوئی، اُن دنوں وہ لاہور میں اجنبی تھے، شاید یہی وجہ ہے کہ ہم دونوں رُوحانی طور پر ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے وُہ خوش نویسی کر رہے تھے لیکن کتابت کی اچھی خاصی اُجرت کے باوجود معاشی طور پر دھوئیں میں سانس لے رہے تھے کیونکہ مزدوری میں تسلسل نہیں ہوتا، مَیں کتب خانے کے فرائض انجام دے کر شام کو کہیں نقل کا کام کرتا کہیں پروف دیکھتا، اسی کشمکش کی گرفت اور افلاس کے جبڑوں میں بھنچے بھنچائے لشٹم پشٹم دِن گزر رہے تھے۔

تعارف کے فوراً بعد مَیں نے شور کو مع اہل وعیال اپنے مکان پر بلا لیا تاکہ تنہائی کا قلق ہلکا پڑ جائے ایک دن شور نے کہا میری اہلیہ کو وضع حمل ہونے والا ہے اور پیسا پاس نہیں رات دن پریشان ہوں کہ کیا کروں؟ یہ مرحلہ کیسے گزرے؟ مَیں نے کہا پریشانی کا علاج پریشانی تو ہرگز نہیں بہتر یہ ہے کہ اسے ہسپتال میں داخل کر دیا جائے چنانچہ اُسی وقت اُسے ہسپتال پہنچا دیا۔ دُوسرے دن شور صاحب خوشخبری لائے کہ دو لڑکے تولّد ہوئے ہیں۔ مَیں نے مبارکباد کے ساتھ ہی ایک فرمائشی قہقہہ لگایا کہ زنجیر میں قدرت کی طرف سے مصائب کی دو کڑیاں یکدم بڑھ گئیں۔

اُن دنوں شور اور میں اس قدر نزدیک تھے کہ ایک دوسرے سے زندگی کا کوئی گوشہ بھی چھپانا گناہ معلوم ہوتا تھا روز ملنا اور زندگی کی تلخیوں کو قہقہوں میں اُڑا دینا معمول سا بن گیا تھا۔ دُوسرے یا تیسرے روز جب لاہور میں گرمیوں کا آفتاب سڑکوں سے سایوں کی جاجمیں سمیٹ دیتا ہے شور صاحب تشریف لائے جیسے کسی

پٹواری کی لال کتاب گم ہوگئی ہو، پھر بولے "بھائی جان! دونوں بچّوں کا انتقال ہوگیا ہے اب دو لاشیں ہیں اور ہم دو آدمی کس کو بلائیں اور کیا کریں؟" میں نے کہا "کرنا کیا ہے چلو دفنا دیں۔ کتنی رقم ہے تمہارے پاس؟"

شوؔر:۔ "چار روپے! اور تمہارے پاس؟"

میں:۔ "دو روپے چھ آنے۔"

شوؔر:۔ "اِس رقم میں دو لاشیں دفنائی جا سکتی ہیں؟"

میں:۔ "لاشیں تو بغیر پیسے بھی ٹھکانے لگائی جا سکتی ہیں۔"

شوؔر:۔ "آؤ پھر جلدی چلو آدمیوں کو بھی اکٹھا کرنا ہے۔"

میں:۔ "کاہے کو؟"

شوؔر:۔ "کاہے کو؟ ارے بھائی دو جنازے لے جانا ہیں۔"

میں:۔ "ارے میاں یہ تو سوچو کہ اس برستی آگ میں کون ہمارے ساتھ جانے لگا؛ کون سے یہاں عزیز و اقارب بیٹھے ہیں تم دو گز کپڑا لے لو اور خاموشی کے ساتھ مجھے لے چلو اگر ہنگامہ کرنا ہے تو بندے کو معافی دو! میں اپنا وقت کیوں خراب کروں؟ اپنا کام کروں گا۔"

شوؔر:۔ "نہیں بھئی جو آپ کہیں اس میں مجھے کیا عذر ہو سکتا ہے آخر کسی طرح اس مصیبت کو تو ٹالنا ہی ہے۔"

میں اور شوؔر دونوں ہسپتال گئے اور نرس نے دونوں بچّوں کی لاشیں ہمارے سپرد کر دیں۔ میں نے شوؔر کے لائے ہوئے دو گز لٹھے کے ایک ایک گز کے دو ٹکڑے کر لئے اور ایک ایک لاش کو ایک ایک پارچے میں لپیٹ کر ایک کو سائیکل کے اگلے کیریر اور دوسرے کو پچھلے کیریر پر باندھ لیا اور دونوں جنازگاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک بار تو شوؔر کے چہرے پر استعجاب کی پرچھائیں سی کانپی لیکن

وہ فوراً مسکراتا ہوا میرے ساتھ ہولیا۔ راستے میں جس شخص نے دیکھا وہ دُور تک دیکھتا رہا اور بعض اس حقیقت کو خواب نہ سمجھنے کے لئے تھوڑی دُور تک ساتھ چلے اور "توبہ توبہ" کہہ کر کانوں پر ہاتھ دھرے واپس ہوگئے۔ کسی نے کہا "اللہ! اللہ! کیا بے بسی ہے"۔ کسی نے ہاتھ ملے اور کوئی منہ پھیر کر دہلیز میں گھس گیا۔ ہم تھے کہ خوش خوش ایک دوسرے کا دل بہلاتے اور آگے کے واقعات کا اندازہ کرتے چلے جا رہے تھے۔ آخر کار جنازگاہ آگئی اور ہم نے دونوں لاشیں سائیکل سے کھول کر فرش پر رکھ دیں جہاں نماز جنازہ ہوتی ہے۔

بچوں کی لاشیں دیکھ کر ایک گورکن دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا۔

"میاں صاحب کہاں دفن کروگے"؟

مَیں :۔" بھائی جہاں جگہ ہو دفن کر دو۔"

گورکن :۔" دونوں قبروں کے دس روپے ہوں گے۔

مَیں نے اسحاق شورؔ کی طرف دیکھا کیونکہ دس روپے تو ہم دونوں کی پونجی ملا کر بھی نہیں ہوتے تھے شورؔ خاموش ہوگیا اور ڈوبی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ "تم ہی جانو جو چاہو کرو!"

مَیں نے گورکن سے کہا "بھئی دو قبروں کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو بھائی بھائی ہیں لڑیں گے تو نہیں ایک ہی جگہ کسی چھوٹی سی قبر میں دفنا دو" اتنے میں ایک مولوی صاحب اندر کی محراب سے اُٹھ کر آئے غالباً وہ اسی جنازگاہ کے عملے کے کارکن تھے، فرمانے لگے "سُنو جی! اگر بچہ جنتے ہُوئے عورت کا انتقال ہوجائے تو بچہ ہمراہ دفن ہوسکتا ہے ورنہ ہر جسم کی قبر علیحدہ ہوتی ہے سمجھے"؟

مَیں :۔حضرت۔ پھر آپ ان دونوں بچوں کی لاشوں کو امانت رکھیں ہم ہسپتال سے اِن کی ماں کو ابھی مار کے لاتے ہیں، پھر تینوں کو ایک ہی جگہ دفن کرا دیجئے دس

روپے تو ہمارے پاس نہیں اور نہ کہیں سے مہیا ہو سکتے ہیں۔"
مولوی صاحب :۔ "یہ کوئی عجیب بیہودہ لوگ ہیں کہ میت پہ کھڑے ہیں اور مذاق کرتے ہیں، کوئی ان سے پُوچھے کہ ہم لوگوں سے آدمی مرواتے ہیں؟" اور لاحول ولا قوۃ کہتے ہوئے مسجد میں داخل ہو گئے۔
شور :۔ "احسان صاحب اب کیا کریں؟"
مَیں :۔ "تدبیر تو ہے اور اعلیٰ درجے کی ہے لیکن ذرا ہمت سے کام لو۔"
شور :۔ "کیا؟"
مَیں :۔ "دونوں لاشیں یہاں چھوڑ کر ایک ایک کر کے کھسک چلو، جب شام ہو گی اور کوئی وارث نہیں آئے گا تو انھیں دونوں لاشیں خود دفنانا پڑیں گی اور ہم تم سے اچھی طرح دفنائیں گے۔"
شور :۔ "بات تو بہت زور دار ہے اس طرح تو پیسے بھی بچ جائیں گے، پہلے آپ کھسک لیں پھر چپکے سے موقع دیکھ کر مَیں آ جاؤں گا۔"
یہ گفتگو اختتام پر تھی کہ ایک شخص محمد شفیع نامی جو نہ جانے مجھے کیسے جانتا تھا دُور سے مُسکراتا ہوا میری طرف بڑھا اور کہنے لگا "احسان صاحب کیا بات ہے۔" مَیں نے تمام ماجرا سُنایا اس نے کہا "لاشیں اُٹھا لو اور آؤ میں اپنی زمین دیتا ہوں۔"
ہم دونوں لاشیں لے کر اس کے ساتھ ہو لئے اس نے غالباً چار روپے ہم سے لئے اور ہم نے ایک چھوٹی سی قبر کھود کر دونوں معصوموں کو سپردِ خاک کر دیا۔
اِس مصیبت سے نجات پاتے پاتے شام ہو گئی میں گھر چلا گیا اور شور ہسپتال کو روانہ ہو گیا تاکہ اہلیہ کو دلاسا دے۔ وہ کوئی دو گھنٹے کے بعد آیا اور سونے کے وقت تک اس موضوع پر کوئی بات چیت نہیں ہوئی مگر شور رہ رہ کر خاموش ہو جاتا تھا اور اس کی گفتگو میں وہ پہلی سی شگفتگی نہیں تھی۔ علی الصبح اُٹھ کر اس نے

ہسپتال جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میں نے کہا "خیریت ہے؟"

شورؔ :۔ "ہاں خیریت تو ہے مگر خیریت کچھ ہمیں پسند نہیں کرتی، جب سے ہم لاشیں ہسپتال سے لے کر نکلے تھے میری بیوی اُسی وقت سے رو رہی ہے، آنکھیں ورم کر گئیں اور آپ سے تو وہ بہت ہی ناراض ہے۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ "تم نے بچوں کی لاشیں" یزید کے سپرد کر دیں۔ ایسی بیدردی تو شمر بھی روا نہ رکھتا! بھلا کوئی سائیکل پر بھی لاشوں کر لے جاتا ہے؟"

میں نے کہا "اچھا" میں ساتھ چلتا ہوں ابھی ٹھیک ہوئی جاتی ہے۔"

میں اور شورؔ ہنستے بولتے دونوں ہسپتال پہنچے واقعی اُس کی اہلیہ رو رو کر ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے پہلے تو اسے سمجھانا چاہا کہ "دیکھو بہن ہم غریب الوطن ہیں اِس تپتی دوپہر میں ہمارا ساتھ دینے والا کون تھا۔ آخر بچوں کو کسی نہ کسی طرح تو دفنانا تھا ہی، اِس کے سوا اور چارۂ کار تھا بھی کیا؟"

شورؔ کی اہلیہ جھلّا کر بولی "بھائی کوئی آج تک لاشوں کو سائیکل پر بھی باندھ کر لے گیا ہے؟"

میں نے ذرا بگڑ کر کہا "جب آدمی نہیں تھے تو کیا کرتے اُن کے لئے میں ہوائی جہاز کہاں سے لاتا۔ مجھے تم کل سے شمر اور یزید بنا رہی ہو۔ لو ابھی دونوں لاشیں نکالے لاتا ہوں، خود اپنی مرضی سے چاہے جس طرح دفن کر لینا۔" میں اُٹھ کھڑا ہوا "ابھی پندرہ منٹ میں تمہاری امانت لاکر تمہارے سپرد کرتا ہوں" میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا اور اُٹھ کر آہستہ آہستہ چل دیا۔

شورؔ نے اپنی بیوی سے لجاجت کے انداز میں کہا "انہیں روکو جو شخص سائیکل پر لے جا سکتا ہے وہ نکال کے لا بھی تو سکتا ہے! ان کے لئے کون سی بڑی بات ہے اور پھر یہ تو آدمی بھی ایسے ہی ہیں اور مٹی خراب کر دیں گے"! شورؔ کی بیگم نے

مجھے آواز دی اور کہنے لگی اب کہاں جا رہے ہو بھائی ؟ سنو تو سہی !"

میں :" میں ابھی تمہاری امانت تمہارے پاس لائے دیتا ہوں انھیں تم جھام میں رکھ کر دفنا لینا ۔"

شورؔ کی اہلیہ :" میں ہاتھ جوڑتی ہوں اب تو انھیں تکلیف نہ دو ۔"

میں :" اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے پہلے انھیں تکلیف دی ہے آج کل نیکی کا بدلہ یہی ہے نا ؟"

شورؔ کی اہلیہ :" بھائی تمھیں معلوم نہیں مُردوں کو تکلیف ہوتی ہے شریعت میں اسی طرح آیا ہے ۔"

میں :" ہوتی ہوگی جی ، مجھے تو یہ بتاؤ کہ انھیں وہاں رہنے دوں یا نکال کے لے آؤں ؟"

شورؔ کی اہلیہ :" بھائی میں تو ان کا آرام چاہتی ہوں ۔"

میں :" آرام چاہتی ہو تو قرآن شریف اٹھاؤ اور ان کو ثواب پہنچاؤ ۔ اس طرح رونے اور مجھے بُرا بھلا کہنے سے کیا فائدہ ؟"

اس گفتگو کے اختتام تک اُس کے آنسو خشک ہو چکے تھے اور وہ اپنی اصلی حالت پر آچکی تھی ، تھوڑی دیر ہسپتال میں ٹھہرے پھر میں اور شورؔ باہر آگئے ۔ شورؔ اب بہت خوش تھا کیونکہ اس کی اہلیہ کو سکون ہو گیا تھا اور میری اُلجھن بھی دُور ہو گئی تھی ۔

شورؔ غالباً تیسرے چوتھے دن اُسے گھر لے آیا اور زندگی معمول کے مطابق گزرنے لگی ۔

اسحاق شورؔ آج کل یو ۔ ایس ۔ آئی ۔ ایس میں کتابت کر رہے ہیں اور گھر پر ان کی مصوری اور فن سپاہ گری کی مشق برابر جاری ہے ۔

سفرِ کلکتہ

غیر منقسم ہندوستان میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا، جو آغا حشر کے نام سے واقف نہ ہو۔ وہ اپنے فن ڈرامہ کے اعتبار سے ہندوستان بھر میں واحد آدمی تھے جو ڈرامے کی تخلیق و ترتیب کے ساتھ ساتھ موسیقی اور رقص کے رموز و غوامض سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ صرف ڈرامے ہی کے حسن و قبح سے واقف نہ تھے بلکہ فن شعر کے معائب اور محاسن پر بھی ان کی اچھی خاصی نظر تھی۔ ان کی مشہور دُعا کا شعر ہے ؎

آہ جاتی ہے فلک پر رحم لانے کے لئے
بادلو ہٹ جاؤ دے دو راہ جانے کے لئے

آج بھی یہ دُعا اُسی طرح مقبول ہے اور پڑھنے والا کسی دوسری ہی فضا میں پہنچ جاتا ہے اور بے اختیار کہہ اُٹھتا ہے کہ یہ دل سے نکلا ہوا شعر ہے۔ جہاں آغا حشر میں بہت سی خوبیاں تھیں وہاں ان میں ایک ذراسی خامی بھی تھی کہ وہ اپنے فنِ ڈرامہ کی حدود میں کسی کو نہیں دیکھ سکتے تھے چنانچہ جو لوگ اُن کے پاس بیوقوفوں کی طرح رہے اور خود کو بے نقاب نہ ہونے دیا، وہ کچھ نہ کچھ لے نکلے ورنہ اُن کا کتنا ہی نزدیکی عزیز کیوں نہ ہو جہاں اُنھیں یہ معلوم ہُوا کہ وہ ڈرامے کی طرف توجہ دے رہا ہے وہ اُس کے اخراج ہی کو مناسب خیال کرتے تھے کئی بار ایسا ہُوا کہ ان کے قریبی دوست اُن کے پاس اپنے لکھے ہوئے ڈرامے لے کر گئے اور فلمی دُنیا میں داخلے کی درخواست کی۔ آغا صاحب نے اُنھیں نہایت محبّت سے رکھا اور ہر طرح کی تواضع کی، مگر تھوڑے ہی دنوں بعد یا تو ڈرامے میں نقائص نکال کر واپس کر دیا یا جسے ذرا اونچا خیال کیا اُسے اپنے پاس سے رقم دے کر چلتا کر دیا اور کہہ دیا کہ یہاں بہت سے ڈرامے آئے ہوئے ہیں اپنے نمبر پر اُسے دیکھ لیا جائے گا، اگر معیار پر پُورا اُترا تو مزید رقم روانہ کر دی جائے گی اتنے دنوں آپ

کہاں انتظار کریں گے فی الحال یہ جو کچھ رقم مل رہی ہے اسی پر اکتفا کریں اور باقی کی اُمید رکھیں۔

میں جن دنوں کتب خانہ میں بیس روپے ماہانہ پر ملازم تھا انہی دنوں بشیر ہندی صاحب نے ایک فلمی پرچے کا اجراء کیا اور اُس کا ایڈیٹر مجھے بنایا۔ میں نے اس کا نام "فلمستان" رکھا۔ شروع شروع میں تو اس نام پر بڑی لے دے ہوئی اور اخباروں نے بھی اس نام کی ترکیب پر اعتراض کیا لیکن میں یہ سوچ کر خاموش رہا کہ جب "لاپتہ" "گنج العرش" "لب سڑک" اور "امام باڑہ" وغیرہ کی ترکیبیں اُردو میں رائج ہو سکتی ہیں تو فلمستان بھی غلط نہیں، چنانچہ آج فلمستان عام ہے اور کوئی معترض نہیں ہوتا۔

ابھی اس رسالے کو جاری ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہُوا تھا، ایڈیٹری میں میرا نام دیکھ کر یار لوگوں نے ایک تنقید آغا حشر کے ڈراموں پر چھپوا دی جس میں ان کے ڈراموں کو ان کی غلط تخلیق بتایا گیا تھا اور آغا حشر کے لئے "مادر پدر آزاد" اور "بھگت باز" جیسے الفاظ استعمال کئے تھے۔ یہ رسالہ چھپتے ہی خاص طور پر کلکتہ بھیجا گیا مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ اس کی تہہ میں کیا معاملہ ہے۔

آغا حشر نے توہین میں دعویٰ دائر کر دیا جس میں پرنٹر پبلشر کے علاوہ ایڈیٹر کو بھی لپیٹ میں لے لیا، گیلانی پریس کی معرفت سمن آتے رہے ہوں گے جو میری اطلاع کے بغیر واپس جاتے رہے۔ اس کے بعد وارنٹ جاری ہو گئے پرنٹر پبلشر جناب بشیر ہندی تو مجھے اطلاع دیئے بغیر کلکتے چلے گئے۔ ایڈیٹر چونکہ میں ہی تھا اس لئے میں خود ہی تھانے میں حاضر ہو گیا۔ معاملہ قابل ضمانت تھا لیکن میری ضمانت نہیں ہو سکی اور لاہور سے کلکتہ تک ہتھکڑیوں میں پہنچایا گیا۔ میں اپنے بے قصور ہونے پر مطمئن تو ضرور تھا لیکن ہتھکڑی اس قدر سخت تھی کہ میرے ہاتھ لہولہان ہو گئے

مَیں خاموش رہا۔ کلکتہ کے قریب جب میرے نگہبان نے میری کلائیوں سے خون ٹپکتا ہوا دیکھا تو افسوس کا اظہار کیا اور دونوں ہتھکڑیاں میرے ایک ہی ہاتھ میں لگا دیں پھر کہنے لگا کہ "مجھے پہلے ہی کیوں نہ بتایا چُپ کیوں رہے"۔ مَیں نے کہا تم نے میرا ایک ہاتھ آزاد کر دیا، کیا یہ قانون شکنی نہیں ہے"؟ اس نے کہا "ذمہ دار تو مَیں ہُوں اور جواب دہ مَیں ہوں گا مَیں نمٹ لوں گا"۔ مَیں خاموش ہو گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

سپاہی کے ساتھ میں کلکتہ کے اسٹیشن پر اُترا تو بہت سی نظریں میری طرف اُٹھیں لیکن میری اجنبیت نے اُنھیں زیادہ سوچنے کا موقع نہ دیا۔ سپاہی میری ہتھکڑیوں کی زنجیر پکڑے چلتا رہا۔ اور مجھے لے کر عدالت کے کمرے میں داخل ہو گیا جہاں مجرم اور معصوم دونوں ایک ہی اصطلاح میں منسلک ہوتے ہیں جہاں قانون کے ٹھیکیدار کچی عقلوں کو جھوٹی تسلیوں میں مبتلا رکھتے ہیں جہاں عمّال کے فیصلے تذبذب کے پنجرے میں رنگ برنگی بولیاں بولتے رہتے ہیں کیونکہ ان کی ڈگریاں اصل میں جرائم اور زبوں کاری کے لائسنس ہوتے ہیں اور ان کے قلم گومگو کی وادیوں میں رینگتے اور ان کے مصاحب رنگا رنگ خفیسانوں کو جنم دیتے رہتے ہیں، جن کے ضمیر رشوتوں کی دھوپ اور آزاد خیالی کے لُوکے سے بنجر ہو جاتے ہیں۔

کرسیٔ عدالت پر ایک سیہ فام معمولی شکل و صورت کا انسان بڑے تدبّر سے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ سپاہی نے اپنے تھیلے سے کچھ کاغذ نکال کر اس کے سامنے سرکا دیے اور اس نے کاغذوں کی خانہ پُری دیکھ کر میز کے چاروں طرف نظر گھمائی اور ذرا توقف کر کے سپاہیوں کو اشارہ کیا جس کے معنی یہ تھے کہ بند کر دو! میرے جاتے ہی نگہدار نے حوالات کا دروازہ کھول دیا اور مَیں سیدھے سبھاؤ

اندر چلا گیا جیسے کچی کلیوں کا کبوتر سرکنڈے کے اشارے پر اجنبی ڈربے میں داخل ہوجاتا ہے۔

اگرچہ حوالات کے تاریک معدے میں ایک جسم کا اضافہ ہوگیا لیکن ابھی اس میں بڑی گنجائش تھی سب نے ایک بار میری طرف دیکھا مگر صرف ایک ڈاڑھی والے نے پوچھا "کہاں سے آئے ہو میاں؟"

"لاہور سے!" میں نے جواب دیا۔

میرے بائیں بازو کی طرف کے ایک شخص نے اپنے ساتھی کہا "چھوڑو چھوڑو، پنجاب سے آیا ہے جہاں عورتیں اپنے مردوں کو انگریزی فوج میں بھیج کے فخر محسوس کرتی ہیں، جہاں کے مسلمان، انگریزوں کی حمایت میں مسلمانوں کے مقدس مقامات پر گولہ باری کر دیتے ہیں اور خود کو مسلمان بتاتے ہیں" میں حیران تھا کہ دیکھنے میں تو یہ باشرع آدمی معلوم ہوتا ہے لیکن بڑا کینہ پرور انسان ہے، بھلا حوالات میں اس قسم کی باتوں کی کیا ضرورت ہے، غصہ تو مجھے آیا لیکن وہ جگہ ایسی نہ تھی کہ معاملے کو بڑھایا جاتا خاموش خون جیسے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

دائیں بازو والے نے اپنے برابر والے سے مدھم آواز میں کہا (جسے میں بھی سن سکوں)، "کوئی اونچا ہی ہے جو لاہور سے یہاں تک جھنجنیوں میں آیا ہے۔"

برابر والا: "کیا خبر کون ہے کچھ بولے تو پتا چلے۔"

میں خاموش تھا اور حوالات کی دیواروں پر سلاخوں سے باہر کے آنے جانے والوں کی پرچھائیاں دوڑ رہی تھیں۔

اتنے میں ایک تیس پینتیس سال کا خشخشی داڑھی والا ملزم اٹھ کر میرے پاس آیا۔ "کہاں سے کس جرم میں آئے ہو میاں؟"

لاہور سے معصومیت کے جرم میں لایا گیا ہوں آپ کہاں سے کس جرم میں

آئے ہیں ؟" میں نے بھی سوال نتھی کر دیا۔

ملزم :" کلکتہ ہی سے آیا ہوں اور ریلوے کا مجرم ہوں"۔

میں :- "ریلوے کے مجرم ہیں تو کیا کچھ لڑائی کا فن بھی جانتے ہیں آپ ؟"

وہ : " ہاں کیوں نہیں ، لٹھ جانتا ہوں" اس نے جیتی جاگتی آواز میں کہا۔

میں : "بس لٹھ یا اور کچھ بھی ؟"

وہ : " اور کیا جاننا چاہیئے ؟"

میں : "کچھ بانک یا بنوٹ میں سے بھی آتا ہے ؟"

وہ مسکرایا اور کیسہ میں سے مجھے ایک لپ چلغوزے دیئے۔ پھر بیڑی نکال کر بولا " بیڑی پیئو۔ ان حرامزادوں نے آپ کو سگریٹ نہیں دی ہوگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو فن سپہ گری میں کچھ دخل ہے کیونکہ اس طرح کی باتیں مرد ہی پوچھا کرتے ہیں"

میں : " فی الحال تو قیدی ہوں مگر استادوں کی خدمت کو عبادت خیال کرتا ہوں۔"

وہ میری ملاقات سے بہت خوش ہوا اور وہیں اس نے مجھے اپنا پورا پتا بھی بتا دیا ، وہ ایک وفادار ، بہادر اور بڑے ٹھنڈے مزاج کا انسان تھا دوستوں کی امداد کے لیئے ہر وقت اس کی جان حاضر تھی جو معیاری اور وفادار لوگوں کا شعار ہے۔

تھوڑی دیر میں بشیر مہدی صاحب ایک وکیل کو لے کر آگئے اور میری ضمانت ہو گئی۔

شام کا وقت تھا ہم دونوں مفت روزہ اخبار "خادم" کے دفتر میں چلے گئے۔ اخبار کے مالک جعفری نے مجھے دیکھ کر ایک قہقہہ لگایا اور کہا" اللہ کی شان کے قربان جائیے کیسے کیسے کام کے آدمی بھیجتا ہے" اس کے بعد فوراً چائے آگئی اور اس دستر خوانی گفتگو میں جعفری نے اپنا اخبار میرے سپرد کر دیا اور چپکے سے کہا فکر نہ کرنا معقول مشاہرہ دوں گا ، میں آپ کو جانتا ہوں اور آپ کی شہرت

سے بھی آگاہ ہوں اس کے بعد میں تمام دن دفتر میں رہتا اور جعفری صاحب لوگوں سے اشتہارات کی اُجرت وصول کر کے لاتے ان کی طبیعت میں اس قدر مزاح تھا کہ میں ایک دن بھی مغموم یا فکرمند نہیں ہوا، میں قریب قریب چار ماہ کلکتے میں رہا اور اس شخص کو میں نے بہت ہی اچھا انسان پایا لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے کی مثل صرف اُس پر صادق آتی تھی۔ مستقل باغ و بہار قسم کا انسان اس سے زیادہ دیکھنے میں نہیں آیا۔

اپنے مقدمے کی طرف سے میں بالکل بے فکر تھا کیونکہ جن جن الفاظ پر اعتراض تھا اس کا علمی ثبوت میرے پاس موجود تھا اور حوالے کے لئے مستند کتابیں بھی میرے پاس تھیں۔

پہلی پیشی تھی اور عدالت میں کلکتہ کے صاحبِ ذوق حضرات کا ہجوم تھا کچہری میں جگہ جگہ کہیں مجھے گالیاں دی جا رہی تھیں اور کہیں کہیں میری پیٹھ بھی ٹھونکی جا رہی تھی۔ کہتے تھے کہ اس دجّال سے تم ہی مقابلہ کر سکتے تھے اور کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ میں خاموش سب کی سنتا اور ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔

میں نے عدالت میں جج سے کہا کہ یہ جو مجھ پر دفعہ ۵۰۰ عائد کی گئی ہے غالباً یہ ازالہ حیثیتِ عرفی کی ہے اس لئے میرا مدّعی اپنی چالیس لاکھ کی حیثیت کا ثبوت دے جو استغاثہ میں درج ہے۔

جج "۔ آغا صاحب، ہاں آپ کی چالیس لاکھ کی حیثیت کا کیا ثبوت ہے؟"

آغا حشر" یہ میڈن تھیٹر کے رجسٹر موجود ہیں۔"

میں "۔ میڈن تھیٹر تو ایک نجی ادارہ ہے حیثیت تو انکم ٹیکس سے معلوم ہوتی ہے عدالت مدّعی سے انکم ٹیکس کے متعلق دریافت کرے اور ساتھ ہی رسیدیں طلب کرے۔"

جج "۔ آپ انکم ٹیکس دیتے ہیں؟ اور دیتے ہیں تو کتنا اور اس کی رسیدیں دکھایئے کہاں ہیں؟"

آغا حشر: "انکم ٹیکس کیا، اِن رجسٹروں میں بھی تو غلط حساب نہیں رکھے جاتے۔"

مَیں: "جناب لکھئے کہ چالیس لاکھ کی حیثیت کے آدمی نے کوئی انکم ٹیکس ادا نہیں کیا۔"

بیان لکھا گیا تو مَیں نے کہا "عدالت فیصلہ کرے کہ اس صورت میں دفعہ ۵۰۰ کہاں تک باقی رہتی ہے اور مدّعی کا یہ بیان انکم ٹیکس آفس کو روانہ کیا جائے چنانچہ ریڈر کو حکم ہُوا کہ یہ بیان انکم ٹیکس والوں کو روانہ کیا جائے اور مقدّمے کی تاریخ پیشی بیس پچیس روز بعد ڈال دی گئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے دل میں آغا حشر کی بڑی قدر و منزلت تھی اور وہ بھی اسی طرح پیش آتے تھے کیونکہ اُن کے سامنے میری اصل پوزیشن تھی، وہ یُوں تو بڑے ہی گلیر[1] تھے لیکن چونکہ مَیں اُن کا ادب کرتا تھا اس لئے انھوں نے مجھے کبھی گالی نہیں دی۔

آخر اس مقدّمے میں صلح وصفائی ہُوئی لیکن کلکتہ کی چار ماہ کی زندگی میں جن لوگوں سے مجھے شرف نیاز رہا وہ آج تک دل کو روشن کئے ہُوئے ہے۔ ان میں سب سے پہلے جناب وحشتؔ کلکتوی ہیں جو ایک عظیم المرتبت شاعر ہونے کے ساتھ مجھ پہ اپنے شاگردوں کی طرح مہربان تھے اور مَیں اُن میں وہ تمام خصوصیات دیکھتا تھا جو بڑے لوگوں کا امتیازی نشان ہے

۲۔ جمیل مظہری:۔ یہ جناب وحشتؔ کلکتوی کے شاگرد رشید ہیں اور نظم۔ غزل افسانہ اور تنقید پر یکساں عبور رکھتے ہیں نہایت مخلص اور محبّت کے قابل انسان ہیں۔ آج کل پٹنہ یُونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ اور صحیح معنی میں ادیب اور شاعر ہیں۔

۳۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پُوری:۔ یہ بھی اُن دنوں کلکتہ ہی میں تھے۔ ادبی حلقوں کا کون سا فرد ہے جو اُن سے اور اُن کے فن سے آشنا نہیں، اُن کی کئی کتابیں دنیائے ادب سے خراجِ تحسین لے رہی ہیں اور بڑے ہی قابلِ قدر انسان ہیں۔

[1] گلیر۔ گالی دینے والا۔

۴۔ علامہ علیش امروہوی :۔ یہ حضرت رنگون میں مقیم تھے لیکن حضرت وحشت کے دوستوں میں سے تھے۔ مَیں نے ایسی معلومات کے بہت کم ادیب دیکھے ہیں خصوصاً علمی تحقیق کے سلسلے میں یہ سینکڑوں علماء و فضلاء پہ بھاری تھے۔

۵۔ ابراہیم ہوش :۔ انہیں شروع ہی سے شعر و شاعری اور صحافت سے لگاؤ رہا ہے اور اب بھی کلکتے میں کسی اخبار سے منسلک ہیں نہایت خوش مزاج اور نہایت سیدھے سادے انسان ہیں جب اُن کی یاد آتی ہے تو مَیں تصور میں کلکتے پہنچ جاتا ہوں، اور اُن کی باچھوں سے پان کی پیک کے دنبالے نکلتے نظر آنے لگتے ہیں۔

ان کے علاوہ ڈاکٹر فیض اور جناب محمود طرزی بھی اپنے خلوص کے لحاظ سے بھولنے کی شخصیتیں نہیں۔ مولانا وحشت کے تلامذہ آصف اور واصف وغیرہ بھی پرخلوص اور قابلِ قدر ہونے کے علاوہ مسافر نواز انسان ہیں۔ نہ جانے کس حال میں اور کہاں ہوں گے؛ مَیں اُن کے لئے دُعا گو ہوں۔

میری کلکتے سے واپسی تک جناب شورؔ گھر کا سودا سلف لاتے رہے اور کسی قسم کی کوئی دقّت محسوس نہیں ہوئی، اُس کے بعد وُہ دہلی چلے گئے اور عرصہ کے بعد لاہور واپسی ہُوئی۔

ایک رفیقِ راہ

توقیر طاہر گنگوہی گنگوہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے ہیں، مَیں جن دنوں منٹگمری میں مقیم تھا اُس وقت یہ کسی پریس میں ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے اُس کے بعد اُنھوں نے ملازمت ترک کر کے ٹال کر لی اور ایک مخلص دوست کے توسّط سے میرا تعارف ہو گیا، چند ہی روز بعد دونوں طرف کے عناصر میں کچھ ایسی کشش بڑھی کہ درمیانی فاصلے کم سے کمتر ہوتے چلے گئے میں اکثر اوقات اُن کی وجہ سے ٹال پر جا کر بیٹھ جاتا اور مختلف موضوعات پہ گفتگو ہوتی، اُن کی ٹال پر بیروں، خانساماؤں، مزدوروں اور خدمت گاروں کی آمد و رفت زیادہ تھی اور یہی پس ماندہ

طبقۂ اوّل سے میری شاعری کی جان رہا ہے، انھیں کا مشاہدہ میرا محبوب مشغلہ تھا اور انھیں سے ہمدردی میری رُوح کی چیخوں میں نمایاں تھی، میری کئی نظمیں انھیں دنوں کی تخلیق ہیں۔

شروع شروع میں بعض بعض اوقات مجھے یہ محسوس ہوتا کہ توقیر کی ظاہری خوبیاں مُنہ زور اور اندر کا انسان گُھنا ہے، جیسا کہ عام تاجروں میں ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ ہم دونوں اس قدر قریب ہو گئے کہ مجھے ایک جان دو قالب کا گُمان ہونے لگا۔

توقیر کو شعر و ادب سے بھی کچھ کم لگاؤ نہ تھا انھوں نے کئی غزلیں بھی کہیں جو اچھے خاصے فکر و خیال کا پتا دے رہی تھیں مگر وہ مطالعۂ ادب سے گریزاں تھے میں نے بہت کوشش کی بلکہ اُن کی حوصلہ افزائی کے خیال سے کہیں یہ بھی لکھ دیا کہ مجھے توقیر طاہر کا مشورہ حاصل ہے میرا خیال تھا کہ اگر یہ شخص ادیب یا شاعر ہو گیا تو جہاں مجھے ایک مضبوط بازو ملے گا وہیں ادب میں بھی قیمتی اضافہ ہو گا۔

اوّل سے میری یہ آرزو تھی کہ کسی طرح ایک معیاری قسم کا تصنیفی و تالیفی ادارہ قائم کیا جائے جس میں ادبِ عالیہ کی اشاعت ہو، وقت اور موقع کی بنا پر میں اس کا آغاز بھی کر چکا تھا لیکن جو میں چاہتا تھا وہ ڈَول[2] نہیں پڑ سکا تھا، اس کے باوجود ابوسعید بزمی سے میں نے دو جلدوں میں "تاریخ انقلاباتِ عالم"[1] لکھوائی، اور مولانا وارث کامل سے تین جلدوں میں "تاریخ مجاہدینِ اسلام" مرتب کرائی اور اس کے بعد قاضی اطہر مبارک پوری سے "علمائے اسلام کی خونیں داستانیں" مکمل کرائی۔ اسی دوران توقیر طاہر بھی میرے ساتھ مل گئے اور کچھ روز اشتراکِ عمل بھی رہا لیکن یہ نزدیکی ہوئی تو وہ غالباً کتاب کے کاروبار کو ٹھنڈی تجارت خیال کرنے لگے، اور طبیعت میں ایک

---

[1] تاریخ انقلاباتِ عالم، یہ کتاب شیخ نیاز احمد صاحب کو پریس ہی سے اونے پونے اٹھوا دی تھی تاریخ مجاہدینِ اسلام بقدر معاوضہ رسیدیں دیکھ کر آغا شورش لے گئے، علمائے اسلام کی خونیں داستانیں، اتنی صفحات کم ہونے کے باعث منو کتابت شدہ میرے پاس موجود ہے۔ [2] ڈَول: ڈھانچہ، خاکہ، داغ بیل، ڈھب، منڈھ، حال:

کھردراپن سا آگیا۔ ایک دفعہ دَورانِ گفتگو میں اُنھوں نے کہا " دولت شاعر کو خرید سکتی ہے مگر شاعر حصُولِ دولت میں ناکام ہی رہتا ہے"۔ مَیں نے کہا "ہاں یہ بات کسی حد تک تو درست ہے کیونکہ شاعر اور ادیب ہمیشہ قلاش ہی رہتے ہیں لیکن جہاں تک بکنے کی بات ہے وہاں تو شاعر کو خریدنے کے لئے بادشاہ بھی ناکام رہے ہیں اور جہاں شاعر اپنے ذوق اور اپنی مرضی سے فروخت ہوتا ہے تو میری طرح ذرا سی بات پہ مرمٹتا ہے" بات بھی قہقہے میں اُڑ گئی۔

توقیر طاہر کے کئی عزیز واقربا[1] ایک کمپنی کی صورت میں کاروبار کرتے تھے اور اُن کے یہاں منافع کے روپے کی ریل پیل تھی چنانچہ توقیر صاحب نے زمین ہموار کر کے تجارت کا رُخ لکڑیوں کی ٹال سے امپیریل ہیمپر کمپنی کی طرف موڑ دیا اور اُن کے ساتھ شریک ہوگئے۔

چلتے ہُوئے کاروبار کی شرکت سے توقیر طاہر کے منصوبوں میں اکھوے پھوٹتے رہے اور اس اثنا میں اُن کے اندر کے شاعر نے خواب آور گولیاں کھالیں، اب جناب توقیر خالص کاروباری آدمی ہو گئے، انھوں نے کسی خیال سے مجھے بھی شرکت کی دعوت دی کہ کتب خانہ بھی اسی کاروبار میں شریک کر دیا جائے، مَیں نے انکار نہ کیا چند روز کے بعد جب لکھت پڑھت پر نوبت آئی تو کج فہمی یا خوش فہمی سے میری شاعرانہ طبیعت تاجرانہ شرائط کی متحمّل نہ ہو سکی اور میں کسی تلخی کے بغیر علیحدہ ہو گیا۔

توقیر صاحب سے کاروباری علیحدگی کے بعد مَیں نے محسُوس کیا کہ مصروفیتِ کار سے آہستہ آہستہ فاصلے طویل ہوتے جا رہے ہیں تو میں بھی خاموش ہو گیا، کیونکہ میرے لئے تو اُن کی کم سے کم نزدیکی بھی بہت تھی جو اب تک چلی آرہی ہے ہر چند کہ اب میری اور اُن کی مُلاقات اس طرح ہے جیسے دو آدمی دیوار کی درمیانی کھڑکی کے آئینے سے

---

[1] فیروز الدین، خُدا بخش، محمد افضل وغیرہ۔

ایک دوسرے کو دیکھ تو سکتے ہیں لیکن مصافحہ و معانقہ نہیں کر سکتے ۔لیکن مجھے مسرت ہے کہ توقیر اپنے ارادوں میں کامیاب ہیں اُن کی زندگی اُن کے معیار سے بہر پہلو رُو بہ ترقی ہے ۔عرصہ ہوگیا کہ انھوں نے امپیریل پیپر کمپنی سے بھی علیحدگی اختیار کرلی اور اپنے ذاتی کاروبار میں منہمک ہیں ۔ مَیں اُن کی تندرستی اور سلامتیٔ ایمان کی دُعا کرتا ہوں ۔

ایک یادگار مشاعرہ

کچھ عرصہ کے بعد فیروز پور میں ایک سرکاری قسم کا مشاعرہ ہوا جس میں اراکین مشاعرہ سب کے سب ملازمت پیشہ تھے ، یہ اُن دِنوں کا ذکر ہے جب آزاد خیالی پر پابندیاں عائد ہونا شروع ہوگئی تھیں اور آزادی پسندوں کے غول کے غول جیل خانوں میں بھیجے جا رہے تھے ۔مہتمم مشاعرہ نے مجھے شرکت کی دعوت دی اور شرط یہ لگائی کہ "کوئی نظم مزدور یا کسان کے متعلق نہ پڑھی جائے"۔ مَیں نے ایک پل کے توقف کے بغیر اقرار کر لیا کہ ہرگز نہیں پڑھوں گا ۔مَیں نے جب اُن سے پُوچھا کہ آپ سے یہ کس نے کہا کہ مَیں مزدوروں اور کسانوں کے متعلق نظم آپ کے مشاعرے میں ضرور پڑھوں گا تو اُنھوں نے چند شاعروں کے نام بتائے جنھیں میں اپنی نظر میں اچھے اور نیک انسان خیال کرتا تھا بلکہ یہاں تک کہا گیا کہ اگر آپ نے احسان دانش کو مشاعرے میں مدعو کیا تو مشاعرہ تو ضرور کامیاب ہو جائے گا لیکن شاید آپ لوگوں کی ملازمتوں پر حرف آجائے ۔احسان دانش کو افسران کا حلقہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتا وہ احسان دانش سے آپ لوگوں کو نزدیک خیال کریں گے ۔خیر مَیں نے اُنھیں اطمینان دلایا کہ مَیں ہرگز ایسی کوئی نظم نہیں پڑھوں گا جس سے آپ لوگوں کی ملازمتیں خطرے میں پڑ جائیں ۔

اُنھوں نے مجھے مطبوعہ دعوت نامہ دے دیا اور کچھ پیشگی مصارف بھی ، چونکہ شعراء کا طبقہ مجھے ساتھ لے کر چلنے پر آمادہ نہیں تھا اس لئے میں مشاعرے سے کچھ دیر پہلے فیروز پور پہنچا اور اراکین نے اودے سنگھ شائق وکیل کے یہاں میرے قیام کا بندوبست کر دیا ۔اودے سنگھ شائق مولانا تاجور نجیب آبادی کے اچھے اور بڑھتے ہوئے شاگرد

میں سے تھے۔ انھوں نے بھی مجھے یہی پٹھ دی کہ مشاعرے میں مزدوروں کے متعلق نظم ہرگز نہ پڑھنا، میں وکیل ہوں اور دن رات حکومت کی نگاہیں پہچاننے میں لگا رہتا ہوں۔ میں نے کہا جناب مجھے کیا غرض ہے کہ مزدور پر نظم پڑھ کر خود کو خطرے میں ڈالوں میں تو غزل پڑھوں گا یا کوئی اور منظریہ نظم! اُودے سنگھ یہ سُن کر خاموش ہو گئے اور اپنی ایک غزل کے کچھ شعر سُنانے لگے۔ یکایک مشاعرے سے بلاوا آگیا، وہ مجھے لے کر مشاعرہ گاہ کو چل دئے۔ ہم جا رہے تھے کہ راستے میں چار پانچ شاعروں کا ایک ٹولا ملا، یہ سب لاہور ہی سے آئے تھے اور تانگے میں بیٹھے مشاعرے میں جا رہے تھے۔ ایک نے آوازہ کسا، کیا خوبصورت شاعر ہے۔ دُوسرے نے کہا، آج اس کی خبر مشاعرے ہی میں لیں گے۔ میں نے اودے سنگھ سے کہا "سُن لیا؟ شعراء حضرات کیا کہتے جا رہے ہیں؟" اُس نے کہا "ہاں سُن لیا، اگر کوئی گڑبڑ کی تو اِن کا کان پکڑ کے مشاعرے سے باہر نکلوا دوں گا"۔ ہم اسی طرح ہنستے بولتے مشاعرے میں پہنچ گئے۔

اختر حسین

اختر حسین ڈپٹی کمشنر مشاعرے کی صدارت کر رہے تھے اور ایک دو شاعر اپنی غزلیں پڑھ بھی چکے تھے۔ میں ہر شاعر کے کلام پر صدر کے ذوق کا اندازہ لگا رہا تھا کہ کہاں کہاں داد دیتے ہیں۔ اور کہاں کہاں خاموش رہتے ہیں۔ ساتویں آٹھویں شاعر پر جا کر مجھے یقین ہو گیا کہ کوئی صاحب ذوق ہے اور علمی ادبی خیالات و تصوّرات کا انسان معلوم ہوتا ہے۔ اگر اس کی صدارت میں اپنے رنگ کی کوئی نظم نہ پڑھی تو پھر بات ہی کیا ہے؟ لیکن چونکہ میں اراکینِ مشاعرہ سے وعدہ کر چکا تھا کہ مزدور کے متعلق نظم نہیں پڑھوں گا اس لئے میں نے بین بین راستہ سوچنا شروع کیا۔ فوراً ہی مجھے اپنی ایک نظم "ناخواندہ خاتون" کا خیال آیا اور خوشی ہوئی کہ یہ نظم مزدور کے متعلق بھی نہیں اور میرے مخصوص تصوّرات کی حامل بھی ہے اُسے تعلیمِ نسواں کے سلسلے کی کڑی کہہ سکتے تھے جو میرے ملک کے ایک طبقے کی

ترجمانی کرتی تھی۔ میرا نام پکارا گیا اور میں نے وہی نظم شروع کر دی۔ اس نظم سے حاضرینِ مشاعرہ اس قدر محظوظ ہوئے کہ دلوں پر قابو نہ رہا ہر سینے میں ایک دجلۂ غم تھا جو آنکھوں میں اُمڈا چلا آ رہا تھا۔

یہ نظم صدرِ مشاعرہ کو بھی بہت پسند آئی اور انھوں نے دل کھول کے داد دی۔ ساتھ ہی ایک اور نظم پڑھنے کی فرمائش کی۔ میں نے تعمیلِ حکم میں ایک اور نظم سُنائی۔ میری نظموں کا تاثر ہر چہرے پہ جُدا رنگ دے رہا تھا، اچھے اور بلند ذوق لوگ سراہ رہے تھے اور حاسد قسم کے شعراء ہونٹ پچکا پچکا کر انگوٹھوں کی گردش سے دائرے بنا رہے تھے لیکن میں خوش تھا کہ عوام پر میری نظموں کا تاثر گہرا نظر آتا تھا۔

پانچ گھنٹے کے بعد مشاعرہ اختتام کو پہنچا اور میں اودے سنگھ کے ہمراہ اُس کی کوٹھی تک مشاعرہ پر تنقید و تبصرہ کرتا اور سُنتا چلا آیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ تم نے جو نظم پڑھی ہے یہ اچھا اثر نہیں چھوڑے گی، یہ تو مزدوروں کی نظموں سے بھی زیادہ سخت اور سنگین ہے۔ میں نے اُسے بہت سمجھایا کہ یہ تو تعلیم نسواں کیلئے ہے جس کی آجکل سخت ضرورت ہے لیکن وہ کہتے تھے کہ میں وکیل ہوں تم میری نازک پوزیشن کو نہیں سمجھ سکتے، اگر ڈپٹی کمشنر صاحب کو یہ معلوم ہو گیا کہ تم میرے یہاں ٹھہرے ہو تو وہ مجھے بھی تمہارے خیالات کا آدمی سمجھ لیں گے۔ میں حیران تھا کہ عجب وکیل ہے۔ لیکن میں نے مزید بحث و تمحیص کو اچھا خیال نہ کیا اور ہم دونوں سو گئے۔ صبح ذرا دیر میں جاگے تو چائے تیار تھی، ہم سب چائے پینے لگے۔ چائے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ایک چپراسی آیا اور اودے سنگھ شائق سے کہا "ڈپٹی کمشنر صاحب نے احسان دانش صاحب کو بلایا ہے"! یہ سُننا تھا کہ اودے سنگھ کا رنگ فق ہو گیا۔ دوڑا دوڑا میرے پاس اندر آیا اور کہنے لگا "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ اس نظم پر کوئی نہ کوئی بات ضرور نکلے گی۔ اب چپراسی باہر کھڑا ہے اور تمھیں صاحب نے بلوایا ہے، خُدا خیر کرے!

اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو میں تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا، جاؤ دیکھو وہ کیا کہتے ہیں۔" میں سیدھے سبھاؤ چپراسی کے ساتھ ہو لیا۔ اس نے کہا کہ صاحب نے یہ بھی کہا تھا کہ اپنی بیاض لیتے آئیں۔ میں واپس ہوا اور بیاض ساتھ لے لی۔ اس پر اودے سنگھ اور بھی مشکوک ہوئے اور خیریت کی دعائیں مانگنے لگے۔ مگر مجھ پر اس بات کا کوئی اثر نہ تھا اور خوشی خوشی چپراسی کے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ آگے چل کر میں نے تانگہ لے لیا اور دس پندرہ منٹ میں ڈپٹی کمشنر صاحب کی کوٹھی پر پہنچ گیا، چپراسی نے اندر جا کر اطلاع دی۔ اختر حسین صاحب نے مجھے اندر بلوا لیا اور کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ میں کرسی پر نہایت اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اس کے بعد ہم دونوں میں یوں گفتگو ہوئی۔

اختر حسین: "میں رات کو آپ کی نظموں سے متاثر ہوا ہوں اور آپ کی بیاض دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میں: "جناب بیاض کیوں دیکھنا چاہتے ہیں آپ؟"

اختر حسین: "اس لئے کہ میں اس سے پہلے بھی ایک شاعر کے ترنم سے متاثر ہوا تھا مگر جب اس کی کتابیں دیکھیں تو مایوس ہونا پڑا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ مجھ پر آپ کے ترنم کا جادو ہے یا کاغذ پر بھی کلام جاندار ہے۔"

اختر حسین صاحب کی اس بات سے میں بہت خوش ہوا اُس وقت میری اُمیدوں میں دھنک کی طرح رنگ دوڑنے لگے اور میں نے اپنی بیاض انھیں دے دی وہ آدھے یا پونے گھنٹے تک اُسے دیکھتے رہے پھر کہنے لگے "آپ کیا کرتے ہیں؟"

میں: "میں ایک کتب خانہ میں بیس روپے ماہانہ کا ملازم ہوں۔"

اختر حسین: "کیسے گزارا ہوتا ہے، کتنے آدمی ہو گھر کے؟"

میں: "چار افراد ہیں، میرے والدین، میری بیگم اور میں، خدا کے فضل و کرم

سے گزارا بھی ہو ہی جاتا ہے۔"

اختر حسین: "جو نظم رات کو آپ نے پڑھی ہے اس کے پانچ ہزار نسخے چھاپ کر لائیں ہم آپ کو فوراً اُن کی قیمت ادا کر دیں گے اور مجھے اپنا بھائی خیال کرتے ہوئے اپنے حالات سے مطلع کرتے رہیں۔ میں آپ کی شاعری میں آپ کے روشن مستقبل کی جھلک پا رہا ہوں۔ موجودہ ماحول آپ کی امداد نہیں کرے گا، کیونکہ وہ ابھی اس قسم کے خیالات سے آشنا نہیں۔ لیکن ایک دن آپ کی یہ شاعری آپ کو مقام ضرور دے گی۔ آپ کی شاعری میں یہ بات قبل از وقت آگئی ہے۔"

میں خاموش رہا اور میری خاموشی حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کرتی رہی۔ لاہور آکر میں نے "ناخواندہ خاتون" کی پانچ ہزار کاپیاں چھپوا کر بھیج دیں اور چند روز کے بعد مجھے اُن کی رقم مل گئی۔ رفتہ رفتہ اختر حسین صاحب سے قربت بڑھتی چلی گئی اور اُن کے یہاں بے تکلف آنا جانا ہو گیا۔ اختر حسین صاحب کی والدہ مجھ سے اپنے بچوں جیسی محبت کرتی تھیں۔

میں ایک مشاعرے میں بھساول گیا تو اُنھوں نے تار دے کر مجھے برہان پور بلوایا، اور اپنے تمام خاندان سے میرا تعارف کرایا، جن دنوں اختر حسین صاحب کی والدہ گردن کے پھوڑے میں مبتلا ہو کر میو ہسپتال میں داخل ہوئیں میں روز بلاناغہ اُن کے پاس جاتا رہا اور وہ مجھے دُعائیں دیتی رہیں۔

جب اُن کا انتقال ہوا اختر حسین اُس وقت کمشنر تھے۔ لاہور کے شیعہ حضرات نے از راہِ قدردانی فیصلہ کیا کہ اختر حسین کی والدہ کو لاہور کربلا کے احاطے میں جگہ دی جائے، لیکن اختر حسین نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے میں تو ایک مسافر اور غریب الوطن ہوں میری والدہ وہیں دفن ہوں گی جہاں اور غریب الوطن اور پردیسی مسافر دفنائے جاتے ہیں چنانچہ اُن کا مزار لاہور کے مشہور

قبرستان میانی صاحب میں ایک غیر آباد راستے پر بنایا گیا اب پختہ سڑک اُس احاطے کو چھوتی ہوئی گزرتی ہے لیکن جب اُنھیں سپردِ خاک کیا گیا اُس وقت وہ جگہ گورِ غریباں ہی کے نام سے موسوم تھی۔ اختر حسین کی والدہ کی شفقت مجھے بھولتی نہیں اور وہ میری دعاؤں میں ہنوز شامل ہیں۔

چند روز بعد میں جس کتب خانے میں ملازم تھا، وہاں سے مجھے جواب مل گیا۔ میں نے حسبِ وعدہ اختر حسین کو اطلاع دی کہ میں آج ملازمت سے سبکدوش ہو گیا ہوں۔ اختر حسین نے فوراً مجھے ایک منی آرڈر بھیجا جسے میں نے شکریہ کے ساتھ واپس کر دیا اور جواب میں لکھا کہ حالات سے اطلاع دینے کا وعدہ تھا۔ منی آرڈر کی وصولی کا نہیں، وہ خاموش ہو گئے مگر تھوڑے دنوں بعد فاضلکا کے میلہ مویشیاں میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تو مجھے دعوت نامہ بھجوا دیا۔ میں نے وہاں پہنچ کر فی البدیہہ میلے کے منظر سے متعلق ایک نظم پڑھ کر سنائی اور مجھے توقع سے زیادہ آمد و رفت کے مصارف مل گئے۔

بعض وقت اختر حسین کے متعلق جب میں غور کرتا ہوں تو اُن میں آج بھی وہی خدمتِ خلق کا جذبہ زندہ و بیدار پاتا ہوں۔ اِس ملک میں انتقال اراضی آباد کاری زرعی اصلاحات اور اوقاف جیسی اسکیمیں اُنھیں کی مرہونِ فکر و قلم ہیں جب میں داتا دربار کی ڈیوڑھی پر اختر حسین کے نام کا پتھر نصب دیکھتا ہوں تو مجھے دلی مسرت ہوتی ہے۔ یہ اُن کے خلوص کا ایسا ٹھپا ہے جو رہتی دُنیا تک اُن کا نام زندہ رکھے گا۔

اختر حسین ڈپٹی کمشنری سے لے کر گورنری تک پہنچے لیکن میرے ساتھ اُن کا رویّہ آج بھی وہی ہے جو پہلے دن تھا۔ وہ جہاں اور جس عہدے پر رہے محنت، دیانت اور خلوص کے حامل رہے، وہ آج کل انجمن ترقی اُردو کے صدر

ہیں اور اُردو کی خدمت میں ایسے منہمک کہ اپنی سرکاری فرض کی ادائی کے علاوہ ترقی اُردو کے لئے جگہ جگہ جاتے ہیں اور کہیں بلندی دستی کا امتیاز روا نہیں رکھتے۔ کاش ہر شعبے کو ایسے کارکن نصیب ہو جائیں اُن کے خلوص اور بے لوث کوشش کا نتیجہ ہے کہ کراچی میں اُردو سائنس کالج کی تعمیر عمل میں آگئی اور تعلیم بھی شروع ہو گئی۔

رفتہ رفتہ میری شاعری کے لئے عوام کی پسندیدگی اور میرے لئے مقبولیت بڑھتی گئی۔ میرے ذاتی کتب کا ذخیرہ بھی میرے پاس اچھا خاصا ہو گیا ایسا کہ یونیورسٹی سے ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈی لٹ کے طالب علم میرے یہاں آکر ریسرچ کرنے لگے لیکن کتاب کے معاملے میں میری تشنگی کم نہیں ہوتی تھی، میں جس قدر کتابیں اکٹھی کرتا جاتا تھا اسی قدر آرزو کی حدیں وسیع ہوتی جاتی تھیں۔ القصہ اس لگن کا اور چھور نہیں ملتا تھا جیسے کسی سرمایہ دار کو سرمائے کا ہوکا لگ جائے جس میں یہ پتا لگانا ناممکن ہو جاتا ہے کہ بنک میں کس قدر ہے اور آرزو میں کس قدر!

ہر چند کہ ابھی میرے ساون ویران اور بھادوں سنسان تھے لیکن اب میں نے نوکری تلاش کرنا چھوڑ دی اور شعر و ادب پر ہی گزارہ کرنے لگا۔ اس طرح اگرچہ کوئی خاص آمدنی نہیں ہوتی تھی، لیکن یہ اطمینان تھا کہ کسی کا ملازم نہیں ہوں اور آزادیٔ مطالعہ حاصل ہے۔ اس گت میں مطالعے کے علاوہ اہل علم و فضل کی صحبتیں بھی میسّر آنے لگیں اور لاہور کے اطراف و جوانب میں ہونے والے مشاعروں میں بھی شرکت کا موقع ملنے لگا۔

اگر سچ پوچھئے تو کالج کے نوجوانوں نے میری شہرت کو اُبھارنے میں بڑا حصّہ لیا اور یہی میری حوصلہ افزائی مجھے آگے لے کر چلی، ورنہ ممکن تھا کہ میں دب کر رہ جاتا۔ جہاں میری شاعری میں میرا خلوص کارفرما تھا، وہیں عوام کی قدر افزائی بھی میری توانائی کا سبب بنی رہی، آج بھی نوجوانوں اور طالب علموں کے علاوہ عوام میری آواز میں آواز ملاتے ہیں۔ کیونکہ میں عوامی شاعر ہوں اور عوام کی بات کہتا ہوں

اُس وقت کے ادبی اور صحافتی طبقے میں صرف مولانا عبدالمجید سالک کی ذات ایسی تھی جو لاہور میں میری حوصلہ افزائی کرتی رہتی تھی۔ جب مَیں نے اُنھیں اپنی کتاب "لغات الاصلاح" کا مسودہ دکھایا تو اُنھوں نے اُسے سراہا اور ایک مختصر سا ابتدائیہ بھی لکھا۔

بک ڈپو میں رہنے سے مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ کتاب میں کس طرح اور کتنا منافع ہوتا ہے۔ چنانچہ میں بازار سے کتابیں خرید کر لائبریریوں کو دینے لگا اور یہ مشغلہ ایک حد تک میرے مصارف کا کفیل ہو گیا۔ میں معمولی خورد و نوش پر اکتفا کر کے خاموشی سے زندگی کا سفر طے کرتا رہا۔ مجھے اپنے گھر میں کتابوں کا ستھراؤ اور ٹوٹی چٹائی پر بیٹھ کر طالب علمانہ زندگی گزارنے میں سکون سا محسوس ہوتا اور کبھی سرمایہ پرستوں کے سنگین اور پُرتکلف مکانات اور احاطوں کے آہنی پھاٹک دیکھ کر نہ تو اچنبھا ہوتا نہ کوئی حسرت کسی ارادے سے دل پر دستک کی جرأت کرتی۔ لیکن مَیں یہ ضرور سمجھ چکا تھا کہ اس دَور میں سائنس کج فکری کے غدود بدلنے تک نہیں آئے گی اور چرب زبانی کے ماہروں سے جی نئیس کے لقب کو کوئی نہیں چھین سکے گا۔ قاتلوں کو تھپکنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے گا اور دولت کی ریل پیل ہر جرم کی معاونت میں گھٹنے ٹیکتی رہے گی۔

یہاں میری نظر سے بے شمار ایسے لکھے پڑھے گزرے جن کی سیرتوں کے دیوالے نکلے ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ اسلامی شعار اور انسانی ہمدردی سے دُور نکل چکے تھے، اِن کے مجرم ضمیروں میں اسلامی سزاؤں کو سُن کر ہڑبے لگ جاتے تھے اور اس کے علاج کے لئے یہ لوگ ایسی سوسائٹی اور اس قسم کے ٹھکانے ڈھونڈھتے پھرتے تھے جن کے آنگنے میں تحقیق کے چھاج ہوں نہ تفتیش کی چھلنیاں، لیکن اُوٹ پٹانگ باتوں سے گناہوں کا جواز پیدا کرنا ان کا شعار ہو۔ گویا یہاں کے اندھے

رہنمائی کے لئے بھی بیٹ ہی ڈھونڈھتے تھے، اور مزے کی بات یہ ہے کہ آہستہ آہستہ یہی شعور شعرا و ادبا کے ذریعے سے عوام میں پھیل رہا تھا۔

اب میری شاعری اس مقام تک آ گئی تھی کہ بڑے بڑے ادبی آڑھتی اور کج کلاہ قسم کے سفید پوش میرے وجدان کی فیکٹری کا مال استعمال کرنے لگے تھے، جگہ جگہ میرے خیالات میرے تصورات میری ترکیبیں اور میری تشبیہیں نظر آنے لگی تھیں۔ لیکن میں اپنے اُسی گرد آلود ماحول میں ڈوبتا اُبھرتا چل رہا تھا، میرے اشعار کی شاخوں پر معانی کے جو پھول کھلتے تھے اُنھیں میں اُن کی بنجر کیاریوں اور زندہ مُردوں کے مقابر پر دیکھتا تھا لیکن جب میں خود پر غور کرتا تو مجھے اپنی پختگی کا یقین ہرگز نہیں آتا۔ ہاں صرف اس قدر محسوس کرتا تھا کہ مطالعے کی ہَوا اور بزرگانِ دین کے اقوال کی مہک سے میری پیداوار کا چھلکا تو مضبوط ہو رہا ہے مگر ابھی عملی خوشوں میں دودھ نہیں پڑا۔ اور یہ بڑی محنت طلب شے ہے جو ایک زمانہ لے گی۔

میرا احساس اور مشاہدہ دونوں مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ قدم قدم پر میرا وجدان غور و فکر کی دعوت دیتا اور میں چونک چونک پڑتا۔

میں نے ہمیشہ پست خیال لوگوں کی رائے اور غلط قدم ادیبوں کے افکار کی مخالفت پر خود کو مجبور پایا۔ بعض بعض حریص لوگوں نے میرے تصورات اور افکار پر مختلف قلمیں باندھ کر مجھے پسپا کرنا چاہا مگر میری یک رُخی توجہ کو وہ نیچا نہ دکھا سکے، اور عموماً یہ دیکھا گیا کہ اُن کے عقائد و اعمال میں میری کونپلوں کا زیرا جا گرا اور اُن میں حیرت انگیز تبدیلی رُونما ہو گئی۔

ایک عبرت

ایک دفعہ میری نظر سے یہ منظر بھی گزرا ہے کہ میں اپنے مکان کی بالائی چھت پر کھڑا ہوا ڈوبتے سورج کو دیکھ رہا تھا، آسمان کے مغربی حاشیے پر بینگنی رنگ کے ابرپارے سرگوشیاں سی کر رہے تھے اور ایسا معلوم

ہو رہا تھا جیسے فطرت سُرمے کی چٹانیں توڑ توڑ کر کناری بازار لگا رہی ہے اور ہر پلکارے میں گوٹے پھٹّے کی جگہیں بدل رہی ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے کرنوں کو ترستا ہوا سورج خون کے کٹورے میں اُتر گیا، میں خیال کر ہی رہا تھا کہ کمرے میں جا کر بتّی روشن کر دوں کہ یکایک سامنے سڑک پار کے محلّے سے ایک شور و شین کا بگولا سا اُٹھا، میں حیران تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔

میں گلی میں جا کر چوراہے سے مُڑا تو معلوم ہوا یہاں سامنے والے گھر میں ایک لکھ پتی سوداگر کی لڑکی زینے سے پھسل کے گر پڑی اور ہسپتال جانے سے پہلے ہی دم دے دیا، لڑکی کی ماں بہنیں اور پاس پڑوس کی عورتیں جمع تھیں اور گھر میں ایک کہرام تھا۔

مگر جب مرحومہ لڑکی کا باپ کارخانے سے آیا تو بے ساختہ پہلا فقرہ اُس کے مُنہ سے یہ نکلا "کاش اس کی لائف انشور ہو گئی ہوتی" اس کے بعد غم و الم سے اُس کے نقش و نگار ذرا پھیکے ہو گئے اور بسورتا ہوا اندر چلا گیا۔

میں تو سُن کر کھڑا کا کھڑا رہ گیا اور سوچنے لگا "اللہ العالمین! تیرے کارخانے میں اس قُماش کی تخلیق میں یہ کیسا مسالہ صرف ہوا ہے کہ جیسے دیکھئے کسی نہ کسی رُخ سے اُس کی زندگی منافع کی لُوٹ اور خساست کے چیپ سے لپی پڑی ہے، کیا ان کی عورتیں بھی انھیں تصوّرات کی حامل ہوتی ہیں؟ اور کیا اُن کے اندر کا شور و شین بھی تقلیدی ہے؟"

حسبِ سابق

عرصہ تک میں اپنی کتابوں سے تبادلے کر کے دوستوں کو کم قیمت پر کتابیں مُہیّا کرتا رہا لیکن جب میں نے یہ دیکھا کہ بازار میں فحاشی، عُریانی اور جنسی کتابوں کی مانگ بڑھ رہی ہے اور رات دن پبلشر ہوں یا قلم کار اسی غلط روی کو حرزِ جاں بنائے جا رہے ہیں تو روحانی کوفت ہونے لگی مگر

مجھے کبھی اس قسم کی بُرائی نے نہیں گدگدایا۔ کیونکہ میں اپنے بعد کسی بُرائی کو اپنے نام سے معنون کرانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھ پر یہ روشن ہو چکا تھا کہ بُرائی کی رسوائی جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہے اور اُس میں زندہ یا مُردے کی کوئی تخصیص نہیں، مرنے کے بعد بھی جب بغاوتیں اور جرائم سامنے آئے ہیں تو برسرِ اقتدار طبقے نے عوام سے لے کر سربراہوں تک کو قبروں سے نکلوا نکلوا کر ڈھانچوں کو سزائیں دی ہیں اور ان سفّاکیوں اور جبر و انتقام سے تاریخ کا سینہ چھننا پڑا ہے۔

علاوہ ازیں میں اپنے بعض دوستوں کے آئینے میں تجارت اور تاجر دونوں کو اظہار کر کے اچھی طرح پڑھ چکا تھا، میرا اندازہ نہیں یقین ہو گیا تھا کہ ہر چیز کی ضرورت قیمت کو بڑھاتی ہے اور ہر تاجر ضرورت مند کی گھات میں بیٹھا ہُوا ہے لذّت کے طالب ہوں یا اشیائے ضرورت مند تمام ذائقوں کے محتاج آج کے تاجر کی نظر میں سب یکساں ہیں۔

لاگت سے بِکری کی رقم کو بڑھانے کے لئے انسانیت سے مستغنی ہونا ضروری ہے، چنانچہ فحش کتابوں کی تجارت یا مذہبی کتابوں کے منہ بولے دام لینے کے لئے شیطانی حربہ ہی معاونت کر سکتا ہے جو مجھ جیسے ٹٹ پونجیے کے بس کی بات نہیں۔ میری نظر میں ایسی تجارت کو رُضد سے کم نہیں۔ نتیجہ میں نے کئی ایک ایسے موقعے ٹھکرا دئیے جنھیں تاجر لاکھوں روپیہ صرف کر کے بھی بمشکل تمام حاصل کرتے ہیں۔

اس سے میری آمدنی تو کبھی مصارف سے زیادہ نہیں ہوئی، بلکہ کبھی کبھی نہوتت کی تکلیف بھی اُٹھانا پڑی لیکن بحمد اللہ میرا ضمیر غلط روی سے نہیں ڈگرایا۔ بسا اوقات تو میں نے جان بوجھ کر دولت کی راہوں سے مُنہ پھیر لیا کیونکہ کئی دولتمندوں کی زندگیاں اور ان کے مصائب میرے سامنے تھے، بارہا ایسا بھی ہُوا کہ میرے پاس جسم کے

کپڑوں کے علاوہ کوئی کپڑا نہیں رہا اور فاقے تک نوبت آ گئی۔ لیکن یہ تیسرے درجے کا افلاس میرے عزائم اور معتقدات میں ضعف پیدا نہیں کر سکا۔ کیونکہ میں عموماً اپنی زندگی میں ایسے ہی حالات سے دوچار رہا تھا اور میں نے تو ایسے موقعوں پہ یہ محسوس کیا کہ میرے سامنے خوش انجام جادے اُبھر رہے ہیں اور میری قوتِ عمل کا صیقل جھل جھل کرنے لگا، بعض وقت پل بھر کے لئے ہی سہی مجھے اپنے اشرف المخلوق ہونے کا یقین بھی نکھرتا دکھائی دیتا اور اس میں ایسی کیفیت تھی جسے موجودہ علوم کی مدد سے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

میرے کئی ایک عہدے دار دوستوں نے میری معاشی تکلیف کو محسوس کر کے ایسے موقعے نکالے جن سے دولت کا لوٹ میرے نشیب کی طرف آسانی سے بہنے لگے لیکن میرے اندر کے انسان نے اعصاب کی باگیں کھینچ لیں اور میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔

پھر میں نے لائبریریوں کو اپنی لائبریری سے کتابیں فروخت کرنا شروع کر دیں چنانچہ ترقی اردو بورڈ کراچی میں بنیادی کتب میری ہی لائبریری سے گئی ہیں۔ میں اپنی لائبریری سے کتابیں تو نکالتا رہا لیکن میں نے کباڑیوں سے کتابوں کی خرید بند نہ کی اور اب تک اُسی عارضے میں مبتلا ہوں۔

میں بہت سے ادیبوں کو کبھی کباڑیوں کی دکان پہ بھی نہیں دیکھتا، جہاں مظلوم اور پرانی کتابیں گاہکوں کے انتظار میں بسورتی رہتی ہیں، مجھے اس انسان کو پڑھا لکھا آدمی ماننے میں تامل ہے جو پرانی کتابوں کے لئے کباڑی بازار کی دکانوں پر سرگرداں نہ دیکھا جاتا ہو، پروفیسر وزیر الحسن عابدی جو فارسی کے مسلم الثبوت اُستاد ہیں اُن سے میری ملاقات ایک ایسے کباڑی کی دکان پہ ہوتی تھی جو مدتوں سے بہ بوڑھی اور بوسیدہ کتابوں کا کاروبار کرتا ہے ان کے علاوہ مولانا عبدالعزیز میمنی،

٭ لوٹ بر وزنِ کوٹ، معنی ریل، رَو وغیرہ

حافظ محمود شیرانی مرحوم، پیر حسام الدین راشدی، مولانا اعجاز الحق قدوسی، خلیل الرحمٰن داؤدی، ڈاکٹر نجم الاسلام، عطاء اللہ کلیم، لطیف انور گورداسپوری مرحوم، ڈاکٹر وحید قریشی شاکر علیمی، حمید الدین شاہد جیسے ادب کے دیوانے سب اُسی ماحول کے کوچہ گرد ہیں اور کیوں نہ ہوں، جب کوئی اچھی کتاب یا اچھی چیز گھر سے نکل جاتی ہے تو اُس کی تلاش بازار میں بھی ضروری ہو جاتی ہے۔

خاکساری

ایک دن میں انار کلی بازار سے مزنگ جا رہا تھا میں نے دیکھا کہ بازار سے خاکساروں کا ایک جیش گزر رہا ہے، وہ دِلّی مسلم ہوٹل کے سامنے جا کر رُک گیا، اور اُس میں سے ایک خاکسار نے اذان دی، وہیں سے ایک گھنی ڈاڑھی والا خاکسار خود سامنے آکر امام ہو گیا، دونوں طرف کی ٹریفک رُک گئی اور خاکساروں نے بیلچے سامنے رکھ رکھ کر نماز کی نیّت باندھ لی، مَیں کھڑا دیکھتا رہا وہ نماز پڑھ کے آگے بڑھ گئے اور مَیں ایک گہرا تاثر لئے ہوئے گھر پہنچا، مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ خاکساروں کی قدموں کی آہٹیں اور قدم مِلا کر چلنے کی آواز میرے دل پر اب تک اُسی طرح ہے، اُن میں ہر شخص کے پاس وہ کان تھے جو نگاہوں کو سُنتے تھے اور وہ آنکھیں تھیں جو پلکوں کے کانٹوں میں خلوص و عزائم کو تول لیتی تھیں، حقائق و صداقت کی دھونکنی سے اُن کے دل کی آگ بول رہی تھی، اور وہ سراپا جرأت و ایمان کے مجسّمے معلوم ہو رہے تھے۔

میرا ذہنی ماحول ابھی اِس شعلگی کے قوام سے ناآشنا تھا اور میں پہلی بار اپنے سینے میں ایک سیّال مواد کی سنسناہٹ سُن رہا تھا میری آنکھیں اس مردانہ شراب کی مستی اور اُن کے کُھردرے چہروں کی شیرینی سے نامانوس تھیں، میرا واسطہ تو اب تک ایسے شاعروں اور ادیبوں سے پڑا تھا جو راستوں میں چلتے چلتے اور ہوٹلوں میں بیٹھے بیٹھے چھلکنے لگتے ہیں اور ناجنس لوگوں کے ہنگامے اُنھیں داد و تحسین سے

نواز تے ہیں، میری کھوپڑی میں بزرگانِ دین کے اقوال تو گونجتے تھے لیکن ارادوں کے سوتے ہاتھ پاؤں میں نہیں اُترتے تھے، میں رات کو بڑی دیر تک انہی خیالات میں غلطاں پیچاں رہا جب اندھیرے کی ٹھنڈک سے پلکوں پر ذرا نیند اُترنے لگتی تو مجھے خیالات کا تسلسل جھنجھوڑ دیتا، رات گزرتی جارہی تھی اور مجھے اپنی پلکیں کانٹوں کی طرح سخت معلوم ہورہی تھیں، یونہی خدا خدا کرکے صبح ہوئی۔

مجھے کبھی میرے تندرست یقین اور توانا جسم نے نا اُمیدی کے دریا میں نہیں دھکیلا، میں ہمیشہ مسافروں کے چہروں سے اُن کے حوصلے پڑھنے کی کوشش میں رہا اور ساحلوں سے طوفانوں کے مزاج پہچاننے کی سعی کی، چنانچہ اُس رات کی مسلسل جگار سے یہ خیال پختگی کی حدود کو چھونے لگا کہ غالباً یہی جماعت پس ماندہ طبقے کے لئے کوئی مفید کام کرے گی اور اسلامی شعار کی توسیع و اشاعت انھیں لوگوں کے حصے میں آئے گی، لیکن دِل نہ ٹھکا، کیونکہ میں کئی بڑبولے لیڈروں اور دودھ کی طرح اُبل کر بیٹھنے والی جماعتوں کو دیکھ چکا تھا۔

خاکساری کی تحریک تھی کہ بن کی آگ کی طرح پھیلتی جارہی تھی، اس میں شریک ہوکر بڑے بڑے سرکش اور کج کلاہ خدمتِ خلق میں مصروف نظر آتے تھے اور رات دن گلیوں میں چپ راست چپ راست کی گونج درو دیوار کے دل ہلارہی تھی جن لوگوں کی زندگیاں لہو ولعب میں گزرتی تھیں اور حرام روزی ان کا شعار ہوچکا تھا، وہ تحریک میں آکر سچے مسلمان بنتے جارہے تھے اور جان و مال کی قربانی سے کسی کو گریز نہ تھا، بیواؤں اور یتیموں کی خدمت، کمزوروں سے تعاون، اور پس ماندہ طبقے سے خلوص اس جماعت کا قانون تھا، ہر مصیبت زدہ اور کمزور انسان ان کا سہارا ڈھونڈھتا اور جو خاکساری سے پہلے جرائم پیشہ تھے وہ صاحبِ باطن لوگوں کی طرح معاملات طے کرتے نظر آتے تھے۔

یہی ایک جماعت تھی جو مسلمانوں کو پیغمبرِ خُدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی طرف لے جا رہی تھی۔ ہر آدمی دُوسرے آدمی کو خون کے رشتے کی طرح عزیز سمجھتا اور امداد کرتا تھا، مَیں اپنی محدود فکر سے جب بھی غور کرتا تو مجھے صدیوں کے فاصلوں میں کسی ایسی مخلص اور جاندار جماعت کا وجود نظر نہ آتا تھا، ہر آدمی اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح جلد از جلد موجُودہ معاشرے کو ایسا خوش رنگ و خوش حال بنا دیا جائے کہ نیکی، ایثار اور جہاد کا چلن عام ہو جائے۔

چنانچہ مَیں خاکسار جماعت میں شامل ہو گیا۔ شرکت سے میرا تصوّر خدمتِ خلق کے علاوہ یہ بھی تھا کہ میں ایک گنہگار انسان ہوں اور اس جماعت میں قدم قدم پر شہادت کا قوی امکان ہے، اگر قسمت سے یہ سعادت میسّر آگئی تو قبر کے عذاب سے چھٹکارا مل جائے گا اور زندگی بھر کے ولدّر دُور ہو جائیں گے۔

مَیں نے چند روز کی کدوکاوش اور دماغ سوزی کے بعد اپنے دوست حبیب اللہ خاں سعدی کو بھی خاکسار بنا لیا۔ انہی دنوں مَیں نے "نغمہ جہاد" کہا جو خاکساروں میں بڑا مقبول ہُوا اور زمزمۂ راہ کے مقام تک پہنچا۔

حبیب اللہ خاں سعدی ایسے ایمان کے جوش میں آئے کہ اُنھوں نے اپنا "قلعہ پھلور ضلع جالندھر" تمام خاکساروں کے سپرد کر دیا اور وُہ خاکساروں کا بڑا اہم مرکز بن گیا، بڑے بڑے شقی القلب اور سنگ دل قسم کے لوگ جن کی رُوحیں کالی پڑ چکی تھیں اور محسن کُشی کے علاوہ دوست آزاری اور جبر و تشدّد اُن کا روزمرّہ کا مشغلہ قرار پا چکا تھا، وُہ سب راہِ مستقیم پر آتے جا رہے تھے۔ اُن کے سامنے ہر وقت اپنے پیغمبر کا اسوۂ حسنہ تھا، اور مجاہدین کا منشور۔

ابھی کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ حبیب اللہ سعدی اَور میں سالاری کے عہدے کے انسان قرار دے دیئے گئے، خیر حبیب اللہ خاں کا تو ڈیل ڈول تھا

اور ساتھ ہی ایثار و منزلت بھی اور اس کے علاوہ تعلیمی لحاظ سے بھی وہ انگریزی، عربی فارسی اور اردو میں کسی سے ہیٹے نہیں تھے، اُن کا سالار ہو جانا تو کوئی بات نہیں تھی، لیکن میں سوچتا رہا کہ یہ مجھے "سالارِ ضبط" کس خوشی میں بنا دیا گیا۔ کہیں یہ ساری جماعت مجھ جیسے لوگوں کی جماعت تو نہیں؟ لیکن پھر معلوم ہُوا کہ میری دونوں نظمیں "خاکسار کی نماز" اور "نغمۂ جہاد" میری سفارش کے لئے بہت تھیں اسی بنا پر مجھے ضبط کی تفویض ہوئی ہے۔

اُسی وقت سے جاہل صوفی جعلی زاہد، فریبی پیر اور ریاکار عالم میری نظروں سے نکل گئے اور آج بھی جو کتاب و سنّت کا تارک ہے وہ میری نظر میں رہنمائی کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ جب کوئی جُبّے قُبّے والا بہروپیا میرے سامنے بزرگی بگھارتا اور جھوٹے حال و قال کے تشنج کو سعادت قرار دیتا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میری رُوح پر نیلی روشنائی انڈیلی جارہی ہے کیونکہ اُن کی باتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قبر کا آرام اور جنّت کی آرائش سب کرائے کی چیزیں ہیں عملِ صالح کا زندگی میں کوئی مقام نہیں، اسی قسم کے بعض لوگوں نے کربلائے مُعلّیٰ کے سانحے کے بعد حق کی حمایت کو ناممکن قرار دے کر شہادت کے راستے میں پھاٹک لگا دیئے اور مسلمانوں کے دلوں کو حضرت حسین رض کی محبّت کے شعلوں سے خالی کر دیا، اُنھیں یہ خبر نہیں کہ آنسوؤں کے کھاری پانی سے شہیدِ کربلا کی کھیتی کی آبیاری اور پیروی کا حق ادا نہیں ہوتا، اُن کا مشن تو جہاد فی سبیل اللہ تھا، جس کی تبلیغ ہر عاشقِ حسین پر فرض قرار پاتی ہے۔

ایک اُستاد

مزنگ میں ٹیمپل روڈ پر جس ٹال پر میرا اُٹھنا بیٹھنا تھا اُس کے پاس ایک مستری کی دُکان تھی جو سائیکلوں کی مرمّت کرتا تھا، نو نو، دس دس سال کے دو بچے مستری کی شاگردی میں دن بھر سائیکلوں میں ہَوا بھرنے اور معمولی قسم کا کیل کانٹا درست کرنے میں لگے رہتے تھے، ان میں ایک تو بڑی توجہ اور

محنت سے کام کرتا تھا اور مستری غالباً اُسے کچھ ماہانہ بھی دیتا تھا۔ لیکن دُوسرا عمر میں اپنے ساتھی سے بڑا لیکن قد میں کم، گٹھا ہُوا جسم اور ہاڑ گوڑ کا مضبُوط، یہ ابھی تھوڑے ہی دنوں سے مستری کی شاگردی میں آیا تھا اور اس کے والدین کو مستری نے یقین دلایا تھا کہ وُہ چھ سات مہینے میں تنخواہ کے قابل ہو جائے گا۔ لیکن یہ لڑکا کچھ توجہ سے کام نہ کرتا، کبھی تو دکان پہ دیر میں آتا اور کبھی بالکل ہی غائب رہتا، جھُوٹ بولنے میں اس قدر چابک دست تھا کہ اس کے والدین اور مستری کو ہفتوں اُس کے جھُوٹ کا پتا نہ لگتا اور جب پندرہ بیس روز میں اس کا باپ اپنے بیٹے کے متعلق کام کی رفتار کے بارے میں پُوچھتا تو اس کی غیر حاضریاں اور بہانہ سازیاں کھُلتیں تو دونوں بزرگ حیران رہ جاتے۔

جب مستری نے یہ دیکھا کہ یہ دکان سے ناغہ کرتا ہے اور دل لگا کر کام نہیں کرتا تو اُس نے سزا دینا شروع کر دی۔ مستری کبھی تو اُسے لوہے کی سلاخوں سے مارتا اور کبھی کان پکڑوا کے مرغا بنا دیتا اور گھنٹوں اپنے سامنے رکھتا۔ مگر وُہ لڑکا کسی صورت میں بھی اپنی عادت سے دست بردار نہ ہُوا، بعض بعض اوقات تو مستری اُسے اس بے دردی سے پیٹتا کہ آس پاس کے دکاندار آ کے چھُڑاتے اور اس کے بدن پہ نیل پڑ جاتے، لیکن وہاں یہ حال تھا کہ جتنی سزا ملتی اُسی قدر اُس کی سخت جان شرارت اور غیر حاضری میں اضافہ ہو جاتا۔

ایک دن مستری نے اس کی دونوں ٹانگوں میں رسّی باندھ کر ایک ریڑھے کے پیچھے باندھ دیا اور ریڑھے والے سے کہا کہ گھوڑا بھگائے ابھی ریڑھ چوک تک ہی گیا تھا کہ راہگیروں نے ترس کھا کے مستری کی منت سماجت کی اور رسّی کھُلوا دی، اتنے عرصے میں اس کی کمر کئی جگہ سے زخمی ہو چکی تھی، سب کے سامنے اُس نے اقرار کیا کہ اب کبھی کام سے نہیں بھاگے گا، لیکن ابھی آزادی کو ایک گھنٹہ بھی نہیں ہُوا تھا کہ آنکھ بچا کر

دے کر پھر فرار ہوگیا۔

تیسرے دن مستری بمشکل تمام اُسے کہیں سے ڈھونڈھ کر لایا اور دکان کے پاس والے پیپل کے تنے پر اُس کا کان رکھ کر پاڑچی میں کیل ٹھونک دی، لڑکا تھوڑی دیر تو بلبلایا اور پھر خاموش ہُوں نہ ہاں آنکھیں بند کئے اسٹیچو کی طرح کھڑا ہوگیا، مگر کان کی لَو سے خُون کے قطرے اُس کے میلے کچیلے کُرتے پر گِر رہے تھے، تھوڑی دیر میں مخلوق کا ہجوم ہوگیا اور کئی لوگوں نے مستری کی خوشامد درآمد کرکے اُس کے کان سے کیل کھنچوا دی اور وہ پھٹے ہُوئے کرتے سے کان پُونچھتا ہُوا دکان پر آگیا۔

اگرچہ مستری نے اُسے یہ کہہ کر چھوڑا تھا کہ اگر اگلی بار تو بھاگا تو حضرت عیسےٰؑ کی طرح تیرے ہاتھ پاؤں میں کیلیں ٹھونکوں گا لیکن اس کے باوجود وُہ شریر پھر بھاگ نکلا اور دو روز غائب غُلّا رہا، تیسرے دن اُس کا باپ اُسے لایا اور مستری نے اُسے اُس کے باپ کے سامنے یہ سزا دی کہ اس کا سر منڈوا کے کالا مُنہ کیا اور گلے میں رسّی باندھ کر محلّے کے بچّوں کو اکٹھا کرکے رسّی اُن کے ہاتھ میں دے دی، بچّے اس کی رسّی پکڑ کر مختلف للکاروں کے ساتھ تمام بازار میں گھسیٹے پھرے اور اس کی چاند پر چپت لگا لگا کر طبیعت جھک کر دی، واپسی پر وہ اس طرح بیٹھا تھا جیسے بندر تمام دن ناچ ناچ کر تھک گیا ہو، اُس کی نظر زمین سے نہ اُٹھتی تھی۔

اُس کے بعد وہ کام سے نہیں بھاگا، اور اب سُنا ہے کہ وُہ بہت بڑا مستری ہے اور اُس کے دسیوں بیسیوں شاگرد ہیں۔

میری شاعری کا ایک دَور

میری شاعری میں ایک دَور ایسا بھی آیا کہ مجھے حقیقت پسند حکام اور معززین نے اپنی مخصوص نشستوں میں مدعو کیا اور انھوں نے مجھ سے مزدوروں اور کسانوں کے متعلق ہی نظمیں سُنیں اُن میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو صحیح معنوں میں شعر اور روحِ شعر

کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور اشارتاً و کنایتاً مجھے میری خامیوں سے بھی آگاہ کرتے اور میں اظہارِ ممنونیت کے ساتھ اپنی اصلاح کر لیتا۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جنھیں میں صاحب علم و فن خیال کرتا تھا لیکن وہ میری شاعری پر ہونٹ بچکا بچکا کر اور پیشانیوں پر بل ڈال ڈال کر مجھے اپنی اصلاح کی طرف متوجہ کرتے تھے۔

اِن صاف شفاف اور مہذب مجلسوں سے اُٹھ کر جب میں گھر آتا تو اپنے گھر کا وہی عالم دیکھتا کہ کہیں دال سے لت پت ڈوئی چولھے سے لگی کھڑی ہے۔ کہیں چھنکتی چمٹے میں بھینچی پڑی ہے کہیں لوٹے میں ساگ کے پتّے تیر رہے ہیں، اور کہیں مُرغا بالٹی پر چڑھا بیٹھا ہے اور پاس ہی ایک دھواں دیتی ہوئی لکڑی آٹے کی تغاری میں جھکی پانی پی کر زور زور سے سسکیاں لے رہی ہے۔ جہاں اس سے جہالت اور فلاکت مترشح ہوتی وہیں معاً یہ خیال بھی ہوتا کہ انسانوں میں تین طبقے ہیں ایک تو وہ جو عقبیٰ کے کُلیّے پر یقین نہیں رکھتا اور رکھتا ہے تو صرف دکھاوے کے لئے، یہ اخلاق سے محروم، انصاف سے معرّا، رحم دلی سے خالی اور سرتاسر خبیث کی زندگی گزارتا ہے وہ حکومت کا خاموش دوست اور عوام کا کُھلا دشمن ہے۔

دُوسرا پس ماندہ طبقہ، مزدُوروں، کسانوں، چپراسیوں، چوکیداروں اور خوانچے والوں پر مشتمل ہے جو مذہب کے احکام، حکومت کے قوانین اور حکّام کی برتری کو آنکھیں بند کر کے مانتا چلا جارہا ہے لیکن روز بروز ایسی گندی گہرائیوں میں کھِسک رہا ہے کہ اُسے اپنے گرد و پیش ایک زر و غبار کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا، اُنھیں سانس لینا بھی دشوار ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ دُنیا بھر کے کاروبار اِسی طبقے کے خون سے چل رہے ہیں۔ لیکن بڑے لوگ ہیں کہ دولت کے پندار میں اپنے اِن آلاتِ زرگری کی حفاظت اور دیکھ بھال بھی نہیں کرتے اور اِن کی زبوں حالی کی طرف سے آنکھیں بند کئے کسبِ زر میں مصروف ہیں حالانکہ ہر صنعت گر

اپنے آلاتِ کار کو زنگ آلود نہیں ہونے دیتا اور صفائی کا خیال رکھتا ہے۔

تیسرا طبقہ وہ ہے جس میں سفید پوش شرفا ہیں جو غیرت کے باعث کہیں دستِ سوال نہیں پھیلاتے اور قلیل آمدنیوں میں اُن کا گزارہ نہیں ہوتا، قدم قدم پر رسم و رواج اور روایات کی دلدل اُن کے لئے سوہانِ رُوح بنی ہوتی ہے اُن کے دن پسینے میں شرابور اور راتیں فکر مندی میں گزرتی ہیں، اصلاح و ترقّی کا میدان اِس طبقے کے سامنے ہے مگر ان کی ناکامی کی ذمّہ داران کے آقاؤں کی نیّتیں اور سرکار کی پالیسی ہے اِس سفید پوش طبقے میں سے بعض سخت جان سربھر کے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور پھر اپنے حقوق حکّام بالا کے جبڑوں میں چمٹا ڈال کر نکالتے ہیں اور خود بھی ویسے ہی ہو جاتے ہیں اور بعض اپنی کوششوں میں ناکام ہو کر نچلے طبقے سے خونی انقلاب کی نیوکھُدواتے ہیں مگر پورے معاشرے کو متاثّر کرنے سے اس لئے معذور ہیں کہ اُن کی پشت پناہی پر بھرپور علمی اور فکری دماغ نہیں ہوتا اور اسی خوف سے بلند مقام طبقہ ملک میں تعلیم کو عام نہیں ہونے دیتا، میں نے خود کو اِسی چھوٹے طبقے میں سے محسوس کیا لیکن اس فکر میں رہا کہ کسی طرح پُورے معاشرے پر اپنی اعضا شکنی طاری کر دُوں۔ میرا خیال تھا کہ اگر جُہلا کے طبقے کو تعلیمی ہتھیاروں سے لیس کر کے محاذ پر سامنے لایا جائے تو ملک، قوم اور انسانیت کو خاطر خواہ فائدہ پہنچے گا لیکن پھر سوچتا اور جگہ جگہ راہ میں لوہے کے پھاٹک لگے دیکھتا تو اُس دَور کی شکست کے امکانات کے فاصلے طویل ہو جاتے اور میں دل مسوس کر رہ جاتا، ملک میں کوئی جماعت ایسی نظر نہیں آتی تھی جو خلوصِ نیّت سے عوام کا بھلا چاہتی ہو اور پس ماندہ طبقے کے لئے کوئی بہبُود کی راہ سوچتی ہو، اُس وقت تو نہیں لیکن میں اب محسوس کرتا ہوں کہ آزادی کے خیالات کو پیدا کرنے اور پھیلانے میں جہاں اور لوگوں کے دل و دماغ کام آئے ہیں وہاں میری نظموں نے بھی تاریک راستوں سے اندھیرے صاف کئے ہیں، اگرچہ آزادی پسندوں کی مخالفت

میں بڑے بڑے پتھروں نے راستے روکے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بصیرت اور خلوص بڑی قوتیں ہیں۔

آج بھی ہر سیاسی شعبدہ باز اسی درمیانہ درجے کے چوک میں اپنی ڈگڈگی بجاتا اور ہر سپیرا یہیں اپنا پٹارا کھول کر بین کا لہرا شروع کرتا ہے جس سے گلی محلے کے سنپولے مست ہو جاتے ہیں لیکن یہ معصوم طبقہ اس سے بے خبر ہے کہ سانپ کا ڈسا ہوا تو دوا دارو یا جھاڑ پھونک سے بچ بھی جاتا ہے لیکن ان سپیروں کا ڈسا ہوا پانی نہیں مانگتا، اور ان سپیروں کے بڑے بڑے ادارے مختلف ناموں سے دنیا میں اپنا زہر پھیلاتے پھر رہے ہیں، کاش کوئی رائی کا پہاڑ[1] بنا کر ان پر حملہ آور ہو جائے۔

بلیا کا مشاعرہ

جہاں تک شعر و شاعری کا تعلق ہے میری شہرت ہندوستان کے گوشے گوشے تک پہنچ چکی تھی اور جہاں بھی کوئی وسیع مشاعرہ ہوتا اراکین مشاعرہ مجھے بھی بلاتے جہاں ایک بار شرکت کر لیتا وہاں بار بار بلایا جاتا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جب میں لاہور سے عازم سفر ہوتا تو تاریخ وار دعوت نامے مرتب کر کے چلتا اور واپسی مہینے مہینے دو دو مہینے کے بعد ہوتی۔ انہی دنوں مجھے فیض آباد سے بلیا کے مشاعرے کی دعوت ملی اور میں انور صابری[2] کی معیت میں ہنستا بولتا اور جبّوں قبّوں کے پس منظر پر غور کرتا بلیا پہنچ گیا۔

انور صابری حالانکہ ایک باغ و بہار قسم کے آدمی ہیں اور مشاہدہ ہے کہ اکثر شعراء اُن سے کلام سنتے ہیں ان کا گنجان ڈاڑھی سے جھانکتا ہوا چہرہ اور لحیم و شحیم جثہ پہلی

---

[1] تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ اگر بڑے سے بڑے سانپ پر رائی کا حصار کھینچ دیا جائے تو وہ اسے عبور نہیں کر سکتا اور وہیں محصور ہو کر رہ جاتا ہے۔

[2] انور صابری صاحب دیو بند کے رہنے والے متعارف کرداروں میں ایک ہیں، جنگ ہند و پاک میں یہ اپنی حکومت کا پروپاگنڈا کرنے میں پیش پیش رہے ہیں اُنھوں نے جو ہندوستان کی قلم دشمن سے مدد کی ہے وہ اُن کی وفاداری کا ایسا کارنامہ ہے جس پر خود ہندوستان کو بھی فخر ہونا چاہیے۔

ملاقات میں تو رعب طاری کر دیتا ہے مگر جب صابری صاحب موج میں آتے ہیں اور مختلف شجروں کے شعر سناتے ہیں تو وہ مرعوب کُن نہیں رہتے بلکہ مسرور کُن ہو جاتے ہیں

جاتے ہی مجھے مشاعرہ کے ارباب بست وکشاد نے خان بہادر نذیرالدین ایڈووکیٹ کے بنگلے پر بھجوا دیا۔ خان بہادر نذیرالدین بلیا میں عجیب و غریب شخصیت کے حامل تھے اُن کے لڑکے اچھی اچھی ملازمتوں پر فائز تھے اور وہ خود ایک بنگلے میں اپنے سات آٹھ نوکروں کے ساتھ اکیلے رہتے تھے۔ سارے نوکر غالباً اُن کا جراتی کا انتخاب تھا کیونکہ میں نے یہ دیکھا کہ کبھی خان بہادر صاحب نوکروں کو دھمکا رہے ہیں اور کبھی نوکر خان بہادر پر برس رہے ہیں اور پھر پانچ دس منٹ کے بعد دونوں میں سے کسی کی پیشانی پر شکن نہیں۔

وکالت میں جو کچھ شام تک حاصل ہوتا دوسرے دن کے لئے نہ رکھتے کئی بار یہ ہوا کہ ناشتے کے لئے کچھ نہ بچا تو خان بہادر نے بار روم میں نوکر بھیج کر کسی سے ادھار روپیہ منگا لیا اور پھر اس میں سے بقدر ضرورت آٹا اور مسور کی دال آئی اور سب نے خوشی خوشی بیٹھ کر کھائی۔

جب کسی نوکر کو دو چار روپے کی ضرورت پڑتی وہ خان بہادر صاحب سے آنکھ بچا کر دیگچی یا صحنی فروخت کر دیتا۔ ادھر نوکر روپیہ لے کر آتا اُدھر بنیا برتن لے کر خان بہادر کے پاس پہنچ جاتا اور طوعاً و کرہاً خان بہادر اُس کا روپیہ ادا کرتے۔

جب وہ نوکر کو گھر سے نکالنے کی دھمکی دیتے تو نوکر کہتا کہ جناب جب میں نوکر ہوا تھا تو ہم دونوں ضرورت مند تھے آپ ایک نوکر کے اور میں ایک آقا کا، آپ کا یہ ایک طرفہ فیصلہ ہرگز قبول نہیں ہوگا۔ علیحدگی تو اب اُس وقت ہوگی جب میں اس گھر سے نکلنے اور آپ نکالنے میں ہم آواز ہو جائیں گے؛ ورنہ جس طرح رہ رہے ہیں اسی طرح رہیں گے خان بہادر صاحب خاموش ہو جاتے اور محبت بھری ہنسی ہنسنے لگتے۔

جب میں خان بہادر صاحب کے یہاں مقیم ہوا تو اُنھوں نے جاتے ہی چائے

تیّار کرائی۔ مَیں نے ساتھ پینے کو کہا تو فرمایا آپ اکیلے پئیں مَیں تو ملازموں کے ساتھ پیوں گا۔ مَیں نے کہا ملازموں کو بھی بُلوالیں تو فرمایا آپ سے شرمائیں گے اور بے تکلفی سے نہیں پی سکیں گے۔ مَیں خاموش تو ہوگیا مگر سوچتا رہا کہ یہ عجیب قسم کا انسان دیکھنے میں آیا ہے کچہری میں وکیل ہے گھر پر مخیّر درویش دوستوں میں قابلِ اعتماد دوست اور یتیموں اور مسکینوں میں فراخدل اور سخی۔

رات کو مشاعرہ منعقد ہُوا تو معلوم ہُوا کہ یہاں تو اچھّے سخن فہم اور صاحبِ ہوش و ادراک لوگ رہتے ہیں اچھّے شعر پر دادِ تحسین اور ہلکے شعر پر خاموشی مشاعرے کے اختتام تک جاری رہی۔ دو بجے شب کو بخیر و خوبی مشاعرے کا اختتام ہُوا۔ انور صابری صاحب جب کندھے پر کمبل ڈال کر باہر نکلے تو پانچ سات مُرید قسم کے معتقدوں نے اُنھیں آلیا اور بہت دُور تک ایسی ایسی الکائش بالی سُنی کہ خُدا کے عذاب سے دل ڈرنے لگا۔

مَیں خان بہادر کے بنگلے پر پہنچا تو تمام نوکر چارپائیوں پر خرّاٹے لے رہے تھے صرف خان بہادر صاحب کی چارپائی خالی تھی جو اُنھوں نے مجھے عنایت کردی اور خود یہ کہہ کر چلے گئے کہ مَیں دُوسری طرف صحن میں جاکر سوتا ہُوں۔

علی الصبح جب میں اُٹھ کر غسل خانے گیا تو دیکھا کہ خان بہادر صاحب غُسل خانے میں زمین پر سو رہے ہیں اور نہانے کے کپڑے کا تکیہ لگا رکھا ہے میں اُلٹے پاؤں صحن میں آگیا اور سوچنے لگا کہ آخر یہ خان بہادر صاحب ہیں کیا؟ ایک شخص میں اتنی خُوبیاں کیسے جمع ہوگئیں؟

جی چاہا کہ خان بہادر صاحب سے کچھ دیر گفتگو ہو مگر خان بہادر صاحب نے آخر وقت تک مجھے تخلیہ نہیں دیا۔

بلیا کے لوگوں کا خلوص اور محبت کیا کہوں؟ دو ہی روز میں وہ میرے جذبات پر اس قدر چھا گئے کہ مَیں بلیا سے چلا تو آنسو نہ روک سکا صبر و ضبط کے باوجود میری

ہچکی بندھ گئی اور خیال ہوا کہ دُنیا انسانیت کی کس قدر پیاسی ہے۔ غریب اپنے اخلاق کی روشنی میں چھوٹے چھوٹے اخلاقی نکتوں کو کس قدر اندراج کر لیتے ہیں اور مجھے یہ کس قدر زیادہ سمجھ گئے ہیں۔

ساحر قدوائی

رسالہ "شاہد" بریلی میں میری کچھ نظمیں، غزلیں چھپیں تو اس کے مدیر جناب ساحر قدوائی سے قلمی مراسم ہو گئے، اور یہ قلمی راہ و رسم اس قدر بڑھی کہ روحوں کی حقیقی کشش کے ساتھ اشتیاقِ ملاقات نے میلوں کے فاصلے مسترد کر دیئے۔ اکثر اوقات میں جب لکھنؤ، فیض آباد یا پرتاب گڑھ یا کلکتہ کے مشاعروں میں جاتا تو بریلی اُتر پڑتا اور ایک ایک ہفتہ قیام رہتا۔

جناب ساحر پہلی بار ملے تو یک ملاقات اُن کے جوہر نہ بولے، لیکن دُوسری ملاقات پر اُن کی شرافت اور مسافر نوازی نے مجھے اپنا گرویدہ بنا لیا، اب مستقل اور بے تکلّف آنا جانا ہو گیا، وُہ قدیم معاشرے کے آدمی ضرور ہیں لیکن نئے دور کی آزاد خیالی سے بھی محروم نہیں۔ اس لئے ہم اور بھی جلد آپس میں قریب ہوتے چلے گئے، ہوتے ہوتے عزیزوں کی طرح اعتبار و اعتماد ہو گیا جب میں وہاں ہوتا تو ساحر اور اُن کا چھوٹا بھائی شجاع اللہ خاں اور بہن نیلم آدھی رات تک دُنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو کرتے۔

نیلم پڑھی لکھی خاتون اور ایسے علمی خاندان کی پرورش یافتہ تھی جہاں دن رات شعر و ادب کے علاوہ فلسفہ و حکمت اور نفسیات و قانون کے دُھواں دھار مباحثے رہتے تھے جب وُہ کسی مسئلے پر اَڑ بیٹھتی تو گھنٹوں ذہنی قلا بازیوں پر قلا بازیاں رہتیں، اُدھر شجاع قانون کا طالب علم اور بلا کا ذہین و فطین نوجوان اور شعر و ادب کے ذوق نے تو اُسے پر ہی لگا دیئے تھے۔ گفتگو میں جب وُہ کسی موڑ پر بگڑتا تو بحث کرتے کرتے مجھے پسینے آجاتے اور یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ یہ لڑکا جب زندگی

میں داخل ہوگا تو کیا قیامت ڈھائے گا، شجاع اللہ اب تک ہر کلاس میں اوّل رہتا چلا آ رہا تھا اور پھر ایل ایل بی میں بھی اس کی یہی پوزیشن رہی۔

ان کے یہاں آنے جانے والوں میں شفیع احمد خاں اُمید بریلوی، اکرام حسین، امتیاز علی خاں وغیرہ سے بھی ملاقات رہتی تھی، یہ لوگ بھی بڑے خلیق اور ملنسار انسان تھے، انہیں کے یہاں عبدالواحد خاں سے پہلی ملاقات ہوئی، جو روزِ اوّل کی طرح آج تک تازہ و شگفتہ ہے، واحد توقع کے خلاف لنگوٹی میں پھاگ کھیلنے والا بڑا آزاد اور یار باش قسم کا انسان نکلا، میں اب بھی جب کراچی جاتا ہوں تو وہاں کی حاضری کے بغیر سکون نہیں ہوتا یہیں میری ملاقات سید مصطفیٰ علی اخضر سے بھی ہوئی جن سے میں نے فنِ بنوٹ سیکھا۔

عبدالواحد خاں اگرچہ اُن دنوں طالب علم تھا لیکن اس کا ادبی ذوق اس کی منزلوں کا پتا دے رہا تھا، جب وہ ذرا نزدیک سے ملا تو اُس میں کچھ ایسی خوبیاں نظر آئیں، جو عموماً تحصیلداروں کے بچوں میں ناپید ہوتی ہیں، مجھے اچنبھا سا تھا، کہ عبدالواحد ایسا کیوں ہے لیکن جب میں اس کے والد رشید احمد خاں تحصیلدار سے ملا تو میری حیرت اطمینان میں بدل گئی، وہی پرانی تراش خراش کے سیدھے سادے بزرگ اور اپنے کام میں نہایت چابک دست، غریبوں کے لئے مخیّر اُمرا کیلئے بڑے تنک مزاج کم آمیز اور کم گو! اگرچہ انگریزی حکومت کی پالیسی ایسی شرافت اور نیک نیتی کی مقتضی نہیں تھی مگر یہ بندۂ خدا اپنی طرز کے عجیب و غریب انسان واقع ہوئے تھے، جب دُنیاوی فرائض سے فرصت ملتی، یادِ الٰہی میں مشغول ہو جاتے، اور آخری وقت تک اتقا کا دامن نہ چھوڑا۔

جناب ساحر کی محفلوں میں عبدالواحد بھی شامل ہونے لگا اور اُسی مذاق میں ڈھل گیا۔ وہ دوستوں کے لئے ایثار پسند مگر مغرور لوگوں کے لئے منہ پھٹ انسان ہو گیا۔ اور اسی آزادہ روی اور دوست نوازی نے اُسے اقتصادی طور پر اُبھرنے نہیں دیا۔ آج کل وہ کراچی میں مقیم ہے۔ بیماری کے باعث قبل از وقت ریٹائر ہو گیا ہے، مگر آج

ف سید مصطفیٰ علی اخضر نے مجھ سے فنِ شاعری اور میں نے اُن سے فنِ سپہ گری میں استفادہ کیا ہے۔

بھی اُن کا وہی خلوص و محبت کا رویہ اپنی جگہ ہے۔

ساحر جہاں نثر اچھی لکھتے تھے وہاں شعر بھی اچھا کہتے تھے لیکن اب مصروفیت کے باعث شعر و ادب کے حلقے سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ ساحر کے والد عتیق اللہ خاں اعلیٰ پائے کے طبیب اور ایک عالم باعمل تھے، مَیں نے باعمل اس لئے کہا ہے کہ ان کا کوئی قدم مذہبی قیود سے باہر نہیں نکلتا تھا۔

ایک دفعہ ساحر کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل گئی جس سے الحاد کا پہلو نکلتا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ساحر جیسے عزیز بیٹے کو چھوڑ کر میرے غریب خانے پر چلے آئے، غالباً ایک ماہ کے بعد بڑی مشکل سے صلح صفائی کرائی، آزادی کے بعد بھی وہ لائل پور میں ساحر سے علیحدہ لائل پور کاٹن ملز کے سامنے "شفاگاہ" کے نام سے مطب کرنے لگے تھے، اُن کے مطب کی خصوصیت یہ تھی کہ اُن کا کوئی نسخہ دہ آنے سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا، اُن کا کہنا تھا کہ اس ملک کا مزدور اس سے زیادہ رقم کا متحمل نہیں ہو سکتا یہی سبب تھا کہ اُن کے مطب میں مزدوروں کا ہنگامہ رہتا۔ وہ خوشی خوشی اُن کی نبضیں دیکھتے، دوائیں دیتے اور اس خدمت خلق کو عبادت سے تعبیر کرتے، میرے دل میں اُن کی بڑی قدر و منزلت تھی، اور میں اُنھیں ایک صاحب باطن انسان خیال کرتا تھا، اُنھوں نے یوں ہی صحت تقسیم کرتے کرتے وفات پائی، اب میں جب کاٹن ملز کی طرف سے گزرتا ہوں تو اُن کی صورت سامنے پھرنے لگتی ہے۔

نیلم کی سیاسی رہنمائی

خاکسار ہو کر جب میں بریلی میں جناب ساحر قدوائی کے گھر گیا تو نیلم نے مجھے خاکساروں کی وردی میں دیکھ کر پوچھا "احسان صاحب کیا آپ بھی خاکسار ہیں؟"

مَیں:۔ "کیا خاکساری آپ کی نظر میں بُری بات ہے؟"

نیلم:۔ "ہر شریف انسان خود کو از راہِ عجز خاکسار کہتا ہے لیکن جماعتی طور پر

خاکسار بن جانا میری سمجھ سے باہر ہے۔"

میں :- "اس میں سمجھ میں نہ آنے کی کونسی بات ہے۔ سیدھی سادی اسلامی تحریک ہے۔"

نیلم :- "اسلام کی موجودگی میں اسلامی تحریک کی کیا ضرورت ہے؟ کیا ہدایت کے لئے قرآن کے احکام اور حدیث کی وضاحت کافی نہیں؟"

میں :- "یہ ایک طرح سے اسلام ہی ہے چونکہ اس دور کے لوگوں نے اسلام سے جہاد کو بالکل ہی الگ سا کر دیا ہے۔ اس لئے جہاد کی اہمیت کو عام کرنے اور اس کا موقع و محل بتانے کے لئے یہ تحریک وجود میں آئی ہے۔"

نیلم :- "اگر ایک انسان سچا مسلمان ہے تو کیا موجودہ دور میں اس کے لئے جہاد ناگزیر نہیں؛ جبکہ انسان اپنی ذراسی چیز کے لئے لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔"

میں :- "یہ تو درست ہے لیکن اکثریت ایسے مسلمانوں کی ہے جو جہاد کی عظمت اور اس کے محل کے علاوہ آئین و ضوابط سے مطلق آشنا نہیں۔ اور جو جانتے ہیں، وہ چشم پوشی کرتے ہیں۔"

نیلم :- "کیا آپ انھیں مسلمان کہیں گے؟"

میں :- "ہاں! ہیں تو وہ مسلمان، یہ اور بات ہے کہ تمام شرائط پہ پورے نہیں اُترتے۔"

نیلم :- "جی، اگر ایسے مسلمانوں کی اکثریت ہے تو کیا پہلے صحیح معنی میں تبلیغِ اسلام کی ضرورت نہیں؛ جہاد کا معاملہ تو وقت کے ہاتھ کی بات ہے۔ جب بھی وہ تقاضا کرے۔ جیسے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پہلے لوگوں کو سچا مسلمان بنایا اور پھر جہاد کا سلسلہ شروع کیا۔"

میں :- "ہم دونوں کام ساتھ ساتھ کر رہے ہیں ایک طرف تو اسلام کی تبلیغ ہے اور دوسری طرف جہاد کی تیاری اور مشقیں۔"

نیلم :۔ "آپ ایمانداری سے بتائیں، کہ آپ کیوں اس جماعت میں شامل ہوئے ہیں، کون سا مفاد پیشِ نظر ہے؟"

مَیں :۔ "میرا معاملہ تو اتنا سا ہے کہ مَیں بڑا گنہ گار انسان ہوں۔ قبر کے عذاب سے ڈر لگتا ہے اور سُنا گیا ہے کہ شہید کا قبر میں حساب نہیں ہوتا۔ اور اس جماعت میں شہادت کا زیادہ امکان ہے۔"

نیلم :۔ "آپ کا خیال تو قابلِ قدر ہے لیکن حکومت خالص اسلامی تحریکوں کو بھی شدید کرا کے سیاسی بنا دیتی ہے اور پھر آپ سوچ لیں کہ اُن کا کیا انجام ہوتا ہوگا۔ یہ دَور تو وُہ ہے کہ سیدھے سادے اسلام کی تبلیغ کریں اور بس! ہر مسلمان یا ہر شخص کو انفرادی طور پہ مسلمان ہونے کی ضرورت ہے اور پھر آپ کا فن تو ایسا آلہ ہے کہ اس کے صحیح استعمال سے ایک صحیح شاعر پیغمبر کا دستِ راست ہو سکتا ہے۔ انسانیت کی تبلیغ تو قیمتی شعر سے بھی ہو سکتی ہے، یہ وہ آلہ ثابت ہو سکتا ہے جس سے آج کے معاشرے کی ہر قدر اور انسانی ضرورت کے ہر رُخ پہ توجہ مبذول کرائی جا سکتی ہے۔ یہ تو انگریز کی تحریک ہے، ورنہ ہزاروں مسلمان انگریز کے خیر خواہ ہوں اور اس کے استحکامِ حکومت میں طُو ند دیں، ناممکن ہے! انگریز کبھی مسلمان کا خیر خواہ نہیں ہو سکتا۔ بچھّو کو آپ ہزار پیار سے رکھیں وہ ڈنگ ضرور مارے گا۔ ممکن ہے ایک وقت ایسا آ جائے کہ ہندو مسلمان کے معاملے میں انگریز کو ثالث کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ انگریز کو ہندو عزیز ہے یا مسلمان؟"

مَیں :۔ "کیا انگریز کو ہندو مسلمان میں کوئی عزیز بھی ہو سکتا ہے؟"

نیلم :۔ "ہاں تقابل میں کسی نہ کسی صورت سے کسی ایک کو دوسرے پہ ترجیح تو دینا پڑے گی خواہ وہ درپردہ ہی کیوں نہ ہو، اور یاد رکھیں کہ اُس وقت ہندو کا پلّہ بھاری رہے گا۔"

میں :۔ "میرے خیال سے تو انگریز کی امداد مسلمان نے زیادہ کی ہے اور اسے مسلمانوں ہی کو اچھا سمجھنا چاہیے۔ وہ ہندو کو کیوں ترجیح دے گا۔ کیا اس لئے کہ ہندو کے مختلف ٹیکسوں سے حکومت کا کاروبار چل رہا ہے، اور مالی منافع ہے؟"

نیلم :۔ "نہیں! بلکہ اس لئے کہ اوّل سے عیسائیت اور اسلام میں آویزش چلی آتی ہے۔ عیسائیوں کی نیتیں خراب اور ضمیر منافق ہیں۔ یہ مسلمان کو کبھی نہیں پنپنے دیں گے۔ تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیجئے جہاں جہاں انگریزوں کا مسلمانوں پر تسلط ہُوا ہے وہاں کے حالات قابلِ اطمینان کبھی نہیں ہوئے۔"

میں :۔ "تو کیا انگریز ہندو کو حکومت سونپ دے گا؟"

نیلم :۔ "آپ تو رفتہ رفتہ لڑنے کے موڈ میں آگئے ہیں۔ دیکھئے اوّل تو کوئی کسی کو حکومت نہیں سونپا کرتا۔ سب پالیسی کی بات ہے۔ لیکن میں کہتی ہوں کہ یاد رکھیں اگر ایسا موقع آگیا تو حکومت ہندو ہی کو دے گا۔ کیونکہ ہندو خود تو حکومت نہیں کر سکتا تاوقتیکہ کوئی طاقت اس کی پشت پناہی نہ کرے تو ایسی صورت میں وہ انگریز سے زیادہ کسی کو بھی پشت پناہی کے لئے موزوں نہیں سمجھے گا۔ اوّل تو ناممکن ہے کہ انگریز مسلمانوں کو ہندوستان کی حکومت سپرد کرے اور اگر ایسا کر بھی دے تو مسلمان صرف انگریز سے رابطہ نہیں رکھ سکتے کیونکہ ان کے اسلامی رشتوں کی بہت سی شاخیں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً عرب۔ چین۔ افریقہ اور دنیا میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں۔"

میں :۔ "تو کیا یہ سب لیڈر بیوقوف ہیں کہ دن رات گلے پھاڑ پھاڑ کر اپنی جانیں کھپا رہے ہیں؟"

نیلم :۔ "میں کیوں کسی کو بیوقوف کہوں۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ انگریز نہایت زیرک اور وقت شناس قوم ہے۔ تمام ملک سے ایسے آدمی چُن لیتی ہے کہ جو کسی

بھی فرقے یا مذہب سے متعلق کیوں نہ ہوں عیسائیت کے دماغ سے سوچنے لگتے ہیں۔ آپ اِسے یوں سوچیں کہ یہاں کا معمولی بدمعاش یا تیسرے درجہ کا غنڈا یا دس بیگھے کا زمیندار کوئی بھی ہو اپنے دُشمن کو زندگی سے محروم کر دینا چاہتا ہے تو کیا حکومت کا دشمن ہو کر رعایا کا آدمی ایک سانس بھی لے سکتا ہے؟ ہرگز نہیں، جنھیں عوام لیڈر کہتے ہیں یہ سب حکومت کے لوگ ہیں اور ہندو مسلمان دونوں دھوکے میں ہیں، یہاں تو لیڈروں کا کام یہ ہے کہ سرمایہ داروں کے مفاد کی حفاظت کریں اور حکومت کو اس کے دشمنوں کی فہرست مُرتّب کرا دیں۔ اور پھر عدالت جس کو جس سزا کے لائق خیال کرے! اُس میں تنبیہ بھی ہے جرمانہ بھی، جیل کی کوٹھڑی بھی اور پھانسی کا تختہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ حکومت کے خلاف پبلک کا جو آدمی بھی ہے وہ حکومت کی نظر میں ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ بعض اوقات، چالاک لیڈر جیل میں بھی چلے جاتے ہیں، لیکن میں پوچھتی ہوں اُنھیں جیل میں کیا تکلیف ہوتی ہے؟ انھیں تو گھر سے زیادہ جیل میں آرام ملتا ہے یہی سبب ہے کہ لیڈر جیلوں سے کتابیں لکھ کر لاتے ہیں جو اُن کی ہزاروں نہیں لاکھوں روپیہ کی آمدنی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ مَیں اس سلسلے میں کسی کا نام نہیں لیتی لیکن یہ تو بتایئے کیا کوئی عوامی قیدخانے کا قیدی بھی کتاب لکھ کر لایا ہے؟

لیڈروں کو مار بھی کھانا پڑتی ہے مگر اس کا معاوضہ اُنھیں اس قدر مل جاتا ہے کہ نسلیں عیش کرتی ہیں۔ سوچیں تو سہی کہ عوام نے جیلیں کاٹی ہیں اور پھانسیوں کے تختوں پر لٹکے ہیں تو انھیں یا اُن کے لواحقین کو کیا مل گیا اور اگر کچھ ملا ہے تو اُن لیڈروں کو جو اچھے بھلے لوگوں کو پھانسیوں کی طرف ہانک دیتے ہیں۔ کانگرس کا اِس قدر زور رہا اور اتنا شور و غوغا ہُوا کہ پبلک نے حیران کن قربانیاں دیں غریب عورتوں نے اپنے معمولی معمولی زیورات تک ناتواں جسموں سے اُتار اُتار کر کانگرس کو دے دیئے، لیکن حاصل؟ کیا انگریز ہندوستان سے نکل گیا یا نکل سکتا ہے؟ کل جو

انگریزوں کو نکالنے کے لئے نوجوانوں سے جیلیں بھروا رہے تھے اور پھانسی کو انسانی عظمت بتا رہے تھے کیا آج وہی صاحبِ اقتدار نہیں؟ کیا غریب اُسی طرح فاقوں سے تنگ نہیں۔ کیا مزدور پر سرمایہ داروں کی گرفت اور بھی سخت نہیں ہوگئی؟ کیا کسان آج آزادی سے روٹی کھا رہا ہے؟ انگریز تو حکومت میں ایسے عنصر کو اُبھرنے ہی نہیں دیتا جو پنپ کر اس کے سامنے آجائے اور سینہ تان کے آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات کر سکے۔ انگریز کو تو آج ایسے ایسے رفیق میسّر ہیں جو اس کے ایک اشارۂ ابرو پر قریوں کو بے جھجک بھینٹ چڑھا سکتے ہیں۔ آپ ہیں کہ خاکساروں کو کارآمد خیال کئے بیٹھے ہیں۔ پہلے اپنے لیڈر کو تو جانچ پرکھ لیا ہوتا۔"

نیلم کی اس گفتگو سے میں نے محسوس کیا کہ میرے حافظے کی دُھند چھٹ رہی ہے اور ہر شئے کے خدوخال اصل صورت میں دکھائی دے رہے ہیں۔ میرے خیالات میں پت جھڑ شروع ہوگئی۔ جس قدر میں غور کرتا تھا، نیلم کا لفظ لفظ ایک حقیقت کی جوت لئے ہوئے تھا۔

اُس دن مجھے تمام رات نیند نہ آئی اور میں نیلم کی سیاسی بصیرت کے متعلق سوچتا رہا کہ یہ عجیب لڑکی ہے۔ ورنہ لڑکیاں تو عموماً پیشوایانِ مذہب اور سیاسی لیڈروں کی لچھے دار تقریروں کے چکّر میں آجاتی ہیں۔ دُوسرے دن صبح میں نے نیلم کا شکریہ ادا کیا اور اپنی بے خبری کا اعتراف کرکے ضمیر کا بوجھ ہلکا کر لیا، لیکن خاکساری کی عظمت میرے دل میں کم نہ ہوئی، کیونکہ وُہ اپنی جگہ ایک اسلامی تنظیم کا درجہ بھی رکھتی تھی۔

نیلم میرے اعتراف پر ہنسنے لگی اور کہنے لگی "جناب اب میں ایک "انسانی تحریک" شروع کرنے والی ہوں۔ لیڈروں کی دُنیا چھوڑیں یہ لوگ قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔"

میں نے پوچھا "پہلی میٹنگ کب ہوگی؟"

نیلم نے قہقہہ لگا کر کہا "یہ بھی کوئی خاکساری ہے کہ میٹنگ ہوگی۔ میری تحریک

میٹنگ کی محتاج نہیں ہوگی اور نہ کسی ممبر کو کسی ممبر کی خبر ہوگی۔ نہ کوئی جلسہ نہ جلوس۔ نہ اخبار نہ پوسٹر بلکہ ہر شخص یہ سمجھے گا کہ میں اکیلا ہی کام کر رہا ہوں اور تنہا اس تحریک کا رُوحِ رواں ہوں"

میں نے پوچھا "اس کے اغراض و مقاصد کیا ہوں گے؟"

نیلم: "خود معلوم ہو جائیں گے۔ پہلے خاکساری کے مقاصد تو معلوم کر لیجئے۔"

اتنے میں نیلم کے بھائی ڈاکٹر صاحب آ گئے اور پھر دُنیا بھر کی باتیں چھڑ گئیں۔ اِن دنوں وہ اپنے رسالے کے سلسلے میں ذرا پریشان سے نظر آتے تھے اور اُس کا دفتر دہلی منتقل کر رہے تھے تاکہ دواخانے کی کامیابی کے لئے اُسی کو ذریعہ بنایا جائے۔

بمبئی

انھیں دنوں مجھے بمبئی سے مشاعرے کا دعوت نامہ آیا، اُس وقت میری خاکساری کا زمانہ شباب پر تھا اور میں ضبطی کی سالاری کو اپنے لئے اعزاز خیال کرتا تھا، بڑی مشکل سے وقت نکال کر دہلی پہنچا اور اسحاق شور کے یہاں قیام کیا تاکہ ذرا دوستوں میں گپ لگ جائے اور دُوسرے دن بمبئی کو چل دوں، رات کو معلوم ہُوا کہ کئی شعراء تو قبل از وقت ہی پہنچ چکے ہیں اور کچھ کل جانے والے ہیں۔ میں دُوسرے دن اسٹیشن ہی سے اُن کے ساتھ ہو لیا۔

یہ میرا وُہ دَور ہے جب میں کتابوں سے چلتے پھرتے عوام میں داخل ہو چکا تھا اُس وقت میں کتابوں کو کم اور سڑکوں کو زیادہ پڑھتا تھا۔ اب میرے مطالعے میں جرائد و اخبار کم تھے سینما ہاؤس کے دروازے، کشتیوں کے اکھاڑے اور کھیلوں کے میدان کے علاوہ عوام کے چہرے زیادہ مطالعے میں رہتے تھے اور اس مشق و مہارت سے میرے علم میں اضافہ ہو رہا تھا، اب کارخانوں، فیکٹریوں اور ملوں سے نکلتے ہوئے مزدوروں کا ہجوم میرے مطالعے کی کتاب کا کام دیتا تھا اس کے ساتھ ساتھ زندگی کے

بعض داخلی پہلو بھی مجھے متوجہ کرنے لگے تھے۔ اب میں کچھ ایسا محسوس کر رہا تھا جیسے میرے بدن میں آنکھوں کی ریل پیل ہوتی جارہی ہے اور فطرت نے مجھے رازدار بنانے کی ٹھان لی ہے۔

جب میں گاڑی کے تیسرے درجے میں سفر کرتا تو غریبوں اور ناداروں کے اڑتے ہوئے رنگ، اترے ہوئے چہرے، گرد و غبار سے اَٹی ہوئی پیشانیاں اور پھٹے پرانے کپڑے میرے سینے میں ایک ہیجان سا برپا کر دیتے اور دل میں بھانت بھانت کے خیالوں کا میلہ سا لگا رہتا۔ کئی بار تو میرے یہاں ریل گاڑی کے پہیوں کی کھٹا کھٹ اور انجن کے دھوئیں کی ٹھیکا ٹھیک نے اشعار کا لباس پہن لیا ہے، اور مجھے اس پیداوار سے یک گونہ مسرّت بھی ہوئی ہے۔

نصف رات گئے جب میں نے باہر کی طرف دیکھا تو جنگل پر عجیب کیفیت برس رہی تھی۔ جب ریل غنودہ جھاڑیوں کے قریب سے گزرتی تو یوں معلوم ہوتا کہ پتلی پتلی نازک ٹہنیاں جاگنے سے انکار کر رہی ہیں، رات کے دو بجے ہوں گے کہ آسمان پر بادل کے ٹکڑے سفید بھیڑوں کے گلّے کی طرح پھیل گئے، ریل کی پٹڑی کے آس پاس کے پھاٹکوں اور جنگلوں کی جھنکار سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے ریل کے پہیوں میں چھوٹے چھوٹے گھنگرو بندھے ہوئے ہیں، صبح ہوتے ہوتے بادلوں سے آسمان بھر گیا اور ہلکا ہلکا ترشح ہونے لگا، جہاں گاڑی رکتی وہاں ہوا کی سیلن اور گیلی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک مسافروں کا استقبال کرنے لگتی، جنگل کے ناہموار راستے سبزے کے قالینوں سے پٹے پڑے تھے، مٹی کی ہر ڈھیری اور چھوٹی سے چھوٹی چٹان سبز گھاس کی پوٹ معلوم ہوتی تھی، بڑے بڑے درختوں کے جھنڈ اور بانسوں کے بیہڑ جنگل کے شہزادوں کی طرح اَنوٹھے دکھا رہے تھے، اس خوشگوار آب و ہوا کے جلو میں ریل گاڑی لمبئی کے اسٹیشن پر جا رکی۔

سے اُنوٹ :- نازوانداز - وضع - نخرہ - لچک -

وہاں اراکین مشاعرہ اور چند رضاکار جو گاڑی کے انتظار میں تھے دروازے سے نکلنے والے ہجوم کا جزوی جائزہ لے رہے تھے، سب لپک لپک کر بڑے تپاک سے ملے اور قیام گاہ پر لے گئے۔ ابھی ہم منہ ہاتھ ہی دھو رہے تھے کہ شام کو مشاعرے میں پیش آنے والے خطرات پر لے دے ہونے لگی، پوچھنے سے معلوم ہوا کہ یہاں کچھ دنوں سے ہندی زبان کے دلدادگان کا یہ رویّہ ہو گیا ہے کہ اُردو کے مشاعروں کو کامیاب نہیں ہونے دیتے، سب کو فکر ہوئی کہ خدا خیر کرے اگر مشاعرہ بخیر و خوبی انجام کو نہ پہنچا تو اراکین مشاعرہ کے ساتھ شعرا اور اُردو کے دلدادہ حضرات کی بڑی دل شکنی ہو گی۔

ابھی ہم آپس میں کھسر پھسر کر ہی رہے تھے کہ چند خاکسار مجھے پوچھتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور سلامی کے بعد مجھے علیحدہ بلا کر کہنے لگے "آپ سالار ہیں اور کمیٹی کے خاکسار آپ کو سلامی دینا چاہتے ہیں، فرمائیے وہ کب آجائیں؟"

میں نے کہا۔ "اِس وقت قیام گاہ پر سلامی کوئی مفید بات نہ ہو گی، بہتر یہ ہے کہ آپ خاکساروں کے جیش کو مشاعرے میں لے آئیں اور وہیں سلامی ہو، اس طرح خاکسار مشاعرہ بھی سُن سکیں گے اور اپنی جگہ یہ تبلیغی پہلو بھی ہے۔" میری بات انھیں جچ گئی اور عسکری سلامی کے بعد قیام گاہ سے رخصت ہو گئے۔

ہم غسل وغیرہ سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ کچھ لوگ آئے جن کے چہروں پر تشویش اور پریشانی کے آثار بول رہے تھے، میں نے سبب دریافت کیا تو جواب ملا کہ "ہم نے سُنا ہے کہ رات کو ہندی کے حامی مشاعرے میں گڑبڑ کریں گے، اگر یہ بات درست ہوئی اور کوئی غل غپاڑا ہو گیا تو سب کیا دھرا خاک میں مل جائے گا۔"

میں نے انھیں تسلّی دی اور آہستہ سے بتایا کہ آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں مشاعرہ نہایت سکون سے سُنا جائے گا اور خدا نے چاہا تو ایسا کامیاب ہو گا، کہ

حریف یاد کریں گے، ان میں سے ایک نے پوچھا "جناب وہ کیسے؟ آپ تو یہاں اجنبی کی حیثیت رکھتے ہیں، یہاں تو مخالفوں کے دَل کے دَل ہیں" میں نے کہا "یہ درست ہے لیکن آپ صرف اسٹیج کے انتظامات کرلیں، باقی کا فیصلہ وقت خود کرلے گا"

میں رات کو اُس وقت مشاعرے میں پہنچا جب تمام شعرا اور سامعین سے ہال کھچا کھچ بھر چکا تھا، میں اسٹیج پر شاعروں کی صف میں جاکر بیٹھا ہی تھا کہ خاکساروں کا ایک جیش وردیوں اور بیلچوں سے لیس چپ راست کرتا ہُوا مشاعرہ ہال میں در آیا، اُن کا ہال میں داخل ہونا تھا کہ میں اسٹیج پر جا کھڑا ہُوا، اور عسکری سلامی لی، پھر سالار کے حکم کے مطابق خاکسار مشاعرہ گاہ میں اس طرح پھیل گئے کہ دس دس فٹ کے فاصلے پر ایک ایک مسلّح سرفروش مجسّمے کی طرح نصب نظر آتا تھا۔

سالار نے اعلان کیا کہ صاحبان یہاں جو لوگ آئے ہیں وہ سب شعر سُننے کے لئے آئے ہیں، یہ کوئی سیاسی یا مذہبی جلسہ نہیں ہے، اس لئے اس میں خرابی پیدا کرنے والے کو ہم اخلاقی مجرم خیال کرتے ہیں، اس کے سدّباب کو ہماری جماعت اپنا فرض اوّلین خیال کرتی ہے اور اس میں بمبئی کی روایات کے علاوہ شہر کے ناموس کا سوال ہے، ہم بمبئی کے عوام پر ہرگز کوئی اخلاقی دھبّا نہیں آنے دیں گے، اس کے علاوہ جناب احسان دانش جو ہماری جماعت کے سالار ہیں خوش نصیبی سے اس وقت مشاعرے میں شامل ہیں، اگر کسی نے مشاعرے کو خراب کرنا چاہا تو جس طرح بھی مناسب ہوگا ہم سدّباب کریں گے، ایک طرف تو ہمیں اردو زبان سے محبّت ہے دُوسری طرف اپنے سالار کی توہین ہمارے لئے کسی طرح بھی قابلِ برداشت نہیں ہوگی، ہم جناب صدر سے دست بستہ عرض کرتے ہیں کہ وہ سب سے پہلے جناب احسان دانش سے "نغمہ جہاد" کی فرمائش کریں جو خاکساروں کے دل بڑھانے کو لکھا گیا تھا،

مشاعرہ ہال میں خاکساروں کے زندہ مجسّمے جگہ جگہ نظر آرہے تھے اور رہ رہ کر

اُن کے چمکتے ہوئے دھار دار بیلچوں کے عکس سے در و دیوار پر بجلیاں سی ناچ رہی تھیں، مشاعرہ گاہ میں مکمل سکوت طاری تھا، میں صدر کی اجازت سے اسٹیج پر آیا اور "نغمۂ جہاد" پڑھا جس کا ٹیپ کا مصرع یہ ہے، ع

مجاہدینِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو!

اس کے بعد دوسرے شعراء نے اپنا اپنا کلام سنایا اور حسبِ معیار داد و بیداد پائی، شروع شروع میں تو پبلک ذرا خالف رہی لیکن جب سب کو یقین ہو گیا کہ یہ صرف انتظام کے لوگ ہیں، کوئی شرارت نہیں ہے تو پھر سنجیدگی سے یہ مشاعرہ ایسا سنا گیا کہ بمبئی میں جس کی مثال بمشکل تھی، رات کو ڈیڑھ بجے بصد حسن و خوبی مشاعرے کا اختتام ہوا، اس وقت کوئی رائے قائم نہ ہو سکی لیکن دوسرے دن انصاف پسند ہندی والوں نے بھی مشاعرے کو سراہا اور دلچسپی کا اظہار کیا۔

دوسرے دن بمبئی کی مشہور آرٹسٹ جدن بائی نے شعراء[۵] کو اپنے بنگلے پر مدعو کیا، جدن بائی میرے کلام سے بیحد متاثر تھی، میری حیرت کی انتہا نہیں رہی جب اُس نے میری نظموں میں سے اپنی پسند کے سیکڑوں ٹکڑے سنا ڈالے مجھے یقین نہیں تھا کہ فلمی دنیا کی معروف عورت انقلابی نظموں اور ذہنوں کو پلٹ دینے والے غزلوں کے اشعار کو حافظے میں جگہ دے سکتی ہے۔ اُسے صرف میرے ہی نہیں اُس دور کے مشہور شعراء کے ہزاروں اشعار ازبر تھے، میں نے اس کی مختصر سی گفتگو سے یہ محسوس کیا کہ جہاں وہ فلمی دنیا میں اپنی مثال آپ تھی، وہیں وہ دوستوں کے لئے بہترین مشیر زندگی بھی تھی، وہ دنیا اور اس کے نشیب و فراز کو اچھی طرح سمجھتی تھی اور معاملے کی سخت سے سخت گتھی کو سلجھانے کی صلاحیت اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔

اُسی نشست میں دو ممتاز اور مشہور شاعروں میں کچھ اختلاف ہو گیا، اور بات بات میں معاملہ کہیں کا کہیں پہنچ گیا لیکن جدن بائی نے اُسے نہایت خوش اسلوبی

۵ شعراء میں اختر شیرانی، عدم اور راقم الحروف کے علاوہ حکیم حیدر، نخشب جارچوی، حامد دہلوی، شکیل بدایونی اور جگر مرادآبادی شامل تھے۔

سے فرو کر کے فضا ہموار کر دی۔

حجاب نے مجھے ایک گفتگو میں بتایا" میں آپ کی ہم خیال ہوں لیکن ہم دونوں کے لائحہ عمل جُدا جُدا ہیں ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنی اپنی جگہ خلوص سے کام کرتے رہیں اور کسی داد و تحسین کی طلب نہ رکھیں۔ ابھی ہمارے ملک میں ایسے ادیب کمیاب ہیں جو سماج کے درد کو محسوس کریں اور ملک کی محبت انھیں دیوانگی تک پہنچا دے۔ آپ اپنی نظموں سے عوام و خواص پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں میں بھی اب سوچ رہی ہوں، اگر موقع ملا تو فلم کے ذریعے سے انقلاب کی زمین تیار کروں گی، ذرا آپ دیکھتے جائیں!"

آج کی فلمی دنیا کی ایکٹریس" نرگس" اُس زمانے میں زیرِ تعلیم تھی، نہ جانے دماغی طور پر اُسے بھی حجاب بائی سے وُہ جذبہ ملا ہے یا نہیں، نرگس کا بھائی اختر اُن دنوں کچھ علیل سا تھا، میں نے لاہور آکر اُسے دوا بھی بھجوائی لیکن پھر معلوم نہ ہو سکا کہ اُسے اِس بھی آئی یا نہیں۔

اُسی نشست میں حجاب نے مجھے فلمی دُنیا میں آنے کا مشورہ بھی دیا اور دبے الفاظ میں کہا کہ اگر آپ اس کے لئے تیار ہوں تو ہزار روپیہ ماہانہ اور بمبئی کے تمام مصارف کا میں ذمہ لیتی ہوں جب جی چاہے چلے آئیں اور دفتر میں بیٹھ جائیں آپ کو کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں، کام میں خود لاکر دوں گی، میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مجھے یہ شعبہ بالکل ناپسند ہے، اس میں شک نہیں کہ روپیہ افراط سے مل جاتا ہے اگر میں سمجھتا ہوں کہ اس ادارے کی معرفت نقلی زندگیوں سے اصل زندگیوں کو بھٹکایا جاتا ہے، اگرچہ اس میں اصلاحی اور انقلابی انداز بھی پیدا کئے جا سکتے ہیں لیکن ابھی یہ ملک اتنا با شعور کہاں، اس کی ذہنیت کو بدلتے ہوئے تو ایک زمانہ لگے گا لیکن اُس وقت تک اس کے فنکار بھی جرائم پیشہ ہو جائیں گے، کیونکہ دولت کا پہلا حملہ اخلاق پر ہی ہوتا ہے اور انھیں یہ مواقع قدم قدم پر میسّر آتے ہیں، انقلاب کے لئے طویل

مُدّت مخلصینِ انقلاب کو بھی خراب کر ڈالتی ہے، انقلاب کے ضروری مواد کو اکٹھا کرنے میں ایک زمانہ لگے گا، اس میں شک نہیں کہ مجھے روپیہ کی ضرورت ہے لیکن میری طبیعت فلمی دُنیا سے مناسبت نہیں رکھتی۔

اس کے بعد کئی بار میں بمبئی گیا لیکن اُس وقت جدّن بائی انتقال کر چکی تھی، نرگس اور اختر کے متعلق خیال ہوا کہ شاید وُہ اب مجھے نہ پہچانیں، اِس لئے حسبِ عادت میں نے بمبئی کے کسی مشاعرے کی قدر نہیں دیکھی اور وہاں کے ہنگامے سے سفر کی صعوبت کو مناسب خیال کیا۔

ایک مشاہدہ

دِلّی کے قرول باغ میں "بابِ عالی" کے نام سے خاکساروں کا مرکز تھا، جو خاکسار باہر سے جاتا وہیں ٹھہرتا، اور جہاں بھیجا جاتا اُس کے احکام وہیں سے صادر ہوتے، لیکن عموماً خاکساروں کا اجتماع جناب اسحاق شوؔر[1] کے مکان پر رہتا، ایک دن ایک سالار غالباً بلند شہر کے محاذ سے واپس آیا اور دفتر میں آمد درج کرائی، جو خاکسار اُس وقت دفتر کا انچارج تھا اُس نے نو وارد خاکسار کو فوراً طلب کر لیا، اور سوال کیا کہ تُم محاذ سے واپس کیوں آ گئے اور جیش کو کس کے سپرد کیا؟

سپاہی خاکسار "میرے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے اور چلنے کی سکت نہیں رہی تھی اس لئے کمان دُوسرے سالار کے سپرد کر کے میں یہاں آ گیا جب ذرا آرام ہو جائے گا، واپس محاذ پر چلا جاؤں گا،"

سالار انچارج "اس کے معنی یہ ہوئے کہ محاذ پر جانا نہ جانا یہ سب تمہاری مرضی پر ہے، جتنی دُور تم واپس آئے ہو اُتنی ہی دُور آگے بھی تو جا سکتے تھے" یہ کہہ کر

---

[1] محمد اسحاق شور۔ لاہور سے ترکِ سکونت کر کے دہلی چلے گئے تھے مگر پھر دہلی سے آ گئے۔ آجکل پی۔ ایس آئی۔ ایس میں خوشنویس ہیں۔

سالار نے ایک شخص کو آواز دی جو اس وقت پہرہ داری کی خدمت انجام دے رہا تھا، فوراً وہ گھنی ڈاڑھی والا خاکسار چیتے کی طرح دوڑ کر آیا۔

سالار۔ "اس بزدل کو میرے سامنے سے لے جاؤ اور خاکساری سے اس کا استعفیٰ لو!" پہرہ دار نے فوراً اُس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر زور سے دھکا دیا اور پھر مسلسل دھکیلتا ہوا ایک کمرے میں لے گیا اور کہا "جلدی استعفیٰ دو استعفیٰ۔!!"

ملزم خاکسار۔ "میں جان دے سکتا ہوں استعفیٰ نہیں دے سکتا، میں انھیں زخمی پیروں سے محاذ پر واپس جاؤں گا۔"

پہرہ دار نے اُسے کئی بار زدوکوب کیا لیکن اُس نے استعفے کی ہامی نہ بھری۔ آخر پہرہ دار تنگ آکر سالار کے پاس گیا اور اُسے اپنی سختی اور اُس کی ثابت قدمی سے آگاہ کیا۔

سالار انچارج۔ "اچھا اب تو بند کر دو، کل ایک گتّے پر جلی حروف میں "محاذِ جنگ سے بھاگا ہوا بزدل سالار" لکھ کر اس کے سینے پر آویزاں کر دو اور ہر روز شہر کے کسی نئے چوراہے میں کھڑا کرو، دوسرے دن میں نے دیکھا کہ وہ ملزم خاکسار اپنا خاکساری کا پرچم ہاتھ میں لئے کھڑا ہے اور سینے پر وہی تحریر آویزاں ہے، "محاذ جنگ سے بھاگا ہوا بزدل سالار" دسیوں بیسیوں آدمی اِردگرد جمع ہیں اور وہ نظر جھکائے کھڑا ہے۔

لیکن دوپہر ہوتی تو یہ بھی دیکھا کہ سورج سر پر ہے اور علّامہ مشرقی اُس کے پاؤں کے چھالوں کی مرہم پٹی کر رہے ہیں لیکن سزا برقرار ہے۔

حوصلہ مند والدین

مَیں ایک دن مزنگ میں جنازہ گاہ والی مسجد کے شہ نشین پر کھڑا تھا کہ چند خاکسار چارپائی پر ایک لاش لائے اور جنازہ گاہ کے سامنے لاش کو ایک بوریئے پر رکھ کر اوپر ایک میلا سا

کھیس ڈال دیا اور ایک خاکسار اس کے داہنی طرف بیٹھ کر کچھ آیات قرآنی پڑھنے لگا، اُنھیں میں سے ایک خاکسار نے دُوسرے خاکسار کو حکم دیا کہ باغبانپورہ میں اس شہید کے والدین کو اطلاع دے دو! وہ اُسی وقت سائیکل لے کر روانہ ہوگیا۔

مَیں نے ایک خاکسار سے پُوچھا یہ لاش کہاں سے آئی ہے" اُس نے جواب دیا "محاذِ جنگ کا شہید ہے مَیں اور کچھ نہیں جانتا" مَیں نے کہا "ذرا مجھے اس کی صُورت دکھادو!" جواب ملا کہ کھیس اُٹھا کر دیکھ لو! میں نے کھیس کا پلّہ اُٹھایا تو ایک اکیس بائیس سال کا گبھرو نوجوان گورا چٹا رنگ گونگھر والے بالوں کی ریشم جیسی نرم ڈاڑھی اور بند آنکھیں جیسے تھکا ہُوا مسافر کسی درخت کی ٹیک لگا کر اونگھ جائے۔ جو خاکسار اِس لاش کو لائے تھے اُن کے چہروں پر غم تو نہیں تھا مگر آنکھوں میں مُقدّس شعلے لپک رہے تھے، ہر ایک میں جراَت مندانہ پھُرتی اور دلیرانہ تیور، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ شکل و صورت کے اعتبار سے تو ہمیں جیسے انسان ہیں لیکن اب وہ کسی اور دُنیا کے ہوگئے ہیں، اسی لئے وُہ ہماری طرف نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے اور اُسی جرل کے قانون پر چل رہے ہیں جس کے سپُرد رہ خود کو کر چکے ہیں، یہ سب کتاب و سُنّت کے لوگ ہیں جو ہم سے بہت دُور نکل چکے ہیں، ان کے سینے روشن ہیں اور چہرے شاداب!

اتنے میں باغبانپورہ سے شہید کے ماں باپ، اُس کے چھوٹے بھائی کو ساتھ لئے قبرستان آپہنچے فریضۂ سلام کے بعد ایک خاکسار نے اُن سے کہا "اُس کھیس کے نیچے اپنے شہید کو دیکھ لو! وُہ جلد بازہم سے پہلے جنّت میں پہنچ گیا ہے"،

باپ" صورت دیکھنے کا فیصلہ تو اُس وقت ہوگا پہلے مجھے یہ بتائیں، کہ اس نے سینے پر گولی کھائی ہے یا پشت پر؟"

خاکسار نے تیور بدل کر کہا "کیا کوئی خاکسار پُشت پر بھی گولی کھا سکتا ہے؟"

کیا ہم جنت جیسے انعام کو ٹھکرا کر اس ذلیل زندگی کو قبول کر یں گے؟ جو یہاں کے لوگ بسر کرتے ہیں، جائیں اُس کا سینہ کھول کر دیکھیں! اس نے سینے پر ہی گولیاں روکی ہیں اور اس کا سینہ شہادت کے پھولوں سے پٹا پڑا ہے۔"

باپ نے بیٹے کے سینے تک کپڑا اُٹھا کر دیکھا اور پیشانی کو بوسہ دے کر اُس کا بیلچہ اس کے چھوٹے بھائی کے باندھ دیا اور کہا "بیٹا اب تمہاری باری ہے" یہ شہادت کی دولت روز روز ہاتھ نہیں آتی، ماں دُور کھڑی دیکھ رہی تھی اُس کی آنکھ سے آنسو نہیں ٹپکا مگر گھی کے چراغ کی طرح پتلیاں جگر جگر کر رہی تھیں جب اُسے بیٹے کی صورت دیکھنے کو کہا گیا تو اُس نے صرف اتنا کہا "میں نے اُسے اپنا دُودھ پلایا ہے اور دن رات اُس کی صورت ہی دیکھتی رہی ہوں، خُدا کا شکر ہے وہ میری عقبیٰ کا سہارا بن گیا۔ یہ جس کی امانت تھی اُسی کے سپرد کرتی ہوں، اِسے اب دفن کر دو خُدا حافظ!"

اگرچہ اس کی آنکھوں کی خساست اور ضبط کی تکمیل کے باعث آنسو تو نہیں نکلے، لیکن وُہ زیادہ دیر تک کھڑی نہیں رہ سکی، اُس کے پاؤں لرز رہے تھے وُہ گھٹنے پکڑ کر بیٹھ گئی پھر اُٹھ کر چلنے لگی تو لڑکھڑا گئی اور بمشکل سنبھلی!

اِدھر میّت کو دفنا کر خاکسار شہید کے چھوٹے بھائی کو لے کر چل دیئے، اُدھر ماں باپ اپنے جگر کے ٹکڑے کو خاکساروں کی تحویل میں دے کر اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو گئے، باپ نے ہمّت نہیں ہاری مگر ماں تانگے میں سوار ہونے لگی تو گر گئی اُسے ہاتھ پاؤں پہ قابو نہ رہا، آخر ماں تھی کہاں تک دل کو پتھر بناتی، بچّہ تو ماں کے جسم کا ایک حصّہ ہوتا ہے جو آنول نانول کاٹ کر علیحدہ کیا جاتا ہے، خُدا کے بعد دُنیا میں بچّے کی محبّت ماں سے زیادہ کون کر سکتا ہے؟

میرا خود اپنی اہلیہ کے متعلق تجربہ ہے اگر کسی دور اُفتادہ بچّے کو کہیں تکلیف ہوئی

ہے یا کوئی مشکل پیش آئی ہے تو اُس نے یہیں چار دیواری میں بیٹھے بیٹھے محسوس کر لیا اور مجھ سے کہا "کسی بچے کو کچھ تکلیف ہے جلدی سے خط لکھو۔"

ایک دفعہ وُہ کہنے لگی کہ خُدا خیر کرے ذیشان[1] کا خط نہیں آیا اور رات سے میرا سینہ سنسنا رہا ہے فوراً خط یا تار بھیج کر اُس کی خیریت معلوم کریں، مَیں نے کہا انشاء اللہ کل خط لکھوں گا، لیکن میرے خط لکھنے سے پہلے ہی ذیشان کا خط آگیا کہ "میرا ہاتھ مشین میں آگیا ہے، مگر فکر نہ کریں یہاں علاج معالجہ نہایت مناسب ہو رہا ہے، انشاء اللہ جلد آرام ہو جائے گا۔"

ایک یہی واقعہ نہیں سینکڑوں واقعات میری نظر میں ہیں جن میں ماں کے رشتے کا استحکام حیرت انگیز ملا ہے اور یہ بات ماں باپ تک ہی نہیں اگر دو دوستوں میں روحانی نزدیکی کی انتہا ہو جائے تو یہ تاثر عزیز داری کا محتاج نہیں، ایک مخلص انسان کے تصوّر اور تخیّل کا اثر ہزار ہا میل پر ہونا ممکن ہے۔

ایک ہندو دوست

کبھی کبھی میرا ایک ہندو دوست جگدیش چندر کہا کرتا تھا کہ میاں خواہ مخواہ اَدب کی اچھّی خاصی لائن چھوڑ کر سیاست کے جال میں آرہے ہو۔ اس خاکسار تحریک میں تو انگریز کا ہاتھ ہے انگریز کا! تم یہ نہیں دیکھتے کہ برطانیہ کے اربابِ سیاست جرمنی سے گھل مل کر رُوس کو تباہ کرنا چاہتے ہیں اور جرمن کی خوشنودی کے لئے خاکسار جماعت کی صورت میں نمائشی طور پر کچھ عرصہ سے جرمنی تنظیم کا شور برپا کیا جا رہا ہے اور بس! لیکن مجھے اس کا یقین نہ آتا تھا۔

کچھ روز کے بعد حبیب اللہ خاں سعدی نے بھی پشاور سے آکر کچھ ایسی خبریں سنائیں کہ مَیں انگشت بدنداں رہ گیا۔ لیکن میرے خلوص میں دراڑ نہیں کُھلی، کیونکہ

---

[1] میرا بڑا لڑکا محمد ذیشان دانش جو اُن دنوں لندن میں تھا۔

ہر خاکسار اپنی جگہ اپنے عزائم میں ایک پہاڑ تھا اور سبب اس کا یہ تھا کہ ہر شخص انفرادی طور پر خود کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا سعادت خیال کرتا تھا۔ اس جماعت کے پُرخلوص لوگ جب بھی کوئی خدمت کرتے اس میں صرف اسلامی اقدار پیشِ نظر رہتیں اور عوام کے سامنے صحابہؓ کے دور کا نقشہ آ جاتا۔

دُوسری جنگِ عظیم زور پر تھی اور اخبارات میں روز جرمنی اور برطانیہ کے کارنامے آ رہے تھے۔ مُلکوں کی فتح و شکست کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک دن رات کو ریڈیو پر اعلان ہُوا کہ برطانیہ اور رُوس متحد ہو گئے اور جرمنی سے اب دونوں مُلک مل کر نبرد آزما ہوں گے۔

برطانیہ اور رُوس کے اتحاد کی خبر سُن کر جگدیش آیا اور کہنے لگا "جناب اب آپ کی خاکسار جماعت ختم ہو جائے گی۔ اب پالیسی بدل گئی ہے پہلے تو برطانیہ اور جرمنی مل کر رُوس کو شکار کرنا چاہتے تھے لیکن جب برطانیہ نے جرمنی افواج کی طاقت اور سپاہیوں کی بے جگری دیکھی تو اسے یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ کبھی اگر جرمنی اِدھر پلٹ پڑا اور جنگ چھڑ گئی تو لندن میں کیا رہے گا؟ اس لئے رُوس سے مل کر جرمنی کو کیوں نہ نیست و نابود کر دیا جائے تاکہ یہ سینے کی سِل تو ہٹ جائے روس اور لندن میں تو پھر بھی فاصلہ ہے۔ اب تم دیکھ لینا کل سے خاکساروں پر سختی شروع ہو جائے گی۔"

مَیں خاموش سُنتا رہا اور کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن دُوسرے دن سے واقعی سختی شروع ہو گئی اور جو جو مظالم خاکساروں پر توڑے گئے ان کے لئے ایک ضخیم کتاب درکار ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب علامہ نے دہلی کے اجتماع کو ناکام ہوتا دیکھ کر جماعت توڑ دی تو ہر شخص کو بڑا صدمہ ہُوا کیونکہ یہ جگر دار لوگوں کی عظیم جماعت دریا میں بہتے ہوئے خس و خاشاک کی طرح ہو گئی۔ سب لوگ علامہ مشرقی کی طرف سے مایُوس ہو گئے اور پوری جماعت کے عزائم میں وَبا پھیل گئی۔ کیونکہ ایسی تنظیمیں روز روز نہیں

ہوا کرتیں ۔ علامہ چاہتے تو اس جماعت سے اور بھی ملک و قوم کے بہت مفید کام لے سکتے تھے لیکن وہ بالکل الگ ہو گئے جیسے جماعت کبھی تھی ہی نہیں ۔

مگر خاکسار جو ایک دوسرے کے لئے ہمدردی، وفاداری اور روحانی نزدیکی رکھتے تھے اُس رشتے کے شکست ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی چنانچہ خاکساروں میں اب تک وہی خلوص و جاں نثاری زندہ و تابندہ ہے اور ہر خاکسار خواہ وہ کسی جگہ کا کیوں نہ ہو دوسرے خاکسار کو اپنا بھائی تصور کرتا ہے اور ہر مشکل وقت میں عزیزوں سے زیادہ ایثار و قربانی کے لئے تیار نظر آتا ہے ۔ علامہ کو جب تنظیم کا شیرازہ بکھرتا نظر نہ آیا تو وہ پھر نئے انداز سے جماعت میں آگئے، اب جو نئی تنظیم ہوئی ہے اُس کے متعلق مجھے معلومات نہیں کہ اس کا رویہ کیا ہے، علامہ مشرقی کی حیات تک تو اِس تنظیم میں جی داری رہی لیکن اُن کی وفات کے بعد اب اُن کی جگہ کون پر کرے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی چرواہا اپنے گلے کو لاوارث چھوڑ گیا ہو افسوس ہے کہ یہ مسلمانوں کا ایک عظیم اجتماع اور مخلصین کی ایک بڑی جماعت بے یار و مددگار ہو کے رہ گئی ۔ مگر خلوص کی زنجیریں ہیں کہ ٹوٹنے میں نہیں آتیں اور بشتم پشتم وفادار اور جیالے خاکسار جماعت کو تغیرات کے اندھیاؤ اور شکست و ریخت کے جھکڑوں میں ثابت قدمی سے لے کر چل رہے ہیں مجھے اُمید ہے کہ کبھی یہ جماعت ملک و قوم کے اڑے وقت میں کام آئے گی ۔

علامہ مشرقی ایک پیشگو

جہاں تک علامہ مشرقی کے زیرک ہونے کا تعلق ہے وہ اس پورے ملک میں ذہین طباع اور موضوع جہاد پر غور و فکر کرنے کے لئے اپنی جگہ تنہا نظر آتے ہیں ۔ اُنھوں نے مسئلہ کشمیر کو سلامتی کونسل میں لے جانے کی مخالفت کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تک معاملہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے ۔

اُنھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر کشمیر کو حاصل نہ کیا گیا تو ۱۹۵۰ء تک انڈیا تمام دریاؤں کے رُخ انڈیا کی طرف پھیر لے گا ۔ لیکن حکومت نے اسے ایک مجذوب کی بڑ

خیال کرکے علامہ مشرقی کو جیل میں ڈال دیا اور اب دریاؤں کی جو کیفیت ہے اظہر من الشمس ہے۔

انھوں نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے نئے رشتوں کو مستحکم کرنے اور شیر و شکر ہونے کے لئے بھی زور دیا تھا لیکن کسی نے اُن کی بات نہیں سُنی اور اس کا انجام سامنے ہے۔

اُنھوں نے کہا تھا "مسلمانو!* میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ ایک ایسا دَور آنے والا ہے جو غالباً ۱۹۷۰ء کے بعد کا دور ہوگا، اس دَور میں میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ ہر طرف ایک یورش کا طوفان اُٹھ رہا ہوگا، ملک کے اندرونی حالات بڑے خراب ہو گئے خون خرابے کا ہر وقت خدشہ ہوگا، نسلی اور صُوبائی تعصّب کو ہر جگہ ہَوا دی جا رہی ہوگی، زندہ باد اور مردہ باد کے نعرے ہوں گے، ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے پروگرام بن رہے ہوں گے، مَیں تمھیں متنبہ کرتا ہوں کہ اگر ملک کی قیادت مضبوط ہاتھوں میں نہ ہوئی تو جان لو اِس ملک کا بچنا محال ہوگا، ہوسکتا ہے کہ مشرقی پاکستان مغربی پاکستان سے کٹ جائے، ہوسکتا ہے کہ اندرونی خلفشار کی وجہ سے کہیں انڈیا فائدہ اُٹھا کر ملک کو ہڑپ نہ کرلے، غلط قسم کے لوگ برسراقتدار آکر پاکستان کو ہندو کی غلامی میں نہ دے دیویں۔ مَیں تمہیں ۱۹۷۰ء کے لئے خبردار کرتا ہوں کہ اس وقت کے لئے ابھی سے تیّاری شروع کردو تاکہ اس وقت تک اس ملک میں ہر فرد اپنے آپ کو مستحکم کرلے تاکہ ملک کے بیرونی دُشمن اور اندرونی دشمن کوئی فائدہ نہ اُٹھالیویں۔

نافرمان قوموں پر خُدا کا عذاب ان کے اپنے ہی عمل کی وجہ سے آیا کرتا ہے، اس عذاب سے بچنے کے لئے خدا کے سپاہی بنو اور عملاً طاقتور بن جاؤ، اس میں تمہاری بہتری ہے (خدا ہمارے ساتھ ہے)"

---

* یہ ۱۹۵۶ء میں منٹو پارک کے عظیم اجتماع سے خطاب کیا تھا۔

لکھنؤ اور رہیں

لکھنؤ کچھ بھی ہو شرفا کی بستی اور صاحبانِ علم وفن کا دیار ضرور ہے۔ وہاں ایک مخصوص آل انڈیا مشاعرہ ہونے والا تھا جس میں ہندوستان بھر کے ممتاز شعرا کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ اس سلسلے میں جناب قدیر لاہور تشریف لائے اور مجھ سے شرکتِ مشاعرہ کے لئے اصرار کیا، میں نے جھجکتے ہوئے وعدہ کر لیا۔

وعدہ تو کر لیا لیکن آخر دن تک یہ فکر دامنگیر رہی کہ لکھنؤ تو بڑے بڑے دراک شاعروں اور ادیبوں کا گڑھ ہے نہ معلوم وہاں مجھ غریب الوطن پر مشاعرے میں کیا گزر جائے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ مشاعرہ بخیر وخوبی اختتام پذیر ہوا اور میں لکھنؤ جاتے ہوئے جس بات سے ڈرتا تھا وہ پیش نہیں آئی، سامعین نے مجھے بہت توجہ سے سُنا اور سراہا، اسی مشاعرے میں امین سلونوی اور عمر انصاری سے پہلی بار ملاقات ہوئی لیکن ان کے خلوص کا یہ حال تھا کہ برسوں کے دوست معلوم ہوتے تھے اور آج تک اُسی طرح ملتے ہیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ اس خوبصورت شہر اور مشرقی تہذیب کے گہوارے میں کچھ زیادہ قیام کروں لیکن سری نگر کے مشاعرے کا وعدہ کر چکا تھا اس لئے جلد ہی واپس ہونا پڑا۔

جہاں تک لکھنؤ کے دارالادب ہونے کا تعلق تھا وہ غلط بھی نہیں تھا، کیونکہ وہاں اس وقت حضرت صفی لکھنوی، جناب ظریف لکھنوی، حضرت اثر لکھنوی، حضرت نیاز فتحپوری جناب آرزو لکھنوی، جناب آنند نرائن مُلا لکھنوی، جناب بیخود موہانی، حکیم آشفتہ لکھنوی جناب آسی الدنی، جناب سراج لکھنوی، حضرت ناطق لکھنوی حضرت نسیم امروہوی، امید امیٹھوی اور علی جواد زیدی جیسے شعراء و ادباء موجود تھے، ان کے علاوہ جناب زکی، جناب عرشی، آزاد فتحپوری، عمر انصاری، امین سلونوی، افقر موہانی، شوکت تھانوی، شاعر لکھنوی، آرم لکھنوی،

سالک لکھنوی یا بسط بیسوانی وغیرہ چھائے ہوئے تھے اور ان کی شہرت اپنا حلقہ وسیع تر کرتی جا رہی تھی۔

اُس وقت نئے اور اُبھرتے ہوئے چہروں میں جناب ہزار لکھنوی جناب ڈل لکھنوی معراج لکھنوی شعلہ لکھنوی اور وحید خیالؔ لکھنوی چہکنا سیکھ رہے تھے اور ان میں ایک بلند و بالا نغمہ گری کے آثار بول رہے تھے چنانچہ جب آج اُن کے متعلق سنتا ہوں تو خوشی ہوتی ہے اور دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ مَیں نے حضرت اصغر گونڈوی کو بھی پہلے پہل وہیں دیکھا تھا اور وہیں جناب دوؔر کانپوری سے بھی ملاقات ہوئی تھی، دوؔر کانپوری اُس وقت ایک نئی سج دھج سے شاعروں کے اژدہام چیرتے ہوئے طلوع ہو رہے تھے۔ شعر گوئی کے ساتھ ساتھ اُن کا ترنم اور گورے چہرے پر چیچک کے نشانات میں جب پسینے سے سرخی آجاتی تھی تو شعر اور شاعر میں انتخاب ہی کا فرق رہ جاتا تھا، دوؔر گویا اپنے دَور کا ایک جان لیوا شاعر اُٹھا تھا، لیکن افسوس کہ اس کی معصوم جوانی شراب و جمال کا فریب کھا گئی اور اُس نے اُسی محراب کیف و رنگ میں دھُونی دے دی، شراب و شاہد کے آمیزے نے اپنے لوازم کے مطالبے میں شاعری کو ضبط کر لیا۔ اب دوؔر سے کبھی کبھی پاکستان میں ملاقات ہوتی ہے تو اُن کا وہ زمانہ نظر میں پھر جاتا ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ کیسا ہونہار اور رسا شاعر کیسی نہر تنک آب و پایاب میں بہہ گیا۔ شعر وہ اب بھی کہتے ہیں مگر اپنے دَور کا ساتھ کیسے دیں؟ راستے کے قیام نے انھیں بہت پیچھے کر دیا ہے۔ اور اُن کی جوانی کی خامیوں نے پختہ ہو کر اُنھیں آرام خواہی کے دَور میں داخل کر دیا۔

"بہارِ ادب" کے مشاعرے میں جب میں دوبارہ لکھنؤ مدعو کیا گیا اس وقت میرا ذوقِ شعری کچھ منزلیں مار چکا تھا۔ قیصر باغ بارہ دری میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح کے شعرا کھنچ آئے تھے۔ بارہ دری کی وسعت نے جب دامن میں جگہ نہ دی تو اس کے چاروں طرف لاؤڈ سپیکر

۱ے آزادی کے بعد سے لاہور میں مقیم ہیں اور ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ قائم ہے۔ ۲ے اُڑ گیا۔ ترنم، جھنجھر، بکھر گیا

لگوا دیئے گئے، باہر سبزے کے پلاٹ سامعین سے پٹے پڑے تھے۔

لکھنؤ کی روایات اور اصولی تکلّفات کے تحت، مشاعرہ کا آغاز ہوا، اتّفاق سے اس مشاعرے میں ایسے ایسے افسوں نوا شاعر جمع ہو گئے تھے جن کا بعض بعض شعر نشتر کی طرح دل میں اُترتا اور خون میں کھیلتا معلوم ہو رہا تھا، پھر شعر کے ہر پہلو پر فراخ دلی سے داد و تحسین کی موجیں اور بھی ہوش ربا ہو رہی تھیں، گویا ایک خواب تھا جسے آنکھیں پہلی بار دیکھ رہی تھیں اور دل بیداری پر مُصر تھا۔

مجھ سے اگلی رَو میں میرے بالکل سامنے مولانا آسی اُلدنی اور اُن کے چند شاگرد بیٹھے چہ میگوئیاں کر رہے تھے، زخمی لکھنوی نے اپنے اُستاد جناب آسی اُلدنی سے پوچھا۔ "اُستاد! احسان دانش کونسا ہے جو لاہور سے آیا ہے سُنا ہے پُورے ہندوستان میں اس کا شہرہ ہے؟" آسی صاحب نے زخمی کا زانو دبایا اور کہا "پیچھے بیٹھے ہوئے ہیں، آہستہ بولو گستاخ نہ ہو!"

زخمی نے حیرت سے میری طرف دیکھ کر کہا "اُستاد یہ گنجا سا کالا سا لونڈا؟ جناب آسی نے تلخی سے کہا "بکو مت! جب یہ اسٹیج پر جا کر پڑھے اس وقت دیکھنا یہ کتنا قدر آور شاعر ہے" زخمی صاحب اپنا سا منہ لے کے رہ گئے۔

نصف مشاعرہ گزرنے کے بعد میرا نام پکارا گیا، مَیں نیچی نظریں کئے اسٹیج تک تو چلا گیا لیکن غزل پڑھنے کو جی نہیں چاہا اور مَیں نے اپنی ایک نظم "جشنِ بیچارگی" شروع کر دی اس میں مَیں نے ایک مزدور کی لڑکی کی رخصتی کو نظم کیا تھا جو میرے طبقے اور مشاہدے کی بات تھی۔

جب نظم اپنے تنت پر پہنچی تو مَیں نے دیکھا کہ مشاعرے کا مشاعرہ آبدیدہ ہے، نظم ختم ہوئی تو خواجہ عزیز الحسن مجذوب نے اُٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور پیشانی کو بوسہ دیا، اُنھیں کہاں یاد تھا کہ مَیں کاندھلے میں اُن سے اصلاح لے چکا ہوں،

جب میں نے اُنھیں یاد دلایا تو اس قدر خوش ہوئے کہ رقص کرنے لگے جو اُن کی والہانہ طبیعت کا خاصّہ تھا۔

ابھی مشاعرہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ کچھ لوگ مجھے ٹریننگ کالج کے مشاعرے میں اُٹھا لے گئے اور زبردستی صدارت کی مسند پر بٹھا دیا، اہلِ لکھنؤ کی اس مسافر نوازی پر میرے آنسو بھر آئے لیکن بمشکل تمام مَیں نے اس سیلاب پر قابو پا لیا، مَیں نے ہزار عرض کیا کہ مَیں صدارت کی صلاحیّت نہیں رکھتا، میں تو مبتدی ہوں لیکن وہ لوگ ایسے مہربان تھے کہ میری ایک نہ سُنی گئی، اب میں اس کے سوا کیا کرتا کہ سمٹا سمٹایا مسند پر بیٹھا رہا، میرے ساتھ بارہ دری کے مشاعرے سے بھی کچھ شاعر گئے تھے لیکن میں نے اُن میں بھی کسی کی پیشانی پر بَل نہیں دیکھا، وہ ایسے اخلاق سے پیش آرہے تھے کہ میں شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا، دُوسرے دن بھی جو شخص ملا وہ اس طرح ملا کہ اس کے خلوص پر برسوں کے تعلّقات کا یقین ہوتا تھا۔

کچھ دنوں بعد جناب عرشی صاحب نے اسلامیہ کالج[1] کے مشاعرے کا دعوت نامہ بھجوایا چونکہ لکھنؤ میں وہ مجھ سے نہایت مروّت سے پیش آئے تھے اس لئے میں انکار نہ کر سکا اور بمبئی کے دعوت نامے کو نظر انداز کر کے لکھنؤ پہنچ گیا۔ مشاعرہ طرحی تھا، مَیں نے طرح پر غزل کہی جو بے حد پسند کی گئی۔ اس مشاعرے میں جناب حسرت موہانی بھی تشریف فرما تھے اُنھوں نے بھی مجھے بڑی محبت اور شفقت سے نوازا۔

توقیر حسین خاں

اس مشاعرے کے اختتام پر توقیر حسین خاں مجھے اپنے گھر لے گئے اور ایک کمرے میں سامان سفر ڈالتے ہوئے کہا "سُنا ہے کہ آپ بے تکلّف اور سادہ مزاج ہیں۔ ہم تو ایسے لوگوں کو ڈھونڈھتے پھرتے ہیں۔" مَیں نے اُن کے یہاں قیام کو شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔

توقیر حسین خاں سے جس قدر نزدیکی ہوتی گئی اُن کے جوہر نکھرتے گئے، اور

---

[1] امیر الدولہ اسلامیہ کالج لکھنؤ

حسنِ سیرت مجھ پر اثر انداز ہوتا چلا گیا، وہ ایک قابلِ اعتماد اور وفادار دوست نکلے، اُن کے اخلاق نے مجھے اس قدر گرویدہ کر لیا کہ مَیں نے لکھنؤ کی سکونت اختیار کرنے کی ٹھان لی لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔

توقیر حسین خاں کے دوستوں میں یُوں تو سبھی قابلِ قدر لوگ تھے مگر دو آدمی مرزا حامد بیگ اور عزیز صاحب تو ایسے سدا بہار قسم کے انسان تھے کہ اُن سے جب بھی ملیئے ہنسی مذاق کی بات اور اگر دوست پر کوئی وقت آ پڑے تو جان وہاں سے حاضر! یہ عجیب سوسائٹی تھی کہ رات دن دُنیا کے مصائب پہ طنز ہوتے اور آدھی آدھی رات تک قہقہے اور لطیفے سماعت میں گلکاری کرتے۔

توقیر حسین خاں نے ہی میری ملاقات محمد صدیق مالک صدیق بک ڈپو سے کرائی تھی، جو نہایت زندہ دل اور دوست قسم کے انسان نکلے، اُن میں اس قدر اوصاف تھے کہ اگر تفصیل دی جائے تو ایک کتاب ان کی ذات پر مرتّب ہو سکتی ہے۔ تجارتی معاملات میں دیر آشنا مگر دل کے صاف اور معاملے کے درست انسان دوستی کے باب میں بلند حوصلہ مہمان نواز اور خوش ذوق،

صدیق بک ڈپو سے قریب ہی شاعر لکھنوی کا دولت خانہ تھا، جناب آزاد[۵] فتحپوری نے اُن سے بھی تعارف کرایا، اُس وقت اُن میں شاعری کے وہ جوہر پَر پُرزے نکال رہے تھے جو آزادی کے بعد پاکستان میں آ کر مائلِ پرواز تو ہوئے مگر فضا سازگار میسّر نہ آسکی اور بوکھلائے ہُوئے ماحول نے شور و شر سے نظر اُٹھا کہ اُنھیں پرکھنے کی کوشش نہیں کی جس سے ان کی پرواز کے دائرے تنگ ہو کے رہ گئے۔ اُن کی شاعری میں ایک صنّاعانہ حسن ہے اور صناعی کو پرکھنا بھی کوئی آسان کام نہیں، یہاں تو لوگ ہنوز اپنی اور اپنے خاندانوں کی تعمیر ہی میں مصروف ہیں اور درمیانہ طبقے میں کوئی اپنی جگہ مطمئن نہیں۔ یہی سبب ہے کہ شاعر کو قدر شناس نہ ملے اور اس کے فن کے بازو سمٹ

۵ آزاد فتحپوری نہایت خوشگو شاعر ہیں مگر اب ایک عرصہ سے پاکستان میں ہیں اور تبلیغ اسلام اُن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

کے رہ گئے، وہ بہت کم مشاعروں میں جاتے ہیں لیکن اُن کا کلام سُن کر کوئی اُن کی عظمت سے انکار نہیں کرتا مگر نااہل لوگوں نے اصلی فنکاروں کے راستے روکے ہوئے ہیں۔ اور اس دور میں یہی جام ہے۔

توقیر حسین خاں کی دوستی میرے لئے بڑی ہی تسکین رساں تھی، لیکن پھر وہ اپنی خاندانی افتادِ طبع سے مجبور ہو کر پولیس میں بھرتی ہو گئے اور آخری بار جب مَیں اُن سے ملا ہوں اس وقت وُہ پرتاب گڑھ میں تھانیدار تھے۔

تقسیمِ ملک نے جب سے سیاسی دیواریں کھینچ دی ہیں اس وقت سے اُن سے خط و کتابت بھی بند ہے، مبادا ان کا محکمہ بدگمان ہو جائے اور ان کی ملازمت پر حرف آئے غالباً یہی خیال اُدھر بھی قلم گیر ہے۔

لکھنؤ میں حضرت آسی الدنی اور حضرت بیخود موہانی بے حد کرم فرماتے تھے اور شاید میرا دل بڑھانے کے لئے میری تعریفیں بھی کرتے رہتے، جناب عبدالمالک[1] آروی نے تو اپنی کتاب "مقامِ محمود" میں بارہ دری والے مشاعرے کا حال بڑے مزے لے لے کر لکھا ہے۔ ایسے مخلص لوگ اب کہاں یہ تینوں ہستیاں اللہ کو پیاری ہو گئیں۔

إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ

---

[1] مولانا عبدالمالک آروی نے پہلی بار مجھے لکھنؤ میں بہار ادب کے مشاعرے میں دیکھا اور سنا، پھر دوبارہ ملاقات بھی ہوئی، اور تعلقات یہاں تک بڑھ گئے کہ مولانا شوقِ ملاقات میں لاہور تک آ گئے۔ یہاں جب میری معاشرت و زبان اور حال و قال کو ہم آہنگ پایا تو اور بھی متاثر ہوئے اور احترام تک آ گئے حالانکہ وُہ مجھ سے عمر میں اچھے خاصے بڑے تھے۔ لاہور سے جا کر اُنھوں نے نگار، لکھنؤ میں ایک طویل مضمون "اقبال جوش اور احسان کا تقابلی مطالعہ" کے عنوان سے سپردِ قلم کیا جو ان کی کتاب "اقبال" میں موجود ہے اور ایم اے کے کورس میں ہے۔ اُن کی دو کتابیں "مضامینِ عبدالمالک" اور "مقامِ محمود" تحقیقی اور معلوماتی مضامین کے نہایت مفید اور بصیرت افروز مجموعے ہیں، جناب نیاز فتحپوری نے اپنی زندگی میں صرف دو آدمیوں کو نگار کا مدیر بنایا ایک مولوی عبدالمالک آروی اور دوسرے مسعود جاوید اور ان دونوں میں سے، عبدالمالک صاحب تو اللہ کو پیارے ہو چکے اور مسعود جاوید لکھنؤ میں معلّمی کر رہے ہیں خدا کرے بعافیت ہوں۔

تہذیب و تمدن کا وہ توام اور شعر و ادب کی وہ قدریں جو صدیوں کی مشاطگی کے بعد تکمیل کو پہنچی تھیں آج برباد ہو کر رہ گئیں ہیں، محبت کی جگہ تعصب نے لے لی اور فراخدلی کی جگہ کم ظرفیاں آگئیں۔ لاہور میں شعراء و ادبا کے قریب ہو کر دیکھئے تو شعر و ادب سے نفرت ہو جاتی ہے، دوسروں کا تو کیا ذکر، اپنوں میں منافقت کی سڑاند آنے لگی۔ کسی بے راہروی پہ کوئی معترض نہیں، کسی کی غلطی پہ کوئی ناقدانہ نظر نہیں ڈالتا، حالانکہ اس سے ادب کی اصلاح ہوتی ہے۔

ہر چند کہ یہ گمراہی کا طوفان بڑھتا ہی جا رہا ہے لیکن بعض ادیبوں اور شاعروں کو دیکھ کر مایوس ہوتے ہوتے امید کی لہر بھی ابھر آتی ہے اور مجھے اطمینان ہو جاتا ہے کہ اس دور کی سرزنش کے لئے ایک نئی نسل آ رہی ہے جن میں ہر شاہین ان مردار خوار گدھوں اور چیل کوؤں کے جعلی لباس نوچ ڈالے گی۔ اور ان کی پروپیگنڈے کی بیساکھیوں پہ رینگتی ہوئی لنگڑی لولی شاعری اور مسلول و مدقوق ادب محتاج خانوں میں ملے گا اور ان کے مبروص فکر و خیال کے شجرے عام کر دیئے جائیں گے۔

لکھنؤ کی آمد و رفت میں جہاں میری معلومات اور ادبی زندگی میں حسین اضافے ہوتے، وہیں ترقی پسندوں سے بھی نزدیکی ہو گئی اور بڑی پُر لطف صحبتیں رہیں، جناب سبط حسن اور علی سردار جعفری سے بھی شب و روز تبادلۂ خیالات رہا۔ میری نظر میں یہ دونوں صحیح ادیب و شاعر ہیں، کیفی اعظمی، ساحر لدھیانوی اور جاں نثار اختر کے علاوہ معین احسن جذبی، مجاز، فرحت اچھے بلند اور سلیم الطبع لوگ ہیں جو ادب کے معاملے میں نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

شروع شروع میں مجھے جس قدر سبط حسن نے متاثر کیا تھا اور سردار جعفری نے اپنی چھوٹ پھینکی تھی اگر اسی طرح اور اسی اخلاق و جہد کے دس پانچ لوگ اور مل جاتے تو ممکن تھا کہ میں اسی رَو میں بہ نکلتا اور اپنا اصل گھاٹ چھوڑ دیتا۔ مگر دوسرے

ترقی پسندوں کے قول و فعل میں تضاد دیکھ کر میں نے وہ راستہ ہی بدل دیا، اُن میں آپس کے اختلاف اس قدر تھے کہ کسی پر بھی مخلص ہونے کا گمان گزرنا دشوار سی بات تھی، وہ جانب داری، دھڑے بندی، اور دوست نوازی میں اس قدر لت پت تھے کہ خیال پرستی اور زبانی جمع خرچ کے علاوہ کہیں ان کی زندگی کے کسی گوشے سے بھی انسانی ہمدردی کے آثار ظاہر نہیں ہوتے تھے۔ وہ شعر و ادب کے ہر شاہکار کو جو اُن کے طبقے میں سے کسی کی تخلیق نہ ہو توجّہ کے قابل خیال نہیں کرتے تھے۔ بڑے سے بڑے اور بلند معیار سے بلند معیار شاعر اور ادیب کو نظرانداز کر دینا اُن کے لئے کوئی بڑی بات نہیں تھی، یہی سبب تھا کہ وہ چند لوگ پوری تحریک کے لئے تپِ دق بنے ہوئے تھے چنانچہ تھوڑے ہی دنوں میں ملک کے گوشے گوشے میں ترقی پسندی کے خلاف چہ میگوئیاں ہونے لگیں، اختر حسین رائے پوری اور ریشؔ الٰہ آبادی جیسے لوگوں نے اُکتا کر سرکاری ملازمتوں کے طوق گلے میں ڈال لئے اور اس بڑے قافلے کی یادگار چند مجاور رہ گئے اور اُنھوں نے بھی کسی ترکیب سے زبان میں لوچ اور جذبات میں سبک روی پیدا کر لی! اب وہ کہیں کہیں تکیہ داروں کی طرح نظر آتے ہیں اور ہوٹلوں میں جوانی کی رنگین یادگاروں کا ذکر اور صحیح ادباء و شعراء کی تضحیک اُن کا شعار رہ گیا ہے۔ یہ اُن کی مشرب سے علیحدگی تو نہیں لیکن گیدڑ جھیرے میں گِر گیا ہے اور کوئی پوچھتا ہے تو کہتا ہے کہ اس بیرن میں بھیں کمرہ لے لیا ہے۔

ایک سفر ریزہ

مَیں لکھنؤ سے بریلی ہوتا ہوا دہلی آیا تھا کہ اچانک فتحپوری میں رفیق فاروقی اور قتیلؔ[۲] سے ملاقات ہو گئی وہ لاہور سے بمبئی جا رہے تھے اور تقریباً دو چار روز کے لئے دہلی اُتر پڑے تھے ہم سب شمس الرحیم زلفی سے جا کر ملے، مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ چند منٹ میں قتیلؔ اور زلفی دونوں ایسے ہو گئے جیسے برسوں کے دوست ہوں۔

جب اُنھیں یہ معلوم ہوا کہ مَیں میرٹھ "فیضِ عام" کے مشاعرے میں جا رہا ہوں تو

---

[۱] مصطفےٰ زیدی مرحوم [۲] رفیق قتیل کاشمیری

دونوں ضد کرنے لگے کہ ہم بھی مشاعرہ سُننے چلیں گے مجھے بادلِ ناخواستہ یہی کہنا پڑا کہ اچھا چلئے، چار بجے اسٹیشن پہنچ جائیں، وہیں ملاقات ہوگی۔

میں اسٹیشن پہنچا تو وہ مجھ سے پہلے ٹکٹ لئے ہُوئے موجود تھے اور رفیق فاروقی کو ہوٹل میں چھوڑ آئے تھے ساتھ ہی کھانے کا سامان بھی تھا، مَیں نے کہا کہ اس ذرا سے فاصلے میں کھانے پینے کے سامان کی کیا ضرورت تھی ؟ یہ سُن کر وہ دونوں خاموش تو رہے مگر اُن کے تیوریوں سے تلخی کا دھواں اُٹھا مجھے حیرت تو ہُوئی مگر خاموشی سے ہم تینوں گاڑی میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہ دانستہ مجھ سے فاصلے پر بیٹھے۔ مَیں سوچتا رہا کہ یہ کیا بات ہے آج ؟

ابھی گاڑی روانہ نہیں ہوئی تھی کہ قتیلؔ نے دال سیو قسم کا چبینا نکالا اور زلفیؔ نے بندر کی طرح ہاتھ مار کر گرا دیا، اُس وقت معلوم ہوا کہ یہ دونوں تو دُھت ہو کر آئے ہیں اور میرٹھ تک پہنچتے پہنچتے جانے کیا کیا بدتمیزی کریں گے لیکن افسوس کے سوا کیا چارۂ کار تھا،

مَیں زلفیؔ کو ایک عرصہ سے جانتا تھا اور یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ اِن کوتکوں کا انسان نہیں، وُہی کیا اس کے خاندان میں سب ثقہ قسم کے لوگ تھے۔ زلفیؔ کا بڑا بھائی حکیم عبدالرحیم نہایت شریف اور ماہر طبیب ہے۔ اس کے والد صُوفی عبدالرحمٰن صاحب نہایت متقی صوفی منش اور باشرع بزرگ تھے، لیکن نہ جانے زلفیؔ پر کیا بنی کہ خراباتی ہوگیا، وُہ دونوں تھوڑی دیر میں ایک دُوسرے سے اس قدر بے تکلف ہو گئے کہ الامان والحفیظ۔

مُجھے فکر ہُوئی کہ اب کیا ہوگا یہ تو مشاعرہ میں بھی یہی رہیں گے جو ہیں اور شاید اس سے زیادہ ہی بہک جائیں، کیونکہ جب شراب بولتی ہے تو ذہن سے حفظِ مراتب کے خانے خالی ہونے لگتے ہیں اور ذات و صفات کا تعلق واضح نہیں رہتا۔ بلکہ یوں کہئیے کہ ذہنی عمل میں خیر و شر کی تحلیل کا عمل بند ہو جاتا ہے اور انجام ظاہر ہے، خیریت یہ گزری کہ اُس ڈبّے میں تمام سیدھے سادے دیہاتی سفر کر رہے تھے لیکن وُہ بھی ایک دوسرے کی طرف معنی خیز

نگاہوں سے تک تک کے رہ جاتے تھے۔

جب مَیں نے دیکھا کہ یہ گالی گلوچ کی حدوں کو چھونے لگے اور ان کی گفتگو میں فقروں کے جوڑ ڈھیلے ہو کر کھڑکھڑانے لگے اور لہجے میں تشنج آگیا تو مَیں نے قریب جا کر رازدارانہ لہجے میں کہا کہ بہت ہو چکی اب اس پھکڑپن کو بند کرو! وہ احتراماً خاموش تو ہو گئے لیکن ایک بار تو دیدے پھاڑ پھاڑ کر میری طرف اس طرح دیکھا کہ مجھے مسکرا دینا پڑا۔ مَیں سمجھ گیا کہ ان کے شعوری اوسان خطا ہو رہے ہیں اور فہم و ادراک کی چھلنیوں کے سوراخ کوڑے کرکٹ سے بند ہو گئے، اب ان کا ہوش میں رہنا دشوار ہے، مَیں اپنی عزت کے خیال سے اور بھی الگ ہو کے بیٹھ گیا، کیونکہ وہ کھڑکی کے سامنے ہوائیں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کی گفتگو اس مقام تک آ چکی تھی جب الفاظ نطق کی پھٹکی سے ڈرنے اور جھکنے لگتے ہیں کہتے کچھ ہیں اور نکلتا کچھ ہے، لیکن جُوں جُوں وہ غنغناہٹ میں ہاتھ پاؤں مار کر گم ہو رہے تھے، اُن کی بلّور مزاجی چمکتی جا رہی تھی اور لہجہ وہی جھلکار دے رہا تھا جو میرے لئے اور بھی فکر کا باعث تھا، کیونکہ شراب تو عموماً ضمیر کو انلارج اور احتیاط کو معزول کر دیتی ہے۔

مجھے زیادہ فکر اس کی تھی کہ کالج کی یُونین کے اراکین اسٹیشن پر آئیں گے اور کنور شمشاد علی خاں سیکرٹری ہیں[1] انھیں اس عالم میں دیکھ کر میرے متعلق کیا اندازہ لگائیں گے،

میرٹھ کے اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو مَیں ان دونوں کو لئے دُور جنگلے کے اختتام پر جا کر کھڑا ہو گیا، شمشاد علی خاں ایک ایک ڈبے میں مجھے ڈھونڈھتے پھر رہے تھے آخر یُونین کے تمام اراکین مایُوس ہو کر لَوٹ گئے اور مَیں دُعائیں مانگتا رہا کہ الٰہ العالمین اِدھر اُن کی نظر نہ پڑے۔ سجاد میاں نے ایک بار ہماری طرف رُخ کیا۔ مگر آگے کھسک گیا۔

جب وہ لوگ رخصت ہو گئے تو مَیں اس جوڑے کو لے کر سیدھا کمبوہ دروازے سعید ہوٹل میں پہنچا اور انھیں ایک کمرے میں لٹا کمرہ بند کر کے مشاعرے میں چلا گیا،

---

[1] شمشاد علیخاں نواب جمشید علی خاں کے بڑے صاحبزادے ہیں۔ آجکل کراچی میں مقیم ہیں۔ مسرت کی بات ہے کہ وہ

مشاعرے والے حیران تھے اور ہر شخص مجھ سے پوچھتا تھا کہ آپ آخر آئے کس راستے ؟ اور مَیں سب کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹالتا رہا۔ اصل بات سے کیسے آگاہ کرتا، اطمینان سے مشاعرہ ہُوا اور اختتام پر رخصت ہوکر سعید ہوٹل پہنچا، کمرہ کھول کر دیکھا تو بستر خالی تھے۔ ایک دفعہ تو دِل دھک سے ہوکر رہ گیا لیکن پھر جو دیکھا تو دونوں اپنی اپنی چارپائیوں کے نیچے ٹسکڑے پڑے ہیں، کمرے میں قَے کی ایسی بدبُو پھیلی تھی کہ بُٹ پڑی چلنے لگی، مَیں نے سانس روک کر جلدی جلدی دروازے کھولے اور کھڑکیوں سے پردے اُٹھائے پھر بمشکل تمام اُنھیں جگایا۔

جاگتے ہی فرمانے لگے ہم غسل کرلیں تو مشاعرے میں چلیں گے۔ مَیں سر جُھکا کر "اچھا جی" کہہ کر خاموش ہوگیا جب وہ نہا دھوکر اس دُنیا میں آئے تو نہایت شرمندہ ہوئے اور دونوں دہلی تک معافی مانگتے چلے آئے۔ جب مَیں نے زتقی سے دریافت کیا کہ تمہیں شراب کی یہ لت کہاں سے لگی تو اس نے جواب میں کہا کہ یہ میرے ایک معالج کی مہربانی ہے جو مجھے ہسپتال میں برانڈی آمیز دوا پلاتا تھا۔ تندرستی کے بعد ڈاکٹر کی آمدو رفت میرے گھر جاری ہوگئی، وہ مجھے اُسی طرح گھر پر بھی اپنے ساتھ کبھی وسکی اور کبھی برانڈی کو دوا کا نام دے کر پلاتا رہا۔ اب بھی وہ ڈاکٹر اسی طرح میرے یہاں آتا جاتا ہے اور اس کا وہی مشغلہ میرے ساتھ ہنوز جاری ہے، لیکن مَیں آج سے توبہ کرتا ہُوں کہ اب کبھی شراب کے نزدیک نہیں جاؤں گا۔ اُس کے بعد میں نے زتقی کو کبھی اس عالم میں نہیں دیکھا۔ رفیق فاروقی اور قتیل دونوں بمبئی چلے گئے تھے۔ رفیق فاروقی تو کچھ دنوں بعد لاہور آگئے اور قتیل کا ہنوز کوئی پتا نہیں چل سکا۔ اُسے میری آنکھیں ڈھونڈتی ہیں، خدا کرے جہاں ہو لیافیت ہو۔

رفیق فاروقی اسکول میں معلّم ہیں اور اُن سے شگفتگی کے ساتھ اب تک مراسم چلے آتے ہیں۔ وہ ایک مخلص انسان ہیں۔

جہاں بیشمار راہ

میرا مطالعہ جتنا بڑھتا گیا اسی نسبت سے کتب بینی کے ذوق میں بھی ترقی ہوتی چلی گئی ساتھ ہی میری شاعری کی مقبولیت نے میرے لئے جتنی سہولتیں پیدا کیں اسی قدر میرے دوستوں کی تعداد اور آمد و رفت میں بھی اضافہ ہوگیا کچھ دنوں تو مجھے اس سے ذرا خوشی سی محسوس ہوئی لیکن بہت جلد اس کا بھی انکشاف ہوگیا کہ آنے جانے والوں سے صرف میرے وقت ہی کا زیاں نہیں بلکہ ان میں حاسدوں اور منافقوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے اسی احساس و انکشاف نے دوستی کے متعلق میرے پرانے تجربات کو اور بھی اجاگر کر دیا جس سے مجھے خود پر غصّہ آنے لگا حالانکہ جو لوگ عزیزوں کی محبت سے محروم اور دوستوں کے فریبوں سے دل برداشتہ ہو جاتے ہیں وُہ اجنبیوں کے معمولی سے اخلاق اور سلوک کو غنیمت جاننے لگتے ہیں لیکن چونکہ ان لوگوں کی فطرتیں بے نقاب ہو چکی تھیں اس لئے میں ہر قدم پر ذرا سوچ سمجھ سے کام لینے لگا تھا اور جہاں مجھے کوئی اپنی سادگی کا نقصان بیتاب کر دیتا اُس وقت میری رُوح میرے نشیب پر ہنستے اور میری گمراہی کا مذاق اُڑانے لگتی بعض اوقات جب کوئی مجھ سے ذرا ترش روئی سے پیش آتا تو میں اپنی زود اعتقادی پر خود بھی چونک پڑتا اور خاموش ہو جاتا کیونکہ ایسے موقع پر گفتگو اتنی ہی خطرناک ہوتی ہے جتنی گفتگو کے موقعوں پر خاموشی! ایسے موقعوں پر میری زبان سے صرف اتنا نکلتا "خود کردہ را علاجے نیست" اس کے بعد ایک زندانہ وار سانس سب کچھ سینے میں دفن کر دیتی۔ شاعری کے باعث اچھے اور بلند ذوق لوگوں میں میری آمد و رفت دیکھ کر معمولی معمولی کاموں کے لئے غریب اور پریشان لوگ بھی میرے پاس آنے لگے تھے اور میں جہاں تک ہو سکتا دامے۔ درمے۔ قدمے۔ سخنے اور قلمے اُن کی امداد کو اپنا فرض منصبی خیال کرتا تھا۔

بعض کج نظر لوگوں نے میرے اس رویے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا لیکن میں نے کبھی نیکی کے وقت کسی کی ناراضی کی مطلق پروا نہیں کی اور برابر یہ عبادت میرا مشغلہ رہی کیونکہ میں جانتا تھا کہ حقائق پھر حقائق ہیں تاریک ضمیر اور انسان دشمن لوگوں کی دشمنی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی حالانکہ اگر میں بھی ان کی طرح ہو جاتا تو انہیں کہیں زیادہ نقصان پہنچ سکتا تھا مگر میں نے اُن جیسا بننے کی کبھی سعی نہیں کی اور ہمیشہ اپنا معاملہ خدا پر چھوڑے رکھا۔

میں نے ہمیشہ طالب علموں کو شاعری سے منع کیا اور اس کا سبب یہ ہے کہ شاعری کے باوجود میری علمی تشنگی جوں کی توں رہی کاش میں پہلے پڑھتا اور پھر شاعری کی طرف آتا لیکن شاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا شاعری ہو یا ادب نہایت دلچسپ اور پُر کیف مشغلے ہیں لیکن جب انسان کو یہ چسکا لگ جاتا ہے وہ دُنیا کے اور کسی کام کے قابل نہیں رہتا، کیونکہ اس سے احساس بیدار اور طبیعت نازک ہو جاتی ہے جو دُنیادار انسانوں کے لئے قدم قدم پر خطرے کا الارم ہے۔

خواب دہلی

جناب اسحاق شور اور شمس زبیری کی وساطت سے دہلی میں کئی بلند مقام شخصیتوں سے ملاقاتیں ہوئیں جن میں حضرت مولانا عبدالسلام نیازی، حضرت خواجہ عبدالمجید، شمس العلماء مولانا عبدالرحمان، مولانا احمد سعید اور مولانا سمیع اللہ وغیرہ شامل ہیں چونکہ گوردوارہ روڈ سے "برہان" کا دفتر قریب تھا اس لئے گاہ گاہ مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی حاضری ہوتی رہتی تھی اور وہاں مولانا سعید احمد اکبر آبادی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، جناب یُوسف بخاری سے شرف نیاز میرے لئے باعث افتخار تھا اور انھیں لوگوں میں بسمل شاہجہاں پوری بھی ہیں۔

اس ادارے کے تمام اراکین کو میں نے قابلِ قدر پایا اور ان حضرات کا خلوص میرے دل پر نقش ہے۔ یہیں ایک دن ناشتہ پر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی سے بھی ملاقات ہوئی

اُن دنوں میں نے اپنی والدہ کا مرثیہ "گورستان" کے نام سے کہا تھا سب کی فرمائش پر میں نے وہی مرثیہ سُنایا، میری توقع کے خلاف مولانا شبیر احمد صاحب نے مجھے اس قدر داد و تحسین سے نوازا کہ مَیں حیران رہ گیا اور مجھے اس دن یقین ہُوا کہ علمائے دیوبند چوکھا علم رکھتے ہیں۔ ان سے نزدیک ہو کر دیکھا جائے تو شعر و ادب کے علاوہ ان کے وضعدارانہ مراسم بھی عوام کی جگری دوستی سے زیادہ ایثار پسند ملیں گے اور ناموسِ رسُول پر تو ان کی جاں نثاریوں اور مصائب طلبیوں سے تاریخ کا سینہ اَٹا پڑا ہے۔

"برہان" کے دفتر کے پاس ہی "حرم"[۱] کا دفتر تھا، وہاں مولانا محمد سلیم اور حافظ نعیم صاحب سے بھی بڑی نزدیکی ہو گئی تھی ہم وطنی کے باعث وہ اور بھی محبت کرتے تھے۔

اُردو بازار میں مولوی سمیع اللہ صاحب کی دکان پر جناب شمس زبیری نے مجھے شیخ فضل الٰہی سے بھی متعارف کرایا اور اُنہی نے ایک ذکر پر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ایک لنگڑے شخص کو دُور سے دکھایا اور بتایا کہ یہ داڑھی والا معذور شخص یہاں جیب تراشوں کا خلیفہ ہے، صُبح کو جب یہ اپنے دس دس بارہ بارہ سال کے بچّوں کو کیسہ تراشی کی تعلیم دیتا ہے اور قینچی لے کر انھیں بھیڑ بھڑکّا میں تیرنا سکھاتا ہے وُہ منظر دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے ہر بچّہ اپنا گھنگھروؤں والا فرغل پہن کر ٹیڑھی میڑھی لکیروں پر اس طرح چلتا ہے کہ ایک گھنگھرو بھی آواز نہیں دیتا حالانکہ اس کے دامن اور آستینیں گھنگھروؤں کی قطاروں سے بھری ہوتی ہیں، چلتے میں جہاں کسی کا گھنگھرو بجا وہیں خلیفہ کی قینچی نے احتساب کیا۔

مگر اس خلیفہ کے تمام شاگردوں میں نہ کوئی شراب پیتا ہے نہ جُوا کھیلتا ہے نہ کسی کو چرس کا چسکا ہے نہ تمباکو کا نشہ! اگر خلیفہ سے ذرا کسی لڑکے نے دُوسرے لڑکے

---

[۱] "حرم" ماہنامہ تھا، وُہ تھا تو تبلیغی لیکن اس کی آمدنی مدرسہ صولتیہ (مکّہ مکرّمہ) کو جاتی تھی، سلیم صاحب تقسیم کی مصیبت میں مکّہ مکرّمہ چلے گئے تھے مَیں عمرہ کرنے گیا تو عرصہ کے بعد اُن سے ملاقات ہوئی اور وُہ اُسی طرح ملے جیسے بزرگ اپنے چھوٹوں سے ملتے ہیں۔ حافظ نعیم صاحب انتقال کر گئے جو میرے جگری دوست تھے، خُدا اُنھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین عزیزم شمیم سے ملاقات نہ ہونے کا ملال رہا، خدا انھیں خوش رکھے۔

کی شکایت کر دی کہ اُن کی عدم موجودگی میں یہ سگرٹ پی رہا تھا اور خلیفہ کی تحقیق و تفتیش میں وہ صحیح ثابت ہو گئی بس پھر کیا ہے قینچی سے کرنیلی کر دیتا ہے یہ عجیب قسم کا اُستاد ہے ہر وقت اس کی تلقین ہے کہ نشہ پینے سے ہاتھ میں رعشہ آجاتا ہے اور پھر فنکار صفائی سے کیسہ نہیں کاٹ سکتا۔ اسی طرح یہ اپنے تمام تلامذہ کو روز اخلاقی جرائم کے خلاف لکچر دیتا رہتا ہے۔ اس کے تمام شاگرد جو کما کر لاتے ہیں وہ اس خلیفہ کے پاس جمع کرتے ہیں اور یہ پھر مناسب حصّے لگا کر تقسیم کرتا ہے، یہی نہیں یہ شاگردوں میں عید تیوہار کے علاوہ اُن کی رسم ختنہ اور شادی وغیرہ میں اپنے بچّوں کی طرح دل کھول کر صرف کرتا ہے۔ اس کے شاگردوں میں کوئی ایسا نہیں جو نماز نہ پڑھتا ہو اور دُنیا کے لہو و لعب میں مبتلا ہو، اِلّا جیب تراشی۔

مَیں نے کہا "کیوں نہ ہو کمائی بھی تو آخر انھیں کی ہوتی ہے" اس پر شیخ صاحب نے کہا "نہیں جناب یہ اپنا الگ کام کرتا ہے شاگردوں کے بھروسے پر نہیں رہتا" مَیں نے کہا، "جناب اپنا کام کرتا ہے ؟"

شیخ صاحب۔ "ارے میاں یہ شاگرد کی پیٹھ پر سوار ہو کر جیب کاٹتا ہے، مگر مہینہ دو مہینہ میں ایک دو کام دکھاتا ہے! وُہ بھی صرف گذارے کے لئے، ابھی چند روز ہوئے خلیفہ کا کیسہ جواب دے گیا اس نے فوراً اپنے ایک مضبوط سے شاگرد کو بلوایا اور کہا "چلو آج جیب میں کچھ نہیں فقیر خالی جا رہے ہیں، شاگرد نے کمر باندھی اور استاد کو چڈھی لے کر بولا حکم خلیفہ ؟"

خلیفہ۔ "چلو، ریلوے اسٹیشن کی طرف چلو"۔ شاگرد یہ بار احترام پیٹھ پر اُٹھائے ریلوے اسٹیشن پہنچ گیا اور سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اُسی وقت ایک نوجوان بڑے کرّوفر سے لپکتا ہوا آیا اور ٹکٹ خرید کر نوٹوں سے بھرا بٹوہ پتلون کی پچھلی پاکٹ میں ٹھونس کر چلتا بنا، اُدھر خلیفہ نے اپنے مرکب کو مہمیز کیا

اور وہ اس کے پیچھے پیچھے لپک لیا۔ سیڑھیوں سے چڑھ کر جب درمیانہ ہمواری پر گئے تو خلیفہ نے اپنا خالی بٹوہ نوجوان کے پاؤں میں پھینکا، نوجوان دیسی تو تھا ہی بٹوہ اُٹھایا اور خالی پا کر وہیں پھینک دیا مگر اسی اثنا میں خلیفہ اپنا کام کر کے دُور جاچکا تھا، خلیفہ نے پلیٹ فارم پر اُترتے ہی بٹوہ شاگرد کو دے کر کہا جلد اسٹیشن سے باہر پہنچا دو۔" یہ تمام ہنگامہ تین چار منٹ میں ہوگیا، خلیفہ اپنے کمرے میں آکر نوافل ادا کرنے لگا اور شاگرد کو کام پر بھیج دیا۔ بٹوے میں خلیفہ کا تین چار ماہ کی کفالت کا سامان تھا۔

مجھے خلیفہ کی شخصیت اور اس کے اوصاف سُن کر بڑی حیرت ہوئی، مَیں نے شیخ صاحب سے کہا "جناب میں تو اس خلیفہ کو بزرگان دین اور صاحب باطن لوگوں میں سے خیال کرتا ہوں، کیونکہ نہ یہ عبادت سے غافل ہے۔ نہ حقوق العباد سے، فقیروں کو کبھی مایوس نہیں کرتا اور اپنے اردگرد کے لوگوں کو کسی اخلاقی پستی میں نہیں دیکھنا چاہتا، اور بزرگوں میں کیا ہوتا ہے؟"۔

شیخ صاحب نے فرمایا "میاں دیر تو ہو ہی رہی ہے ان کے ایک شاگرد کا معمولی سا کارنامہ سُن لو، یہ زیادہ دنوں کی بات نہیں کہ شام کو اُس نے خلیفہ کے سامنے سوا دو روپے لا کر رکھ دیئے۔ خلیفہ نے اُس کی طرف آنکھیں نکال کر کہا "اے خبیث! صدر بازار میں پہاڑ سا دن اور یہ سوا دو روپے؟ بے ایمان یہ کس غریب کو مار دیا؟ خُدا کو کیا جواب دے گا۔ ایسے اتنے پیسوں پر بھی کوئی ہاتھ ڈالتا ہے؟

شاگرد نے بصد عجز عرض کی "خلیفہ کیا بتاؤں میں نے تو کئی ہزار پر ہاتھ مار دیا تھا مگر وہ کم بخت انگریز تھا، مجھے تھوڑی دُور چل کے خیال آیا کہ "قیامت کے میدان میں اگر عیسیٰ علیہ السلام نے میرے آقا محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ شکایت کی کہ دیکھئے آپ کے اُمتی نے میرے امتی کی جیب کاٹی تھی تو حضورؐ کو ملال ہوگا" یہ خیال آتے ہی مَیں واپس مُڑا اور بٹوہ اُسے واپس کر دیا۔ وہ میرا نام پتا

بھی پوچھتا رہا لیکن مجھے اس قدر ندامت تھی کہ مَیں وہاں کھڑا نہیں رہ سکا، اس کے بعد ایک سیٹھ کی جیب ٹوٹی تو اُس کے پاس صرف یہ سوا دو نکلے جو آپ کی نذر ہیں۔ خلیفہ نے اُس کی پیٹھ ٹھونکی اور خوش ہو کر اپنی اَنٹی سے اُسے دس روپے بطور انعام مٹھائی کھانے کے لئے دیئے اور کہا خُدا تیرے ایمان کو روشن کرے تو نے نہایت اچھا کام کیا ہے بیٹا! تُو نے عصمتِ رسُولؐ کی حفاظت کی ہے خدا تیری حفاظت کریگا۔

میں تو یہ سُن کر چکرا گیا کہ جیب تراشی میں یہ کردار اور اتنی پاکیزہ تعلیم، یہ تو آج بڑی بڑی خانقاہوں میں نہیں اور خلیفہ کے اس شاگرد کی مثال تو دُور دُور نظر نہیں آتی غالباً خلیفہ کو معلوم ہے کہ صاحب ولایت اگر غاصب کی جیب کاٹ لے تو خدا معاف کرنے والا ہے اُسے بخشش سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔

تقسیم ملک کے بعد شیخ فضل الٰہی لاہور آگئے تھے اور میری نظر میں دہلی کی زبان پر عبور رکھنے والے جہاں اشرف صبوحی اور خواجہ محمد شفیع ہیں وہیں شیخ فضل الٰہی صاحب کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، مگر نہ جانے اُنھوں نے اپنا کوئی کارنامہ بھی چھوڑا ہے یا نہیں اشرف صبُوحی صاحب کی کئی ایک کتابیں تو چھپ چکی ہیں جو زبان و بیان کے اعتبار سے دلّی کی نمائندگی کرتی ہیں۔

خواجہ محمد شفیع کی بھی اُردو کے سلسلے میں بڑی خدمات ہیں دہلی میں اُن کے دولتکدے پر ہر اتوار کو مجلس مشاعرہ منعقد ہوتی تھی جس میں دہلی اور بیرون دہلی کے لوگ بھی شریک ہوتے تھے اور مقامی مشاعرے برپا کرنے والوں کی نظر میں بھی یہ ایک مرکز تھا، لاہور آکر بھی انھوں نے اس روایت کو زندہ رکھا، اب تک ان کے یہاں اُسی طرح مشاعرے کی روایت چلی آتی ہے جس میں صاحب ذوق حضرات کے علاوہ مختلف انجمنوں کے صاحبِ خدمت بھی شریک ہوتے ہیں، ان میں جناب رسا جالندھری، فرغ لکھنوی، مائل نقوی، ابن سائل[۵]، زیبا ناروی، منظور احمد عثمانی، حکیم بشیر احمد مصوّر دہلوی، مختار بخاری۔

---

۵ نواب قطب الدین ابنِ سائل کا ۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء کو انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

شورش دہلوی، وحید خیال اور جناب احسان الحق وغیرہ کا دم غنیمت ہے۔ علاوہ ازیں جناب ڈاکٹر قمر میرٹھی، جناب نشتر جالندھری بھی بزم قمر اور بزم نشتر کے ذریعہ اُردو کی ترویج و اشاعت میں رات دن خون پسینہ ایک کئے رکھتے ہیں۔

جناب ڈاکٹر قمر میرٹھی، حضرت شمس وارثی میرٹھی کے خلفِ اصغر ہیں جو ایک صوفی منش اور قادر الکلام اُستاد تھے۔ انھیں شمس الشعراء کا خطاب بھی تھا۔ اور حضرت بیان و یزدانی میرٹھی کے شاگردِ رشید تھے۔ ڈاکٹر قمر اپنے ہمعصروں میں اپنا جداگانہ رنگ رکھتے ہیں جو جدید اور قدیم رنگ کے درمیان ہے لیکن رو بہ جدید!

افسوس ہے کہ تقسیم ملک میں باہر سے آنے والا یہ قافلہ اپنی روایتی شاعری کی چار دیواری میں گھر کر رہ گیا۔ اور وقت کے تقاضوں پر دھیان نہ دیا جس سے یہ نقصان ہُوا کہ ارتقائے ادب کا کارواں عنرلوں نکل گیا اور یہ اپنی سادہ کاری سے باہر نہ آ سکے۔

ان میں نشتر جالندھری صاحب، نظم طباطبائی اور شوق نیدوائی کے شاگرد ہیں اور انھیں فن پر قابلِ رشک عبور ہے۔ پنجاب میں اس کینڈے کا صاحبِ فن نظر نہیں آتا۔

ہاں ایک جناب نظیر لکھنوی ہیں جو ماضی پر ٹکٹکی باندھ کر نہیں چلتے اور کھلی فضا میں پرواز کو زندگی خیال کرتے ہیں لیکن ناقدرتی زمانہ نے انھیں پنپنے کا موقع نہیں دیا، وہ اس ضعیفی میں بھی بڑی جانکاہ مزدوری کر کے پیٹ پالتے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ مزدوری کے بعد جسم کتنا ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ مشاعروں اور مناظموں کے علاوہ اُدبا و شعراء کی مجلسوں میں بھی شریک نہیں ہو سکتے اور ہمارے معاشرے میں ابھی جوہر شناسی کا دور دُور پتا نہیں، البتہ معاصرانہ چشمکیں روز ہنگامے برپا رکھتی ہیں۔

یُوں تو حضرت زیبا ناروی بھی زبان و بیان کے معاملے میں معمولی معلومات کے آدمی نہیں لیکن اب انھیں پیری مریدی کا انہماک زیادہ ہو گیا اور شعر و ادب پر ان کی پہلی سی استعداد کام کر رہی ہے نئے رجحانات سے وُہ بھی دُور ہیں ہاں زبان کا چٹخارا اور لہجے کا تیکھا پن اُن کا حصہ ہے۔

ہارڈنگ لائبریری کے مشاعرے میں پہلی بار میری ملاقات سر شاہ سلیمان صاحب سے ہوئی، شاہ صاحب اس مشاعرے میں صدارت کے فرائض انجام دے رہے تھے اور ہندوستان کی بڑی اہم شخصیت تھے۔ وہ جہاں عدلیہ کے بلند مقام رکن تھے وہیں سائنس داں بھی تھے شعر و ادب ان کا محبوب مشغلہ تھا ان کا ارادہ تھا کہ جس طرح ممکن ہو سائنس کو جلد از جلد اردو میں منتقل کر دیا جائے اس سلسلے میں ادیبوں کی حوصلہ افزائی بھی اُن کے عزائم کی شاہد ہے۔ کئی کتابوں پر میں نے اُن کا نام اس حیثیت سے دیکھا ہے۔ ویسے بھی اردو زبان پر ان کے احسانات ہیں۔

مشاعرے میں جب میں نے اپنی مزدوروں اور کسانوں کے حالات پر نظمیں پڑھیں تو وہ ضبط کے باوجود آنسوؤں پہ قابو نہ پا سکے اور اس قدر آبدیدہ ہوئے کہ رومال تر ہو گیا، اُنھوں نے مجھے اسٹیج پر ہی کہا کہ کل صبح چائے پر میں آپکا انتظار کروں گا۔

دوسرے دن میں پہنچا تو موصوف مجھ سے بزرگوں کی طرح پیش آئے، اُنھوں نے کہا کہ اس ملک میں انقلاب لانے اور نفسیات اور سائنس کو عام کرنے کے لئے آپ جیسے شاعروں کی ضرورت ہے، ممکن ہے کسی اسٹیج پر آکے گورنمنٹ آپ کی طرف سے مشکوک ہو جائے لیکن یاد رکھیے آپ کا کلام انقلابی تاریخ کا بنیادی لٹریچر ہے، آپ اسی ڈگر پر چلتے رہیئے اور مجھے اپنے سے دُور نہ سمجھیئے مجھے آپ کی ہر خدمت سے خوشی ہوگی، میں نے شکریہ ادا کیا اور کہا حضور یہ دُعا فرمایئے کہ مجھے کسی خدمت کی ضرورت نہ پڑے، اس پہ اُنھوں نے مجھے ایسی آنکھیں کھول کر دیکھا جیسے وہ کچی نیند میں جگا دیئے گئے ہوں۔ وہیں گوپی ناتھ امن[1] سے بھی ملاقات ہوئی

دوسرے روز صبح کو نصیح الدین صاحب سے ملاقات ہوئی وہ مجھے رات سے ڈھونڈھتے پھر رہے تھے، وہ ہارڈنگ لائبریری میں سیکریٹری تھے، اور نہایت خوش اخلاق، ملنسار کے علاوہ علم دوست انسان واقع ہوئے تھے،

---

[1] گوپی ناتھ امن لکھنوی سے آج تک ویسی ہی ملاقات چلی آتی ہے۔ وہ بلند درجے کے شاعر، ادیب اور صحافی ہیں، اور شرافت پرست ۱۱

وہ اِس قدر خلوص سے ملے کہ ذرا سی دیر کے وقفے پر ایک عُمر کے تعلق کا گمان ہونے لگا، اُنھوں نے بتایا کہ دہلی کے ادبی حلقوں میں آپ کی نظموں کے چرچے ہیں اور سب لوگ سراہ رہے ہیں اب سے آپ جب بھی دہلی آئیں مجھ سے ضرور مِل لیا کریں، مَیں اُن کا شکریہ ادا کرتا رہا کہ دُنیا اچھّے انسانوں سے خالی نہیں مگر نہ جانے معاشرہ رُو بہ اصلاح کیوں نہیں ہوتا۔

رات کو پھر مشاعرہ ہُوا اور ڈیڑھ دو بجے شب تک چلتا رہا، اختتام پر مجھے نئی دہلی میں تال کٹورا پارک میں جانا تھا مَیں وہیں اپنے ایک کرم فرما کے یہاں مُقیم تھا، اس وقت جناب اظہار سہسوانی نے سواری کا انتظام کیا اور مستقر تک میرے ہمراہ گئے، وُہ غالباً پولس میں حوالدار تھے، بڑے کھلّے ڈُھلّے کے انسان! مَیں جب بھی اُن سے ملا ہُوں ایک رُوحانی تسکین سی محسُوس کی ہے دہلی میں اُن کے سینکڑوں شاگرد تھے اور وُہ نہایت اچھّا مضبُوط شعر کہتے تھے اور جیسا مضبُوط شعر کہتے تھے ویسا ہی مضبُوط کردار بھی رکھتے تھے نہ معلُوم اُن کا کوئی مجمُوعہ بھی چھپا ہے یا نہیں۔

حضرت جوشؔ ملیح آبادی سے پہلی ملاقات

ایک مرتبہ حضرت جوشؔ لاہور تشریف لائے اور لالہ پنڈی داس[1] کے مکان پر ٹھہرے۔ مَیں سیدھے سبھاؤ مزنگ میں اپنے گھر بیٹھا ہوا تھا کہ لالہ پنڈی داس نے ایک ملازم کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ حضرت جوشؔ ملیح آبادی تشریف لائے ہوئے ہیں اور آپ سے ملنے کے مشتاق ہیں۔ مَیں یہ سُن کر چونک پڑا کیونکہ میرے دل میں بھی ایک عرصہ سے شوقِ ملاقات پرورش پا رہا تھا۔ لیکن میرا

[1] لالہ پنڈی داس لاہور کے مشہور لوگوں میں تھے اور میں عوامی لوگوں کو اُن کا مداح پاتا تھا۔ جوشؔ صاحب کے وہاں قیام سے لالہ جی کی مردم شناسی بھی میری نظر میں آگئی۔

مکان اس قابل نہ تھا جہاں حضرت جوشؔ جیسی شخصیت کو بٹھا سکتا چنانچہ مَیں نے پیغامبر سے عرض کی کہ جوشؔ صاحب سے کہدیں کہ مَیں خود حاضر ہو رہا ہوں۔

مَیں نے جلدی جلدی میلے کپڑے دھو کر سکھائے اور اسی شکن آلود لباس سے لالہ پنڈی داس جی کے گھر جا پہنچا۔ جوشؔ صاحب اس وقت نیچے ڈرائنگ روم میں تشریف فرما تھے میں نے بصد عقیدت اُنھیں سلام کیا۔ جوشؔ صاحب نے اُٹھ کر مجھے سینے سے لگا لیا اور اس پُر خلوص معانقے سے میری پلکوں کی جڑوں میں آنسو سرسرانے لگے۔

جوشؔ صاحب نے مجھے اپنے سامنے کرسی پر بٹھا لیا اور فرمانے لگے مَیں آپ کی نظمیں معمولی معمولی اخباروں میں پڑھتا رہتا ہوں کیا اس سرزمین میں ابھی آپ کو پہچاننے والا کوئی نہیں ہے، مَیں خاموش رہا اور دل چاہتا رہا کہ بس میں ہو تو جوشؔ صاحب میں جذب ہو جاؤں۔

تھوڑی دیر کے بعد میں نے عرض کی کہ میری آرزو ہے کہ آپ میری نظمیں دیکھ لیا کریں کیونکہ مجھے یہاں میرے رنگ میں کہنے والا کوئی شاعر نظر نہیں آتا، جوشؔ صاحب نے فرمایا کہ آپ کے رنگ کا شاعر تو پورے ملک میں نہیں لیکن آپ نے یہ بات بہت ہی غلط سوچی ہے، مَیں تو مداحوں میں ہوں آپ مجھے اُستاد بنائے دے رہے ہیں۔ مَیں یہ جرم کر کے آپ کی شخصیت کو دبانا نہیں چاہتا۔ مَیں آپ کی شاعری میں نئے دَور کے تندرست جراثیم دیکھ رہا ہوں۔ آپ جیسے شاعر کا کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا خودکشی کے مترادف ہو گا۔ ہاں ہمارے آپ کے مراسم اب عمر بھر رہیں گے اتنے میں خاموش ہو گیا۔

یہ پہلی ملاقات حضرت جوشؔ سے عمر بھر کی ملاقات ہو کے رہ گئی بقول میرؔ ؎

روز ملنے پہ نہیں نسبتِ عشقی موقوف　　عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

مَیں بھی اُن کے یہاں حاضری دیتا رہتا ہوں اور جب جوشؔ صاحب لاہور تشریف لاتے ہیں تو غریب خانہ پر تشریف لا کر مجھے ضرور نوازتے ہیں ؎

والدہ سے جدائی

میری والدہ میری خاطر زندگی میں پہلی بار لاہور آنے کے لئے ریل گاڑی میں سوار ہوئیں اور بس، مَیں نے پھر انھیں گاند ھلے نہیں جانے دیا کیونکہ بحمدللہ مَیں انکی زندگی ہی میں ماں باپ کی عظمت اور مقام سے آگاہ ہو گیا تھا میری نظر میں ماں کی عظمت سجدے کے مقام کی عظمت والی بات تھی، اس کے علاوہ حالات بھی کچھ زیادہ تکلیف رساں نہیں رہے تھے ہر وقت میرے سامنے یہی رہتا کہ میرے والدین نے مجھے کس مصیبت سے پرورش کیا ہے اور کیسی کیسی تکلیفیں اُٹھائی ہیں، اس لئے میں چاہتا تھا کہ اُن کے تصور سے مفلسی اور تہورت کا جہنم اوجھل ہو جائے تاکہ اُنھیں سکون میسر آئے لہٰذا جب کسی مشاعرہ سے مصارف ملتے تو مَیں کبھی نوٹ کی صورت میں روپیہ لے کر گھر نہ جاتا بلکہ نوٹوں سے چاندی کے روپے بدلوا لیتا، پھر گھر جا کر والدہ کے قدموں پر ڈھیر لگا دیتا اور اُن سے کہتا " آپ انھیں اپنے قدموں سے چھو دیں تاکہ یہ میرے استعمال کے قابل ہو جائیں، اس سے وہ بہت خوش ہوتیں اور فوراً شکرانہ کے نوافل پڑھنے کھڑی ہو جاتیں اور میرے لئے دُعا کرتیں۔

جب سے مَیں نے ہوش سنبھالا تھا اُنھیں دائم الصوم ہی دیکھا، نماز کے پانچ وقتوں کے علاوہ وہ اشراق، چاشت، زوال، صلوٰۃ الاوابین اور تہجد بھی ادا کرتی تھیں آخر آخر تو یہ ہوا کہ وہ نماز کے سوا دُنیا کی ہر چیز بھول گئیں اگر کسی فقیر نے دروازے پر صدا لگائی یا پاس پڑوس میں کسی کا بچہ رویا تو وہ یہ سمجھتی تھیں کہ اذان ہو رہی ہے چنانچہ فوراً وضو کر کے نماز کی نیت باندھ لیتیں۔ وضو میں سہولت کے لئے مَیں نے ایک پانی کا ٹب رکھوا دیا تھا۔ اور اس طرح دن میں پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ نمازیں ادا کرنا ان کا معمول سا ہو گیا تھا۔

جب وہ بیمار ہوئیں تو مَیں نے اپنی اہلیہ کو اُن کے قریب بھی نہ آنے دیا کیونکہ مَیں

اس عبادت میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتا تھا سردیوں میں علی الصبح تاروں کی چھاؤں اُن کا بستر دھونے کے لئے دو میل نہر پہ لے کے چلا جاتا اور جب لوگ سیر کو جاتے اُس وقت میں واپسی پر شہر کے نزدیک پہنچ لیتا۔ اُن دِنوں میں نے ہمیشہ نکلتے ہوئے سورج کی شعاعیں پس پشت ہی رکھیں۔ گرمیوں میں جب چیل انڈے چھوڑتی ہے میں اُس وقت والدہ کا بستر لے کر نہر پر جاتا اور صاف کر کے سُکھا کر واپس لاتا۔ والدہ کی محبت اور عقیدت میں مجھے گرمی سردی کا کبھی کوئی احساس نہیں ہُوا اور میری عقیدت کی دیوار میں بڑی سے بڑی قوت نقب نہیں لگا سکی۔ میں اس وقت خود کو ایسی مقدس کیفیت میں محسوس کرتا جو بعض وقت خلوص کے ساتھ ایسی جگہ سربسجود ہونے میں ہوتی ہے جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔

مَیں کام کاج سے فارغ ہو کر عموماً انھیں کی خدمت میں حاضر رہتا ایک دن اُنھوں نے مجھ سے کہا "بیٹا! یہ سینما کیا چیز ہے؛ بچے شور مچاتے رہتے ہیں"۔ مَیں نے تشریح کی طوالت سے بچنے کے لئے صرف اس پر اکتفا کیا "اماں تصویریں چلتی پھرتی دکھائی دیتی ہیں اور کچھ نہیں"۔

اُنھوں نے حیرت سے کہا "تصویریں کیسے چلتی پھرتی ہوں گی؟"

مَیں آج شام کو سینما دکھاؤں گا! مَیں شام ہوتے ہی اُنھیں تانگے میں سوار کر کے سینما ہال میں پہنچ گیا۔ والدہ فلم دیکھتی رہیں اور مَیں اپنی والدہ کی صورت دیکھتا رہا جیسے کوئی پُجاری کُنبھ کے میلے میں کسی معبود کو پُوج رہا ہو بیٹھے بیٹھے تھوڑی دیر میں اُنھیں یکدم خیال آیا اور کہنے لگیں "ارے احسان! تصویروں کو تو اسلام نے منع کیا ہے مجھے جلدی یہاں سے لے چل۔ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔" اُن کے حکم کے مطابق میں اُنھیں لے کر گھر آ گیا اُنھوں نے آ کر عشاء کی نماز پڑھی اور بڑی دیر تک گڑگڑا کر معافی مانگتی رہیں۔

وہ بیمار تو مدت سے چلی آ رہی تھیں ایک دن جب اُنھوں نے خود کو موت کی طرف کھنچتے ہوئے دیکھا تو مجھے بلوا کر پاس بٹھا لیا اور خود بخود کہنے لگیں "دُنیا کی ہر چیز فنا ہونے کی

ہے بیٹا ! یہاں سب جانے کے لئے آتے ہیں میں نے تیری پرورش کے لئے کوئی غیر انسانی اور غیر شرعی ذریعہ اختیار نہیں کیا۔ کسی پیر فقیر کے کہنے سے کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو شریعت کے خلاف ہو، میں نے روزہ نماز کے علاوہ کسی نذر و نیاز کو روا نہیں گردانا اور خدا ہی کو حاضر و ناظر جانا ہے! خدا نے شاید اسی صلے میں یہ کرم کیا ہے کہ تو میرا بیٹا ہے۔ میں نہ رہ جاؤں تو غم نہ کرنا! موت سنّت ہے سنّت!! اور بس پھر آرام ہی آرام۔ اب شاید مجھے زندگی نہ ملے۔ میں تجھے اُسی خدا کے سپرد کرتی ہوں جو ساری دُنیا کا رکھوالا ہے اور کمزور دل کو طاقتوروں کے پنجوں سے محفوظ رکھتا ہے۔" یہ کہتے کہتے اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور پتلیاں آنسوؤں کے پیچھے جھلکنے لگیں۔ اُن کی صورت دیکھ کر میں کچھ ایسا محسوس کرنے لگا جیسے میرے دل و دماغ کی رگیں تاروں کی طرح کھنچی جا رہی ہیں اور میرے چہرے کے مسامات سے خون چھوٹ بہے گا۔ میں اپنی پلکوں میں سرسراتے آنسو لے کر اُن کے پاس سے اُٹھ گیا اور باہر جا کر ٹھنڈا پانی پیا تاکہ دل سنبھل جائے اور میرے آنسوؤں سے والدہ کی تکلیف میں اضافہ نہ ہو۔

میں نے اُن کی خدمت اور معالجے میں کسر نہیں چھوڑی لیکن میری کوششیں بار آور نہ ہوئیں اور روز بروز وہ اس دُنیا سے تعلق کم کرتی گئیں، آخر ایک دن نمازِ عصر کے وقت میرے آنسوؤں اور میرے بیوی بچوں کی مغموم خاموشی میں باتیں کرتے کرتے اُن کی آنکھیں مُند گئیں اور گلے میں سے خرخراہٹ کے ساتھ باچھوں سے جمے ہوئے خون کے ٹکڑے آنے لگے تھوڑی دیر کے بعد ایک ہچکی انھیں ابدی آرام گاہ میں لے گئی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ہ

وہ ہمیشہ ہمیشہ کو عالمِ بقا میں چلی گئیں جہاں سے اس دُنیا کی طرف کوئی دریچہ نہیں کھلتا۔ شام کے وقت جب سورج دُور باغوں کی فصیل پر ٹھوڑی ٹیکے ہماری زمین کو خیر باد کہہ رہا تھا، انھیں لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اُن کی

قبر شیخ طاہر بندگیؒ صاحب کے احاطے میں دروازے سے داخل ہو کر دائیں طرف چند قدم کے فاصلے پر سرِ راہ ہے۔

والدہ کے انتقال کے بعد میری کوئی جدوجہد پُر اُمید نہ رہی ہر کوشش پر تھوڑی دیر چل کر یہ خیال آتا کہ آخر یہ سب کس لئے اور کس کے لئے؟ جبکہ میری ماں میری محبوب ہستی دُنیا کو خیرباد کہہ گئی وُہ ضرور کسی مجبوری اور فطرت کے نظام کے تحت مجھ سے علیحدہ ہو گئی ہے، اسی طرح ایک دن مجھے بھی بیوی بچوں کو روتے چھوڑ کر رخصت ہونا پڑے گا اور وُہ کچھ روز کے بعد زمانے کی طرح خود بخود ہنسنے لگیں گے مگر یہ خیال بھی میرا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا کہ دُنیا میں صرف انسانی خدمت اور غریبوں، بیواؤں، یتیموں اور مسکینوں کے اُڑے وقت میں کام آنا ہی تخلیق کا منشا ہے، بلکہ یہی اصل عبادت ہے جس کی مخالفت میں کوئی بھی مذہب نہیں ہوتا یہ بڑی ارزاں نیکی ہے۔

مذہب کے قوانین اسی لئے ماننے کے قابل ہیں کہ اُن سے انسان دوسرے انسانوں کے کام آنے کے قابل ہو جاتا ہے اور بس! یہ بڑی بات ہے کہ مذہبی معمول و مشاغل سے صرف وہی اعصاب قوی ہوتے ہیں جن کا تعلق، تفکر، تدبر اور عدل کے اجزا سے ہے۔

والدہ کے انتقال کے بعد اُن کی یادگار کے طور پر ایک مربع میرے پاس ہے جسے کھلوا کر مَیں نے چادر کی شکل دے لی ہے اور جب مجھ پر کوئی اچانک مصیبت آتی ہے تو وہ چادر اُوڑھ کر لیٹ جاتا ہوں۔ خدا شاہد ہے کہ مجھے اُس سے سکُون ملتا ہے، ایسا سکُون جیسے زندگی کو بہاروں نے گود میں اُٹھا لیا ہو۔ اور مہکیلی ہوائیں مجھے سنبھالے ہوئے ہوں۔

جنابِ نوحؔ ناروی کا خلوص

جہاں اُس دَور کے دُوسرے اساتذہ[1] مجھ سے خوش تھے وہیں جناب نوحؔ ناروی بھی شفقت فرماتے تھے اور ایسی کہ بعض اوقات اُن کے تلامذہ کو رشک ہونے لگتا تھا۔ اُستاد سے

---

[1] صفیؔ لکھنوی، بیخودؔ موہانی، آرزوؔ لکھنوی، جوشؔ ملسیانی، ساحرؔ دہلوی۔ پنڈت دتاتریہ کیفیؔ، زارؔ دہلوی، جوشؔ ملیح آبادی مولانا تاجورؔ نجیب آبادی، تلوک چند محرومؔ، میلا رام وفاؔ، بادی مچھلی شہری، قمرؔ بدایونی۔ ناطقؔ لکھنوی، آغا شاعرؔ الدہلوی، ناطقؔ گلاوٹھوی، ساحرؔ دہلوی، گوپی ناتھ امنؔ لکھنوی وغیرہ۔

جب کوئی بات دریافت کرنا ہوتی تو میری معرفت دریافت کراتے، وُہ مجھ سے پہروں گھوڑوں کی قسموں، رنگوں اور نشانیوں کے متعلق بات چیت کرتے اور مَیں اس طرح سُنتا جیسے ایک مُرید کسی شیخ کے سامنے کسبِ فیض کے لئے بیٹھتا ہے کیونکہ مَیں اس فن سے بالکل بے بہرہ تھا۔

حضرت نوحؔ کو کبوتروں کا پُرانا شوق تھا اور اس فن میں اُنھیں مہارت تامّہ حاصل تھی وہ اپنے یہاں کی خاص خاص نسلوں کا بڑے خلوص سے ذکر کیا کرتے اور جب وُہ ذرا خاموش ہوتے تو مَیں اپنے ہاں کے قاصدوں کا ذکر چھیڑ دیتا اور وُہ جواب میں ایسی گفتگو کرتے کہ مَیں اچھّی خاصی معلُومات لے کر اُٹھتا، مَیں ہمیشہ ان کی صحبت سے علمی، ادبی اور فنی معلُومات لے کر آیا ہوں اور ان کی شفقت کو اب تک یاد کرتا ہوں کبھی شاعری پر بات آتی تو اساتذہ کے علم وادب اور عالی ظرفی کی تعریف کرتے اُنھوں نے اپنے دو دیوان "سفینۂ نوحؔ" اور "طوفانِ نوحؔ" مجھے بہ کرم عنایت فرمائے تھے کہ یہ دونوں ناپید ہیں اُنھیں اپنے تلامذہ کے اچھّے اشعار بھی یاد تھے اور موقع آتا تو شاگردوں کے اشعار بھی تعریف کے ساتھ سُنایا کرتے۔ اور ایسا معلوم ہوتا جیسے کچھ شاگردوں پر بھی اُنھیں ناز ہے۔

بنارس میں ایک مشاعرہ تھا اس میں مجھے بھی بلایا گیا اور حضرت نوحؔ ناروی بھی تشریف لائے مجھے جاتے ہی معلوم ہُوا کہ حضرت نوحؔ بنارس میں تشریف فرما ہیں۔ مَیں قیامگاہ سے مُلاقات کو روانہ ہوگیا، اُدھر حضرت نوحؔ کو میرے متعلق معلوم ہُوا " دل را بدل رہیست " اُدھر سے وُہ میری قیام گاہ کی طرف روانہ ہوگئے راستے میں مجھے مغرب کی اذان ہوگئی، اور لب راہ ایک مسجد میں نماز کے لئے چلا گیا وہاں میں نے دیکھا کہ جناب نوحؔ بھی دروازے کے قریب نماز پڑھ رہے ہیں۔ مَیں نے سوچا کہ جلدی جلدی نماز پڑھ کے باہر کے دروازے پر انتظار کروں گا، اسی خیال سے بہ عجلت نماز پڑھی ادھر حضرت نوحؔ نے مجھے دیکھ لیا تھا، اور دیکھ کر نیت باندھ لی تھی، مَیں نماز سے فارغ ہوکر دروازے کی طرف چل دیا۔ وُہ یہ

سمجھے کہ مَیں نے انھیں نہیں دیکھا اور اب یہ جا رہا ہے چنانچہ فوراً نبّت توڑ دی اور مجھ سے لپٹ گئے۔ مَیں تو اُن کی اس محبت پر حیران رہ گیا، حالانکہ اگر دیکھا جائے تو مَیں اُن کے تلامذہ کی صف کے قابل بھی نہیں تھا یہ صرف ان کی محبت اور حوصلہ افزائی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ یہی کردار بزرگوں کی عظمت کو برقرار رکھتا ہے افسوس کہ اس قسم کے بزرگ دُنیا سے اُٹھتے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ وہ لوگ آ رہے ہیں جو گزرتے ہوئے وقت کی جھولی سے اتفاقاً گرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ تنتے اور خود کار تھیاروں کی طرح اُنھیں ہر آدمی سمجھ بھی نہیں سکتا اور جو جلدی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، وہ خطرے سے خالی نہیں۔ آگے اپنی اپنی قسمت رہی۔

زخم و مرہم

بعض وقت قدرت انسان کو انھیں حالات سے دوچار کرتی ہے جن سے وہ گریزاں اور خائف رہتا ہے چنانچہ یہی معاملہ مولانا تاجور کے ساتھ بھی ہوا۔ موصوف موت کا نام سن کر لرزتے تھے اور بہت کم جنازوں میں شرکت کرتے تھے قدرت کو شاید ان کی یہ بات نہ بھائی، چنانچہ پندرہ دن کے اندر اندر دو جوان لڑکے راہی عدم ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُوْنَ۔ دُوسرے لڑکے کی موت پر تو وہ ایک کمرے میں چُپ کر بیٹھ گئے اور جنازے کے ساتھ تک نہیں گئے۔ ہم چند لوگوں نے ہی مل کر اُسے سپردِ خاک کیا۔ دو جوان بھائیوں کی برابر برابر دو قبریں اور ان کے اردگرد کی فضا مجھ پر ایسی طاری ہوئی کہ "دو قبریں" کے عنوان سے مَیں نے ایک نظم کہی جو میرے کلام کے ایک مجموعے میں شامل ہے۔ اس نظم کا ایک شعر ہے ؎

یہ پھُول اپنی لطافت کی داد پا نہ سکے
کھِلے ضرور مگر کھِل کے مسکرا نہ سکے

یہ شعر کچھ ایسا عام ہو گیا ہے کہ آج قبرستانوں میں کتنی قبروں پر کندہ ملتا ہے۔ اس حادثے کے بعد مولانا تاجور صاحب پر کچھ ایسا اثر ہُوا کہ نہ تو روتے تھے اور نہ کسی سے

بولتے تھے کبھی دیوار پر ٹکٹکی لگی ہوئی ہے تو کبھی چھت کی طرف مسلسل دیکھ رہے ہیں۔

جب اُنھیں اسی عالم میں کئی دن ہو گئے تو مجھے خطرہ ہوگیا کہ کہیں بچّوں کا صدمہ مولانا کو نہ لے بیٹھے، ہم عزیزوں اور دوستوں نے اُن کا سکوت بہت توڑنا چاہا مگر وُہ غم سے پتھر ہو گئے تھے بڑی مشکل سے دس بیس باتوں میں کسی ایک کا جواب ہاں ہُوں میں دے دیا تو دے دیا ورنہ مستقل خاموشی، جیسے اُن کے سامنے کچھ مناظر تھے جنھیں وُہ مسلسل تکتے رہتے تھے جدھر نظر جم گئی جم گئی۔ حالانکہ مولینا مجھ سے بڑے بے تکلّف تھے لیکن ایک دم ایسے بدل گئے کہ معلوم ہوتا تھا جیسے بالکل واقف ہی نہیں اور کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔

آخر ایک دن مَیں نے سوچا کہ یوں کام نہیں چلے گا گستاخ اور بے ادب تو مَیں اوّل بھی ہوں آخر بھی یہ سکوت توڑنا نہایت ضروری ہے۔ چنانچہ مَیں نے اپنے ایک عزیز دوست سرور پرکاش داس[1] اور مولانا کے ایک معتقد راج بلدیوراج سے کہا کہ مولانا کی یہ خاموشی خطرناک ہے اگر مولانا سے ہمیں کوئی تعلق ہے تو اُن کے اِس سکوت کو توڑنا درکار ہے ورنہ مولانا سے بھی ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

اُنھوں نے کہا کیا کیا جائے؟ مَیں نے جواب دیا کہ علاج صرف ایک ہی ہے، جس طرح مَیں کہوں بے فکری سے اس پر عمل کرتے چلے جاؤ ابھی جاؤ اور کسی اچھے ہوٹل میں دو تین حسین عورتوں کا انتظام کرو۔ کسی بہانے سے مولانا کو لے کر چلیں گے۔ مولانا کو کمرے میں بٹھا کر ہم تم باہر آجائیں گے اور دُوسرے دروازے سے اُن عورتوں کو بھیج دیں گے اور اُن سے کہہ دیں گے کسی طرح مولانا کا سکوت توڑیں وُہ خود زمین بنالیں گی۔ وہ اِس فن سے خُوب واقف ہوتی ہیں۔

چنانچہ وُہ اُسی وقت اُٹھ کر گئے اور شہر سے باہر ایک اعلیٰ قسم کے ہوٹل میں انتظام کر آئے۔ میں نے مولانا سے جا کر کہا کہ ایک سیّاح آیا ہُوا ہے اور اس کا لکچر ہے اسلام کا

---

[1] سرور پرکاش داس دلّی میں کسی بنک کے منیجر ہیں اور راج بلدیوراج بمبئی میں کسی فلم کمپنی میں ڈائرکٹر ہیں ان کا ایک شعری مجموعہ "ناقوس" آزادی سے پہلے شائع ہوچکا تھا۔ ان سیاسی دیواروں کے پیچھے نہ جانے انھوں نے کیا کہا ہوگا۔

رُوحانی پہلو" شہر کے معززین وہاں آئیں گے مجھے ابھی ابھی ایک آدمی آپ کے متعلق تاکید کر کے گیا ہے میرا خیال ہے کہ اس سیّاح کے پاس مصارف ختم ہو چکے ہوں گے کیونکہ اس کی بیوی بچے بھی اس کے ساتھ ہیں لیکچر تو ظاہر ہے بڑا علم افروز ہوگا لیکن شاید پھر کچھ مدد کے لئے بھی چندے کی صورت میں کوئی بات نکلے، مولانا نے پہلے تو انکار کے لئے انگلی ہلائی لیکن جب مَیں نے ذرا ترشی سے اصرار کیا تو مولانا نے بیگم سے پندرہ روپے منگوا کر کیسہ میں ڈال لئے اور طوعاً و کرعاً ساتھ ہو لئے۔

ہوٹل میں لے جا کر میں نے مولانا کو ایک کمرے میں بٹھا دیا اور کہا وہ پروفیسر صاحب ابھی شہر سے نہیں آئے کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ مگر کوئی بات نہیں آپ کے لئے چائے کا انتظام کرتا ہُوں مولانا نے تلخی سے کہا کہ "تو مجھے سب سے پہلے کیوں لے کر آگیا؟" میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور چائے کے بہانے سے باہر نکل آیا اور دو چار قدم چل کر پھر واپس ہُوا اور مولانا سے کہا ہاں جی! آدمی تو جمع ہیں مگر ہم لوگ اب تو چائے پی کر ہی چلیں گے ابھی تو برابر والے کمرے میں شاید اُن کے بیوی بچے بھی ہیں وہ تنہا کہیں گئے ہیں اب آنے ہی والے ہوں گے۔

مَیں مولانا کو مطمئن کر کے باہر آگیا اُدھر سے واحَن نے اُن عورتوں کو مولانا کے کمرے میں داخل کر دیا مولانا سمجھے کہ یہ اُس سیّاح پروفیسر کی اہلیہ وغیرہ ہیں چنانچہ مولانا نے دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے اور زور سے کہا۔"بہن یہاں تو مَیں بیٹھا ہوں۔"

اُنھوں نے کہا"جی ہاں آپ ہی سے ملنے کو تو جی چاہا ہے چنانچہ مولانا کے ایک پہلو میں ایک اور دوسرے پہلو میں دوسری بیٹھ گئی اور دونوں نے باری باری اُن کے سینے سے سینہ ملا دیا پھر ایک بولی مولانا آپ مجھے پسند کرتے ہیں یا نہیں؟

مولانا: میرا دل رُکا جا رہا ہے آپ علیحدہ ہو کر بیٹھیں۔

اُس نے مولانا کے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ دل کیسے رُک سکتا ہے جب یہاں چلانے والے موجود ہیں۔

مولانا اُٹھنے لگے تو دونوں نے پکڑ کر بٹھا لیا اور ایک نے گال سے گال ملا دیا اُس وقت مولانا کے چہرے کا یہ عالم تھا جیسے کوئی کسیلی دوا مولانا کے حلق سے اُتر رہی ہو۔

ہم لوگ بار بار آئینے سے دیکھ کر مولانا کی گھبراہٹ کے مزے لے رہے تھے پھر برابر کے کمرے میں آگئے جہاں سے اُن عورتوں کو بھیجا گیا تھا اور وہ اس قدر کم فاصلہ تھا کہ معمولی آواز بھی ہمیں سُنائی دیتی تھی۔

جب مَیں نے دیکھا کہ مولانا بہت ہی برافروختہ ہیں تو مَیں چائے والے ملازم کو ساتھ لے کر کمرے میں داخل ہُوا۔ پھر کیا تھا مولانا مجھ پر برس پڑے اور مَیں خاموش کھڑا سُنتا رہا اور خُدا کا شُکر ادا کیا کہ اُن کی خاموشی ٹوٹی جب مجھے بُرا بھلا سُنتے سُنتے دیر ہو گئی تو مَیں نے کہا "مولانا چائے پیجئے"۔ مولانا نے کہا "ہرگز چائے نہیں پیوں گا"۔ مَیں نے سوچے بغیر جواب دیا کہ "حضرت اس کا بل تو آئے گا اور میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں"۔ مولانا نے فوراً جیب سے پندرہ روپے نکال کر میرے اوپر پھینک دیے اور کہا "بے حیا! ڈوب کے مرجا! شرم نہیں آتی؟ لے بل ادا کر دے! ابلیس!!"

مَیں نے کہا "حضور شرم تو آئے گی لیکن آج کی حرکات آپ کی بیگم سے ضرور کہوں گا اور ایسے ایسے حاشیے لگا دُوں گا کہ ہفتوں جنگ بند نہ ہو۔"

مولانا: "نہیں نہیں! ایسی بات وہاں نہ کہنا وہ کیا کہیں گی پھر تیرا آنا جانا بھی بند ہو جائے گا۔ خبردار!"

مَیں: "آنا جانا تو مَیں اب خود بند کر دُوں گا، ہوٹلوں کی عورتوں میں اب آپ ہی رہ گئے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ بات میں آپ کی بیگم سے چھپاؤں آخر انھیں کسی نہ کسی دن معلوم تو ضرور ہو گا اور آپ کے پیٹ میں تو کوئی بات ٹھہرتی ہی نہیں اُس وقت بیگم مجھے ایک بُرا اور غیر مخلص انسان خیال کریں گی اس لئے مَیں اُن سے ہرگز یہ بات نہیں چھپا سکتا ابھی جا کر پہلی بات ہی یہ ہو گی۔"

مولانا نے دس روپے اور نکال کر میرے اوپر پھینکے اور کہا "مجھے یہاں سے باہر تو نکال دے، خبیث!"

میں نے کہا "مولانا میرے تو چالیس روپے صرف ہوتے ہیں، ان روپوں سے کیا کام چلتا ہے؟"

مولانا: "خدا کی قسم میں سب ادا کر دوں گا گھر تک تو چل ذرا، اتنا بھی اعتبار نہیں ہے کیا؟"

میں: "اچھا چلتے ہیں ذرا چائے تو پی لیں۔"

مولانا: "ارے ظالم میرا کوئی شاگرد ادھر اُدھر ہوا تو کیا کہے گا؟"

میں: "مولینا میں بھی تو آپ کا شاگرد ہوں اور یہاں کوئی مجھ جیسا ہی شاگرد آیا ہوگا نا؟"

مولانا: "توبہ توبہ! تو تو بابا استاد ہے شاگرد نہیں بس جلدی چل۔"

بمشکل تمام مولانا نے آدھی پیالی زہر مار کی اور جلدی جلدی ہوٹل سے نکلے، دامن نے ٹانگے والے کو آواز دی اور ہم چاروں آدمی ٹانگے میں بیٹھ گئے۔

ٹانگے والے نے پوچھا "کہاں چلوں سرکار؟"

میں: "کسی ایسے ہوٹل میں چلو جہاں مولویوں کا زنگ اتارا جاتا ہے۔"

مولانا: "نہیں نہیں مزنگ چلو مزنگ۔"

میں: "یہ مولینا تو یہاں اسی طرح کہا کرتے ہیں کسی اچھے ہوٹل میں چلو۔"

یہ سن کر مولانا نے میری طرف آنکھیں نکالیں اور ٹانگے سے کودنے کو تیار ہو گئے۔ میں نے مولانا کے قدم پکڑ لیے اور دست بستہ معافی مانگی۔ گھر کے سامنے ٹانگہ رکا تو مولانا کی جان میں جان آئی اور خدا کا شکر ادا کیا۔

گھر میں پہنچے تو چارپائی پر دراز ہو گئے، جب ذرا سانس ٹھکانے آیا تو میں نے کہا "مولانا بڑی محنت ہوئی ہے اب تو چائے پلوائیے۔"

مولانا: "احسان! تو شیطان ہے شیطان! آج معلوم ہوا کہ تو تو بڑا ہی آوارہ آدمی

ہے تیری دوستیاں تو آوارہ لوگوں سے ہیں آوارہ لوگوں سے" توبہ توبہ مجھے اِس گل کے لڑکے نے کیسا جل دیا ہے الامان والحفیظ۔"

اِتنے میں اندر سے بیگم نے چائے بھیج دی اور ہم سب چائے پینے لگے۔

مولانا کی علمی خدمات اور اُردو کی ترویج واشاعت کے لئے ان کے حریف بھی معترف ہیں لیکن اِس زبانی اعتراف کے باوجود ہمیشہ اُن کی کاٹ ہی کرتے رہے اور وُہ اپنی جگہ ان کے اوچھے حربوں کو اوٹتے رہے۔ شکایت زبان تک نہیں لائے، انھوں نے کئی بار اہم اہم عنوانات سے کام کرنا چاہا لیکن مقامی مخالفتوں نے انھیں سانس تک لینے کی مہلت نہ دی اور رات دن پریشان رکھا۔

ان پریشانیوں کے باوصف وُہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے تھے اور اگر کبھی ان کے بکھرے ہُوئے مضامین کو اکٹھا کر لیا گیا تو یہ بھی ادبی کارنامہ ہوگا۔

جہاں تک ادبا و شعرا کے طبقے سے مجھے استفادہ کا موقع ملا ہے اس سے اندازہ ہے کہ ایسے اُستاد بہت کم پیدا ہوتے ہیں اور جہاں تک مقامی حریفوں کی دشمنی کا تعلق ہے وُہ بھی اسی معیار کی ہے بعض بعض لوگوں نے تو ایسے ایسے الزام تراشے جس سے عوام بھڑک اُٹھیں اور قتل و غارت تک نوبت آجاتے لیکن خُدا اپنے نیک بندوں کی مدد خود کرتا ہے، چنانچہ اُن کی تمام تہمتیں صدا بصحرا ہو کر رہ گئیں۔ بعض بعض تو مولانا کے انتقال کے بعد بھی اپنی دُشمنی سے باز نہیں آئے، سُنا ہے کسی نے اب یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا نے اُنھیں زہر دینے کی کوشش کی تھی، حالانکہ مولینا تاجور کے متعلق یہ ایسا الزام ہے جسے شاید خدا بھی نہ بخشے، مولانا علم کے اعتبار سے فاضلِ دیوبند تھے اور پنجاب یونیورسٹی سے بھی عربی میں سندِ فضیلت حاصل کی تھی۔ وُہ شرافت اور اتقا میں بڑے منہمک اور مرتاض تھے۔ اُن کے متعلق یہ گُمان کرنا بھی صداقت کا خون کرنا ہے۔ مَیں اُس شاعر کے لئے دُعا کرتا ہُوں خُدا اُسے مُعاف کرے جس نے مولانا پر یہ الزام تراشا ہے مَیں نے تو جب پہلے پہل یہ خبر سُنی تو کانپ

گیا اور سوچنے لگا کہ شاید اس شخص کے سامنے موت نہیں ہے جو چند روزہ زندگی کے لئے خدا سے نہیں ڈرتا اور دوزخ کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

بزمِ اُردو شملہ کا سالانہ جلسہ شملہ غیر منقسم ملک میں پہاڑی مقام ہونے کی وجہ سے گرمیوں میں ایک بہارستان بن جاتا تھا ملک بھر کے اہم شعبے اپنے دفاتر وہیں لے جاتے تھے اور چار پانچ ماہ پہاڑوں کے آغوش میں ایک نئی دُنیا نظر آتی تھی۔

یہاں مشاعرے کی بنیاد سر شیخ عبدالقادر نے ڈالی تھی جس کی آخر وقت تک سید رضا علی صاحب نے پشت پناہی کی اور یادگار مشاعرے ہوتے پھر شملے کی پبلک اور شعراء کے طبقے نے بزمِ اُردو شملہ کے نام سے ایک نئی بزم قائم کی چونکہ پہلے مشاعروں میں شملے کے لوگ مجھے جان پہچان چکے تھے اس لئے بزم کے سیکرٹری جناب تنویر علی صاحب سے دوستانہ مراسم ہو گئے تھے۔

بزمِ اُردو شملہ کا پانچواں سالانہ مشاعرہ تھا اور جہاں شہر شہر کے دیگر شعراء مثلاً جناب احسن مارہروی جناب مرزا ثاقب لکھنوی جناب جگر مرادآبادی جناب آزاد کپورتھلوی جناب ہادی مچھلی شہری جناب آغا ہوش کاظمی جناب سراج لکھنوی جناب قدیر لکھنوی جناب حکیم احمد شجاع جناب میر غلام بھیک نیرنگ جناب بہزاد لکھنوی جناب اسد ملتانی جناب روش جوالاپوری جناب خورشید فریدآبادی جناب سوہن لال ساحر کپورتھلوی جناب جلیل قدوائی پنڈت کرشن کانت مالویہ، جناب شعری بھوپالی جناب سراج الدین ظفر جناب عرش ملسیانی اور جناب ساغر نظامی وغیرہ کو دعوت نامے بھیجے گئے تھے مجھے بھی دعوت نامہ ملا۔ میں تنویر صاحب کی ہدایت کے مطابق مشاعرے سے ایک دن پہلے شملے پہنچ گیا اور منتظمہ نے مجھے دہلی مسلم ہوٹل میں ٹھہرا دیا۔

دوسرے دن ڈے۔ وی۔ کہ بال روم میں دس بجے صبح سے مشاعرہ کا انعقاد تھا اور

شرح ٹکٹ ایک روپیہ سے پانچ روپیہ تک تھی اس کے باوصف ہال میں کہیں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی گیلری میں خواتین کی نشستوں کا معقول انتظام تھا اُن کے لئے جالی کے پردے لگوا دئے گئے تھے مشاعرے کی صدارت کے لئے سر سید رضا علی صاحب کا اعلان کیا گیا اور سب نے تالیوں سے تائید کی حقیقت یہ ہے کہ شاعروں پر اُن کے زیبا رکس شعر سے کم لُطف نہیں رکھتے تھے اُن کے ہر فقرے میں برجستگی سلاست اور گہرائی سامعین کو داد و تحسین پر مجبور کر دیتی تھی اور اکثر اشعار کے تاثرات اُبھر آتے تھے۔

سامعین میں مولانا شوکت علی، سر جگدیش پرشاد، سر سکندر حیات، نواب لائق علیخاں سر عبدالرحیم، سر ظفر اللہ، سر محمد یامین، مسٹر فضل الحق، بھولا بھائی ڈیسائی، میاں عبدالحی اور سنٹرل لیجسلیٹو اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے کئی اراکین شامل تھے۔

اُن کے علاوہ تمام شملے کے معززین تو پہلے ہی مشاعرے کا جزوِ اعظم تھے۔ یہ مشاعرہ ساڑھے دس بجے سے شروع ہو کر شام کے ساڑھے سات بجے تک جاری رہا۔ اس میں ایک مصرع طرح بھی تھا۔ ؎

"نہ ہو نگاہ میں شوخی تو دلبری کیا ہے"

قافیہ دلبری، برتری وغیرہ اور ردیف کیا ہے۔

پہلی نشست طرحی غزلوں کے لئے مخصوص رہی اور دوسری میں غیر طرحی کلام پڑھا گیا دونوں نشستوں میں منتخب کلام براڈ کاسٹ بھی ہُوا اس طرح یہ مشاعرہ ملک کے ہر گوشے میں سُنا گیا!!

اِس مشاعرے میں اس قدر شعرا شریک تھے کہ بعض بعض شعراء کو تو صرف چار چار پانچ پانچ شعر سُنانے کا موقع ملا مگر وُہ بھی سلیقے سے سُنے گئے اور داد و بیداد دونوں اپنی اصل حدود سے باہر نہیں ہوئیں۔

ایک تعارف دُوسری غیر طرحی نشست میں سُبحان اللہ! جو ننکار اُٹھتا تھا

وہ اپنی جگہ یکہ و تنہا نظر آتا تھا اس دوسری نشست سے پہلے درمیانی وقفے میں ایک صاحب نے مجھ سے ایک شاعر کا تعارف کرانا چاہا جو اُن دنوں اپنے ترنّم کے لحاظ سے اچھی خاصی داد پاتے تھے لیکن ہم دونوں اب تک صورت آشنا نہ تھے اُن پر شہرت کا نشہ کچھ ایسا سوار تھا کہ اُنھوں نے نظر اُٹھا کر نہ دیکھا اور جو چلے کرتے رہے۔ میری نظر میں تو فوراً ہی ان کے تمام عادات و اطوار آ گئے کیونکہ میں غالباً چہار مقالہ میں شریف بالنفس اور شریف بالطبع والا مضمون پڑھ چکا تھا اس لئے میں تو اپنے ہمراہی کی سادگی پر تاسف کرتا ہُوا وہاں سے ٹل گیا اور میرا ساتھی تھوڑی دیر کے بعد شعراء کی عادات و اطوار اور غرور و پندار کو بُرا بھلا کہتا مایُوس واپس آ گیا جیسے ایک سوالی کسی ایسے شخص کے دروازے سے تہی دامن لوٹ آئے جو فقیروں کا حصّہ بھی تفریحی چندے

میں دے دیتا ہو، میں نے اُس سے کہا کہ مشاعرے کی فہرست دیکھو اور میرا نام اس مغرور اِنسان کے بعد ہو تو کسی طرح اس سے پہلے لکھوا دو۔ اس نے جا کر فہرست دیکھی تو میرے بعد اُس کا نام تھا، میں خوش ہُوا اور خُدا سے دُعا کی کہ الٰہ العالمین میں تو کم علم بھی ہُوں اور نوآموز بھی اور تیرے سوا کوئی سہارا بھی نہیں رکھتا اُس نے مجھے بے بضاعت سمجھ کر شہرت کے نشے میں میری توہین کی ہے! اگر تیری بارگاہ میں غرور و پندار کو بھی نوازا جاتا ہے تو خیر ورنہ میں اُسے اس کے مقام پہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

یہ نشست شروع ہی سے ایسی جمی کہ تمام سامعین کا یہ خیال تھا کہ ایسا مشاعرہ کبھی کبھی ہوتا ہے ایک تو ملک بھر کے نامور شعراء کی شرکت اور اس پر صاحب ذوق حضرات کی داد و تحسین سبحان اللہ! سبحان اللہ! ایک کیفیت تھی جو شعراء اور سامعین پر یکساں طاری تھی چار ساڑھے چار بجے کے قریب میرا نام پکارا گیا۔

میں معمولی سا آدمی معمولی سے لباس میں ملبوس اسٹیج پر گیا ہی تھا کہ سر رضا علی صاحب نے اعلان کیا کہ "سامعین حضرات اس نوجوان کی سادگی پر نہ جائیں یہ دل کی بات کہتا ہے

اور آنکھوں سے داد لیتا ہے۔"

میں نے اپنی تازہ نظم "جشنِ بیچارگی" کا اعلان کیا جو میں نے اپنے ایک مزدور دوست کی لڑکی کی رخصتی سے متاثر ہو کر کہی تھی ترنم سے نظم شروع کی اور ہر شعر پر میری روح کی چیخ آواز میں شامل ہوتی گئی۔ پڑھتے پڑھتے جو میری نظر مجمع پر گئی تو تمام لوگ آبدیدہ تھے اور خواتین نے جالی کے پردے نوچ پھینکے تھے سب کی آنکھوں میں موتی سے جھلملا رہے تھے اور بعض بعض کی تو ہچکی بندھی ہوئی تھی۔

یہ عالم دیکھا تھا کہ وہ نظم خود مجھ پر بھی طاری ہو گئی اور آنسو پلکوں کی جڑوں سے جھانکنے لگے، میں نے فوراً سامنے کی میز سے گلاس اٹھا کر دو گھونٹ پانی پیا اور خود کو قائم کر کے نظم کے شباب کو سنبھالا اور عجیب کیفیت میں نظم ختم کی۔ آنکھوں سے دل تک ایک قسم کی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی جیسے برف کی ایک باریک دھار دماغ سے چل کر شہ رگ میں ہوتی ہوئی دل تک سرسرا رہی ہو۔

میرے بعد فوراً ہی اُن صاحب کا نام پکارا گیا جو اُس وقت اپنے پندار کے دھوئیں سے باہر آ چکے تھے ہانپتے کانپتے اسٹیج پر گئے لیکن "آہ" کے بعد "واہ" کو کامیاب کر لینا بڑے دل گردے کا کام ہے بہت کھنکار کھنکار کر پڑھا اور موقع موقع سے گنگنایا بھی لیکن ابھی تو سامعین کی آنکھوں سے آنسو بھی خشک نہیں ہوئے تھے ناز و غمزہ کی گنجائش کس کے دل میں تھی؟ یہ بیچارے مقطع پڑھ کر واپس اپنی جگہ آ گئے مشاعرے کے اختتام پر دوڑ کے مجھ سے لپٹ گئے اور کامیابی پہ مبارکباد دی۔ اُسی وقت سے وہ میرے دوست ہو گئے اور میں آج تک ان کا احترام کرتا ہوں۔

یہیں میری ملاقات الماد لطیفی سے ہوئی وہ آئی سی ایس کے آدمی تھے، مگر نہایت زیرک و مدبر! وہ تھے تو کم گو مگر جب بات کرتے تھے تو باون تولے پاؤ رتی کی۔

بیگم الماد لطیفی بھی ادبی ذوق کی خاتون تھیں غالباً اُن کے کہنے پہ الماد لطیفی نے

مجھے مشاعرے ہی میں اپنے یہاں مدعو کر لیا تھا۔ میں پہنچا تو لطیفی صاحب بڑے خلوص سے پیش آئے اُن کی بیگم نے بھی میری نظموں کو بہت سراہا اور کہنے لگیں کہ میں اپنے مضامین آپ کو دکھاؤں گی آپ اُن کی زبان درست کر دیں اور آپ کے ڈھب کا کوئی عنوان نکل آئے تو اُسے نظم بھی کریں، ان کا خیال تھا کہ انگریزی سے زیادہ اردو میں پھیلنے اور بڑھنے کی صلاحیت ہے۔

جناب الماز لطیفی اور اختر حسین یہ دو شخصیتیں ایسی تھیں جنہوں نے میرے ادبی خیالات کو منہدم نہیں ہونے دیا میری رُوح اُن کی ممنون ہے۔

ان لوگوں میں جہاں انتظامی صلاحیتیں درخشاں اور بیدار تھیں، وہیں ان کا ادبی ذوق بھی معیاری تھا یہی سبب تھا مجھے یہاں کی ادبی صحبتوں سے زیادہ ان لوگوں کے پاس وقت گزارنے میں لطف آتا تھا۔

کئی بار جی معین الدین مجھے اپنے یہاں لے گئے اور خطاطی کے ایسے ایسے نمونے دکھائے کہ میں دنگ رہ گیا۔ جی معین صاحب کم گو اور کم آمیز انسان ضرور ہیں لیکن میں نے اچھے اچھے لوگوں کو ان کی ذہانت کی تعریف کرتے پایا ہے اور جب بھی اُن سے بات چیت ہوئی ہے، ان کی بلندیاں آشکارا ہو کر رہی ہیں۔

یہی سبب تھا کہ میں نے اپنی ایک کتاب ان کے نام سے معنون کی اور محسوس کیا کہ ایک بلند شخصیت سے منسلک ہو گیا ہوں۔ شملے ہی میں ڈاکٹر نجم الدین جعفری کے یہاں سر محمد یامین سے ملاقات ہوئی، وہ بردبار مگر خوش ذوق انسان تھے۔

صندل ہال کا مشاعرہ

اس مشاعرہ کے بعد دُوسرے دن ایک مشاعرہ صندل ہال میں ہُوا اور پھر ایک نشست ڈاکٹر نجم الدین جعفری کے دولت کدے پر حضرت احسن مارہروی کی صدارت میں ہُوئی۔ اس میں مخصوص

شعرا و سامعین ہونے کے باوجود بہت ہی کامیاب نشست رہی یوں تو ڈاکٹر نجم الدین جعفری مجھ پر پہلے ہی سے کرم فرماتے تھے لیکن اُنھوں نے ذرا تفصیل سے میرے حالات معلوم کئے اور پھر علیحدہ ایک کمرہ میں لے جاکر فرمایا "اگر کچھ کام گورنمنٹ کا کر ڈالو تو مشاہرہ بھی مل سکتا ہے اور خطاب بھی۔"

میں نے کہا "کیا کام ہے وہ؟"

جعفری صاحب نے بتایا۔

ہر چند کہ وہ کام ادبی تھا لیکن میرے اصول کی چیز نہیں تھی۔ میں نے کہا، کہ مزدور آدمی ہوں فاقوں سے نہیں گھبراتا اور زندگی کی ضروریات ایسی نہیں کہ مجھے اپنے تصورات اور نظریات سے رُوگردانی پر مجبور کر دیں تاہم آپ کی نوازش کا بہت بہت شکریہ!

ڈاکٹر نجم الدین صاحب نے مجھے گلے لگا لیا اور کہا مجھے تم سے یہی اُمید تھی اب تم جب بھی آؤ گے میرے یہاں قیام کرو گے آج سے میں تمہیں فرید[1] اور سعید کی طرح سمجھتا ہوں چنانچہ اس کے بعد جب بھی میں الٰہ آباد جاتا تو اُنھیں کے بنگلے پر قیام کرتا وہ مجھے خاندان کے ایک فرد کی طرح سمجھتے تھے اور میں نے بھی اپنے بزرگ کی طرح ہمیشہ اُن کا احترام کیا،، حقیقت یہ ہے کہ وہ راسخ الایمان اور رحمدل مسلمان تھے اُن کی بہت سی باتیں اب تک میرے کام آرہی ہیں اُنہی کے ہاں جناب ہادی مچھلی شہری سے ملاقات ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں وہ اس قدر مہربان ہوگئے کہ اپنے یہاں آنے کی دعوت دی، اُنھوں نے ڈاکٹر نجم الدین صاحب کے بنگلے پر بھی مجھ سے نظمیں سُنیں اور اپنے ہاں بھی۔ مزید براں موقع بموقع داد دے کر میری حوصلہ افزائی بھی کی۔ ہادی مچھلی شہری اُس دور کے اُن بزرگوں میں تھے جنہیں منتہی کہا جاتا ہے، فارسی اُردو کے صاحبِ دیوان شاعر خلیق اور وضعدار ایسے کہ سب سے حسب مراتب برتاؤ جس میں

[1] فرید جعفری اور سعید جعفری سید نجم الدین جعفری کے صاحبزادے ہیں حال ہی میں فرید جعفری کا انتقال ہو چکا ہے وہ ایک بلند پایہ صحافی تھے اور پُرخلوص انسان۔

خلوص و محبّت کا عنصر غالب تھا۔

اہلِ ادب نے ابھی ہادی مچھلی شہری کی تخلیقات پر نظر نہیں ڈالی وہ ہرگز ان شعرا میں نہیں جنہیں نظرانداز کیا جاسکے۔ اُن کی فارسی شاعری نے تو اہلِ ایران کو انگشت بدنداں کر دیا تھا یہی وجہ تھی کہ غیر منقسم ملک میں سے اہلِ ایران نے جہاں رابندر ناتھ ٹیگور کو ایران آنے کی دعوت دی تھی، وہاں ہادی مچھلی شہری کو بھی مدعو کیا تھا اور وہاں کے اساتذہ اُنھیں اب تک استاذی کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

ابھی میں شملے سے لاہور کو روانہ نہیں ہوا تھا کہ اہلِ شملہ کے اصرار پر ایک اور مشاعرے میں شامل ہونا پڑا جس کی صدارت کے فرائض ڈاکٹر جعفری صاحب ہی نے انجام دیئے اور یہ مشاعرہ بھی اس لحاظ سے کامیاب رہا کہ شملے کی آبادی کے منتخب شعرا اس میں شریک تھے اور سامعین نے جس کو جس قدر چاہا سنا۔

چونکہ شملے میں کئی دن ٹھہرنا پڑا اس لئے میں تمام دن تو سعید الہ آبادی"، راجندر اور راغب مرادآبادی کے ساتھ قدرتی مناظر دیکھتا پھرتا اور شام کو مال روڈ کے ہجوم رنگ و بُو میں کھو جاتا۔ یہ نور و نکہت کا سیلاب ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوہساروں نے اپنے سینے کے زندہ اصنام کو اذنِ خرام دے دیا ہے کاٹھ روڈ کی طرف جانکلتے تو ایسا معلوم ہوتا، کہ ڈھلوان جُھک جُھک کر رکشا کھینچنے والے مزدوروں اور چھابڑی والوں کے جھونپڑوں کا جائزہ لے رہے ہیں اور ڈے وی کو بال روم سے جاکھو کی طرف چلتا، تو معلوم ہوتا کہ یہ شفّاف چڑھائی فطرت کی چھاتیوں تک چلی جائے گی۔ یہاں قدرت کی صنّاعی اور انسانی ترقی میں جنگ نظر آتی تھی، مسلسل جنگ!

ابر آلود رات کو جب میں مسلم ہوٹل کی کھڑکی سے باہر کو دیکھتا تو اندھیرے خلاؤں میں بلند و پست پر رنگ برنگ برقی قمقمے ایسے معلوم ہوتے جیسے جنّات کی لڑکیوں کا جہیز پھیلا ہوا ہو۔ بازار میں کہیں ٹھٹک کر کھڑا ہو جاتا تو حسین چہروں کا بے ترتیب

ے راغب مرادآبادی کراچی میں مقیم ہیں اور بدیہہ گوئی میں مہارتِ تامّہ رکھتے ہیں اور ان سے دری شگفتہ روئی چلی آتی ہے۔

سیلاب بہتی ہوئی کہکشاں معلوم ہوتا۔ مجھے وہ سماں نہیں بھولتا جب میں علی الصبح ایک کھڈ کی اونچی ڈھانگ پر کھڑا ہوا تھا۔ صبح کی کمسن اور معصوم ہوا اونگھتے ہوئے پودوں کے شانے ہلا ہلا کر جگا رہی تھی دور بجلی کے پول پر نکلتا ہوا سورج ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے شامیوں کے نیزے پر حسینؓ کا مقدس چہرہ۔ سنہری روشنی میں دور کی برف پوش چٹانیں شیشے کی پگھلتی ہوئی فصیلیں دکھائی دیتی تھیں۔ میں کئی گھنٹے اس منظر میں گم رہا جب سڑکوں پر دھوپ کی چاندنی بچھ گئی تو میں قیام گاہ پر آیا۔

اربابِ ثلاثہ

نواب صدیق علیخاں، عبدالستار اسحاق سیٹھ، حسینؓ امام

شملہ دہلی مسلم ہوٹل کے دوران قیام میں ایک دن صبح سویرے میں اپنے کمرے سے نکل رہا تھا کہ نواب صدیق علی خاں بڑے تپاک سے ملے اور ہاتھ پکڑے ہوئے اپنے کمرے میں لے گئے۔ وہاں عبدالستار اسحاق سیٹھ اور حسین امام صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ میں نے سلام کیا۔ پہلی ہی ملاقات تھی یہ لوگ کھڑے ہو گئے اور مشاعرے میں کامیابی پر مبارکباد دینے لگے چونکہ میں نے کبھی تعریف اور تنقید دونوں پر دھیان نہیں دیا، میرے سامنے تو میرا جنون اور اس کے تقاضے رہتے تھے میں نے ان کا رسمی شکریہ ادا کیا اور سب بیٹھ گئے۔

نواب صدیق علی خاں نے فرمایا "جناب جہاں تک آپ کی نظموں کا انداز بیان ہے اور ان کا پبلک پر اثر ہوتا ہے وہاں تک تو سب بجا و درست، لیکن ان نظموں سے آپ کا منشاء کیا ہے؟ آپ لیڈر بننا چاہتے ہیں یا اور کوئی گوشہ پیش نظر ہے۔"

میں: "جناب اس ملک کا لیڈر تو خدا مجھے نہ بنائے میں تو اسے اپنے لئے نیک فال نہیں سمجھتا۔"

نواب صاحب:۔ "کیوں صاحب؟ یہ کیوں؟"

اب تو اسحاق سیٹھ اور حسین امام صاحب بھی ذرا چونکے اور سنبھل کر بیٹھ گئے۔

میں نے جواب دیا "حضور یہاں کی لیڈری عوامی لیڈری نہیں ہے میرے خیال سے تو یہ لیڈری جو آج ہو رہی ہے سرمایہ داری کا ایک تحفظ ہے عوام کے مفاد سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ جب آپ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں گے تو محسوس کریں گے کہ سب بڑے لیڈر کسی نہ کسی بڑی طاقت کے ایجنٹ ہوتے ہیں یہ کسی طرح بھی بیرونی طاقت کے مخالف نہیں اور ہوں بھی تو کامیاب نہیں ہو سکتے یہ تو ایک قسم کی عوام فروشی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ ان کے اور ان کی تحریکوں کے تمام مصارف سرمایہ داری ہی برداشت کرتی ہے اور کیوں نہ کرے انگریز کی تاجرانہ پالیسی سے تجارت بھی تو انھیں کی متاثر ہوتی ہے عوام کی کون سی فیکٹریاں یا کارخانے ہیں کہ انگریز کے اشاروں پر چلنا ضروری قرار پائے"۔

نواب صاحب:۔ "ہاں اور ہمارے متعلق کیا خیال ہے؟"

میں:۔ "خیال کیا ہوتا برطانیہ کے راج میں آپ کیا کر سکتے ہیں؟ سوائے اس کے کہ اخلاق کا شور مچائیں اور تہذیب کا کھوکھلا پروپیگنڈا کریں"۔

سیٹھ ستار:۔ "اچھا جناب! ہم جیسے لیڈروں کو بھی اسی صف میں کھڑا کرتے ہیں آپ؟"

میں:۔ "جناب آپ مسلمانوں کے خیر خواہ اور نواب صدیق علی خان اسلامی نظریات کے انسان ضرور ہیں اور اس قوم کی فلاح و بہبود بھی چاہتے ہیں لیکن ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ آپ دو دشمنوں سے بیک وقت جنگ کیسے لڑ سکیں گے؟"

سیٹھ اسحاق:۔ "دو دشمن؟"

میں:۔ "جی! دو دشمن! تفصیل بتا دوں؟"

نواب صدیق علی خان :- "نہیں نہیں تفصیل کی ضرورت نہیں ، آپ یہ فرمائیں لیڈر کا فرض کیا ہے ؟"

مَیں :- "آپ تو اس شعبے کے اتالیق ہیں۔ مَیں آپ کو کیا بتا سکتا ہوں ؟"

نواب صدیق علی خان :- "اچھا آپ یہ فرمائیں کہ آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں ؟"

مَیں :- "مَیں ایک آپ ہی سے نہیں بلکہ تمام ہندو اور مسلمان لیڈروں سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ عوام کو اُبھار کر اُن لوگوں کو باغیوں کی فہرست میں درج نہ کرائیں۔ یہ غریب بال بچے دار اور مخلص پبلک ہے اس سے دشمنی اچھی نہیں، یہ تو ملک اور انسانیت کا بھلا چاہتے ہیں۔ مَیں دیکھتا ہوں کہ جیل خانوں میں سیاسی قیدیوں کی فہرست انھیں لوگوں کی فرد ہے جو صحیح معنوں میں ملک کے خیر طلب اور بہی خواہ ہیں کیا اِن تمام تاجروں اور مِل والوں کے سینوں میں دِل نہیں یا ان کی غیرت کہیں روپوش ہو گئی ہے کہ قید و بند میں ایک سرمایہ دار بھی نظر نہیں آتا اور کیوں نظر آئے ان لوگوں سے تو یہ تمام سیاسی فیکٹریاں چل رہی ہیں۔"

نواب صدیق علی خاں :- "ہاں صاحب بات تو پتے کی ہے لیکن عزیزم ! ہمارے ملک میں اتنی سکت کہاں ہے کہ دشمن کو بیک بینی و دو گوش نکال دیں یہ کام تو نہایت سوچ سمجھ کے ہیں۔ کوشش کی جارہی ہے کہ کام خوش اسلوبی سے ہو جائے۔ سوچتے ہم بھی وہی ہیں جو آپ نے سوچا ہے لیکن ہم خاموشی سے کام کر رہے ہیں ، ہمارے فکر و عمل کی راہ دوسری ہے آپ مزدور کے حالات پر روتے اور رُلاتے ہیں اور اپنی جگہ بالکل درست ہیں، بحیثیت شاعر یہ بڑی خدمت ہے اس سے آئندہ حالات کے لیئے زمین بنتی ہے لیکن ہم اس مقام پہ نہیں ہیں اور نہ آنا چاہتے ہیں ہمارا طریق کار دوسرا ہے لیکن ہمیں خوشی ضرور ہے کہ آپ ہمارے ہم خیال ہیں طرزِ عمل ہیں مختلف سہی آپ کی شاعری ہمارے لیئے ہی نہیں ملک بھر کے لئے سود مند ہے اگرچہ اس کا اگلا قدم بغاوت

کی حدود میں آجاتا ہے جس میں نظم وضبط نہیں ہوتا۔"

میں :۔"ارے صاحب! میں تو سرمایہ داروں سے رحم دلی اور ارکان حکومت سے منصفی چاہتا ہوں اور اس کا اظہار اپنا فرض خیال کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ مزدور اور کسان سے ناانصافی ہو رہی ہے اور کوئی مذہب یا قانون اس بے دردی کی اجازت نہیں دیتا اس پر طرّہ یہ کہ ہمارے لیڈر سیاسی پارٹیاں بناکر حکومت کو بتا رہے ہیں کہ صرف یہی لوگ حکومت کے لئے خطرناک اور بغاوت کے دلدادہ ہیں چنانچہ قید خانوں میں جاتا ہے تو پسماندہ طبقہ اور پھانسیوں پر چڑھتا ہے تو غریب طبقہ! ہمارے لیڈر تو دولت مندوں کا حصار کئے رکھتے ہیں۔ اور ان کے جلو میں حکومت کا قانون اور پولیس کا تشدد ہر وقت کمربستہ رہتا ہے۔"

نواب صدیق علی خاں :۔" آپ اپنا کام کئے جائیں اور ہم کوشش کرتے ہیں کہ ملکی حالات درست ہوجائیں آج سے ہم اور آپ دوست ہیں! یاد رکھیئے دوست ہیں!!"

میں :۔" اگر آپ مجھے اس قابل خیال کرتے ہیں تو یہ میری خوش بختی ہے۔"

اتنے میں چائے آگئی اور ہم چائے میں مشغول ہوگئے اس کے بعد اجازت لے کر میں اپنے کمرے میں چلا آیا۔

خراشِ راہ

شملے میں ایک صاحب مجھے اپنے یہاں ایک نشست میں لے گئے۔ یہ شملے کی تہذیب سے الگ تھلگ ایسے مہذّب لوگوں کی مجلس تھی۔ جہاں صحیح شاعر دل کھول کر اپنا کلام سناتے اور شعر کی صحیح داد پاتے تھے۔

جب کلام سنانے کے لئے میرا نمبر آیا تو ایک نظم کی فرمائش آئی۔ میں نے نظم سنادی اس کے بعد مشاعرہ برخاست ہوگیا اب گھر میں صرف چار آدمی باقی رہ گئے۔ صاحب خانہ نے فرمایا" آپ کو زحمت تو ہوگی مستورات میں سے فرمائش ہوئی ہے کہ احسان دانش اور کچھ سنائیں"

"مَیں یہ مقدس آرزو کیسے ٹھکرا سکتا ہوں۔ سناؤں گا اور ضرور سناؤں گا" مَیں نے جواباً کہا!

چنانچہ چار پانچ آدمیوں کی محفل پھر جم گئی۔ مَیں نے اپنی وہ نظمیں بھی سناڈالیں جو مشاعروں میں نہیں پڑھی جاسکتی تھیں اور رات کے ایک ڈیڑھ کے عمل تک یہ محفل گرم رہی۔

صاحب خانہ سرکاری ملازم تھے جب دفاتر شملے آتے تو شملے آجاتے اور جب دہلی واپس ہوتے تو دہلی چلے جاتے۔ چنانچہ اُن کی کرمفرمائیوں کے باعث اُن سے دونوں جگہ ملاقات کا سلسلہ رہنے لگا۔

وُہ قدیم معاشرے کے شریف اور خاندانی انسان تھے جہاں قدامت کا رکھ رکھاؤ آج تک معیارِ شرافت قرار پاتا ہے وہی مہمان نوازی، وضع داری اور زبان کی نیچ اُن کے یہاں اب تک چلی آتی ہے۔

اکثر اُن کی بیگم سے بھی میری گفتگو ہوئی جو اُنہی جیسی مہذّب اور روایت پرست خاتون تھیں۔ بات چیت میں سلیقہ اور حفظِ مراتب کے علاوہ شعر و شاعری پر بھی اُن کی اچھّی خاصی نظر تھی وُہ ادب شناس اور ادب جو ہونے کے علاوہ وسیع المطالعہ اور نقّاد قسم کی خاتون واقع ہوئی تھیں۔ بعض کڑی تنقید کرنے والے نقّادوں کی طرح روزمرّہ میں اُن کے وہی کڑوے کسیلے تیور اُن کے مباحث کو بلیغ اور نظریات کو مستحکم بنا دیتے تھے۔

وُہ خاندانی طور پر تو پردہ نشین تھیں مگر موجودہ تعلیم سے بہرہ مند ہونے کے باعث روایت کی دیواروں میں مبہم قسم کے دریچے کھل گئے تھے۔ جب وہ کہیں باہر جاتیں تو برقع پہنتیں اور گھر میں شوہر کی مرضی سے گوشہ کر لیتی تھیں۔ مَیں نے جب ان کے یہاں نماز پڑھی تو اندر سے آواز آئی "ماشاءاللہ شاعر بھی نماز پڑھنے لگے حالانکہ وہ اور ان کا شریکِ حیات دونوں خاصے مذہبی تھے۔"

مَیں نے پوچھا "کیا نماز بھی کوئی طنز کی چیز ہے؟"

"نہیں احسان صاحب! نماز طنز کی چیز نہیں! شاعر عموماً نماز روزے سے آزاد ہی دیکھے گئے ہیں اور اسی لئے شاید وہ آزادی سے گفتگو کر سکتے ہیں"۔ اُنھوں نے جواب دیا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کیا اس گمراہی کے بغیر آزادی سے گفتگو نہیں ہو سکتی ؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی آزادی تو سرکشی ہے آزادی نہیں چنانچہ میں نے ایسی گفتگو کرنے والے لوگوں میں کیریکٹر نہیں دیکھا کیونکہ خدا کی اطاعت سے آزاد ہو کر انسان کے سامنے لہو و لعب کے سوا کوئی راہ کھلی نہیں رہتی"۔ میں نے جواباً کہا۔

"بہشتی زیور میں تو یہ بات کہیں نہیں" اندر سے طنز یہ آواز جس کے پیچھے ایک ہولناک کچھو کا بسور رہا تھا۔

میں:۔ "بہشتی زیور میں نہ سہی یہ بات انسان کا زیور ضرور ہے"۔

وہ:۔ "آج کی عورت زیور کو پسند نہیں کرتی چاندی سونے کے ٹکڑوں سے نقش و نگار میں فرق نہیں آجاتا"۔

میں:۔ "جو عورت اس زیور کو پسند نہیں کرتی اس کا فطری حسن بھی جاذب نظر نہیں رہتا اس کا رجحان ریڈی میڈ بناؤ سنگار کی طرف ہو جاتا ہے اور اس قسم کی سہولت پسندی نسوانی لطافت کو کھا جاتی ہے آپ نہیں دیکھتیں یہ لنڈورا حسن پھیلتا جا رہا ہے"۔

وہ:۔ "آپ ناراض ہو گئے ہیں تو معافی چاہتی ہوں"۔

میں:۔ "معافی کی بات نہیں مجھے تو خوشی ہوئی کہ آپ بے خبر نہیں ہیں"۔

وہ:۔ "کیا بے خبر عورتیں بُری ہوتی ہیں آپ کی نظر میں ؟"

میں:۔ "مجھ جیسے شاعر کے لئے تو بہت اچھی ہوتی ہیں کیونکہ مجھے عورت کے جہل سے بڑی محبت ہے کسی اور کے متعلق معلوم نہیں"۔

وہ:۔ "معلوم ہوتا ہے آپ کی بیگم بھی پڑھی لکھی نہیں ہیں"۔

ہیں :۔" ہاں خدا کا شکر ہے وہ پڑھی لکھی نہیں ؛ صرف دینیات کی تعلیم ہے جس کا شریف لوگوں میں رواج ہے ۔"

صاحب خانہ نے بات کاٹ کر کہا۔" اچھا آپ دہلی کب آئیں گے ؛ جب بھی آپ دہلی آئیں غریب خانے پر قیام فرمائیں ۔"

مَیں نے ان کے خلوص کو دیکھتے ہوئے اقرار کر لیا دوسرے سال ہارڈنگ لائبریری کے مشاعرے میں گیا تو انھیں کے یہاں کئی روز قیام کیا۔ جس روز مجھے دہلی سے روانہ ہونا تھا اس کی صبح کو صاحب خانہ تو دفتر چلے گئے اور بیگم نے وہی گفتگو پھر شروع کر دی۔

" آپ مردوں کے اکھاڑے میں روحانیت پر بہت اچھی گفتگو کر لیتے ہیں، آخر یہ کیا قصہ ہے ؟ کہیں شاعری آہستہ آہستہ پیری مریدی کی طرف تو نہیں لے جا رہی ہے ؟" اُنھوں نے طنزیہ انداز میں سوال کیا ۔

مَیں :۔" مَیں رُوحانیت کو ماننے والا ہی نہیں روحانیت سے اچھی طرح متعارف بھی ہوں یہی وجہ ہے کہ اپنے دوستوں میں اس پر گفتگو کرتا ہوں اور اسے کوئی بری بات نہیں سمجھتا۔ لیکن میں اُن جاہل پیروں فقیروں کا ماننے والا نہیں جن کے حال و قال کے رقص اور کیفیت کی دھینگا مشتی جہلا کو جنت کے فریب دیتی رہتی ہے۔ مَیں نے ان تحصیلِ علم کے بغیر فنا و بقا پر گفتگو کرنے والوں کو نزدیک سے دیکھا ہے، یہ تو وضو اور نماز کے شرائط، حرام و حلال کی تمیز اور واجب و مستحب کے فرق سے بھی آشنا نہیں ہوتے۔ مَیں تو مذہب کے معاملے میں قرآن کے منکر اور سنت کے تارک کو کسی طرح بھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا وہ تو دن رات اپنی ہوس اور اشتہا کے غار کو حرام روزی سے بھرتے رہتے ہیں قیامت میں اُن کے اعمال و اشغال کا صلہ تو وہی دیں گے جنھیں دکھانے کے لئے یہ جعلی زہد و ورع اختیار کئے ہوئے ہیں اور اس شعبدہ کاری کو بزرگی اور سعادت کے لقب میں جُز دانا گیا ہے اور پھر یہاں تو مَیں نے آپ سے کوئی رُوحانیت کی بات بھی

نہیں کی۔ آپ کیوں جزبز ہیں"۔

بیگم صاحبہ: "اگر کوئی رُوحانیت کا کرشمہ ہے تو آپ دکھائیے! آپ کیا ہمیں اس قابل نہیں سمجھتے؟"

مَیں: "آپ کی قابلیّت کا تو مَیں معترف ہُوں لیکن کسی خاتون کے سامنے تقدّس کی برکتوں اور رُوحانیت کے بیان کو تضیع اوقات خیال کرتا ہوں۔ عورت تو صرف عورت ہے اور اس سے وہی گفتگو مناسب ہے جس سے اُسے مسرّت ہو۔ جو لوگ دوستوں میں عورتوں کے حسن و جمال کے قصّے اور عورتوں میں روحانیت پر گفتگو کرتے ہیں مجھے اُن کی مردانہ صفات میں شک ہونے لگتا ہے۔"

بیگم صاحبہ "بات تو آپ نے درست کہی ہے میری نظر اس کے ایک ہی رُخ پر تھی دُوسرا پہلو آپ نے نکھارا ہے آپ کے تجربے کو میں کیسے غلط کہہ سکتی ہوں۔ اچھا جو لوگ تبلیغِ دین کے سلسلے میں عورتوں کی مجلسوں یا جلسوں میں تقدّس اور رُوحانیت کی ڈینگیں مارتے ہیں ان کے متعلّق آپ کا کیا خیال ہے؟"

مَیں: "وہ یا تو اُن کا پیشہ یا پھر پردہ! اُن کی زبان کے ساتھ اُن کا دل نہیں ہوتا، معمُولی عورت بھی اُنھیں بے نقاب کر سکتی ہے۔"

بیگم صاحبہ: "اگر خوفِ الٰہی سے کسی کا یہ پہلو مُرجھا چکا ہو اور جنسی اشتہا کا غلام نہ ہو؟"

مَیں: "خوفِ الٰہی سے یہ پہلو مرتا نہیں کیونکہ جنّت میں تو حوروں کی بشارت دی گئی ہے البتہ نفسیات کی رو سے بعض حصّوں کو زنگ لگ جاتا ہے یا بعض وقت کوئی پہلو سُن پڑ جاتا ہے مگر عورت اُسے جب بھی چاہے زندہ و بیدار کر سکتی ہے۔"

بیگم صاحبہ: "آپ کو تجربہ ہو یا نہ ہو بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ وہ تقدّس میں غرق ہو کر باہر نہیں نکلتے اُن کے بدن مُردہ ہو جاتے ہیں اور روحیں پشیمانی میں ڈوب کر فریب کاری پر اُتر آتی ہیں۔"

اُس وقت وُہ کسی مصوّر کا ایسا شاہکار معلوم ہو رہی تھی جسے حیات کی نمائش سے کسی نااہل نے خرید لیا ہو اور اس کے رنگ دھندلا رہے ہوں۔

ہیں"۔ ہاں وقت کے تقاضے اور موسمِ بہار کی شدّت بھی انسان کو عموماً بے حس کر دیتی ہے ایسے موقعوں پر شباب کی آنکھوں پر چربی چھا جاتی ہے اور جسمانی تشنگی جہاں اعتماد کو گمراہ بنا دیتی ہے وہیں رُوح اور ضمیر کے کانوں میں بھی روئی ٹھونس دیتی ہے اِس گمراہی میں اُوسرا بندی نہیں ہوتی بلکہ دل و دماغ رُوح سے بغاوت کر جاتے ہیں۔ اس وقت شباب ایسے لوگوں کو اپنی یادگاریں پشیمانی، ندامت اور افسوس کے سوا کچھ نہیں دیتا۔"

میری اس گفتگو کو بیگم صاحبہ اس طرح سن رہی تھیں جیسے آسمانی آواز پر متوجہ ہو رہی ہوں کسی کسی نکتے پر اس کی گردن ہلنے لگتی تھی اور آواز کی شگفتگی اُداسی کی طرف جھک جاتی تھی۔ مَیں نے بیگم صاحبہ سے کہا "آخر آپ نے میری رُوحانیت کی گفتگو کے بارے میں کیوں ذکر چھیڑا؛ کیا کسی سے میری کوئی شکایت سُنی ہے یا کوئی گستاخی محسوس کی ہے؟"

بیگم صاحبہ "بات تو کچھ بھی نہیں، مَیں بھی کسی نتیجے پہ پہنچنا چاہتی تھی جس طرح آپ مَردوں میں رُوحانیت پہ گفتگو کر کے کوئی نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں، میری ایک سہیلی کے شوہر اپنی اُس بیوی سے جو قدیم معاشرت کی لڑکی ہونے کے باوجود جدید روشنی سے بھی نابلد نہیں۔ ساری ساری رات بزرگانِ دین کے قصّے بیان کرتے ہیں اور وُہ بے چاری اس لسانی یکسانیت سے اس قدر پریشان ہے کہ مستقل دورانِ سر رہنے لگا ہے، اُس کی جوانی کی کنواری چاندنیاں اور کوری دوپہریں مایوس گزر رہی ہیں، اور اُمنگوں کی کونپلیں خشک! اُس پہ اچھا اثر تو کیا ہوتا اُسے خُدا اور رسُول کے نام سے بھی نفرت ہو گئی ہے بعض اوقات وُہ جذباتی تشنّج میں مبتلا ہو کر بیہوش ہو جاتی ہے۔ اُس کی بھوکی بانہیں مُرجھائی ہوئی شاخوں کی طرح کمانیں ہو گئی ہیں۔ آپ غور

سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اُس کے کُندنی رُخساروں سے بسنتی جھانک رہی ہے اُس کا چہرہ بھوری بدلیوں کی رنگت سے پٹا ہُوا معلوم ہوتا ہے جس میں بُوند بھر پانی بھی نہیں ہوتا۔"

میں :۔ "بانو اس کا شوہر امیر کبیر آدمی ہوگا اور وُہ غریب گھر کی بچّی ہوگی، یا روپے کی جھلک سے سودا ہوا ہوگا یا پھر میاں کے قریبی عزیزوں میں ہوگی اور لڑکی کے والدین کو زمین جائداد کا لالچ ہوگا ورنہ ایسے رنڈکے ہوئے کے ساتھ شادی کی کیا تُک ہے؟"

بیگم صاحبہ :۔ "یہ دونوں باتیں نہیں مگر اور واقعات کچھ مِلتے جُلتے سے ہیں وُہ انسان تو نہایت شریف ہیں، خاندانی اور صاحبِ علم ہونے کے علاوہ بڑے اچھے عہدے پر فائز ہیں اور کسی قسم کی تکلیف نہیں دیتے، مگر وُہ اپنی غذا میں ایسی نعمت کو سامنے رکھتے ہیں جس کو ہضم کرنے کی معدے میں صلاحیت ہی نہیں ہے اور فریقِ ثانی کی اشتہا کو اللہ کے ذکر سے پُورا کرنا چاہتے ہیں۔ وُہ دُوسروں کے حقوق پہچاننے کے باوجود بیوی کو وعظ و پند کی لُلّو پتّو[1] سے زبان نہیں کھولنے دیتے۔"

میں :۔ "وُہ اپنے ہم صحبت لوگوں میں ضرور عورتوں کے قصّے قضیئے جاری رکھتے ہوں گے یا اس قدر مہذّب بنتے ہوں گے کہ کسی کو ایسی گفتگو کی جرأت نہ ہو۔"

بیگم صاحبہ :۔ "ہاں یہ بات تو ہے وُہ اپنی سوسائٹی کے لوگوں میں گندے اور مخش مذاق کے عادی نہیں شاید اپنے عہدے کی برتری قائم رکھنے کے لئے کسی سے کُھل کر مذاق نہیں کرتے۔" اُس وقت اس کا اندازِ گفتگو احاطۂ ادب اور حفظِ مراتب کی دیوار کو عبُور کرتا معلوم ہو رہا تھا۔

میں :۔ "جی ہاں! ایسا بھی ہوتا ہے۔ اس دُنیا میں نہ جانے انسان کن کن پہلوؤں سے زخم پالتا اور کیسی کیسی ضیق میں زندگی گذارتا ہے حالانکہ ہمارا اسلامی معاشرہ مرد ہو یا عورت کسی کو اس ریاکاری کی اجازت نہیں دیتا اسلام سچائی اور صاف گوئی کی

---

[1] لُلّو پتّو :۔ اِدھر اُدھر کی میٹھی اور خوش کن باتیں۔

تعلیم دیتا ہے۔

بیگم صاحبہ: "آپ کا اسلامی معاشرہ فراخدل ضرور ہے لیکن اس پر عمل کون کر رہا ہے؟ مردوں نے اپنے لئے تمام سہولتیں روا رکھی ہیں عورتوں کے حقوق پر اب تک کسی کی نظر نہیں۔ نہ اب تک کوئی عورت ایسی پیدا ہوئی جو اپنے حقوق اِن سے چھینے، اور ان کے مقدس لبادے اُتار پھینکے۔"

یہ الفاظ کہتے ہوئے بیگم صاحبہ کی آواز میں رُشتنی دوڑ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کے رُوبرُو تمام دُنیا کی عورتوں کی طرف سے وکالت کر رہی ہیں اور عدالت کو جانبدار پاکر برہمی تک آگئیں، پھر وہ خاموش ہوگئیں۔ ان کی خاموشی سنّاٹوں کی پہیلی اور ویران دلدل معلوم ہو رہی تھی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کمرے کی دیوار پر ایک انسانی سر کا سایہ رینگا۔ وہ چونک پڑیں اور بولیں" خادمہ نے مجھے آپ سے بے تکلف باتیں کرتے دیکھ لیا ہے یہ ضرور اُن سے کہے گی۔"

مَیں: "پھر کیا ہے؟ کیا وہ مجھ سے بدگمان ہو جائیں گے؟ یا وہ مجھے ایسا خیال کرتے ہیں کہ آسانی سے کوئی اتّہام تراش لیں۔ اُن کے سامنے بھی تو ہم تم ملتے بیٹھتے ہیں؟"

بیگم صاحبہ: "خیال تو نہیں کرتے لیکن بدگمانی تو مَرد کی گھُٹّی میں پڑی ہے نہ جانے کیا سوچیں مگر خیر آپ تو آج جا ہی رہے ہیں نا؟ جو ہوگا دیکھا جائے گا میں آپ کو اُن کے متعلق خط لکھوں گی۔ وہ ایسے ہیں تو نہیں،،

مَیں رات کو دہلی سے لاہور روانہ ہو گیا اور پھر اس کا کوئی خط موصول نہیں ہُوا البتّہ اُس کے شوہر کا ایک کارڈ آیا تھا جس میں میری طرف سے ان کے وہ پہلے جذبات نہیں تھے مَیں نے اِس بات کو کریدنا نہیں چاہا مبادا میاں بیوی میں تلخی بڑھ

جائے اور بدگمانیوں سے نتیجہ خراب نکلے مرد ہو یا عورت غصہ دونوں کو انجام سے بے خبر کر دیتا ہے، مجھے افسوس ہے کہ اُن سے میرے زیادہ طویل مراسم نہیں رہے اور میرا ادب کئی مفید نظریوں سے محروم ہو گیا۔ بعض اوقات سوچتا ہوں کہ مَیں نے ذرا سی بات کو بے وجہ طول دے دیا۔

اس کے شوہر نہایت قابل اور جہاندیدہ انسان تھے اور مجھے زندگی کے کئی راستوں میں اُن سے روشنی کے سُراغ ملے ہیں بات کچھ بھی نہیں تھی جسے خواہ مخواہ قبر تک کی خراش بنا لیا۔

پسماندہ طبقے کے لوگوں میں میری آمد و رفت تھی اور اس سے جہاں زندگی مجھے چیونٹیوں بھرا کباب معلوم ہوتی تھی، وہاں ایک زخمِ احساس اور بھی میرے دَرپے ہو گیا تھا وُہ یہ کہ جب اور جہاں میں کسی محنتی انسان کی تعلیم ناقص اور شعور بیدار پاتا یا ناداری کے باعث کسی ذہین لڑکے کو تعلیم سے محروم دیکھتا تو مجھے سخت تکلیف ہوتی اور جہاں تک بس چلتا اس کو سنبھالنے کی کوشش کرتا الحمدللہ کہ میرے اسی جذبہ نے کئی لوگوں کو سند یافتہ بنا دیا۔ آخر آخر جب میرے تعلقات اچھے اور بلند منصب لوگوں سے ہوئے تو مَیں نے اُن سے* بھی مدد چاہی اور اُنھوں نے میری صداقت کو مایوس نہیں کیا۔ میرے جاننے والے سب جانتے ہیں کہ مَیں نے کسی کو اپنے ذاتی مُفاد کے سلسلے میں زحمت نہیں دی۔ مَیں نے ہمیشہ مستحق، غریب اور مصیبت زدہ لوگوں کے لئے دوستوں سے انصاف اور رحم کی درخواست کی ہے مَیں اُن کا ممنون ہوں۔ رہا اس کا اجر، وُہ خُدا کی بات ہے اُسے وہی جانے۔

بعض لوگوں نے میری اس عادت کو بے راہروی اور کُنبہ پروری بتایا لیکن میں نے کبھی اُن کی پروا نہیں کی، کیونکہ میرا ضمیر صاف اور نیت پاک رہی ہے۔ مجھے جاننے والے جانتے ہیں کہ مَیں لالچی زندگی نہیں رکھتا اور کسی سے ناجائز فائدہ اُٹھانا میرا مشرب نہیں،

* مَیں اس سلسلے میں مرزا ناصر احمد صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی پرنسپلی کے زمانے میں میری کسی معروض کو نہیں ٹھکرایا۔ خدا انھیں جزا دے۔ اسی طرح خواجہ دل محمد مرحوم، رشید تجاری اور پروفیسر حمید احمد خاں بھی میرے شکریے کے مستحق ہیں۔

میرے بچوں کے سوا میرا یہاں کوئی کنبہ نہیں ہے البتہ ہر پریشان حال میرا عزیز ہے۔ مَیں نے اپنے کسی دوست سے کبھی ایسا کام نہیں لیا جس کی وجہ سے اُسے ندامت اُٹھانی پڑی ہو یا اُس کے منصب پر حرف آیا ہو، میری زندگی کا شروع ہی سے یہ انداز رہا اور آج تک اُسی ڈگر پر چل رہا ہوں بلکہ دوسروں کو بھی اسی روحانی لذت کی تلقین کرتا ہوں۔ ہر چند کہ جن لوگوں سے میں نے یہ سلوک کیا ہے اُنھوں نے اپنے منصب سے اِس ثوابِ جاریہ کو خارج کر دیا جو عقبیٰ میں ان کی نجات کا باعث ہوتا اور دُنیا میں نیکنامی کا

لائل پور کاٹن ملز کے مُشاعرے

جانے لائل پور کاٹن ملز میں کب سے مشاعروں کی بُنیاد پڑی ہو گی مگر سُنا تھا کہ وہاں اچھّے اچھّے بلند پایہ شعراء کا اجتماع ہوتا ہے۔ مُرلی دھر شاد نے جب مجھے بُلایا تو وُہ صرف میرے نام اور میرے غزل سے ہی واقف تھا نہ کہ میرے حالات اور داخلی کیفیات کے علاوہ معیارِ شعر سے، مَیں چونکہ اوّل سے مزدور ہوں اور مزدور کا حامی رہا ہُوں اس لئے جب مُرلی دھر کا ایلچی دعوت نامہ لایا تو میں حیران رہ گیا، میرا خیال تھا کہ سنگین محلّات آہنی پھاٹک اور شیشے کے روشندان والے مکانوں میں رہنے والے اتنے عالی ظرف نہیں ہوتے نہ اس قدر نازک احساس ہوتے ہیں کہ شعر کی لطافت اور آوازوں کی چھال[۵] سے بہرہ اندوز ہو سکیں جو شاعروں کے کلام سے سامعین کے دِلوں پر پڑتی ہے۔ کیونکہ اُن کے وہاں تو خوشبو کی جھنکاروں اور زخموں کی مہکاروں کا داخلہ ہی بند رہتا ہے لیکن مَیں نے دعوت نامہ اس خیال سے قبول کر لیا کہ اس میں دہلی اور گرد و نواح کے اساتذہ بھی شامل تھے اور ان سے ملاقات میرے لئے سعادت تھی۔ وہاں جا کر معلوم ہُوا کہ حضرت بیخود دہلوی کے فیضِ تربیت سے لالہ سری رام، لالہ شنکر لال اور مُرلی دھر شاد وغیرہ کے تو دیوان مرتّب ہو چکے ہیں اور مُرلی دھر شاد سرتاپا شاعر ہے جیسے سرمایہ دار اپنا بینک بیلنس دیکھ کر خوش ہوتے ہیں شاد

---

۵ چھال: بلندی سے پانی کی چادر گرنا چھال کہلاتا ہے۔

اپنی شعری تخلیق کو دیکھ کر ہشاش بشاش رہتا ہے۔ اس کے سینے میں شاعرانہ احساس کے دبے ہوئے زخم بھی کچھ کم نہیں مگر وہ اپنی شاہد و بادہ کی مجلسوں میں بھی ضمیر کو گمراہی سے بچاتا ہے حالانکہ شراب دل و دماغ ہی کو نہیں کانوں اور آنکھوں کو فرض شناسی، ہاتھ پاؤں کو کارکردگی اور ذہن کو مقدارِ کار سے دُور لے جا کر معزول کر دیتی ہے، فکر بلندی کی طرف پرواز نہیں کرتا اُس میں آسمانی پیام اور ماورائی تقاضے پاتال کے سُر معلوم ہونے لگتے ہیں اور الفاظ اپنے معنی کے جسموں کو سیّال بنا لیتے ہیں یہی نہیں، گفتگو کی ابتداء سے منشاء و منتہا بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

مُرلی دھر شاد شراب کے نشے میں بھی بصیرت کا دامن نہ چھوڑتا اور مستحق لوگوں سے حلم و سخاوت کا برتاؤ روا رکھتا جب وہ کسی کی مصیبت سُنتا یا دیکھتا اُسے پسینے آ جاتے اور اس کی آنکھیں بے رونق ہو جاتیں جیسے پُرانے مندروں اور مزاروں پر بجھے ہوئے چراغ، وہ حکومت کا خیر خواہ اور صاحبِ اقتدار لوگوں کا ثناخواں ہونے کے باوجود دلوں کی دھڑکنوں کو سنتا اور سمجھا جانتا تھا۔ یہ خوبی بھی شاید حضرت بیخودؔ ہی کے فیضانِ صحبت کا نتیجہ تھی۔

مُرلی دھر شاد پہلی ہی ملاقات میں مجھ سے اس قدر کُھل گیا کہ اس کے ظاہر و باطن مجھ پر بے نقاب ہونے لگے اور ارادہ و خیال اس کے چہرے پر کتاب کی طرح نمایاں ہو گئے وہ لائل پُور سے جب بھی لاہور آتا تو غریب خانے پر ضرور آتا اور کھانے پینے میں بھی احتیاط نہ برتتا۔

ایک دن وہ اپنے کسی کام سے صُبح صُبح لاہور آیا اور سیدھا میرے یہاں پہنچ گیا۔ مَیں ناشتے میں بیسنی روٹی اور چٹنی کھا رہا تھا میں نے جھکتے جھکتے اُس سے ناشتے کے لئے کہا اور وہ بے تکلّف دسترخوان پر آ گیا۔ مَیں شرمندہ سا ہو گیا کہ ایسے ہم مفلسوں کی یہ مخصوص ڈِش کیا پسند آئے گی لیکن وُہ دو چار لقمے کھانے کے بعد کہنے لگا

"مجھے اپنے یہاں ناشتے میں کبھی ایسا مزا نہیں آیا یہ تو میاں عیاشی ہے عیاشی! یہ تو بتاؤ اس چٹنی میں کیا مصالحے ڈالتے ہو؟"

"میں نے سیدھے سبھاؤ جواب میں کہا "کچھ نہیں یہ تو نمک مرچ کی چٹنی ہے ہم غریب لوگ مصالحوں کا تکلّف نہیں کیا کرتے اس میں جو لذّت ہے وہ صرف شدّت کی بھوک یا پھر حلال روزی کی ہے"، میں نے تو مذاق میں ذرا سا طنز کیا تھا وہ سچ مچ اس پر سوچنے لگا اور بولا "بھائی شاید یہی بات ہے لیکن محنت تو میں بھی مزدوروں سے زیادہ کرتا ہوں یہ اور بات ہے کہ وہ لکھنا پڑھنا اور بھاگ دوڑ کے علاوہ تجارتی جوڑ توڑ ہوتے ہیں کل میں اپنے یہاں یہ چٹنی بنواؤں گا ممکن ہے حرام اور حلال روزی ہی کا فرق ہو۔"

اس نے لائل پور پہنچ کر سویرے سویرے گھر میں بیسنی روٹی اور نمک مرچ کی چٹنی کے لئے آرڈر دیا لیکن چٹنی سامنے آئی تو اس میں وہ ذائقہ مفقود تھا، جو میرے یہاں چکھ چکا تھا اور جس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں لہسن نہیں تھا جو اس چٹنی کا جزوِ اعظم ہوتا ہے۔ غالباً مرلی دھر شاد کے رسوئیے نے ذائقوں کی افراط میں لہسن کے کرشمے نہیں دیکھے تھے وہ شاید پراٹھے پونے اور دال سبزیاں چھونکنے میں ماہر تھا۔ چنانچہ شاد جب پھر لاہور آیا تو چٹنی کی فرمائش کی اور کہنے لگا "احسان صاحب یہ تو واقعی حلال اور حرام روزی کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اپنے یہاں یہ چٹنی بنوائی تو مجھے بالکل یہاں جیسی لذّت نہیں آئی۔"

میں سمجھ گیا اور پوچھا کہ "جناب اس میں لہسن بھی پسوایا تھا کہ نہیں؟"

"آپ نے لہسن کو تو نہیں کہا تھا۔" شاد نے جواباً کہا۔

میں نے کہا "جناب پھر لذّت کیسے آسکتی تھی، اب کے اس میں دو پوتھی لہسن کی پسوا لینا پھر دیکھنا کیسا مزہ آتا ہے۔" اس نے مجھے پہلی ہی ملاقات میں چلتے وقت

یہ کہہ دیا تھا کہ اگر آپ کی نظر میں کوئی مستحق امداد ہو یا کپڑے کے معاملے میں جس کی آپ مدد کرنا مناسب خیال کریں اُسے چِٹ پر اپنا نام لکھ کر بھیجدیا کریں میں اپنے ملز سے کپڑا دلوا دیا کروں گا۔

چنانچہ لائل پور کاٹن ملز سے کئی غریبوں کے جسم ڈھکے گئے اور کئی ناداروں اور بیواؤں کی لڑکیوں نے عروسی لباس پہنا اُس کی جزا تو خُدا کے اختیار کی بات ہے لیکن مجھ پر اُس کے اس رویّے سے بڑا گہرا اثر ہُوا اور میری طبیعت خود بخود اس کے احترام پر مجبور ہوگئی۔

گھنٹی گھر کے مشاعرے کے بعد شاد کے بنگلے پر بھی ایک نجی نشست ہوتی تھی جس میں کئی شعرائے کرام شاد کے قرب اور شنکر لال جی کی نزدیکی کے لئے قطعات اور قصائد لئے بوکھلائے پھرا کرتے تھے میں نے سرِ محفل کئی حضرات کو نثری منقبتوں میں مصروف پایا۔ شاد اِس تمام سوانگ کو اچھّی طرح سمجھتا تھا مگر اس کا حلم اُس کے ہونٹوں پر کبھی تلخی نہیں آنے دیتا تھا۔ مَیں نے مشاعرے کے علاوہ کبھی اُس کی قربت کی کوشش نہیں کی۔ فرصت دیکھ کر وُہ خود میرے پاس آجاتا تھا اور ہنسی مذاق کر کے چلا جاتا، تاکہ کسی کو کچھ غلط فہمی نہ ہو جائے، اُس کا یہ روّیہ میرے ساتھ ہی نہیں تھا وہ مشاعرے کے بعد سب کے پاس جاتا اور ہر ایک سے پُوچھتا کہ آپ کو جو ضرورت ہو مجھے بتائیں آپ کو میرے عملے سے کوئی شکایت تو نہیں؟

ایک دن احمد اسلام خاں جو اس کاٹن ملز کے سب سے بڑے افسر تھے مجھ سے کہنے لگے "احسان صاحب! اور شاعروں کی طرح آپ کو کبھی لالہ سری رام یا شنکر لال جی سے ملنے کے لئے کوشاں نہیں دیکھا، ایسی اَدب نواز شخصیتوں کی تو تعظیم کرنا چاہیئے"

مَیں نے کہا "جناب میرا ممدوح تمام دُنیا کے دولت مندوں سے بڑا دولت مند ہے اور اس کے آستانے پر بادشاہ بھی فقیروں کی صف میں نظر آتے ہیں اور وہی مجھ

۵ اس کے علاوہ میں کسی کو میں نے بڑا انسان نہیں پایا۔

جیسے بدمزاج اور گنہگار مفلسوں کو بھرتا ہے لالہ جی ہی نہیں شاید دُنیا کا کوئی بھی سرمایہ دار مجھے خوش نہیں رکھ سکتا۔"

احمد اسلام خاں نے کوئی جواب نہیں دیا اور جب چلنے لگے تو فرمایا کہ آج شام کو میرے ساتھ چائے پئیں تو نوازش ہوگی۔ مَیں نے اُن کے لہجے کو پُرخلوص پاکر وعدہ کرلیا۔ پانچ بجے اُنھوں نے اپنا آدمی بھیجدیا اور مَیں اُس کے ساتھ اُن کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ اُن کے یہاں کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی شاید اِسی خلا کو پُر کرنے کے لئے اُنھوں نے اپنے دو بھانجوں کی تعلیم وتربیت اپنے ذمّہ لے لی تھی اور اُنھیں بیٹوں کی طرح بڑے چاؤ سے رکھتے تھے ان کے یہاں سے کئی بیواؤں یتیموں کی تنخواہیں اور مسجدوں کی تعمیر اور دینی اداروں کی معاونت کے لئے اچھی خاصی رقمیں جاتی تھیں مجھے اُن کے صحیح حالات سے اُس وقت آگاہی ہوئی جب وُہ لاہور کے میو ہسپتال میں علاج کی غرض سے داخل تھے میں اور شفیق کوٹی صاحب بلاناغہ اُن سے ملنے جاتے تو دینی اداروں کے اراکین کا تانتا بندھا رہتا، اور وُہ ہر ایک کی مناسب امداد کرتے۔

اپنے بھانجوں کی تعلیم وتربیت اور بیاہ شادی کے بعد وُہ یا تو ملز کے کاموں میں جُٹے رہتے یا پھر غُربا اور مساکین کی امداد جو اُن کا مشغلہ بن چکا تھا غالباً وُہ اپنے سرمائے کا بڑا حصّہ اِسی غریب پروری میں صرف کردینا چاہتے تھے میرے خیال سے وُہ نیک، صاحب ایثار اور دیانتدار انسان تھے اللہ اُن کی رُوح پر کرم فرمائے۔آمین

یُوں تو لائل پور میں کئی نغز گو شعرا موجود تھے مثلاً منظور احمد صاحب منظورؔ، خلیق قریشی، ابراہیم شمیمؔ، اشرف ریاضی، پروفیسر منظور حسین شورؔ، پروفیسر محمد عبداللہ کاملؔ اور جناب اصغرؔ وغیرہ مگر جو اراکینِ مشاعرہ لائل پور کاٹن ملز میں ملازم تھے ہرچند کہ اُنھیں مصروفیات فرصت نہیں دیتی تھیں لیکن جب وُہ توجّہ سے شعر کہتے تھے تو کسی صُورت میں بھی اپنے ہم عصروں سے ہیٹے نہیں رہتے تھے اُن میں مرلی دھر شادؔ،

حضرتِ یکتاؔ دہلوی، عارفؔ دہلوی، فیضؔ جھنجھانوی، طاہرؔ دیوبندی قابلِ ذکر ہیں۔ البتہ فیض جھنجھانوی اور جناب شورؔ علیگ کو میں پہلے سے جانتا تھا۔

کاٹن ملز کے شعرا، اُن فنکاروں میں نہیں تھے جنھیں اوچھے سرمایہ دار دریافت کر لیتے ہیں جو بچے کھچے ٹکڑوں، شراب کی چھوٹی پیالیوں اور معمولی قسم کے مصارف سے خرید کر اپنے بنگلوں میں جشن برپا رکھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً جب کوئی برسرِ اقتدار انسان آتا ہے تو ان کا استعمال آلۂ تفریح کے طور پر روا رکھتے ہیں۔

اُسی دَور میں جب کاٹن ملز کے مشاعروں کی شہرت کو پَر لگے اور دُور دُور اُس کے چرچے پہنچے تو مرلی دھر شاد کی دیکھا دیکھی بعض بڑے ٹھیکیدار اور فیکٹریوں کے مالک ادب نواز شخصیتوں کی خوشنودی اور عوام میں ہر دلعزیزی کے لئے نجی مشاعرے بھی کرانے لگے جو اصل میں ایک تاجرانہ چھَل یا فریب ہے اس قسم کے ارباب دولت مند، سادہ لوح فنکاروں کو مستقل ملازمت تو نہیں دیتے مگر ان کے مصارف کو لاگت میں شریک ضرور کر لیتے ہیں۔

اِن شعری کارکنوں اور آنریری فنکاروں کا فریضہ مجلسوں میں نغمہ و ماتم کے سوا کچھ نہیں ہوتا اور صلے میں جھوٹی داد و تحسین اور دسترخوانوں کی ریزہ چینی کے علاوہ کچھ نہیں پاتے۔ حالانکہ کارگزاری کے تحت اُنھیں شعر و نغمہ پر اچھا خاصا عبور ہو جاتا ہے، یہ مرثیے، سہرے، رخصتیاں اور مبارکبادیاں، معیاری شعرا سے زیادہ اچھی لکھ پڑھ لیتے ہیں لیکن یہ خود کو کرایہ پر چلنے والے سامان کی طرح بنا لیتے ہیں اُن کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں اور ارادے فیل پائی میں مبتلا رہنے لگتے ہیں۔ جیسی گنجی ستی ویسے ہی اُترت بگھاری، ان فنکاروں کو آقا بھی ایسے نصیب ہوتے ہیں کہ بعض بعض اوقات اُن میں ایسی غیر متوازن ہستیاں اُبھر آتی ہیں کہ خانساماں اور غلام اُن کی کمینگی پر دانتوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں مگر اس کے باوصف یہ فنکار جگہ جگہ اُن کے بے رُوح قصیدوں اور بے جان اظہارِ تشکر میں

ل ان شاعروں کے متعلق میں نے اس کتاب کی دوسری جلد "تذکرہ جہانِ دانش" میں ذرا تفصیل سے لکھا ہے۔

مصروف نظر آتے ہیں۔

مُرلی دھر شاد کی نظروں سے شاعروں کی قدر و قیمت اور افسران کی قابلیتیں پوشیدہ نہیں تھیں اُس کی نظر میں حفظِ مراتب اور انسانی ہمدردی کے لئے بڑی گنجائشیں تھیں

بعض بعض احساس کمتری کے مارے ہوئے فنکار بھی شہرت پسند آقاؤں اور دُنیا پرست مالکوں کی دریافت میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ اُن کی در در کی ذلت سے بچنے، اور نقد و تبصرہ کی چھان پھٹک سے محفوظ رہنے کی ایک ترکیب اور ضرورت ہوتی ہے لیکن اپنی غم آلود پستی کو چھپانے کی غرض سے ملوں، فیکٹریوں اور فلم کمپنیوں میں پناہ لینا بھی کوئی معمولی کام نہیں ہے اس میں بھی بڑی ٹیڑھی نیچی جگہوں پہ پاپڑ بیلنا پڑتے ہیں مگر جب وُہ کامیاب ہو جاتے ہیں تو اپنے سے پست اور کم سواد لوگوں میں اپنی عظمت و قابلیت کا ڈھول پیٹ کر نفسیاتی طور پر معاشی آسودگی کے ساتھ شہرت کے خلا کو پاٹتے اور اس تنگ ظرفی اور ضمیر کی جھوٹی سیرابی کو بلندی کا نام دیتے ہیں۔"

اُن کے نہید امن، اور انسانیت سے محروم آقا پالتو جانوروں کی طرح ان کی نمائش کرتے رہتے ہیں۔ ان کے تمام منصوبوں میں مشاعرے، مناظمے اور مراقصے حکام کی خوشنودی اور انکم ٹیکس سے بچنے کے لئے صابون کے بُلبلوں کی طرح رنگین نظر آتے ہیں جن کو آزاد ہواؤں کی ذرا ذرا سی ٹھیس چکنا چُور کر دیتی ہے مگر یہ ہیں کہ اس خود غرضی کو شاعر نوازی اور ادب پروری کا لقب دیتے ہیں اور موقع موقع سے اس تاجرانہ فریب کاری کو غریب پروری اور مسکین نوازی کا نام دے کر اپنی اوٹ پٹانگ تقریروں میں عجیب عجیب طریقوں سے بیان کرتے ہیں۔

مگر جاننے والے حکام اور پہچاننے والے صاحبِ اقتدار لوگ ان فنکاروں اور تاجروں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں بلکہ بعض بعض اوقات شرفا نوازاور ادب پرور حکام

جانچ پرکھ کر اُبھرنے اور جھجکتے ہوئے فنکاروں کو از راہِ ثواب اس دامِ تزویر سے چھڑا بھی لیتے ہیں اور ادب کی خدمت کرنے والے مخلصوں کی امداد بھی کرتے ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ تاجروں کی اس گراں گوش مخلوق کو شعر کی تقدیس اور لطافت سے دُور کا واسطہ بھی نہیں۔ وُہ روح کی زبان اور لہجوں کی اشاریت سے ہرگز آشنا نہیں ہو سکتے۔ اُنہیں کیا خبر کہ شعر و نغمہ کی بارش اور عالمِ ارواح کے درمیان کون کون سے رنگ کے خطوط شیرازہ بندی کرتے ہیں، وُہ تو خود کو عظمت و بلندی اور معمولی فنکاروں کو اُن کی بلند فنکاری کا یقین دلانے کے لئے سادہ خاطر مزدوروں کو سامعین بنا کر سخن گری اور سخن فہمی کی خانہ پُری کرتے ہیں۔

اس قسم کے اداروں میں صحیح قسم کا سخن گو اور سخن فہم ذرا مشکل ہی سے دستیاب ہوتا ہے اور کچھ ہیں بھی تو وُہ مرکز سے دُور دائرہ خمول میں گھُٹے رہتے ہیں رفتہ رفتہ ان کی صلاحیتیں خوشامد اور تعمیلِ احکام کے تانے بانے میں جکڑ کر رہ جاتی ہیں۔ ہاں بعض جرائد کے ایڈیٹر از راہ ہمدردی کبھی کبھی اُنھیں چھاپ دیتے ہیں۔

لائن پُور کاٹن ملز میں جو نشستیں ہوتی تھیں اُن میں شاعروں ادیبوں اور چند سخن فہم حضرات کے سوا تیسرے درجے کا آدمی نظر نہیں آتا تھا کیونکہ شاد جانتا تھا کہ جب شاعر یا فن کار کے گرد اس کے فن کو سمجھنے والے نہ ہوں اُس وقت اظہارِ فن کے وقت روح پر فالج جیسا حملہ ہوتا ہے اور ہنرمندی خود کو پیشے پر خیال کرنے لگتی ہے جس میں ذلّت، رسوائی اور تحقیر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ کاٹن ملز کی نشستوں کا سرُور آج تک تصوّر کو شاداب اور یادوں کو درخشاں کئے ہوئے ہے۔ اب بھی لگتا ہے وہاں مشاعرے تو ہوتے ہیں مگر گذشتہ ادب و شعر کے عرُس کی طرح!!

والد صاحب کا انتقال

جب میری پہلی کتاب "حدیثِ ادب" چھپی تو نہ جانے کن لوگوں نے اور کیوں پسند کی ؛ وُہ کسی قسم کے اشتہار کے بغیر بفضلِ تعالیٰ میری توقع سے زیادہ فروخت ہوئی اور جو باقی رہیں اُن کا میں نے دُوسرے دکان داروں سے تبادلہ کر لیا اور اس عمل سے میرا ایک معمولی سا کُتب خانہ قائم ہو گیا ، اب میری شاعری بھی اس درجہ پر آ گئی تھی کہ مجھے لاہور سے باہر منعقد ہونے والے مشاعروں میں شریک ہونے کے لئے معقول لوگ معقول قسم کے مصارف سفر دینے لگے تھے لیکن میرے پیشِ نظر میرا ماحول تھا اور ہمیشہ تھرڈ کلاس ہی میں سفر کرتا تھا اس کفایت سے دوسرے مصارف میں آسانی ہو جاتی تھی مجھے اپنے علاوہ اپنی بیوہ بہن اور اس کے پانچ بچّوں کے لئے بھی کچھ نہ کچھ خیال کرنا پڑتا تھا ، علاوہ ازیں میری اہلیہ کا چچا جو نابینا تھا وہ بھی ہر ماہ میری آمدنی میں جائز حصّہ دار تھا ان تمام باتوں کے باوجود میری بیگم نے مجھ سے بالا بالا اچھی خاصی رقم جوڑ لی ، ایک دن اُس نے کہا کہ لاہور میں سر چھپانے کے لئے کہیں تھوڑی سی زمین خرید لیں ۔ مَیں نے کچھ روپیہ جمع کر لیا ہے اس سے کم سے کم زمین تو ضرور آ جائے گی اس میں خواہ جھونپڑی ہو اپنی چیز تو ہو گی آئے دن مکان بدلتے بدلتے گھر کا سامان بھی ختم ہوا جا رہا ہے ۔

مجھے حیرت ہوئی کہ یہ رقم کیونکر بچ گئی اور اپنی اہلیہ کی سلیقہ مندی کو سراہتے بن پڑی ۔ مَیں نے بھی سوچ لیا کہ اس رقم کی زمین ہی خرید لی جائے لیکن جب والد صاحب نے سُنا کہ زمین کی خریداری کا منصوبہ بن رہا ہے تو وُہ کچھ خُوش نظر نہ آئے اور کہنے لگے میں اپنا مکان کاندھلے میں بنواؤں گا اور تمہارا قیام لاہور میں مناسب سمجھتا ہوں ، کیونکہ تُم نے یہیں محنت کی اور جان کھپائی ہے ۔ مَیں اپنی زندگی کے آخری دن کاندھلے میں گزارنا چاہتا ہوں اور اپنے بزرگوں کے قبرستان سے دُور نہیں رہنا چاہتا ۔ بیگم اور مَیں دونوں نے خاموشی سے ایک ایک پیسہ والد صاحب کے حوالے کر دیا اور کاندھلے میں اپنے ایک عزیز دوست

محمد رفیق قریشی کو خط لکھ دیا کہ میرے والد صاحب آ رہے ہیں۔ انھیں وہاں ان کی مرضی کے مطابق ایک مکان بنوا دیں۔ کچھ روپیہ ان کے پاس ہے اور کچھ میں ساتھ کے ساتھ بھیجتا رہوں گا۔ چنانچہ کاندھلے میں آبائی مکان سے الگ معقول قسم کا سیمنٹڈ دو منزلہ مکان بن گیا اور والد صاحب وہیں رہنے لگے۔

میں نے بھی یہ سوچا کہ اگر لاہور کی زمین نے جگہ نہ دی تو شاید قبر کے لئے مجھے بھی وہیں جانا پڑے اور یہ بھی ارادہ کر لیا کہ دنیا نے مجھے جس چیز سے محروم رکھا ہے میں اپنی یادگار میں دنیا کو وہی چیز دے کر جاؤں گا یعنی ایک ایسی لائبریری جہاں دور دور سے محقق آ کر تحقیق کیا کریں۔ اس تصور سے نیچے کی منزل میں ایک بڑا کمرہ لائبریری کے لئے اور اس سے ملحق ایک کمرہ تصنیف و تالیف کے لئے رکھا اوپر کی منزل میں زینے سے قریب والد صاحب کی عبادت گاہ خاص طور پر خوبصورت اور ہوا دار بنوائی۔ اُس وقت میرے محلے میں صرف میرا مکان سیمنٹڈ تھا بعد میں کئی حویلیاں اُس سے بلند اور وسیع وجود میں آ گئیں۔

میرے والد صاحب بڑے مذہبی اور زود رنج قسم کے انسان تھے۔ میں صاحبِ اولاد ہو گیا تھا لیکن اُن کی مار پیٹ برابر جاری تھی۔ بعض اوقات تو جب وہ مجھے پیٹتے تو ہمسائے آ کر چھڑانے لگتے اور میں انھیں منع کرتا "آخر یہ میرے والد ہیں اِن کے ہاتھ سے مار کھانا تو میرے لئے سعادت ہے۔ آپ اپنا کام کریں"۔ میرے والد کے ایک دوست فیروزی لال نامی باغپت کے رہنے والے تھے جو انبالہ چلے آئے تھے۔ کبھی کبھی والد صاحب اُن کے یہاں بھی چلے جاتے اور وہ اپنے والد کی طرح اُن کا ادب کرتے۔ بعض بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ یہاں میری طبیعت خراب ہوئی، اور اُدھر فیروزی لال کا خط آ گیا کہ آپ تشریف لائیں، تو والد صاحب مجھے خُدا کے سُپرد کر کے خود انبالہ چلے گئے۔ پھر کبھی کبھی تو مہینے مہینے وہاں رہتے۔ فیروزی لال

سے میں بھی ملا ہوں وہ نہایت شریف اور قدر شناس انسان تھے اور مجھ سے وُہ بھائی کی طرح برتاؤ رَوا رکھتے تھے۔

زندگی کے روز و شب تھے کہ بسر ہوتے جا رہے تھے۔ بعض وقت جب ماحول کی گرفت سخت ہوتی تو ایسا محسوس ہوتا کہ شام کے ستارے سے صبح کے سُورج کا فاصلہ جان لیوا سفر ہے اور جب ہاتھ تنگ نہ ہوتا تو نگاہیں ستاروں اور پھولوں سے زیادہ خد و خال کی طرف لپکتی رہتیں۔ شاید اس لئے کہ میرے اندر کا شاعر حُسن کا پیاسا تھا۔

ایک دفعہ میں غالباً بنگلور (میسور) مشاعرے میں گیا ہُوا تھا اور والد صاحب کے پاس پندرہ روز تک میری خیریت کا خط نہ جا سکا۔ ایک تو انھیں میری طرف سے پریشانی تھی دوسرے تبدیلیٔ موسم سے اُن کی طبیعت بھی اچھّی نہیں تھی۔ نہ جانے کس ظالم نے اُن سے جا کر کہہ دیا کہ احسان تو بھوپال کے مشاعرے سے واپس آتے ہوئے ریل گاڑی میں فوت ہو گیا اور اس کی لاش کو لوگوں نے جھانسی کے اسٹیشن پر ہی دفنا دیا ہے یہ سنتا تھا کہ ایک دم انھیں پسینہ آیا اور سقوطِ قلب سے راہیٔ عدم ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

جب میں بنگلور سے بجنور کے مشاعرے میں آیا تو اُسی دن شام کو مُجھے ایک دوست نے والد صاحب کے انتقال کا تار بھیجا اور مَیں بجنور سے رات کو روانہ ہو کر دُوسرے دن دو بجے کاندھلے پہنچ گیا لیکن اس وقت وُہ سپردِ خاک کئے جا چکے تھے مَیں نے اُن کی قبر پر فاتحہ پڑھا اور پہلی بار مجھے اپنی بیکسی اور بے بسی کا احساس ہوا۔ باپ ہونے کے علاوہ وہ اُستاد اور زندگی کے سفر میں میرے اعلیٰ درجے کے مشیر بھی تھے میں نے اُن کے انتقال سے محسوس کیا کہ جیسے خضر علیہ السلام نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا، میرے سامنے حدِ نظر تک ایک وحشت لے جادہ پھیلا ہُوا ہے اور چہار دیواری زمین بوس ہو گئی ہے۔

لاہور کی فضا اور سوسائٹی کے نئے خیالات میں ممکن تھا کہ میں اپنے ماضی کے عقائد سے دست بردار ہو کر کسی غلط رستے پر چل نکلتا لیکن ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور جناب امیر الدین قدوائی ایڈووکیٹ کے علاوہ حکیم نصیر احمد مرحوم سے تبادلۂ خیالات کا سلسلہ ایسا تھا کہ جس سے میرے خیالات و جذبات کے بڑھتے ہوئے شاخچوں کی تزئین و تہذیب ہوتی رہتی تھی۔

جناب برہان احمد فاروقی اسلامی فلسفے پر عبور رکھنے والے باشعور اور مثالی انسان ہیں۔ انھوں نے زمین و آسمان کے بھاری پاٹوں میں پس پس کر تعلیم مکمل کی لیکن معاشرے میں ان کے لئے کوئی ایسی جگہ نہ نکلی جس سے وہ باعزت طور پر زندگی بسر کر کے ملک و قوم کا کوئی بڑا کام کرتے

جناب امیر الدین قدوائی دنیا بھر کے قوانین سے آگاہ اور قرآنی قوانین پر کاربند ہیں۔ وہ مشکل سے مشکل مسائل کو قرآن کی روشنی میں آسان سے آسان لفظوں میں ادا کرنے پر قدرت رکھتے ہیں، جہاں وہ علم و فضل سے مالا مال ہیں وہیں اُن کی درویشی بھی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ دوستوں میں نیاز مندی اور مغرور لوگوں میں بے نیازی سے پیش آنا اُن کی فطرت بن گئی ہے۔

حکیم نصیر احمد[1] قصبہ کرت پور ضلع بجنور کے رہنے والے تھے اور ملٹری اکاونٹ آفس میں ملازم تھے۔ زندگی کے اہم ترین مسائل کو قرآن کی روشنی میں سمجھنا اُن کا محبوب ترین مشغلہ تھا، وہ ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق شائستہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اکثر غریب خانے پر تشریف لاتے اور اسلامی شعار کی تبلیغ کرتے اُن سے میں نے کئی اُلجھے ہوئے مسائل سمجھے ہیں۔ وہ ایک صاحبِ ضبط اور بُردبار انسان تھے۔

---

[1] حکیم موصوف وفات پا چکے ہیں ان کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خاں، جناب فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، سید حسام الدین راشدی، پروفیسر محمد ابراہیم شمیم، ابواللیث صدیقی، اعجاز الحق قدوسی اور بشیر احمد خاں نے بھی میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ اور میری روح اُن کی ممنون ہے۔

بھوپال کا مشاعرہ

جب مجھے بھوپال سے مشاعرے کا دعوت نامہ آیا تو میں تین چار روز پہلے اس خیال سے دہلی روانہ ہوا کہ ایک دو روز اسحاق شور صاحب سے دل لگی رہے گی اور پھر دہلی کے تمام مدعو شعراء کے ساتھ بھوپال روانہ ہو جاؤں گا۔ دلّی پہنچتے ہی میں نے گوردوارہ روڈ کی راہ لی اور شور کے مکان پر پہنچ گیا وہ حکیم رضوان احمد صاحب سے میرا تعارف پہلے ہی کرا چکے تھے جو شکلاً تو مجھ سے بھی ذرا اُترتے سے تھے لیکن جسم کی فربہی کے لحاظ سے تجسیم شحیم انسان، علم و فضل کے اعتبار سے وہ ان لوگوں کی صف میں آتے تھے جو دریا پی کر بھی ہونٹوں کی پپڑیوں پر زبان پھیرنے سے باز نہیں آتے القصہ صورتاً جس قدر حُسن سے محروم سیرتاً اسی قدر قابلِ احترام اُستاد اور کام آنے والے دوست کے علاوہ انسانیت کے مبلّغ!

دوسرے روز حکیم محمد احمد صاحب سے تعارف ہوا یہ صاحب حکیم رضوان احمد صاحب کے مطب کو سنبھالے ہوئے تھے اور حکیم رضوان صاحب کے قریبی عزیزوں میں تھے ذہین اور فطین نوجوان، نہایت سادہ خاطر مگر جذباتی، انتھک قسم کے محنتی اور تنک مزاج ہونے کے باوجود یارباش، مطب کے وقت مشین کی طرح کام کرنے والے اور ماہر کار، طبیعت میں شوخی اور شرارت، مگر اپنوں تک محدود، جو شرفاء کا شعار ہے۔

اسحاق شور کے مکان سے دو قدم حکیم کبیرالدین صاحب کا مکان تھا جو بڑے طبیب اور علمِ طب کے اساتذہ میں مانے ہوئے اُستاد ہیں۔ وہ اُن دنوں مصطفےٰ علی اختر بریلوی سے فنِ بنوٹ سیکھ رہے تھے اور اسحاق شور ان سے طب پڑھ رہے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد میں بھی ان کا ہم سبق ہو گیا کیونکہ اختر صاحب کی عدم موجودگی میں اکثر شور ہی اُنھیں مشقِ فن کراتے تھے رفتہ رفتہ یہ ذوقِ سپہ گری ایسا بڑھا کہ

---

۵ سنا ہے کہ حکیم رضوان احمد صاحب کراچی میں وفات پا گئے ہیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اخضر صاحب نے بیسیوں پچاسیوں شاگرد کر ڈالے اور سکھانے کے لئے اسحاق شور کو نیابت میں لے لیا۔ اُس میں مصروفیت اس قدر بڑھی کہ طلب کے سبق کے لئے بھی وقت نہ رہا۔ آئے دن مظاہرے کی تیاریاں ہوتی رہتیں۔ یہ سلسلہ برسوں چلتا رہا ذوقِ ادب جہاں تھا وہیں میرا منتظر رہا۔ اُس دور کی آوازیں آج تک میری رُوح میں گونجتی رہتی ہیں لیکن زندگی کی مہلک مصروفیات کی گرفت سر کنے نہیں دیتی۔

دہلی سے میں بھوپال کے مشاعرے کے لئے روانہ ہوا۔ اسٹیشن سے بعض شعراء نے تیسرے درجے کا ٹکٹ لیا اور بعض نے انٹر کا۔ مَیں ریل کے سفر میں جہاں تک بس چلتا ہے کھڑکی کے قریب بیٹھتا ہوں۔ چنانچہ مَیں نے اپنی جگہ سنبھال لی، اور گاڑی بھوپال کی طرف روانہ ہوگئی۔ جس ڈبے میں شعراء کا یہ قافلہ سوار ہوا تھا اس میں شاعر زیادہ اور غیر شاعر کم تھے چنانچہ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دیتی تھی کوئی اپنے اشعار سُنا رہا تھا کوئی دُوسروں کے، کوئی اپنی حمد و ثنا میں مصروف تھا کوئی شاگردوں کے اوصاف میں رطب اللسان، کسی کے ہونٹوں پر کسی مشاعرے کی رُوداد تھی، کوئی تیوری پہ بل ڈالے شرماشرمائی سُننے پر مجبور تھا، کوئی سگریٹ کے دھوئیں کے چکر بنا رہا تھا اور کوئی گلوری سے مُنہ پھلائے ساتھ والے سے گھور گھور کر باتیں کر رہا تھا۔ گاڑی کے جو چند غیر شاعر مسافر اس ہنگامہ میں پھنسے بیٹھے تھے وہ حق حیران دیکھ رہے تھے، گاڑی بڑے اسٹیشنوں پر مقام کرتی چلی جا رہی تھی۔ مَیں ایسی جگہ بیٹھا تھا کہ میرا مُنہ انجن کی طرف تھا۔ سامنے کے مناظر کھیت جنگل ندی نالے اور راستے کی مخلوق مجھ میں سمائی جا رہی تھی۔ ایسا محسُوس ہو رہا تھا جیسے میں آنکھوں سے اس کائنات کو پی رہا ہوں اور ذرّہ ذرّہ سینے میں محفوظ ہو رہا ہے بھوپال سے ایک اسٹیشن پہلے میرے سوا سب شعراء نے ٹکٹوں کو درمیانہ درجہ کا کرالیا مجھ سے بھی کہا گیا لیکن میں نے خود کو اس ریاکاری پر مجبور نہ پایا چنانچہ بھوپال کے اسٹیشن پر سب لوگ درمیانہ

دریچے سے برآمد ہوئے اور میرے میزبان راجہ اودھ نرائن صاحب دوسرے شعراء سے پوچھتے پوچھتے مجھ تک پہنچے اور دیکھتے ہی سوال کیا "کیوں بھائی آپ تھرڈ میں کیوں آئے؟ بڑی تکلیف ہوئی ہوگی"۔ میں نے جواباً کہا۔

"مال گاڑی میں دس آنے من کے حساب سے آدمیوں کو نہیں بٹھاتے مجھے اس میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی"۔ راجہ اودھ نرائن شریف النفس اور با اخلاق، انسان تھے خاموش ہو گئے وہ اردو کے علاوہ فارسی سے بھی بے بہرہ نہیں تھے اس لئے ان کی گفتگو میں ایک شیرینی آ گئی تھی جو انسان کے شعور اور معیارِ علم کا پتا دیا کرتی ہے۔ وہ بڑے ہی قابلِ قدر انسان تھے!

رات کو کامیابی کے ساتھ مشاعرے کا اختتام ہوا اور معیاری سامعین نے شعراء کو حسبِ مراتب داد و تحسین سے نوازا، مجھے وہ پہاڑوں کی آغوش میں جنگلات سے آراستہ شہر اس قدر پسند آیا کہ میں نے تین روز قیام کیا۔

دوسرے دن شام کو ایک [1] خاص نشست ہوئی اور مجھے اس شرط پر وہاں بلایا گیا کہ میں کوئی ایسی نظم نہ پڑھوں جو اس جشنِ سالگرہ کے موقع پر دلوں کو مغموم کر دے میں نے وہاں تو اقرار کر لیا، لیکن جب یہ دیکھا کہ سننے والے سلیقے کے لوگ ہیں تو میں نے "مزدور کی موت" نظم شروع کی۔ کارکنوں نے میری طرف دیدے نکالنے شروع کئے لیکن میں نے پروا نہ کی اور پڑھتا چلا گیا۔ اب میں جس قدر منظرکشی کی طرف جا رہا تھا اُسی قدر مجمع پر تاثیر کی شدت نظر آتی جا رہی تھی۔

آخر ایک وزیر قسم کے آدمی نے نواب صاحب سے پوچھا کہ اجازت ہو تو نظم روک دی جائے لیکن نظم ان پر بھی اپنا کام کر چکی تھی، فرمایا "نہیں! بیٹھ جائیے"۔

اِدھر تو میں چنقوں سے سسکیوں کی آوازیں سن رہا تھا اُدھر دل پتھر کرنے اور آنسو روکنے کے باوجود لوگوں کے چہروں پر نظم کے تاثرات نمایاں تھے اگرچہ

---

[1] بھوپال کے شعراء میں حامد سعید خاں، جنابِ باسط، جناب احسن، جناب اختر، منظر سعید، مولانا مہما، جناب شاکی

داد و تحسین کے لئے اِن کی زبانیں رُسل گئی تھیں لیکن اُن کی آنکھیں گھی کے چراغوں کی طرح دل کے گداز کا پتا دے رہی تھیں۔

مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ کارکنانِ مشاعرہ مجھے آئندہ سال مشاعرے کی دعوت نہیں دیں گے لیکن میں خوش تھا کہ مَیں نے شاہی محلات میں مزدوروں کے دِل کی ہُوک داخل کر دی اور کھرے کھوٹے دلوں کا پتا لگ گیا۔

نظم تمام ہوتے ہی نواب صاحب نے ایک شخص سے فرمایا کہ احسانؔ دانش کو آئندہ ضرور بُلایا جائے اور مہمانانِ خصُوصی میں ان کا نام درج کر لیا جائے۔ دُوسرے روز علی الصّبح شعراء کے لئے بُلاوا آیا اور لوگ قصیدے لے لے کر پہنچے ہر قصیدے پر پانچ صد روپے اور خلعت عطا ہُوا۔ میرے میزبان راجہ اودھ نرائن میرے متعلق لوگوں سے سُن چکے تھے اور کچھ بالمشافہ میرا اندازہ لگا چکے تھے اُنھوں نے دبی زبان سے اتنا کہا کہ اگر آپ بھی قصیدے کے دوچار اشعار لکھ لیتے تو انعام اور خلعت مِل جاتا آخر سب لوگ جا ہی رہے ہیں نا؟ مَیں نے جواباً کہا آپ کی ہمدردی کا شکریہ! لیکن مَیں اپنی شاعری میں روپے پیسے یا خلعت کے لئے دروغ بافی کرنے کو تیّار نہیں ہُوں۔ نہ پانچ سو روپے میرے پاس رہ سکیں گے نہ خلعت لیکن قصیدہ میرے تخلیقی لٹریچر میں آجائے گا جو ایک بدعت کی طرح ہو گا۔"

"آپ کے خیال میں کیا نواب صاحب اس کے مستحق نہیں؟" اودھ نرائن صاحب نے پُوچھا۔

"ضرور ہیں! لیکن اگر ایک قصیدہ کم بھی ہو تو کیا فرق پڑتا ہے؟ مَیں اُن سے اس قدر نزدیک نہیں کہ سیر حاصل تبصرہ کر سکوں الفاظ کی قطاریں لگانے اور زبان و قلم کو دروغ بافی کے جُرم میں مبتلا کرنے سے کیا حاصل؟ مزید براں قصیدہ تو ایک جھوٹی خوشامد ہے مجھے نزدیکی کا موقع مِلا تو نظم کہوں گا جو قصیدے سے بالا چیز ہے

مجھے یہ جو آمد و رفت کا کرایہ دیا گیا ہے یہی کافی ہے اللہ برکت دینے والا ہے"
مَیں نے اطمینان سے کہا۔

اودھ نرائن صاحب خاموش ہو گئے اور دبے لفظوں میں کہنے لگے ،
عجیب و غریب انسان ہو بھائی! لوگ تو ایسے موقعوں کی تلاش میں نہ جانے کیا کیا تکڑم رنگانے پھرتے ہیں۔ اتنے میں جگن ناتھ آزاد آگئے اور ہم دونوں اُن کی طرف متوجہ ہو گئے۔

حضرت شاہ فتح اللہؒ کا مزار

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہر طرف کمیونزم کا شور برپا تھا اور بڑے بڑے مشاعروں میں خُدا اور مذہب کے خلاف تصورات اشعار میں آنے لگے تھے، مَیں نے بھی اس ازم کو پڑھا اور دن رات پڑھا لیکن مجھے اس میں میری اُس تشنگی کے لئے سیرابی کا کوئی سرچشمہ دستیاب نہ ہوا جو مجھے بے تاب کئے ہوئے تھی، مَیں نے اس سے رُوگردانی تو کرلی لیکن نیک اور سیدھے سادے لوگوں پر اعتراض کرنے کی جرأت آگئی، اور اس جرأت میں کہیں کہیں گستاخی کے آثار بھی اُبھرنے لگے، لیکن جب کوئی گستاخی یا بے راہی سرزد ہوتی تو تنہائی میں بڑا پشیمان ہُوا کرتا، کیونکہ میری سرشت میں بنیادی طور پر مذہب اور خُدا سے بغاوت نہیں تھی۔ اور جو تھوڑی بہت بیباکی آگئی تھی وہ میرے یک رُخے مطالعہ کا نتیجہ تھی، جسے میں خود بھی سمجھتا تھا۔

بھوپال میں اسی قیام کے دوران ایک دن جی چاہا کہ سانچی میں مہاتما بُدھ[۵] کے اسٹوپے دیکھے جائیں۔ مَیں نے سعید رزمی سے کہا، اُس نے خوشی خوشی اس تفریح کو قبول کر لیا چنانچہ ڈرائیور کو گاڑی کے لئے کہدیا گیا اور ہم چار آدمی سعید رزمی، شعری بھوپالی، ناظم بھوپالی اور راقم الحروف سوار ہو کر سانچی کی طرف چل دیئے۔ ہم

۵ مجھے حضرت عیسٰی اور مہاتما بدھ سے فطرتاً ایک اُنس ہے اور ان کی تعلیمات کو اسلامی تعلیمات خیال کرتا ہوں۔

لوگ مختلف قسم کی گفتگو میں مصروف جارہے تھے کہ سامنے ہی بہت دور ایک سفید معمولی قسم کی عمارت دکھائی دی، مَیں نے شعریؔ سے پوچھا، یہ کیا عمارت ہے میاں!۔ شعریؔ نے کہا یہ حضرت شاہ فتح اللہ صاحبؒ کا مزار ہے جو حضرت معین الدین چشتی اجمیریؒ کے خلفاء میں سے ہیں اور نہایت اچھے صاحب کرامت بزرگ ہیں۔ مَیں نے دل میں کہا انھیں اس بزرگی کا جواب دوں کہ جنگلوں میں بھی یہ بت پرستی کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے، لیکن پھر ایک خیال آیا کہ یہ لوگ اسلامی ریاست کے باشندے ہیں ایسا نہ ہو کہ بگڑ جائیں اور بے بات اس حسین فرصت اور تفریح میں تلخی آجائے، مَیں خاموش ہو گیا اور اِدھر اُدھر کے سرسبز جنگل کے افسونی مناظر پر نگاہیں دوڑاتا رہا۔

جب ہم شاہ فتح اللہ صاحب کے مزار کے سامنے پہنچے تو یکدم موٹر نے جواب دے دیا اور ہم سب لوگ نیچے اُتر گئے۔ ڈرائیور تو موٹر کی درستی میں لگ گیا اور شعریؔ بھوپالی نے کہا، آؤ جب تک موٹر درست ہو ہم فاتحہ پڑھ لیں چنانچہ ہم احاطے میں گئے اور وضو کر کے مزار والی عمارت کی طرف چل دیئے۔

وہ تو باہر کے دروازے پر ہی کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھنے لگے اور مَیں نے اندر جا کے قبر کی دائیں طرف بیٹھ کے فاتحہ شروع کر دیا۔ تھوڑی سی دیر میں وہ سب تو موٹر کے قریب چلے گئے اور مَیں اکیلا فاتحہ پڑھتا رہ گیا۔ پڑھتے پڑھتے خوشبو کی لپٹوں نے مجھے اُس ہار کی طرف متوجہ کر لیا جو مزار کے سینے پر پڑا ہوا تھا اور اس کے بیچ کی دو لڑیاں پائینتیانے کی طرف لٹکی ہوئی تھیں، مَیں نے سوچا کہ تازہ پھول ہیں مزار پہ کیا کام آرہے ہیں؟ کیوں نہ یہ ہار اُٹھا کے ساتھ لے چلوں؟

چنانچہ فاتحہ سے فارغ ہو کر مَیں مزار کے جنوب کی طرف اس نیّت سے گیا کہ اس ہار کو اُٹھا کر ساتھ لے لوں مگر کھڑے کھڑے مجھے ایسا محسوس ہوا

کہ میں بے ارادے کچھ ہِل سا گیا ہُوں، اس پہ مَیں نے خیال کیا کہ مَیں دیر تک بیٹھ کر اُٹھا ہوں شاید گھمیری سی آگئی، مَیں نے پروا نہ کی اور ہار اُٹھانے کو مزار کی طرف جُھکا لیکن جب میرا ہاتھ ہار کے قریب ہُوا تو یکدم لٹکی ہُوئی دونوں لڑیاں کھڑی ہوگئیں اور اس طرح ہلنے لگیں جیسے مجھے منع کیا جا رہا ہے، مَیں نے باہر کی طرف دیکھا کہ کہیں کوئی ہَوا کا تیز جھونکا تو یہ کام نہیں کر رہا ہے لیکن ہَوا نہایت ہلکی تھی، ہَوا ہوتی تو پھُولوں سے پہلے غلاف اُڑنا چاہیئے تھا، مَیں کھڑا ہو گیا اور میرے تمام مُردہ خیالات و معتقدات زندہ ہو گئے، لڑیاں بیٹھ گئیں اور مجھ پر ایک مُقدّس خوف سا طاری ہو گیا۔ اس وقت میں صاحبِ مزار کی طرف متوجّہ ہُوا اور کہا کہ حضرت اگر مہمان کی تواضع یہی ہے تو مَیں جاتا ہوں، یہ ضرور ہے کہ مَیں آپ کی حیات کا قائل ہو گیا ہُوں۔ یہ کہہ کر میں اُن کے دروازے سے قدم نکال ہی رہا تھا کہ مُجھے چار اجنبی آدمیوں نے روکا اور کہا کہ ہم دیہاتی ہیں فاتحہ پڑھنا نہیں جانتے آپ فاتحہ پڑھ دیں تو ثواب ہو گا، مَیں نے کہا فاتحہ تو میں پڑھ دُوں گا لیکن غلاف آپ لوگ چڑھائیں۔ اُنھوں نے کہا یہ کونسی بات ہے ہم غلاف بدل دیں گے۔

چنانچہ مَیں نے اُسی طرح مزار کے دائیں طرف بیٹھ کر فاتحہ پڑھا اور جب فاتحہ سے فارغ ہو گیا تو اُن سے کہا کہ آپ لوگ یہ پُرانا غلاف اُتار دیں اور نیا چڑھا دیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک آدمی نے پہلے ہار اُٹھایا تو معلوم ہُوا کہ وہ ہار تو کاغذی پھُولوں کا ہے۔ فوراً میری سمجھ میں بات آگئی کہ مجھے منع کیا جا رہا تھا کہ یہ تو کاغذی ہار ہے پھر میں نے ہی پُرانا غلاف جھاڑ پونچھ کر اُنھیں دے دیا اور نیا غلاف چڑھایا اور طبیعت کو اس قدر سکون ہُوا کہ لُطف آگیا۔

اُنھوں نے مجھے مٹھائی میں سے تبرّک دیا اور میرے ساتھیوں کے لئے اُن کے حصّے کی مٹھائی علیحدہ دی۔ مَیں مٹھائی لئے جو اپنے ساتھیوں میں گیا تو وُہ حیران

رہ گئے کہ جب سے ہم یہاں آئے ہیں کوئی آدمی اندر نہیں گیا، میں نے کہا کہ ابھی تو وہ اندر ہیں دیکھ لیجیے وہ لوگ اندر آئے وہاں کوئی موجود نہیں تھا چاروں طرف ایک ایک میل تک نظر دوڑائی مگر کوئی انسان نظر نہ آیا، اُنھوں نے کہا کہ جناب وہ لوگ بھی بزرگانِ دین سے ہی تھے، ایسے ایسے حیران کن اور ماورائی واقعات یہاں کئی لوگوں کو پیش آئے ہیں۔ اور یہ بزرگ بڑے صاحبِ فیض ہیں۔

وہاں سے نکلے تو موٹر بھی درست ہو گئی معلوم ہوا کہ پٹرول کی نالی بند ہو گئی تھی، پھر ہم سب سانچی پہنچے، سارے اسٹوپے وغیرہ دیکھے اور وہاں کے رجسٹر میں بھی کچھ لکھا اور ہنستے بولتے واپس آ گئے۔ لیکن روحانیت کے بارے میں میری تشکیک ایسی صاف ہوئی کہ حضرت شاہ فتح اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ آج تک میرے روز کے فاتحہ میں شریک ہیں۔ میرے سامنے جو اشکال تھے بفضلہٖ تعالیٰ اب نہیں، زندگی بھر روحانیت سے انکار میرے بس سے باہر کی بات ہو گئی۔

یُوں تو میں فکر و عمل میں کبھی بے پروا نہیں رہا لیکن اس واقعے سے تو اور بھی آنکھیں کُھل گئیں اور دل سے پردے اُٹھ گئے یہ میں پہلے بھی جانتا تھا کہ تاثّر اور جذبہ دونوں معقولیّت کے فقدان کی علامتیں ہیں جو رائے جتنی جذباتی جوشیلی یا تقلیدی ہو گی، وہ اسی قدر معقولیّت سے دُور ہو گی کیونکہ وہ تقابلی مطالعے کے عبور سے محروم ہوتی ہے اور ایک رُخے فکر سے مرعوب ہو کر جو آرا یا مباحث پُرجوش طریقے پر تسلیم کر لی جاتی ہیں اُن کے پیچھے کوئی قوی دلیل نہیں ہوتی، صرف ایک وقتی شکست ہوتی ہے۔

جذباتی اور جوشیلی آرا و تقاریر جو عموماً مذہب کے مخالف محاذوں سے آتی ہیں یا وہاں کی افواہوں سے مشتق ہوتی ہیں کوئی معتبر اساس نہیں رکھتیں، لہٰذا جب تک کسی بات یا قضیے کو بجا طور پہ ماننے یا تسلیم کرنے کی کوئی خاص اور مضبوط وجہ نہ ہو اس کا یقین کر لینا سراسر غلطی ہے۔

ہنگامۂ راہ

آزادیٔ ہند کے فوراً بعد ہی ادب کے چاروں طرف دھند لکا چھا گیا تھا اگرچہ تحریکِ آزادیٔ ہند و مسلم اتحاد اور ملک کی چالیس کروڑ آبادی کی روحوں کا مطالبہ تھی جس کا ناکام ہونا ممکن ہی نہیں تھا، چنانچہ اُس دَور کے اخبارات، رسالے اور کتابیں مخلوق کے دلوں کی ہُوک اور رُوحوں کی چیخوں سے بھری پڑی ہیں۔ میری ہی[1] اور میرے ہمعصروں کی اکثر کتابوں میں یہ جذبہ بدرجۂ تم پایا جاتا ہے میں کانگرس کی تشکیل اور اس کی جدوجہد میں انگریزوں کی پالیسی کی کرامات تو محسوس کرتا تھا لیکن جب مسلمانوں نے بھی ہندوؤں کی آواز میں آواز ملادی اور کفر و اسلام کی حدِ فاصل کو نظر انداز کر دیا تو میں بھی ان کا ہم نوا ہوگیا اگرچہ عملی نظام سے میں کوسوں دُور رہا۔ اور اتنی فرصت بھی کہاں تھی مگر مسلمانوں کی سادہ خاطری اور چالاک ہندوؤں کی انسان دشمنی دونوں نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں، ملک کے ہندو اور مسلمان ادبا و شعراء نے اپنی اپنی بساط کے مطابق بے شمار لٹریچر تخلیق کیا۔ لیکن چونکہ کانگرس اور دوسری تحریکات کا جزئیاتی لٹریچر اُس وقت تک میرے ذخیرۂ معلومات سے باہر تھا۔ اس لئے میں نے مزدوروں، کسانوں، بیواؤں، یتیموں اور دیگر پس ماندہ طبقوں کی ترجمانی کو اپنی شاعری کا موضوع قرار دے رکھا تھا، کیونکہ اس ملک میں اُس وقت تک کوئی ادیب یا کوئی شاعر ایسا نہیں تھا جو عملی طور پر مزدوری، چوکیداری، باغبانی، کاشتکاری، حمّالی اور چپراسی کے راستے سے گزر کر آیا ہو اور مشقّت کی بھٹیوں کے شعلوں نے اس کی زبان کو جراءتِ بیان دی ہو۔ جو لوگ موجود تھے وہ صوفوں پہ بیٹھ کر کبھی کبھی پسماندہ طبقے کا ذکر فیشن کے طور پہ کر لیتے تھے ورنہ کچھ نہیں، کسی کی زبان نے فاقوں کا ذائقہ اور مصائب کا قوام نہیں چکھا تھا اس لئے پس ماندہ طبقے کی مشکلات سے بے خبر تھے۔

لیکن میری شاعری تو تجربے اور مشاہدے کی چھتری لے کر چل رہی تھی جسے

---

[1] میری اور میرے ہم عصروں کی تمام کتابیں میں مزدور، کسان اور پس ماندہ طبقے کے حالات و واقعات بھرے پڑے ہیں۔

کہیں کہیں میرا محدود علم سہارا دے دیتا تھا یہی سبب تھا کہ میری اس محنت کوشی اور مظلوم مخلوق کی ترجمانی کو کانگریسی خیال کے لوگ اپنے کام کی بات خیال کرتے تھے، اور انقلاب پسند اپنی ترجمانی سمجھتے تھے حالانکہ میں ان دونوں سے الگ تھلگ تھا۔ میرے خیالات کا ہتھکنڈہ مجھے کہاں قدم اُٹھانے دیتا تھا میں تو اسے اَنگھائے لوگوں کا مشغلہ خیال کرتا تھا جس کا سبب یہ تھا کہ ان پر سوشلزم کے سورج کی ٹیڑھی چھوٹ پڑ رہی تھی اور یہ لوگ ہوٹلوں اور شراب خانوں میں بیٹھ کر ان لوگوں کے مسائل پر گفتگو کرتے تھے جن سے ان کا دُور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنا کام جاری رہے۔ میں اپنے اس مشغلے کو اب تک عبادت خیال کرتا کر رہا ہوں وُہ اس لئے کہ رسول کریم صلعم نے سرمایہ داروں اور غرباء و مساکین کے لئے جو کُچھ شرائطِ حیات عائد کئے تھے وُہی اسلام کہلاتے سرمایہ داروں کو قتل و غارت اور ڈاکہ زنی کے علاوہ دیگر تخریبی عناصر سے محفوظ کرنے کے لئے خیرات، زکوٰۃ وغیرہ کو ضروری قرار دیا۔ اور غریبوں کو افلاس میں چوری قتل اور ڈاکہ وغیرہ سے روکنے کو اُن کی ضروریات کے لئے بیت المال کا قیام ضروری سمجھا اور دونوں طبقے مدت تک اپنے اپنے اصولوں پر کاربند رہ کر امن و امان سے گزارتے رہے لیکن آہستہ آہستہ سرمایہ دار طبقہ اسلامی اصولوں سے ہٹ گیا جس سے غریبوں اور پسماندہ طبقے میں مشکلات پیدا ہو گئیں لیکن یہ طبقہ اب اس قدر نیک دل اور صداقت پسند ہو چکا تھا کہ سرمایہ داروں کی بے عدلی اور ناانصافی کے باوجود اپنے ایمان کی تابانی کو برقرار رکھنا چاہتا تھا جب سرمایہ پرستوں نے اُن پر رزق کے دروازے تنگ کر دیئے اور ان کے بچّوں پر تعلیم کے امکانات ختم کرنے کے لئے راہ میں کانٹے دار تار لگا دیئے تو یہ لوگ بھی رفتہ رفتہ اپنے اوچھے حربوں پر اُتر آئے۔

میں اپنی شاعری میں ان دونوں طبقوں کی ترجمانی کو فرض خیال کرتا تھا تاکہ دونوں

ٹ اَنگھائے: پیٹ بھرے۔ چھکے ہُوئے

طبقے اپنا اپنا انجام سوچ کر راہ راست پر آجائیں اور اس ترجمانی میں جہاں انسانیت اور احکامِ خداوندی کی پابندی کی طرف اشارے تھے وہیں خونیں انقلاب کی داغ بیل کی طرف بھی توجہ دلائی جاتی تھی جو میری شاعری میں جگہ جگہ موجود ہے۔

جب ملک آزاد ہوگیا تو میرا اور میرے چند دوستوں کا خیال تھا کہ اب یہ پھُولے پھلے گا اور دُنیا میں نام روشن ہوگا کیونکہ اس آزادی کے راستے میں عوام نے بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں۔ کئی کارکنانِ آزادی کو پھانسیاں لگیں، ہندو مسلمان دونوں نے جیلیں کاٹیں، عورتوں کے جلوس لٹھیائے گئے اور کروڑوں اربوں روپے کی جائداد ضبطی میں آگئیں لیکن متشدد ہندوؤں کی نیّت کا حال اُس وقت کھُلا جب اُنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ ناانصافیاں اور مظالم کر کے مسلمانوں پر یہ ثابت کر دیا، کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور دونوں آپس میں برابر کی دشمن ہیں ہر طرف سے ایسے آثار نمایاں ہوئے کہ مسلمانوں کو اپنا سیاسی مقام پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ بعض بعض نے عوام کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کے لئے آزادیٔ خیال اور عظمتِ انسانیّت کے شگوفے چھوڑے ہوئے تھے مگر کٹر اور خود غرض ہندوؤں نے تخریبی پروگراموں اور متعصبانہ بدعملیوں کا ایسا طوفان اُٹھایا کہ مسلمانوں کو اپنے اعتماد و اعتبار پر افسوس کرنا پڑا اور طوعاً و کرہاً وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اب یہاں گزارا ناممکن ہے پُورے مسلمانوں کی اس تکلیف کو بعض محبِ وطن شدّت سے محسُوس کر رہے تھے اور یہ بات صیغۂ راز میں بھی نہیں رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ہندوستان نے ۴۵ء میں جنگ سے فرصت پائی ہے اور ہندو مسلمان کے پاس بے شمار دولت ہے اب یہ دونوں بیک وقت مارکیٹ میں آئیں گے بازار کے نرخوں اور منافع اندوزی کا مقابلہ ہوگا۔ نتیجتاً جنگ سے کمایا ہوا روپیہ رفتہ رفتہ ہندوؤں کی تجوریوں میں پہنچ جائے گا صرف تاجروں نے اس تقابلی خسارے سے بچنے کا ایک یہ ذریعہ سوچا ہے کہ

دس کروڑ مسلمانوں کا مارکیٹ علیحدہ بنا لیا جائے تاکہ مسلمانوں کا روپیہ مسلمانوں کے قبضے سے باہر نہ جائے۔ مگر مجھے یہ اُمید نہیں تھی کہ یہاں کے تاجر اس مُلک کو چلا سکیں گے اس لئے میں خاموش تھا، ہر چند کہ اب ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ بیک وقت سب کے دل و دماغ جاگ اُٹھے ہیں اور سب اپنے اپنے دیدبان سے خسارے کا اندازہ لگا رہے ہیں اور سب کی تان یہیں آ کر ٹوٹتی ہے کہ جس طرح ممکن ہو اپنی منڈی علیحدہ کر لی جائے۔ مگر چونکہ مجھے سیاسی اور تاریخی حالات سے کما حقہ، آگاہی نہیں تھی اس لئے میں خاموش اس جوار بھاٹا کو دیکھ دیکھ کر فکر مند ہو رہا تھا۔ اگرچہ میں بہت جلد اپنے اس نظریئے سے دست بردار ہو گیا اور یہ انکشاف ہو گیا کہ تاجرانہ نہیں اس کو سیاسی رُخ سے سوچا جا رہا ہے اور وہ بڑا سنگین رُخ ہے۔ خُدا خیر کرے۔

مگر ملکی ماحول میں اس قدر کشمکش تھی کہ ہر طرف ایک شعوری ہنگامہ تھا اور توقع کے خلاف آزادی کے سہارے ملک میں سکون و اطمینان کی جگہ داخلی تضادات نے لے لی تھی کہیں ذاتی اغراض نعرہ بر لب تھے اور کہیں جنسی خواہشات کی اُڑائی ہوئی دھول نے نگاہوں کے راستے مسدُود کر دیئے تھے۔

اس عالم میں ظاہر ہے کہ ادب کا کوئی رُخ کیسے متعیّن ہو سکتا تھا۔

ٹریفک کا ہفتہ

میں اپنی کتاب "خضر عروض" میں اضافوں کے خیال سے علی الصبح لارنس گارڈن جایا کرتا تھا ایک دن دس گیارہ بجے واپسی ہو رہی تھی مال روڈ پر جہاں سے مجھے سڑک عبور کرنا تھی کچھ پولیس کے سپاہی سڑک کے دونوں طرف آمنے سامنے کھڑے تھے میں نے دائیں بائیں خالی دیکھ کر سڑک عبور کی جُونہی سڑک کے اُس پار پہنچا دو سپاہیوں نے مجھے پکڑ لیا اور کہا نام لکھاؤ۔

میں :- کیوں؟ کیا بات ہے؟

وہ :- تم نے خلاف قانون سڑک عبور کی ہے۔

مَیں :- یہ چوراہہ نہیں ہے اور دونوں طرف سڑک خالی ہے کوئی ٹریفک نہیں اور نہ یہاں کسی کانسٹیبل کی ڈیوٹی ہے۔

وُہ :- آج ٹریفک کے ہفتے کا آخری دن ہے ذرا تھانے چلو وہاں سے چھوڑ دیئے جاؤگے زیادہ سے زیادہ ایک دو روپیہ جرمانہ ہو جائے گا۔

اوّل تو شریف آدمی کو کون جرمانہ کرتا ہے ؛ یہ تو ہمیں تنگ کیا جا رہا ہے کہ دو پہر تک دو سو چالان دو خواہ کسی طرح دو۔

مَیں خاموش رہا وہ مجھے چیئرنگ کراس تھانے میں لے گئے وہاں قریب قریب ڈیڑھ سو پونے دو سو آدمی کھڑے تھے جن میں جوان بھی تھے اور ضعیف بھی اور اسکول کے بچے بھی، ہر چہرے پہ پریشانی اور حیرت کے ملے جُلے آثار نمایاں تھے اور سب میری ہی طرح کے بے خطا مجرم !

اسکول کے بچے پیاس سے بیتاب بوڑھے سر پکڑے دیوار کے سہارے تفکّرات میں گُم تھے ابھی مجسٹریٹ صاحب تشریف نہیں لائے تھے اور مجرمانِ معصوم بڑی شدّت سے انتظار کر رہے تھے اتنے میں ایک کمرے سے دو پولیس افسر اور ایک مجسٹریٹ صاحب برآمد ہوئے اور مجمع پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر فرمایا۔

" ان سے دس دس روپے لے لو اور چھوڑ دو !

یہ کہہ کر وُہ تو باہر نکل گئے اور تھانے کے محرّر نے وصولی شروع کر دی۔ اس کے پاس ایک اور شخص بھی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا غالباً وُہ اُس محرّر سے بڑا افسر تھا۔

مَیں اس فکر میں تھا کہ اس بلائے ناگہانی کا جرمانہ کہاں سے دُوں گا، میری جیب میں تو ایک جھنجی کوڑی بھی نہیں؛ اتنے میں میرا ایک شناسا اندر سے جرمانہ بھر کے نکلا اور مجھ سے پوچھنے لگا، احسان صاحب دس روپے موجود ہیں یا میں دُوں ؟ مَیں نے کہا میرا جرمانہ آپ ادا کر دیں اور رسید لا دیں مَیں گھر چل کر ادا کر دُوں گا۔ اُس نے

اپنی ہتھیلی پر ایک سرخ روشنائی کا نشان دکھاتے ہوئے کہا "میاں کیسی رسید؟ یہاں تو روپے لے کر ہتھیلی پر یہ نشان بنا دیتے ہیں۔ اس نشان کو دیکھ کر سپاہی آپ کو باہر جانے دے گا اور آپ آزاد ہو جائیں گے۔ پھر درویش پر جان درویش میں نے دس روپے ادا کئے اور ہتھیلی پر محرر سے ایک اوٹ پٹانگ قسم کا نشان لگوالیا۔ وصول کرنے والا افسر میرا نام سن کر مسکرایا اور پوچھا تم شاعر ہو نا؟

میں نے نظر جھکا کر اثبات میں جواب دیا۔ اس نے پھر کہا۔ مزدوروں اور کسانوں کے متعلق نظمیں لکھا کرتے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں! وہ میں ہی ہوں۔ وہ سر کو ایک جھٹکا دے کر خاموش ہو گیا اور میں تھانے سے باہر نکل آیا، مبادا کوئی اور سنگین جرم مجھ پر تھوپ دیا جائے۔

ہم دونوں گھر تک ساتھ آئے اور گھر پہنچ کر میں نے فوراً اپنے مہربان کو دس روپے دیئے۔ پھر کتب خانہ میں بیٹھ کر دیر تک حکومت کے ارکان اور نظم و ضبط پر گفتگو کر کے کڑھتے رہے جیسے شریف باپ کے بچے بدچلن ہو جائیں۔ اور گھر بھر کا مستقبل تاریک نظر آنے لگے۔

اَدبی دِیدبان

انتشار کی نظام کا شور و غوغا تو بہت تھا مگر اس کا نصب العین ملک کے باشندوں کی آرزو اور خواہش کی پیداوار نہیں تھا اس لئے وہ اس برصغیر کے طول و عرض کے مذہبی ہنگاموں پر مضبوط گرفت نہیں کر سکتا تھا اس کے باوجود لوگوں کے ذہن اس سے متاثر ضرور تھے ان متاثرین میں کچھ لوگ ایسے تھے جو اس تحریک کو خلوص دل سے ملک کے معاشی بحران کا حل خیال کرتے تھے اور اس کی نشر و اشاعت

کے لئے کوشاں تھے دُوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جنھوں نے فیشن کے طور پر اُن کی آواز میں آواز ملا رکھی تھی۔ تمام مذہبی ادارے اسے مغربی طاقتوں کی مشرق دشمنی خیال کر رہے تھے لیکن وہ اپنے طور پر ملک میں معاشی بحران کا حل ضرور چاہتے تھے جو پہلی جنگِ عظیم سے لے کر دوسری جنگ عظیم تک دُنیا کے کونے کونے میں سکون و اطمینان کو تہ و بالا کر رہا تھا۔ یہی سبب تھا کہ لوگوں کے دلوں میں اس دَور کے محبِ وطن اور انسان دوست اہلِ قلم کی قدر و منزلت تھی اور یہی وجہ تھی کہ اس اشتراکی نظام کی تحریروں کی پسندیدگی اُس دَور کی سیاسی اور معاشی ضروریات کا تقاضا بھی کہی جاتی تھی ورنہ اشتراکیت اِس مذہبی فضا میں یہاں کا فطری جذبہ کہاں بن سکتی تھی مگر چونکہ اس کا بغلی دریچہ انسان دوستی اور مشرق کی ہمدردی کی طرف بھی کھُلتا تھا اس لئے خواہ کسی دریچے میں سہی کچھ نہ کچھ مقبولیت ضرور ہو رہی تھی یہ بھی ممکن تھا کہ یہاں اشتراکیت اب تک بامِ عروج پر ہوتی لیکن ایک طرف تو بعض اشتراکیوں کے کردار اور زبان و بیان میں تعصب[1] کے گہرے غار دیکھ کر لوگ بدگمان ہو گئے، دُوسری طرف مسلمانوں کا ماحول بگڑتا دیکھ کر بیشتر اہلِ غیرت، حسّاس اور باشعور علماء نے تبلیغ کا کام شروع کر دیا اور ان کی دن رات کی کوشش سے قصبات اور شہر کا کم لکھا پڑھا طبقہ تو اس وبا سے محفوظ ہو گیا، لیکن انگریزی لکھے پڑھے لوگوں کے سینوں میں اس کی جڑیں خشک نہیں ہو سکیں اور وُہ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس کی تہ میں کون سی حکمت عملی کام کر رہی ہے اور اس اصلاح کے پردے میں کون سے ہتھیار ڈھل رہے ہیں آگے بڑھتے رہے۔ بعض لوگ تو اس ناندیشی میں اپنے وطنی اور ثقافتی رشتوں کو شکست کر کے آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر رہ گئے جن میں کچھ تو اُونچے طبقے کے فیشن پسند تھے اور کچھ درمیانہ درجے کے کم علم لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وُہ حُبّ انسانی سے منسلک ضرور تھے، لوگ شہری

---

[1] میرے خیال سے صحیح اشتراکی متعصب نہیں ہوتا اور یہاں ہر اشتراکی متعصب ہے۔

آبادی میں ہوٹلوں کے آنے والوں اور بے روزگار قسم کے نوجوانوں کو تو اس تحریک سے متاثر کرتے رہتے تھے لیکن شہر سے باہر کی فضا کو نہیں چھو سکتے تھے اس لیئے اشتراکیت کا چھاپہ دیہات کے در و بام پر مہریں نہ لگا سکا۔ جو کامیابی کی پہلی شرط ہے۔

احیائے شریعت اور قومی بہبود کے لوگ گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ پھر کر اپنے فرائض انجام دیتے رہے جس میں تبلیغی جماعت کا کام خصوصاً قابلِ تحسین ہے، دیوبند اعظم گڑھ، ندوہ اور سرائے میر کے اراکین سے قطع نظر اہل تصوف کے خانقاہی[۵] درویشوں نے بھی اسلام کو باقی رکھنے اور سیدھے سادے لوگوں کو خدا دشمنی سے بچانے کی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں اور ان سے زیادہ دینی درسگاہوں کا کام ہے جو ایک طرف تو مسلمانوں کے دین و ایمان اور عقائد و اعمال کی اصلاح و تحفظ میں منہمک رہے اور دوسری طرف خانقاہوں اور مساجد کے لئے علما و صوفیاء کا ایک گروہ تیار کر کے روحانی زمین سیراب کرتے رہے بعد میں اس روحانی اور مادیاتی سرد جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں با اثر جماعتیں بہت کم رہ گئیں ان میں کچھ لوگ تو ایسے تھے جن کے اعمال و عقائد میں برطانویت یا اشتراکیت کا ضامن لگا ہوا تھا اور بعض مغربی مفادات کے پروردہ تھے، اور کچھ پھرکی کی طرح ہوا کے رُخ پہ گھوم جانے والی عادات و خصائل کے مالک۔ کانگریسی خیال سے وہ گروہ متنفر تھا جو یہ جانتا تھا کہ اس کا بانی ایک انگریز تھا، اور مسلم لیگ سے عرصے تک وہ لوگ دامن کش رہے جن کا یہ خیال تھا کہ اس جماعت میں ایسے لوگ بھی شامل ہیں جن کے آباؤ اجداد کو ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے قومی غداری اور وطن دشمنی کے صلے میں جاگیریں دی تھیں لیکن اس سوجھ بوجھ کے لوگوں کی تعداد زیادہ نہ تھی، اس لئے یہ دونوں جماعتیں اپنی اپنی رفتار سے اپنے مقاصد کی طرف بڑھتی رہیں کہیں کہیں ان کی

---

۵ خانقاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، خانقاہ حضرت علاؤ الدین صابر کلیریؒ، خانقاہ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ، خانقاہ حضرت مہر علی شاہؒ، خانقاہ سیال شریف، خانقاہ حضرت سید عبداللہ شاہ قادریؒ وغیرہ

رفتار میں فرق ضرور آگیا لیکن ان کے سامنے غلط یا صحیح مقصد ضرور تھا۔

آئینۂ انحطاط

چونکہ کانگریس کا پردہ انگریزوں کی نزدیکی اور اسلام دشمنی نے چاک کر دیا تھا اس لئے کانگریسی خیال کے لوگوں کی آواز دب گئی تھی اور لوگوں کے خیال میں کانگریس کا وہ نعرہ کہ "انگریزوں کو نکال دو" بالکل فریب معلوم ہو رہا تھا، اُس وقت میری نظر میں وطن پرستوں کی پھانسیاں، اُن کی بیواؤں اور یتیموں کے چہرے، قید خانوں کی ایذا رسانیاں، اور جلسوں جلوسوں کے مختلف اقسام کے مشکلات اور لہو میں تیرنے والے نوجوانوں کی قربانیاں بے مصرف نظر آرہی تھیں۔ دراصل میں سیاست کو بھی اُمرا کا فریب خیال کر رہا تھا۔

مسلم لیگ کی زمام کار حریت پسند اور محب وطن افراد کے ہاتھ میں آجانے کی وجہ سے اس میں ایسے تغیرات پیدا ہو گئے تھے جو اس کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرنے لگے تھے۔ اگرچہ بعض اوقات کہیں کہیں اس کے لباس میں جھریاں آکر اس کا بدن جھلک جاتا تھا لیکن اس کے باوجود یہ منجمد نہیں تھی اس کی حرکت میں برکت کا یقین موجود تھا۔

ایک موڑ

مسلم لیگ کانگریس کی اسلام دشمنی کے نتیجے میں قائم ہوئی تھی اس لئے اس میں افرنگ پرستی نہیں تھی، بعد میں اُس نے تمام مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی مسائل کو تخصیص کے ساتھ جزوِ مقصد بنا لیا تھا بلکہ یوں کہیں تو دُرست ہوگا کہ مسلمانوں میں اچھے اور خوش خیال لوگوں کی ایک مثالی جماعت سامنے آگئی تھی اگرچہ بعض وجوہ سے اِس میں وہ تابناکی تو نہیں تھی جو تیرہ سو برس سے مسلمانوں کے رگ و ریشہ میں ایک تقدیس اور روشنی کی صورت میں چلی آرہی تھی اور یہ تمام عالم اسلام کی خواہش تھی کہ جس طرح ممکن ہو دَورِ نبوی کی برکات کا اعادہ و احیا کیا جائے اس سے تمام دُنیا کی غیر مذہبی اور سیاسی تحریکات کا دم ٹوٹ سکتا تھا۔

اسی اثناء میں ایک دور ایسا بھی آیا کہ ہندو مسلمان دونوں تہذیبوں کے دریا ایک ہی آواز کی چھال کے ساتھ مل کر بہ رہے تھے لیکن پھر جو دیکھا تو کچھ دور جاکر دونوں کے خطِ سفر جدا جدا تھے حضرت قائدِ اعظمؒ پر اوّل دن سے یہ آشکار ہو گیا تھا کہ یہاں متحدہ قومیت کا خواب تعبیر نہیں دے سکتا، اور اگر اس مفاہمت کی مزید کوشش کی گئی تو آپس کے منافقات وقت سے پہلے اور بڑھ جائیں گے۔ ہندو جسے اشتراک وطن کا نام دے رہا ہے یہ جذبہ کبھی اشتراک ایمان کا لقب نہیں پاسکتا۔ ہندو مسلمان دونوں مستقل الگ الگ قومیں ہیں اور ملّی وحدت ان کی تقدیر ہرگز نہیں بن سکتی۔

حیرت ہے کہ ہندو سماج ذات پات کے عارضی سہارے پر بسر کرنے کے باوصف اب تک اسلام کی افادیت، انسانیت، آفاقیت، اور مخلوق سے ہمدردی کو نہیں سمجھ سکا تھا ایسی صورت میں مسلمانوں کو کیا پڑی تھی کہ سیدھا راستہ چھوڑ کر غلط راہ ہو جائیں؛

یہی ضمیر کی صفائی اور عدل کی قوت تھی کہ قائدِ اعظمؒ نے نظریۂ پاکستان پیش کرنے میں جھجک محسوس نہیں کی اور کسی پس و پیش کے بغیر اپنا مقصد عوام کے سینوں میں اُتار دیا، اُن کا کہنا تھا "کہ ہندو مسلم میں صرف مذہب کا فرق نہیں ہے ہندوؤں کی ہٹ دھرمی نے خود کو ہر طرح ہمارے کلچر کے خلاف منظم کر لیا اور قدم قدم پر پھاٹک لگا دیتے ہیں مگر ہمیں پروا نہیں کہ ہمیں قرآن نے جو ضابطۂ حیات دیا ہے وہ تمام انسانیت کی رہنمائی کے لئے کفایت کرتا ہے اور اس میں ہندو ہو یا مسلمان سب کا بھلا ہے۔

اس پر ہندو اس قدر بھڑکے کہ جواہر لال جی جیسے روشن خیال آدمی بھی بلند بانگ ہو کر میدان میں اُتر آئے مگر قائدِ اعظم تھے کہ اسلامی نظریات کا ایک مثالی ملک

بنانے کے لئے سوچتے ہی چلے گئے، اُنہیں یقین تھا کہ قرآن کے احکام اور اسلامی اصولوں پر کاربندی ہماری معاشی اور سیاسی زندگی کی سمتیں اور حدود متعین کردے گی اور یہی خدمت ایسی ہوگی جو انسانیت کی ہمدرد اور خدا کی اطاعت کو اپنا نصب العین قرار دے گی۔

جب گاندھی جی کو خبر ملی کہ پاکستان کا شور دبتا نظر نہیں آتا تو اُنہیں تشویش ہوئی اور اُنھوں نے فرمایا کہ ہم سب ایک خدا کے پرستار ہیں خواہ وہ کسی نام سے بھی پکارے جائیں لیکن تحریک پاکستان اس مقام پر پہنچ چکی تھی کہ انحطاط اور ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اور عزم و استحکام کی تحریک اپنے مقصد سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ مگر میری نظر میں نہ جانے کیوں یہ کامیابی مشکوک سی تھی۔

آخر ایک دن وہ آگیا کہ قائد اعظم محمدؐ علی جناح اپنے ناتواں بازوؤں سے طوفانوں کے دڑیڑوں سے نکتے بچاتے اور خونین گرداب سے لڑتے بھڑتے ساحل مُراد پر آپہنچے یعنی کروڑوں انسان ایک نصب العین پر ہم آواز ہو گئے۔ اور میں حیران رہ گیا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو پاکستان کے قیام کا اعلان ہو رہا تھا اور تصوّرات و تیقّنات کا مجسمہ قائد اعظم کی معرفت، ایک نیا ملک مثالی ثقافت اور تابندہ تصوّر کی بنیادوں پر عالمِ وجود میں آگیا۔ کسے معلوم نہیں اسلام اپنے یہاں تعصّب کو راہ نہیں دیتا وہ تو مفتوحہ قوموں کے مذہبی اقدار و شرافت کی حفاظت کرتا ہے اور دشمنوں کی دل شکنی کو بھی روا نہیں رکھتا وہ کسی کو عورتوں، بچوں اور بیماروں پر ہاتھ اُٹھانے کی اجازت نہیں دیتا؛ وہ کھیتوں کو جلانے باغوں کو اجاڑنے اور مکانوں کو مسمار کرنے سے روکتا ہے، وہ سب کو دعوتِ فکر دیتا ہے اور کسی کے اصولِ عبادات میں رخنہ اندازی

کا فائل نہیں جس کی نظیریں تاریخ میں اب تک گونگی نہیں ہوئیں۔

پاکستان کے قیام کا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا کہ آبادیوں کا تبادلہ ہو جائے بلکہ اس کے معنی تو یہ تھے کہ دو ملکوں میں اکثریت کے دو قانونِ حیات رائج ہو جائیں اور تقابلی مطالعے سے یہ معلوم ہو جائے کہ ان دونوں میں عوام کو کونسا قانون زندگی اور اس کی آسائش کا حق دیتا ہے۔

ظاہر ہے کہ جہاں اور جس میں عوام کو اس کا مقام مزدور کو اُجرت اور کسان کو محنتانہ اچھا اور معقول دیا جاتا لوگ اُسی قانون کے تابع ہو جاتے جنگ و جدل سے کشت و خون کی نوبت نہ آتی۔

پاکستان اور ہندوستان میں دونوں جگہ مختلف نسلوں اور قسم قسم کے مذاہب کے لوگ آباد ہیں اور ظاہر ہے کہ یہاں نسلوں کے ساتھ زبانیں بھی سینکڑوں کی تعداد میں بولی جاتی ہیں اس لئے یہاں مذہبی اور لسانی قدامت پر حکومت کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی، بلکہ اکثریت کا قانون اور لسانی جامعیت و مقبولیت کی رُو سے زبان کا انتخاب لازم آتا ہے اور اس طرح عوام اور حکومت کے رشتے مضبوط اور توازن دیرپا ہوسکتا ہے۔ اس تصوّر کے تحت چونکہ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے اور رابطے کی زبان جو سارے ملک میں بولی اور سمجھی جاتی ہے صرف اُردو ہے لہٰذا ماحول کُلّی طور پر قانونِ اسلامی اور زبانِ اُردو کا تقاضا کرتا ہے اُردو کو میں اس لئے بھی ترجیح دیتا ہوں کہ یہ بے تعصّب زبان ہے اور کسی بھی مقامی بولی کی مخالفت نہیں کرتی۔ بلکہ جس قدر علاقائی بولیاں ترقی کرتی جائیں گی اُسی قدر اُردو کو الفاظ کا ذخیرہ ملتا جائیگا اور پاکستانی آبادی کا انسان دوسری قوموں میں الگ پہچانا جاسکے گا۔

لیکن ہوا یہ کہ تخریب پسند اور متعصّب لوگوں نے قتل و غارت پر کمر باندھ لی، اور بگڑے ہوئے لوگوں کے منہ انسانی خون لگ گیا۔ اچھے اچھے لوگوں نے جمہوریت

اور مساوات کے علاوہ رحم و انصاف کے اصولوں سے رُوگردانی کرلی۔ غول کے غول آبادیوں، سڑکوں، چوپالوں۔ پارکوں اور ویران احاطوں میں پڑے تھے۔ سبزے کے پلاٹوں میں کلرک چادریں بچھائے بیٹھے تھے۔ لوگ اپنا معمولی معمولی سامان فروخت کرکے اسٹیشنری لارہے تھے اور افسران ٹاٹ کے ٹکڑوں پر بیٹھے دفتروں کی تعمیر و تنظیم میں منہمک تھے۔ جہاں پریشانی کا یہ عالم تھا وہیں کئی ایک چالاک، زبان دراز دروغ باف۔ خوشامدی اور گروہ بند مکانوں اور دُکانوں پر ناجائز قبضہ بھی کر رہے تھے مگر مستحق شرفانے افسروں کے دروازوں کی ذلّت برداشت نہیں کی، اور وُہ اب تک گوشہ نشینی میں عسرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں جب قیامِ پاکستان سے شعور بڑھا تو ملک اور اس کے باشندوں کے مسائلِ حیات اور بھی پیچیدہ و ہنگامہ خیز ہوگئے۔ مقامی خود غرضوں کا نعرہ تھا "پاکستان ہمارا ہے اور ہمارے لئے بنا ہے" ہندوؤں کی زمینیں باغات، فیکٹریاں، ملز اور مکانات سب ہمارے ہیں اور ہم ہی ان کے حقدار ہیں۔

جو لوگ باہر سے اپنے روزگار، ملازمتیں، مکانات، باغات، زمینیں اور قبرستان چھوڑ کر ایمان و تبلیغ کے نشے میں پاکستان چلے آئے تھے انھیں یہ زمین راستہ دینے کو تیار نہیں تھی۔ بعض چھپ چھپا کر اور بعض دیدہ دلیری سے کھُل کر یہ کہہ رہے تھے کہ یہاں آنے اور رہنے کا کسی کو کوئی حق نہیں۔ ہندو جو کچھ بھی چھوڑ کر گیا ہے وُہ سب ہمارا ہے اور صرف ہمارا، وُہ اس سے مطلق بے خبر تھے کہ اس اقلیت نے اکثریت سے کس جگرداری سے نبرد آزمائی کی ہے، ان کی نگاہوں سے وہ مقام بالکل اوجھل تھا کہ جب پاکستان کی تحریک شباب پر تھی اور مسلم لیگ کے تمام کارکنانِ تحریک جیل خانوں میں بھرے پڑے تھے۔ اس وقت یہ اقلیتیں اگر پاکستان کے نعرے اور مطالبے کو بسار دیتیں تو اس ملک کا وجود میں آنا ہی ناممکن تھا کیونکہ یہاں کے لالہ و گُل کی قلمیں تو پہلے ہی بانجھ اور بدیسی درختوں کی شاخوں سے بندھی ہوئی تھیں اور

پرورش میں بدیسی کھاد استعمال ہو رہی تھی۔

اس ہنگامۂ دار و گیر کو فرو کرنے کے لئے یہاں کے ارکان حکومت کی اکثریت نے نہایت دُور اندیشی سے کام لیا اور جہاں تک ہو سکا عوام کو مُطمئن کرنے میں کوشاں رہے یہ الگ بات ہے کہ مطلب پرستوں اور خود غرض لوگوں کے تخریبی منصوبے نہ رُکے اور ان کی للّو چلتی رہی۔

اَدبی پہلُو

ایسی صورت میں جبکہ کوئی شخص بھی اپنی جگہ مطمئن نہیں تھا ملازمتیں ناپید تھیں، تجارتی مواقع عنقا، مکانوں کی الاٹمنٹ جاں طلب، دُکانوں کی اُمّید مفقود۔ بھلا ادبی طبقہ کونسا رُخ اختیار کرتا ؟ اور کرتا بھی تو کیا وُہ لٹریچر اس قابل ہوتا جو ذہنی تضادات، اغراض کے سیلاب اور مفادات کے سرسام کو مٹا سکتا، ہرگز نہیں !۔

چنانچہ اخلاقی و معاشی خسارے اور دولت کی غلط تقسیم کے اشارے غزلوں کے اشعار میں اجمال اور نظموں میں تفصیل سے چلتے رہے اور اس میں بعض بعض شعراء اور ادباء نے جو اس ہنگامے کی رُوح سے آگاہ تھے قابلِ قدر شعر تخلیق کئے لیکن چونکہ عوام کے دماغوں میں اُلجھن اور دلوں میں غم و آلام کی آلودگی تھی اس لئے ادب کی معیاری تحریروں اور غزلوں کے معیاری اشعار بھی رواج نہ پا سکے ہاں اُن کی جگہ دولت سے بہرہ مند لوگ ہر قسم کی آزاد روی پر اُتر آئے اور درمیانہ طبقہ تاریخی

ے اس دَور کے کئی اُستادوں اور مشہور ہستیوں کے قلمی شاہکاروں کو ہنوز طباعت و تذکرہ میسّر نہیں آیا نہ تو اُنھیں کوئی مقام دیا جاتا ہے اور نہ محققین مطالعے میں اہمیت دیتے ہیں مثلاً راجہ دل محمد دل، عبداللطیف تپش۔ عبدالمالک آروی۔ سیماب اکبرآبادی، ہادی مچھلی شہری۔ آرزو لکھنوی، واثق کامل، ساحر صدیقی۔ پیرزادہ ضیا۔ گوپی ناتھ امن۔ آنند نرائن مُلّا۔ نوح ناروی۔ جگر بریلوی۔ بہار کوٹی۔ طاہر سروعنوی وغیرہ

ناولوں کا دلدادہ ہوگیا اور جنھیں کچھ نہ ملا وہ جاسوسی ناولوں اور فحشیات کے مطالعے میں مصروف ہو گئے کسی کو یہ خیال نہ رہا کہ جہاں یہ فکر و خیال کا خسارہ ہے وہاں وقت کے تقاضوں کا کس قدر عظیم نقصان ہے، اس خلا کو پاک کرنے کے لئے اب تک کوئی راستہ کھلتا نظر نہیں آتا تھا۔ ایک طرف تو ہماری جدید تہذیب کے دائروں اور قوسوں کا سیلاب اُمڈا ہوا تھا دوسری طرف اسلامی طرزِ حیات اختیار کرنے کا بھیگا ڈھول پیٹا جا رہا تھا۔ ادیبوں اور شاعروں کے دماغوں میں ایک خلجان تھا کہ کون سی روش اختیار کریں، رنگ برنگ کا دھواں تھا جو چاروں طرف پھیلا ہوا تھا اور اتنا گہرا کہ صحیح راستوں کی نشاندہی نہیں ہو سکتی تھی۔

اگر آزادی کے بعد تعمیری صلاحتیں اور شعوری توانائیاں بیمار ہو جائیں یا اُن میں بے پروائی کی وبا پھیل جائے تو پوری آبادی کی تخلیقی نوعیت پر ترقی اور بلندی کی بجائے کہولت اور ڈگرا اپنا تسلّط جما لیتی ہے اور مجاہدین و مفکّرین کے بجائے عیّاشوں اور اوباشوں کے گروہ پیدا ہونے لگتے ہیں اور انجیب قیادت کے راستوں کو کمین گاہیں بنا لیتے ہیں، جس کے نتیجے میں پھر دُھنی نیم روشن اور گندی بستیاں مقدّر ہو جاتی ہیں جن سے موت کی کھنبیاں اُگتی اور افسوس کے کھلیان دستیاب ہوتے ہیں۔

مشاعروں میں عوام کی داد و تحسین سے میرا دل تو بڑھتا مگر دھڑے بند اور متعصب شاعروں کے متعلق میں یہ سوچتا رہتا کہ آخر ان لوگوں کا دین مذہب بھی تو کچھ ہوگا، کیا ان کی تعلیم یہ انسان دشمنی ہی ہے؟ کیا انگریزوں کے فیض و کرم کا یہ رُخ بھی ہے کہ نسلِ شناعتی کی تعداد بڑھتی چلی جائے اور نجیبوں کا قحط ہوتا چلا جائے، آخر یہ علمی حمل کے شروع زمانے ہی سے اخلاق و شرافت کی توڑ پھوڑ میں کیوں مصروف ہو جاتے ہیں بعض اوقات تو میں پہروں ان کے اس مزمن مرض کے متعلّق سوچتے سوچتے تھک جاتا

لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلتا۔ مگر میری ہمت شکست نہ ہوتی میں اپنے فاقوں کی تلخی کو مٹھاس میں تبدیل کر چکا تھا اور میرے ذہن کے چراغ مجھے راستہ دکھانے لگے تھے اس کے باوجود میرا ذوق بعض وقت اونچے نیچے کھڈّوں میں بھٹک جاتا اور منزل کے آثار دُور دُور تک نظر نہ آتے۔ نظریات و تصوّرات تھے کہ وقتی تقاضوں میں افراد و افکار کے ڈھول دھپوں میں لڑکھڑا کر چل رہے تھے مگر مایوسی میرے سائے سے بھی بدکتی تھی۔

آخر مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ یہ شاعر اور ادیب محلّوں کے اکھاڑوں میں زور کرنے والے پٹھوں کی طرح ہیں، انھوں نے ابھی باہر کے دنگل نہیں دیکھے۔ محدود ماحول میں ایک عمر کی داد و تحسین کے باوصف ان کی شہرت کی جھولیاں اوچھی ہی نہیں خالی ہیں وہ مشاعروں میں تقدیم و تاخیر کو حفظِ مراتب کا لقب دے کر اپنا نام آخر میں رکھواتے ہیں تاکہ اُن کی انا کے ذخیرے مرجھا نہ جائیں اور ناقص اُستادی کی سند پوشی برقرار رہے وہ اس سے بے خبر تھے کہ اچھا شعر ہر مقام پر اچھا شعر ہے تقدیم و تاخیر سے گرتی ہوئی دیوار نہیں رُکتی۔

جہاں تک مکتبی علم کا تعلّق تھا وہاں تک تو یہ اپنی طیلسانیت کا رُعب دے کر کم سواد لوگوں میں اپنا لوہا منوا لیتے لیکن جن کے سینوں میں نغموں کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں اور شعور کے شوکیس میسّر تھے اُن میں ان کے لٹریچر کی کوئی قیمت نہیں لگتی تھی۔ میری نگاہیں تو نکلتے ہوئے سورج کے نتھنوں سے دھاریں لینے کی عادی تھیں اور سانسوں سے خوشبو پینے کے فن پر میں اچھی طرح حاوی تھا۔ میرا مطالعہ اور مشاہدہ جبلی علوم اور کھوکھلے خیالات کو کیوں خاطر میں لاتا ہ جب کہ میں اپنے سینے میں ایک ایسا عنصر پا رہا تھا جو الفاظ میں آکر مفہوم میں افسوں اور معانی میں تفویض کا رنگ بھر دیتا ہے اور اُسے وقت کی مسموم ہوائیں خراب کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔

تقسیمِ ملک کا ہنگامہ

میں کوٹ عبداللہ شاہ مزنگ لاہور کے جس مکان میں رہتا تھا، وہ اس قدر بلندی پر تھا کہ وہاں سے قریب قریب تمام لاہور کا بالائی حصّہ نظر آتا تھا۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کی رات کو جب پاکستان عملی وجود میں آیا۔ اُس رات میں اپنے مکان کی چھت پر کھڑا تھا فسادات کا سلسلہ یُوں تو پہلے سے جاری تھا لیکن اس وقت تمام لاہور چِتاؤں کا شہر معلوم ہو رہا تھا۔ کہیں شعلے زبانیں نکال رہے تھے۔ کہیں دھوئیں کے سُرخ پہاڑوں کی چوٹیاں آسمان کی طرف لپلپاتی ہوئی دکھائی دیتی تھیں، کہیں دھماکوں سے فضا میں ڈبکیں پڑ رہی تھیں اور کہیں رائفل کی گولیوں کے زنّاٹے فضاؤں میں نامعلوم خط لگا رہے تھے۔ رات کے اندھے سنّاٹے میں کبھی کسی مکان کے بیٹھنے اور کبھی آدمیوں کے بے ہنگام شور وغل کا بگولا اُٹھتا اور پھر خاموشی طاری ہو جاتی، دن میں گلیوں کا یہ عالم تھا جیسے دَورے کے اختتام پر نہر کے حکّام کے خیمے اُکھڑ رہے ہوں۔

میں اس فضا میں بھی اچھے اور بُرے لوگوں کے کارنامے دیکھ رہا تھا، جو متعصّب ہندو جاتا تھا وہ تمام قیمتی سامان کیمپ میں لے جاتا اور کاٹھ کباڑ رکھ کر آگ لگا دیتا تاکہ کوئی چیز دوسروں کے کام نہ آسکے اور جو شریف ہندو تھے وہ نقدی

زیور تو لے جاتے مگر گھر کا سامان کسی غریب یا دوست کے سپرد کر جاتے یا پھر مکان کو قفل کے بغیر چھوڑ جاتے تاکہ سامان کسی نہ کسی کے کام آجائے۔ حالانکہ میرے محلّے میں بڑے جری اور جیالے لوگ رہتے تھے جو لاہور بھر میں بہادر اور لڑاکا مشہور تھے مگر مَیں پُوری ذمّہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ میرے محلے میں کوئی ہندو قتل نہیں ہُوا اور کوئی عورت بے آبرُو نہیں کی گئی، ہاں غریب لوگوں نے بچا کھچا سامان ضرور اُٹھایا ہے اور یہ سب جگہ ہُوا ہے! اِدھر اُدھر کی کوئی تخصیص نہیں، قیمتی سامان اور مال و زر غریبوں کے ہاتھ بالکل نہیں آیا! اوسط درجے کی باقیات کو بڑے لوگوں اور سرکاری آدمیوں نے ڈمپ میں پہنچا دیا۔ اور وُہ افسرانِ ضلع کی تحویل میں رہا۔

اس تقسیم کے ہنگامے میں سب سے زیادہ بے قدری کتابوں کی ہوئی۔ اتنی کوئی چیز ذلیل نہیں ہوئی۔ ٹھیلوں پر مٹّی کے بھاؤ ایسی ایسی کتابیں بک گئیں جنھیں آج روح ڈھونڈھتی ہے۔ ملک کے سب سے بڑے سائنسدان ڈاکٹر شانتی سروپ[۱] بھٹناگر کی لائبریری جب رہٹروں میں لدکر بازار جانے والی تھی۔ عین اُسی وقت مَیں نے جسٹس ایس اے رحمان صاحب سے جاکر کہا کہ ڈاکٹر بھٹناگر کی لائبریری بازار جا رہی ہے اس کا کوئی انتظام کرائیں۔ ایسی لائبریری پھر نصیب نہیں ہوگی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ مَیں ابھی کوئی نہ کوئی انتظام کرتا ہوں آپ بے فکر رہیں نہ معلُوم پھر کیا ہُوا اور وہ لائبریری ردی میں بکی یا کہیں موزوں جگہ پہنچی۔

خود میری کتابیں میرے کلمہ گو بھائی لُوٹ کر لے گئے۔ اُنھوں نے اُسے بھی مالِ غنیمت جان لیا اُس وقت میں کُتب خانے کی حفاظت کے لئے رام گلی تک کیسے جاتا، سڑکوں پہ تو مَوت کا تسلّط تھا، رائفل کی نالیاں اپنی بے نور آنکھیں گلیوں کی ویرانی پر جمائے ہوئے تھیں اور گھر سے باہر نکلنے کے بعد کسی کو لوٹ کر آنے کا یقین بمشکل ہوتا تھا۔

---

[۱] ڈاکٹر شانتی سُروپ مرزا غالب کے عزیز شاگرد مرزا ہرگوپال تفتہ کے پوتے تھے اور میرے کرم فرما۔

لاہور کے حکام

اختر حسین، ظفر الاحسن لاری، جی معین الدین، آئی یو خاں، میاں امین الدین، سید فدا حسن، وزیر علی شیخ، قاضی احمد شفیع مسعود جیلانی، بشیر احمد خان اور مقصود حسین سب انسپکٹر پولیس

اتفاق تھا یا حکومت کی دُور اندیشی کہ اس وقت لاہور اور قرب و جوار کے اضلاع میں بڑے بڑے تجربہ کار اور ذی شعور حکام متعیّن تھے چنانچہ اختر حسین ظفر الاحسن لاری، جی معین الدین۔ آئی۔ یو خاں۔ میاں امین الدین، سید فدا حسن۔ ڈبلیو۔ اے شیخ وغیرہ کے کارنامے اظہر من الشمس ہیں۔ علاوہ ازیں قاضی احمد شفیع، اور بشیر احمد خاں صاحب وغیرہ انتظامی امور میں جان لڑائے ہوئے تھے۔ مہاجرین کے موجیں مارتے ہوئے سیلاب کو روک کر نظم وضبط قائم رکھنا اور عوام کو بے نظمی تک نہ آنے دینا یہ ظفر الاحسن ہی کا کام تھا اُنھوں نے اُن دنوں اپنی کوٹھی سے پہرہ ہٹا دیا تھا اور رات کے دو دو تین تین بجے تک کام کر کے سویرے اُٹھنا اور تمام دن سلیقے سے کام کرنا اور پھر حکومت اور عوام دونوں کو مطمئن رکھنا کسی معمولی سُوجھ بُوجھ کے آدمی کا کام نہ تھا۔

جی معین الدین اور اختر حسین کی جگہ اگر کوئی ذرا بھی غیر معیاری انسان ہوتا تو نہ جانے کیا کیا خرابیاں ظہور میں آتیں لیکن اختر حسین فطرتاً شریف انسان اور برہان پور کے ایک معزز خاندان کے فرد ہیں اس لئے وُہ آج تک اپنے دامن کو آلودگی سے پاک رکھے ہُوئے ہیں۔ ان کے پیش نظر ہمیشہ عقبیٰ کا سفر اور عوام کی بہبُود رہی ہے۔

اسی طرح جی معینُ الدین پشتینی شریف اور رئیس ہونے کے علاوہ ایک علمی

؂ قیام امن کے بعد ایک دَور ایسا آیا کہ حکومت نے وفادار اور باتدبیر اہلکاروں میں سے کئی ایک کو نااہل قرار دے کر عہدوں سے معزول کر دیا ان میں پہلے سات افسر سی ایس پی اور قاضی احمد شفیع پی۔ سی۔ ایس ہیں۔ بشیر احمد خاں مسعود جیلانی [illegible]

ادبی خاندان کے فرد ہیں اور معاشی طور پر نہ بد سے نہیں ، اس لئے انھوں نے بھی جو کام کیا اس میں حق دار کی حق رسی پر نظر رکھی ہے ۔

آئی یو خاں بھی محنت اور دیانت کے علاوہ حکومت کی پالیسی سے سرِمو انحراف نہیں کرتے اور ظاہر ہے کہ ایسے محتاط اور امن پسند انسان غلط قدم نہیں اٹھاتے وہ حکومت کے دست و بازو ہی نہیں ہوتے بلکہ دماغ کا حصّہ بھی ہوتے ہیں، اُن کی کوٹھی کا محل وقوع ان کی شرافت اور نیّت کا بیّن ثبوت ہے حالانکہ اگر وہ چاہتے تو اچھی سے اچھی جگہ منتخب کر سکتے تھے لیکن وہ ایک گندے نالے کے پہلو پہ اکتفا کر گئے ۔

فدا حسن کا تجربہ ، شرافت اور خاندانی روایات اُنھیں آج تک ساحلوں میں لئے جا رہی ہیں جو آج تک پایاب نہیں ہونے پائے حکومت اور عوام دونوں اُنھیں منتظم اور پُرخلوص کارکن خیال کرتے تھے ۔

مُردے ہی مُردے

جب ہندوستان کے مُسلم اکثریت کے حصّوں نے پاکستان کا نام پایا اور تقسیم ملک عمل میں آئی اس وقت میں لاہور میں ہی تھا اور اہل و عیال کاندھلہ ضلع مظفر نگر میں !

لاہور کی جہاں اور خصوصیات ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ اس کا ایک ہی قبرستان ہے دُوسرے شہروں کی طرح اس کے چاروں طرف مقابر نہیں، البتہ بعض اطراف میں تھوڑی تھوڑی قبریں ضرور ہیں اور ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں کبھی قبرستان ہوگا لیکن زندگی کی تُندی اور آبادی کی ترقّی نے اسے بستی میں تبدیل کر دیا ۔ لاہور کا سب سے بڑا اور اصل قبرستان میانی صاحب کا احاطہ اور اس کے گرد و نواح کی میلوں زمین تھی جو چاروں طرف سے مکانات میں آتے آتے اب معمُولی قبرستان رہ گیا لیکن اب بھی یہ دوسرے شہروں کے قبرستانوں

سے فراخ اور بارونق ہے۔

آج کا قبرستان جو میانی صاحب کے نام سے مشہور ہے سُنا جاتا ہے کہ یہاں کبھی شاہ آباد کے نام سے ایک آبادی تھی اور حضرت میانی صاحب اُس میں ایک بڑے درویش قسم کے بزرگ تھے اس وقت لاہور کا قبرستان مہزنگ تھا ترکی میں جسکے معنی ہیں گورستان، زمانے کے انقلاب سے اب وہ شاہ آباد جہاں میانی صاحب رہتے تھے قبرستان ہو گیا اور مہزنگ جو قبرستان تھا وسیع آبادی ہو گئی جسے عوام وخواص مزنگ کہتے ہیں۔ یہاں بڑے بڑے علماؑ وفضلاء، اور اونچے درجے کے درویش محو خواب ہیں لاہور بھر کے مکینوں کو یہیں زمین جگہ دیتی ہے یہیں لاہور کے مشہور بزرگ اور مجددؒ الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت شیخ طاہرؒ بندگی کا مزار ہے جس کے خادم جناب سیّد بشیر حسین گیلانی ہیں۔ بشیر حسین گیلانی میرے ہم عمر دوست ہیں۔ آغازِ شباب میں نہایت شوقین مزاج انسان تھے۔ لیکن اب ایک عرصہ سے اُنھوں نے عقبیٰ کی طرف ٹکٹکی باندھی ہوئی ہے۔ اِن کے برادرِ خورد سید شریف حسین سہروردی ہیں جو اپنی خاندانی روایات کے سختی سے پابند ہیں۔ درویش طبع اور مخیر قسم کے انسان واقع ہوئے ہیں جو بھی آدمی اُن سے ذرا قریب ہو گیا اُس نے ہمیشہ اُن کی طرف سے وکالت کی ٹھان لی اور اُن کے اوصاف حمیدہ کا ناشر ہو گیا۔

جب اس پاکستان کے خواب نے تعبیر کی صورت اختیار کی تو انسان کے خون سے ہی انسان کی تشنگی بجھتی تھی اور زر ومال کی ہوس نے اس قدر پاؤں پھیلا دئے تھے کہ نااہل، کام چور، اور بدمعاش لوگوں کو اندھا کر کے مار دھاڑ میں مصروف کر دیا تھا۔

جنازگاہ کے سامنے ہی قریشی محلّہ ہے اور یہ اچھی خاصی گنجان آبادی ہے، وہیں مویشیوں کی منڈی بھی لگتی ہے ظاہر ہے کہ یہاں رہنے والے گوشت کی

بُو چربی کی چڑاند کے علاوہ گائے بھینسوں کے پیشاب اور گوبر کی بُو کے عادی سے ہو گئے ہیں لیکن تقسیم کی خونریزی ہوئی تو مقتولوں میں ایسی لاشیں بھی آئیں کہ آس پاس کے لوگوں کو سانس لینا مشکل ہو گیا اور دماغ پھٹنے لگے۔

چنانچہ میری سربراہی میں چند مخلصین کی ایک کمیٹی بن گئی جس نے اِن لاشوں کی تجہیز و تکفین کا بیڑا اٹھایا جن میں چوہدری محمد اسماعیل، بابو محمد نقی، خلیل محمد یامین حلوائی اور مولانا الیاس کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ہم سب لوگ مل کر پہلے کفن کے لئے چندہ اکٹھا کرتے پھر فوراً کپڑا منگا کر مُردوں کو کفناتے دفناتے۔ اس بھاگ دوڑ میں مولانا کا حصہ سب سے زیادہ تھا کیونکہ ہر مشکل کام انہی کو دیا جاتا تھا۔ مولانا کا نام محمد الیاس ہے اور تمام محلّے کے لوگ انہیں مولانا کے نام سے پکارتے ہیں یہ ضلع بجنور کا رہنے والا ایک مزدور قسم کا غریب اور دیانتدار انسان ہے یُوں تو وُہ کچھ بھی نہیں مگر جب خدمتِ خلق اور ملک و قوم کی بات آجائے تو ہر کارکن کے ساتھ نتھی ہو جانا اس کا شیوہ ہے۔ پہلے وہ میری ہی طرح معماروں کے ساتھ مزدوروں میں کام کرتا تھا کئی بار مزدوری میں میرا اور اس کا ساتھ بھی رہا ہے مگر اب عرصہ ہُوا اُس نے ایک چھوٹی سی سبزی کی دکان کر لی ہے اسی سے اپنا گزارا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک خلوص ہے، جہاں مدد کا سوال آتا ہے اس کے لئے دوست دُشمن سب برابر ہیں۔ اور اب تو وہ بفضلہٖ تعالیٰ حج بیت اللہ بھی کر آیا ہے۔

تقسیم ملک نے انتقال آبادی کے نام سے چاروں طرف انسانی جسموں کے کھیتوں میں کٹائی لگا رکھی تھی مہاجرین کی کٹی پھٹی اور بدبُودار لاشوں کے ملبے سے بھرے ہوئے ٹرک برابر پہنچ رہے تھے اور جنازہ گاہ کے باہر ان بے رُوح اجسام کا انبار لگتا جا رہا تھا اکثر کے جسموں پہ ضربات کی نیلی چادریں اور زخموں کے کتھئی کفن نہ جانے کیسے کیسے واقعات کے گواہ تھے۔ سینکڑوں اُبلی ہُوئی آنکھیں اور سوجن سے

چنچے ہوئے چہروں کی ہیبت سے دیکھنے والوں کے مُنہ کھُلے کے کھُلے رہ جاتے تھے۔ اِن ٹھوس ربڑ جیسے متعفن جسموں کے ٹیلے سے نہ کوئی سِسکی اُگتی تھی اور نہ فریاد۔ اُن کی آنکھیں لوہا، ہونٹ پتھر اور دماغ تانبے کی طرح سرد ہو چکے تھے۔ لیکن اِن سیاست کی صنعتوں اور تعصّب کے شاہکاروں پر جرم وگناہ اور بر ہنگی کا الزام عائد نہیں ہوسکتا تھا۔ اس سفّاک وقت میں ہم سب کارکن جی کڑا کیے ہوئے آئی موت کے لاشوں کی ٹھٹھری ہوئی فصل کو بالیوں موالیوں کی طرح ٹھکانے لگا رہے تھے، آس پاس کے خس وخاشاک اور پیلو کے قدآوم درخت حیرت اور خاموشی میں ڈوبے ہوئے تھے کیونکہ شاید اس سرزمین پر اس سے پہلے کبھی مقتولوں کا ایسا خاموش جلوس نہیں آیا تھا۔

سینکڑوں ایسی لاشیں بھی نظر سے گزریں کہ سیاست اور خودغرضی کے تربیت یافتہ قزاقوں نے پتّوں اور بالیوں کے لئے کان، بُلاقوں اور نتھوں کے لئے ناکیں کاٹ لی تھیں مگر گونجیں کھولنے کی تکلیف گوارا نہیں کی تھی۔ جگنیوں ہاروں اور سونے کے تعویذوں کے لئے گلے گھونٹ دئے تھے۔ جہانگیریوں، پہنچیوں، بندوں اور کنگنوں کے لئے گوری گوری نازک نازک کلائیاں تراش لی گئی تھیں اس سے ظاہر ہے کہ جب معمولی زیورات کے لئے یہ بربرّیت روا ہوتی ہے تو تاج کے حصول میں سر اُتار لینا کون سی بڑی بات ہے؟

اُن کی نظر میں یہ نہیں تھا کہ جنگلی خودرو پھولوں اور پھلوں کے بیجوں کو بگولوں، آندھیوں اور طوفانوں کے باوجود زمین مہینوں برسوں محفوظ رکھتی ہے تو اِن مظلوموں پر جبروتشدّد کے خونیں ڈرامے کی تمام تر جھانکیوں کو زمین کہاں ضائع ہونے دے گی یہ تو ایسی امانت ہے جس کی مستقبل کو سپردگی اِردگرد کی فضا کی ذمّہ داری ہے۔

مَیں اور میرے ساتھی جب اس ناگہانی تجہیز و تکفین میں مصروف مقتولوں کو عجلت اور بے پروائی سے دفنا رہے تھے، مبادا لاشیں زیادہ ہو جائیں اور رات گزرنے پر تعفّن بڑھ جائے۔ اُس وقت مُجھے گورکنوں کی بے دردی اور پیشہ ورانہ تجہیز و تکفین کا کئی بار خیال آیا اور اپنے پہلے فیصلے پر ندامت ہوئی۔ اب آسانی سے میری سمجھ میں آگیا کہ قدرت کے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کو اگر گورکن ٹھکانے نہ لگائیں تو گلے سڑے جسموں کے تعفّن کا بھپکارا پوری آبادی کو لپیٹ میں لے لے اور زندگیاں موت کی طرف چل پڑیں۔ یہ گورکنی با تاجرانہ اندازِ حیات بادی النظر میں ایک جابرانہ فعل سہی، انسانی ہمدردی اور صحتِ عامّہ کے اعتبار سے بڑی خدمت ہے اور یہ کسی صورت میں بھی قاتلوں کی طرح مجرم اور گناہگار نہیں ہو سکتے۔

مزنگ کی آبادی عجیب و غریب ہے اس میں شریف لوگ بھی آباد ہیں اور شرافت سے منکر بھی۔ نیک اور پاک بھی بستے ہیں اور ایسے غنڈے بھی جنھوں نے اب تک غنڈہ گردی کا نام نہیں مٹنے دیا۔ لیکن یہاں کے شرفا کو میں نے اچھے بُرے کاموں میں تمیز کرتے پایا ہے۔ یہ لوگ کھوٹے کھرے کو دیر میں پہچانتے ہیں لیکن جب کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو بدلنا نہیں جانتے، کوئی آدمی اگر ان کے معیار پر پُورا اُتر جائے تو پھر وہ عزیزوں اور رشتہ داروں سے زیادہ امداد کرتے ہیں میرے جاننے والوں میں شیخ ظفر حسین ایڈووکیٹ، میر بشیر ہندی، مجید قنساری، پیرزادہ شریف احمد عثمانی اور شریف حسین سہروردی کے علاوہ محمد شریف، مہر محمد افضل، عبدالرزاق چوہدری محمد ابراہیم، چوہدری محمد سعید، محمد ظہیر اور محمد مختار قابلِ ذکر لوگ ہیں۔ میں نے انھیں ہر موقع پر شریف اور معقول انسان پایا ہے۔ یہی لوگ تھے کہ ہم نے ہزاروں لاشوں کے لئے کفن مہیّا کر لئے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ مَیں نے خوب غور سے مطالعہ کیا ہے کہ مسلمان جب مسلمان ہو کے رہتا تو وہ جان کی قربانی سے بھی دریغ

نہیں کرتا اور صبر و شکر میں بھی اپنی مثال آپ ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جو مظلوم انتقام کا خیال نہیں رکھتا خود فطرت اس کے انتقام کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شاید انہی مقتولوں کی روحوں کی پہلی اپیلوں کے فیصلے ہو رہے تھے جیسے آسمانی کارکن دیکھتے اور نظرِ ثانی سے ترمیم و تنسیخ کرتے ہیں ۱۹۴۷ء اور ۱۹۶۵ء میں زیادہ مسافت نہیں ہونے پائی تھی کہ جنگ میں میلوں تک مدِّ مقابل کی لاشوں سے میدان پٹے پڑے تھے اور از راہ خدا ترسی دشمنوں کی لاشوں کو بھی انہی لوگوں نے جل آشرم دیا، کیونکہ اسلام میں احترام میت کے لئے تاکید آئی ہے، میرا یقین پختہ ہو گیا کہ مظلوموں کی دبی ہوئی آوازیں روحوں کی عدالت اور قلب کی رصد گاہوں سے اُٹھتی ہیں جہاں صرف الوہیت کے احکام چلتے ہیں اور وہاں سے اُٹھی ہوئی چیخ عرش کی مسند تک مار کرتی ہے۔ تقسیم کے وقت لاہور کے کلمہ گوؤں نے جہاں میرا کتب خانہ اور کاغذ کا اسٹاک متروکہ مال سمجھ کر لوٹا وہیں پنجاب ریلیجیس بک سوسائٹی پریس کا منیجر امام الدین بھی میرے پچاس ریم کاغذ سے منکر ہو گیا۔ اور میں حق حیران پریشان کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ میرے لئے رسیدوں کے ذریعہ چارہ جوئی کا موقع ضرور تھا لیکن حالات کے تقاضے سے یہ خیال دامنگیر رہا کہ میری کوئی مضبوط پشت پناہی تو ہے نہیں اور اس کے بغیر چارہ جوئی ایک خوش خیالی کے سوا اور کچھ نہیں، قانونی طور پر حصول کے لئے تو لنگوٹی کا مطالبہ پگڑی کی قیمت طلب کرتا ہے۔

کاغذ اور کتابوں کا اسٹاک لُٹ جانے سے مجھے اتنا افسوس نہیں تھا کیونکہ وہ ہندو کے مکان میں تھا اور ظفر ادیب اس کے نگران تھے جو ایماندار اور نیک سیرت انسان ہیں، لیکن اس عیسائیت کے پرچار کرنے والے اِدارے کی بدراہی اور دناءت کے ساتھ اس کی ایمان بیزاری سے میں تو ہک دک رہ گیا کہ کیا حضرت عیسٰے علیہ السلام

کے پیروی کرنے والے اتنی جلدی اور کم قیمت پر شیطان کے ہاتھ پر بیعت کر سکتے ہیں، مجھے افسوس اس لئے بھی زیادہ ہوا کہ میں حضرت عیسٰی اور مہاتما بدھ کو قابلِ تعظیم سمجھتا ہوں۔

ظفرادیب

جس ادارے کی تشکیل میرے پیشِ نظر تھی، میں اُس میں سب کچھ لگا چکا تھا، توقیر سے علیحدہ ہو کر وہ تعمیری پروگرام التوا میں پڑ گیا تھا، مگر بہت زیادہ دن نہیں گزرے کہ ظفر ادیب جو مجھے اپنا کلام بھی دکھاتے تھے، آ کر شریک ہو گئے اور کام سکون و اطمینان سے ہوتا رہا، ظفر ادیب کے خلوص کے باعث مجھے اس سے ہمدردی بھی تھی اور محبت بھی لیکن کبھی کبھی خود بخود دل میں یہ خیال ضد پر اُتر آتا کہ دونوں عنقریب جُدا ہو جائیں گے کیونکہ ایسا اشتراک فریقین میں کسی کو راس نہیں آتا، میں بعض بعض اوقات تو تواتر خیال سے ڈر جاتا اور ہم دونوں وصیت نامے لکھنے بیٹھ جاتے مگر پھر اُسے وہم قرار دے کر دُوسری طرف سوچنے لگتے اور کوئی وجہ سمجھ میں نہ آتی، حالانکہ یہ دونوں طرف سے اصرار تھا۔

بالآخر یہ تصوراتی خطرہ تقسیمِ ملک کی صورت میں بر آمد ہوا اور ہم دونوں ہمدردیوں سے لبریز ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے؛ اور اس جُدائی نے ایسی جاذبیت بڑھا دی کہ آج تک اُسی خلوص اور محبت سے بیتاب ہیں۔ ظفر ادیب کے رنگ و روغن سے قطع نظر اور بنگال آرٹ کے نقش و نگار سے عاری اُس کی آواز میں ایک شیریں غم اور لہجے میں سنگین مظلومیت گھلی ہوئی ہے وہ جب سے دہلی میں مقیم ہے سراپا درد ہے! اُس کے لہجے میں آج بھی وہ جاذبہ ہے جس کا معمولی سا جھٹکا رُوح کو جھنجھوڑ ڈالتا ہے۔ لیکن شاید ماحول کی رگیں بہری اور آنکھیں بے نور ہو چکی ہیں کہ چاروں طرف خلوص اور شرافت کی کوئی قیمت نہیں پڑتی۔ ظفر ادیب کی رُوحانی لطافت اس کے جسمانی حدود سے کہیں بلند ہو گئی ہے، اُس کی گفتگو میں مفہوم اس طرح ملتا ہے جیسے شعر میں ابہام کا کیف یا نغمے میں صوتی تاثرات۔ مجھے اُس سے ایک قسم کی پُرخلوص محبت ہے اور مرتے دم تک رہے گی

سردار کرپال سنگھ

اگست ۱۹۴۷ء کی بات ہے کہ میرے ایک کرم فرما سیّد مظفّر علی ظفر نے جو فوج میں حوالدار اسٹور ہولڈر تھے آکر مجھے بتایا کہ مَیں اپنے تین سپاہیوں کے ساتھ فتح گڑھ چوڑیاں سے مہاجرین کو لا رہا تھا کہ راستے میں دُور سے ایک اسّی پچاسی سال کے بوڑھے سکھ نے ٹرک کو روکنے کے لئے اشارہ کیا۔ مَیں نے کچھ سوچ کے ٹرک روک لیا اور اپنے ساتھیوں سے ہوشیار رہنے کو کہا۔ سردار نے پوچھا تم کون ہو؟ مَیں نے جواب میں کہا کہ مسلمان ہیں اور فوج کے آدمی ہیں سردار نے کہا کہ میرا نام سردار کرپال سنگھ ہے اپنے دو آدمی میرے ساتھ بھیجو مَیں نے اپنے ہمسایوں کی دو مسلمان لڑکیاں چھپا رکھی ہیں انھیں لے جاؤ جلدی سے، اب تو گاؤں کے لوگ لوٹ مار کرنے گئے ہوئے ہیں ایسا نہ ہو کہ وُہ آجائیں،

کرپال سنگھ کے چہرے پر ایک مقدّس شگفتگی تھی مَیں نے دو سپاہی اُس کے ساتھ کر دیئے اور اپنے اطمینان کے لئے میں بھی ساتھ ہو لیا کیونکہ گاؤں سڑک سے کچھ دُور نہیں تھا۔

سردار کا گھر گاؤں کے کنارے پر تھا وہ ہمیں ایک بڑے دالان میں لے گیا اور دالان کی بغل والے ایک بھوسے کے کوٹھے کو کھولا تو بھوسے کے اُوپر دو ٹوکریاں اُلٹی پڑی ہوئی تھیں اس نے دونوں ٹوکریاں اُٹھائیں تو اُن کے نیچے دو لڑکیوں کے سر دکھائی دیئے اور باقی جسم بھوسے میں دبا ہُوا تھا۔ ہم نے اور سردار کرپال سنگھ نے جلدی جلدی بھوسا ہٹا کر لڑکیوں کو باہر نکالا اور سردار نے دونوں لڑکیاں ہمارے سپُرد کرتے ہُوئے کہا۔ یہ آپ کی امانت آپ کے سپُرد ہے مَیں نے اپنی ہمسائگی کا فرض ادا کر دیا اب آپ جانیں آپ کا کام!

ہم نے وُہ دونوں لڑکیاں لا کر کیمپ میں داخل کر دیں اُس وقت سے طبیعت پر بڑا گہرا اثر ہے۔ سردار کرپال سنگھ کا کیریکٹر مجھے نہیں بھُولتا جب ذرا فرصت میں اکیلا بیٹھتا ہوں اُس وقت اس کا بوڑھا اور جھرّیوں سے بھرا ہُوا چہرہ میرے سامنے

آجاتا ہے۔ اس کے برعکس دُنیا میں ایسے ایسے بلند بانگ اور اسٹیج پر ہنکار نے والے "اُمن پسند" لوگ بھی ہیں جو اپنی نیتوں کا پردہ کر کے لوگوں کو فریب دیتے ہیں اور جب اُن کا لبادہ اُتر جاتا ہے اور یہ اپنے اصلی رُوپ میں سامنے آجاتے ہیں تو اُن کا کردار درندوں سے زیادہ بھیانک اور ان کی صورتیں جھلائے ہوئے شیطانوں سے زیادہ مکروہ ہوتی ہیں چھوٹے درجہ کے لوگ نہ جرم کرتے ہیں نہ گناہ۔ بڑے لوگ اُنھیں اپنا آلہ بنا لیتے ہیں مگر ان کا ضمیر ہمیشہ صحیح آواز دیتا ہے، یہ اور بات ہے کہ مجبوری کے عالم میں یہ جرائم بھی کر گزرتے ہیں لیکن ان کی فطرت میں جرم نہیں ہوتا!!

مثالی دوستی

تقسیم ملک کا ہنگامہ جالندھر میں قیامت کا نمونہ بنا ہوا تھا آگ اور خون کے دیوتا چنگھاڑ رہے تھے مسلمانوں کے خون سے ہندو سیاست کی بنیادیں بھری جا رہی تھیں۔ دیہات کے جابر سکھوں اور چالاک ہندوؤں نے مذہب اور انسانیت کے اصولوں کو پس پُشت ڈال کر پردہ نشین عورتوں اور بچوں کے قتل سے بھی دریغ نہیں کیا، چنانچہ گلی گلی میں مسلمانوں کو قتل کرنے کے لئے مقتل مقرر ہو گئے تھے۔ اِدھر اُدھر قتل ہونے والے مسافر اور غریب الوطن مقتول سڑکوں باغوں اور ریلوے لائن کے آس پاس بکھرے پڑے تھے چیلیں اور کوّے انسانی گوشت کو کھا کھا کے چھک چکے تھے اور اب جنگلوں میں ایسا تعفّن پھیل رہا تھا جیسے دونا پاک اور ایذا رساں مادّوں میں کھاچھنی ہو گئی ہو مگر جذبۂ غارتگری تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا۔

موٹے موٹے توندل بنیئے قاتلوں اور جلادوں کی پُشت پناہی کر کے اور پیٹھیں ٹھونک کر انعام و اکرام سے حوصلہ افزائی کر رہے تھے جس سے ذرا بھی چپقلش تھی وُہ گھر بیٹھے اُن کے قتل کے احکام صادر کر دیتے تھے اور سکھ تھے کہ اندھے جنون میں بے سوچے سمجھے اُن کے اشاروں پر چل رہے تھے۔

جالندھر کا ایک سچّا اور مخلص مُسلمان مُعلّم اپنے گھر کا دروازہ بند کئے اپنے دارالعلوم کے انجام پر غور و فکر کر رہا تھا برابر کے مکان سے آٹھ دس سکھ اوپر کی منزل سے کود آئے اور نیچے آکر مولانا کو اُن کی اہلیہ سمیت کھینچتے ہوئے سڑک پر لے آئے اور زبردستی ٹرک میں ڈال لیا۔ مولانا بہت چلائے اور شور و غل کیا کہ میری لڑکی کو بھی لے آؤ جہاں ہم ہیں وہیں وہ رہے گی اُنھوں نے اُن سے تو یہ کہدیا کہ وہ دُوسرے ٹرک میں آتے گی تم چلو ہم لا رہے ہیں اور لڑکی کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہیں اور لے گئے مولانا اور ان کی بوڑھی اہلیہ پرستی آنکھوں سے لڑکی کا انتظار کرتے رہے لیکن شام کے قریب ایک شخص نے جس کی تین لڑکیاں اسی طرح انسانی صورت درندوں میں قید تھیں مولانا کو بتایا کہ اب نہ میری لڑکیاں آسکتی ہیں نہ آپ کی۔ اب تو خُدا سے دُعا کریں کہ اللہ کرم فرمائے یہاں خُدا کے سوا کوئی فریاد نہیں سُنتا۔ یہ دو تین لمبوترے چہروں کے انسان جو آپ کو صبر کی تلقین کر رہے ہیں شقاوت اور بیدردی کے مجسّمے ہیں رات ہی ایک شخص بلند آواز سے گریہ و زاری کرنے لگا تھا اس سکھ جمعدار نے اُسے گولی مار دی اور کیمپ سے دُور پھینکوا دیا۔

یہ بُزدل لوگ تو مسلمان جیسی بہادر اور جی دار قوم کو ذلیل اور نیست و نابُود کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔" مولانا نے سُنا اور آہِ سرد بھر کر رہ گئے ان کے ہونٹوں پہ خود بخود ذکرِ الٰہی جاری ہو گیا اور تصوّر و تخیل کے تار فضلِ الٰہی سے ملنے لگے۔ کیمپ میں ہر لمحہ آرے کی طرح گزر رہا تھا اور دن دہاڑے متعفّن اندھیروں کے غول آفتاب و مہتاب جیسی صورتوں پہ چابک برساتے تھے۔ اب ہندوؤں اور سکھوں کا مذہب اور اُن کی مذہبی کتابیں اُن کے ذہنوں سے محو ہو چکی تھیں، اور ان کے پیشواؤں کی تعلیم صدا بہ صحرا ہو کر رہ گئی تھی۔ بے ایمانیوں اور حرام روزی سے پلے ہوئے نوجوانوں کو بنیوں اور حاکموں نے شمشیر برہنہ بنا دیا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جن کے ضمیروں کا غیرت

سے تعارف نہیں تھا۔ اور اژدہاؤں کی طرح قالینوں اور صوفوں پر ریاحی چھچھوندریں چھوڑنے اور کھٹی ڈکاروں کی دھڑوک کے سوا کوئی مشغلہ نہیں تھا اور آج یہ مجبور اور بیکس مسلمانوں کو جب چاہتے اور جہاں چاہتے بے جان لاشوں کی طرح پھینک دیتے تھے۔

چنانچہ مولانا کو بھی اُنھوں نے جالندھر سے اور کسی دوسرے کیمپ میں بھجوا دیا اور مولانا نہ جانے کس کس طرح آلام و مصائب جھیلتے ہُوئے لاہور پہنچ گئے، اُنھوں نے دسیوں بیسیوں مولویوں اور اس وقت کے لیڈروں کے علاوہ ذمّہ دار افسروں کو اپنی داستانِ مصیبت سُنائی مگر یہ ایسا وقت تھا کہ وہ بھی کیا کرتے؛ ہمدردی کے اظہار میں بھی خسّت برتی جاتی تھی!

ہر شخص اپنے اپنے کرب و ابتلا میں گھرا ہُوا تھا اور پھر مولانا جن جُبّہ پوشوں سے امداد کے طالب تھے ان کے حجروں میں تو خرّاٹوں کے چمگادڑوں کی پروازوں اور پلاؤ زردہ کو فضلہ بنانے کی مشینوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ اُن میں خُدا کا خوف اور انسانی ہمدردی کہاں سے آئی تھی؟ یہ سوتے ہُوئے لوگ جاگتے خُدا کو کہاں دیکھ سکتے تھے؟

آخر مولانا نے تنگ آ کر اپنی سرگذشت اپنے ایک ہندو دوست کو لکھی اور نشاندہی کی کہ فلاں فلاں لوگ میری لڑکی کو ساتھ لے گئے تھے اگر اُسے بھجوا دیں تو میں زندگی بھر دُعا گو رہوں گا۔

حالانکہ اُن دنوں مذہبی ساحلوں پر علم و خلوص اور رحم و انصاف کی درآمد بند تھی اور ہر طرف ظلم و تشدّد اور بیدردی کی اسمگلنگ جاری تھی لیکن مولانا کا ہندو دوست نشاندہی کے مطابق اس گاؤں میں گیا جہاں کے یہ لوگ رہنے والے تھے وہاں کا مُکھیا اُس کا دوست تھا اُس نے اُسی وقت لڑکی کے متعلّق دریافت کیا،

ے دھڑوک۔ سانڈ اور شیر وغیرہ کی آواز۔

معلوم ہوا کہ ایک لڑکی آئی ہے۔ مکھیا نے اپنے کمیرے کو بھیج کر ایک نوجوان کو بلوایا جو صورت شکل کے اعتبار سے شریف انسان معلوم ہوتا تھا۔

مکھیا نے کہا کہ میرے دوست لالہ صاحب آئے ہیں۔ انھیں وہ مولوی صاحب کی لڑکی جو تمھارے پاس ہے واپس دے دو!!

نوجوان: "میں تو اس سے شادی کر چکا ہوں"۔

مولانا کے اس ہندو دوست نے کہا۔ "اگر شادی تک ہی بات ہے تو میرے یہاں ایک لڑکی ہے اس سے شادی کر لو۔ مگر مولانا کی لڑکی واپس کر دو"۔

نوجوان نے جب یہ سنا تو سناٹے میں آگیا اور اس کے ذہن پر ایسا اخلاقی دباؤ پڑا کہ جوابی آواز نہ آئی۔ وہ زمین پر نظر جمائے کھڑا رہا اس کے کانوں کا رشتہ اس کی کھوپڑی سے جا ملا جہاں مذہب اور انسانیت کی بلندیاں لودے رہی ہیں۔ وہ بڑی دیر تک خیالی دلدلوں میں ہاتھ پاؤں مار کر نکلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کی صفات کی پگڈنڈیاں ذات کی طرف مڑ گئی تھیں اُس نے اپنے دِل کی گہرائیوں سے آواز کھینچ کر کہا "اب وہ لڑکی میری بہن ہے اور میں آپ کے دوست کی لڑکی کو ابھی آپ کے ساتھ کرتا ہوں اب سے وہ میری بیوی نہیں رہی۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اُس نے لڑکی کو تمام زیورات اور پارچات سے لاد کر مولانا کے ہندو دوست کے سپرد کر دیا، اور اس نے لڑکی کو پاکستانی کیمپ میں داخل کر کے رسید مولانا کو روانہ کر دی اور مولانا کیمپ سے بذریعہ رسید لڑکی کو لے آئے۔ لیکن اُس کے پاس نہ زیور تھا نہ کپڑے!

ایک بدگمانی

اسی اثنا میں حکومت کے ایک ذمّہ دار افسر راولپنڈی کی طرف دورے پر گئے اُس وقت مشرقی پنجاب اور انڈیا سے آئے ہوئے بے شمار زخمی پاکستان میں مختلف شہروں قصبوں اور دیہات

میں پہنچ رہے تھے۔ راولپنڈی سے اُدھر حضرو کے قرب وجوار میں ایک قصبہ ہے جس میں ایک بڑا اور معزز ہندو خاندان صدیوں سے چلا آرہا تھا۔ اتفاق سے ریلوے اسٹیشن پر مشرقی پنجاب اور یو۔پی کے دو تین سو زخمی اُتارے گئے عجب چھاتیاں کٹی ہوئی عورتیں، ناک کٹے ہوئے بوڑھے بوڑھیاں اور جھلسے ہوئے بچے جلوس کی طرح بستی میں داخل ہوئے تو ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم و ستم کا شور برپا ہوگیا ہر آدمی کے دل میں اُن کی طرف سے نفرت کا جذبہ اور انتقام کا جوش کروٹیں لینے لگا، دُنیا کی نظر میں کوئی انسانی خطا ایسی نہ تھی، جس پہ اتنی مخلوق کو بے سبب خون سے نہلا دیا جائے، مجبور و بے کس جسموں پر زخم پہنا دئے جائیں، اور سچ پوچھئے تو خود ظالموں، جابروں اور قاتلوں کو بھی ان مظلوموں کا کوئی قصور معلوم نہ تھا وہ تو وقت کی رَو میں بہ رہے تھے۔ اُنھیں تو سرمایہ داروں نے اپنی حفاظت اور سرمائے کی سالمیت کے لئے قتل و غارت کی طرف راغب کر دیا تھا اور خود گھروں میں بیٹھے انسانی خون کے ضیاع سے خوش ہو رہے تھے۔

یوں تو اس بستی میں سینکڑوں ہندو آباد تھے لیکن یہ ایک خاندان اُن سب میں لکھا پڑھا اور ہندوؤں میں نمودار سمجھا جاتا تھا۔ وہ بڑا گھبرایا ہوا تھا چنانچہ جب اُس کا سہم اور خوف حد سے بڑھا تو ایک منصوبے کے تحت اپنی دو لڑکیوں کو ان کی ہونے والی شادیوں کے زیور اور کپڑے پہنا دیئے اور وہ تمام دِن مستقبل کی دُلہنیں بنی پھرتی رہیں جب شام ہوئی تو سارا گھر سوگوار سا ہوگیا اور جب نصف رات گزر چکی اور آسمان اپنے سینے سے ستاروں کا ہار اُتارنے لگا تو اُنھوں نے اپنے گھر کا تمام معمولی سامان سے لے کر قیمتی سامان تک جس میں لکڑی کے صندوق، مسہریاں، لکڑیاں اور اِدھر اُدھر کا کاٹھ کباڑ شامل تھا اپنے صحن میں رکھا

اور بیچ میں لڑکیوں کو بٹھا کر تیل چھڑک کے آگ لگادی" ابھی آگ لگائے ہوئے دو گھنٹے نہیں گزرے تھے کہ ملٹری کے ٹرک آ گئے اور اُنھوں نے کہا کہ اپنا قیمتی سامان اور بیوی بچوں کو ٹرک میں بٹھا دو تاکہ تمہارا مال اور جانیں محفوظ ہو جائیں ہم مسلمان ہیں تم پر کوئی سختی نہیں ہوگی، ہم تمہیں احتیاط کے ساتھ تمہارے کیمپ میں پہنچا دیں گے۔ یہ ہمارا فرض اور ہمارے خُدا کا حکم ہے۔

اُس وقت مَرد تو خاموش رہے مگر عورتوں سے نہ رہا گیا اور کہا کہ ہم نے تو اپنے گھر کا سامان اور اپنی بچیوں کو زندہ جلا دیا ہے ہمیں کیا خبر تھی کہ مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں کو زخمی اور خون سے تر بتر دیکھ کر بھی ہوش و حواس کو ہاتھ سے نہیں دیں گے، اور ہماری حفاظت کی ذمہ داری لیں گے پھر تو مَرد بھی پھوٹ پڑے اور ایک کہرام مچ گیا۔ ابھی ہری ہری دُھوپ درختوں کی چوٹیوں پہ جھلک رہی تھی اور اس محلّے میں ایک کہرام برپا تھا، مگر کیا حاصل؛ وقت کے سرے تک ہاتھ سے نکل چکے تھے وُہ روتے پیٹتے اپنا بچا کھچا زیور اور نقدی لے کر ٹرک میں سوار ہو گئے اور ٹرک بخیریت تمام کیمپ تک پہنچ گیا۔

اصل میں یہ قتل و غارت کا بازار خود غرض اور غلط اندیش سرمایہ داروں نے گرم کیا تھا اُن کے پیشِ نظر اپنے مال و منال کی حفاظت تھی اور مسلمانوں سے عناد کے مشتعل جذبات اُنھیں اندھا کئے ہوئے تھے۔

مسلمانوں نے بہت سے ہندوؤں اور سکھوں کو بادلِ نخواستہ سینے پر پتھر رکھ کر کڑھتے ہوئے دِل سے رخصت کیا ہے۔ مَیں خود جب تنہائی کے زینے سے اپنے ماضی میں اُتر جاتا ہوں تو بھیم سین ظفر، راج بلدیو راج، راجندر کرشن احساس، کیدار ناتھ، دولت رام، سردپرکاش دامن، روشن لال، زلفی اور ماسٹر دیسراج وغیرہ اُنہی لباسوں اور شگفتہ چہروں سے ہنستے بولتے نظر آتے ہیں تقسیم ملک کو

پچیس برس ہونے کو آئے مگر ابھی تک اُن کی یادیں بن باس لینے کو تیار نہیں ہیں، شاید اِس لیئے کہ یہ سب علمی ادبی نوجوان ہیں اور پھر شاعر اور ادیب تو ہر قوم کے مخلص لوگ ہوتے ہیں ممکن ہے کہ خود غرض لوگ اور ہوس پرست انسان اپنے تعلقات کو فراموش کر چکے ہوں مگر وُہ تعلقات جو فراموش ہو گئے ہیں اسی قابل تھے کہ فراموش کر دیئے جائیں۔

اخلاقی مظاہرہ

قیامِ پاکستان کے بعد وقت کے ساتھ جب بربریت فرو ہوگئی اور ہندو مسلمان ہی نہیں سکھ بھی ہوش میں آکر نفع و نقصان کو سوچنے لگے کہ تقسیم میں کیا کھویا اور کیا پایا، تو چند خود غرض، ریاکار افراد اور تاجر پیشہ لوگوں کے سوا ہر آدمی خود کو خسارے میں محسوس کر رہا تھا۔ عدل و انصاف کے علاوہ تاریخ اور مورخ قلمی تعصبات کے غلط استعمال سے پشیمان تھے۔ اور جب طاقتور۔ کمزوروں پہ تشدّد کا سبب سوچنے لگے تو شرمندگی کے سوا کچھ نہ ملا، ہر قوم و ملت کے خلوص، وفا، کردار اور انصاف کا تجربہ سامنے تھا۔ اور کفِ افسوس ملے جا رہے تھے۔ مذہبی پیشواؤں اور حکّام نے اپنے مُقدّس لبادے پھر پہن لئے تھے اور عوام سے علیحدگی اختیار کرکے منبروں پر سنجیدگی سے بیٹھ گئے تھے۔ جیسے شکم سیر چیتے بعض اوقات درختوں پر بھی شکار کی گھات میں بیٹھے رہتے ہیں۔ پاکستان میں ہندوؤں اور سکھوں کا آنا جانا دوبارہ ہو گیا تھا اُنھیں دنوں مجھے ایک دن میں کئی آدمیوں نے یہ واقعہ سُنایا کہ دن کے ڈیڑھ دو بجے ہسپتال کے بغلی دروازے سے جو ہسپتال روڈ کی طرف کھُلتا ہے ایک بڑے ڈیل ڈول کا مگر نہایت مغموم مسلمان ہسپتال سے نکل کر آ رہا تھا۔ اتنے میں اِسی سڑک پر ایک سکھ کا گذر ہُوا اُسے دیکھتے ہی مسلمان کی آنکھیں سرخ شعلوں سے بھر گئیں اور چہرہ کے خدوخال تشدّد پسند لوگوں کی طرح ہو گئے، اُس نے

گلہار کی طرح جھپٹ کر اُسے پکڑ لیا اور پھر اس کے کیس پاؤں سے دبا کر بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ لاہور کی سڑکیں جہاں ہر وقت آدمیوں کا سیلاب موجیں مارتا رہتا ہے۔ فوراً سینکڑوں آدمی جمع ہو گئے۔ اور سکھ کو چھڑانے لگے۔ لیکن اُس سردار نے بڑے تلخ لہجے میں اپنے مددگاروں کو روک دیا، اور بڑے روشن لہجے میں کہا کہ مجھے کوئی نہ چھڑائے! لوگوں نے مسلمان کو پکڑ لیا، اور سردار سے سوال کیا یہ کیوں؟

سردار نے کہا "میں نے اس کے خاندان کو قتل کیا ہے، اور وہ بے گناہ تھے! میرا انھوں نے کوئی نقصان نہیں کیا تھا۔ مگر میں اس وقت ایک لالہ کے اُکسانے اور بھڑکانے میں آگیا اور قتل و غارت پہ کمر باندھ لی، لیکن گھر جا کے جو سوچا تو میرے ضمیر نے میری نیندیں چھین لیں جب سوتا ہوں تو خواب میں وہی ماحول دکھائی دیتا ہے کہ لالہ دوئی چند غارتگری کے منصوبے بنا رہے ہیں اور ہم لوگ اُن کے اشاروں پر بے گناہوں کا قتلِ عام کر رہے ہیں۔ پولیس اور فوج ہمارے تعاقب میں ہے اور ہم جنگلوں اور اونچے نیچے ٹیلوں میں دُبکتے پھرتے ہیں؛ فوراً آنکھ کُھل جاتی ہے اور پھر صُبح تک نیند نہیں آتی آخر میں۔ نے طے کر لیا تھا کہ جب رستے کُھل جائیں گے تو لاہور جا کر خود کو اِن میاں صاحب کے سپرد کر دوں گا جو سامنے کھڑے ہیں۔ میں صرف اسی لئے لاہور آیا تھا۔ اور ان کے گھر جا رہا تھا کہ اِن کے دروازے پر ان کے ہاتھ سے قتل ہو جاؤں تاکہ رُوح کو ندامت اور ضمیر کو ملامت سے نجات ملے۔ اتفاق ہے کہ یہ رستے ہی میں مل گئے۔ آپ لوگ مجھ پر کرم کریں انھیں چھوڑ دیں اور مجھے نہ بچائیں میں، تو اِنھیں کے ہاتھ سے مر کر سکون پا سکتا ہوں، اور یونہی میری مکتی ہو سکتی ہے۔ یہ کہہ کر وُہ سر جُھکا کر بیٹھ گیا اور اس شخص سے کہا "آؤ اپنا کام کرو اور مجھے تکلیف سے چھڑا دو! مَیں خُدا سے پہلے تُمہارا گنہگار ہوں!"

یہ سُن کر مسلمان کے سینے میں اپنے اسلاف کی رُوح عود کر آئی، اس نے سردار

کو سینے سے لگالیا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔"میں نے اور میرے خدا نے تمہیں معاف کر دیا! میرے ساتھ گھر چلو! تم میرے مہمان ہو۔" چنانچہ دونوں باہوں میں باہیں ڈال کر موڑ مڑ گئے اور ایبک روڈ سے ہوتے ہوئے انارکلی عبور کر کے بھاٹی گیٹ کی طرف آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔

میں حیران رہ گیا کہ آج بھی مسلمان امیر المومنین حضرت علیؑ کی طرح کردار کی اسی بلندی پر ہیں اور قاتلوں کو معاف کر سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب اسلام کے اُن بنیادی کرداروں کی برکت ہے جن پر اسلام کی تاریخ ناز کرتی ہے

زرِ راہ

سید محبوب الرحمٰن وامق عظیم آبادی

سید محبوب الرحمٰن وامق پٹنہ کے ایک شریف خاندان کی نکلی ہوئی کڑی تھے تقسیم کے وقت بدنصیبی انہیں لاہور لے آئی، اور یہاں یہ انکم ٹیکس کے محکمے میں ملازم ہوگئے۔ شعر و ادب کا خاصا نکھرا ہوا مذاق ملا تھا چنانچہ لاہور کے شعراء و ادبا میں بہت جلد متعارف ہوگئے اور لوگ انہیں جاننے پہچاننے لگے۔

اگرچہ وہ شعر و ادب کے معاملے میں مجھ سے مشورہ کرتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصغر جنگ کی طرح وہ بھی مجھے دنیا کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتے رہتے تھے۔ انگریزی مصنفین کے خیالات اور نظریات پر اُن سے اکثر بحث رہتی اور دو دو دن تک کوئی میدان نہ چھوڑتا وہ بزرگوں کی طرح میرا احترام کرتے تھے۔ میں نے انہیں ہمیشہ بچوں کی طرح عزیز جانا اور اُن سے یہ رشتہ زندگی بھر کے لئے استوار ہوگیا۔ وہ کثیر المطالعہ انسان تھے اُن سے گفتگو میں مجھے اچھا خاصا معلومات کا ذخیرہ ملا اور ویسے ان کا خلوص بھی میرے لئے مغتنم تھا۔

مگر اس کا کیا علاج؟ حکومت کے اربابِ بست و کشاد نے اُن کی آزادہ روی

اور پندارِ علمی کے جُرم میں اُنھیں اپنا ذاتی ادارہ کھولنے پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ وہ پھر کراچی میں اِنکم ٹیکس پریکٹس کرنے لگے۔ نہ جانے ان کے علمی ادبی مشاغل کن منزلوں میں ہونگے۔ لاہور میں اُن کے پاس قدیم کتب کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا خُدا جانے کراچی میں رہ کر اس میں اُنھوں نے کیا اضافہ کیا ہوگا۔ ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو اچانک سقوطِ قلب سے راہیِ عدم ہوگئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ان کا کلام اکثر "نگار" کراچی میں چھپتا تھا جس کے مدیر نیازؔ فتحپوری تھے افسوس ابھی تک ان کی کوئی کتاب منصۂ شہود پر نہیں آئی ہم دونوں میں اگرچہ خط و کتابت کم تھی لیکن جب میں کراچی جاتا تھا۔ یا وہ لاہور آتے تھے تو فاصلے نظر نہیں آتے تھے۔ کاش میں اُن کے کسی کام آسکتا، وہ قابلِ قدر انسان تھے۔

جواں مرگ (شجاع اللہ)

ساحرؔ قدوائی کے توسّل سے یوں تو بریلی کے شعراء اور معززین میں اپنے اخلاق و اطوار کے باعث جناب اُمیدؔ[۵] بریلوی اکرام حسین شفیع اللہ خاں، اور محمود ہاشمی مرحوم، سبھی دل پر نقش ہیں اور تنہائی میں جب خیال آتا ہے تو اُن لوگوں کے شاداب شاداب چہرے نظر کے سامنے جھلملانے لگتے ہیں لیکن ڈاکٹر صفی اللہ خاں ساحرؔ قدوائی نے مجھے ایسا گرویدہ کر لیا تھا کہ اُن کے مکان کے علاوہ مجھے قیام میں کہیں بھی سکون نصیب نہیں ہوتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ساحرؔ کا رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ جو ایک بار اُس سے نزدیک ہوگیا میں نے پھر اُس کی زبان سے شکایت نہیں سُنی حالانکہ آج کل عام روّیہ ہے کہ دو چار ماہ ملنے کے بعد لوگ دوستوں کی شکایت ہی نہیں اُن کی طرف سے نفرت اور بیگانگی کے جذبات لئے پھرنے لگتے ہیں اس قسم کے لوگ اصل میں خود مخلص نہیں ہوتے۔ وہ کسی نہ کسی ذاتی غرض سے قربت اختیار

---

۵ اُمیدؔ بریلوی مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔ بریلی ہی میں ان کا انتقال ہُوا وُہ اچھے شاعر اور ادیب تھے۔

کرتے ہیں جو ایک سراب، ایک دھوکا اور ایک شعبدہ ہے اور بس۔

دوستوں کی اس دَور میں کمی نہیں لیکن مَیں بہت کم دوستوں پر اعتماد کرتا ہوں کیونکہ یہ جذباتی جوار بھاٹا نہ جانے کتنی بار میری نظر سے گذر چکا ہے۔ حالانکہ آج تک کسی دوست سے قرض یا اس قسم کے لین دین کی کوئی نوبت نہیں آئی جو عموماً دلوں میں فاصلے پھیلا دیتی ہے اور نہ کسی سے ایسی امید رکھتا ہوں یہی سبب ہے کہ کھرا تل رہتا ہوں اور خلوص کی تبلیغ میرا مذہب بن چکا ہے۔ لیکن اس کے باوجود لوگ دشمنی میں بھرے پھرتے ہیں۔ برعکس اس کے جب بھی ڈاکٹر ساحر سے ملتا ہوں، بال برابر فاصلہ محسوس نہیں کرتا۔

ڈاکٹر ساحر اپنے بھلے چنگے اور کھاتے پیتے دوستوں کے لئے بھی اپنی ہمت اور استعداد کے مطابق امداد سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ یہ بنجر زمین میں تخم ریزی تھی! بیماری کے ذرا سے آثار پر بھی وہ دوستوں کو دواؤں پر مجبور کر دیتے تھے۔ ان کا ایک عجیب نظریہ ہے کہ ڈگریاں جو ڈاکٹروں کو ملتی ہیں وہ اس لئے ہیں کہ "مریضوں کو تندرست کریں" حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ ایسے ڈاکٹر پیدا کئے جائیں جو تندرستوں کو بیمار نہ ہونے دیں! اور ان کا یہ خیال جہاں عجیب معلوم ہوتا ہے۔ وہاں قیمتی بھی ہے۔ مَیں ساحر کے پاس سے ہمیشہ یہ حسرت لے کر اُٹھا کہ کاش میں اس کے کسی کام آسکوں مگر ایسا موقع نہیں آیا۔

قیام پاکستان کے ہنگامے میں ڈاکٹر ساحر سے پہلے اُن کا چھوٹا بھائی شجاع اللہ خاں لاہور آگیا تھا اور میرے یہاں ہی مقیم تھا۔ وہ نہایت طبّاع اور نئے ذہن کا نوجوان تھا۔ اسکول سے لے کر ایل۔ ایل۔ بی تک وہ ہمیشہ اوّل رہا۔ تقریروں میں حصّہ لیتے لیتے اُسے بحث و مباحثہ کی عادت پڑ گئی تھی۔ وہ حیات اور علم حیات کے اہم اہم شعبوں پر ایسی گفتگو کرتا کہ سُننے والے عش عش کر اُٹھتے۔ وہ شعر

اچھا خاصا کہہ لیتا تھا۔ چنانچہ دلّی میں "تیرِ نیم کش" کے نام سے اس کا ایک مجموعہ بھی چھپ چکا تھا۔ جو اچھا خاصا ضخیم ہے نہ جانے اس کا اسٹاک کہاں ہے یا کیا ہوا؟

جب وہ لاہور آکے اُترا تو اس کے ساتھ ایک صاحبہ بھی تھیں جنھیں میں پہلے سے نہیں جانتا تھا اور نہ کبھی اس کا ذکر آیا تھا، اور شجاع نے بھی مجھ سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ شجاع کی طبیعت پہلے ہی سے صعوبت زدہ تھی لاہور میں آکر وہ اور بھی مضمحل سا رہنے لگا۔ اور کچھ روز کے بعد اُسے ہلکا ہلکا بخار بھی شروع ہو گیا۔ اس کی ساتھی ہر وقت اس کی امداد کو اُس کے پاس ضرور رہتی تھی۔ لیکن شاید یہ نزدیکی شجاع کی صحت کے لئے مفید نہیں تھی۔ وہ ہر وقت اُسے خوش رکھنے کی فکر میں رہتی لیکن جوانی کی پسندیدہ چیزیں عموماً جوانی کے لئے مفید ثابت نہیں ہوتیں! ایک سُوجھ بُوجھ کا نوجوان جان کی حفاظت کے لئے علاج معالجے کی طرف مائل تو ضرور ہو جاتا ہے لیکن پرہیز پر وہ بہ سعیٔ تمام بھی قادر نہیں ہو سکتا!! اور نوجوانوں کے بعض امراض اسی لئے دیرپا ہو جایا کرتے ہیں۔

شجاع کا معاملہ بھی یہی ہُوا کہ آہستہ آہستہ ڈاکٹروں نے تپِ دق تجویز کر دیا۔ اب تو شجاع اللہ خود بھی گھبرا گیا۔ اور وہ خاتون بھی بدحواس سی ہو گئی۔ مجھے بے حد تشویش ہوئی۔ کیونکہ میرے ایک عزیز دوست کا بھائی تھا۔ مَیں نے سوچ لیا تھا کہ چاہے مَیں بِک جاؤں شجاع اللہ کا خاطر خواہ علاج کراؤں گا۔ چند روز کے بعد اس کے سینے سے خون آنے لگا۔

جس کمرے میں شجاع سوتا تھا میں مصلحتاً وہیں چٹائی پر سونے لگا۔ میرے سر کے قریب ہی شجاع کے خون تھوکنے کا برتن رکھا رہتا تھا۔ مَیں تمام تمام رات اُس کی نگرانی کرتا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اِس کی جوانی بدپرہیزی کی نذر ہو جائے۔

لیکن میں چوبیس گھنٹے کیسے اُس کے پاس رہ سکتا تھا۔ دوا دارو کے لئے بھی جانا ضروری تھا۔ اور اپنی زندگی کے مراحل بھی درپیش تھے جو مشکل ہی نہیں مہلک ہو گئے تھے۔

اسی اثنا میں ڈاکٹر ساحرہ بھی والدین سمیت لاہور آ گئے اور ہم نے باہمی مشورہ سے اُسے میو ہسپتال[1] میں داخل کرا دیا۔ ہسپتال میں جب تک بھنگیوں اور خدمتگاروں کو انعام و اکرام نہ دیا جائے اسوقت تک نہ بھنگی صفائی کو فرض جانتا ہے نہ ملازم خبر گیری کو! چنانچہ بیمار کے لئے ہسپتال کی زندگی سنبھالا ہو کے رہ جاتی ہے اور ملازم بھی کیا کریں اُنھیں تنخواہیں اتنی قلیل ملتی ہیں کہ گزارا نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ کہیں دواؤں میں سے کہیں کھانے میں سے اور زیادہ تر مریضوں کو تنگ کر کے ان کے ورثا، اور لواحقین سے رقمیں وصول کرتے ہیں۔

مَیں نے ہسپتال میں بعض مریضوں کی تیمارداری کے دوران یہ محسوس کیا کہ اِس ادارے میں جسے شفاخانے کا نام دیا جاتا ہے۔ بھنگی ہی سب سے اہم آدمی ہوتا ہے۔ اور باقی ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

اس سے امرا کا طبقہ تو عہدہ برا ہو جاتا ہے۔ لیکن غربا کا داخلہ تو ہسپتال میں مُورت کے آغوش کا عرصہ ہے اور بس! کیونکہ پیسے کے بغیر نہ پیشاب پاخانے کی سہولت ہوتی ہے اور نہ کروٹ بدلنے میں آسانی میسّر آتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معمولی معاشرے کا انسان وقت سے پہلے مَوت کے گھاٹ اُتر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن روتے پیٹتے انسانوں کے جلوس ہسپتال سے نکلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور کوئی اس خامی پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں!

مجھے شجاع کو دیکھنے کے لئے ہر روز ہسپتال جانا پڑتا تھا۔ اس لئے میں نے ڈیڑھ دو ماہ تک صرف ہسپتال کے ماحول کا جائزہ لیا اور معلوم یہ ہوا کہ موجودہ صورت

---

[1] آج کا میو ہسپتال وہ ہسپتال نہیں، بہت سی اصلاحیں ہو چکی ہیں اور ہو رہی ہیں۔ کرنل عبدالرشید صاحب اور میٹرن رشس نے نظام کی درستی میں قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔

یں ہسپتال ایک تجربہ گاہ ہے۔ جہاں طالب علموں کے لئے عوام کو تختۂ مشق بنایا جاتا ہے۔ دولت مندوں کے لئے ممکن ہے کچھ سہولتیں بھی ہوں۔ مگر عوام کے لئے تو یہ مذبح سے کم نہیں۔ بعض ہسپتالوں میں بیماروں کے ہاتھوں میں نسخے دے دئے جاتے ہیں کہ دوائیں بازار سے خرید لائیں۔ اور جب دوائیں دستیاب نہیں ہوتیں تو کہتے ہیں کہ "رقم دیجئے ہم منگا دیں گے" اور وہ ناپید دوائیں وہیں سے دستیاب ہو جاتی ہیں۔ مرے تو کیا نہ کرے، بے ورثاء کو دواؤں کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، جو لوگ دواؤں کی قیمت ادا کر سکتے ہیں ان کے مریض تو ممکن ہے صحتیاب ہو جاتے ہوں ورنہ عوام تو عموماً ان کے رویّہ سے تنگ آ کر بھاگ نکلتے ہیں اور اپنے جھونپڑوں میں آ کر دم توڑ دیتے ہیں۔

ایک مریض کی چارپائی پر جب کوئی ڈاکٹر پہنچتا ہے تو اس کے ساتھ پانچ سات طالب علم بھی ضرور ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ایک پھوڑے کو دبا کر دیکھتا ہے اور اس کے مواد پر گفتگو کرتا یا لکچر دیتا ہے، تو ایک ایک کر کے سب کے سب طالب علم بھی اُسے اُسی طرح دیکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں اندمال کیسے ممکن ہے؟ کیا وہ پھوڑا ناسور نہیں بن جاتا ہوگا؟

مَیں نے دہلی میں خود دیکھا کہ ایک ڈاکٹر نے ایک مریض کی آنکھ کے زخم کو پپوٹے پلٹ کر دیکھا اور طالب علموں کو اس کے متعلق بتایا۔ اس کے بعد تجربہ کے لئے ہر طالب علم نے اسی طرح اُس کی آنکھ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ کیا ایسا مریض شفایاب ہو سکتا ہے؟ اچھی بھلی آنکھ کو بھی اگر دو چار بار اُلٹ پلٹ کر دیکھا جائے تو خراب ہونے میں کسر باقی نہیں رہتی۔

ایک دن ایک مریض کراہتا اور کانپتا ہوا تانگہ سے اُترا اور دو آدمیوں کا سہارا لے کر ڈاکٹر تک پہنچا، اس کے سامنے تین چار مریض اور تھے اُن کا معائنہ کر کے ڈاکٹر

اس مریض کی طرف متوجہ ہُوا اور اپنے کانوں کی عینک اُٹھا کر اس کا چمن مریض کے سینے پر رکھ دیا۔ اور پاس کھڑے ہوئے ملازم سے انگریزی میں کچھ کہا۔ خادم دو منٹ کے بعد واپس آگیا۔ اور ساتھ ہی سات آٹھ نوجوان طالب علم درآمد ہو گئے۔ ڈاکٹر نے اس مریض کو میز پر لٹا دیا اور اس کے سینے پر اُنگلی سے دستک دی۔ اور جگہ بدل بدل کر دستکیں سی دیتا رہا جب وہ ہٹ گیا تو شاگردوں نے بھی اسی طرح ٹھوکے دیئے، نتیجہ یہ ہُوا کہ مریض بیہوش ہو گیا۔ اور دو شخص جو اُسے ساتھ لائے تھے تانگے میں گھر لے گئے۔ وہاں کے ارکین میں سے کسی نے یہ بھی نہ کہا کہ مریض کے لئے تو ہسپتال ہوتا ہے۔ اِسے گھر کیوں لئے جاتے ہو؟ اُس کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر وغیرہ سب سمجھ گئے تھے اور وُہ چاہتے تھے کہ مریض اپنے گھر جاکر دم توڑے یعنی ایک اور مُوت ہمارے اعمال نامے میں نہ لکھی جائے۔ حالانکہ اس کا سفر تو طالب علموں ہی نے آسان کر دیا تھا۔

رات کو ساڑھے نو بجے ہسپتال کی بتیاں گُل ہو جاتی ہیں۔ اس وقت نرسوں اور ڈاکٹروں کی جگہ بیرے۔ خانساماں چوکیدار اور جمعدار وغیرہ ان کے قائم مقام ہوتے ہیں اب انجام جو بھی ہو جائے کم ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ہسپتال کونسا ہے؛ اور کن لوگوں کے لئے ہے " اگر یہی ہسپتال ہے تو اس کے قیام کا کوئی واضح مقصد معلُوم نہیں ہوتا۔ ہاں سرکاری ملازموں کے لئے کچھ ہو تو ہو جو تفریحاً بھی داخل دیکھے گئے ہیں۔

ساحر صاحب جو روپیہ ساتھ لائے تھے اوّل تو وہی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اور جو کچھ تھا وہ اُنھوں نے شجاع کی بیماری میں صرف کر دیا تھا اور کر رہے تھے۔ ایک دن رات کو ہسپتال کا ایک مریض جو مجھے جانتا تھا دَوڑا ہُوا میرے پاس آیا اور نہایت گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا کہ آپ کا مریض جو ہسپتال میں ہے اس کی حالت اچھی

نہیں۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور دل نے کہا شجاع چل بسا۔ ساحر نے دو روز پہلے لاہور سے دو میل کے فاصلے پر اچھرہ* میں ایک قبرستان کے کنارے کی آبادی میں مکان لیا تھا۔ اتفاقاً اُس وقت میرا ایک دوست میرے پاس بیٹھا تھا وہ ڈاکٹر ساحر کے نئے مکان کو جانتا تھا۔ میں نے اُسے دوڑایا اور کہا کہ ساحر اور اس کے والد سے کہہ دیں کہ شجاع کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ وہ شخص فوراً اچھرے گیا اور دونوں کو ہمراہ لے آیا۔ اگرچہ انھیں میں نے بھی یہی کہا کہ شجاع کی طبیعت زیادہ خراب ہے لیکن وہ بھی سمجھ گئے کہ شجاع گیا، اب وہ اس دُنیا میں نہیں۔

رات کا وقت تھا میں اُن دونوں کے چہرے تو نہیں پڑھ سکتا تھا البتہ رندھے ہوئے گلے اور بھرّائی ہوئی آوازیں اُن کے دل کی کیفیت کا پتا دے رہی تھیں۔ شجاع کے والد کے قدم لڑکھڑا لڑکھڑا کر اُٹھ رہے تھے، اور ساحر ہسپتال پہنچتے پہنچتے حواس باختہ سا ہو گیا تھا۔

جب ہم رات کو بارہ بجے ہسپتال پہنچے تو شجاع کی لاش ہسپتال والوں نے ایک کپڑے کی چار دیواری میں رکھی ہوئی تھی۔ ہم نے جا کر انچارج سے نعش اُٹھانے کی اجازت حاصل کی، اُسی وقت ایک ٹیکسی کرائے پر منگائی اور میں نے اس کے والد کو موٹر میں بٹھا کر سینہ و سر ان کے زانو پر رکھا اور دھڑ میں خود گود میں لے کر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی روانہ ہو گئی۔ ساحر ایسا بدحواس ہو گیا تھا کہ جیسے اُس کا نعش سے کوئی تعلق ہی نہیں، وہ خاموش تھا، نہ آنکھوں میں آنسو تھے، نہ ہونٹوں میں جنبش!

لاش جس کپڑے میں لپٹی ہوئی تھی اس میں سے پیشاب پاخانے اور دواؤں کی ملی جلی بُو ایسی آ رہی تھی کہ دل و دماغ معطل ہوا جا رہا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ایسے وقت میں دل پہ جبر کر کے ہی کام ہو سکتا ہے۔ ساحر ڈرائیور کے برابر کی سیٹ پر راستہ بتانے کے لئے بیٹھا تھا۔ لیکن ڈرائیور نہ جانے کس راستہ سے لے کر چلا کہ

* اچھرہ۔ لاہور کی ایک [illegible] ہے۔

ساحر کو راستے کا اندازہ نہ ہو سکا۔ اُن دنوں اچھرے کی آبادی تک سیلاب کا پانی مار کر رہا تھا۔ اس لئے گلیوں پر نالوں اور چوراہوں کے نشیبوں پر جھیلوں کا گمان ہونے لگتا تھا۔ جب ساحر کی سمجھ میں راستہ نہ آیا اور اندازے سے گاڑی اِدھر اُدھر لئے پھرنے لگا۔ تو ڈرائیور نے ایک کچے تالاب کے کنارے جاکر ٹیکسی روک دی اور کہنے لگا آگے راستہ نہیں۔ ساحر نے ماحول پر نظر ڈال کر کہا کہ مکان یہیں کہیں نزدیک ہی ہے۔ اِسی یقین اور قیاس پر ٹیکسی والے کو رخصت کر دیا۔ ڈاکٹر ساحر اور اس کے والد تو مکان کی تلاش میں نکل گئے۔ اور میں تالاب کے کنارے شجاع کی لاش کو لے کر بیٹھ گیا۔ نم آلود رات کے دو ڈھائی بج رہے تھے اور اندھیری رات کے تاروں کا عکس پانی میں ایک ہیبت پیدا کر رہا تھا۔ میں دُعا مانگ رہا تھا کہ اللہ العالمین جلدی ہی مکان مل جائے۔ مجھے یہ خوف تھا کہ اگر خدانخواستہ ایسے میں اِدھر کو پولیس کا راونڈ ہو گیا اور جوان نعش پر مجھے بیٹھے ہوئے دیکھا تو نہ جانے کیا کیا سوال و جواب ہوں گے اور مُردے کی مٹّی الگ خراب ہو گی۔

اتنے میں ساحر اور اس کے والد ہانپتے ہوئے آئے اور کہنے لگے کہ گھر دُور نہیں دوسرے کنارے والی گلی میں ہے۔ مَیں نے کہا مکان تو خیر ہُوا۔ آپ لوگ چارپائی کیوں نہیں لائے؟ میت کو ہم تُم گھر کیسے لے جائیں گے؟ وُہ بیچارے پھر بھاگے ہُوئے گئے اور چارپائی لائے مگر پھر یہ نہ سوچا کہ چارپائی کو اُٹھانے کے لئے چار آدمی درکار ہوتے ہیں۔ ایک کسی پڑوسی کو اُٹھا لیں مگر اُن کے تو اوسان ٹھکانے نہیں تھے۔ یہ باتیں تو سب ہوش و حواس کی ہُوا کرتی ہیں۔

ہم نے لاش کو زمین سے اُٹھا کر چارپائی پر رکھا سرہانے کی طرف ساحر صاحب اور ان کے والد ہوئے اور پائنتی کی طرف میں اکیلا۔ خدا خدا کر کے گھر پہنچے۔ میرے کپڑے لاش سے ٹپکے ہُوئے پانی اور دواؤں کی بُو سے ناقابلِ برداشت

ہو چکے تھے۔ چنانچہ میّت کو گھر پہنچا کے میں اپنے گھر آیا اور نہا کے کپڑے بدلے پھر فوراً سائیکل لے کر ساحرؔ کے گھر پہنچ گیا اور شجاع اللہ کو قبر میں اُتارنے تک کا مرحلہ طے کیا۔

شجاع کی ماں اور بڑی بہن نے رو رو کر اپنی بینائی ختم کر لی، ماں کا تو یہ عالم ہُوا کہ شجاع کی لاش دیکھنے کے بعد وُہ خود ایک زندہ لاش کی صورت میں تبدیل ہو گئی تھی، اور جب تک زندہ رہی اسی کے تصوّر سے باتیں کرتی رہی۔

مَیں اور تو کسی قابل تھا نہیں۔ مَیں نے اپنی مال روڈ والی دُکان ساحرؔ کو دے دی کہ اِس میں کاروبار کریں، لیکن نوجوان بھائی کا صدمہ اور بیمار ماں کی خدمت اُس پر پردیس، ساحرؔ آخر انسان ہی تو تھا۔ بوکھلا کے رہ گیا؛ اور کامیاب نہیں ہو سکا۔ پھر ساحرؔ کو ایک پبلشر کے ہاں ملازمت کرنا پڑی۔ اور پبلشر کو انسانی خون کی ایسی چاٹ ہوتی ہے کہ بعض اوقات وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کی شہ رگ پر بھی دانت گاڑ دیتا ہے اور خون چوس کر اتنی دُور پھینکتا ہے کہ راہگیروں کی اس پر نظر بھی نہیں پڑتی۔ چنانچہ ساحرؔ کو دو ماہ کی تنخواہ نہیں ملی۔ وہ لاہور کی زندگی سے اُکتا کر اور لوگوں کے اخلاق سے مایوس ہو کر لائل پور چلا گیا۔ وہاں "بڑا دواخانہ" میں طبیب اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ دَواخانے سے آکر وہ گھر پہ اپنا مطب کرتا تھا، اور معاشی طور پر غیر مطمئن نہیں تھا۔ اگرچہ ساحرؔ اب وہ پہلا انسان نہیں رہا کیونکہ تجربات نے اُسے سیماب اور چاندی کا فرق بتا دیا ہے۔ لیکن میرے لئے اُن کے یہاں اب بھی وُہی پہلی بات ہے اور ذرّہ برابر فرق نہیں آیا۔ آج بھی میں اُس میں وہی بات دیکھتا ہوں جو اِس دَور میں نقصان رساں مگر انسانیت کے پوجنے والوں میں طرّۂ امتیاز ہے۔

اب ساحرؔ نے لائل پور سے باہر ایک کالونی میں اپنی ذاتی بلڈنگ بھی بنالی ہے

وہ عیال دار انسان ہے لیکن اپنے فرائض کی ادائی اُسے اُسی طرح عزیز ہے۔
اپنی بیوہ بہن کے لیئے اُس نے اپنے مکان کے سامنے ایک دُوسرا مکان
لے لیا ہے۔ تین سال ہوئے والد بھی اللہ کو پیارے ہو گئے اور جب سے ان کا
انتقال ہوا ہے میں سمجھتا ہوں ساحر کے گھر کی پردے والی دیوار گر گئی ہے۔

تن ہمہ داغ داغ شد

جب قیام پاکستان کے ہنگامے میں ڈاکٹر ساحر لُٹ پِٹ کر بریلی سے لاہور آئے
تو کچھ دنوں بعد اُن کی بہن سلیم اور اُن کے شوہر ڈاکٹر دلدار حسین بھی آ گئے اور ساحر
صاحب کے ساتھ رہنے لگے وہ بڑے ختنی آدمی تھے۔ پولیس سے نکلا ہُوا انسان
ویسے بھی چوکنا ہو جاتا ہے۔ مگر ڈاکٹر دلدار حسین کچھ بہت ہی ذہین حسّاس اور
نازک طبع انسان واقع ہُوئے تھے۔ یہاں آ کر اُن کی ڈاکٹری تو نہیں چلی، مگر وہ گھبرائے
نہیں۔ کچھ روز تو لاہور ہی میں کسی اچھے مقام کی تلاش میں رہے۔ لیکن جب کام چلتا
نہ دیکھا تو دواؤں کے ایجنٹ کی حیثیت سے لاہور سے باہر کے دورے کرنے لگے۔

وہ چار بچوں کے باپ تھے اس لئے اُنھیں ہر وقت یہ فکر دامن گیر تھی کہ بچوں
کے لئے آسائش مہیا ہو۔ اگرچہ فرائض کی ادائی میں وہ کمی نہیں کرتے تھے لیکن وقت
اُن کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ فکر انسانی زندگی کے لئے دیمک سے کم نہیں ہوتی،
شدید محنت اور دن رات کے تفکر نے دلدار حسین کو تپ دق میں مبتلا کر دیا۔ بہت
دنوں تک تو اُنھوں نے اپنی بیماری کے متعلق اپنے بیوی بچوں کو بھی نہیں بتایا اور
بالا بالا علاج معالجہ کراتے رہے اور جب چارپائی نے دامن پکڑ لیا تو ایک گاؤں میں
اپنے کسی دوست کے یہاں جا پڑے جو صاحبِ حیثیت تھا۔ اُس نے اپنی طرف سے
تو معالجے میں کمی نہیں کی، لیکن ڈاکٹر دلدار حسین پر موت کا سایہ آ چکا تھا۔ اور اُنھوں

نے اپنے بیوی بچوں کے افلاس کے پیشِ نظر اُسی دوست کے دروازے پر جان دے دی! اُن کی موت شیروں اور چیتوں کی طرح باعزت موت تھی جو اپنی موت کے لئے ایسی جگہ تلاش کرتے ہیں کہ اُن کے جسم کی عفونت دُوسری زندگیوں کو متاثر نہ کرے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہمیں شیروں، چیتوں اور اژدہوں کے ڈھانچے دستیاب نہیں ہوتے۔ انتہا یہ ہے کہ گینڈے، ہاتھی اور جنگلی بھینسے تک اپنا قبرستان ایسی جگہ بناتے ہیں جہاں دُور دُور آبادیاں نہ ہوں اور یہ شعور اُسی قوت کی ودیعت ہے جس کے اشاروں پہ تمام نظامِ شمسی اپنے وظیفوں اور وعدوں پر قائم ہے۔

لاہور انتقال کی خبر پہنچی تو گھر میں کہرام مچ گیا، ڈاکٹر ساحر غریب پہلے ہی پریشان تھے۔ اب یہ نئی افتاد آ گئی۔ مگر قدرت کے سامنے کیا کرتے سب خاموش تھے۔ اُن کے والد باہمت انسان ہونے کے باوجود کچھ گھبرائے گھبرائے سے نظر آنے لگے تھے۔ کچھ دنوں بعد ساحر نے ملازمت ترک کر دی، اور اپنا مطب قائم کر لیا۔

اس کے بعد سے اب تک بیوہ بہن کا بار بھی ساحر کے کندھوں پر ہے لیکن وُہ صاحبِ ظرف انسان ہیں، خاموشی سے برداشت کر رہے ہیں اور کبھی ماتھے پر اکتاہٹ کی شکن نہیں رینگتی۔ نیلم اپنے مستقبل کے خوف میں گُم گھر کا کام کاج کرتی رہتی ہے۔ بعض اوقات مجبوریوں کا احساس اور شرم و حیا کا تشنج اُس کی انگلیوں کو آپس میں بَل دیتا ہے لیکن اُس کے لبوں کی مُہر نہیں ٹوٹتی۔ بیوگی کے بعد جب نیلم اپنی والدہ اور اپنی آنکھوں کے امتحان کے لئے میو ہسپتال لاہور میں آئی، اور پہلی بار مَیں نے اُسے دیکھا۔ اُس وقت وہ ایک بُجھے ہوئے شعلے کی طرح تھی۔ غموں نے اُس کے چہرے کا یہ حال کر دیا تھا جیسے زمین کے کھنڈر مدفون تہذیبوں کا سراغ دیتے ہیں۔ اُس کی پیشانی کچھ ایسی ہو گئی جیسے زرد گلاب کو پالے نے جُلا دیا ہو۔ وُہ دیوار کے ایک گوشہ پر نظر جمائے ہُوئے تھی۔ جیسے اُس کی گذشتہ زندگی کی فلم اُن کے

سامنے گزر رہی ہو۔ میں خود کو بڑا سخت دل اور صاحبِ ضبط انسان خیال کرتا تھا۔ لیکن میں نے خود میں نیلم کو اس عالم میں دیکھنے کی ہمت نہ پائی اور آنکھیں جھکا لیں۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے دل پہ کوئی آس پاس سے تھل تھلاتا بوجھ ڈھلک رہا ہو۔ اس کی خاموشی وضاحت طلب اور یک رُخی حیرت آفریں نظر تفصیل طلب تھی۔

میں نے آنکھیں جھکائے جھکائے بڑی ہمت سے ڈرتے ڈرتے صرف اتنا کہا کہ تمہیں تو اب بڑی دقت پیش آ رہی ہوگی، اگر کبھی میں تمہاری کوئی خدمت کر سکوں تو مجھے صرف خوشی ہی نہیں ہوگی بلکہ تہِ دل سے ممنون بھی ہوں گا۔

اُس نے گردن جھکالی اور مُرجھائے ہوئے رخساروں پہ آنسوؤں کی گیلی لکیریں جھلملانے لگیں۔ حالانکہ اُس کی آنکھوں کو آنسوؤں کا لپکا نہیں تھا۔ اُس کا یہ عالم دیکھ کر میرا دل بھی اس طرح دھڑکنے لگا جیسے کوئی چھوٹی کشتی دریا کے کنارے کے پودوں میں رسّی سے باندھ دی جائے۔

نیلم نے بڑی احتیاط کے ساتھ اتنا کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ! مجھے آپ سے یہی اُمید تھی۔ لیکن میرے بھائی مجھ سے زندگی بھر نہیں اُکتائیں گے۔ اور اب تو ماشاءاللہ اُنہیں معاشی اُلجھنیں بھی نہیں ہیں وہ دُکھ تکلیف میں میرا ہر طرح کا خیال رکھتے ہیں۔ اور میرے بچوں کو بھی اپنے بچوں کی طرح خیال کرتے اور چاہتے ہیں۔ ایسا بھائی ہر بہن کو نصیب نہیں ہوتا۔ اور قسمت سے ان کی بیگم بھی ایسی ہیں کہ ان کے ارادوں میں حائل نہیں ہوتیں۔ آخر میرا اور ساحر کا رشتہ ایسا تو نہیں کہ اتنی جلدی خونِ سفید ہو جائے، اور پھر میری ضروریات بھی تو محدود ہیں۔ رہا بچوں کی تعلیم و تربیت کا خیال۔ اس میں بھی وہ مجھ سے زیادہ مستعد ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ وہ اپنے فرض اور رشتے کی بلندی کو خوب پہچانتے ہیں، صاحبِ دل، اور

صاحبِ احساس انسان ہیں۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ اگر کبھی وہ بگڑیں تو قرآن اور حدیث کے اصول بھی انہیں راہِ راست پر نہیں لا سکتے۔ وہ ہیں بُری طرح عقل پرست!"

میں خاموش تھا۔ کہیں کہیں جب اس کی آواز کے شجرے کی کوئی شاخ ضبطِ غم کے بارے سے لچک جاتی تو دل کلپنے لگتا۔ مگر پھر خیال آتا کہ ایسی مہذب اور پڑھی لکھی بیوہ سے گفتگو اور نزدیکی میری سطح کے انسان کے لئے ایسا نشیلا چراغ ہے جس کی روشنی اور دُھواں زیادہ دیر ہوش کی مہلت نہیں دیتا اور سکون چھین لیتا ہے۔

میری خاموشی نہیں ٹوٹی اور میں اُس مصائب کے مجسّمے کو بولتے ہوئے دیکھتا اور سُنتا رہا۔ اس کے چہرے پر غم اور اظہارِ غم کا ایسا ملا جُلا تغیر تھا جیسے رات بھر جلتی ہوئی میلی لالٹین پر صبح کے سُورج کی روشنی! آخر وہ اِس فقرے پر آ گئی "ان تمام باتوں کے باوجود اگر خدا نخواستہ کچھ ایسی ویسی بات ہوئی تو میں آپ کو خط لکھوا دوں گی۔" اُس وقت میرے دل ودماغ پر رہ رہ کے چھینکے سے لگنے لگے تھے مگر خاموش رہا اور سوچتا رہا کہ ایک صنفِ نازک میں کس قدر مُنہ زور ہمتِ مردانہ ہے۔

وہ ابھی لائل پور میں ڈاکٹر ساحرہ قدوائی کے ساتھ ہیں۔ جب میرے خیال کا عکس نیلم کے ماضی پر جاتا ہے تو تصور کی انگلی پر تمام مناظر آویزاں ہو جاتے ہیں۔ اور میں اُس کی جگرداری، ضبط اور ہمت کو قابلِ تحسین پاتا ہوں۔ اُس کا احساس سالوں کو آنسوؤں کے سہرے تو ضرور پروتا ہوگا۔ کیونکہ شرافت کا احساس مصائب و غربت میں اور بھی شدید ہو جاتا ہے۔ لیکن وہاں تبسم کے گجرے نہیں گندھتے، اب نیلم کا سنگھار بچّوں کی تعلیم و تربیت میں گم ہو چکا ہے۔ وہ اپنے بھائی اور بھاوج کی خوشنودیٔ مزاج کو اپنا فرض گردانتی ہے۔

نیلم کے والدین کا تو یکے بعد دیگرے پہلے ہی انتقال ہو گیا تھا۔ بعد میں اُس کی بڑی لڑکی شمیم اقبال پر بھی باپ کے مرض کا گہرا سایہ پڑنے لگا، دِن رات

علاج معالجے کے باوصف وہ جانبر نہ ہو سکی۔ اب دو لڑکیاں زیرِ تعلیم ہیں۔ مگر نیلم کا لڑکا خالد علیل رہتا ہے۔ ہرچند کہ نیلم اور اس کے ماموں ڈاکٹر ساحر اس کے علاج معالجے سے بے خبر نہیں لیکن عرصہ سے اُس کی طبیعت خراب ہی چلی آ رہی ہے۔ اللہ اُسے تندرست کر دے۔ آمین۔

میں چند روز ہوئے لائل پور گیا تو نیلم عورتوں اور بچّوں میں اس طرح بیٹھی تھی جیسے انگیٹھیوں کے حصار میں پکسا ہُوا گلدستہ۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑی ہوگئی اور اُس کی دھواں دیتی خاموشی پر ہلکا سا تبسّم جھلک گیا۔ وہ چائے پکانے میں مصروف ہو گئی اور میں اِس دُنیا کے کارخانے پر غور و فکر کرتا رہا۔ اب اُس کا چہرہ اُس دیوار کے طاق کی طرح ہے جس میں چراغ جلتے جلتے تیل اور چکٹ کا اثر دیوار تک پہنچ گیا ہو۔ اور کمر لگا کے بیٹھنا بھی غلط نظر آئے۔

سفرِ بمبئی

ایک دفعہ مجھے لاہور سے بمبئی کے ایک مشاعرے میں جانے کا اتفاق ہُوا اور مشاعرے کے بعد سیلون ریڈیو سے کلام براڈ کاسٹ کرنے کے سلسلہ میں شیخ ایاز[1] سے یادگار ملاقات ہُوئی۔ اس سے پہلے وہ ایک بار لاہور میں بھی تشریف لائے تھے اور میں نے کئی دوستوں کو اُن کا مدّاح پایا تھا لیکن بمبئی میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ خلوص و مروّت اور ہمدردی سے پیش آئے یہی نہیں میں نے دہلی تک آتے آتے نہ جانے کتنے لوگوں کو اُن کا مدّاح پایا مجھے اس سے اور بھی خوشی ہوئی کیونکہ شیخ ایاز کے متعلق دُنیا میری ہم خیال اور ہم زبان نکلی۔

راجندر کرشن

اسی طرح راجندر کرشن سے ملاقات ہوئی وہ اس خلوص کے ساتھ ملا کہ میرا دِل بھر آیا۔ اُس نے میرے اعزاز میں اپنے

[1] اس نام کے ساتھ میں یہ بتا دینا بھی ضروری سمجھتا ہُوں کہ اس شیخ ایاز کا سندھ یا جیئے سندھ کی تحریک سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

گھر پر فلم انڈسٹری کے نودار لوگوں کو چائے پر بلایا اور سب کے سامنے اپنی شاگردی کا اعتراف کیا، اس نے کہا "مجھے فخر ہے کہ میں اپنے اُستاد احسان دانش کے گھر بچّوں کی طرح رہا ہوں اور وُہ مجھ سے اسی طرح پیش آئے جیسے ایک باپ بیٹے سے پیش آتا ہے۔" حالانکہ میرے یہاں اُستادی شاگردی کا کارخانہ کبھی نہیں کھُلا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مَیں نے اپنے اُستاد قاضی محمد زکی صاحب زکی کاندھلوی کی شفقت دیکھی، مولانا تاجور نجیب آبادی مرحوم کی خدمت میں رہا جناب جوش ملسیانی اور تلوک چند محروم جیسے صاحبِ فن لوگوں سے اکتسابِ فن کیا، جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی مرحوم کی علمی ادبی صحبتوں سے فیضیاب ہوا اور حضرت نوح ناروی جیسے صاحبِ کمال کی محبت اور توجّہ نصیب ہوئی اب بتائیں کہ اس کے بعد مجھے اپنی اُستادی کا خیال کیسے آ سکتا ہے؟ مَیں تو آج بھی خود کو ان کی خاکِ پا کے برابر نہیں سمجھتا یہ لوگ فنِ شعر ہی تک قابلِ احترام نہیں تھے ان کے یہاں اخلاقی قدروں کی حفاظت اور انسانی کردار کا ایک مقام ملتا ہے ان میں سے جو مُہرا بھی بساط سے اُٹھ گیا اُس کی جگہ خالی نظر آئی اور آنے والا زمانہ پُر نہ کر سکا۔

بمبئی میں قیام کے دوران مولانا تاجور کے عزیز شاگرد چونی لال کاوش اور راج بلدیو راج سے بھی ملاقات ہوئی یہ لوگ خلوص کے معاملے میں اپنا جواب نہ خود ہیں خُوش نصیبی سے جناب قیس، جناب قمر، حکیم حیدر صاحب[۵] سے بھی ملاقاتیں رہیں اور اُنہیں پھلتا پھُولتا دیکھ کر یک گونہ اطمینان ہُوا یہ لوگ اس طرح جھک کر ملے اور خلوص سے پیش آئے کہ میرے آنسو بھر آئے اور قیام گاہ پر آکر دیر تک زندگی کے مراحل پر سوچتا رہا۔ اور سیاسی دیواروں پہ افسوس کرتا رہا؛ کاش یہ سیاسی ادارے انسانیت کا احترام بھی کرنے لگیں۔

---

۵ حکیم حیدر صاحب وفات پا چکے ہیں اللہ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

ایک ذہنیت

قیامِ پاکستان کے بعد کئی اوچھے تاجروں کی نزدیکی سے جو میرے علم اور مشاہدے میں اضافہ ہُوا ہے مَیں اُس کی روشنی میں چھوٹے تاجروں اور تجارتی اداروں سے منسلک تجربہ کار مگر گھٹیا انسانوں کو اُن کی مشین کے پُرزے خیال کرتا ہوں یہ ایک دوسرے کو تو اچھی طرح جانتے پہچانتے اور سمجھتے ہیں لیکن اِن دونوں گروہوں سے اُلجھ کر عہدہ بُرا ہونا وکلاء کے بس کی بات ہو تو ہو عمرانی زندگی کے عام لوگ اُن کا شکار ہو کر ہی رہتے ہیں۔

اوچھے تاجروں اور گھٹیا عمّال کا طبقہ توڑ جوڑ میں جس قدر پختہ کار ہوتا ہے اسی قدر بے ایمانی، فریب کاری اور محسن کُشی اس کی فطرت بنتی چلی جاتی ہے وہ محنت کی قیمت لگانے سے دانستہ نظر بچاتا ہے اور شرفا کی صحبت اُسے راس نہیں آتی یہ سب شہری درندوں کی نسل کے انسان نما جانور ہوتے ہیں جو کسانوں کی چربی کے کھلیان کُھندل کر بھی سیر نہیں ہوتے اور مزدوروں کا خُون ان کی من بھاتی خوراک ہونے کے باوجود قیمت نہیں پاتا۔ البتّہ بعض اوقات پولیس کے چکّر میں آ کر تنقیہ ہو جاتا ہے۔ مگر تہذیب کے اصلاح خانوں میں اس بیماری کا ابھی کوئی علاج نہیں۔

جب یہ لوگ اُبھرتی ہُوئی پوزیشن میں ہوتے ہیں تو شاید احساسِ کمتری کے تحت، برابر والوں سے بھی دامن بچانے لگتے ہیں یہ ہمیشہ اپنے مقصد کے لئے اپنے سے کم عقل اور سیدھے سادے لوگوں کو اپنے علم، تجربے اور خلوص کا فریب دیا کرتے ہیں اور اسی ورزش سے ان کی تندرستی قائم رہتی ہے ان کے گرد کی دُنیا میں یا تو صرف وُہ تاجر رہتے ہیں جن میں ایک کو دوسرے سے مفاد کی اُمّید ہوتی ہے یا پھر ایسے بھولے بھالے انسان اور جذبات سے مغلوب دوست جو زبان سی کر اپنی جیب کٹوا لیں اور

کچے کانوں پر زندگی بسر کریں؟

ایسے لوگوں کو نہ تو مذہبی بلندیوں سے کچھ لگاؤ ہوتا ہے اور نہ دنیاوی آلائشوں اور گندگیوں سے نفرت! اُن کے سامنے تو صرف مال کی آمد و رفت اور اشیاء کی خرید و فروخت کے سوا عقبیٰ جیسی چیز بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ یہ اسلامی زندگی سے اسی لئے نفرت کرتے ہیں کہ اسلام ایک ذریعہ ہے شریف انسان بننے اور بنانے کا۔ اس میں تجارت کے لئے ایمانداری اور منافع کے لئے مقرّرہ حدود کی تاکید آئی ہے۔

یہ طبقہ حکومت کو دشمن اور مخلص دوستوں کو غرض مند سمجھتا ہے یہ لوگ حکام سے اس قدر نزدیک اور اغراض میں اسقدر اندھے ہو جاتے ہیں کہ بسا اوقات ان کی عصمتیں بھی بالکل بے حفاظت رہ جاتی ہیں اور دولت کا لالچ اُنھیں اس قدر بے نقاب کر دیتا ہے کہ معمولی معمولی لوگوں کی نظر ان کے نشیبوں پر منڈلانے لگتی ہے اور ان کے گھروں کے صحن اس قدر وسیع ہو جاتے ہیں کہ ان کی پالتو مرغیوں کی کنڈالیوں میں کُتّے پانی پیتے دیکھے گئے ہیں۔

دُور کیوں جائیں میرے ہموطن اور کاندھلہ کے ایک رئیس نوجوان جذبۂ اسلام کی چھانچھ میں اپنا عدالتی وقار اور اچھا خاصا زمیندارہ تج کر پاکستان آ گئے، اُنھیں کیا خبر تھی کہ پاکستان میں تو موقع شناس ابن الوقت اور مصاحب قسم کے انسان پھل پھُول رہے ہیں اور سینکڑوں اسلام کے شیدائی ذلّت، ندامت اور مایوسی کی زندگی بسر کر رہے ہیں

لاہور میں تشریف لائے تو میں نے کہا "غریب خانہ حاضر ہے تم میرے دوست کے بھائی ہو، میرے دل میں زندگی بھر کے لئے تمہاری مستقل جگہ ہے، لیکن چونکہ اُن کے پاس کچھ رقم موجود تھی اور ابھی دماغ کا دھواں نہیں چھٹا تھا اس لئے وہ میری درویشانہ زندگی اور رہن سہن کے طریق کو طائرانہ دیکھ کر گزر گئے البتہ آمد و رفت اور بے تکلفی جوں کی توں رہی، جس قدر دن گزرتے گئے، کیسہ خالی اور حاضریاں طویل ہوتی گئیں۔

ایک دن تشریف لائے تو میری لائبریری کی ایک بینچ پر آکر لیٹ گئے، میں نے مزاج پوچھا تو بچوں کی طرح روتے ہوئے کہا: بھائی احسان اب جیب میں صرف چونتیس ۳۴ روپے باقی ہیں، اب کیا ہوگا؟ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے دیکھ کر میں نے کہا "میری موجودگی میں تمہیں گھبرانے کی کیا ضرورت ہے میں تو زندگی بھر تمہارا کفیل ہو سکتا ہوں۔" ذرا صبر سے کام لو یہاں تم کاندھلے کی زندگی سے اچھے رہو گے یہ سرزمین شروع شروع میں بڑا لتیاؤ کرتی ہے مگر جب انسان کو اگاڑی پچھاڑی لگانے کا شعور آجاتا ہے تو یہ اٹا گرٹے کا پھاٹک کھول دیتی ہے اور پھر جگہ جگہ آسودگی کے دریچے کھلے نظر آنے لگتے ہیں اور تم تو علیگڑھ کے تعلیم یافتہ ہو، ایڈوکیٹ ہو، یہ طبقہ تو چوکھا ہوتا ہے اور دنیا کو دیکھنا ہی نہیں برتنا بھی جانتا ہے۔

قصہ کوتاہ لاہور میں انھوں نے وکالت کی بے توقیری اور تنگدامانی دیکھ کر کاروبار شروع کر دیا، وکالت کے داؤ پیچ، علیگڑھ کی سوسائٹی اور فطری ذہانت نے ذرا ہاتھ پاؤں نکالے تو اچھے خاصے تاجر ہو گئے اور چونکہ خاندانی طور پر ندیدے نہیں تھے کاروبار چمک اُٹھا اب بحمداللہ نہایت کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں۔

لیکن اب وہ پہلے شیخ رشید نہیں رہے بلکہ ماحول میں جذب ہو گئے۔ ایک دن میں نے کہا کہ اَب تم سچ سچ اپنے حالات بتاؤ! اُنھوں نے بڑی جرأت سے پہلی بار کھل کے یہ گفتگو کی " احسان بھائی میں نے جب سے یہ کاروبار شروع کیا ہے گردوپیش کے ہر تعلّق کو نظرانداز کر دیا ہے اور یہ عالم ہے کہ بے مقصد و منافع کسی سے نزدیکی کو جی نہیں چاہتا مخلص دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کو بھی تضیعِ اوقات خیال کرتا ہوں، حالانکہ جب غور کرتا ہوں تو یہ بڑا ہی مجرمانہ اور غیر انسانی فعل ہے لیکن کیا کروں؟ یہ کاروبار

نہیں بلکہ ہوسِ زر کا جبری تقاضا ہے۔ بعض بعض اوقات تو خود پر غصّہ بھی آتا ہے مگر پھر سوچتا ہوں کہ اس معاشرے میں زندگی بسر کرنے کے لئے تو اسی بھیڑ بھڑکا کے ساتھ قدم ملا کر چلنا ہوگا اور اسی قسم کے شریف صورت درندوں سے چولی دامن کا ساتھ رکھنا پڑیگا، اور اب تو اس میں مزا آنے لگا ہے۔ لیکن میں ایک بات عرض کر دوں اگرچہ جانتا ہوں کہ آپ فریب خوردہ انسان ہیں اور آپ کی تحریر میں تجربات ہی تجربات بولتے ہیں میری اس صداقت کو تسلیم کرنے میں آپ کو تامّل ہوگا لیکن مَیں خُدا کو حاضر و ناظر جان کر قسم کھاتا ہوں کہ بے ایمانی یا فریب کاری کا نام تجارت نہیں، بلکہ اس میں تو دیانت اور صداقت کا استعمال ضروری ہے۔ مَیں ہمیشہ گاہک کو خرید کے دام بتا کر منافع لیتا ہوں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے یہاں دوسرے اداروں سے زیادہ گاہک گرتے ہیں اور قطعاً حیل و حجّت نہیں کرتے۔

میرے خیال سے یہ شیخ رشید ہی نہیں اسلامی اصُول سے جو شخص بھی تجارت کریگا اُس میں نقصان کسی صورت سے بھی ممکن نہیں ، مگر مشکل تو یہ ہے کہ آج کے تاجروں کی نظر میں حق و صداقت کا معیار اور اخلاقی قدریں صرف بیان کی چیزیں رہ گئی ہیں۔

آج تجارت کو سنّت پیغمبر سمجھ کر کون کرتا ہے؟ یہ تو سارقانہ ہیر پھیر اور مجرمانہ ہتھکنڈوں میں اُلجھ کر رہ گئے اُنھیں خبر نہیں کہ ایسے تاجروں کا انجام بخیر نہیں ہوتا ، اسلامی معاشرے میں تو جہاں اس پر عمل ہے کہ "مزدُور کو پسینہ خشک ہونے سے پہلے مزدوری دے دو" وہیں مزدُور کے لئے بھی پسینے میں شرابُور ہونا شرط ہے جو اس کی اُجرت پر حلال روزی کی مُہرِ تصدیق لگاتی ہے تاجروں کی بے راہ روی کے لئے ہی شاید یہ حدیث آئی ہے "تجّار قیامت کے دن فاجروں میں اُٹھائے جائیں گے"۔ فاجر کے معنی ہیں دن دہاڑے لوٹنے والا۔ لیکن اسلامی اصُول پر تجارت کرنے والا جنتّی ہے جنتّی!

یہ بیدرد لوگ

قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کی تعمیر میں ہاتھ بٹانے اور اُسے پھولتا پھلتا دیکھنے کے لئے ہزاروں دیوانگان مذہب و ملت، اپنے وطن، اعزا، احبا، اور بزرگوں کے قبرستان چھوڑ کر یہاں چلے آئے، جن کا پاکستان میں عزیزداری کا سہارا تھا وہ تو سہاروں پر بار بن گئے اور جن کا کوئی سہارا نہیں تھا وہ ٹوٹے پھوٹے مکانوں پارکوں، مسجدوں، امام باڑوں اور چوپالوں میں آ پڑے۔

اس وقت حکومت کے بیشتر دفاتر چھولداریوں میں تھے، اور جگہ جگہ میدان ان چھولداریوں سے بھرے پڑے تھے، نہ میز، نہ کرسی نہ دوات نہ قلم، سینکڑوں کلرکوں نے حُبِّ وطن سے سرشار ہو کر اپنی بیویوں کے زیورات تک فروخت کر کے دفتروں کی سٹیشنری خریدی۔

کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو جنونِ وطن اور جوشِ ایمان میں نکل تو آئے لیکن یہاں اُن کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ہو کر رہ گئی چونکہ معزز خاندان تھے اس لئے افسروں کے دروازوں کی جھڑکیاں اُن کی قوت برداشت سے باہر تھیں بعض حیرت اور بعض تذبذب میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے لیکن مستقبل میں کوسوں روشنی نظر نہیں آتی تھی میں نے بچشم خود بیگمات کی شادیوں کے جوڑے اور کنواری لڑکیوں کے جہیز گلی کوچوں کی خاموشی میں اونے پونے بکتے دیکھے ہیں اور کلیجا پکڑ کر رہ گیا ہوں۔

خود میرے مکان پر میرے اقربا کا ہجوم تھا جس کی کفالت میرے لئے عزت کا سوال بنی ہوئی تھی۔

اس ہجوم افلاس و فاداری میں کسی قصبے کا ایک شخص جو گھر کا سامان بیچ کر افلاس

سے ہار مان چکا تھا اپنی علمی قابلیت کے بھروسے پر مصائب کے جبڑوں میں دبا دبا ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا کہ شاید یہاں کوئی گنجائش نکل آئے اُسے کیا معلوم تھا کہ شرافت اور قابلیت دونوں اس ادارے میں کھوٹے سکّے قرار پاتے ہیں، یہ انسان تو بھیڑیوں کی طرح غول کی زندگی لبسر کرنے کے عادی ہیں ان کے یہاں رجسٹروں میں رحم و انصاف کے خانے نہیں، یہ شعورِ انسانی سے عاری اور حُبّ انسانی سے نابلد ہیں۔

مگر بھوک اور عزّتِ نفس کا تحفّظ انسان کو ایسے ایسے مقامات پر لے جاتا ہے، جہاں کے چند لمحے بھی عقبے کے راستے کا بوجھ بن جاتے ہیں اور اس غریب پر کچھ ایسا ہی پیغمبری وقت پڑا ہوا تھا۔

ریڈیو کے ماحول میں بھلا اس مصیبت زدہ کی ڈوبتی ہوئی نبضوں اور بے نور ہوتی ہوئی آنکھوں کو کون دیکھنے والا تھا، وہاں تو نغمہ و ساز اور کاکُل و رخسار کا کاروبار تھا۔

اُس نے دفتر میں قدم رکھّا ہی تھا کہ دو تین چہروں نے بلند آواز اور طنزیہ انداز میں کہا " باادب باملاحظہ ہوشیار!" وہ غریب یہ سمجھا کہ یہ حکم میرے لئے ہے چنانچہ اُس نے نمازیوں کی طرح دونوں ہاتھ باندھ لئے اور بے گناہ مجرم کی طرح کھڑا ہو گیا۔

ایک ادھیڑ عمر کُرسی نشین :- کیا بات ہے بڑے میاں ؟

اجنبی :- میاں میں لکھا پڑھا انسان ہوں اور فاقوں پر نوبت ہے مجھے کوئی لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے تو خدا اس کا اجر دے گا تمہیں!۔

ایک چپراسی اشارہ پاکر :- آپ ذرا باہر تشریف رکھیں، اتنے میں ادارے کے ایک مزاح نگار نے ایک کاغذ پر اُلٹی سیدھی لکیریں کھینچ کر کاغذ کو دیوار کی انگیٹھی کے خلا میں ٹھونس دیا اور ایک اسٹول انگیٹھی کے سامنے بچھوا کر کہا، بڑے میاں آیئے! دیکھئے اسٹول پہ بیٹھ کر اس درمیانی خلا کی طرف منہ کر کے کوئی غزل پڑھئے!! ہم آپ کی آواز ٹیسٹ کر رہے ہیں پھر پروگرام کے متعلق بات ہو جائے گی۔

غالباً اب یہ ادارہ رُو بہ اصلاح ہے۔

اجنبی غریب اسٹول پر انگیٹھی کے خلا کے قریب مُنہ کر کے بیٹھ گیا اور ان میں سے ایک نے اُسے ایک غزلوں کی کتاب تھما دی اور کہا اس میں سے کوئی غزل پڑھیے!

اجنبی نے پہلے ہی صفحے سے ایک حمد پڑھی اور یہ پورا عملہ ہنس ہنس کر دوہرا ہو ہو گیا۔ جب مقطع آیا تو اُس مزاح کار نے انگیٹھی میں سے وُہ کاغذ نکال کر غور سے دیکھا اور کہا۔ بڑے میاں یہ لکیریں باقاعدہ ہونی چاہئیں لیکن ایسا نہیں ہے ہمیں افسوس ہے، نہ تو آپ جوان ہیں کہ آپ کو جوانوں کے پروگرام میں لے لیں اور نہ ابھی اس قدر بوڑھے ہیں کہ پوپلے مُنہ سے بوڑھوں کی صف میں آ جائیں ہاں اگر دانت نہ ہوتے تو ہمارے یہاں اچھے پروگرام ملتے رہتے، ہمیں آجکل ایسے فنکاروں کی ضرورت ہے۔

اجنبی کے چہرے پر ایک سایہ سا کانپا اور وُہ مایوسی میں پیشانی پر پسینہ اور چہرے پر آنسوؤں کی لہرائی ہوئی روشن لکیریں لئے ریڈیو اسٹیشن سے باہر نکل آیا۔ حالانکہ ایسے موقعوں پر نقادوں کے بڑے بڑے تودے پگھل کر بہ جاتے ہیں لیکن اس ادارے کے اراکین میں سے کسی کا قہقہہ نہ مُرجھایا۔

اجنبی کے سامنے بیوی بچّوں کی نمانی صورتیں اور ان کا انجام تھا چنانچہ اُس نے گھر کی کوئی چیز فروخت کر کے اچھے خاصے دانت نکلوا ڈالے اور کئی روز بعد پھر ریڈیو اسٹیشن پہنچ گیا اور کہنے لگا میں نے آپ کی مرضی کے مُطابق اپنے دانت نکلوا دیئے ہیں، اب تو آپ مجھے پروگرام دیں گے نا؟

اراکین ریڈیو سنّاٹے میں آ گئے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ کئی نے مسکراہٹ روکی، کئی نے آنسو، اور اُسے ایک پندرہ روپے کا پروگرام دیا۔ وُہ اس طرح گھر لوٹا جیسے کسی کے زخم پر پھاہا لگا دیا گیا ہو، نمعلوم بعد میں ریڈیو والوں نے کب تک اُسے قابلِ توجّہ گردانا ہو گا، اور اس کے اس ایثار کی کیا قیمت لگائی ہو گی۔

میرے ذہن میں ریڈیو کے اراکین اور اُن کے سیہ گوش حواریوں کے بجانے کتنے

واقعات ہیں لیکن کیا فائدہ؟

سانحۂ رحلت

قائدِ اعظم خدا کے فضل اور اپنی قابلیت کے بل پر اُس مقام تک رسا ہو گئے تھے کہ ان کی نظیر مشکل تھی حصولِ پاکستان کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا جسے انھوں نے اپنی کدوکاوش سے انجام تک پہنچا دیا۔ ہمارا فرض تھا کہ ان کے نقشِ قدم پہ چل کر ملک کو ترقی دیتے اور اس کھیتی کو سرسبز و شاداب رکھتے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ بلکہ دشمنوں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔

ابھی اس حسین خواب کی تعبیر ناتمام تھی اور آسائش و آرائش حیات کے شعبے نامکمّل تھے کہ اس کے موسس اعلیٰ حضرت قائد اعظم محمد علی جناح اللہ کو پیارے ہو گئے اور یہ ملک لاوارث رہ گیا جیسے کوئی انجن ریل گاڑی کو چھوڑ کر آگے بڑھ جائے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

نواب زادہ لیاقت علی خان ایک عرصے سے قائد اعظم کے ساتھ کام کر رہے تھے اور اُن کے متعلق قائد اعظم کا خیال تھا کہ وہ اپنے کندھوں پہ بہت بڑا سیاسی بوجھ اُٹھائے ہوئے ہیں یہی سبب تھا کہ وہ اُنھیں اپنا دستِ راست کہا کرتے تھے جس کا اظہار اُنھوں نے دسمبر ۱۹۴۳ء کو مسلم لیگ کراچی کے اجلاس میں کیا تھا کہ "اگرچہ وہ ایک نواب زادہ ہیں لیکن عامۃ النّاس میں سے ہیں اور اب اس ملک کے نواب زادے ایسے ہی ہوا کریں گے۔

قائدِ ملّت : یُوں بھی جب ہم قائد اعظم کے دَور کا ذکر چھیڑتے ہیں تو قائدِ ملّت لیاقت علی خان کا ذکر خُود بخود زبان پر آجاتا ہے اُن جیسی قربانی اور ایثار مسلم لیگ کی تاریخ میں کسی کی نہیں ہے اُنھوں نے صرف قائد اعظم کے منشا پر اپنی پوری ریاست

داؤں پر لگا دی تھی اور دن رات مشین کی طرح پاکستان کی تعمیر و آرائش میں مصروف رہتے تھے۔

قائدِ اعظم کے بعد:۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کے بعد لیاقت علی خان نے جس طرح ان کے مشن کو چلایا وہ انہی کا کام تھا یوں سمجھ لیجیے کہ قائدِ اعظم تو بانیٔ پاکستان تھے اور لیاقت علی خاں معمارِ پاکستان! جس طرح قائدِ اعظم کو لیاقت علی خاں سے لگاؤ تھا بالکل اسی طرح لیاقت علی خان اور نواب صدیق علی خان ایک جان دو قالب کی طرح تھے۔ صدیق علی خان نے بھی لیاقت علی خان کی طرح خطاب اور اپنی کل حیثیت کو مسلم لیگ اور مسلمانوں کی بہبود پر قربان کر دیا تھا اور دونوں رات دن ملک کی تعمیر اور ترقی کے منصوبے بناتے اور انھیں عملی جامہ پہناتے رہتے تھے

یہ دونوں ایسے انسان تھے کہ ان کے چاروں طرف دولت بکھری پڑی تھی مگر ان کی نگاہیں ملک اور قوم سے نہیں ہٹتی تھیں۔ لیاقت علی خان نے اس لئے بیرسٹری پاس نہیں کی تھی کہ وہ اس سے روپیہ کمائیں بلکہ اس لئے کہ ملک کے قانون کو سوچ سمجھ کر سیاست میں قدم رکھا جائے چنانچہ انھوں نے سیاست میں حصہ لیا اور اس وقت اس راہِ پُرخار میں قدم رکھا جب اس ملک میں لیڈروں کی صرف پگڑی ہی نہیں اچھلتی تھی ان پر گندگی بھی اچھالی جاتی تھی اور بعض بعض اوقات اینٹ پتھر بھی برستے تھے۔ لیکن نوابزادے نے بڑی ہوشمندی سے کام لیا اور ملک کو سنبھالا ہی نہیں مضبوط بھی کیا! اُن کے دماغ کی رسائی اور اس پیش بینی کا کیا جواب ہے؟ کہ انہوں نے وقت کے اندرونی پروگرام کو پڑھ کر بی آر بی نہر کھوا دی تھی۔ اُس وقت بعض خام فکر لوگوں نے اعتراض بھی کیا۔ مگر انھوں نے کسی کی بات پر دھیان نہ دیا۔ ملک اور قوم کو اس کی اہمیت ۱۹۶۵ء میں جنگ کے موقع پر معلوم ہوئی، پھر تو پورے ملک نے لیاقت علیخان کی رُوح کو خراجِ تحسین ادا کیا اور ان کی دیدہ وری کو سراہا۔

جو لوگ اپنا گھر در چھوڑ کر اسلام کے نشے میں ادھر آ گئے تھے، اُن میں اکثر و بیشتر کا سہارا صرف خُدا کی ذات تھی۔ لیکن جن لوگوں کو دنیاوی سہارا حاصل تھا وُہ لوگ بھی کیمپوں میں زندگی اور مَوت کے درمیان سانس لے رہے تھے۔ ان میں سینکڑوں لوگ ایسے بھی تھے جنھوں نے قائدِ اعظم کی اپیل پر بڑے بڑے عطیّات دئے تھے! وہ قائدِ اعظم کو کیمپوں کے معائنے کے وقت وُہ مسلم لیگ کے فنڈ میں دی ہوئی رقوم کی رسیدیں بھی دکھاتے تھے مگر اُن کی تکالیف کا سدِّباب کوئی نہیں تھا۔

کیمپوں کی اس تباہ حالی سے، قائدِ اعظم اس قدر متاثر ہوئے کہ اُنھیں علالت نے گھیر لیا، اور وہ اِسی اندرونی گھُن میں گھُلتے گھُلتے صاحبِ فراش ہو گئے۔ علاج معالجے کے باوجُود یہ صدمہ اُنھیں تندرستی سے اس قدر دُور لے گیا کہ مَوت کے گرداب میں آ گئے اور عالمِ بقا میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ خُدا اُنھیں جوارِ رحمت عطا فرمائے۔

لیاقت علی خان کے بڑے بھائی کرنال والے نواب سجّاد علی خان اور اُن کی والدہ محترمہ نیز خاندان کے دوسرے افراد بھی وطن کو خیر باد کہنے والوں میں تھے۔ نواب سجّاد علی خان نے نوابزادہ لیاقت علی خان کو اُن کی والدہ اور دُوسرے افراد کی طرف سے پیغام بھجوایا کہ پاکستان آنے کے لئے کسی موٹر یا ٹرک کا اِنتظام کر دیا جائے تو ہم لوگ آ جائیں۔ اس پر نوابزادہ صاحب نے جو اُس وقت پاکستان کے وزیرِ اعظم تھے اپنے عدل، اسلامی مساوات اور مذہب کے پیشِ نظر یہ کہلوا دیا کہ مَیں آپ لوگوں کے لئے کوئی خاص انتظام نہیں کر سکتا۔ جس طرح اور مہاجر آ رہے ہیں اُسی طرح آپ بھی آ جائیں۔ چنانچہ اُن کا پُورا خاندان دوسرے مہاجرین کی طرح خستہ حالی میں پاکستان پہنچا۔

قائدِ ملّت کی شہادت

اِس پر خلوص قائد کی جب تک زندگی سے علیٰحدگی نہ ہوئی ایک غریب مہاجر کی طرح دِن گزارے، جون ۱۹۴۸ء میں جہانگیر پارک کراچی میں اُنھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میرے پاس

نہ دولت ہے نہ جائداد، یہ دونوں چیزیں ایمان کی خرابی کا باعث ہوتی ہیں۔ میرے پاس تو صرف میری جان ہے، اور اُسے میں پہلے ہی ملک اور قوم کے لئے وقف کر چکا ہوں۔"

اُن کے اِن فقروں کی صداقت اُس وقت آ کے کھلی جب راولپنڈی میں وہ محرّم کی تیرھویں کو اپنی محبوب قوم کی دو گولیوں سے شہید ہو گئے اور اپنے رفیقِ خاص نواب صدیق علی خان[5] کی گود میں دم توڑ دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ ط

اطلاعاً عرض ہے

مَیں اپنی اس کتاب "جہانِ دانش" کی پہلی جلد یہیں تک لکھتا ہوں! دوسری جلد میں حالات و واقعات کے ساتھ اُن لوگوں کا ذکر کروں گا جن سے میں کبھی اور کسی بھی رُخ سے متاثر ہُوا ہوں، اُن میں بلا امتیاز مذہب و ملّت شاعر، ادیب، تاجر، طبیب، حکّام، قائد، مصوّر، عالم، نقّاد، معلّم، پیرزادگان اور وہ فنکار بھی شامل ہوں گے جو مجھے کسی بھی فن میں باکمال نظر آئے ہیں۔

احسان دانش

---

[5] صدیق علی خان نے پاکستان کے قیام کے متعلق ایک وقیع کتاب "بے تیغ سپاہی" کے عنوان سے لکھی ہے میرے خیال میں سیاسی معلومات کے اعتبار سے ایسی کتاب مشکل ہی سے ملے گی۔ اس میں انھوں نے کئی ایک دستاویزات کے عکس بھی شامل کتاب کر دیئے ہیں جس سے کتاب کی وقعت اور بھی بڑھ گئی ہے۔